سخن ور پنجم

تذکرہ شعراء اور شاعرات

سلطانہ مہر

ولی عالم شاہین — افضال سرور — جاوید اختر چوہدری — ادا جعفری — احمد مسعود

زرین یاسمین — جاوید زیدی — اقبال حیدر — خواجہ محمد آصف — جگن ناتھ آزاد

شمس جیلانی — مصطفیٰ شہاب — فوزیہ سلطانہ — نصرت شاہ

طلعت اشارت — عقیل دانش — فرزانہ خان نیناں — پرویز مظفر — عشرت آفرین

سعید قیس — فرخ عباس — اقبال نوید — ملک فضل حسین

ڈاکٹر طیب الرحمٰن — مونا شہاب — ناصر خان ناصر — حسن جہانگیر

"سلطانہ مہر اپنی ادبی خدمات کے حوالے سے ممتاز ہیں۔ ان کا کام یقیناً اتنا اور اس قابل ہے کہ ان کی شخصیت اور فن پر بھی کام ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

1177

تذکرہ شعرا و ادباء اردو

شریک سخن ور پنجم

ضیاء خان اور ٹینا

اپنے وطن پاکستان سے دور وہ دور ہیں ہو اب امریکہ ان کا وطن ثانی بن چکا ہے۔ ضیاء خان نے لاس اینجلس (ریاست کیلیفورنیا) میں اردو مشاعروں کی بنیاد ڈالی، اردو بولنے والی کمیونٹی کو اکٹھا کیا یوں جیسے ایک نیا شہر بسا لیا ہو۔ ان کے کام کی، ان کی لگن کی اور ان کے خلوص کی ضیاء پاشیوں نے وطن سے دور رہنے والے لوگوں کے لیے زندگی کی اندھیری راہیں روشن کر دیں۔

پھر جب وہ روزگار کے سلسلے میں امریکہ سے ریاض (سعودی عرب) سدھارے تو وہاں بھی اپنی زبان سے رشتے استوار رکھنے کے لیے لوگوں میں گھل مل گئے۔ دامے درمے قدمے سخنے وہ اپنے احباب کے گروہ میں مقبول ہوتے گئے اور اب، جب وہ ریاض سے رخصت ہو کر پھر کیلی فورنیا آ گئے ہیں تو وہاں کے لوگ انہیں بھلا نہیں پاتے۔ کہتے ہیں ضیاء خان ہماری محفلیں سونی کر گئے۔ ان احباب کی ایک طویل فہرست ہے جو ریاض (سعودی عرب) اور امریکہ میں رہتے ہیں لیکن دوری کے باوجود ضیاء خان کے پرستار ہیں۔ خصوصاً لاس اینجلس کے اقبال ابراہیم اور بھابھی شہناز اقبال۔ شخصیت کا یہ سحر کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اسے فطرت کی ودیعت یا خدائے واحد کی عنایت کہہ سکتے ہیں کہ جو اپنے بندوں کو یہ توفیق بھی دیتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو فیض بھی پہنچائیں۔ گو وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں لیکن اردو ادب کے پرستار ہونے کے ناتے انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی حوصلہ افزائی کی۔

کیلی فورنیا کے شاعر اور افسانہ نگار خالد خواجہ ضیاء خان کے لیے کہتے ہیں کہ ضیاء کی شاعری پر بھی ان کی من موہنی شخصیت کی چھاپ ہے اور ان کے خلوص کا پرتو جگہ جگہ ملتا ہے۔ ضیاء کی سچائی ان کی شاعری کا جوہر ہے۔ یوں ضیاء کی شخصیت ان کی شاعری کے حوالے سے اور بھی میٹھی اور دل پذیر ہو جاتی ہے۔ وہ سادگی میں ہی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ جیسے

ہے اب بھی تپش باقی ان راکھ کے ذروں میں   دیکھو کوئی چنگاری پھر سے نہ سلگ جائے!

ضیاء کے ہاں صحرا کا استعارہ بھی بہت اہم ہے۔ ان کی زندگی کے بہترین سال کویت، مصر، عرب امارات اور سعودی عرب میں گزرے ہیں۔ انہوں نے صحرا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ صحرا کے موضوع سے ان کی جذباتی وابستگی یا Facination ان کے کلام میں اکثر ملے گا۔ ضیاء کا سچا تجربہ ان اشعار میں نمایاں ہے۔

میں نے صحرا قریب سے دیکھا   کتنی بارش ہو نم نہیں ہوتا

اور

ریگزاروں میں کہیں نقش قدم چھوڑ آیا   خواہش نفس کی دنیا کے صنم توڑ آیا

ضیاء خان نے اب صوفی ازم کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ تھوڑے بہت صوفی تو وہ پہلے بھی تھے مگر ان کے جواں سال بیٹے کی رحلت نے ان کا یہ یقین اور بھی پختہ کر دیا کہ یہ بے ثبات دنیا لائق اعتنا نہیں۔ اسی حوالے سے ان کا ایک شعر اتنا اہم ہے کہ بار بار دہرانے کو جی چاہتا ہے۔

فلسفہ زیست کا ضیاء اتنا   پلکیں جھپکیں تو دم نہیں ہوگا

رب کائنات ضیاء خان کے "سخن" میں مزید تازگی اور توانائی دے کہ یہ سخن ہی ایک شاعر اور ادیب کی میراث ہے۔

سلطانہ مہر

محبتیں بانٹنے والا ایک انسان

محمد شفیق موڑک
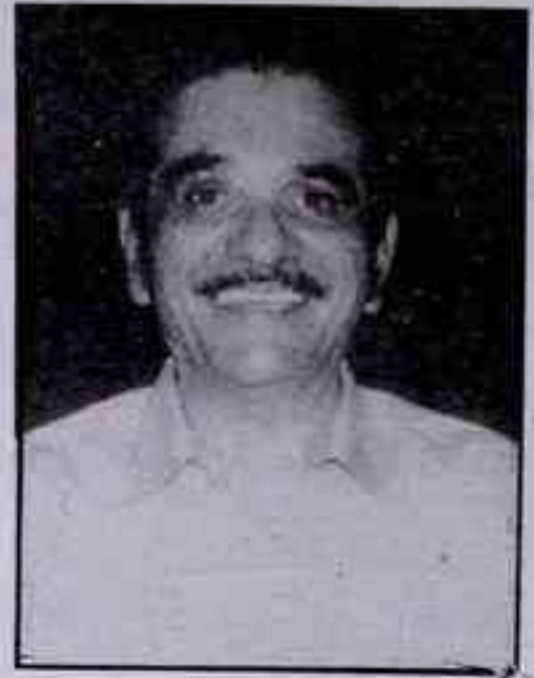
کچھ لوگ اپنے لیے جیتے ہیں۔ اپنی شناخت کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ زندگی میں ان کے اندر کبھی بھی یہ احساس جاگتا نہیں کہ مر جائیں گے تو یہ دونوں ہاتھ جس سے دولت اور شہرت سمیٹتے ہیں خالی ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن انہی لوگوں میں چند ایسے بھی ہیں جو دوسروں میں خوشیاں بانٹنے کے لیے جیتے ہیں اور ان کا یقین ہے کہ ان محبت بھری نیکیوں کے خزانے سے دم آخر ان کے ہاتھ بھرے رہیں گے۔

محمد شفیق موڑک کا نام بھی انہی لوگوں میں لیا جاتا ہے جن کے صبح و شام ضرورت مندوں کی خدمتوں کے لیے وقف ہیں۔ علم کی ترویج سے انہیں گہری محبت ہے۔ کتابیں ان کی ساتھی ہیں۔ اُردو ان کی مادری زبان نہیں مگر سفر میں اُردو زبان و ادب کی کتابیں اور رسالے ان کے ہمراہی ہوتے ہیں۔

محمد شفیق موڑک صوبہ مہاراشٹر کے ضلع رتناگری کے ایک چھوٹے سے گاؤں کروئی (Kadwai) میں ۲۵ جنوری ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء سے کاروبار کے سلسلے میں ان کا قیام انڈونیشیا میں ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی شادی ہوئی۔ اپنی بیگم زبیدہ موڑک کو انہوں نے انڈونیشیا بلوا لیا۔ ان سے دو بیٹے اسلم موڑک اور ندیم موڑک اور دو بیٹیاں اسما اور فردوس ہیں۔ اسلم ابھی امریکہ میں ہیں لیکن جلد ہی ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں گے جب کہ ندیم، بہو نورعین اور داماد امتیاز ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں۔ زندگی خوشگوار تھی کہ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۶ء کو ان کی شریک سفر زبیدہ کار کے حادثے میں انتقال کر گئیں۔ ان کی یادیں شفیق کی شب و روز کی ساتھی ہیں۔ ان کی زندگی میں کئی دوسرے اتار چڑھاؤ بھی آئے۔ انہوں نے لاکھوں کا نقصان بھی جھیلا مگر ہمت نہ ہاری۔ اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر آگے بڑھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ مایوسی کے گھپ اندھیروں میں ان کی دوسری بیگم وحیدہ کی رفاقت نے روشنی کی کرنیں پھیلائیں اور بیٹی زلفا کی رفاقت ان کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ شفیق آج بھی زبیدہ کو یاد کرتے ہیں۔ ستمبر کے مہینے میں بے چین سے رہتے ہیں اور خود کو بچوں کی محبت میں گم کر دیتے ہیں کہ یہی ان کے خدا کی مرضی بھی ہے۔

شفیق موڑک نے بتایا۔ انہیں اُردو سے دلچسپی ۱۹۷۰ء میں جناب ادریس دہلوی سے مل کر ہوئی۔ ادریس دہلوی (مرحوم) کی خواہش پر وہ ان کے ماہنامہ شمع دہلی کے لیے اکثر نامور فلمی ستاروں سے ملاقات اور تقریبات کی رپورٹیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ "شمع دہلی" نے اُردو ادب اور فلمی صحافت میں غیر ممالک میں بھی ایک سفیر کا کام انجام دیا۔ ادریس جب کبھی ممبئی آتے شفیق کے ہاں قیام کرتے۔ ان

کے برادرانہ تعلقات کی یادیں آج بھی شفیق کے البم میں تصویروں کی صورت میں موجود ہیں۔ شفیق کو فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ انہوں نے کئی فلمی ستاروں کی تصویریں شمع کے لیے بنائیں تھیں۔

شفیق موڈک کئی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ اُردو اور انگریزی تو ان کی بچپن کی ساتھی ہیں۔ انڈونیشی، چینی اور ملائی (ملائیشیا کی زبان) سے بھی انہوں نے دوستی رچائی ہے۔ انڈونیشی زبان پر انہیں عبور حاصل ہے۔ انڈونیشیا کی علاقائی زبانیں بھی انہوں نے سیکھیں کیوں کہ یہ ان کے کاروبار کی بھی ضرورت ہے۔

عمر کی اس منزل میں شفیق چاہتے ہیں کہ اپنی مرحومہ بیوی کی خواہش کے مطابق اپنا کاروبار اپنے بچوں اور داماد کو سونپ کر اپنے وطن لوٹیں اور اپنے لوگوں اور مٹی کی خدمت کا حق ادا کریں۔ انہوں نے زبیدہ مرحومہ کی یاد میں کوکن کے دیہاتی علاقوں میں پانچ مسجدیں "مسجد زبیدہ" کے نام سے بنوائیں۔ مرحومہ کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کی اور بعد میں حج اور کئی عمرے کر چکے ہیں۔ ہر سال کسی نہ کسی خواہش مند کو حج پر بھیجتے ہیں۔ بشرطیکہ خواہش مند ان سے رجوع کرے۔ آج بھی نیکی کا یہ عمل جاری ہے کہ جہاں بھی مسجد کی ضرورت دیکھی اور لوگوں نے خواہش ظاہر کی شفیق موڈک اس کارِ خیر کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ درج ذیل قطعہ انہوں نے اپنی مرحوم شریکِ حیات زبیدہ کی نذر کیا ہے۔

مری زندگی کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی
تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوسکیں
تری یاد شاخِ گلاب ہے جو ہوا چلی تو لچک گئی

M.Shfiq Modak
402, Red Gates,
St. Alexious Road
Bandra (West)
Mumbai 400050
INDIA.

Add. Indonesia
Plaza Textile,
Jalan Pandansari
No: XX/14-A,
Balikpapan (Kal-Tim)
INDONESIA.

رضا لائبریری رامپور کے لئے

۳۱ دسمبر ۲۰۰۵

سخن ور

حصہ پنجم

تذکرہ شعرا و شاعرات

تصنیف و تالیف

سلطانہ مہر

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION
20873 East Walnut, Canyon Road,
Walnut, CA 91789 USA

نام کتاب : سخنور حصہ پنجم (تذکرہ شعرا و شاعرات)

مصنفہ و مؤلفہ : سلطانہ مہر

سن اشاعت : بار اول 2004ء

ناشر : مہر بک فاؤنڈیشن،

لاس اینجلس، ریاستہائے متحدہ امریکہ

طباعت : اے بی سی پرنٹرز

25 امریکی ڈالر، 15 پاؤنڈ
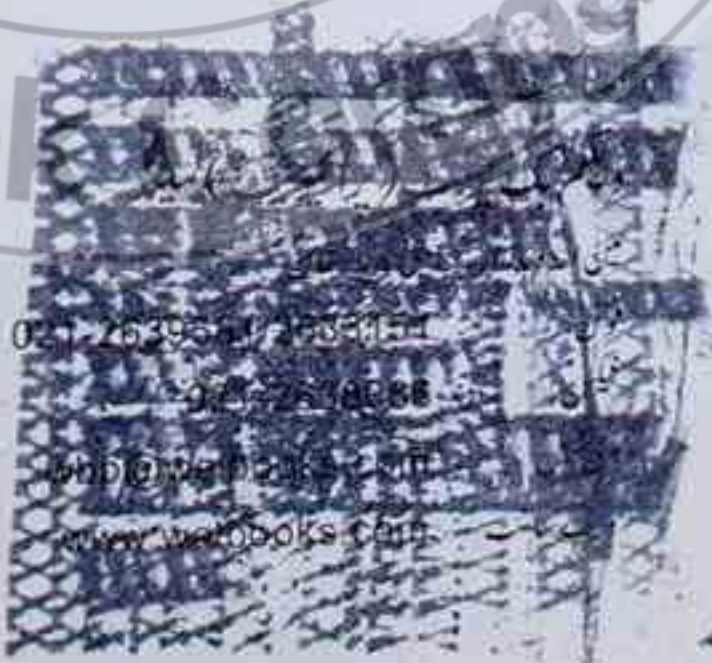
انتساب

ان کرم فرماؤں اور معاونین کے نام جن کے تعاون سے
میں نے اپنے اس ادبی سفر کو بحسن وخوبی طے کیا۔

- جناب احمد اڈایا اور بیگم امینہ اڈایا
- جناب ابوبکر وکیل اور بیگم زیب النساء وکیل
- جناب محمد حسن و بیگم حسن
- جناب ڈاکٹر سہیل مسعود اور بیگم مونا مسعود
- جناب شفیق موڑک و بیگم وحیدہ موڑک
- جناب ضیاء خان اور بینا ضیاء

اور

- جناب شان لال جی و شریمتی راج جی

سلطانہ مہر

فہرست مشمولات ...... سخنور حصہ پنجم

شمار	نام	صفحہ

شین (ش)

صاد (ص)

ضاد (ض)

طوئے (ط)

ظوئے (ظ)

شمار	نام	صفحہ

عین (ع)

غین (غ)

فے (ف)

قاف (ق)

سخنور حصہ پنجم کے بعد......

سلطانہ مہر
برمنگھم، برطانیہ

خداذوالجلال کا شکر ہے اور ہزار ہزار شکر ..... کہ ''سخنور'' کا حصہ پنجم تکمیل کو پہنچا۔ ادب کی تاریخ نویسی کا ایک مرحلہ طے ہوا۔ ''گفتنی'' کا حصہ دوم ابھی کمپوزنگ کے مراحل سے گزر رہا ہے اور ذات باری تعالی سے قوی امید ہے کہ یہ کام سال رواں میں یا اگلے سال کے اوائل میں اختتام کو پہنچ جائے گا۔

مزید کچھ کہنے سے پہلے میں جناب ڈاکٹر صفات علوی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر میں کمپوزنگ کے مشکل مراحل سے اتنی آسانی سے گزر جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اردو قواعد اور زبان و بیان کی صحت میں بھی تعاون دیا۔ اللہ تعالی انہیں جزائے خیر دے۔ آمین!

ان کے ساتھ ہی جناب جاوید اختر چودہری کا شکریہ ادا کرنا کیسے بھول سکتی ہوں جنہوں نے اپنا بہت وقت بڑی دیدہ ریزی سے پروف ریڈنگ میں صرف کیا۔ مجھے امید ہے کہ سخنور حصہ اول تا حصہ چہارم اور گفتنی حصہ اول کی نسبت ان دو کتابوں (سخنور حصہ پنجم اور گفتنی حصہ دوم) میں املا کی اغلاط بہت کم ہوں گی۔ تاہم جو رہ گئیں ان کو آپ انسانی کمزوریوں میں شمار کر لیجیے۔

سخنور حصہ پنجم کی محفل شرکا سے اردو زبان کے رسم الخط .. دنیا میں بالعموم اور مغربی دنیا میں

بالخصوص اردو زبان کا مقام اور اس کے مستقبل کے حوالے سے سوال کیئے گئے۔ بیشتر دانشور شعرا نے بڑے معلوماتی اور تجزیاتی جوابوں سے ہمیں سرفراز کیا۔ اور یقیناً یہ جوابات مستقبل میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے مثبت راہیں متعین کرنے میں معاون ہوں گے۔

شعرا اور نثار کے تعارف اکٹھا کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اردو کے قارئین جب بھی کسی ادیب کے بارے میں کچھ جاننے کے خواہش مند ہوں تو وہ ان کتابوں کی ان جلدوں کو بلا کسی صعوبت کے کوئیک ریفرینس یا ریڈی میڈ ریفرینس(quick reference/ready-made reference سریع الحوالہ) کے طور پر استعمال کرسکیں۔ لہٰذا میں ان کتابوں کی ہمہ گیر فعال اہمیت کے پیش نظر اپنے آپ کو مبارک بادکی حق بجانب سمجھتی ہوں کہ ان کی مدد سے عام اردو ادب کے قاری کو ادب کے کہکشاں اور ست رنگی جھرمٹ میں ان کے دل پسند شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نویسوں، نقادوں اور دانشوروں کے ذاتی حالات، ان کی پسند یا ناپسند، ان کے خیالات وترجیحات کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔ اس سے پہلے سخنور کے ہر چار حصوں اور گفتنی کے ایک حصے کی تدوین میں اوسطاً دو سال لگے لیکن اس بار سخنور کے حصہ پنجم اور گفتنی کے حصہ دوم، دونوں کے لئے تین سال صرف ہو گئے۔ اس کی وجہ کچھ ذاتی مصروفیات تھیں اور عائلی زندگی میں تبدیلی بھی۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ کوشش بسیار کے بعد بھی چند شعرا اور شاعرات کا تذکرہ اس جلد میں بھی شامل نہیں ہو سکا۔ چوں کہ ایک طے شدہ لے آوٹ (lay-out) کی تکمیل کے بغیر میں ادھورا تعارف شائع کرنے کے حق میں نہیں اس لئے میں اب کسی ایسے غیر حاضر شاعر یا شاعرہ سے معذرت خواہی بھی نہیں کروں گی جن سے متعدد بار ٹیلی فون، خط، ای میل سے یاد دہانی کے باوجود، کتاب کی ضروریات کے مطابق مواد حاصل نہیں ہو سکا۔ کسی نے تصویر نہیں مہیا کی تو کسی نے عکسِ تحریر میں بخل دکھایا۔ سوائے ایک پردہ نشین افسانہ نگار خاتون کے جنھوں نے تصویر کے سلسلے میں شرعی عذر پیش کیا، اس لئے قابلِ قبول ہے ورنہ میں ایسے تمام نامکمل جوابات بھیجنے والوں کو اس تذکرہ میں شامل نہیں کرسکتی۔ اس ضمن میں دو نام فوری طور پر یاد آرہے ہیں ایک ڈاکٹر صبیحہ صبا، نیویارک اور دوسرا ڈاکٹر صفی حسن، برمنگھم، برطانیہ۔ ان دونوں کے انٹرویو میرے پاس محفوظ ہیں لیکن تصویر نہیں ملی اور نہ ہی کوئی شرعی عذر۔

میں نے ۱۹۶۷ء میں شعرا و شاعرات کے تعارف کا ہفت وار سلسلہ روزنامہ جنگ، کراچی میں شروع کیا تھا۔ بحیثیت ایڈیٹر صفحۂ خواتین یہ سلسلہ اس صفحہ پر نہ صرف اس لئے کہ کوئی نیا پن اس صفحہ پر آئے، بلکہ اس لئے بھی شروع کیا کہ خواتین ادب کی طرف راغب ہوں اور اُن میں اس کی ترویج ہو۔ یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا۔ ۱۹۶۷ء میں پہلا تعارف محترم قمر جلالوی مرحوم کا اور سلسلے کا آخری ایک سو بیسواں تعارف ۱۹۶۹ء میں پروفیسر سحر انصاری کا شائع ہوا تھا۔ یہ تمام تعارف میں نے شعرا و شاعرات سے بالمشافہ گفتگو کر کے لکھے تھے۔ کراچی سے باہر کے شعرا و شاعرات مثلاً پروفیسر شور علیگ، ناصر کاظمی، قتیل شفائی، ڈاکٹر پروفیسر عندلیب شادانی وغیرہ سے کراچی میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں جاکر

ملاقات کرتی تھی اور ان کے انٹرویو کرتی تھی۔ مگر پھر یہ ممکن نہ رہا۔ دو سال تک سفارشوں کے دباؤ اور جانب داری کی بہتان طرازیوں کے بعد میں نے تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔

پھر میں نے سخنور حصہ دوم سے حصہ پنجم تک کے لئے سوال نامے مرتب کر کے اور شعراء و شاعرات کے تحریری جوابات کے ساتھ ساتھ اور جہاں جہاں ممکن ہوا بالمشافہ ملاقات کے ذریعے تذکرہ نگاری کے واسطے نوٹس لیئے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ میں ایک وسیع جغرافیائی طول وعرض پر بسنے والے اردو کے شاعروں کے حالات سے واقفیت بہم پہنچانے کی قابل ہوگئی۔ اور یوں اب یہ سخنور آپ کی خدمت میں پانچ جلدوں میں پیش ہے۔ لیکن اب میں نے محسوس کیا ہے کہ میں نے اس کام کو یہاں تک پہنچا دیا ہے جہاں سے آگے ان چراغوں سے چراغ جلانے کا کام دوسروں کے لئے چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔

میں اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے آپ سے دعائے خیر کی طالب ہوں۔

یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء

Mrs. Sultana Meher,
2, Birchtrees Croft, Birmingham, B26 1EF, UK

باسمہٖ ربی

مہر عالم تاب... سلطانہ مہر

رشیدہ عیاں
نیو جرسی، امریکہ

انسانی فطرت میں کھوج اور تلاش ایک بنیادی صفت ہے۔ یہ خواہش انسان کی ترقی اور ترقی پسندی کی علامت ہے۔ روزِ ازل سے انسان کائنات کی وسعتوں میں اپنے زمانے، اور اپنے علم و کاوش کے دائرے میں نئی نئی قوتوں اور ظاہر و مخفی موجودات کی تلاش میں محو ہے۔ اس میں سائنس، طب، نجوم، کیمیا قسم کے ہزاروں علوم پر تحقیق ہوتی آئی ہے، ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اب اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ سلطانہ مہر کو خلاؤں، سیاروں یا زمین اور سمندروں کی تحقیق و تلاش کے بجائے تمام عالمِ ادب میں جگمگاتے تاروں اور علم و ادب کے میناروں کی تلاش و تحقیق نے تقریباً پینتیس (۳۵) برسوں سے مصروف رکھا ہوا ہے۔ ان کی اُن بے خواب راتوں کا حساب، جن کو انہوں نے سیارگانِ ادب تلاش کرنے، ان کے حالات و کوائف خیالات و ترجیحات کو قلم بند کرنے میں خود کو پور پور زخمی کیا ہے، کون دے سکتا ہے سوائے ان کی تحریر، تصنیفات و تالیفات اور متعدد تذکروں کے۔

میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ آیا سلطانہ مہر کے خاندان میں، والد، والدہ، بھائی بہن میں سے کوئی اشہبِ قلم کا شہسوار رہا ہے یا نہیں یا پھر اپنے خاندان میں میری طرح یہ بھی ایک بدعتی پیدا ہو گئیں۔ بھلے ہی گھرانے میں کوئی قلم کار رہا ہو نہ رہا ہو، لیکن ان کی تنہا ذات کا مینار کئی بلکہ ہزاروں بلند و

بالا میناروں سے زیادہ بلند و روشن، جھلک جھلک، مسکرا مسکرا کر بڑے خلوص و عجز و انکسار سے باتیں کرکے، اور محبت سے راگ الاپ کر تمام عالم ادب کے چراغوں کو، ایک ایک کو اس کی جگہ پر سجا کر دیوالی بنا رہا ہے۔ اور یہ دیوالی سلطانہ مہر کے قلم سے وجود میں آئی ہے۔

سلطانہ مہر سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ جس عرصہ میں ایک نوزائیدہ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ان کی محبت کا تعلق بھی پروان چڑھتا رہا ہے۔ ان سے میری ملاقات ''افکار'' کے دفتر میں دیے گئے ایک عصرانے میں ہوئی تھی۔ سادہ سادہ پرکشش شخصیت، نرم گفتگو نے دل موہ لیا۔ لیکن پھر بات یوں آئی گئی ہوگئی کہ میں اپنے شوہر شمیم حیدر کے ساتھ نیپال چلی گئی اور وہاں قیام اتنا طویل ہوا کہ تیرہ (۱۳) سال لگ گئے۔ تقریباً سات (۷) سال کے بعد جب میں تنہا کراچی آئی اور اپنے بہن بہنوئی کے یہاں مقیم رہی تو نہ جانے کیسے سلطانہ مہر کو خبر ہوگئی۔ اور ایک دن مقرر کرکے یہ ملاقات کے لئے آگئیں۔ وہی پیاری اور مخلص مسکراہٹ لبوں پر سجائے ایک انٹرویو لینے کی خواہش۔ میں نے کہا بھی کہ بھئی میں کیا اور میری شاعری کیا بس بچپن سے شعر گوئی کا شوق ہے اور بس۔ لیکن مہر کی آنکھیں یقین کی ایسی کرنیں بکھیر رہی تھیں کہ ان کے یقین پر یقین کرنا پڑا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔

میں واپس نیپال چلی گئی۔ اور پھر وہاں سے چھ (۶) سال کے بعد امریکہ آگئی۔ مہر نظم و نثر کے میدان مارتی رہیں اور میں اپنی شاعری کی پتنگیں اڑانے میں محو رہی۔ کبھی کبھار لاس اینجلس اور کبھی نیویارک، نیوجرسی کے مشاعروں میں مہر سے ملاقات ہوتی رہی۔

مہر کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ اتنی بڑی شخصیت ہوں گی۔ اکثر دیکھا ہے کہ جو ذرا عالم اور نامور ہو جائے وہ نگاہ جھکا کر بات نہیں کرتے، اپنے قد کے برابر دیکھتے ہیں سر جھکانا تو دور کی بات ہے۔ لیکن سلطانہ مہر کی یہی بڑائی مجھے اپنا اسیر کر گئی کہ مزاج میں تکبر نام کی کوئی رمق بھی نہیں ہے۔ نام جو مہر ہے مہر جو اتنا بلند اور روشن ہے لیکن اس کی کرنیں نیچے زمین پر ہی اترتی ہیں، زمین والوں پر نثار ہوتی ہیں۔ یہی انداز سلطانہ مہر کا دیکھا۔

بچپن میں پریوں اور دیو کی کہانیاں پڑھ کر، اور سن سن کر کچھ ایسا تاثر قائم ہو گیا تھا گویا ''دیو'' ایک مافوق الفطرت وجود ہے اور وہ جو کچھ کر سکتا ہے ایک عام آدمی وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ عام انسان سے زیادہ قوت اور اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ اور آج سرسوتی کا روپ دھارن کیئے ہوئے ایک دیوی ہے علم کی دیوی ہے۔ دھیان گیان کی دیوی ہے، جس نے اپنے قلم کی ایک جنبش، بلکہ قلم کی چھڑی کی مسلسل جنبش سے عالم ادب کے تمام شہزادوں شہزادیوں کو مسخر کر کے ایک قطار میں رکھ کر ''سخنور'' اور ''گفتنی'' کے چھ سات آسمانوں پر سجا دیا ہے۔ ایسے ایسے خوب صورت پیمانے تراشے ہیں کہ کوزہ گری کی لاج رکھ دی۔ اللہ اللہ ایک انسان سے اتنا کام عمل میں آجانا، جتنا کام ایک ادارے کے لئے دشوار ہو، عطائے ایزدی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، کسی طرح بھی خدا میں

یقین نہیں رکھتے۔ وہ لوگ اگر خدا کی ایک چھوٹی سی بے ضرر سی معصوم سی ہستی سلطانہ مہر کو وقت واحد میں اتنے کام کرتے دیکھ لیں اور سلیقے سے سنبھالتے رہنے کا انداز دیکھ لیں تو اللہ تبارک تعالیٰ کی بے پایاں قدرتوں، ندرتوں اور عطاؤں پر یقین لے آئیں گے۔

سلطانہ مہر نے جو کچھ کام ادبی حوالے سے ابھی تک کیا ہے یا کر رہی ہیں اس کا ذکر اور اعتراف اور تعریف تو بڑے بڑے اکابرین تحقیق و ادب ان کی کتابوں میں مختلف عنوانات سے کر چکے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ میں تو بہت غور و خوض کے بعد بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ

این سعادت بہ زور بازو نیست — تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

یقینا سلطانہ مہر کے ساتھ کوئی ایسی غیر مرئی یا روحانی قوت کام کر رہی ہے جس کا ادراک عام انسانی نظر کو نہیں ہو سکتا۔ جس سلیقے اور قرینے سے ''سخنور'' اور ''گفتنی'' میں شخصیت کے بیش بہا موتیوں کو ایک ادبی تعلق کی ڈور میں پرو دیا گیا ہے یہ ہنر مندی کی معراج ہے۔ یہ کام آج کل یا پھر اس صدی تک ہی محدود نہیں۔ یہ لازوال کام ہے۔ اور رہتی دنیا تک، اس وقت تک جب تک قرطاس و قلم باقی ہیں، پڑھنے والی آنکھیں، سمجھنے والے دماغ محسوس کرنے والے شعور باقی ہیں، سلطانہ مہر کے یہ کارنامے (تذکرے کہہ لیجیے) زندہ رہ کر آنے والے زمانوں میں تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

مجھے یہ فخر ہے کہ ہم خواتین میں کوئی شخصیت ایسی بھی ہے جس نے تمام خواتین کا، اور خصوصاً ان خواتین کا جو قلم سے وابستہ ہیں، سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ مسلسل محنت اور شب و روز کی عرق ریزی کے باوجود آپ سلطانہ کو ست، چڑچڑا یا بے زار نہیں پائیں گے۔ سلطانہ مہر کے جن کاموں کو سن کر ہی کچھ لوگوں کو تھکن ہو جاتی ہے لیکن ان ہی شب و روز کے مسلسل کاموں سے بھی سلطانہ مہر کو تھکان نام کی کوئی چیز پریشان نہیں کرتی اور وہ اسی طرح مطمئن، پرسکون اور خوش مزاج نظر آتی ہیں۔ یہ شخصیت میں زبردست توازن کی علامت ہے۔

سلطانہ مہر کے خیر سے تین بیٹے اور پوتا پوتی بھی ہیں اور یقیناً یہ مجسم مہر و محبت انہیں کچھ نہ کچھ وقت بھی دیتی ہوں گی اور پھر اس کے باوجود تذکرہ نویسی کی مصروفیات بھی ہوں گی۔ آخر یہ خاتون کس مٹی کی بنی ہوئی ہے حیرت ہوتی ہے۔

ہماری ادبی تاریخ میں ایک دو تذکرے تھوڑا ہی ہیں۔ بڑے بڑے قدآور تذکرہ نویس گزرے ہیں۔ ہندو پاک میں بھی اور غیر ممالک میں بھی تذکرہ نگار خواتین میں بمشکل چند نام نظر آتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم اور سیدہ جعفر کے نام تحقیقی کتابوں میں نمایاں ہیں۔ لیکن پاکستان میں ''غزل نما'' کی حد تک صرف ادا جعفری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو سلطانہ مہر کے سوا دور دور تک کسی خاتون کا نام نہیں۔ علاوہ ازیں سلطانہ مہر کے تذکروں کی جو اہمیت اور افادیت ہے وہ آج بھی تسلیم کی جا رہی ہے اور آنے والے زمانے میں اس کا مقام اور بلند ہوگا۔ یہ کوئی معمولی تذکرے نہیں ہیں، وقت آئے گا کہ یہ سند کے طور پر تسلیم کیے جائیں گے۔

ہمارے یہاں ادب میں بھی کچھ تنگ دلی یا طرف داری کا عمل دخل بہت ہوگیا ہے ورنہ ابھی تک تو سلطانہ مہر کو پی ایچ ڈی (Ph D) کی ڈگری مل چکی ہوتی۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ عام طور پر مشاعروں میں بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات اچھے شعرا کے مقابلے میں کمزور کلام والے شعرا زیادہ "داد" سمیٹ لے جاتے ہیں۔ گویا اس دور میں تو اب "داد" بھی معتبر نہیں رہی۔ یہ دنیا تو ایک بازار ہے جہاں کوئی اپنی گدڑی میں لعل آب دار چھپائے بیٹھا ہے وہیں کوئی اور نقلی پتھروں کو سجائے آوازیں لگا رہا ہے۔ مرجع خلائق و عام بنا ہوا ہے اور سنگ ناتراشیدہ فروخت ہو رہے ہیں۔ ہیروں کی پہچان کسے ہے کہ دام لگائے۔

سلطانہ مہر کی تو یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ بغیر آواز لگائے ان کے ہیروں کی دور دور تک چھوٹ پڑ رہی ہے*۔ دراصل جادو تو وہ ہی ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

میں صوفی طبقے سے متعلق ہوں جہاں پہلی منزل پر ہی کبر و انا، حسد، دل آزاری، خود پسندی جیسے امراض کا قلع قمع کر دیا جاتا ہے۔ اس تربیت میں مشقت بہت ہے لیکن نفسِ مطمئنہ کے حصول کے بعد پریشانی، بے قراری، بے اطمینانی زائل ہو کر ایک سکون و اطمینان اور روحانی طمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مجھے آج تک کسی کی دولت و ثروت، حسن و وجاہت وغیرہ پر کبھی رشک نہیں ہوا، حسد تو کجا، تلاشِ بسیار کے ملا بھی تو تھوڑا سا محبت بھرا، اور فخر کے ساتھ رشک ملا جو سلطانہ مہر کی بے تکان قدرتِ تحریر پر ہے۔ یہ میری آئیڈیل (ideal) خاتون ہیں۔ ان سے محبت اور دوستی کا خانہ الگ لیکن دنیائے ادب کے لئے ان کی بے مثل خدمات اور بے نظیر تخلیقات نے بڑوں بڑوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ کام پہلے نہیں ہوا۔ بڑے بڑے محقق اور عالم گزرے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے علم و ادب اور تحقیق و تدقیق کے بڑے بڑے ذخیرے چھوڑے ہیں۔ آج کے دور میں بھی ایسی شخصیات ہیں مگر کم کم ہیں۔ اس مشینی دور میں اتنے تحمل، وقار اور لگن کے ساتھ ادبی تحقیق اور تالیفی کام کر کے سلطانہ مہر نے ایک مثال قائم کی ہے۔ سلطانہ مہر نے چھ (٦) تذکرے مکمل کر لیے ہیں جب ایک ساتواں اور مکمل کر لیں گی تو یہ "بنات النعش" گردوں کی طرح آسمانِ ادب پر جگمگائیں گے اور تحقیق کی روشنی سارا عالم دیکھے گا۔

آفریں صد آفریں سلطانہ مہر!

تم آسمانِ ادب کا وہ سورج ہو جو کبھی نہ گہنائے گا۔ انشاءاللہ۔

۲۴/ اکتوبر ۲۰۰۲ء

نیو جرسی، امریکہ

---

* چھوٹ پڑنا (اردو محاورہ) کسی چیز کا عکس پڑنا

ہے یہ کوئی معرکہ ضرور

شکیل عادل زادہ
کراچی، پاکستان

مجھے احساس ہے کہ آج کی تقریب دل پذیر میں مجھ سے پہلے جو تلقین کی گئی ہے اور میرے بعد جو نقش کیا جائے گا وہ سارا ایک جیسا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نیا نہیں ہے۔ اور جب نیا کچھ نہ ہو تو نیا کچھ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

آج سے کوئی چار ماہ پہلے یہ خراباتی ایک سہ پہری بے خبری میں سویا پڑا تھا کہ کسی نے حجرۂ خلوتیاں پر اس اعتماد سے دستکیں دینی شروع کیں کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو سراسیمہ ہو جاتا۔ دستکی نے جواب کا انتظار کیا۔ اپنی اس عادت خبیثہ کی میں برسوں سے پرورش کر رہا ہوں۔ جانے کس طرح وقت بچا کے، چرا کے، کسی فریضے کی طرح اچھے، برے موسموں میں اسے جاری رکھے ہوئے ہوں۔ کسی دن کوئی حادثاتی قسم کی رکاوٹ پیش آجاتی ہے تو ساری شام اور رات ایک عجیب بے کیفی و بے دلی رہتی ہے۔ دروازہ کھولا، سامنے ایک خاتون تھیں وہ بھی سلطانہ مہر، ایک ممتاز ادیبہ، شاعرہ اور صحافی۔ پردیس سے آمد کا امتیاز مستزاد تھا اور پردیس بھی کون سا، سات سمندر پار امریکۂ عظیم، معاذ اللہ بعد از خدا اُس کی پناہ۔ سلطانہ مہر کے جوش اور جذبے کا وہی عالم تھا جیسے ان پر کوئی وقت نہ گزرا ہو۔ سچ ہے عمر تو اداروں کی ہوتی ہے، دہکتی آواز میں کہنے لگیں... ”میں اب آپ کو سونے نہیں دوں گی۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ کام ہے“۔

گزشتہ چار ماہ سے وہ اس ناتواں کے دفتر میں تقریباً قیام فرما رہی ہیں۔ یہاں تمام لاؤلشکر کے باوجود سال بھر میں سات سو (۷۰۰) صفحات کا ایک رسالہ نہیں نکلتا۔ انہوں نے اس عرصے میں پانچ سو چھ سو صفحات کی تین ضخیم کتابوں کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ یا عیب جوئی، پیسٹنگ، طباعت اور جزبندی تمام کی۔ آج یہ تینوں کتابیں آپ کے سامنے ہیں۔ وہ صبح پابندی سے دفتر آتی ہیں اور سر جھکائے کام کرتی رہتی ہیں۔ ہم حیرتیاں دیکھتے رہتے، سیدہ کام کرتی رہتیں۔ انہیں صبح و شام دفتر میں برپا ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے اجتماع سے ایک رسمی اخلاقی سی غرض تھی۔ سلام ودعا کے بعد وہ اپنی راہ لیتیں اور کمپوزنگ والے کمرے میں مقید ہو کے مسودوں پر قلم زنی کرتی رہتیں۔

ابھی چند دن ہوئے، میں نے دفتر میں موجود ایک صاحب قلم نوجوان سے کہا ... "دیکھو اس طرح کام ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر میں کس درجے کی قوت کار ہے۔ 'سخنور' سلسلے کی تین کتابیں پہلے آچکی ہیں، اب چوتھا حصہ آرہا ہے اور نثر نگاروں کا ایک مبسوط اور جامع تذکرہ 'گفتنی' بھی"۔ نوجوان کی جبیں شکنوں سے پُر ہوئی، بے نیازانہ کہا... "ایسی کتابیں تو روز ترتیب دی جاسکتی ہیں"۔ میں نے عرض کی... "مگر دی جاتی نہیں۔ ضرورت پڑے ہم ایسی کتاب ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اردو میں شاذ و نادر ہی کسی نے ایسا کام کیا ہے، اس سلیقے اور نظم سے تو بہت کم"۔ پھر میں نے احتجاجاً کہا کہ یہ ایسا کام نہیں جسے سر کی ایک جنبشِ خفی سے درگزر کردیا جائے۔ یہ تو اپنی نوعیت میں انسائیکلوپیڈیا والا کام ہے۔ یہ کتابیں آگے جا کے بہ طور حوالہ کام آئیں گی۔ یہ ایک سربسر تحقیقی کام ہے۔ ان سے ہم عصر لکھنے والوں کے حال احوال، ان کی ریاضت اور فکر کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر نے فکر انگیز سوال اُٹھائے ہیں اور طرح طرح سے کسی شخصیت کے خدوخال، قامت وقد اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سی جگہوں پر اُن کی تمہیدی تعارفی سطور خاصی وقیع اور دل نشیں ہیں۔ اتنے بہت سے تخلیق کاروں کے کوائف جمع کرنا، ان کے لئے دور دراز مقامات کے دورے کرنا، خط و کتابت کرنا اور جمع کی ہوئی چیزوں کی ترتیب و تشکیل ایسا کام نہیں جو کسی چُست و مستعد افسر کے بس کا ہو۔ اس کے لئے ایک علمی و شعری و ادبی پس منظر چاہیئے۔ کام کرنے والے کو شعروادب کی ایک خاص آگہی کی ضرورت ہے۔ سلطانہ مہر نے قلم کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں اور بے شمار گواہ ہیں۔ قلم کے مسئلے کے سوا اُن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بہ تمام و کمال ایک خانہ دار خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے گھر، اپنے بچوں سے ذراسی بھی غفلت نہیں برتی۔ اپنے بچوں کے لئے انہوں نے ایک بہترین زندگی کے سامان فراہم کیئے۔ ادھر اُدھر کی ناگہانیوں، خانگی اُلجھنوں کے باوجود قلم سے ان کا تعلق کسی عشق کی طرح برقرار رہا۔ وہ امریکہ چلی گئیں۔ وہاں کی رنگارنگی میں بھی اُن کا مسئلہ ادب و شعر میں ہی رہا۔ وہ وہاں یا تو مطالعہ کرتی ہیں، شعر کہتی ہیں، افسانے لکھتی ہیں، ناول لکھتی ہیں یا اپنی نئی کتاب کے لئے فون، فیکس اور خط کے ذریعے برصغیر ہند کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔ یوں ایک کتاب تیار ہوجاتی ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت ہے۔ تمام ادب تخلیق نہیں ہے اور ادب کا کام محض تخلیق کاری نہیں ہوتا۔ ادب کی ترویج و توسیع، ذوق و شوق کی نمود کے لئے کچھ کام بھی ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت کبھی کبھی خالص ادب سے بیش ہوتی ہیں۔

میں واضح کردوں، میں کوئی ادیب وشاعر نہیں، صحافیوں میں حکومت پاکستان اپنا شمار نہیں کرتی۔ صحافی اس کی تعبیر وتشریح کے مطابق صرف اخباروں اور ہفت روزوں کے ہوتے ہیں۔ بہرحال ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہوئے چالیس سال سے اُوپر ہو رہے ہیں۔ ایک بات بہت آزردہ کرتی ہے، اپنے معزز ومحترم قلم کاروں کے ہاں یگانگت کی کیوں ایسی کمی ہوتی ہے۔ کوئی کشاکش وکش مکش اُن کے مابین اس قدر شدومد سے کیوں روا رہتی ہے۔ خدا گواہ ہے، غیاب میں بھی ایک دوسرے کے متعلق ایسے شدید بیانات سے واسطہ پڑا ہے کہ اپنی سماعت پر شبہ ہوتا ہے۔ تخلیق کار چھوٹا بڑا، اہم غیر اہم اپنی تخلیق سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کی جستجو شاید یہی رہتی ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ نثری اور شعری نمونہ پیش کرے۔ اس تگ ودو میں وہ کبھی کامیاب رہتا ہے، کبھی ناکام۔ کسی سے نیت اور ارادے کے صدق کے باوجود اچھا شعر سرزد نہیں ہو پا رہا ہے، اچھی تحریر نہیں ڈھل رہی تو وہ حرماں نصیب ایسا کہاں کا موردِ عتاب ٹھہرا۔ جہاں کہیں بھی، جو کچھ بھی، جس سطح پر کہا جا رہا ہے، اُس کی ایک پزیرائی لازم ہے، چاہے وہ سید امروہوی ہوں یا محسن احسان۔ میں نے عجب عجب منظر دیکھے ہیں۔ دُشنام، بہتان، دل آزاریاں، باقاعدہ سازشیں، یہ چشمک اور رقابت سے کہیں زیادہ معاملہ ہے۔ یہاں تو ادب وشعر سے متعلق قریباً تمام اہل ہنر میں بیش وکم اپنے ہم قبیلاں، ہم پیشگاں سے کدورت اور عداوت عام ہے۔ کم تر کہنے والا ایسا قابل نفریں نہیں ہوتا۔ تمام تخلیق کار ایک معیار کا ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ جو آج کچھ برتر کہنے میں عاجز نظر آرہا ہے آنے والا کل اُس کے ساتھ مہربان ہو سکتا ہے اور آنے والا کل مہربان نہ بھی ہو اس نے تو بہ قدرِ توفیق کام تو لفظوں کا، خوابوں کا اور تعبیروں کا کیا ہے۔ واسطہ تو اُس کا قلم سے رہا ہے۔ اُس کی شمولیت کی داد تو ملنی چاہیئے۔ یوں ہی کارواں بڑھتے ہیں۔ کل کے پاس آج کے ذرائع ابلاغ اور تعلق عامہ کا سیاق وسباق نہیں ہوتا۔ اُس کا پیمانہ دوسرا ہوتا ہے اور واضح رہے ہر آنے والا کل، گزرے ہوئے کل سے مختلف ہوتا ہے۔ آنے والا کل صفیں کاٹ دیتا ہے اور پاتال سے موتی نکال لیتا ہے۔

بات تفصیل طلب ہے اور یہاں اس کا محل نہیں۔ سلطانہ مہر کی یہ کتابیں بے شک تخلیق کا کارنامہ نہیں۔ اس کا انہوں نے دعویٰ بھی کہاں کیا ہے۔ پر ہے کوئی نہ کوئی معرکہ ضرور ہے سلطانہ مہر کا۔ تخلیقی کام الگ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اچھے شعر کہتی ہیں، اچھے افسانے لکھتی ہیں۔ انہوں نے قابل ذکر ناول لکھے ہیں۔ انہوں نے صحافت میں نام پیدا کیا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے تذکروں پر مشتمل ان کتابوں کی اپنی جگہ ایک الگ حیثیت ہے۔ جو کام اور نہیں کر سکے، وہ دور دیس بیٹھی ہوئی ایک خانہ نشین خاتون نے کیا ہے اور یہ آج کا نہیں کل کا کام ہے۔ کل اس کی قدر وقیمت دوچند ہو جائے گی۔ میں ایک عامی، سلطانہ مہر صاحبہ کا مداح، انہیں یقین دلاتا ہوں اور میری التجا ہے کہ وہ اپنا یہ نہایت محترم و موقر سلسلہ جاری رکھیں۔

میں نے عرض کیا تھا، میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نیا نہیں ہے۔ میں نے سلطانہ مہر صاحبہ سے بھی گزارش کی تھی۔ انہوں نے مروت کی۔ مجھ سے یہ بھی نہیں ہو رہا، مجھ سے یہ بھی نہ ہوا۔ وما علینا الا البلاغ۔

نوٹ: یہ مضمون "سخنور اول (طبع سوم)، سخنور چہارم اور گفتنی اول" کی تعارفی تقریب کے موقع پر کراچی میں ۳۰/مئی ۲۰۰۰ء کو پڑھا گیا۔

باسمِ ربّی

اردو کی ایک درخشاں علامت... سلطانہ مہر

محمود ہاشمی
برمنگھم، انگلینڈ

سلطانہ مہر ادیب ہیں اور صحافی بھی۔ اُن میں ادیب کا تخیلِ خلاقی اور بصیرت ہے اور صحافی کی تیز نظر اور عجلت پسندی بھی۔ اُن کا کمال یہ ہے اُنہوں نے اپنی ان دونوں صلاحیتوں کو اپنی شخصیت میں کچھ اس طرح سمویا ہے کہ اُن کی ساری کارگزاری سے ایک قلیل مدت میں اردو ادب مالا مال ہوگیا ہے۔ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اُسے اپنے ادیبوں کی برادری اور صحافیوں کے قبیلے سے ایک سلطانہ مہر مل گئی، جو ادب کی ترازو تھامے، ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اردو ادیبوں اور شاعروں پر نگاہیں جمائے، صحافیانہ تیز رفتاری سے "سخنور" اور "گفتنی" جیسے تذکرے لکھ رہی ہیں۔ سلطانہ مہر کی اپنی شاعری اور افسانوں کے مجموعوں سے قطع نظر اگر صرف اُن کتابوں کے صفحات ہی کا شمار کیا جائے، جو انہوں نے تذکروں کے سلسلے میں لکھی ہیں، تو ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں۔

یہ کام ایسا ہے جو اپنی اس دوروزہ حیاتِ فانی میں کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا تھا جو محض ادیب ہوتا یا محض صحافی۔ یہ کام صرف سلطانہ مہر ہی کر سکتی تھیں اور بطریقِ احسن کر رہی ہیں۔ خدا اُن کی عمر دراز کرے۔ وہ نثر نگار اور شاعر جن کا ذکر سخنور یا گفتنی میں اب تک نہیں آیا، اُمید بھری نظروں سے اُن کی جانب دیکھ رہے ہیں اور اردو کے متوالے اس امر پر نازاں ہیں کہ اردو کی مناسبت سے اُن کا رشتہ سلطانہ مہر جیسی شخصیت سے ہے، جو اُن کی اردو کی ایک درخشاں علامت ہیں اور تابندہ حوالہ ہیں۔

۲۵/ جنوری ۲۰۰۱ء
برمنگھم، انگلستان

Mr. Mahmood Hashmi,
44 Hob Moor Road, Small Heath, Birmingham, B10 9BU, UK

باسم ربّی

سُلطاناؤں سے سُلطانہ مہر تک

کرامت غوری

ٹورنٹو، کنیڈا

سلطانہ مہر اپنے نام کی مناسبت اور عرفیت سے مرقعِ کمالات ہیں۔

سلطان، سلطانہ، سلطانی یہ سب جاہ وجلال والے نام ہیں اور سلطانہ مہر میں جاہ وجلال ہے۔ یہ جس محفل میں ہوتی ہیں حاضرین ان کی موجودگی سے بے خبر نہیں رہتے۔ ان کو محفل گدازی کا فن بھی آتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے کسی سلطانہ کو دربار آرائی میں درک اور دسترس حاصل ہوتی ہے اور جب تک وہ دربار میں رہتی ہے اس پر چھائی رہتی ہے۔ ایسے ہی سلطانہ مہر جس محفل میں ہوتی ہیں اس کی جان بن جاتی ہیں، اس پر چھا جاتی ہیں۔

لیکن دیگر سلطانائیں عام طور سے جلال تو رکھتی ہیں مگر جمال سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

وہ سب جنہیں تاریخ کا شعور ہے جانتے ہیں کہ قلوپطرہ جو اپنے دور میں سلطانہ عالم تھی اس کے ہاتھوں اس کے چاہنے والوں کا کیا حشر ہوتا تھا۔ اس کا حسن انہیں ناگن کی طرح ڈستا تھا اور پٹاری کا سانپ انہیں عالمِ بالا کی طرف روانہ کر دیتا تھا۔

انگلستان کی معروف عالم ملکہ الزبتھ اول کی، جو ہمارے اکبر اعظم کی ہمعصر تھیں، ساکھ بھی قلوپطرہ سے کم نہیں تھی۔ ان میں صرف جلال تھا جمال کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اپنے چاہنے والوں کو وہ

ٹاور آف لندن کی سیلن کے سپرد کر دیتی تھیں یا پھر ان کے سروں کو نیزے کی نوک پر آویزاں کر دیا کرتی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کی ملکہ میری کا جو حشر ان کے ہاتھوں ہوا وہ تاج برطانیہ پر آج تک داغ ہے۔

اپنی ملکہ رضیہ سلطانہ بھی مہر و محبت سے زیادہ اپنے جاہ و جلال اور تمکنت تاج و تخت کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔

ہاں ایک ملکہ نور جہاں ایسی تھیں جس میں جلال و جمال کی گنگا جمنی آمیزش نے وہ مرقع آفاقی پیدا کیا تھا جس کے سامنے پورا ہندوستان جھکتا تھا۔ لیکن کوئی تاریخ سے پوچھے کہ اگر اکبر اعظم کے لاڈلے شیخو نے نور الدین شہنشاہ جہانگیر بن جانے کے بعد ایک پیالہ شراب اور دو پاؤ پارچہ لحم کے عوض ہندوستان کا تاج و تخت نور جہاں کو نہ بیچا ہوتا تو کیا تاریخ ملکۂ عالم نور جہاں کو ایسے ہی یاد کرتی جیسے آج تک کرتی آئی ہے۔

اور ہاں ایک سلطانہ وہ بھی تھی، ارجمند بانو ممتاز محل جس کے حسن وفا نے شاہجہاں کو بے دام خرید لیا تھا کہ ممنون احسان شہنشاہ نے اپنے اعتراف و احترام کے ثبوت میں دنیا کی حسین ترین عمارت تعمیر کروائی اور اُسے رہتی دنیا تک کے لئے ممتاز محل کے نام سے جوڑ دیا۔

سلطانہ مہر کو کسی تاج محل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ان کے ارادت مند تو اپنے دلوں میں کب سے ان کے لئے عقیدت و احترام کے شیش محل سجائے بیٹھے ہیں۔

لیکن ایک اعتبار سے سلطانہ مہر صفات سلطانی سے قطعاً محروم ہیں۔ وہ یوں کہ ان کی پوری زندگی سلطانیٔ وقت کے حدود اور قیود کے خلاف بغاوت میں گزر گئی ہے۔ کیسا عجب تضاد ہے ایک سلطانہ اور باغی۔ مہر و محبت کے گیت بُننے اور گانے والی اپنے عمل میں آج تک زمانے سے ستیزہ کار اور آمادۂ پیکار رہی ہے۔

سلطانہ مہر کی شخصیت کا یہ پہلو بہت کم لوگوں پر آشکارا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر سماج کے مروجہ اصولوں، ضابطوں اور پیمانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور یلغار و غا کرنے میں صرف کی ہے۔

ایک لڑکی جو ایک کٹر قسم کے قدامت پسند گھرانے میں آنکھ کھولے اور پھر جوان ہو کر اس کے نیم کو ماننے سے انکار کر دے باغی نہیں کہلائے گی تو اور کیا؟ ایک لڑکی جس کی مادری زبان سب کچھ ہو اردو نہ ہو، وہ ہوش سنبھالنے اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی اردو میں کہانیاں لکھنا شروع کر دے اور اس میں اتنی کار بند رہے کہ گھر والوں کی مخالفت سے بچنے کے لئے اپنا نام ہی تبدیل کر لے تو اُس میں بغاوت کی پوری فوج ظفر موج پل رہی ہوگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سماج اور معاشرے کے ریت رواج برسوں پہلے بلکہ صدیوں پہلے سے عورت کی آزادی کو مذہب اور نہ جانے کیا کیا کچھ کے نام پر سلب کرتے آئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

سلطانہ مہر نے اسی تسلط اور زیادتی کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اپنی ذات کو زادِ سفر بنا کر اپنے قلم کو راہوار کا رتبہ دے کر انہوں نے نہ صرف اپنی ذات کی نفی نہیں ہونے دی بلکہ اپنی جیسی اور ہزاروں لاکھوں

دکھی عورتوں کی رہنمائی بھی کی ہے۔ انہیں اندھیری راہ پر چلتے ہوئے روشنی کا رزق دیا ہے۔ ان کی جدو جہد کو ایک جہت، ایک راستہ ایک منزل فراہم کی ہے۔

یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ یہ جو ایک عمر سلطانہ مہر نے مہر سے، ماہ سے ستاروں سے روشنی طبع پا کر اور انجام سے بے پرواہ ہو کر ذات سے، سماج سے، حالات سے کھلی جنگ کی ہے کیا یہ واقعی ضروری تھی؟ وہ یہ ہی سب کچھ کرنا چاہتی تھیں یا یہ اس ناہموار معاشرے کی دین ہے جو اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے اندھا دھند لاٹھی چلا رہا ہے اور جو اس کی زد میں آجائے اُسے بسمل کیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

میں جو چالیس (۴۰) برس سے سلطانہ مہر کو جانتا ہوں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ اس پلیٹ فارم سے آپ سب کی قوت سماعت کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ اعلان کرتا ہوں کہ... نہیں، ہرگز نہیں، انہوں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ اس راہ پُر خار اور پُر خطر پر چل نکلیں جس کے انجام سے آج سے چار (۴) دہائیاں پہلے وہ قطعاً واقف و آشنا نہیں تھیں۔

انہوں نے تو ہر اس لڑکی کی طرح جو شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد سے ایک چھوٹے سے سجیلے گھر اور خوشی اور سکون سے معمور، محفوظ آنگن کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے، اپنے لئے ایک کُنج غیر آشوب کی تمنا کی تھی۔ لیکن جب زمانے کی ناہمواریوں نے ان کے رنگ محل سے رنگ چرانے شروع کئے اور بے مہر سورج نے سوا نیزے پر آ کر ان کے رنگ بکھیرنے کا عمل آغاز کیا تو انہوں نے ہتھیار ڈالنے اور اندھیروں میں نہ چھپنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ اگر زمانہ بے مہر ہے تو کیا ہوا وہ اپنا سورج خود اُجالیں گی اور اس کی روشنی میں اپنے راستے اپنی منزل کا خود تعین کریں گی۔ سو وہ اس شعر کی تفسیر بن گئیں۔

یہ مہر تاباں سے جا کے کہہ دو کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

سو آج تک وہ اردو شعر و نثر سوانح نگاری اور تاریخ سازی کے صحرائے بے آب میں مدر ٹریسا بنی ہوئی ہیں اور سرابوں سے بچتی ہوئی خود نئے نئے نخلستان تلاش کیئے جا رہی ہیں جن کے چشموں سے شائقین ادب و فن کی پیاس بجھے۔ رضیہ سلطانہ کی طرح یہ میدان مارتے ہوئے انہوں نے کسی غیاث الدین بلبن یا ملک کافور کا سہارا نہیں لیا۔ ہر دریا اپنے عزم کے پتوار سے پار کیا اور ہر دشت کو اپنی ذات کے رہوار سے عبور کیا۔ یہ ایک سوفی صد خود ساختہ یا سلف میڈ (self made) مجاہدہ ہیں جنہوں نے اپنی جنگ کا ہر قاعدہ خود وضع کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اس عہد کی خواتین کے لئے رول ماڈل (role model) ہیں۔

۱۷/ اگست ۲۰۰۲ء
ٹورنٹو، کنیڈا

نوٹ: یہ مضمون، شاہد ہاشمی صدر "کین پاک چیمبرز" کی جانب سے دی گئی تقریب "در قدر افزائی خدمات ادبی سلطانہ مہر" و ہدیہ حاصل حیات (لائف اچیومنٹ ایوارڈ Life Achievemnt Award)" پیش کرنے کے موقعہ پر پڑھا گیا۔

درقدر افزائی خدمات سلطانہ مہر

رئیس امروہوی مرحوم

سلطانہ مہر زلف صحافت کی ہیں اسیر
ہے اُن کا "روپ" اُن کے سبب سے مہِ منیر

جو صاحب قلم ہے وہ اُن کے قریب ہے
بے مثل اُن کی شان ہے، اخلاص بے نظیر

اصناف شاعری سے بھی اُن کو لگاؤ ہے
اُن کی نظر میں کوئی بھی شاعر نہیں حقیر

ممتاز علم و فن میں ہے اُن کا خانداں
اپنی حدوں میں دیکھئے جس کو وہ ہے شہیر

اُن کے ہر اک عمل میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے
ہے بوریا عزیز تو ٹھوکر میں ہے سریر

وہ چاہتی ہیں دہر میں جینے کا حق ملے
وہ ہے امیر اُن کی نظر میں جو ہے فقیر

ہم بھی رئیسؔ ان کی لگن کے ہیں قدر داں
تاباں ہے اُن کے نوکِ قلم کی ہر اک لکیر

۲۲/ستمبر ۱۹۸۸
کراچی۔ پاکستان

نوٹ: یہ نظم رئیس امروہوی مرحوم نے ماہنامہ "روپ" کی اڈیٹر یعنی سلطانہ مہر کی خدمات کی قدر افزائی کے لئے محمود حسن صاحب کو املا کرائی تھی۔ محمود حسن صاحب کے کہنے کے مطابق رئیس صاحب کے یہ اشعار ان کے آخری اشعار ہیں جو انہوں نے ڈائری لکھواتے وقت ان کے ہاتھ سے لکھوائے تھے۔ سلطانہ مہر

۲۷/مارچ ۱۹۹۸ء

تعارف... سُخنور

جوہر غوری

کیلی فورنیا، امریکہ

کن لفظوں میں تعریف کروں کیا ہے سخنور
اردوئے معلی کا خزانہ ہے سخنور
جس طرح گُلِ تازہ کھلیں صحنِ چمن میں
اس طرح کا اک مجموعۂ شعرا ہے سخنور
وہ جن کو سروکار نہیں علم و ادب سے
اُن کے لئے اک دیدۂ بینا ہے سخنور
سلطانہ مہر کی کد و کاوش کا نتیجہ
اُس کے لئے قدرت کا کرشمہ ہے سخنور
اک عکسِ دلآویز ہے تاریخِ ادب کا
اردو کا درخشندہ ستارہ ہے سخنور
شعرائے جدید اور قدیم ہوگئے مربوط
ہر ایک کا عکاسِ نظر یہ ہے سخنور
صرف اس میں محبت کے فسانے ہی نہیں ہیں
ہر دورِ سیاست کا مرقعہ ہے سخنور
ہر ورق میں پوشیدہ ہے اک بحرِ معانی
ظاہر میں تو معمولی سا قطرہ ہے سخنور
کیا طرزِ تکلم ہے ترنم ہے نہ پوچھو
ہنستا ہوا، گاتا ہوا دریا ہے سخنور
کچھ شعرائے مخصوص کا نقاشِ تعارف
اُن کے رُخِ پُرنور کا جلوہ ہے سخنور
امریکہ و یورپ میں بھی اردو کی رسائی
تشہیر کا اعلیٰ تریں ذریعہ ہے سخنور
ایامِ ضعیفی کے لئے شغلِ دل آویز
دردِ غمِ فرقت کا مسیحا ہے سخنور
اس میں کئی شعرائے گرامی کا نہیں ذکر
ان سب کے لئے وعدۂ فردا ہے سخنور

جوہر میں رکھوں گا اسے سینہ سے لگاکر
میرے لئے اک بے بہا تحفہ ہے سخنور

۲۳/ جولائی ۱۹۹۶ء

منظوم خراجِ عقیدت

سخنور دوم کی تقریب اجرا کے موقع پر

راغبؔ مرادآبادی

کراچی، پاکستان

سلطانہ مہرؔ خدمتِ فن سے ہیں بہرہ یاب
شائع جو ہو چکا ہے ''سخنور'' کے نام سے
اور ''حرفِ معتبر'' کہ ہے جس میں کلامِ مہر
جلوہ فگن ہے مہر جو نصف النہار پر
توفیق اسی نے دی، یہ قلم کار بن گئیں
وابستہ رہ چکی ہیں یہ اخبارِ جنگ سے
مُلکِ سخن کی یہ ملکہ ہیں بفضلِ رب
بے حد ہے کامیاب، یہ تقریب دل نواز
کی نام رب ہے قدیہ اکبر نے ابتدا
فرمایا یہ بھی، مہر سے میرے تعلقات
نقاشِ کاظمی، جو مقرر تھے اولیں

اس کا ثبوت ہے، شعرا کا وہ انتخاب
پائی ہے جس نے داد، خاص و عام سے
اُس نے تو کر دیا متعین مقامِ مہر
نازاں ہے مہر، رحمتِ پروردگار پر
قصرِ ادب کی، دولتِ بیدار بن گئیں
گزریں بخیر، رہ گزرِ خشت و سنگ سے
اس سے بڑا تو کوئی شرف ہی نہیں ہے اب
اس پر ہے، سامعینِ گرامی، مجھے بھی ناز
سلطانہ مہر کے لئے کلمہ، خیر کا کہا
اک عمر سے ہیں اور رہیں گے یہ تا حیات
سلطانہ مہر سے متاثر ہیں، بالیقیں

ڈالی اُنہوں نے خوب ''سخنور'' پہ روشنی
اور حرفِ معتبر کی بھی تعریف دل سے کی

خوشیِ بخت کی نظامتِ دل کش ہے بے مثال
تقلید ان کی کوئی کرے کیا کس کی ہے مجال

فہمیدہ[۱] نے بتائی ہیں کچھ مہر کی صفات
قرطاس کے سپرد یہ کرتی ہیں دل کی بات

جو خوبیاں بیان حمایت علی[۲] نے کیں
حصے میں مہر ہی کے وہ آئی ہیں بالیقیں

شاعر[۲] کا جو مقدمہ ہے شامل کتاب
اُس کا مطالعہ بھی کریں غور سے جناب

فرمانِ فتح پور کا روشن ہے جن سے نام
سلطانہ مہر کے ہیں یہ مداح، لا کلام

امریکہ میں قیام ہے جن کا وہ شاعرات
رکھتی ہیں مختلف ہی کچھ اپنی وہ لفظیات

سلطانہ مہر کی ہے یہی انفرادیت
ہر تذکرے میں ہے شعرا کی چلت پھرت

تقریب جس کے حضرتِ عالی[۳] ہیں آج صدر
حلقے میں ہیں نجومِ ادب کے مثالِ بدر

فرمایا، مہر کا کوئی نعم البدل نہیں
یہ تذکرہ نگار ہیں، خاتونِ اولیں

ارشاد ہے یہ حضرتِ عالی[۳] کا حق مزاج
سلطانہ مہر کا کوئی ثانی نہیں ہے آج

امریکہ میں مقیم یہ اب ہیں، تو کیا ہوا
محکم ہے دل پہ نقش ہنوز ارضِ پاک کا

راغب! ہوں کامیاب مقاصد جہاں رہیں
برسوں یہاں قیام رہا، اب وہاں رہیں

(۱) فہمیدہ ریاض ۔ (۲) حمایت علی شاعر ۔ (۳) جمیل الدین عالی

نوٹ: ۲۳/ جولائی ۱۹۹۶ء کو یہ نظم تقریب اجرا سخنور دوم، کراچی، میں محترم راغب مرادآبادی صاحب نے پڑھی تھی۔

میدانِ ہنروری

نقاش کاظمی

کراچی، پاکستان

ایسے اہلِ قلم بہت کم نظر آتے ہیں جن میں نظم و نثر لکھنے کی صلاحیتیں یکساں طور پر موجود ہیں۔ لیکن جدید عہد میں چند اس نوع کے ادیبوں اور شاعروں کے نام بہ آسانی لیئے جاسکتے ہیں جن کو غزل و نظم یا نظم و نثر پر ایک جیسی قدرت بھی حاصل ہو۔ اس طرح کے چند لکھنے والوں میں ہم سلطانہ مہر کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔

سلطانہ مہر ایک جانب تو اقلیم ادب و فن کی سلطانہ ہیں اور دوسری طرف صحافت کی مہر منور، گویا اسم بامسمی۔ اب تک سلطانہ مہر کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ چار ناولیں، افسانوں کے تین مجموعے، اقبال دورِ جدید کی آواز، ساحر کا فن و شخصیت، سخنور حصہ اول، دوئم، سوم اور چہارم اور تازہ تصنیف نثر نگاروں کا تذکرہ ''گفتنی اول اور مجموعۂ کلام ''حرف معتبر'' شامل ہیں۔

انہوں نے تعلیم اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز کراچی جیسے فعال شہر سے کیا تھا۔ بعدازاں انہوں نے روزنامہ ''جنگ، کراچی'' میں بارہ برس تک اپنی صحافتی خدمات کے ذریعے قارئین کو اور خصوصاً خواتین اور طالبات کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اُن دنوں وہ خواتین کا صفحہ مرتب کرتی تھیں۔ اور نت نئے تجربات اور دلچسپیوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو متوجہ کرتی تھیں۔ اب جب کہ وہ امریکہ کے شہر

لاس اینجلس میں قیام پزیر ہیں تب بھی انہوں نے اپنے قلم کو ستانے نہیں دیا اور نہ اپنے شعری و نثری تخلیقات کو آرام کرنے دیا۔ انہوں نے مسلسل کام کیا۔ جس کے نتیجے میں ان کی تازہ تصنیفات سخنور پنجم اور گفتنی دوم آج ہمارے سامنے ہیں۔ بیرون پاکستان ادیبوں اور شاعروں کا انٹرویو جس عرق ریزی اور دیدہ وری کا آئینہ دار ہے، قارئین پڑھ کر محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کا مجموعۂ کلام ان کے خصوصی طرزِ سخن کا آئینہ دار ہے۔ نئے نئے موضوعات، چونکا دینے والی تشبیہات، نوع بہ نوع استعارے، غزلوں اور نظموں دونوں اسلوب میں دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ وطن سے دور رہتے ہوئے بھی جن لوگوں نے اپنے وطن، اپنی زبان اور اپنی تہذیب و ثقافت کے پرچم کو بلند رکھا ان میں سلطانہ مہر کا نام بھی نمایاں اور نمایاں تر ہے۔ یہاں یہ امر بھی محلِ نظر ہے کہ ان کی بولی اردو نہیں بلکہ گجراتی میمنی ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان و ترویج و ترقی میں ان کا حصہ قابلِ داد و قابلِ تحسین ہے۔ دعا یہ ہے کہ میدان ہنروری میں انہیں روز و شب ترقی حاصل ہو اور ان کا قلمی سفر تیز سے تیز تر ہو جائے۔ آمین!

باسمِ ربّی

چراغ سے چراغ جلانے کا ہنر...

مرزا یٰسین بیگ

مس سی ساگا، انٹاریو، کینیڈا

کینیڈا آکر مجھے جو پہلی خوشی ملی، اس کا نام سلطانہ مہر ہے۔ غالباً یہ ہی میری اب تک کی آخری خوشی بھی ہے۔ پاکستان میں صحافت کے میدان میں دو ہی اشخاص نے متاثر کیا، پہلی سلطانہ مہر اور دوسرے محمود شام ہیں جو گزشتہ کئی سالوں سے روزنامہ ''جنگ، کراچی'' میں مدیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں ٹیلنٹ (talent استعدا) پرکھنے، اس کی قدر کرنے اور اپنے کام میں نئے نئے آئیڈیاز (ideas خیالات و تجربات) تلاش کرنے کا جو بے پناہ جوہر پایا جاتا ہے اُسے میں سلام کرتا ہوں۔

آج کی شام سلطانہ مہر کے نام ہے۔ میں انہیں ایسی سینکڑوں شاموں کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ وہ ہیں ہی اس قابل کہ اُن کی ہر شام آج جیسی شام ہو۔ سلطانہ مہر کی اہم خوبی ''چونکانا'' ہے۔ چاہے وہ صحافت کر رہی ہوں، افسانے لکھ رہی ہوں، ناول کی آبیاری کر رہی ہوں یا شعر کی بُنت اور سجاوٹ میں مصروف ہوں، ان کے قلم سے نکلے حروف پڑھنے والے کو چونکاتے ضرور ہیں۔ قاری پڑھتے پڑھتے چند لمحے کے لئے رُکتا ہے اور پھر ''واہ'' کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

آج کے دور میں جہاں دو بچے پالنا مشکل ہیں سلطانہ مہر نے تین (۳) بچوں اور سولہ (۱۶) کتابوں کی کفالت کی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے تینوں بیٹوں، ڈاکٹر سہیل، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

ریحان اور انجینئر وقار کو دیکھ لیں یا پھر ان کی سولہ کتابوں کو، آپ ان کی ہمت اور لگن کی داد دیئے بغیر رہ نہ سکیں گے۔ ایسی پریکٹیکل (practical مشاق) اور محنتی صحافی، ادیبہ، شاعرہ اور ماں کے لئے آج کی تقریب سجا کر شاہد ہاشمی نے ہم سب کی جانب سے قرض کی پہلی قسط ادا کی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سلطانہ مہر آئی ایم ایف نہیں ہیں پھر بھی انہوں نے جو کچھ ہمیں دیا ہے ہم اُسے لوٹانے کی کوشش ضرور کریں گے کیونکہ چراغ سے چراغ جلانے کا ہنر ہم نے انہیں سے سیکھا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ میں نے سلطانہ مہر کو ہمیشہ خواتین سے زیادہ مردوں میں مقبول پایا مگر حیرت انگیز طور پر میں یہ راز کبھی نہ جان سکا کہ وہ کس مرد کو اپنے سب سے قریب پاتی ہیں۔ سلطانہ مہر نے تن تنہا مردانہ وار زندگی گزاری ہے۔ اس وار کو آپ انگریزی کا وار (war جنگ) نہ سمجھیئے گا۔ اُن کے ہنر نے ان کو دکھ بھی دیئے ہیں اور خوشیاں بھی۔ مگر دکھ اور خوشیوں کے یہ اسپیڈ بریکر (speed braker مخل الرفتار) کبھی ان کی ہمت اور لگن کی اسپیڈ (speed تیز گامی) کو کم نہ کر سکے۔

لوگ خواتین سے کافی دنوں کے بعد ملیں تو پوچھتے ہیں ''بچے کتنے ہیں''؟ سلطانہ مہر سے پوچھنا پڑتا ہے ''کتابیں کتنی ہیں''؟ اس انداز سے ان کا تخلیقی جوہر برصغیر پاک و ہند کی ہر عورت کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔

میری دلی کیفیات سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے کہ سلطانہ مہر کوئی فرشتہ ہیں اور ان میں کوئی شخصیتی عیب یا انسانی کمزوریاں نہیں ہیں۔ یقیناً ہیں اور ہوں گی۔ اور بحیثیت کولیگ (colleague رفیق کار) اور دفتری ساتھی کے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہر طرح سے شیئر (share نباہ) کیا ہے اپنی خامیوں میں بھی اور اپنی خوبیوں میں بھی۔ مجھے ایک عورت نے جنم دیا اور دوسری عورت نے مجھے دریافت کیا۔ میں نے اپنے صحافتی کیریئر (career پیشے) کا آغاز ان کے رسالے ''روپ'' سے کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اتنا سکھایا، اتنا بتلایا کہ اس کے بعد میں کبھی ''زخمی'' نہیں ہوا، البتہ ٹھوکریں تو آج بھی کھاتا ہوں۔

شاہد ہاشمی، صدر کین پاک چیمبرز، کی ترتیب دی ہوئی آج کی یہ تقریب اور مجھے اس سپاس نامے کو پیش کرنے کا موقعہ فراہم کرنا میرے حافظے میں عرصے تک محفوظ رہے گا، کیوں کہ انہوں نے میرے استاد کو عزت بخشی ہے۔ سلطانہ مہر اس تقریب میں تو تھوڑی دیر رہیں گی لیکن میرے دل میں ہمیشہ رہیں گی بغیر کسی کرائے کے۔ ان کا کام ان کی پہچان بن کر اردو ادب کے ماتھے پر مشل بندیا چمکتا رہے گا اور اس چمک سے آنے والا دور بھی فیض یاب ہوگا۔ میں ان کا نام تاریخ اردو ادب میں بہت دور تک دیکھ رہا ہوں۔ خدا میری دور کی نظر کو نظرِ بد سے بچائے۔ آمین!

۲۲/اپریل ۲۰۰۱ء
مس سی ساگا، انٹاریو، کینیڈا

Mr. M. Y. Baig,
203-1485 William Sport Drive, Mississauga, ONT. LX4 1T6, Canada

باسمِ ربی

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو

ادا جعفری
23.1.2002

آدا جعفری

کراچی، پاکستان

ادا بدایونی سے ادا جعفری تک، شاعرہ آدا ایک شخصیت نہیں ایک دبستان ہیں۔ ان کا تعارف لکھتے ہوئے سوچنے لگی میں ان سے کب ملی تھی؟ تب یادوں کا ایک میلہ لگ گیا۔ نازک کلیاں انگڑائی لے کر چٹکیں، کچھ شگوفے مہکے اور دھنک کے سارے رنگ رقصاں ہوئے۔ معمولی بات نہ تھی کہ میرے تصور میں ایک ایسی شخصیت تھی جس کی آنکھوں میں میں نے اپنائیت کا سحر پایا تھا، چہرے پر ممتا کا نور، ہونٹوں پر ایک شبنمی مسکراہٹ اور گفتگو کرتے ہوئے نغمہ گر مدھم لہجہ۔ وقت تھم تھم کر چل رہا تھا جیسے متقاضی ہو کہ اس شخصیت کے سائے تلے کچھ دیر اور ستا لیا جائے۔ یہ شخصیت آدا جعفری کی ہے۔

یہ فکشن نہیں، کہانی نہیں، یہ سچی بات ہے۔ پندرہ سال پہلے بھی اس شخصیت کا سحر ایسا ہی تھا اور دو سال قبل جب میں ان سے دوبارہ ملی تب بھی محبت کا وہی سحر پایا۔

میں ان سے اُس وقت ملی تھی جب میں ۱۹۷۳ء میں شاعرات کا تذکرہ ”آج کی شاعرات“ مرتب کر رہی تھی۔ پھر جب انہیں پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملا تو میں نے اپنے ماہنامہ ”روپ“ کی جانب سے ”ایک شام آدا جعفری کے نام“ منعقد کی۔ اس شام ان کی موجودگی میں گلوکار آصف علی نے ان کا کلام سنایا۔ پھر شب و روز تو وہی تھے مگر تم کہیں ہم کہیں والے حالات تھے۔

۲۰۰۰ء میں جب میں '' سخنور چہارم''، '' سخنور اول (طبع سوم)'' اور '' گفتنی اول'' کی طباعت کے سلسلے میں کراچی میں تھی، تو ایک شام لطف اللہ صاحب نے اپنے گھر پر ایک خصوصی نشست میں مدعو کیا۔ اس نشست میں محترم جمیل جالبی، بیگم جالبی، جناب مشفق خواجہ، محترمہ آمنہ مشفق، جناب مختار زمن، محترمہ سلمیٰ زمن، جناب احمد علی، بیگم ہاجرہ مسرور، محترم مشتاق یوسفی، بیگم یوسفی، جناب شان الحق حقی، محترمہ سلمیٰ حقی، محترمہ حوری نورانی، محترمہ زہرہ نگاہ اور محترمہ ادا جعفری اور دو ایک اور مہمان جن کا نام میں بھول رہی ہوں مدعو تھے۔ آسمانِ ادب کے اتنے ممتاز اور روشن ستارے یوں جگمگا رہے تھے کہ مہر کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی مگر سلطانہ پھر بھی نازاں تھی کہ وہ ان کے جلو میں تھی۔

واپسی میں ادا جعفری صاحبہ نے اپنی گاڑی میں مجھے میرے گھر اُتارا۔ میں ان کی اس زحمت پر شرمندہ تھی مگر وہ تھیں کہ جیسے یہ ان پر میرا قرض واجب ہو۔

میں نے لاس اینجلس سے ان کی خدمت میں '' سخنور پنجم'' کا سوال نامہ ڈرتے ڈرتے بھیجا کیونکہ سخنور سوم اور چہارم کے وقت چند مشہور شعرا اس بات پر خفا تھے کہ میں انہیں '' سخنور دوم'' کے وقت کیوں بھول گئی؟ کیا ان کا مرتبہ اس کا متقاضی نہ تھا؟ میں معذرت ہی کر سکتی تھی کہ بھول ہو گئی۔ میں کیا بتاتی کہ میں یہ کام کس پل صراط پر چلتے ہوئے کرتی رہی ہوں۔ مگر جب مجھے محترمہ ادا جعفری کا تعارف ایک محبت بھرے خط کے ساتھ موصول ہوا جس میں انہوں نے میری محنت کو سراہا تھا تو میرے حوصلوں کو پھر زندگی مل گئی۔ میں پھر جی اٹھی۔ میں نے ان کی خودنوشت سوانح '' جو رہی سو بے خبری رہی'' کراچی سے منگوائی تھی۔ چند صفحات ہی پڑھے تھے کہ کسی نے پڑھنے کے بہانے عارضی طور پر مانگی اور واپس نہ دی۔ صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ برطانیہ آ کر لائبریریاں چھانیں اور کتاب حاصل کی۔ پھر ادا جعفری کو پڑھا کہ لکھنے کے لئے ان کے متعلق پڑھنا ضروری تھا۔ جاننا ضروری تھا کہ قطرے سے گہر بننے تک کیا گزری۔

جب انہوں نے خودنوشت سوانح لکھی تھی تب ان کے شریکِ سفر نور الحسن جعفری حیات تھے۔ ۵/دسمبر ۱۹۹۵ء کے دن وہ اپنے رب سے جا ملے۔ ادا نے ان کی فرقت کا صدمہ کیسے جھیلا اور کیسے جھیل رہی ہیں اس کی آئینہ دار ان کی نظم '' سویرا ہو تو کیسے ہو (جعفری صاحب کے نام)'' ہے۔

تم اب میرے سرہانے
موتیا کے پھول رکھنا بھول جاتے ہو
سویرا ہو تو کیسے ہو
اُجالا اب مرے دل تک نہیں آتا
دھنک کے رنگ آنچل سے پھسل کر گر چکے ہیں
مسافر خواب کو رستہ مرے گھر کا نہیں ملتا
کوئی شیریں نوا طائر کسی رُت کا سندیسہ اب نہیں لاتا
فقط اک درد کا موسم فقط اک غم کی پُروائی

کسی خوش بو کا لہجہ اب سخن مجھ سے نہیں کرتا
جو روز و شب سے رشتے تھے
وہ پہچانے نہیں جاتے
نہ جانے کتنے دن گزرے نہ جانے کون یگ بیتا
کہ اب موجِ ہوا مجھ سے مخاطب ہی نہیں ہوتی
تو کیا سب آئینے ٹوٹے تو کیا اب یہ زمین و آسماں بدلے !
یہ سناٹا، اندھیرا اور تنہائی یہ ویرانی
تمہارے بس میں تھا کارِ مسیحائی
نہ جانے تم کہاں ہو میں کہاں ہوں
تمہیں یادوں کے گجرے اب کہاں بھیجوں!

میں جب بھی یہ نظم پڑھتی ہوں میری آنکھیں دکھ کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔

ادا جعفری ہجوم سے ہمیشہ ہی سے دور رہیں۔ انہوں نے اپنی کسی کتاب کی تعارفی تقریب بھی منعقد نہیں ہونے دی۔ وہ مشاعروں میں شرکت سے بھی گریز اں رہیں سوائے چند ایک مشاعروں کے جن میں کنیڈا، امریکہ اور روس (ماسکو) میں منعقد ہونے والے مشاعرے شامل ہیں۔

۱۷/ اگست ۲۰۰۲ء کے دن ٹورنٹو، کنیڈا میں ''کین پاک چیمبر آف کامرس'' کے صدر محترم شاہد ہاشمی نے ''آرکو کمپیوٹرز لمیٹڈ'' کے اشتراک سے خواتین کو ایوارڈ دینے کی ایک تقریب منعقد کی جس میں محترمہ ادا جعفری کا نام سرِ فہرست تھا۔ وہ ان دنوں امریکہ میں تھیں مگر اپنی طبیعت ہی کی وجہ سے شریک محفل نہ ہو سکیں اور ان کا ایوارڈ ان کی جانب سے کسی اور نے وصول کیا۔ اس محفل میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ادا جعفری صاحبہ کی شخصیت پر ایک مقالہ پڑھا۔ اپنے مقالے میں انہوں نے کہا...

''ادا جعفری نے، اپنی عمر کا ایک طویل حصہ علمی ریاضت اور مسلسل مشق کی نذر کرتے ہوئے ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے، نسائیت کے بعض جذبوں کی ترجمانی ضرور کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہیں تھی۔ لیکن وہ صرف اسی دائرے میں محدود ہو کر نہیں رہ گئیں بلکہ انہوں نے نسائیت کے حصار سے باہر نکل کر انسانیت کے جذبوں اور مسائل کائنات کو بھی اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو آرائشِ خم و کاکل کے لئے نہیں، اندیشۂ دور دراز کے لئے وقف کیا ہے۔ انہوں نے صنف نازک کے تعارف کے لئے جو تصویر اپنے قلم سے پیش کی وہ خود اپنے مصور کی فکری اوج کے مظاہر کے لئے کافی ہے۔

میں کہ تقدیسِ وفا، عفت و ناموسِ حیات	میرے انفاس سے روشن ہوا فانوسِ حیات
میں کسی خوابِ دل آویز کی تشکیل نہ تھی	جذبۂ لذتِ تخلیق کی تکمیل نہ تھی
میں تو خود خالق و کوزہ گر و صناع بنی	شہر بانو بھی مرا نام رہا مریم بھی

مگر ان منزلوں تک پہنچنے کے لئے ادا جعفری کو بڑے کٹھن مراحل اور دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا ہے۔ جیسا کہ وہ

خود کہتی ہیں۔

میں نے رو رو کے رات کاٹی ہے آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

ادا جعفری کے کلام کا ہر ہر لفظ ابلاغ ہے ان کی فکر کا، ان کی جستجو کا، ان کے احساسات کا۔ بلاشبہ وہ جدید اردو شاعری کی 'خاتون اول' کہلائے جانے کی مستحق ہیں"۔

ادا بدایونی ۲۲ / اگست ۱۹۲۶ء کو بدایوں کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کی کم سنی ہی میں ان کے والد مولوی بدر الحسن کا انتقال ہوگیا۔ زندگی کے شب و روز کی دیواروں میں کچھ ایسی دراڑیں پڑیں کہ یہ کم سن لڑکی اپنے دھیان گیان کی دنیا میں جیسے گم ہوکر رہ گئی۔ گھرانا تعلیم یافتہ تھا مگر لڑکیوں کے لئے وہی مسائل تھے جو آج بھی اس مہذب روشن دنیا کے بہت سے اندھیرے گوشوں میں ہیں، جہاں وہ مروجہ بہر حال کم تر گردانی جاتی ہے۔ ان دنوں کہیں سے کسی لغت کے تھوڑے سے پھٹے ہوئے اوراق ادا کے ہاتھ لگے۔ ان اوراق میں جتنے الفاظ تھے انہوں نے چند دنوں میں حفظ کر لیئے۔ شعر گوئی بھی اسی زمانے کی عطا ہے۔ والدہ نے بھی اس کم سن بچی کے حوصلوں کو زندگی بخشی اور یوں ادا نے قافیہ پیمائی کے بجائے شاعری کی ابتدا نظموں سے کی۔ امی کی اجازت سے دو ایک نظمیں شائع بھی ہوئیں۔ والدہ نے ہمت سے کام لے کر انہیں گھر ہی میں اساتذہ سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم دلوائی۔ ادا کو خود بھی مطالعے کا شوق تھا اور پھر والدہ کے ساتھ گھر میں ایک شفیق ہستی مولوی ظہور حسن کی تھی جو ان کی نانی کے بھائی تھے اور جنہیں یہ "نانا" کہتی تھیں۔ ادا بتاتی ہیں "ان کی شفقتیں اور محبتیں لاانتہا تھیں۔ ایک دن وہ بڑی حویلی میں آئے اور ادا کو بلا کر کہنے لگے...

'اب آپ کا کلام رسالوں میں چھپ رہا ہے۔ ابھی تک ہم شاعروں سے بڑے مرعوب ہوا کرتے تھے کہ یہ ہم سے زیادہ علم و دانش رکھتے ہیں۔ اب آپ شاعرہ ہیں۔ آپ ہمیں ایک لفظ کے معنی بتائیں تو ہم آپ کو منہ مانگا انعام دیں گے'۔ انہوں نے لفظ 'تبخال' کے معنی پوچھے۔ میں لغات کے پھٹے اوراق سے بہت سے الفاظ رٹ چکی تھی۔ فوراً جواب دیا... بخار کے بعد جو بھی ہونٹوں پر چھالا پڑ جاتا ہے اس کو تبخال یا تبخالہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ تپ خال سے بنا ہے۔ اس پر نانا بہت خوش ہوئے اور منہ مانگا انعام پوچھا۔ میں نے لغات کشوری مانگی جو میری قوت خرید سے باہر تھی۔ اس زمانے کے بزرگوں کا طریقہ تھا کہ جیب خرچ کے لئے نقد رقم نہیں دیتے تھے اور بچوں کی تمام ضروریات بن مانگے ہی پوری کرتے تھے"۔

بڑی آرزوؤں کے بعد بھی ادا نے کالج اور یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی۔ کتابوں سے دوستی اور رفاقت گھر کی چار دیواری تک محدود رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کب محروم رکھتا ہے، مانگنے والا تو ہو! ۱۹۶۸ء میں ادا کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی جب وہ امریکہ گئیں تب واشنگٹن میں لائبریری آف کانگریس میں انہوں نے دل کھول کر کتابوں سے دوستی کی، ان کا لمس حاصل کیا۔ اور ادا کی دعائیں یوں بھی رنگ لائیں کہ ان کی بیٹی صبیحہ اقبال کی معاشیات پر لکھی ہوئی کتاب آج اُس لائبریری کی زینت ہے، اور جس سے سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ ادا نے کہا تھا

ابھی تک یاد ہے مجھ کو
کہ جب چلنا مرے پیروں نے سیکھا تھا
میرے پیروں میں زنجیریں تھیں
زنجیریں جنہیں آسائش تہذیب اور پازیب کہتے ہیں

ادا نے بتایا ہے جب ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی اس زمانے میں چند خواتین جیسے حیا لکھنوی، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور نجمہ تصدق حسین کا کلام رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ بہت سی چیزوں سے محرومیوں کے باوجود ادا نے ''احساسِ محرومی'' کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ اور یہ ان کے صبر اور حوصلوں کی جزا تھی کہ اپنے بیٹے عامر اور بہو شعاع کے گھر امریکہ گئیں تو نیو انگلینڈ، امریکہ کی دو شاعرات سے ان کی ملاقات ہوئی جنہیں یہ دنیا چھوڑے مدت ہو چکی تھی مگر وہ اپنی شاعری میں زندہ تھیں۔ وہ دو شاعرات تھیں ایملی ڈکنسن (Emily Dikinson 1830-1886) اور سلویا پلاتھ (Sylvia Plath 1932-1963)۔ شعاع کے ہمراہ وہ ایملی ڈکنسن کے گھر گئیں اور سلویا پلاتھ کو انہوں نے اسمتھ کالج میں تلاش کیا۔ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ادا اپنے اندر چھپی شاعرہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ انتھک محنت اور ریاضت کے بعد آخر انہوں نے اس کو ڈھونڈ نکالا۔

بارہ تیرہ سال کی عمر میں ادبی زندگی کا آغاز کرنے والی ادا کا پہلا مجموعۂ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ ادا نے یہ مجموعہ ۱۹۴۷ء میں اپنی شادی سے قبل ہی ترتیب دے کر ناشر ''نیا ادارہ، لاہور'' کے سپرد کر دیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''شہرِ درد'' ۱۹۶۷ء میں، تیسرا ''غزالاں تم تو واقف ہو'' ۱۹۷۴ء میں، چوتھا ''ساز سخن بہانہ ہے'' ۱۹۸۲ء میں، انتخاب کلام ''سازِ سخن'' ۱۹۸۸ء میں پانچواں مجموعہ ''حرف شناسائی'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں کی کئی کئی طباعتیں ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم شعرا کا تعارف و تحقیق پر مبنی ''غزل نما'' کے نام سے پہلا حصہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات ''جو رہی سو بے خبر رہی'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ ان کا چھٹا مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔ ''کلیات ادا جعفری'' اور ''غزل نما حصہ دوم'' بھی زیرِ طبع ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ ''میں نے غزل، نظم اور نثر لکھی ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل کبھی نہیں لکھی کیوں کہ اس میں اپنے لئے کوئی کشش نہیں پائی''۔ مگر انہوں نے اپنے کسی ایک دوست کے ایک اندوہناک واقعے پر ایک نثری نظم کہی تھی جو ان کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں۔ وہ نظم یہ ہے۔

ستارہ زاد آنکھیں / تم نے نہیں دیکھیں / تم نے نہیں پڑھیں

یہ نظم خاصی طویل ہے جو ان کی خودنوشت سوانح میں شامل ہے۔

ادا جعفری اردو زبان و ادب کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ ان کے نزدیک اس زبان کا مستقبل تابناک ہے۔ نہ ہی وہ رسم الخط بدلے جانے کے حق میں ہیں۔

سوال نمبر پانچ کے جواب میں انہوں نے کہا کہ شاعر کو اظہار پر قدرت حاصل ہو تو نظم اور غزل، دونوں کا ابلاغ ہوتا ہے۔ ایک صنف سخن پر دوسری کو ترجیح دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ نظم یا غزل لکھتے وقت صنف سخن کا تعین خود ہی ہو جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ آج کا ادب مکمل طور پر اپنے عہد کا ترجمان ہے اور اردو ایک مکمل زبان ہے جسے اپنا کر یہ سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم نے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

ادا کہتی ہیں... ''میں کسی شاعر سے متاثر نہیں رہی۔ لیکن میرے نزدیک حافظ، میر، غالب اور ناصر کاظمی گزری صدیوں کے قدآور شعرا میں سے ہیں۔ میں نے باقاعدہ کسی سے اصلاح بھی نہیں لی لیکن مشورے کے لئے محترم اثر لکھنوی اور محترم اختر شیرانی سے استفادہ کیا تھا۔ میں نے اس زمانے میں، جب گھر میں کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ تھا، رسائل میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے نزدیک آج بھی صحت مند تنقید نئے لکھنے والوں کے لئے بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے''۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے انہوں نے کہا... ''یہ تحریک اردو ادب کے لئے حیاتِ نو کا بلاوا بھی تھی اور نوید بھی۔ یوں تو ہر زمانے میں ایک نیا زمانہ جنم لیتا ہے اور ہر عہد کے حوالے سے ہر عہد کا ادب بھی تغیر آشنا ہوتا ہے''۔

زندگی کے اہم واقعات کا ذکر آیا تو کہنے لگیں... ''کونسا واقعہ سناؤں۔ سوچوں تو بہت ہیں اور نہ سوچوں تو...''۔ مگر ادا جعفری کی زندگی کا یہ واقعہ کم اہم نہیں کہ نورالحسن جعفری نے ان کا کلام پڑھ کر ان کے لئے رشتہ بھیجا تھا۔ ادا جعفری اس واقعے سے بھی بے خبر ہیں۔ پھر ان کی زندگی کا یہ واقعہ بھی بے حد اہم ہے کہ انہوں نے ایک طویل عرصے تک کچھ نہیں لکھا۔ کہتی ہیں... ''میں جو لفظ کی انگلی تھام کر زندگی سے ملاقات کرنے نکلی تھی سسرال اور سسرال کے ماحول میں اپنے آپ سے بچھڑ گئی۔ حد یہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک میں نے ماں کو بھی خط نہیں لکھا۔ جرائد میرے نام آتے تھے۔ کلام کی فرمائشیں ہوتی تھیں مگر میں چپ تھی۔ ان کے جواب بھی نور ہی لکھتے تھے اور امی کے خط کے جواب بھی وہی دیتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب نور کے پھوپی زاد بھائی میجر ضیاالدین عباس شہید نے خاکِ وطن کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو اس ذاتی دُکھ نے اور اجتماعی جذبۂ جاں نثاری نے مجھے دوبارہ قلم پکڑنا سکھا دیا اور میں نے 'میرے شہید' کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور پھر مسلسل لکھتی رہی''۔

جمود ٹوٹ چکا تھا۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کی ذات، ان کے اہل خاندان اور احباب کے ساتھ ساتھ ان کے قارئین وسامعین کے لئے بھی مشعل راہ ہے حالانکہ وہ کہتی ہیں... ''میں اپنی شاعری کو فن کہنا پسند نہیں کرتی۔ میرے لئے شاعری حیات کا منظر نامہ ہے اور پیمانِ حیات بھی۔ یہ جو شعر و سخن کا سفر ہے یہ اپنی ذات سے ہی شروع ہوتا ہے اور حسب توفیق حیات اور کائنات تک پہنچتا ہے اور اس کا فیصلہ بھی وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی درست مگر وقت بھی قلم کی طرح شاعر اور ادیب کی امانت ہے جو اسے اپنی آنے والی نسل کو دیانت کے ساتھ سونپنا ہے''۔

آدا نے روشنی کی لکیر اپنی ماں کے مہربان وجود سے پائی وہ کہتی ہیں۔

جب ان حیران آنکھوں نے
اُجالے اور اندھیرے دیکھنا سیکھا
اندھیرے باادب خدام کی صورت میں تھے ایستادہ
اُجالا ماں کی پلکوں پر دھرا تھا

آدا جعفری کا یہی اُجالا آفاقی ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے تمام قارئین اور سامعین تک پہنچاتی ہیں جب وہ اپنے بیٹے عامر سے مخاطب ہو کر "شجر نازاں" کے عنوان سے نظم کہتی ہیں۔

میرے بچے!
مجھے جب دیکھنا، جب سوچنا چاہو
تو بس اپنی طرف دیکھو
تمہارے لب پہ جو حرفِ صداقت ہے یہی میں ہوں
تمہارے دل میں جو نازِ جسارت ہے یہی میں ہوں
نگاہوں میں جو اک طرزِ عبادت ہے یہی میں ہوں
محبت کی طرح میں بھی ہوں بے پایاں
کبھی ظاہر کبھی پنہاں
جہاں تم ہو وہاں تک میری خوش بو ہے
وہاں میں ہوں!

صبیحہ، عامر، عزمی کے ساتھ زبیر، شعاع اور مایا اور ان کے بچے آدا کی محبتوں کا ثمر ہیں، ان کا اصل ایوارڈ ہیں گو انہیں ان کی ادبی خدمات پر ۱۹۶۸ء میں آدم جی ایوارڈ اور بابائے اردو ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ یہ ادبی خدمات صرف ان کی شاعری نہیں بلکہ شعر کی صورت میں اُس دور میں ان کا احتجاج بھی تھا جہاں مردوں کے اُس معاشرے میں عورت کو اظہار کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ وہ معاشرہ آج کے معاشرے سے جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ آدا کی شاعری اسی دکھ کا اظہار ہے، اسی دکھ اور بے بسی کے نام ہے۔ فرسودہ اور اذیت آفریں روایات سے انحراف اور اس کے اظہار کی راہ بے خار نہ تھی مگر آدا جعفری کے بقول ان کا یہ ضدی تجربہ دل آویز بھی تھا اور قیمتی بھی۔

ان کا یہ تجربہ اور ان کی یہ جرأت آج ان کی آنے والی نسل کے لئے بلاشبہ مشعل راہ ہے۔

Mrs Ada Jafri,
43/8/B, Block 6, P E C H Society, Karachi, Pakistan

انتخابِ کلام

کرشمہ سازئ منظر پہ حیرتیں بھی ہوئیں
اور اس کے بعد چراغوں سے وحشتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

عجب نہیں کہ اُجالے بہت ملے ہیں ہمیں
ہمارا زادِ سفر تو جراحتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

تسلیوں سے بہلنا بھی سیکھ لیتے ہیں
وہ جن کی آنکھ کے آگے قیامتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

تم ایک خواب بکھرنے سے کیوں ہو آزردہ
کہ منہدم تو غموں سے عمارتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

یہ سادہ لوگ جو بے آس جی لیئے ہیں یہاں
نہ جانے کیوں ہمیں ان سے ندامتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

نہ اپنا دھیان ہی آیا، نہ اُس کو یاد کیا
سو اب کے موسموں کچھ ایسی صورتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

امیر شہر کو آنسو کی بھیک بھی نہ ملی
اسی زمیں پہ کچھ ایسی کرامتیں بھی ہوئیں

⌛•⌛

اپنے ماضی کے اجالوں سے عقیدت ہے مجھے
اپنے بچپن کے کھلونوں سے محبت ہے مجھے
اپنے گھر کے در و دیوار سجانے کے لیے
میں نے محسوس کیا تیری ضرورت ہے مجھے

۱۴ راپریل ۲۰۰۱ء ارشد عثمانی ۔ کینیڈا

ارشد عثمانی

ٹورنٹو، کینیڈا

بلاشبہ اردو میری مادری زبان نہیں لیکن اردو میرے دل میں بسی ہوئی ہے بالکل اپنے محبوب کی طرح۔ یوں ایک طرح سے اردو زبان بھی میری محبوبہ ہے۔ چنانچہ جب سے میں نے شعرا و شاعرات کا تعارف لکھنا شروع کیا، حیلے حوالے سے ان سے اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں رائے طلب کی۔ اور وہ رائیں ''سخنور اول'' سے لے کر ''سخنور چہارم'' تک میں نے اردو کے شیدائیوں تک پہنچا دیں، اب آپ انہیں سخنور اول، دوم، سوم اور چہارم میں پڑھ سکتے ہیں۔ ''سخنور پنجم'' میں بھی شعرا و شاعرات نے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ میں بھی گاہے گاہے اس موضوع پر لکھی جانے والی رپورٹیں پڑھتی رہتی ہوں۔ چنانچہ ''پاکستان لنک'' پڑھا کہ ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق.... ''کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی تعداد چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) کے لگ بھگ ہے۔ اردو کے رسائل بھی کافی تعداد میں نکلتے ہیں۔ ثقافتی اور ادبی محفلیں بھی گاہے گاہے منعقد ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کینیڈا ہو، امریکہ یا یورپ نئی نسل کو اردو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ وہ اردو پڑھنا جانتی ہے نہ اردو لکھنا۔ بلکہ اردو زبان میں گفتگو کرنے میں بھی انہیں دقت ہوتی ہے (۱)۔''

(۱)۔ ہفت روزہ ''پاکستان لنک، لاس اینجلس'' مورخہ ۳۱/ مارچ ۲۰۰۰ء، بعنوان.... ''اردو کا مستقبل'' از سید اصغر عباس

اس سوال کا جواب میں نے ارشد عثمانی سے بھی چاہا۔ وہ کہنے لگے ..." نئی نسل میں اردو زبان کو متعارف کرانے اور ان کی اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے والدین کو کوشش کرنی چاہیئے، کیونکہ بچوں کے اردو نہ جاننے کی وجہ ان کے والدین کی کوتاہی ہے جو حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں جب کہ وہ اس مسئلے کی سنگینی سے بھی باخبر ہیں کہ ان کی کورذوقی اور لاپروائی ہی سے اردو زبان شدید نقصانات سے دوچار ہوگی"۔

ارشد عثمانی صاحب کے اس تبصرے پر مجھے یاد آیا کہ اردو زبان کی ایک شیدائی محترمہ نسیمہ بنت سراج نے روزنامہ "جنگ" کے لئے لکھے گئے اپنے ایک کالم بعنوان "اردو ہے جس کا نام" میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آج کے دور میں نئی نسل کی اردو سے بیگانگی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کے طلبا کو اچھے روزگار کے مواقع حاصل نہیں۔ ان کی انگریزی زبان میں کمزوری ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ ملٹی نیشنل (multi-national) کمپنیاں جو اچھی تنخواہیں دیتی ہیں اُن تک توان گریجویٹوں کی رسائی نہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی قومی زبان کی حیثیت کو پاکستان میں بحال کرنے کے موثر اقدامات کیئے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری ناقدری سے اردو میں ہمارے ادب کا جو سرمایہ محفوظ ہے وہ ضائع ہو جائے۔

مگر سوال صرف پاکستان یا ہندوستان تک اردو کو محفوظ کرنے کے اقدامات کا نہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ بچوں کو، گھر میں اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ، ابتدائی جماعتوں میں اردو پڑھانے کے انتظامات ہوں اور والدین اس کے لئے رضا کارانہ خدمات پیش کریں۔

ارشد عثمانی کی یہ تجویز بھی ہے کہ سنڈے اسلامک اسکولوں (Sunday Islamic Schools اسلامی اتواری اسکول) میں اردو پڑھانے کے انتظامات بھی ہونے چاہئیں۔ ایسی تجاویز کئی صاحبان نے دی ہیں۔ مگر ان تجاویز کو دائرہ عمل میں لایا جائے تو تجاویز کارگر ہوں گی ورنہ ہم نہ ہوں گے اور نہ ہی یہ باتیں ہوں گی۔

اب آیئے میں ارشد عثمانی سے آپ کو ملواؤں۔

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب روزنامہ "جنگ" کے حوالے سے میں ارشد عثمانی کو جانتی تھی۔ ان کی لکھی رپورٹیں پڑھتی تھی۔ وہ دوبئی میں ان دنوں روزنامہ "جنگ" کی نمائندگی کرتے تھے۔ پھر جب میں نے اپنا ماہنامہ "روپ" شائع کرنا شروع کیا تو ارشد عثمانی کی خدمات حاصل کیں۔ رپورٹوں اور انٹرویوز کے علاوہ "روپ" کے لئے انہوں نے ایک انعامی مقابلہ بھی شروع کیا جو دلچسپی کا حامل تھا۔ یوں ارشد کو جب قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو اندازہ ہوا کہ ارشد کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ہمہ رنگ ہیں۔ نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ دوبئی میں بھی دھومیں مچاتے تھے اور پھر کینیڈا آ کر بھی ہنگامے برپا کرتے رہے تھے، یعنی ٹیلی ویژن شو (television show)، اسٹیج شو (stage show) اور مشاعرے منعقد کرتے رہے۔

والدین نے ان کا نام ارشد حسین عثمانی رکھا۔ اپنے نام کو مختصر کر کے انہوں نے تخلص بھی نام سے لیا، یعنی ارشدؔ۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج سے بی کام (B Com) کیا اور اعلیٰ تعلیم کا پروگرام بنایا تو ان کے والد تجمل حسین عثمانی مرحوم کے ایک شاگرد نے، جو یونائیٹڈ بنک میں اعلیٰ افسر تھے، بنک میں ملازمت کی پیش کش کی۔ ارشد کو یہ پیش کش پرکشش لگی۔ گو اس وقت دوبئی اردو ادب کے حوالے سے اتنا زرخیز نہ تھا پھر بھی ارشد دوبئی برانچ میں ذمہ داریاں سنبھالنے روانہ ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد انگلستان کے برکلیز بنک میں بلایا گیا تو ارشد یو بی ایل (UBL) چھوڑ کر برکلیز بنک جا پہنچے اور ترقی کرتے ہوئے تھوڑے عرصے میں نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ارشد کے والد عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے ان کے خون نے ارشد کو کم عمری میں ہی اُکسا کر شاعری کی دنیا میں پہنچا دیا۔ والد نے کم عمر بیٹے کے جوہر پرکھ کر بھرپور رہنمائی کی۔ ایک طرح سے وہ ارشد کے استاد بھی تھے۔ مشاعرے میں جانے سے قبل ارشد کا کلام دیکھتے۔ اس کی نوک پلک سنوارتے۔ یوں ارشد کو مشاعروں میں پزیرائی ملی تو حوصلے بھی بلند ہوئے۔ لیکن متحدہ عرب امارات میں دوسری مصروفیات کی بنا پر رجحان شاعری سے رپورٹنگ تک جا پہنچا۔ محترم خلیل الرحمٰن مرحوم کی حوصلہ افزائی سے روزنامہ ''جنگ'' کے ذریعے ان کی نثری تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ اس ضمن میں اشتیاق اظہر صاحب، جو اس زمانے میں کراچی میں حکومتِ پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے، ارشد کے مضامین کی اصلاح کر کے پاکستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لئے بھیج دیتے۔ مرحوم شہاب دہلوی نے بھی خاصا تعاون کیا۔ لہٰذا اس زمانے میں لوگ انہیں شاعر سے زیادہ کمپیئر (compere) کی حیثیت سے جانتے تھے کیونکہ ارشد عثمانی نے ثقافتی شو (show) پیش کرنے کی ٹھان لی تھی۔

۱۹۹۱ء میں ارشد عثمانی کا پہلا مجموعہ کلام ''محبتوں کا قرض'' شائع ہوا۔

کنیڈا آنے کے بعد ارشد کا ناطہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو کے اخبارات سے بھی جڑا رہا۔ اس کے علاوہ ٹیلی ویژن سے بھی اردو کا پروگرام کر رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کا اسٹیج پروگرام ''نیلام گھر'' خاصا مقبول رہا۔ راجرز کیبل جس کے تحت ''نیلام گھر'' پیش کیا جا رہا تھا کنیڈا کا سب سے بڑا ٹیلی ویژن نیٹ ورک (Television Network) ہے۔ اس ادارے نے ارشد کو تین اعلیٰ ایوارڈ (awards) سے نوازا۔ حکومت کنیڈا نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ''بہترین شہری رضا کار'' ایوارڈ اپنی وزیر برائے سٹیزن شپ (citizenship) ایلن زمیبا کے ہاتھوں دلوایا۔

اردو رسم الخط کے حوالے سے ارشد عثمانی کہہ رہے تھے ...''رسم الخط ہی کسی زبان کی بقا کی ضمانت ہے۔ رسم الخط باقی نہیں رہے گا تو زبان کی مٹھاس اور اس کی لطافت فنا ہو جائے گی''۔ انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا...'' اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لئے جدید آلات سے مدد لی جائے۔ اردو کی ترویج کے لئے کمپیوٹر، ویڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے دلچسپ اور اچھے پروگرام پیش کیئے جائیں ساتھ

ہی ادبی پروگرام، مشاعرے اور دوسرے ثقافتی پروگراموں کی روداد اور دوسرا دلچسپ لٹریچر نئی نسل کو مہیا کیا جائے۔ نئی نسل کو یہ احساس دلانا بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ مشرقی روایات اور اردو زبان سے محبت ہی ہماری بقا ہے۔ یہ ہمارا قومی ورثہ ہے اور اپنے ورثے کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اردو باقی رہی تو اردو زبان کا ادب بھی باقی رہے گا۔ بجائے اس کے کہ ہم رسم الخط کو تبدیل کریں ہم نئی نسل کو اردو پڑھنے کی طرف کیوں راغب نہ کریں''۔ اس حوالے سے انہوں نے چند اشعار بھی سنائے اور کہا...'' جو شاعری اردو زبان میں ہوئی ہے اور ہو رہی ہے، اس کی سی مٹھاس کسی دوسری زبان کی شاعری میں ملنا مشکل امر ہے''۔

Mr. Arshad Usmani,

158, Elson Street, Markham, Ont. L35 3E7, Canada

انتخابِ کلام (عقیدت)

اپنے ماضی کے اجالوں سے عقیدت ہے مجھے
اپنے بچپن کے کھلونوں سے محبت ہے مجھے
اپنے گھر کے در و دیوار سجانے کے لئے
میں نے محسوس کیا تیری ضرورت ہے مجھے
یہ الگ بات ہے کہ میں خانماں برباد رہا
اپنے آباؑ کی انا سے تو محبت ہے مجھے
اس لئے میں نے کسی اور کو چاہا ہی نہیں
بات یہ ہے کہ فقط تجھ سے ہی الفت ہے مجھے
اس نے تو جاتے ہوئے لوٹ کے دیکھا بھی نہیں
ارشدؔ اس شہر میں جس شخص سے نسبت ہے مجھے

غزل

آج رشتہ جو تم سے ٹوٹا ہے — دل کا ہر زخم پھر سے پھوٹا ہے
اس کی سچائی کے ہزار گواہ — اور وہ کس بلا کا جھوٹا ہے
یہ جو دل میں لگا ہے زخم نہیں — یہ محبت کا بیل بوٹا ہے
سارا گلشن اُداس ہے لوگو — ایک پتہ شجر سے ٹوٹا ہے
نیند آنے لگی ہے شام ڈھلے — آج ارشدؔ سے کوئی روٹھا ہے

لوٹ آئے سرِ دار سے اس شوق میں اشعر
سنتے ہیں کہ اس بزم کی رونق ہے قضا اور

اکرام اشعر
۱۲ اپریل ۰۲ء
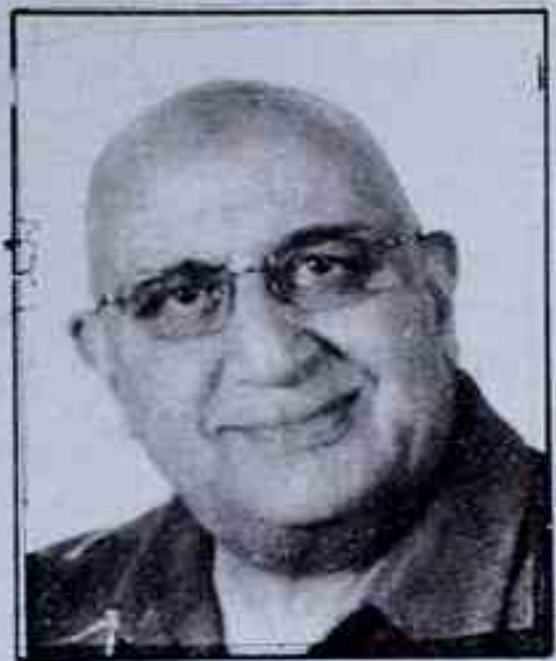
اکرام اشعر

روچسٹر، کینٹ، برطانیہ

یوں تو اُن کا پورا نام سید اکرام علی ہے اور گھر میں وہ قدر عالم کہلاتے ہیں لیکن جانے جاتے ہیں اکرام اشعر کے نام سے۔ اب تو اُن کا تخلص اشعر اس طرح اُن کے نام کا حصہ بن گیا ہے کہ اُسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۳۹ء میں بھوپال کی مردم خیز زمین میں آنکھیں کھولیں۔ بلگرام کے ایک علمی خانوادے سے تعلق اور بھوپال کے ماحول نے اُنھیں شعروسخن کی دنیا سجانے پر آمادہ کیا۔ اسی کے ساتھ وہ تعلیم کے میدان میں بھی کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے گئے۔ بھوپال کے گورنمنٹ حمیدیہ کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ قانون کی ڈگری لی۔ بی ایڈ کیا اور درس وتدریس کے مقدس پیشے سے خود کو وابستہ کیا۔ اڑتیس (۳۸) سال قبل سات سمندروں کا سینہ چیرتے مملکتِ برطانیہ میں وارد ہوئے اور یہاں بھی درس وتدریس ہی مقدر ٹھہری۔

ادبی زندگی کا آغاز اسکول کے زمانے میں ہی ہوگیا تھا۔ ترقی پسند خیالات کے حامل نوجوانوں کی ادبی انجمن ''حلقۂ ارباب ادب'' میں ادبی تربیت حاصل کی۔ اور بتدریج ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالی۔ نظم گوئی مزاج کو راس آئی اور اُنھوں نے ''تنہائی، کشمکش، مداوائے جنوں، تحریک، سونے کی چوڑیاں، عکسِ زنداں، فریب خودآگہی'' جیسی معیاری نظمیں کہیں۔

اُن کی اردو پر لکھی ہوئی نظم نے ''کل ہند اردو کانفرنس'' کے مندوبین کا دل جیت لیا۔ مشہور نقاد احتشام حسین نے، جو عام طور پر لیئے دیئے رہتے تھے، اُنہیں گلے لگا کر داد دی۔

لندن آنے کے بعد ستم ہائے روزگار نے اُن کے ادبی سلسلے کو منقطع سا کر دیا۔ ایک اجنبی دیار دوسرے غیر ادبی ماحول تیسرے فاصلے؛ وہ اپنا کیریئر بنانے میں مصروف رہے اور کامیاب ہوئے۔ حالاں کہ اُن کا قیام چارلس ڈکنس کے شہر روچسٹر میں تھا اور ہو (Hoo) کی خوب صورت فضا شعر و شاعری کے لئے بہت موزوں تھی لیکن پتا نہیں کیوں وہ ''پر طبیعت ادھر نہیں آتی'' پر عمل پیرا رہے۔

۱۹۷۳ء میں بھوپال کی ایک سربر آوردہ فیملی میں اُن کی شادی ہوئی۔ اُن کی اہلیہ عابدہ بیگم علم نباتات میں پوسٹ گریجویٹ تھیں اور سائنسی ذہن کی مالک۔ اُن کی رفاقت کا ثمر اولیں ایک خوب صورت بیٹے کی شکل میں ملا، شیزی جواب ایک ڈاکٹر ہے۔ پھر دو بیٹیاں رمونا اور نتاشا سے اُن کا گھر آنگن مہکا۔ نتاشا ابھی تعلیم مکمل کر رہی ہیں جب کہ رمونا لندن یونیورسٹی میں ریسرچ ایڈمنسٹریٹر ہے۔

اکرام اشعر نے قبل از وقت رٹائرمنٹ لے کر دو نرسنگ ہوم قائم کیئے اور ایک خوش حال زندگی کا خواب اس طرح پورا ہوا۔ ان نرسنگ ہوموں کی کامیابی میں عابدہ بیگم کی انتظامی صلاحیت اور قابلیت کو بڑا دخل ہے۔

اکرام اشعر سماجی بہبود کے کاموں میں بھی سرگرم عمل رہے۔ نسلی امتیاز کے خلاف انجمن کے تیس (۳۰) سال تک صدر رہے۔ اقلیت کی فلاح کے لئے بھی کام کرتے رہے۔ اُن کی ان سماجی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۸ء میں ''جسٹس آف پیس'' کے عہدے پر فائز ہوئے۔

یہ پوچھنے پر کہ ان کی ادبی دنیا میں واپسی کس طرح ہوئی؟ انہوں نے بتایا ...''۱۹۹۱ء میں بریڈفورڈ میں ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر صفات علوی کی قیادت میں ایک عالمی اردو کانفرنس ہوئی تھی جس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر نثار احمد فاروقی کے ساتھ پروفیسر آفاق احمد بھی آئے تھے۔ یہ میرے بچپن کے دوست تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کی اور ایک بار پھر شعر و ادب کی دنیا میں واپس آ گیا''۔

نظم اور غزل کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا...'' کیوں کہ میں نظم کا شاعر ہوں اس لئے مختلف موضوعات کی پیشکش کے لئے اُسے بہتر سمجھتا ہوں، لیکن دل کے معاملات کے اظہار کے لئے غزل مناسب ہے''۔ انہوں نے کہا ...'' حالاں کہ میں عام طور پر موضوعاتی نظمیں کہتا ہوں لیکن غزل بھی میرے لئے شجر ممنوعہ نہیں۔ جب کوساوا پر کچھ کہنا چاہا تو وہاں کے مناظر اور معصوموں پر ظلم کے اظہار کے لئے میں نے نظم ہی کو منتخب کیا۔

آپ نے لوح پر لکھ لیے تھے
اُن کے ناموں کے خوں بار حرف
اُن کے چہروں کے جولاں خطوط

ان کے جسموں کے چھلنی نقوش
ان کے ہونٹوں کے بجھتے ہوئے جل ترنگ
اُن کی وادی میں روتے ہوئے خشت و سنگ
عرشِ اعلیٰ کے منصف در و بام سے
چھنی تھیں صدائیں جو بولی نہ تھیں
اُٹھے تھے وہ محشر جو خاموش تھے
دل بریدہ تھے راہوں میں شاخ و شجر
طائر تھے جب دم بخود اپنی پرواز پر
مصلحت تھی بتا تیری کس حال میں
پھنسایا تھا کونین کو تو نے کس جال میں!

اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید اکرام اشعر اردو رسم الخط بدلنے کو روح و جسم کو منقطع کرنا سمجھتے ہیں کہ اس کا موجودہ رسم الخط ہی اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ وہ نثری غزل کے تجربے کو تن آسانی قرار دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے قد آور شعرا میں اقبال سرِ فہرست ہیں جب کہ مجروح، ساحر، مخدوم، سردار جعفری، فیض، جذبی، اختر الایمان بھی آفتاب و مہتاب کی طرح درخشاں ہیں۔

اور پھر بولے..."رہی میری زندگی کے کسی یادگار واقعہ کی بات تو یادوں کی پوری ایک انجمن سجی ہوئی ہے۔ کس کس واقعہ کا ذکر کروں۔ اپنی ہندوستان سے مراجعت، اپنی ایک سگھڑ خاتون سے شادی اور پیارے پیارے بچوں کی سنگت! زندگی کا ہر واقعہ یادگار ہے"۔ خوب صورت اور خوب سیرت اکرام اشعر یہ کہہ کر دور خلا میں کچھ دیکھ رہے تھے... شاید اپنے ماضی کو شاید اپنے حال کو یا شاید اپنے مستقبل کو۔

Mr. Ikram Ashar,
The School House, Stoke Road, Hoo, Rochester, Kent, ME3 9BJ, UK

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

دو طرفہ فضاؤں میں مہکتی ہے ندا اور
صحرا کا خدا اور ہے محمل کا خدا اور

مقتل میں اس سے ملاقات ہوئی ہے
مدت میں کہیں جاکے کوئی بات ہوئی ہے

ساقی کا مشورہ ہے کہ رندانِ بد حواس
جام وسبو کو چھوڑ دیں نظروں سے کام لیں

احساسِ زیاں اپنی محفل میں اگر ہوتا
اُس زود پشیماں کے انداز بدل جاتے

جب سے منعم کی بھیک پائی ہے
رشک آتا ہے فاقہ مستوں پر

لینے کو انتقام غزالانِ شہر سے
سب عارف المقام سبو خوار ہوئے تھے

جب سے ہوا حرام ہمیں مے کدہ اشعرؔ
توبہ میں دل لگا نہ مناجات ہوگی

باسم ربی

باغ انگور کے چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں

پاگل بوڑھا پل پل کشمش کشمش کرتا رہتا ہے۔

پروین کمار اشک

۷

۵

۲۰۰۵

پروین کمار اشک

پٹھان کوٹ، پنجاب، ہندوستان

''اشک اگر تم شاعر نہ ہوتے تو کیا ہوتے''؟ میں نے جانے کیوں اس سے پوچھ لیا، جب کہ مجھے پتا تھا کہ وہ کچھ نہ ہوتا تب بھی شاعر ہوتا اور کچھ ہوتا تو ہوتا مگر شاعر ضرور ہوتا کہ اس کی شخصیت میں، اس کی گفتگو میں، اس کے مدہم لہجے میں، باتیں کرتی آنکھوں میں اور اس کی شگفتہ مسکراہٹ میں ایک شاعر رچا بسا بیٹھا ہے۔ اور اسی رچے بسے شاعر نے اس سے کہلوایا ہے۔

شہرِ دعا کو رستہ کہاں سے مڑتا ہے نقشہ دے یہ نکتہ میں سمجھتا ہوں

سہل ممتنع میں اتنا دل نواز اظہار اشک کے ہاں ہی ملتا ہے۔ اس کی زبان سے یہ شعر سن کر میرا جی چاہا اُسے سنا کروں۔ لوگ داد دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا کیا ہر مشاعرے میں اتنی داد سمیٹ کر لے جاتے ہیں؟

فرمایا... ''آپ کے اس سوال نے زندگی کا ایک حسین ترین واقعہ یاد دلا دیا۔ اجازت ہو تو سنا دوں۔ مگر اسے خودستائی نہ سمجھئے گا''۔

''بسم اللہ'' میں ہمہ تن گوش تھی۔ اور پروین اپنی خوب صورت یادوں کے موتیوں کی مالا پرو رہے تھے... ''یہ چند سال قبل کا واقعہ ہے۔ مہاراشٹر کے شہر پونے میں ایک کل ہند مشاعرے پر مجھے مرحومہ ممتاز مرزا صاحبہ نے دلّی سے

بلوایا۔ میں نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی ۔

وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا — بزرگ ہوکے بھی دیکھو دعا نہیں دیتا
کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی — خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا
مجھے یہ کیسا سمندر صدائیں دیتا ہے — جو مجھ کو ڈوبنے کا حوصلہ نہیں دیتا
وہ مرے پھول میری تتلیاں کہاں دے گا — جو ننگی شاخ کو پتا ہرا نہیں دیتا

ہر شعر پر چھتیں اُڑا دینے والی داد ملی جسے میں نے سرنگوں ہوکر شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ مگر مشاعرے کے بعد علی سردار جعفری صاحب مرحوم نے اپنی شخصی عظمتوں کا جس خلوص اور شفقت کے ساتھ بیساختہ مظاہرہ کیا آخری سانس تک نہ بھلا سکوں گا۔ مرحوم موصوف نے بانہوں میں بھر کر فرمایا..'خوش رہیئے۔ آپ کا انداز بے حد جداگانہ ہے اور آپ کے اشعار ماشاءاللہ بے حد خوب صورت۔ بہت دنوں تک یاد رہیں گے۔ میں آب دیدہ ہوگیا تھا۔ اتنا عظیم شاعر مجھ ایسے نئی نسل کے شاعر کے ساتھ کس درجہ اخلاص کا مظاہرہ کر رہا تھا کہ میرے روئیں روئیں سے دعائیں نکل رہیں تھیں۔ سچ مچ بڑے بڑے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ ہمارے جعفری صاحب کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ آمین ثمہ آمین !!''۔

پاکستان کے ایک معتبر شاعر ناصر شہزاد نے پروین کمار کے مجموعۂ کلام ''شہر دعا کا مسافر'' میں لکھا ہے..''ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر لوہے کی باڑ اور بندوقوں کی دھاڑ نے اور تو یقیناً سب کچھ روک لیا ہوگا مگر کچھ چیزوں کو یہ کڑے پہرے اور سنگلاخ کٹہرے نہیں روک سکے۔ پرندوں کی آواز، سُر کا اعجاز اور شعر کا انداز اسی طرح ان دونوں ملکوں میں تنویر ہو رہا ہے جیسے کہ وہ بٹوارے سے پہلے تھا۔ آج بھی سرحدوں کے آر پار بولتے ہوئے پنچھیوں کی چہکار وہی مہکار استوار کرتی ہے جو ان دونوں ملکوں کی تقسیم سے پہلے تھی۔ لتا جی کے سُر کے سمپت' اور بلمپت' ادھر بھی وہی اثر چھوڑتے ہیں جو اُدھر میڈم نور جہاں کی گائیکی کے گُر سے منور ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری کے لئے ادھر بھی وہی پیار ہے جو اُدھر مجید امجد اور فیض احمد فیض کے لئے روبہ کار ہے۔ ملک بٹ چکا ہے، بہت ساری رسمیں اور رواج ایک دوسرے سے کٹ کر درگھٹ ہوگئے ہیں مگر انسانیت سے محبت کرنے والوں کی صدا آج بھی اُسی طرح خوش نوا ہے جیسے کہ پہلے کبھی تھی ۔

تُم نے کیوں بارود بچھا دی دھرتی پر — میں تو دعا کا شہر بسانے والا تھا

یہ آواز پروین کمار اشک کی آواز ہے جس نے اردو غزل کو ایک نئے اعجاز سے سرفراز کیا ہے۔ پروین کمار اشک ہندوستان اُن چند شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے ادھر اردو غزل کے جمال کو روبہ زوال نہیں ہونے دیا۔ پروین کمار کی غزل میں جدید انداز کی نئی نئی جہتیں ہیں۔ غزل میں وہ اپنی بات بڑی آسانی اور بڑی کامرانی سے صراط کر رہا ہے۔ سرزمیں پاک وہند کے بٹ جانے کا درد اُس کے رگ وپے میں ہر شے سے زیادہ سرایت کر گیا ہے۔ وہ اس دکھ سے نراس اور اُداس ہے۔ اس کے اندر کا انسان ٹوٹ پھوٹ کر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے ۔

اب میں اُس سرحد سے ٹکراتا ہوں سر — پار جس کے میرا بازو رہ گیا

اور

اس کو دیکھوں سرحد پار اور بے قابو ہو جاؤں

ممکن ہے کہ پروین کمار اشک کے اجداد اس دھرتی پر آباد ہوں جو آج پاکستان کے منطقے کی روداد ہے۔ ممکن ہے کہ پروین کمار اشک نے ان کی زبانی وہ کہانی سنی جو آج اس خطے کی ضوفشانی اور جاودانی کی ترجمانی کرتی ہے"۔

باغ انگور کے چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں پاگل بوڑھا پل پل کشمش کرتا رہتا ہے

ناصر شہزاد کا خیال درست ہے۔ پروین کمار نے بتایا ان کے اجداد کا اصل وطن ہوشیار پور (پنجاب، پاکستان) تھا مگر بسلسلہ روزگار ہجرت کر کے ۱۹۲۸ء میں مستقلاً پٹھان کوٹ میں سکونت پزیر ہو گئے تھے۔ اشک کے والد کا نام آنجہانی کلونت رائے کنول ہوشیار پوری تھا۔ وہ "جنم بھومی" نامی اردو ادبی رسالے کے مدیر تھے۔ پروین یکم نومبر ۱۹۵۱ء کو لدھیانہ، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم پٹھان کوٹ میں حاصل کی۔ لدھیانہ سے سول انجینیرنگ میں ڈگری لی۔ خود کبھی پاکستان میں نہیں رہے۔ مگر والدین کی ہجرتوں کے دکھ کی کہانیاں سنی ہیں۔ حساس دل پایا ہے چنانچہ ۱۹۷۴ء سے شعر گوئی شروع کی۔ ان کی پہلی غزل سے، جو رسالہ "تحریک" کے سلور جوبلی نمبر میں شائع ہوئی تھی، یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

پھل دار تھا تو گاؤں اُسے پوجتا رہا سوکھا تو قتل ہو گیا وہ بے زباں درخت

پروین کمار اشک نے جس نہج پر اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی اس فکر کو اس نے اپنے مطالعے اور ریاض سے پروان چڑھایا۔ اس کی شاعری میں صوفی ازم (sufism تصوف) کے ناطے خدا سے قربت کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

رات خدا بھی سو نہ سکا چشم دعا میں آنسو تھا

اور

خوش لباسوں کی صحبت میں میاں اپنی چادر سنبھال رکھا کرو

پروین کی فکر نے کئی منزلیں طے کر لیں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ...

نہ پکڑی قافلے کی جس نے انگلی وہ بچہ سب سے آگے چل رہا ہے

چنانچہ پچیس (۲۵) سال کی ریاضت کے سفر نے اس کی جھولی میں اس کی شناخت کے کئی ایوارڈ اور انعامات ڈالے۔ ان میں فراق گورکھپوری ایوارڈ، بہار اردو اکاڈمی ایوارڈ، بنگال اردو اکاڈمی ایوارڈ، محکمہ السنہ پنجاب ادب ایوارڈ اور شہنشاہ غزل ایوارڈ شامل ہیں۔ بی بی سی لندن نے بعنوان "غزل کا سفر" ان کا ایک طویل لائیو انٹرویو (live interview) لیا۔ وہ کئی مشاعروں میں شرکت کر کے ان مشاعروں کی شان و شوکت میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ اب ان کی خواہش ہے کہ وہ برطانیہ اور امریکہ کے عالمی مشاعروں میں شریک ہو کر ان اردو دان احباب سے، جو اردو کی نئی بستیوں میں شعر و ادب کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں، تبادلۂ خیال کریں۔ اسی حوالے سے انہوں نے کہا... "بلاشبہ اردو زبان و ادب کے مستقبل سے پُر امید ہوں۔ بس اردو والے اگر از خود اردو والوں کی حق تلفیاں کرنا چھوڑ دیں، اپنی تجارتی کاروباری کنبہ پرور ذہنیت کا مظاہرہ نہ کریں، گروہ بندیوں اور ادبی سیاستوں سے گریز کریں، اردو کے ہر سچے، معتبر ادیب و شاعر کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دیں، بلا امتیاز

مذہب وملت خاص طور پر اردو کے غیر مسلم شعرا و ادبا کے ساتھ مخلص ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں یہ زبان ترقی نہ کرے۔ مگر اس کے لئے ہمیں ہر اردو والے کو اس کا جائز مقام اور حق دینا ہوگا۔ اسی طرح رسم الخط کو تبدیل کرنا اردو کا گلا گھونٹنے کے برابر ہے۔ مدیران رسائل و جرائد اور اراکین اردو اکاڈمیوں کو اپنا اردو کے تئیں فرض پہچاننا از بس ضروری ہے"۔

اگلے سوال کے جواب میں پروین کمار نے کہا... "میں نے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتیں اردو غزل کے واسطے وقف کر دی ہیں۔ مگر کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اردو ماہیے بھی لکھے ہیں۔ ماہیے میں بھی میری شعری انفرادیت کا اعتراف عالم گیر سطح پر ہوا ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل سے میرا کوئی علاقہ نہیں، ویسے نثری نظم کو مطالعاتی سطح پر میں پسند کرتا ہوں"۔

پروین کمار کہہ رہے تھے ... "یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم اظہار کا بہتر ذریعہ ہے۔ میری رائے میں اردو ادب میں صرف غزل ہی زندہ جاوید تھی، ہے اور انشا اللہ رہے گی۔ اس کا محض ایک ہی خوب صورت شعر سینکڑوں بے کیف اور لولی لنگڑی نظموں پر بھاری ہو کر ہمارے شعور اور وجدان کو مسخر کرنے صلاحیت رکھتا ہے۔ اور پھر ایسا کون سا موضوع ہے جس کی سمائی اردو غزل کے ایک شعر میں نہیں ہو سکتی۔ اردو کی شاعری میں گنتی کی صرف پانچ دس نظمیں ایسی ہیں جنہیں قبول عام حاصل ہو سکا جب کہ غزل کے ہزاروں اشعار ہمارے زخموں پر مرہم کی طرح کام کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ آج کا ادب اپنے عہد کی واقعی ترجمانی کر رہا ہے جس کی مقدار ذرا کم ہے۔ اردو زبان کے ساتھ میرا عشق ازلی ہے۔ اس کے اپنانے سے جذباتی طور پر اس کے ٹھیکے داروں نے بے طرح مجروح کیا یوں کہ سرکاری جرائد نے مجھے یکسر نظر انداز کر رکھا ہے حالانکہ میری غزل کو عالم گیر سطح پر بالکل انفرادی، مختلف اور ممتاز قرار دیا ہے۔ مگر گروہ بند ادبی سیاست نے میرے مقابلے میں خاصے کمزور شاعروں کو زیادہ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال اس میں ذاتی نقصان جو ہوا سو ہوا، پر قارئین کو ان اردو دشمنوں نے ضرور سچے اور بہتر ادب سے پرے رکھا"۔

میں نے پوچھا کہ آپ کن شعرا سے متاثر رہے؟ پروین کمار نے ایک لمحہ سوچا، پھر کہا ... "مجھے فراق گورکھپوری، عبدالحمید عدم، ناصر کاظمی اور بانی پسند ہیں۔ فراق گورکھپوری بیسویں صدی کا عظیم غزل نگار ہے۔ عدم، بانی، ڈاکٹر وزیر آغا، احمد مشتاق، ظفر اقبال، پروین شاکر، شکیب جلالی وغیرہ کئی شعرا ہیں جن کے کلام سے میں متاثر ہوں"۔

اشک تو کئی شعرا سے متاثر ہیں لیکن ان کے کلام سے متاثر ہونے والوں کے نام کی ایک لمبی فہرست ہے۔ چند جید شعرا کی آرا ملاحظہ ہوں:

لندن کے ساقی فاروقی بمشکل ہی کسی کے کلام کو سراہتے ہیں۔ مگر پروین کمار اشک کے کلام کو پڑھ کر انہوں نے لکھا۔ "چاندنی کے خطوط ملے۔ شکریہ۔ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ میں فلیپ پر لکھی ہوئی آرا سے متفق ہوا ہوں۔ مگر اس بار اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ میں تمہاری تازہ کاری سے اور زبان پر کنٹرول سے

بہت متاثر ہوا۔ مجھے اپنے آپ سے شکایت ہے کہ میں نے تمہیں پہلے دریافت کیوں نہیں کیا"۔

اور اب آخر میں ڈاکٹر وزیر آغا کا تبصرہ بھی دیکھیے ... "ماں کے حوالے سے شاعر کے محسوسات اور رویوں میں بھی ایک بچے کی سی معصومیت اور حیرت جاگ اٹھی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی محبوبہ بھی کوئی پختہ عمر، پُر اعتماد حسینہ نہیں، بلکہ کچے جذبات کی خوش بو میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی ہے۔ گویا شاعر کی معصومیت نے محبت کے معاملے میں بھی معصومیت کی حامل ہستی ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے"۔

راہ میں پہلے سمند آئے گا — میرے بچے! پھر تیرا گھر آئے گا

میں سفر میں جہاں بھی تھکنے لگا — سر پہ رکھا تری دعا نے ہاتھ

اور

غم کے سفر سے لوٹ کر جب پہنچا اپنے گھر — بانہوں میں لے کر رو پڑا میرا مکان مجھے

Mr Parveen Kumar Ashk,

T-4/161, Shahpurkandhi Town Ship, Near Pathankot, Punjab,

India, Pin 145029

انتخابِ کلام

زمیں کو یا خدا وہ زلزلہ دے — نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے

سیاست کی اگر ماں مارنی ہے — تو پھر لاہور دلّی سے ملا دے

بزرگوں کا بس اک کمرا بچا ہے — تو جب چاہے پرانا گھر گرا دے

فلک پر اک ستارہ رہ گیا ہے — خدا! اس کو مری قسمت بنا دے

مرا کردار بھی کر قتل یارب — مجھے بھی شہر میں جینا سکھا دے

خوشی میں ایسی گولی مت چلانا — شجر سے جو پرندوں کو اُڑا دے

الف سے آشنا اسکول کوئی — مرے بچوں کو جو پڑھنا سکھا دے

مہاجر کا مکاں خالی ہے لیکن — میں در کھولوں تو کوئی بد دعا دے

میں سورج توڑ لاؤں گا نہیں تو — مجھے اے روشنی اپنا پتا دے

میں ہمسایا ہوں تیرا اشکؔ مجھ کو
ذرا سی دھوپ تھوڑی سی ہوا دے

اگر یہی ہے کہ تشکیں بے ہنر میں رہے
مری نمود ابھی دست کوزہ گر میں رہے

/اطہر شاہ خاں
2 فروری 2002

اطہر شاہ خان جیدی

کراچی، پاکستان

ٹیلی ویژن پر میں نے جب اُسے ایک خبطی انسان کی ایکٹنگ (acting کردار ادا) کرتے دیکھا تو اُس کی فن کاری کا لوہا مان گئی۔ لیکن جب اُسی شخص کو سنجیدہ اشعار سناتے دیکھا تو اس کے پڑھنے کے انداز میں اُس کی معتبر شخصیت کا حوالہ نظر آیا۔ اس وقت مجھے اس کا اپنا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا۔

کبھی یہ وقت بھی بہروپیے پہ آتا ہے بنا کے اپنا تماشہ وہ آپ ہی دیکھے

یہ اطہر شاہ خان جیدی ہیں جو آپ کو ہنسانے پر آئیں تو کہیں گے۔

کہا تھا کس نے کہ عمر بھر کا وبال رکھنا سر پہ قرضے میں ساس کو یرغمال رکھنا

اور

وطن سے اپنے مٹائیں گے رشوت اور سفارش مگر ذرا میرے بھانجے کا خیال رکھنا

احمد شاہ بخاری اور اطہر شاہ خان میں اگر کوئی مماثلت ہے تو ''شاہ'' کی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بھی مماثلت بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ احمد شاہ بخاری پطرس اس بات کے قائل تھے اور جیسا کہ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک محفل میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا... ''میں آپ کو گے ہاتھوں یہ بتا دوں کہ اس ادبی مباحثے کا موضوع تھا'' دا پروپر اسٹڈی آف مین کائنڈ از وُمن (The Proper

Study of Mankind is Woman صنف نازک ہی اصل انسانی مطالعہ ہے)"۔ محفل کے صدر تھے سر عبدالقادر اور پطرس فرما رہے تھے..." صاحب صدر صنف نازک کے مطالعے کے بغیر سائنس کا مطالعہ ناممکن ہے۔ کیا آپ میگنیٹ ازم (magnetism مقناطیسیت) کا مطالعہ صنفِ نازک کے بغیر مکمل سمجھیں گے جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پُر کشش ہستی خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کی۔ کیا آپ حرارت (heat) کا مطالعہ کرنے میں عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب کہ آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی عورت کی موجودگی کی مرہونِ منت ہے۔ کیا آپ الیکٹریسٹی (electricity برقیات) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ حوا کی بیٹیاں بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں۔ اگر لیونارڈو،(Leonardo da Vinci) رافیل (Rafial) اور مائیکل اینجلو (Michael Angeleno) نے عورت کے خدوخال کا قریب سے مطالعہ نہ کیا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی مجسموں اور تصاویر کی تخلیق کر سکتے تھے؟ اگر کالی داس، شیکسپیئر (Shakespear) اور دانتے (Aligheri Daunte) نے صنفِ نازک کے مطالعے میں شب و روز نہ گزارے ہوتے تو کیا وہ شکنتلا، روزالنڈ (Rosalind) اور بیٹریس (Beatrice) جیسی تخلیقات عالمی ادب کو دے سکتے تھے؟ چنانچہ اگر آج فنونِ لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعے کے اصل موضوع سے بھٹک گئے ہیں"۔

اطہر شاہ خان جیدی بھی غالباً پطرس کے ہم نوا ہیں۔ اپنے محبوب کی آنکھ مچولیوں سے تنگ آ کر کہتے ہیں۔

تجھے جھٹی سے نظر آئیں مرے سارے رقیب وہ اندھیرا تری بینائی میں پیدا ہو جائے

اور یہی اطہر شاہ خان جب سنجیدہ ہوتے ہیں تو محبوب کی بے اعتنائی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تیرہ شبی کی ساعتیں دونوں نے مل کے بانٹ لیں میں نے اُسے دیا دیا، وہ مجھے خواب دے گیا

اسی اطہر شاہ خان سے میں آج آپ کو ملوا رہی ہوں جنہوں نے یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو رام پور، ہندوستان میں جنم لیا۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے صحافت میں ایم اے کیا اور ہومیو پیتھک میں ڈی ایچ ایم ایس، آر ایچ ایم پی کر کے ڈاکٹر کہلائے۔ اطہر نے اپنے حالات زندگی بتاتے ہوئے کہا کہ انہوں نے چھوٹی عمر میں انڈیا سے ہجرت کی۔ پاکستان آ کر ان کے لڑکپن ہی میں والدین انتقال کر گئے۔ بڑے بھائی سلیم شاہ خان نے ان کی پرورش کی۔ وہ پی آئی اے میں انجینیئر تھے۔ ان کے تبادلوں کے ساتھ شہر بدلتے رہے۔ پرائمری کلاسیں لاہور میں پڑھیں، میٹرک پشاور سے کیا، گریجویشن کراچی سے اور ماسٹرز ڈگری لاہور سے حاصل کی۔ بچپن میں بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور مضامین لکھے۔ میٹرک کے بعد ریڈیو ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ صداکاری بھی کی۔ لاہور سے پاکستان ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا تو ٹی وی کی تاریخ میں ۱۹۶۵ء میں پہلی مزاحیہ سیریز "لاکھوں میں تین..." لکھی۔ پھر ان کا قلم تھما ہی نہیں۔ ٹی وی کے ساتھ ریڈیو ڈرامے بھی چلتے رہے۔ اسٹیج ڈرامے بھی اور فلمی کہانیاں بھی مثلاً

''گونج اٹھی شہنائی''، ''آس پاس'' اور ''منجھی کتھے ڈاہواں'' جیسی مشہور فلموں کی کہانیاں انہوں نے لکھیں اور ''آس پاس'' کی ڈائرکشن (direction ہدایت کاری) بھی کی۔ ریڈیو کی تاریخ کا سب سے طویل کمرشیل پروگرام ''رنگ ہی رنگ، جیدی کے سنگ'' تقریباً انیس (۱۹) سال چلا۔ اور یہاں ہی سے اپنی مزاحیہ شاعری کے لئے ''جیدی'' تخلص اختیار کیا۔ لاہور ٹی وی کے لئے بے شمار ڈرامے لکھے کہ اب ان کی تعداد بھی انہیں یاد نہیں، غالباً سات سو (۷۰۰) ڈرامے ریڈیو کے لئے اور تین سو (۳۰۰) ٹی وی کے لئے۔ مشہور سیریلوں میں ''انتظار فرمائیے''، ''ہیلو، ہیلو''، ''جانے دو''، ''رفتہ رفتہ''، ''برگر فیملی''، ''پرابلم ہاؤس'' اور ''باادب باملاحظہ ہوشیار'' شامل ہیں۔ انہوں نے سب ہی فنون میں حصہ لیا۔ چنانچہ ریڈیو، ٹی وی، اسٹیج، فلم، اداکاری، ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور شاعری بھی بیک وقت چلتی رہی۔

اطہر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اتنے افسانے لکھے کہ مجموعہ شائع ہوسکتا ہے۔ اب بھی نمایاں ادبی جرائد، ''افکار، سیپ، فنون، اور نقوش'' میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پر خدمات کے لئے بے شمار ایوارڈوں اور گولڈ میڈلوں کے علاوہ حکومتِ پاکستان کا اعزاز ''صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی (پرائڈ آف پرفارمنس Pride of Performance) بھی انہیں مل چکا ہے۔ جنہوں نے اطہر کے مزاحیہ ڈرامے دیکھے ہیں وہ ''جیدی'' کے کردار کو بھول ہی نہیں سکتے۔

اطہر نے بتایا کہ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں شادی کی۔ ہنس کر کہنے لگے ...''صرف ایک بیوی ہے اور چار بچے ہیں''۔ لیکن غالب کی طرح پیر میں پڑی ایک ہی زنجیر کے شاکی نہیں ہیں۔ شادی کے کئی سال بعد ان کا جی ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے کا چاہا۔ چناں چہ سینٹرل ہومیو پیتھک میڈیکل کالج کراچی میں داخلہ لیا اور سال اول سے آخری سال تک باقاعدہ پڑھ کر ڈاکٹری کا امتحان نمایاں نمبروں سے پاس کیا۔ اب حکومتِ پاکستان کے منظور کردہ سند یافتہ ڈاکٹر ہیں۔

شاعری کی ابتدا کب ہوئی، میں نے پوچھا؟ کہنے لگے: ''ہاں، یہ بھی سن لیں۔ شاعری کے علاوہ باقی تمام شعبوں کا ذکر تو ہو چکا، خصوصاً ڈرامہ نگاری... لیکن ڈراموں سے وابستگی صرف 'کچن' کے لئے تھی کیونکہ ڈراموں کا چیک بھی ملتا ہے۔ مگر شاعری ذریعۂ معاش سے ہٹ کر ہمیشہ پہلی ترجیح رہی، کیوں کہ یہ میں اپنی تسکینِ قلب کے لئے کرتا ہوں اور یہ ہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ شاعری کا آغاز تو لڑکپن ہی میں ہو گیا تھا نوجوانی میں یہ شعلہ خوب بھڑکا اور بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ شاعری کی باقاعدگی کو چالیس بیالیس سال ہو چکے ہیں لیکن مشاعروں میں شرکت پچھلے بیس سال سے کر رہا ہوں۔ سنجیدہ محفلوں میں سنجیدہ کلام سناتا ہوں اور کالجوں وغیرہ میں مزاحیہ غزلیں اور قطعات پڑھتا ہوں۔ اب سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں''۔

اطہر نے بارہ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا ـ

ہم پہ اک سانس بھی قیامت ہے　　　لوگ کہتے ہیں مسکرانے کو

اگلے سوال کے جواب میں کہنے لگے ... ''میں رجائیت پسند ضرور ہوں لیکن اردو زبان کا مستقبل زیادہ تابناک نظر نہیں آ رہا ہے کیوں کہ جس طرح ہمارے ملک میں انگریزی غلبہ پا رہی ہے، ممکن ہے کہ چالیس پچاس سال بعد ہماری وہ انگریزی زدہ نسل انگریزی میں شاعری کر رہی ہو۔

میری رائے میں اردو کا رسم الخط بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں اس سے بے حد مشکلات پیدا ہوں گی۔ اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کا صحیح تلفظ ہی ناممکن ہو جائے گا۔

میرے خیال میں آج کا ادب کافی حد تک اپنے عہد کا ترجمان ہے لیکن ادب کی رسائی عوام تک نہیں ہے۔

میں کہوں گا کہ اچھی نظم کہنا غزل کے نسبت مشکل کام ہے۔ غزل کے مختلف اشعار میں مختلف موضوع ہوتے ہیں جب کہ نظم ایک ہی موضوع یا خیال تسلسل سے موجزن ہوتا ہے اور کلائمیکس (climax عروج) کے تحیر کا التزام بھی رکھنا پڑتا ہے۔ نظم احساسات کے اظہار کے لئے بہت وسعت رکھتی ہے۔ لیکن غزل کو جو مقبولیت ملی ہے وہ نظم کے حصے میں نہیں آئی''۔

اطہر شاہ خان کا مجموعہ کلام جلد طبع ہوگا فیصلہ یہ کرنا ہے کہ پہلے سنجیدہ شاعری کا یا مزاحیہ شاعری کا۔ انہیں اپنی سنجیدہ شاعری زیادہ پسند ہے کیوں کہ اس میں ان کے اندر کے فکری جوہر کھل کر نمایاں ہوتے ہیں۔

Dr. Athar Shah Khan,

D-18, safari Heights, Gulistan-e-Johar, Block 15, Karachi, Pakistan

انتخابِ کلام

محرابوں پر ظلم اگر لکھوائے جاتے　　　کتنے تاج محل مسمار کرائے جاتے

کچھ دُکھ ساتھ اگر کر دیتے اچھا ہوتا　　　ہم تنہا رستے میں دل بہلائے جاتے

نفرت کس نے بوئی ہے دیوار کے پیچھے　　　یوں ہی میرے پھول نہیں مرجھائے جاتے

قیدی ہونے کا احساس مٹا جاتا ہے　　　زنداں میں کچھ روزن بھی کھلوائے جاتے

فرشِ خاک پہ لمبی تان کے سوجاتا ہوں　　　چادر ہو تو پاؤں نہیں پھیلائے جاتے

دار سے بھی رشتہ ہوتا ہے سرداری کا　　　ہر گردن کو ہار نہیں پہنائے جاتے

ہر کتبے پر مَن چاہی تعبیریں لکھتے
اطہر اپنے خواب اگر دفنائے جاتے

سید یونس اعجاز

ڈیلاس، ٹیکساس، امریکہ

آج ایک باغ و بہار شخصیت اور اپنے کلام میں زندہ و پائندہ شاعر، سید یونس اعجاز کا تعارف لکھنے بیٹھی تو کچھ گزرے زمانے کے ساتھ چند گزرے شعرا بھی یاد آ گئے۔ ان میں ایک بانکا بجیلا شاعر جون ایلیا بھی تھا۔ ۸ / نومبر ۲۰۰۲ء کے دن جون ایلیا کے ہم سب سے روٹھ جانے کی خبر میں نے دو ہفتے بعد روز نامہ جنگ، لندن میں محترم عطاالحق قاسمی کے کالم میں پڑھی۔ میں ان دنوں برمنگھم، برطانیہ میں ہوں اور نہ صرف باقاعدگی سے اخبار نہیں پڑھتی بلکہ بہت سے کاموں کو ارادتاً بے قاعدگی سے کر رہی ہوں کہ کاموں میں یکسانیت بھی ایک طرح سے جمود اور دبے پاؤں آنے والی موت کی اعلان دہندہ ہے۔

۲۱ / نومبر، جمعرات کے روز نامہ جنگ، لندن کے ادبی ایڈیشن میں جون کی تصویر دیکھی۔ جمال احسانی بھی جون کے ساتھ تھے۔ دونوں ہی اپنے دور کے نمائندہ شاعر تھے اور دونوں نے جانے میں جلدی کی۔ ابھی ان کی ضرورت تھی۔

پھر مجھے سلیم جعفری مرحوم یاد آئے جو دبئی میں منعقد ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے جشن منعقد کرنے کے حوالے سے یاد کیئے جاتے ہیں۔ وہ جشن اب بھی منعقد کیئے جاتے ہیں تا کہ آنے والی نسلوں کے لئے پچھلوں کی کارکردگی مشعلِ راہ بنے۔ میں نے بھی ۱۹۹۵ء میں اسی خواہش کے تحت

لاس اینجلس میں مقیم محترمہ نیر جہاں (سکریٹری اردو مرکز انٹرنیشنل) سے دوبئی میں مقیم سلیم جعفری کا پتا لے کر انہیں خط لکھا کہ وہ عرب امارات کے چند شعرا و شاعرات کے پتے مجھے عنایت کریں کیونکہ میں "سخنور دوم" کی تیاری کر رہی تھی اور "سخنور اول" جو میں نے ۱۹۷۱ء میں مرتب کر کے شائع کی تھی اس کی پشت پر اپنے پڑھنے والوں سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کے بقیہ شعرا کا تعارف میں جلد ہی "سخنور دوم" کے ذریعے ان تک پہنچاؤں گی۔ مگر میری کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس میں تاخیر ہو گئی۔

چند دنوں بعد سلیم جعفری مرحوم نے مجھے فون کیا اور کہا کہ مشرق وسطیٰ کے شعرا پر وہاں ایک کتاب ۱۹۹۳ء میں مرتب ہو چکی ہے اب اس پر کام کر کے میں کیا کروں گی۔ مرحوم کے اس جواب سے مجھے مایوسی تو ہوئی لیکن میری لغت سے لفظ 'مایوسی' میں نے اپنی نوعمری ہی میں کاٹ دیا تھا۔ پھر میرا کام تو مشرق وسطیٰ کے شعرا تک محدود نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے دیگر وسائل سے شعرا کے پتے حاصل کیئے اور "سخنور دوم" سے لے کر اب پنجم تک آ پہنچی ہوں اور طے کر رہی ہوں کہ شعرا کے تعارف کا یہ سلسلہ اپنے کاموں کے چارٹ سے اس امید کے ساتھ خارج کر دوں کہ اب اس پر دیگر صاحبان قلم طبع آزمائی کریں کہ میں نے اپنے حصے کا اپنی استعداد کے مطابق کام انجام دے لیا ہے۔

تو ذکر شروع ہوا تھا سید یونس اعجاز کی شخصیت اور کلام پر گفتگو سے۔ بات سے بات نکلی ہے تو یہ بتاتی چلوں کہ یونس اعجاز سے میں چند گھڑیوں کے لئے لاس اینجلس میں ملی ہوں جب وہ میری کتابوں کی تعارفی تقریب کی رونق دوبالا کرنے کے لئے میری دعوت پر ڈیلاس سے تشریف لائے تھے۔ مگر فون پر ان سے خوب گفتگو ہوتی رہی اور پھر ذکا صدیقی کے مضمون سے بھی پتا چلا کہ یونس اعجاز سعودی عرب میں بھی انتہائی فعال اور خدمت گزار رہے ہیں اور کئی مشاعرے منعقد کرا چکے ہیں۔ چنانچہ انہیں سعودی عرب سے الوداع کہتے وقت دوستوں نے انہیں "اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم (Overseas Pakistani Writers Forum)" کی جانب سے "ارمغان اعجاز" کے نام سے ایک کتاب شائع کر کے دی۔ اس مجموعے میں وہ غزلیں ہیں جو سعودی عرب کے مختلف شعرا نے اعجاز صاحب کے منعقد کیئے ہوئے مشاعروں کے لئے کہیں اور پڑھیں۔ انہیں اعزاز بخشنے کے لئے کتاب کا نام بھی ان کے نام پر "ارمغان اعجاز" رکھا گیا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کے توسط سے جس شخص کی اپنے حلقے میں مقبولیت کا یہ حال ہو پھر وہ شخص کہے۔

یہ سناٹا تو اپنی ذات کا ہے
سکوت بام و در ایسا نہیں تھا

تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ذات کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

بے کسی بھی کم نہیں ہوتی بڑے انسان کی
شہر ہو جتنا بڑا اتنی بڑی تنہائیاں

تو اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو انجمنیں فراہم کرنے والا بھی تنہائیوں کا شکار رہتا ہے۔ مگر ان تنہائیوں کو اپنی محنت سے دوسروں کو مسرتیں فراہم کیئے جانے کے چراغوں سے روشن بھی کرتا ہے۔

یونس اعجاز جتنے اچھے انسان ہیں اتنے ہی دل نواز شاعر بھی ہیں۔ مشاعروں میں، گھریلو نشستوں میں ان سے کلام سنیئے تو لطف آنے لگتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ گفتگو بھی ایسی ہی دل آویز انداز میں

کرتے ہیں۔

میں نے کہا... "اعجاز صاحب! اپنے بارے میں بتائیے" تو کہنے لگے... "سید محمد یونس گیلانی نام اور تخلص اعجاز ہے۔ یوں میں سید یونس اعجاز کہلاتا ہوں۔ میں نے کپورتھلہ (ضلع جالندھر، ہندوستان) میں ۲۱/ جون ۱۹۳۸ء کے دن جنم لیا۔ ابتدائی تین (۳) سال کپورتھلہ کے رندھرا اسکول، پھر چھ (۶) سال ڈی سی ہائی اسکول اور دو (۲) سال گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول ٹوبہ ٹیک سنگھ میں گزارے جہاں سے میٹرک کا امتحان سارے اسکول میں اول رہنے کے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران والدین نور کے تڑکے تلاوت قرآن اور نعت و درود کے زمزموں کے ذریعے مجھے نیند سے بیدار کر کے درس نظامی کی تحصیل کے لئے مولانا مختار الحق صدیقی صاحب کے مدرسے میں روانہ فرماتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن (graduation) کے بعد پانچ (۵) سال تک کاسٹ اکاؤنٹنگ (cost accounting) کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی۔ اسی کے باعث میری روزی حساب کم وبیش سے منسلک ہے۔ حصول پاکستان کی جدوجہد اور اس کے نتیجہ میں کی جانے والی ہجرت کے، جو کہنے کو تو محض کپورتھلہ سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی قلیل مسافت دکھائی دیتی ہے، دوران کوئے قاتل سے گزرنے کی صعوبتیں آج بھی دامنِ دل پکڑ کے بار بار رکنے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لئے مجبور کرتی رہتی ہیں۔ یادوں کے اسی پڑاؤ کے گرد ونواح میں میری شاعری کے لئے غیب سے مضامین میسر آتے رہتے ہیں۔ ستر (۷۰) کی دہائی میں دوسری ہجرت سعودی عرب کی جانب ہوئی۔ جہاں چوبیس (۲۴) برسوں کے قیام کے باعث نہ صرف مالی آسودگی نے ہاتھ تھام کر بچوں کی اعلی تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کے راستے دکھائے بلکہ اس 'طرفہ فارغ البالی' نے سعودی عرب میں 'مجلسِ اقبال' کی بنیاد رکھنے، اس کے بانی سکریٹری جنرل کے فرائض ادا کرنے، اور 'اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم' کے بانی صدر کی حیثیت سے بارہ (۱۲) سال تک فرائض منصبی ادا کرنے اور دیار غیر میں اردو کے بین الاقوامی مشاعرے منعقد کرانے کی توفیق بھی بخشی۔ میں 'مجلسِ اقبال' کے احباب کا ہمیشہ احسان مند رہنے کے ساتھ ساتھ 'اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم' کے کرم فرماؤں کا ممنون رہوں گا کہ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنی شب زندہ داریوں سے ہجرت اور تاریک راتوں کو چاندنی سی ٹھنڈی روشنی بخشی۔ ان صحبتوں میں ذکا صدیقی، سلطان محمود آشفتہ، پروفیسر واصل عثمانی، خورشید احمد، اقبال احمد قمر، سہیل چشتی، اے ایم تجسم، شاہد چغتائی اور مکرم خان صاحبان کے فیض سے فن کی جن بلندیوں تک رسائی ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس باعث برطانیہ، امریکہ اور دبئی کے بین الاقوامی مشاعروں میں شریک ہو کر احمد فراز، پیرزادہ قاسم، سردار جعفری مرحوم، بشیر بدر، امجد اسلام امجد، انور مسعود اور سلیم کوثر جیسے معتبر شعرا کی موجودگی میں اپنے اشعار سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر امجد پرویز، استاد یعقوب خان، استاد بختیار احمد اور شفقت اویل نے نہ صرف میری غزلوں اور گیتوں کے پورے پورے البم تیار کیئے بلکہ پاکستان ٹی وی سے میاں شہریار کی ترتیب دی ہوئی دھنوں میں متعدد بار میرا کلام نشر کیا گیا۔

مئی ۱۹۹۷ء سے امریکہ کے شہر ڈیلاس (ٹیکساس) میں مقیم ہوں۔ یہاں کی سرکاری لائبریری

میں اردو کا گوشہ کھلوانے، 'بزمِ سخن' کی بنیاد رکھنے اور اس کے تحت ماہانہ ادبی تنقیدی محفلیں منعقد کرانے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔

حصولِ تعلیم کے دوران شعر سننے اور سنانے کے مواقع مجھے میسر آ چکے تھے۔ لیکن باقاعدہ شعر کہنے کا موقعہ لائلپور (حال فیصل آباد) کے دو سالہ قیام کے دوران ملا جہاں پروفیسر صدیق سالک کی سرکردگی میں ماہانہ ٹیوٹوریل گروپ (tutorial group) کی مجلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا رہا۔ صدیق سالک صاحب بعد میں ملٹری سروسز (military services) سے منسلک ہو کر بریگیڈیر کے عہدے تک پہنچے اور صدر جنرل ضیا الحق کے طیارے کے ساتھ حادثے میں شہید ہو گئے۔ اساتذہ کی اصلاح کی بدولت بین الکلیاتی طرحی مشاعرے جیتنے کا اعزاز بھی مجھے نصیب ہوا۔ آپ کو حیرت ہوگی کی آج بھی مجھے اپنا پہلا شعر یاد ہے"۔

گڑیوں کی شادیوں میں رہتا تھا پیش پیش — بچپن سے ہی مزاج میرا عاشقانہ تھا

یونس اعجاز گفتگو کے پھول کھلاتے ہوئے کہہ رہے تھے... " کہنے کو تو طبع آزمائی نظم، گیت اور ہائیکو جیسی اصناف میں بھی ہوتی رہی ہے البتہ اپنے مشاہدے کو پیرائے میں ڈھالنے کے لئے میرے نزدیک اردو غزل گوئی کا فن زیادہ شریف صنفِ سخن ہے۔ میں اس امر پر ایمانداری سے یقین رکھتا ہوں...

غزل کے ہاتھ ہے پرچم کشائی تازہ صبحوں کی — دیارِ شعر میں ہم شمعِ اردو لے کے چلتے ہیں

غزل ایک صنفِ سخن ہی نہیں بلکہ چھ ساڑھے چھ سو سال پر پھیلا ہوا ہمارا وہ ثقافتی ورثہ ہے جس کو بلا تفریق ذوق و نظر خاص و عام نے نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اس کی سحر کاریوں کو دلوں میں جگہ دی۔ ویسے غزل دشمنی کی ابتدا خواجہ الطاف حسین حالی کی شہرہ آفاق تصنیف 'مقدمہ شعر و شاعری' سے ہوئی تھی جس میں انہوں نے غزل پر سخت ترین الفاظ میں تنقید فرما کر غزل کے مخالفین کی ایک فوجِ ظفر موج لا کھڑی کی۔ جس کے نتیجے میں کسی دل جلے نے غزل کو 'نیم وحشی صنف' قرار دینے میں کچھ باک نہ رکھا۔ الحمد اللہ، آزادی سے ذرا پہلے علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور آزادی کے بعد غزل کو باقاعدہ ایک مکتبِ فکر بنانے والے احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز جیسے شاعروں کی کاوشوں کے باعث غزل کو اس کا موجودہ حسن اور اہمیت نصیب ہوئی اور جو روبہ ترقی ہے۔ پھر آج کا شاعر (اور قاری بھی) مختلف ناکام تجربوں سے گزر کر غزل کو ہی سب سے زیادہ خوب صورت اور مقبول صنفِ سخن قرار دیتا ہے۔ اردو غزل اپنے مولد و مرکز میں سرکاری دشمنی سے اپنی بیخ کنی کے مراحل سے گزرنے کے باوجود نہ صرف وہاں زندہ ہے بلکہ اس کی فصل دنیا کے کتنے ہی ممالک میں لہلہاتی نظر آتی ہے۔ پاکستان میں نقوش، فنون، بیاض، دنیائے ادب، اوراق اور امریکہ میں سخنور اور زاویہ جیسے جرائد کے اجرا نے تو غزل کو جریدۂ عالم پر بقائے دوام سے سرفراز فرما دیا ہے۔

جہاں تک اردو کے رسم الخط بدلے جانے کی بات ہے، میں اس سے یہاں تک تو اتفاق کرتا ہوں کہ دنیا کی تازہ بستیوں کے مکینوں کو اس تہذیب سے آشنا کرنے کے لئے علاقائی طور پر کسی بھی لباس میں پیش کر دیا جائے لیکن اس کے تہذیبی اور ثقافتی لباس پر کوئی قبا ڈالنے سے نہ صرف جگ ہنسائی کے

مواقع فراہم کیئے جائیں گے بلکہ یہ عمل پرانی وراثتوں کو سرے سے نابود کرنے کا باعث بھی ہو جائے گا"۔

سوال نمبر چھ (۶) کا جواب دیتے ہوئے یونس اعجاز نے کہا..."کسی بھی شجر کی برگ و بار کا زیور پہننے کی خواہش ہمیشہ اپنی بنیاد سے پیوست رہنے کے باعث ہی ہو سکتی ہے۔ جو شاخ اپنے شجر سے ٹوٹ جائے وہ سحابِ بہار سے کیسے ہری ہو سکتی ہے؟ آج کا جدید غزل گو اگر غزل کی روایت سے الگ تھلگ ہو کر کچھ کہے گا تو اُس کی تخلیق 'نقش بر آب' کے علاوہ اور کس زمرے میں آئے گی؟ اس صنفِ سخن کی مقبولیت کا پہلا سر چشمہ اس کی غیر معمولی شیرینی، لطافت اور تہذیبی رکھ رکھاؤ ہے۔ پھر فلمی گیت، مشاعرے، قوالیاں اور غزل کے گائیک ہیں۔ اس کے بعد اخباروں کے ادبی صفحے، دیگر ادبی جرائد، اور آخر آخر شعرا کے شعری مجموعے اور دواوین، جو چھپ کر چاہنے والوں تک پہنچ رہے ہیں اور پھر ذرائع نقل و مراسلات ہیں۔ آج غزل کا شاعر اپنے علاقے کی چوپال میں بیٹھنے والوں ہی کو شعر نہیں سُناتا، بلکہ اس کا قاری پورے گلوبل ولیج (global village) کے کونے کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ آج ادب جس درجے موجود عہد (حال) اور اس کی زندگی کا ترجمان ہے، ماضی میں اسے یہ سعادت کہیں بھی نصیب نہیں ہوئی"۔

نثری نظم کے حوالے سے یونس اعجاز نے بڑے پتے کی بات کی۔ کہنے لگے..."غالبؔ نے کہا تھا:

بہ قدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالبؔ کو اپنے وسعتِ بیان کے لئے جو درکار تھا شاید وہ آج کی نثری نظم ہی ہو۔ لیکن وہ چاہنے کے باوجود اس سے دامن کش ہی رہے۔ نثری نظم میں جو تجربے پروفیسر یوسف حسن، ن م راشد، اخترؔ جعفری، خاقان خاور، سردارؔ جعفری، پروین شاکر، احمد ندیم قاسمی، منصورہ احمد اور پچھلی صدی کے دوسرے اچھے شعرا نے کیئے وہ تو قابلِ تحسین ہیں لیکن نثری نظم کے نام پر جو اوٹ پٹانگ نظمیں کہی اور لکھی جا رہی ہیں، جن کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر نہ نفسِ مضمون اور نہ ہی کسی قسم کا ابلاغ اور جہاں شاعر کو خود پتا نہ چلے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے، اس سے تو پرہیز ہی بہتر ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایسی نظمیں سب اخبارات اور جرائد میں ایسے بھرپور انداز سے چھپتی ہیں جیسے اور کچھ کہنے کے لئے باقی ہی نہ بچا ہو۔

محولہ بالا شعرا کی نثری نظمیں اپنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان لوگوں نے تو اپنے سچے جذبے، چابکدستی اور فن کاری کے باعث اس صنف کو بھی الگ مکتبِ فکر کا درجہ بخش دیا تاہم بقول علامہ اقبالؔ ۔ 'نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند'"۔

موسم اچھا تھا۔ کافی پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر یونس اعجاز کی گفتگو میں بھی کافی سے کم لطف آرائی نہ تھی۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات یاد کرتے ہوئے کہنے لگے..."کالج کی تعلیم کے دوران علامہ اقبالؔ" کو پڑھنے کا جنون مجھ پر سوار رہتا تھا۔ لیکن نہ ان کی ہر بات سمجھ میں آتی تھی نہ ہی اپنی کہی ہوئی۔ ایسی پریشانی میں ایک شب خواب میں علامہ اقبالؔ کو ایک کارگاہ میں دیکھا۔ میں آداب بجالایا تو فرمانے لگے...'میں کب سے تمہارے انتظار میں ہوں۔ چلو ذرا اخبار کے دفتر چلنا ہے'۔ پھر انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا اور تقریباً دو گھنٹے تک ہم اسی عالم میں چلتے رہے۔ انہوں نے اپنے بعض اشعار کی خود ہی تشریح بھی

فرمائی۔ پھر میرے ایک اوٹ پٹانگ سوال پر ایک دم غائب ہوگئے۔ اس واقعہ کے بعد نہ صرف ان کا کلام سمجھ میں آنے لگا بلکہ مجھے اپنے شعر بھی روبہ ترقی نظر آنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں وہیں سے فیضان حاصل ہوا۔ اسی احساس کے باعث سعودی عرب میں مجھے 'مجلس اقبال' کی بنیاد ڈالنے کا شرف حاصل ہوا۔

ایک اور واقعہ سعودی عرب کے قیام کے دوران کا ہے۔ میرے مجموعہ کلام 'اڑان ٹوٹے پروں کی' کی تقریب رونمائی میں سعودی شہزادہ امیر عبداللہ بن خالد بن عبدالعزیز آل سعود نے بہ نفس نفیس تشریف لاکر میری کوشش کو سراہتے ہوئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار فرما کر مجھے آبدیدہ کردیا۔ اور انہی لمحوں مجھے یاد آیا کہ یہ میرے والدین کی دعاؤں اور کاوشوں کا صلہ ہے۔ میں اپنے والدین کے نعت و درود کے ان زمزموں کو یاد کر کے، جو آج بھی میری رہنمائی کرتے ہیں، اس وقت بہت رویا۔ اس حوالے سے یہ شعر اپنے پڑھنے والوں کی نذر ہے۔

پھر جنم دن پہ کیک کاٹ اعجاز ماں سے ملنے کی آرزو جاگے

Mr. Syed Younus Ijaz,
373, Birch Lane, Richardson, TX 75091, USA

انتخابِ کلام:

بے ہنر بولتے، صاحبانِ ہنر کے ہوتے آئینے کوئی تو آئینہ گروں کے ہوتے
گرمیِ جلوۂ انساں کا ہے اپنا ہی گداز چاندنی چیز ہے کیا سیم بروں کے ہوتے
مہر و مہتاب نے دھندلا دیئے تاروں کے سراغ خلق بے نام رہی نام وروں کے ہوتے
وصلِ خوباں نے تڑپ اور بھی دل میں بھر دی چاک بڑھتا ہی گیا بخیہ گروں کے ہوتے

❒ ❒ ❒ ❒

اندھی گپھاؤں تک جو اجالا نہیں گیا
کرنوں کو سیدھی راہ پہ ڈالا نہیں گیا
یہ بھی کوئی ہوا تھی کہ زلفیں بکھیر دیں
تم سے ذرا سا روپ سنبھالا نہیں گیا
تہمت تھی کون سی کہ نہ آئی ہمارے سر
پتھر تھا کیا جو ہم پہ اچھالا نہیں گیا
اعجاز وہ بھی کتنے اندھیرے میں ہیں ابھی
جن تک ترے سخن کا اجالا نہیں گیا

محمد اقبال بھٹی

برمنگھم، برطانیہ

مین نے ریسرچ کے ایک مضمون میں پڑھا کہ برطانیہ ہندوپاک کے بعد اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جتنے اخبارات، رسائل اور جرائد اردو زبان میں برطانیہ سے نکلتے ہیں اتنے کسی اور ملک سے نہیں نکلتے۔ اردو کے ہزاروں مخطوطے، نوشتے اور کتابوں کے نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری[۱] کی زینت ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا علوم شرقی وافریقی کا مدرسہ (School of Oriental and African Studies اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز) اردو کی تعلیم وتصنیف کا ایک مستند ادارہ ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں بھی اردو پر قابل تحسین کام ہورہا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے قیام سے اہل برطانیہ نے اردو سے جو رشتہ قائم کیا تھا وہ یہاں کی چند ایک ہستیاں جیسے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، مسٹر رالف رسل وغیرہ اب تک جوڑے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی برطانیہ میں کچھ ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے بچوں کو اردو زبان سکھائی بلکہ اپنے فارغ وقت میں دیگر بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت محمد اقبال بھٹی ہیں جو برمنگھم کی مسجد ''ضیاء القرآن'' میں بچوں کو اردو

۱۔ انڈیا آفس لائبریری اب برٹش لائبریری، ۹۶ یوسٹن روڈ، لندن میں اورینٹل اینڈ انڈیا آفس کلکشن کے تحت آگئی ہے۔

پڑھاتے ہیں اور اپنے فارغ وقت میں خود بھی جم کر مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے گھر میں سینکڑوں کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ ڈرائنگ روم کی دونوں الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔

اقبال نے ایک رفاہی ادارہ ''ماں جی ایجوکیشن ٹرسٹ'' کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس ادارے کے ذریعے وہ نادار اور غریب بچوں کو تعلیم اور علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ یوں اپنے حصے کا چراغ جلانے میں اقبال نے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ وہ اپنے آبائی وطن پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

قسمت میں میرے وطن کی اے ربِ دوعالم سورج کی تازگی وتمازت، نکھار دے

اپنے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کا نام تو والدین نے محمد اقبال رکھا لیکن ۱۹۶۶ء میں انہوں نے ''بھٹی'' کا اضافہ کر کے خود کو محمد اقبال بھٹی بنالیا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں اپنے نانا کے گھر ساہیوال چک نمبر 135/EB میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم چک میں برگد تلے قائم ایک مدرسے میں حاصل کی۔ پھر ان کے والدین راولپنڈی کے ایک مضافاتی قصبہ ''بیول'' میں آگئے۔ یہ بھی ان کے نانا کے گھروں میں سے ایک گھر تھا۔ سیکنڈری تعلیم بیول سے حاصل کی اور ستمبر ۱۹۶۴ء میں انگلینڈ آگئے۔

چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر علم کی روشنی سے جگمگاتے ایک بڑے شہر میں آکر اقبال کو علم کی تشنگی شدت سے محسوس ہوئی۔ قدم جمانے کے مسائل بھی ساتھ تھے۔ ان ہی دنوں یہاں سے ایک ہفتہ وار اردو کا اخبار ''مشرق'' نکلتا تھا۔ کتابوں کے ساتھ اس اخبار کا مطالعہ اقبال کا مشغلہ بن گیا۔ پھر انہوں نے اپنے قلم کو دھار لگانے کے لئے ایڈیٹر کے نام مراسلات کے کالم کے لئے خط لکھنے شروع کر دیئے۔ کبھی کوئی خط چھپ جاتا اور کبھی انتظار کے جاں گسل لمحات سولی پر لٹکائے رکھتے۔ اسی دوران اللہ میاں نے ان کی پچھلے پہر کی کوئی دعا سن لی اور ایک اور اخبار ''وطن'' میدان میں آگیا۔ اقبال نے وہاں بھی قسمت آزمائی کے طور پر مضامین لکھنا شروع کیئے۔ اخبار وطن نے پزیرائی کی اور یوں دو تین سال کی مشقت نے اقبال کے قلم کو دھار دے دی۔

اب اقبال کے اندر کا شاعر بیدار ہو رہا تھا۔ طبیعت موزوں تھی اور جدو جہد ان کے مزاج کی خاصیت۔ کچھ نام کا بھی اثر تھا کہ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ کچے پکے اشعار میں ہنر مندی آتی چلی گئی اور پھر اگست ۱۹۹۹ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ایک بھول ہوئی نادانی میں'' کتابی شکل میں ان کے ہاتھوں میں آیا تو اقبال نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اللہ میاں کو بھی اقبال کی یہ ادا پسند آئی۔ چنانچہ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ''خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے'' پایۂ تکمیل کو پہنچ کر قارئین سے داد وصول کرنے آپہنچا۔ اس کتاب کی پشت پر لکھا ہوا یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

پرندہ واپسی کی سوچتا ہے ارادے باندھتا ہے توڑتا ہے
عمل ہجرت کا ہے جاں سے گزرنا خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے

اقبال نے اردو کے ساتھ پنجابی میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان کی پنجابی غزل سے یہ مطلع دیکھیئے، کتنی رواں اور آسان زبان میں انہوں نے فکر ڈھالی ہے۔

پاگل پاگل بُلائے مینوں جگ سارا   میں خوش مینوں ایہہ جزا کافی

اقبال کی مشق سخن چکی کی مشقت کے ساتھ جاری تھی۔ چنانچہ سال بھر بعد پھر ستمبر ۲۰۰۲ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''ستارے جب نہیں ملتے'' شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں برمنگھم کے مشہور افسانہ نگار جاوید اختر چودھری لکھتے ہیں...

''بھٹی صاحب نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ کاش یہ شاعری کے ساتھ نثر پر بھی توجہ دیں''۔ انہوں نے مزید یہ بھی لکھا ہے...''اقبال بھٹی اپنے علاقے 'بیول' کے پہلے مستند صاحب کتاب شاعر ہیں''۔

اقبال بھٹی بتا رہے تھے...''میں نے جب مضامین لکھے، شوقیہ لکھے۔ ساتھ ساتھ کام کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شاعری کی تو بھی کام اور روزگار کا حصول نہیں چھوڑا اور نہ ہی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کام و روزگار چھوڑ کر محض شاعری کی جائے۔ رہی خسارے کی بات، اللہ کے فضل و کرم سے دوسرے مجموعۂ کلام سے منافع حاصل ہوا ہے اور وہ بھی اتنا کہ پہلے مجموعے کی کسر بھی پوری ہوگئی۔ پھر شہرت کا جہاں تک تعلق ہے، میں نے یہ کام ادبی گرُھوں کے لئے کیا ہی نہیں۔ اس لئے ان کی سوچ کا مجھے علم نہیں۔ مگر جن لوگوں کے لئے میں نے یہ کام کیا ہے بلاشبہ ان کے درمیان مجھے بے پناہ شہرت ملی اتنی کہ جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی''۔

اقبال کو اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں سے بھی بہت پیار ہے۔ پیار کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا

جی جان سے ابو صدقے تیرے، سب تن من تجھ پر وارا ہے
ماں تیرے پیار میں جیتی ہے تو ماں کی آنکھوں کا تارا ہے
دیوانے ہیں یہ دونوں تیرے، پر تیری سمجھ سے بالا ہے
تو پیار نشانی ہے ان کی، تو پیاروں سے بھی پیارا ہے
سو بار تصدق میں تجھ پر، معصوم تبسم پر تیرے
مجھ کو تو یہ محسوس ہوا، تو فرش پہ عرش نظارہ ہے
لگتا ہے کہ جنت سے آیا اک پھول ہمارے گلشن میں
خوشبو سے تری اے منّے! گھر بار معطر سارا ہے
تو پیار کی نیا کا ماجھی، تو پیار کے پانی کا جھرنا
تو پیار کے راہی کی منزل، تو ڈوبتے دل کا سہارا ہے
اقبالؔ سمجھ سے بالا ہے کیا شے یہ محبت ہوتی ہے
ہر چیز سے جان یہ پیاری ہے پر جان سے بھی تو پیارا ہے

Mr. Mohammad Iqbal Bhatti,
114, Bowyer Road, Saltley, Birmingham, B8 1ES, UK

انتخابِ کلام

ہمیں تم یہ کہہ کر پکارا کروگے
کہاں چھپ گئے ہو دِوانے ہمارے

⧗•⧗

تاسف سے تم ہاتھ مل کر کہوگے
ملیں کاش وہ دن پرانے ہمارے

⧗•⧗

جدائی نے کردی ہے اندھیر دنیا
گئے ٹوٹ سپنے سہانے ہمارے

⧗•⧗

تصور پہ بندش لگا نہ سکو گے
رلائیں گے گزرے زمانے ہمارے

⧗•⧗

وہ یاد اُن کی اب کیوں ستم ڈھارہی ہے
چلی آئی دل کو دکھانے ہمارے

⧗•⧗

وہ شوخی شرارت وہ ناز و ادائیں
ہمیں کو لگے ہیں ستانے ہمارے

⧗•⧗

کچھ ایسے گئے ہیں پلٹ کر نہ آئے
کہاں ہیں وہ ساتھی نہ جانے ہمارے

⧗•⧗

دل محلّے میں پھر چراغاں ہے
ہائے دل انتظاریاں نہ گئیں
اقبال حیدر
۱۸ دسمبر ۲۰۰۲ء

اقبال حیدر

کیلگری، کنیڈا

اس قول کی صحت میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ حرف کی، لفظ کی اور کتاب کی طاقت معمولی طاقت نہیں اور جن لوگوں نے، جس قوم نے حرف کی طاقت کا ادراک حاصل کرلیا وہ دنیا میں ایسی باوقار ہوئی کہ اس کی عظمت کے نشان مٹانے پر بھی مٹائے نہ جاسکے۔ اگر ہر کسی کو کتاب سے رشتہ استوار کرنے کا فن آجائے تو یہ دنیا حسین سے حسین تر ہوجائے۔

کیلگری میں بسنے والے اقبال حیدر نے یہ نکتہ پالیا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ہندوپاک کی طرح مطالعے کے لئے کتب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ جہاں وسائل ہوتے ہوئے بھی انسان اکثر خود کو بے دست و پا پاتا ہے۔ روزگار کا حصول لمحوں لمحوں کا حساب مانگتا ہے۔ مگر لگن اور جد و جہد کا جذبہ رکاوٹوں کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ چنانچہ اقبال حیدر نے ۱۹۸۲ء میں ''جوش سوسائٹی'' کی بنیاد ڈالی کیوں کہ بقول اقبال حیدر... ''آج کے عالمی تناظر میں یک جہتی بے حد اہم اور رواداری اس سے بھی زیادہ ضروری ہے تاکہ دنیا میں امن کے قیام میں آسانی ہو۔ جوش ملیح آبادی کا پیغام چونکہ عالم انسانیت اور اردو دنیا کے لئے مشعل راہ کا کام کرسکتا ہے اس لئے ہم نے اس پیغام کو عام کرنے کے لئے سیاسی مصلحتوں اور علاقائی عصبیتوں سے دور رہ کر پہلی انٹرنیشنل کانفرنس ۱۹۸۴ء میں

منعقد کی جس میں ہندوستان سے مرحوم علی سردار جعفری، ڈاکٹر محمد حسن اور پاکستان سے مرحوم رئیس امروہوی اور دیگر اکابرین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا عنوان تھا ''موجودہ دور کا شاعر ... جوشؔ'' دوسری کانفرنس غالباً ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ عنوان تھا ''اردو کا عالمی معیار''۔ اور تیسری کانفرنس بعنوان ''جوشؔ اور ترقی پسند ادب تحریک'' ۱۹۸۸ء میں منعقد ہوئی۔ شرکا میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس اور دیگر اکابرین شامل تھے۔

اس کے علاوہ اقبال حیدر نے جوش سوسائٹی کے تحت الہٰ آباد سے شائع ہونے والے جریدے ''نیا سفیر'' کے مدیر اور مشہور دانشور جناب ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے اشتراک سے ۱۹۸۵ء سے تا حال جوشؔ ملیح آبادی پر سات (۷) کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں جوشؔ کے نثری مضامین جو اول ۱۹۴۲ء میں ''اشارات'' کے عنوان سے دہلی سے شائع ہوئے تھے، نظموں کی کتاب ''الہام و افکار'' جو اول ۱۹۶۷ء میں کراچی سے طبع ہوئی تھی، ''جوش و مکالمات راغب مرادآبادی'' اور ''جوش ... شخص و شاعر'' از اکرام بریلوی کی اشاعتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ۹۹-۹۸ء میں سات آٹھ ممالک میں جو جوشؔ صدی منائی گئی اس کی داغ بیل بھی اقبال حیدر کی کوششوں سے کیلگری میں پڑی تھی۔ ایک پروگرام ''جوش سوسائٹی، کیلگری'' اور ''نیا دور، الہٰ آباد'' کے اشتراک سے دہلی میں ہوا جس کی صدارت ہندوستان کے وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال نے کی تھی۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ''جوش و فراق لٹریری سوسائٹی'' قائم کی ہے۔ اس کا ہیڈ آفس الہٰ آباد میں ہے۔ کراچی میں ۲۰۰۳ء میں جوش سوسائٹی کی جانب سے فراق پر سیمینار کرنے کا پروگرام ہے۔ جوشؔ صدی میں پاکستان سے جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹ کے اجرا کے لئے بھی جوش سوسائٹی نے خاصی کوشش کی تھی۔

اقبال حیدر چونکہ فلاح و بہبود کا کام کرنے کے عادی ہیں چنانچہ انہوں نے جوشؔ کی شہرہ آفاق نظم ''اک تارہ'' کو علامت بنا کر کیلگری سے ایک نیا پروجیکٹ ''اک تارہ چیرایٹیبل فاؤنڈیشن (Ek Tara Charitable Foundation)'' کے نام سے شروع کیا ہے۔ اس کے تحت پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں خصوصی طور پر اور دیگر ممالک میں فروغ تعلیم کے لئے ورلڈ ویژن (World Vision) کی طرز پر انفرادی طور پر مستحق بچوں کو تعلیم کے حصول میں مدد دی جائے گی۔

اقبال حیدر نے بتایا کہ جوشؔ کی نظم ''اک تارا'' کو پہلے کیلگری کے گلوکار تشی کانت بالی نے ۱۹۸۷ء میں اور پھر جگجیت سنگھ نے ۱۹۹۴ء میں گایا ہے۔

اقبال حیدر نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے کیلگری میں اب تک چھ (۶) بین الاقوامی مشاعرے بھی منعقد کیئے ہیں جن میں علی سردار جعفری، جون ایلیا، رئیس امروہوی، خمار بارہ بنکوی، پروین شاکر، منظر ایوبی، محسن احسان، شہزاد احمد، حمایت علی شاعر، امجد اسلام امجد، ضمیر جعفری، عبدالقوی ضیا، نسیم سید، اشفاق حسین اور سحر انصاری کے علاوہ دیگر شعرا بھی شرکت کر چکے ہیں۔

اقبال حیدر نے جوشؔ کی بہت سی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ''اردو ان کنیڈا

(Urdu in Canada)''کے نام سے جوش لٹریری سوسائٹی کی جانب سے شائع کی ہیں۔ ان میں کچھ نظمیں علی سردار جعفری کی ترجمہ کی ہوئی بھی ہیں۔

۷/ جولائی ۱۹۴۹ء کو کراچی میں پیدا ہونے والے اقبال حیدر نے کراچی سے بی ایس سی اور پھر قانون کے پہلے سال کا امتحان دیا اور پھر کنیڈا آ گئے۔ یہاں انجینیر نگ (engineering) میں داخلہ لیا۔ مگر والد کے اچانک انتقال کے باعث تعلیم چھوڑنا پڑی اور روٹی روزگار کی گردش نے حصول ملازمت کے لئے پھیرے لگوائے مگر علم کی لگن نے پیچھا نہ چھوڑا۔ انہوں نے پاور انجینیر نگ (Power Engineering) میں ڈپلو مالیا۔ پھر کئی دوسرے کورس بھی کیئے۔ ایک لمبی جدو جہد کے بعد انہوں نے اپنے نجی کاروبار کی داغ بیل ڈالی۔ اب پچھلے پندرہ (۱۵) سال سے کیلگری میں انشورنس ایجنسی قائم کی ہے جس کے چار (۴) دفتر ہیں۔

اقبال بتارہے تھے ان کے والد اور تایا، دونوں وکیل تھے اور شاعر بھی۔ ان کے والد، سید رضی اکبر بہت اچھے قصیدہ گو تھے اور ایک زمانے میں کراچی کی اہم محفلوں میں پڑھتے بھی تھے۔ ان کے خاندان میں میر، غالب، سودا، انیس، اقبال اور جوش کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ہر بڑے شاعر کے کلیات اور دواوین ان کے گھر میں تھے۔ فکری آسودگی کے ساتھ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ لہٰذا بغیر کسی تعصب کے انہوں نے نوعمری سے کئی مکتبۂ فکر کی کتب کا مطالعہ کیا۔

ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا، انہیں یاد نہیں۔ کبھی کبھار اشعار جب موزوں ہو جاتے یہ گنگنا لیتے، لکھا کبھی نہیں۔ مگر مشرقی پاکستان جانے کے بعد جب کچھ اشعار کہے تو انہیں نوٹ کر لیا۔ اور پھر مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی نے ان پر ایک ستم توڑ ڈالا۔ یہ ویسا ہی دکھ تھا جیسا ان کے والد کی رحلت اور جدائی کے وقت انہیں ہوا تھا۔

اقبال نے ابتدا میں زیادہ تر نظمیں کہیں۔ رباعی اور قطعات بھی کہے۔ اب غزلیں زیادہ کہتے ہیں۔ ان کی کہی حمد، نعت بعنوان'' وہ ایک نام''، نیلسن مینڈیلا کی فتح پر بعنوان ''صلہ''، ''آؤ اقرار کریں'' اور ''احتساب عورت سے'' بڑی دل گداز نظمیں ہیں۔ ان کی کہی ایک پُر اثر فریاد بعنوان ''کب تک'' ملاحظہ ہو:

خداوندا بھلا کب تک
تری رحمت کے در پہ، سر بہ زانو مضمحل یہ مضطرب بندے
دعا کو بس یونہی بیٹھے رہیں کہ باب استجابت وا ہوگا
کبھی کو مدعا مل جائے گا، سب کا بھلا ہوگا
بھلا کب تک خداوندا، خداوندا بھلا کب تک
ہیں اتنے بے سروساماں، کہ
ایماں تک نہیں باقی، یقیں کی بے کراں دولت
کہیں خود بیچ آئے ہیں، مگر پھر بھی گماں ہے کہ

کہیں ان کا خدا ہوگا کوئی ان کا خدا ہوگا
مگر یہ بھی گماں کب تک، خداوندا بھلا کب تک
خداوندا ترے ہونے سے سب نے تجھ کو پہچانا
نہ ہونے کا ترے بے آسرا یہ سہہ نہ پائیں، کسی سے کہہ نہ پائیں گے
جو گزرے گی سو جیتے گی، بگر یوں رہ نہ پائیں گے
دعائیں بر نہیں آتیں، مگر مانگی تو جاتی ہیں
تو محور ہے، تو مرکز ہے، تو مرجع ہے دعاؤں کا
دعائیں ژاژ خائی، بے نوائی، بے مسافت آبلہ پائی نہ بن جائیں
دعاؤں کا بھرم بن جا ازل سے تھا ابد تک ہے
جنوں تو کیا خرد تک ہے، یہی سنتے چلے آئے
نہ ہونے کے یقیں سے تیرے ہونے کا گماں بہتر
مگر ڈرتا ہے دل اکثر، رہے گا یہ گماں کب تک
بن اگنی کے دھواں کب تک
بھلا کب تک خداوندا، خداوندا بھلا کب تک!

اقبال حیدر کی پسندیدہ صنف پابند اور غیر پابند نظم ہی ہے۔ نثری نظم یا نثری غزل کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ تجربات ہر قسم کے ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ ہو سکتا ہے جو چیز ہمارے لئے قابل قبول یا منطقی ہو یا جو چیز ہمیں آج نہیں بھاتی وہ وقت گزرنے کے ساتھ معمول قرار پائے۔ آدمی ہی تبدیلی لاتا ہے اور آدمی ہی اسے روکتا ہے۔ بہر حال انہوں نے ابھی تک نثری نظم یا نثری غزل کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پایا۔

اقبال حیدر نے کہا... ''ہم یقینی طور پر اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید ہیں۔ گو اردو کی مخصوص تہذیبی فضا کو منہدم ہوتے دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں مگر اردو زبان و ادب کے مستقبل سے مایوس نہیں کیونکہ اردو ادب سے وابستگی کا دائرہ اب، جغرافیائی اعتبار سے بھی اور لسانی اعتبار سے بھی، بہت وسیع و بسیط ہو چکا ہے۔ اس پھیلے ہوئے اور پھیلتے ہوئے منظر نامے کی وجہ سے کچھ ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو روایت پسند اور نسبتاً ایک طویل عرصے سے متعلقہ لوگوں کو گراں گزر رہی ہیں۔ اسی قسم کی ایک تجویز تبدیلیٔ رسم الخط بھی ہے۔ ہمارے خیال میں 'بولی' اور 'زبان' کا فرق ہی رسم الخط ہوتا ہے۔ 'بولی' کو 'زبان' بننے کے لئے گویا رسم الخط لازمی ہے۔ اب اگر کسی زبان کا رسم الخط بدل دیا جائے تو وہ یقینی طور پر نئی زبان ہو گی یا ہو جائے گی، چاہے صوتی (بولی) اعتبار سے ہم اس کو کوئی بھی نام دیں۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ہمارے جیسے لاکھوں ہجرت شدہ پاکستانیوں کا ہے، جن کے بچے اردو بول سکتے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن اس کے عوامل و تدارک، دونوں رسم الخط سے وابستہ نہیں ہیں۔

دوسری طرف شاید وہ ہندوستانی محبان اردو ہیں جو اپنی بچی کچھی تہذیب بچانے کے لئے ، اور اردو ادب کو تمام سیاسی اور مذہبی تنگ نظری سے محفوظ رکھنے کے لئے اس تجویز کے حامی ہیں۔ ہمارا ابھی بھی یہی خیال ہے کی اگر کچھ لوگ اردو کی ڈیمائز (demise موت) سے خائف ہیں اور اسکے تدارک کے لئے رسم الخط بدلنے کی بات کر رہے ہیں تو شاید اس کو روکنے سے زیادہ وہ اپنے اس عمل سے اس میں سرعت (ایکس پیڈیٹ expedite) کا باعث بنیں گے''۔

پانچویں سوال کے جواب میں کہنے لگے... ''ہمارے ہاں زور آزمائی کا اس قدر رجحان ہے کہ ہمیشہ 'ممولے' کو 'شہباز' سے لڑانے کی روایت پر عمل کرتے ہوئے سطحی تقابل کی آسان راہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہ ہی حال غزل اور نظم کا ہے۔ جو اکابرین اپنی مخصوص کیفیت یا زندگی کے جبلی تقاضوں کی برآوردگی کی وجہ سے غزل کو مطعون کر گئے ان کا نہ صرف نظم بلکہ غزل میں بھی نہایت ممتاز کانٹریبوشن (contribution حصہ) ہے۔ اب جو دو فرقے، تغزیلیئے اور غیر تغزیلیئے (بروزن تفصیلیئے اور غیر تفصیلیئے) تشکیل پائے، وہ رات دن کی رسہ کشی کا شکار ہیں۔ اصل میں تو کوئی بھی صنف ہو اس کی عظمت کا دار و مدار اس صنف کے برتنے والے کی عظمت اور خلاقیت سے براہ راست متناسب ہوتا ہے۔ جب غزل کو میر، غالب، سودا، مومن، حسرت، فراق ملیں گے تو غزل زندگی کی ترجمان ہی کیا پہچان بن جائے گی۔ اسی طرح جب نظم کو نظیر، حالی، انیس، دبیر، اقبال اور جوش ملیں گے تو نظم نہ صرف زندگی کی ترجمان بلکہ فکری، معاشرتی اور تہذیبی ارتقا کی پاسبان اور موجد بن جائے گی یعنی کہ۔

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں۔

اب ہمارے ہاں چالیس پینتالیس برس میں جو شاعری ہوئی ہے اور سراہی گئی ہے وہ نعرہ تو 'ادب برائے زندگی' کا لگاتی ہے مگر اپنے اُسلوب کی مجہولیت اور اپنے تخلیق کار کی مصلحت یا کم اہلیت کی وجہ سے ادب برائے ادب کے زمرے میں زیادہ آئے گی۔ اس غزل کی مقبولیت اور غزل بانوں (بر وزن فیل بان، نگہبان) کی عصبیت کی وجہ سے سب سے بڑا نقصان تو شاید یہ ہوا کہ ہمارا تنقیدی مزاج ہی ''غزلیہ'' ہو گیا کیونکہ اپنی آسانی یا دانستہ سیاسی مصلحت کی بنا پر غزل کو کُل 'شاعری' سمجھ کر نہ صرف تنقید بھی اسی پیرائے میں ہونے لگی بلکہ نظم بھی ان ہی لوازمات کے ساتھ کہی جانے لگی۔ اس کے علاوہ غزل کا وہ پوٹنٹ (potent قوی الاثر) اُسلوب جو حسرت نے شروع کیا تھا اور فراق نے خون جگر دے کر پالا تھا وہ فیض تک آتے آتے اتنا سلف کانشیس (self-conscious خودنگر)، محدود و مجبور ہو گیا کہ چند استثنات کے علاوہ زیادہ تر 'ادب برائے ادب' ہی رہ گیا۔ مغربی اور عالمی ادب سے متاثر ہونے کے نتیجے میں ہر شاعر عالمی ادب تخلیق کرنے پر مامور ہو گیا اور زندگی بے چاری منہ تکتی رہ گئی۔ یہ باتیں یقینی طور پر تکلیف دہ ہوں گی مگر تجزیاتی مطالعہ دیانت داری سے کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ دھیمے لہجے کی دل نشین شاعری فراق ہی نے شروع کی تھی مگر فراق اس بات پر نہ مصر تھے اور نہ ہی سمجھتے تھے کہ شاعری اسی لہجے میں ممکن ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں کسی قسم کی مجہولیت اور عاجزیت نہیں ہے۔ ہمیشہ زندگی کے

تقاضوں کو پورا کیا اور ایک ہی غزل میں اپنے مخصوص اسلوب سے باہر بھی آئے اور تنوع یا ہمہ گیری کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ ہماری غزل کی مثال آج اس رنگین اور خوش نما فوارے کی ہے جس میں بیرونی اقدار کی تقلیدی مینا کاری اور مستعار لی ہوئی رنگینی کی ری سائیکلنگ (recycling مدوری تواتر/ بازگشت) تو ہے لیکن روح کی تشنگی کو سیراب کرنے کی صلاحیت نہیں۔ اگر غزل کو 'مقبولیت محض' سے نکال کر عظمت رفتہ و آئندہ کی طرف لے جانا ہے تو ہمیں اس ضرر رساں محدودیت سے نکلنا ہوگا اور یہ ماننا پڑے گا کہ ہر صنف کے 'سوتے' غزل ہی سے نہیں پھوٹتے۔ زندگی کے پریویلنگ (prevailing عام/ مروجہ) عوامل مدنظر رکھتے ہوئے ادب کا نیا رول ادا کرنے کے لئے غزل یقینی طور پر کافی نہیں۔ اور نہ اردو کی تمام تر بڑی شاعری اور نہ ہی کسی اور زبان کی بڑی شاعری غزل کے مزاج سے ہم کنار ہے۔ غزل ایک بہت ہی نازک، مقبول اور دل نشین صنف سخن ہے اور زندگی کو اس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی نظم کی۔ غزل اور نظم اپنے مزاج، ساخت، تاثر کی و عمل پسندی کے اعتبار سے زندگی میں بالکل مرد و زن کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے اور ایک دوسرے کو بدل بھی نہیں سکتے، دو مخصوص، متوازی، توانا دھارے، ایک کی بر وجہ زبردستی نہ صرف دوسرے کو بلکہ مجموعی زندگی کو مجروح کر دیتی ہے۔ استعارۃً اگر یوں کہا جائے تو شاید صحیح ہوگا اگر ہمارا مزاج بے جا 'میل چیو ن ازم (male chauvinism مذکر شوانیت/ جنگجویانہ مذکر پرست خصلت)' کا شکار ہوگا تو مضر ہے اور اگر بے انتہا 'فیمینسٹ (feminist نسائیت زدہ) ہوگا تو بھی مضر ہے۔ اس لحاظ سے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہماری تنقیدی فکر کو تنگ حد بندی سے آزاد کرانا ہے"۔

اقبال متاثر تو بے شمار شعرا سے ہوئے ہیں جس میں میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ، سوداؔ، مومنؔ۔ اقبالؒ، جوشؔ، فراقؔ، مجاز، ن م راشد، زیدی، فیضؔ، جون ایلیا اور شجاع خاور کے نام خاص طور سے انہیں ہمیشہ یاد آتے ہیں، کہنے لگے..." یہاں متاثر سے مراد پسندیدگی ہے۔ گزری صدی کے قد آور شعرا تو ہماری نگاہ میں صرف دو ہیں، اقبالؒ اور جوشؔ۔ ان ہی کے قریب فراقؔ بھی ہیں مگر کچھ وجوہات کی بنا پر شاید وہ ان دونوں کے بالکل ہم پلہ نہ ہوں، اور جس کی تفصیل کے لئے ایک علحدہ مضمون درکار ہے۔ ہم اپنے اس بیان کو مزید واضح کر دیں کہ 'مقبولیت' اور 'عظمت' میں بہت فرق ہے۔ عام طور پر ذہنی اور فکری سطح پر کی گئی گفتگو فوراً قبول ہو جاتی ہے جب کہ اس سطح سے بلند یا بلند تر گفتگو بادیر بار پاتی ہے اور اگر معاشرہ انتہائی انحطاط پزیر ہو تو مقبول ہی نہیں ہوتی۔ خوش نصیب ہیں وہ تخلیق کار جن کے بعد آنے والے ان کی تخلیق اور فکری جہات کے جائز اور صحیح معنوں کا تعین کرتے ہیں۔ ہمیں جہاں تک یاد پڑتا ہے ہم سب سے پہلے جس شاعر سے متاثر ہوئے (نویں کلاس میں) وہ اقبالؒ تھے جن کی نظم 'پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ' آج بھی اپنا اثر قائم کیئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد ہم متاثر ہوئے تو جوشؔ سے اور ان کے احترام آدمیت سے۔

بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں　　کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی

اقبال کو ان کی مذہبی ادعایت کی وجہ سے ہم نے بیچ میں کھو دیا تھا مگر پچھلے دس (۱۰) سال میں شاعری سے زیادہ اُن کے مقالات میں ان کو ریڈسکور (rediscoverیافتِ ثانی) کیا۔ جوش کو ہم اقبال کا ایکس ٹینشن (extensionتوسیع/ پھیلاؤ) سمجھتے ہیں اور وہ اس معنی میں کہ جو بات اقبالؔ اپنی جبلی یا منصبی مجبوریوں کے باعث نہیں کہہ پائے ان کو جوش نے کہا۔ اردو میں میر انیس کی مخصوص شاعری کو نکال دیا جائے تو صرف اقبالؔ اور جوش ہی دو سب سے زیادہ پوٹنٹ (potentتوانا) شاعر ہوں گے۔ اقبالؔ اور جوش کے علاوہ ن م راشد، مصطفیٰ زیدی اور جون ایلیا کی شاعری کے بھی واضح اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

دو سال پہلے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو ایک بہت ہی اچھے شاعر کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا اور ان کا مجموعہ پڑھنے کا خوش کن اتفاق ہوا۔ اس شاعر کا نام شجاع خاور ہے۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ (جیسا پہلے عرض کیا تھا) وہ غزل کے اسلوب کو محدود نہیں کرتے بلکہ غزل میں ہر طرح کے مضمون بڑی خوب صورتی اور نازکی سے باندھتے ہیں۔ اس دور میں یہ فن ان کے علاوہ صرف جون ایلیا کو حاصل تھا۔ یہ حضرات شاعری کے میڈیم (mediumوسیلہ) یعنی زبان سے خائف نہیں بلکہ اپنے آرٹ (artفن) کے ملکہ پر انہیں فخر ہے"۔

اب اقبال حیدر اپنی زندگی کا ایک اہم اور یادگار واقعہ سنا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ..." زندگی میں واقعات تو بے شمار ہیں مگر اس وقت ۱۹۷۵ء کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ہم سہ پہر کے وقت اپنے والد صاحب کی گاڑی پر نارتھ ناظم آباد سے گزر رہے تھے۔ ایک کار کو پاس کیا تو ایسا لگا کہ اس میں جوش صاحب بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے جوش صاحب کی تصاویر دیکھی تھیں، مجموعے پڑھے تھے اور 'یادوں کی بارات' پڑھی تھی، تین دفعہ قریب سے دیکھا تھا، کسٹم کلب کے مشاعرے میں، سکھر کے مشاعرے میں اور رضویہ امام بارگاہ میں مصطفیٰ زیدی کے چہلم پر۔ بہر حال ہم نے اپنی گاڑی اس کار کے پیچھے چلانی شروع کردی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کار ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے نیچے رکی۔ ہم نے اپنی کار ذرا فاصلے سے روکی۔ دیکھا تو جوش صاحب ایک اور صاحب (خورشید علی خاں صاحب) کی معیت میں برآمد ہوئے۔ میں نے جاکر آداب کیا اور عرض کیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے خورشید علی خاں صاحب کے مکان کا پتا بتایا اور کہا کہ وہاں آجانا۔ میں دوسرے روز پہنچ گیا۔ جوش صاحب بہت شفقت اور اپنائیت سے ملے۔ میرے متعلق اور میرے خاندان کے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور وہ بھی شام کو۔ کہنے لگے پہلے اپنے 'باوا' سے پوچھ لو میں ضرور آؤں گا مگر ہفتہ بھر کے بعد کیوں کہ اسلام آباد جارہا ہوں۔ میں نے اپنے ابو سے اجازت مانگی۔ وہ مذہبی شخص تھے مگر جوش کو بہت مانتے تھے۔ کہنے لگے اگر جوش آرہے ہیں اور ان کے لئے شراب کا بندوبست کرنا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں جوش صاحب کے پاس گیا اور عرض کیا کہ آئندہ سنیچر کو آپ ہمارے ہاں شام کو تشریف لائیں۔ مسکرائے، اور کہنے لگے تمہیں معلوم ہے میں شام کو کیا کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا میں 'یادوں کی بارات' میں پڑھ چکا ہوں۔ بہت خوش ہوئے،

کہنے لگے ہاں بھئی پھر آئیں گے خورشید علی خاں سے طے کرلو۔ اس کے بعد جوشؔ صاحب ہمارے گھر تشریف لائے۔ بیس پچیس احباب جمع تھے اور دو چار بزرگ۔ جوشؔ صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ انہوں نے حسب معمول مجمع کا جائزہ لیا اور اپنی مخصوص قسم کی رباعیات سنانے لگے۔ جب ہم سب نوجوانوں کی طرف سے سنجیدہ اور عمیق کلام کی فرمائش ہوئی تو جوشؔ صاحب کو اندازہ ہوا کہ معاملہ سیریس (serious متین وسنجیدہ) ہے۔ اس کے بعد جوشؔ صاحب نے ایک گھنٹے تک کلام سنایا اور نشست کے معیار سے بہت خوش ہوئے۔ اس محفل کے بعد جوشؔ صاحب سے بیشتر ملاقاتیں نصیب ہوئیں۔ ان سے، خاص طور مفکر جوشؔ سے ملنے کا بہترین وقت سہ پہر کا ہوتا تھا۔ جوشؔ صاحب کو یاد کر کے اس وقت یہ اشعار ذہن میں آگئے۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی — پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

بہت جی خوش ہوا، ہم نشیں کل جوشؔ سے مل کر — ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

Mr. Iqbal Haider,
4640-17 Avenue NW, Calgary, Alberta, Canada , T3B0P3

انتخابِ کلام

خلوتِ جاں کی زاریاں نہ گئیں — یار بن یار، یاریاں نہ گئیں

دل محلے میں پھر چراغاں ہے — ہائے دل ! انتظاریاں نہ گئیں

کوچۂ التفات گرد آباد — پر تری خوش نگاریاں نہ گئیں

شمع گل کر کے رات سوتی ہے — اور جو یادگاریاں نہ گئیں؟

زندگی سلسلہ ہے یادوں کا — نہ گئیں، بے قراریاں نہ گئیں!

ہم بھی نردوش جانتے خود کو — کیا کریں شرمساریاں نہ گئیں

کس گناہِ بسیط کی ہے سزا — باہمی سنگساریاں نہ گئیں

لوگ ڈرتے رہے خداؤں سے — اور عبادت گزاریاں نہ گئیں

پیش و پس تو رہا محبت میں — تھیں عجب پاسداریاں نہ گئیں

اب تو پہلے سا کچھ رہا بھی نہیں
کیوں جنوں کی کٹاریاں نہ گئیں

جس عہد سے وابستہ ہیں سب خواب ہمارے
جینا ہے تو اس عہد کی آواز سمجھنا!

اکبر حیدرآبادی
مارچ ۲۰۰۰ء

اکبر حیدرآبادی

آکسفورڈ، برطانیہ

کہتے ہیں کہ شعر گوئی میں مہارت ''کسب'' ہے اور تاثیر ''عطا'' ہے۔ آکسفورڈ میں مقیم محترم شاعر اکبر حیدرآبادی کا کلام پڑھیے تو پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کلام کو تاثیر عطا کی ہے اور اکبر حیدرآبادی نے اپنی محنت، ریاض اور صلاحیت سے اپنے کلام کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ چنانچہ برمنگھم کی ایک معتبر ادبی شخصیت، محمود ہاشمی، برملا کہتے ہیں کہ اکبر حیدرآبادی کا فن روح کی بے کراں تنہائیوں اور سناٹوں میں صدا دیتے ہوئے سایوں کو اظہار اور قوتِ گویائی سے ہم کنار کرتا ہے۔

ان جملوں کی صداقت کو جناب اکبر حیدرآبادی کی اس نظم کے تناظر میں دیکھیے۔ عنوان ہے ''سورج، دریا اور میں''۔

سورج مجھ سے اونچا لیکن
مجھ سا دردشناس کہاں!
دریا مجھ سے گہرا لیکن
میری طرح حساس کہاں!
کوئی مجھے سورج کی بلندی، دریا کی گہرائی دے دے
دونوں کی تنہائی دے دے!

اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہنے والا ایک نام ن م راشد کا بھی ہے۔ انہوں نے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کے ایک خط میں کیا خوب صورت بات کہی تھی... "اکبر حیدر آبادی غزل کہتے ہیں اور غزل میں بڑا وقار رکھتے ہیں۔ عشق اور فلسفے کی شگفتہ آمیزش ان کے کلام پر حاوی ہے"۔ ایسی ہی ایک معنی آفریں فکر کا اظہار پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اکبر حیدر آبادی کے مجموعہ کلام "آوازوں کا شہر" میں کیا ہے... "اگلے زمانے کے لوگ جانتے تھے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے ارض وسما ان کے اندر تھا اور ان کے کلام میں کائنات کی وسعتیں گونجتی تھیں۔ اب ہم جانتے ہیں کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں اگرچہ کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے ہمارا باطن خالی ہوتا جا رہا ہے۔ آگہی اور اجنبیت ہمارا مقدر ہے۔ اس مقدر نے جس ڈیلیما (dilemma) کو پیدا کیا ہے اکبر حیدر آبادی کی شاعری اس کا شعور رکھتی ہے اور اس سے لطف واثر پیدا کرنے کی کوشاں ہے۔ وہ روایت آگاہ اور محتاط شاعر ہیں۔ وہ لفظ کے حصار کو توڑنے اور برف کے پگھلنے کے لئے بے قرار ہیں۔ وہ اس انسان کے ماتم گزار ہیں جسے جینے کا حوالہ نہیں ملتا اور جس کی آنکھ میں ذرا سا بھی اُجالا نہیں۔ یہ احساس اپنے اندر بشارت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ اس سچائی کی سمجھ ہی سے وہ دھنک پھوٹتی ہے جو زندگی کی ضمانت ہے"۔

اکبر حیدر آبادی کے مکمل تعارف سے قبل میں محترم ڈاکٹر وزیر آغا کی خوب صورت رائے آپ تک ضرور پہنچانا چاہوں گی جس کا اظہار انہوں نے اکبر حیدر آبادی کے مجموعہ کلام "ذروں سے ستاروں تک" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں... "اکبر حیدر آبادی نے غالباً فلکیات کے مطالعے کے زیر اثر آسمان کے اندر نقاب اندر نقاب وجود میں نوری سالوں کی کروٹوں کا ادراک کیا ہے اور یوں قاری کو اس کائنات کے امکانات کی طرف متوجہ کر دیا ہے"۔

اب اکبر صاحب کا ایک معنی آفریں شعر سنیئے۔ پھر ان سے اردو کے رسم الخط کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

ابھی تو وقت کی زنبیل میں بہت کچھ ہے ۔۔۔ نئی زبان بنے گی، نئے خیال کے بعد

"آپ نے پوچھا ہے کہ اردو کے رسم الخط کے بدلنے کا حامی ہوں یا مخالف؟ آج کل اس موضوع پر گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں، تائید میں کم اور مخالفت میں زیادہ۔ میری نظر سے دو تجویزیں گزری ہیں۔ ایک ہندوستان میں، اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے، دوسری یہ کہ اس کو رومن رسم الخط میں ڈھالا جائے۔ اول الذکر تجویز کا تو میں سرے سے مخالف ہوں۔ اردو اور ہندی دو سگی بہنوں کی طرح ہیں جن میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور بہت سی مختلف۔ تاہم ان دونوں زبانوں کی اپنی الگ شناخت ہے جسے باقی رہنا چاہیئے۔ البتہ رومن رسم الخط کے تعلق سے میرا نظریہ یہ ہے کہ اس کو جزوی طور پر استعمال کیا جائے۔ یعنی جو کتابیں ہماری نئی نسل کو ذہن میں رکھ کر لکھی جائیں وہ رومن اسکرپٹ میں ہوں کہ ہمارے بچوں کو ہمارے ادب، ہماری تاریخ اور ہمارے مذہب سے روشناس کرانے کا واحد طریقہ یہی ہے کیوں کہ ان بچوں نے اس ماحول میں آنکھ کھولی ہے جہاں انگریزی ہی

بولی لکھی اور سمجھی جاتی ہے اور وہ سوچتے بھی اسی زبان میں ہیں۔ ہمیں اس اہم مسئلے کو جذبات کی سطح سے اوپر ہو کر دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے۔ ہم خواہ کتنی ہی نیک نیتی اور خلوصِ دل سے اس بات کے متمنی ہوں کہ ہمارے بچے اردو پڑھنا سیکھ لیں، عملی اعتبار سے یہ تمنا خواب وخیال سے زیادہ نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ والدین کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہے کہ وہ بچوں کو اردو سکھا سکیں۔ خود بچوں میں اس کے سیکھنے کا ان سن ٹیو (incentive محرک) نظر نہیں آتا۔ تو اس صورت میں صرف ایک ہی حل ہے کہ رومن اسکرپٹ کو اپنایا جائے۔ اس طرح وہ کم از کم ہمارے ادب، تہذیب اور ثقافت سے استفادہ تو کرسکیں گے۔ لندن کے رالف رسل صاحب نے رومن رسم الخط کے محدود حروف میں اردو کی آوازوں کو سمونے کے لئے ضروری اور بڑی مفید تحریفات سے کام لیا ہے، جس کو ازبر کرنے کے بعد بچے اردو کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ یہاں رسم الخط سے زیادہ اہمیت خود زبان کے ادراک کی ہے۔ جیسا میں نے کہا ایسا اقدام صرف جزوی طور پر ہونا چاہیئے۔ باقی تمام کتابوں کے لئے اردو رسم الخط کو ہی بروئے کار لانا چاہیئے کہ میں کلیتہً رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہوں''۔

اکبر حیدرآبادی کی یہ رباعی شاید آپ کی نظر سے نہ گزری ہو۔ ملاحظہ ہو:

کس نہج سے ہم نے ایک کہانی کہہ دی   دو بیتوں میں بات دل کی ساری کہہ دی
لفظوں کی کفایت بھی ہنر ہے اکبر   جب کہہ نہ سکے غزل، رباعی کہہ دی

اس رباعی کے خالق اکبر علی خان المعروف اکبر حیدرآبادی اپنے منفرد لب و لہجے سے ادبی و شعری حلقوں میں نمایاں ہیں۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۲۵ء کو حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آرکیٹیکٹ (architect) بنے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد اور ممبئی کے بعد آکسفورڈ اور برسٹل، یوکے، آئے۔ بی بی سی ریڈیو آکسفورڈ سے آٹھ سال تک تارکین وطن کے لئے ہفتہ وار پروگرام بھی پیش کرتے رہے۔ ابتدائی زمانے میں افسانہ نگاری بھی کی۔ لیکن مستقبل وابستگی شاعری ہی سے رہی۔

جناب اکبر حیدرآبادی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں...'' میری شعر و ادب سے آشنائی میری ہمشیرہ جہاں بانو نقوی کی مرہون منت ہے جو انشاء پرداز اور مضامین کے تین مجموعوں کی مصنفہ تھیں اور جامعہ عثمانیہ کلیہ اناث میں صدر شعبہ اردو تھیں۔ نانا، مرزا نصر اللہ خان فدائی، چونکہ تاریخ ایران کی تین جلدوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر تھے تو ہوسکتا ہے کہ شعر و ادب کا ذوق مجھے ورثہ میں ملا ہو۔ ابتدائی دور میں رومانی تاثرات سب سے اہم محرکات ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ غم دوراں نے ان کی جگہ لے لی۔ بالآخر فکر و نظر کے وسیع تر تناظر میں انسان، حیات اور کائنات کے باہمی رشتوں کے پیدا کردہ حالات و مسائل اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقا، سفر اور عصری تقاضے موضوعِ سخن بنتے گئے''۔

انکی شاعری کا ابتدائی دور ترقی پسند نظریات سے متاثر رہا۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کا ایسا غلبہ رہا کہ نئی کھیپ کے لکھنے والے اس سے متاثر

ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے میں یہ اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں فن تعمیر کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے اکبر حیدرآبادی انگلستان چلے گئے۔ جہاں ایک عرصے تک تخلیقی دھاروں پر جمود طاری رہا کیونکہ اشتراکی نظریات کے پرچار کے لئے وہاں (برطانیہ) کا ماحول سازگار نہ تھا۔ ان کا کلام افکار، اوراق، شاعر، منشور، ابلاغ، ذہن جدید، شب خون اور سب رس میں شائع ہوتا رہا ہے۔ چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں...خطِ رہ گزر (۱۹۷۱ء)، نمو کی آگ (۱۹۸۰ء)، آوازوں کا شہر (۱۹۸۷ء) اور ذروں سے ستاروں تک (۱۹۹۳ء)۔ آخر الذکر مجموعے کو اردو مرکز انٹرنیشنل، لاس اینجلس، کیلی فورنیا، امریکہ کی طرف سے ۱۹۹۳ء کی بہترین شعری تصنیف کا انعام دیا گیا۔

شاعری میں ابلاغ کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے..." ابلاغ، ادیب و شاعر کے لئے یقیناً ضروری ہے اور تخلیق کار کو حتی الامکان اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ زبان اور اسلوب عام فہم ہو۔ لیکن چونکہ آج کی زندگی بہت گنجلک ہے اور بعض نئے علوم (مثلاً علم نفسیات و دیگر) نے موضوعات کو گمبھیر بنا دیا ہے تو بعض اوقات شعر کا تہہ دار ہونا لازمی بات ہے۔ ایسی صورت میں ترسیل و ابلاغ کے لئے قاری کو بھی تھوڑی بہت محنت کرنا پڑتی ہے"۔

اکبر صاحب تنقید کے حق میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں..." ادب کی تمام اصناف میں تنقید نگاری سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ یہ وہ کسوٹی ہے جو کھرے کھوٹے کا کھوج لگاتی ہے اور ادب میں صحت مند اور ارتقا پزیر رجحان کو فروغ دیتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ادب انحطاط اور سہل نگاری کا شکار ہو جاتا ہے"۔

ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کا سبب ان کے نزدیک عوام الناس کی علمی موضوعات اور سستی اور جذبات انگیز تحریروں سے رغبت ہے۔ اور ٹیلی ویژن بھی اس ضمن میں منفی رول ادا کرتا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بظاہر یہ ایک مشکل صورت حال ہے مگر شعر و سخن کی نجی محفلیں کسی حد تک اس مسئلے کا حل فراہم کر سکتی ہیں۔ ایسی محفلیں بنیادی طور پر سماجی نوعیت کی ہونے کے باعث لوگوں میں بالواسطہ شعر و ادب کا مذاق پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ایسی محلہ دار چھوٹی چھوٹی ادبی محفلیں تشکیل دی جا سکتی ہیں جو کم از کم ہر دوسرے تیسرے مہینے تقریب کا اہتمام کر سکیں تا کہ غیر شعوری طور پر شعر و ادب سے لوگوں کی وابستگی بڑھ جائے۔

اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا..." نئی نسل اور اردو کی بقا کا مسئلہ امریکہ ہی میں نہیں بلکہ خود انگلستان میں بھی بہت تشویش ناک ہے۔ تاہم یہاں اردو کی تعلیم و ترویج اور اشاعت پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ مساجد اور مدارس میں بھی بچوں کو اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ والدین کو بھی چاہیئے کہ اپنے بچوں کے لئے اردو میں دلچسپی لینے کے سامان فراہم کریں اور ان کی طرف سے پازیٹیو رسپانس (positive response مثبت ردعمل) ملنے پر انہیں قیمتی تحفے اور تحائف سے نوازیں جس طرح عید بقرعید کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ اس سے یقیناً ان میں

اردو سیکھنے اور بولنے کی امنگ اور ولولہ پیدا ہوگا۔ مزید یہ کہ اردو کی بہبودی اور بقا کے لئے کام کرنے والے مقامی اور بین الاقوامی اداروں کو آپس میں قریبی رابطہ قائم کرنا چاہیئے اور کم از کم سال میں ایک بار مل کر تبادلۂ خیال کرنا اور ایک دوسرے کے تجربے اور مشورے سے استفادہ کرنا چاہیئے''۔

اکبر صاحب کی رائے میں آج وہ ادب تخلیق نہیں ہو رہا جس کی جڑیں ہماری زمین میں پیوست ہوں۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں... ''موجودہ اردو شاعری مجموعی حیثیت سے غزل کی شاعری ہے اور ظاہر ہے کہ تنگنائے غزل میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ زندگی کے اہم مسائل کا بھرپور احاطہ کر سکے۔ اور پھر جو غزل آج لکھی جا رہی ہے وہ اتنی رومان گزیدہ ہے کہ اس کی جڑوں کا زمین میں پیوست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ نظموں میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ مگر افسوس کہ نظمیں کم لکھی جا رہی ہیں''۔ انہیں تنقید نگار کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں ''سہل انگار اور انحطاط پزیر ہو کر یہ 'ادب برائے ادب' کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ ادب سے یہاں مراد شاعری ہے کہ اردو جرائد کے مطالعے سے یہ بات شفاف آئینہ کے عکس کی طرح اجاگر ہو جاتی ہے کہ محض الفاظ کی بھرمار ہے مگر معنویت اور مقصدیت عنقا۔ مجموعی اعتبار سے غزلوں کا معیار اوسط درجے کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غزل مشاعروں کو پیش نظر رکھ کر لکھی جا رہی ہے۔ زبان کی چاشنی، خیال کی لطافت، اسلوب کا بانکپن اور فکر کی ندرت ناپید ہے۔ اغلاط کو نئی زبان کے حیلے سے مستند قرار دیا جا رہا ہے اور یاوہ گوئی کو فن کا نام دیا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ترقی پسند تحریک نے ہمارے نیم جاں ادب میں نئی روح پھونک کر اسے ایک صحت مند اور توانا وجود عطا کیا تھا۔ موجودہ ادب اپنی وہ رعنائی اور توانائی کھو چکا ہے''۔

ان کے نزدیک یہ سوال بہت کٹھن (لاجواب کر دینے والا) ہے کہ آج کون کون سے شاعر اپنی ذات کے حوالے سے روحِ عصر کی عکاسی کر رہے ہیں؟ کہتے ہیں...'' جزوی حیثیت سے تو کچھ نام لیئے جا سکتے ہیں مگر ایسا ایک نام بھی ذہن میں نہیں آ رہا جو کلی اعتبار سے اپنی ذاتی تجربے، اپنے مشاہدے اور اپنی منفرد فکر و احساس کے بل بوتے پر بامعنی ادب تخلیق کر رہا ہو۔ اردو کے بہت سے شاعروں کے یہاں نئے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر جب تک نئے پن کے کوئی معنی نہ بنتے ہوں اسے محض اس اکہرے اور سطحی وجود کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا''۔

ان کا نیا یعنی پانچواں مجموعہ کلام ''قرض ماہ و سال کے'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہو کر ادب دوستوں میں خاصی پزیرائی حاصل کر چکا ہے۔

Mr. Akbar Hyderabadi,
14 Beech Crescent, Kidlington, Oxford, OX5 1DW, UK

انتخابِ کلام

کھلی نہ غم کی گھٹا گریۂ ملال کے بعد
سنا تھا دھوپ نکلتی ہے برشگال کے بعد

ہے سلسلہ سا شب و روز آزمائش کا
کمندِ نور بھی ہے تیرگی کے جال کے بعد

میں آفتاب کی اقلیم کا ستارہ ہوں
مجھے عروج ملے گا مرے زوال کے بعد

ابھی تو وقت کی زنبیل میں بہت کچھ ہے
نئی زبان بنے گی، نئے خیال کے بعد

میں سوچتا ہوں کہ دیکھوں تمہیں کن آنکھوں سے؟
ملے ہو آج جو تم اتنے ماہ و سال کے بعد

تمام عمر اسی ایک خیال میں گزری
کوئی خیال نہ آیا، ترے خیال کے بعد

نئے سوال کی تمہید بن گیا اکبر
جواب اس کا، مرے آخری سوال کے بعد

مری آنکھو، بتاؤ آج تم کو ہوا کیا
اثاثہ تھا جو دل میں آنسوؤں کا، لٹ گیا کیا

ہوا کے آئینے پر سرخیوں کا عکس کیوں ہے
دبی چنگاریوں سے پھر کوئی شعلہ اٹھا کیا

بڑھاتا تھا جو غم کی لے شریکِ درد ہو کر
وہ چادر بے حسی کی تان کر اب سو گیا کیا

محبت کی زباں مبہم بھی ہے گمبھیر بھی ہے
خدا جانے کہا کیا اس نے اور میں نے سنا کیا

سکونِ جاں کی خاطر توڑ دی یادوں کی زنجیر
تو پھر ایسے میں دل سے بے مروّت کا گلہ کیا

وہیں منزل، جہاں رک جائیں اکبر پائے جولاں
تسلسل کے سفر میں ابتدا کیا انتہا کیا

کبھی اک بار گر سوچیں تو صحرا کو بتا پاؤ
عنایت ہے یہ بادل کی کہ یہ بادل کا احسان

اُمنگ
۱۷ مارچ ۲۰۰۳

اُمنگ بالی

آٹوا، کنیڈا

حیرت کی بات تو ہے مگر خدا جسے نواز دے۔ سو وہ رب العالمین ہے اُس نے اُمنگ بالی کو اردو زبان و ادب کی محبت سے نواز اور نہ اُمنگ نے تو ہندی پڑھی، انگریزی پڑھی اور پیدائش جس صوبے میں ہوئی وہ آسام ہے جہاں اردو کا گزر کہاں تھا۔ مگر لکھنؤ کے ماحول نے اُمنگ کے رگ و پے میں اردو زبان کی شیرینی گھولی۔ لکھنؤ کی تہذیب نے اُمنگ کو اردو بولنے کا سلیقہ سکھایا اور یہ اُمنگ کا اپنا کریڈٹ (credit) ہے کہ لکھنؤ چھوڑے مدت ہوئی مگر اس شخص نے اپنے خمیر میں رچی بسی اردو کی خوشبو کو اپنے گرد و پیش میں پھیلایا اور اب آٹوا کی غیر سرزمین پر اردو کے چراغ جلانے میں پیش پیش ہے۔

آپ کو اُمنگ سے مل کر حیرت ضرور ہوگی اور خوشی بھی۔ ان کی شاعری کے مدھم لہجے میں کبھی کبھی ولی عالم شاہین بولتے ہیں لیکن اُمنگ کا اپنا ایک جداگانہ اسلوب بھی ہے۔

والدین نے ان کا نام رکھا یا خود انہوں نے، اس کا مجھے علم نہیں مگر نام اُمنگ بالی ہے اور تخلص اُمنگ، کچھ سال قبل اشراق بھی اختیار کیا تھا جسے مکمل طور پر اب بھی ترک نہیں کیا۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا... ''میرے والد کرنل برمہ سروپ بالی کا مولد لاہور ہے اور میری امی ڈاکٹر کمل بالی کا راولپنڈی۔ ۱۹۴۷ء میں میرے والد لاہور ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور اپنے ابا حضور کے خون

سے اجداد کے نشان مٹاتے ہوئے، دل پر گہرا داغ لیئے ہندوستان منتقل ہوئے۔

میری پیدائش ۳/ مارچ ۱۹۷۰ء کو صوبہ آسام کے شہر جوہراٹ میں ہوئی۔ فوجی ملازمت کے سبب میرے والد اُن دنوں آسام میں تعینات تھے۔ پھر چند دنوں بعد میری ماں مجھے لکھنؤ لے آئیں جہاں میرے نانا حضور کرشن سنگھ دتا بعد از تقسیمِ ملک منتقل ہوگئے تھے۔ ملازمت کے دوران میرے والدین جگہ جگہ منتقل ہوتے رہے، میں نے اپنی نانی شریمتی سیتہ دتا کے آنچل تلے پرورش پائی اور آماج گاہِ تربیت لکھنؤ رہا۔

پہلی تین جماعتیں سولن، ہماچل پردیس کے سینٹ لوکس اسکول (St. Lucas School) میں پڑھیں۔ پھر چوتھی جماعت سے بارھویں جماعت تک لکھنؤ کے سینٹ فرانسس کالج (St Francis College) میں طالب علم رہا۔ تیرھویں جماعت آٹوا، کنیڈا کے ارل آف مارچ سیکنڈری اسکول (Earl of March Secondary School) سے ختم کرنے پر آٹوا کی کارلٹن یونیورسٹی (Carlton University) میں الیکٹرکل انجینیئرنگ (Electrical Engineering) میں داخلہ لیا جہاں سے میں نے ۱۹۹۴ء میں اعزاز کے ساتھ بیچلر آف انجینیئرنگ (Bachelor of Engineering) کی ڈگری حاصل کی۔

فی الحال میں ایک سافٹ ویر انجینیئر (Software Engineer) کی حیثیت سے آٹوا شہر میں ملازم ہوں۔ میرا کنبہ میری اہلیہ گیتا اور دختر عائشہ سے شاد و آباد ہے"۔

بالی بتا رہے تھے کہ انہیں ادب سے رغبت بچپن سے رہی۔ جہاں تک یاد ہے، نویں جماعت سے انہوں نے اپنے جذبات نثر پاروں میں رقم کرنے کی ابتدا کی تھی۔ ذہن میں تخم شعر و سخن پیوست کیئے ولی عالم شاہین صاحب نے، جن کی پُر التفات آبیاری اور مستقل حوصلہ افزائی کے سبب کچھ نہال پھوٹے ہیں۔ سخن کی اس فصل نے ڈاکٹر راج کمار قیس صاحب کی مہر و محبت سے بھی نشو و نما پائی ہے۔

پہلا شعر جو اُمنگ نے آج سے تقریباً چھ سال قبل فراق صاحب کی ہم زمین غزل سے متاثر ہو کر کہا تھا، یوں ہے۔

یہ جو آنکھوں کی پیاس ہے کیا ہے؟ آرزو ہے کہ آس ہے کیا ہے؟

انہوں نے بتایا کہ انہوں نے غزلوں کے علاوہ معریٰ، مقفیٰ، آزاد نظمیں، دوہے اور کچھ ہائیکو بھی قلم بند کیئے ہیں۔ ان کے خیال میں... "نثری نظم کی اصطلاح خود ایک تضاد ہے۔ کشورِ شعر و سخن میں نظم کا لفظ ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔ وہ معنویت جس سے الفاظ کی منظم ترتیب مراد ہے اور جو ادب کی شاخ شعریات کا جبلّی عنصر بھی ہے۔ اس معنویت سے جداگانہ شاخ ادب حلقۂ نثر ہے۔ نثری نظم کی اصطلاح دراصل ساختیات، رومانیت وغیرہ جیسی اصطلاحات کی مانند انگریزی ادب سے مستعار لی گئی ہے۔ اردو ادب میں وہ صنفِ سخن جسے آزاد نظم کہتے ہیں، جو اردو ادبی روایت کی ارتقا کی نشان دہی بھی کرتی ہے، غالباً انگریزی ادب کی نثری نظم سے کچھ مماثلت رکھتی ہے۔ مگر فرق واضح ہے کہ آزاد نظم

بھی بحر و نظام کے تقاضوں سے ماورا نہیں۔ انگریزی ادب کے تقاضے اردو ادب سے قدرے مختلف ہیں، اور تو اور بنیادی اصول مثلاً قوافی کے قواعد و ضوابط میں بھی نمایاں فرق ہے۔ پھر ایسی صنفِ سخن جسے ایک عرصہ بعد خود انگریزی ادب میں مکمل طور پر مقبولیت حاصل نہیں اُسے ہو بہو اردو ادب میں منتقل کر دیا گیا یہ حیرت انگیز بات ہے"۔ اُمنگ کہہ رہے تھے... "میری سمجھ کے مطابق شعریات کا ایک اہم انگ نظامی نقوش اور ان کی تکرار ہے، جس سے نغمگی پیدا ہوتی ہے، جس کے بغیر سخن کا حسن ایسے رہ جاتا ہے جیسے بِنا لئے کے سنگیت۔ اردو ادب میں نثری نظم کی مقبولیت پر مجھے شبہ ہے۔ ایک تضاد کتنے دن قائم رہ سکتا ہے یہ وقت بتلائے گا۔ جہاں تک نثری غزل کا سوال ہے، یہ اصطلاح تو تضاد اندر تضاد ہے۔ وزن و ردیف و قوافی سے مبرّا ہو کر نہ غزل کی مانگ میں سیندور رہے گا، نہ تن پر لباس، نہ زیور و آرائش۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ غیر مانوس زبانوں کے شاعرانہ ادب کی رسائی میں نثری نظم بے حد مفید ثابت ہوئی ہے جس سے میں بھی فیضیاب ہوا ہوں"۔

سوال نمبر ۴ کے جواب میں انہوں نے کہا... "گزشتہ سات صدیاں نہ صرف شاہد ہیں، بلکہ اس کی تصدیق بھی کرتی ہیں کہ اردو ادب میں جاودانی قوت کا عنصر موجود ہے۔ یہ کہنا شاید واضح کی وضاحت ہوگی کہ بعد از تقسیمِ ملک ہندوستان میں اردو ادب کی ارتقا کو گہری ٹھیس پہنچی ہے۔ مگر اس کسوٹی پر بھی اردو ادب پورا اُترا ہے۔ دور از برصغیر، مغرب میں بھی اس کی مستحکم بنیاد پڑ چکی ہے۔ جس کے سبب اردو ادب کو مزید نشو و نما حاصل ہوگی۔ اردو ادب کا مستقبل میرے نزدیک پُر اُمید ہے لیکن جہاں تک اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کا سوال ہے میں سب سے قبل یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کل بہ خاطرِ عوام اردو زبان کو انٹرنیٹ (internet) پر انگریزی میں ٹرانس لیٹریٹ (transliterate نقل حرفی) کر کے لکھا جا رہا ہے، ہندوستان میں اسے ناگری رسم الخط میں تحریر کیا جا رہا ہے۔ اس کے سبب اردو زبان کی رسائی عام آدمی تک ہو رہی ہے اور عوام میں دل چسپی پیدا کرنے کے لئے یہ دونوں ذرائع خوب ہیں۔ مگر جہاں اردو ادب کی بات آتی ہے وہاں اردو کے مروج رسم الخط کے سوا کوئی دوسرا رسم الخط موزوں نہیں۔ اردو کے الفاظ پر نظرِ ثانی کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ کسی اور رسم الخط میں اتنی ساختیاتی و لسانیاتی قوت نہیں کہ اس میں اردو باقاعدگی سے تصنیف ہو سکے۔ لہٰذا جس شخص کو واقعی اردو ادب سے عقیدت ہوگی وہ اردو رسم الخط کو سیکھنے کی زحمت ضرور اُٹھائے گا۔ کسی گل کی شناخت محض اس کے رنگ و روپ یا خوشبو سے نہیں ہوتی۔ اس لئے میں اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں"۔

اب میں نے ان سے ایک سوال میں تین باتیں پوچھیں ... "کیا یہ درست ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے؟ کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے؟ اور کیا اردو زبان کو اپنا کر آپ گھاٹے میں رہے"؟

اُمنگ نے کہا... "غزل اور نظم محسوسات کو ڈھالنے کے دو مختلف پیکر ہیں، جیسے دو نہایت

خوب صورت گل دان۔ اب ان میں کس طرح، کون سے گل سجائے جاتے ہیں ان کی زینت افزائی اس پر منحصر ہے۔ راگ بھیرو چاہے سارنگی، بانسری یا پھر ستار پر مترنم ہو ایک ہی طرح کے جذبات جگاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سامعین میں کسی کو سارنگی کی آواز فردوس گوش لگے یا کسی کو بانسری کی۔ سامعین میں اس راگ کے جذبات جگانا دستِ صاحب ساز کا کمال ہے اور اس کے فن کی پرکھ بھی اسی میں ہے۔ ہو بہو اسی طرح قارئین میں جذبات جگانے کے دو ساز غزل اور نظم ہیں۔ اب ان سے کیسے اور کس طرح سُر برآمد کیئے جاتے ہیں یہ صاحبِ قلم پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ احساسات کے ترجمان کی پرکھ دستِ صاحبِ قلم کی صناعی میں ہے۔ لگے ہاتھ اتنا اور عرض کرنا چاہوں گا کہ فی زمانہ بعض لوگوں کے لئے غزل یا نظم کی مخالفت کرنا ایک فیشن اسٹیٹ منٹ (fashion statement عام چلن) سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں جس کا قصد محض تشہیر کے سوا کیا ہے خدا معلوم"۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ... "ہر دور کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ آج کے دور کا ادب بھی اسی سعی میں محو کار ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: مغربی مادیت کو کس خوب صورتی سے شاہین صاحب نے کل دو مصرعوں میں قلم بند کیا ہے

رقص ہے ایک سکّے کا دن رات کیا روشنی ہے یہی تیرگی ہے یہی

اختر الایمان صاحب کی شاعری ان کے عہد کی نہایت خوب صورت ترجمان ہے۔ اسی طرح فیض صاحب کی سخنوری ان کے دور کا آئینہ ہے۔ یہی ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب یا شاہین صاحب کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ انگریزی ادب پر نگاہ ڈالیں تو اسٹیفن ڈن، سیزلا ملوز، ٹیڈ ہیوز، سیمس ہینی، مارگریٹ ایٹ وڈ (,Stephen Dunn, Ceslav Milos, Ted Huges, Seamus Heaney Margaret Atwood) کی شاعری میں اس دور کی خوبیوں اور علتوں کی بھرپور جھلک ملتی ہے"۔

"جہاں تک اردو زبان کو اپنا کر گھاٹے میں رہنے کا سوال ہے سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ زبان فقط ایک ذریعہ ہے فن کی پرکھ اور خیالات کے مظاہرے کے لئے۔ کوئی مصنف اپنے خیالات بیان کرنے کے لئے کونسی زبان اختیار کرتا ہے اس کے پیچھے بہت سے راز و کار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کچھ تو غالباً قلم طراز کی دسترس ذہانت سے بھی باہر ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں ایک کار ضرور یہ رہا ہوگا کہ ادیب اس زبان میں سوچنے اور اس میں اظہارِ خیال کرنے میں آسانی محسوس کرے۔ کہیں کسی لاشعوری سطح پر یہ بات بھی دماغ میں رہتی ہوگی کہ زبان اور اس کا ادب غنی ہوں اور ارتقا پسند بھی۔ میرے نزدیک، مجھے اردو زبان سے وہ سب کچھ میسر ہے جس کی بنا پر میں نے اردو کو شاعرانہ زبان کے طور پر قبول کیا۔ ورنہ اس شخص کے لئے جس کی مادری زبان پنجابی ہو، تعلیم انگریزی میں حاصل کی ہو، کلشٹ ہندی بمقتضائے سیاست پڑھائی گئی ہو اور اردو ورثے میں ملی ہو، یہ فیصلہ نہایت مشکل ثابت ہوتا ہے"۔

اُمنگ نے بتایا کہ وہ سب سے زیادہ علامہ اقبالؔ کی شاعری سے متاثر رہے ہیں۔ ان کے

ز یک کلیات اقبال فکر انگیزی کا ایک ایسا بے گراں ذخیرہ ہے جس کے گنجہائے حسن سے مکمل واقفیت کے لئے ایک عمر کافی نہیں۔ افسوس! فرصت گناہ صرف چار ہی دن کی ہے اور بلا شبہ وہ بے بہرا نہیں، سو معتقد میر ہیں اور جن صاحب سخن کا یہ عقیدہ ہے، یعنی غالب، اُن سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی اردو ادب میں سودا، نظیر اکبرآبادی، حالی، فراق، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، جگر، مجاز، اختر الایمان، پنڈت آنند نارئن ملا، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، مخدوم، کیفی اعظمی، ناصر کاظمی، جذبی، شاہین، محبّ عارفی، فراز، ڈاکٹر منیب الرحمن، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، ندا فاضلی، جون ایلیا چند ایسے نام ہیں جن کی قلم طرازی نہ صرف انہیں عزیز ہے بلکہ مندرجہ بالا شعرا کے اساتذانہ کلام نے فن سخنوری کے نکات کے بارے میں انہیں بہت کچھ سکھایا ہے اور بلا شبہ سکھاتا رہے گا۔

مصنفین اردو ادب کے علاوہ رِلکے، ییٹس، رابرٹ فراسٹ، اوڈن، پابلو نیرودا، ایمیلی ڈکنسن، ایڈنا ملے، ولیم کارلوس ولیم (Rainer Maria Rilke, William Butler Yeats, Robert Frost, W. H. Auden, Pablo Neruda, Emily Dickenson, Edna St. Veincent Millay, William Carlos William) جیسے اساتذہ کے کلام سے بھی بہت لطف اندوز اور مستفید ہوتے ہیں۔ پنجابی ادب میں حضرت وارث شاہ حضور، بابا بلھے شاہ حضور، حضرت سلطان باہو کے بے نظیر کلام کی گہری چھاپ ان کے دل پر ہے۔ جدید پنجابی ادب میں شو کمار بٹالوی، امرتا پریتم، نور مسعود، سُر جیت پاتر، نند لال نور پوری کی قلم طرازیوں سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ پھر کچھ رُک کر امنگ بولے... ''میرے لئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے قدآور شعرا کونسے ہیں۔ وہ اس لئے کہ میں 'قدآور' زمرے کو کبھی صحیح طور سے متعین نہیں کر پایا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جن سخنوروں کے نسخے شاذ و نادر ہی میری میز سے جدا ہوتے ہیں اُن میں اقبال، فراق، جوش، فیض، مخدوم، مجاز، اختر الایمان اور شاہین کے اسم گرامی شامل ہیں''۔

اپنی زندگی کے یادگار واقعات یاد کرتے ہوئے انہوں نے کہا... ''میری زندگی میں دو ایسے واقعے گزرے ہیں جن کا احساس گرفت وقت سے ماورا ہے۔ پہلا آج سے چودہ (۱۴) سال قبل گزرا جب میری نانی جہان فانی سے کوچ کر گئیں اور زندگی میں پہلی بار اکیلے پن کا شدید احساس ہوا۔ دوسرا واقعہ آٹھ (۸) ماہ قبل گزرا جب میری لختِ جگر عائشہ کا میری زندگی میں دخل ہوا۔ دل پر دھرا غریب الوطنی کا سنگ گراں کچھ ہلکا ہوگیا اور دماغ میں رہ رہ کر ٹیگور کا مقولہ گونجتا رہا کہ نوزائیدگان کے دیکھے سے یہ آس بندھتی ہے کہ خدا آدمی سے ابھی تک سر بسر مایوس نہیں ہوا''۔

Mr. Umang Bali,
180 Windhurst Drive, Nepean, Ont. K2G 6JU, Canada

انتخابِ کلام:

وشت کی پہنائیوں میں یوں کٹی عمرِ طویل
قیس کے نقشِ کفِ پا تھے ہمارے سنگِ میل

اپنی لاچاری بھی جیسے ایک رحمت سی لگی
زد میں طوفانوں کی جب آئی نظر کوئی بھی جھیل

اک نشانِ شمع کشتہ اور پروانوں کے پَر
گرمئی ہنگامِ شب کی اور کیا ہوگی دلیل

تشنہ لب آہو سے پوچھو ریگ زاروں کی تپش
ایک قطرہ آب کا لگتا ہے جیسے کوئی جھیل

گفتگوئے یار میں پھر لطف کا عالم کہاں
جب تلک نکلے نہ کوئی چھیڑ خانی کی سبیل

ابر آلودہ فلک پر جب بھی دیکھا زرد چاند
یاد کیوں آخر اُمنگ آئی مجھے شامِ رحیل
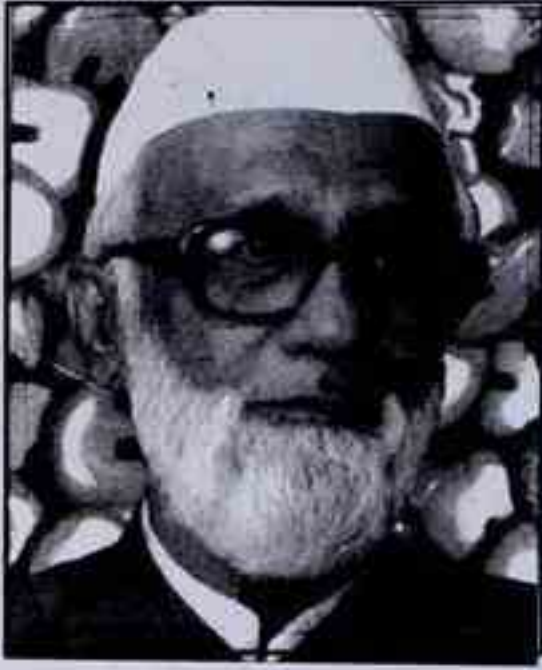
نیازمندوں نے تیرے بھیس ہی کو گھیر لیا
جو بے نیاز تیرے آستاں سے گزر گئے

یوسف کمار

امینِ حزیں

پونے، ہندوستان

دبلے پتلے سے آدمی ہیں امین حزیں۔ لیکن عزم رکھتے ہیں لوہے جیسا۔ جب سوچ لیں کہ کوئی کام کرنا ہے یا کروانا ہے تو وہ کام پائے تکمیل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

یوسف خان صاحب عرف دلیپ کمار کے پرستاروں میں ہیں (میں بھی ہوں)۔ دلیپ کمار صاحب ویسے خاص خاص جگہوں پر جاتے ہیں اور خاص خاص لوگوں سے ملتے ہیں۔ امین حزیں بھی خاص آدمی ہیں۔ وہ دلیپ صاحب یعنی یوسف خان صاحب کو اپنی ایک تقریب میں کھینچ لائے جہاں دلیپ صاحب نے اپنی دل نواز آواز میں تقریر بھی فرمائی۔ شہنشاہ جذبات تو ہیں ہی وہ، بہادر بھی ہیں۔ پھر وہ کارِ خیر بھی خوب کرتے ہیں۔ فاطمید فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان ایک ایسی انجمن ہے جو خون کے عطیات جمع کرتی ہے اور اسپتالوں میں جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں خون مفت مہیا کرتی ہے۔ فاطمیہ کی دعوت پر یوسف خان صاحب پاکستان گئے تھے جس کا خمیازہ واپس ہندوستان جا کر انہیں خوب بھگتنا پڑا۔ تنگ نظر اور ہٹ دھرم لوگوں نے ان کے گھر کے گرد گھیرا ڈالا اور انہیں خوب آزار پہنچایا۔ مگر دلیپ صاحب نے فاطمید فانڈیشن کی دعوت پر انسان کی فلاح و بہبود کی راہ میں پاکستان میں قدم رکھا تھا سو کانٹے بھی چنے۔ امین حزیں نے انہیں ان کے ایسے ہی کارناموں پر خراج تحسین پیش

کرتے ہوئے ایک ''توشیحی نظم'' دلیپ صاحب کی اسیویں (۸۰ ویں) سال گرہ پر ان کی نذر کی۔

ملاحظہ ہو

ی	یقین کیجیے تعریف صرف خدا کی ہے	ش	شعوری، غیر شعوری ثنا خدا کی ہے
و	وہی قرینۂ نقش و نگار دیتا ہے	ہ	ہماری زیست کو خود ہی سنوار دیتا ہے
س	سمجھ کے میں بھی قلم بند کر رہا ہوں نظم	ن	نگارشات کو محفوظ کر رہا ہوں بعزم
ف	فریضے خوب نبھائے ہیں اپنی فلموں میں	ش	شمار رکھتے ہیں عوام اپنے ذہنوں میں
خ	خیالِ خاطرِ احباب ہے تمہارا شعار	ا	ایاز بن کے نبھائے ہیں آپ نے کردار
ا	ادب نواز بھی ہو اور زباں پہ قابو بھی	ہ	ہنر میں یکتا ہو رکھی ہے لاج پیشے کی
ن	نیاز مندی تمہاری ہے قابلِ تعریف	ج	جناب جب تو ثناخواں ہوئے تمہارے حریف
د	دلوں کو جوڑنے والا شعار اپنایا	ذ	ذہین، فکر و ذہانت ہے تیرا سرمایہ
ل	لحاظ رکھتا ہے قوم و وطن کی خدمت کا	ب	بہت خیال رکھا آدمی کی عظمت کا
ی	یہ ایک خوبی ہے انسانیت کی عظمت کی	ا	اساسِ زیست کی آپ نے تو عزت کی
پ	پرائے غم کو بھی سمجھا ہے اپنا غم تم نے	ت	تبھی تو لگا ہے بگا ہے سے تم تم نے
ک	کبھی 'شہید' کبھی 'رام شیام' یا 'لیڈر'	م	مغل بنے تو بنے تم سلیم جیسے پسر
م	محبتوں کے قرینے سکھائے خوبی سے	م	مفید راہیں بتائی ہیں دل جمعی سے
ا	اثر پزیر زمانے میں شخصیت پائی	ب	بشر نواز و ہمدرد خاصیت پائی
ر	رہے تمہارا گلستانِ زندگی آباد	ی	یہی دعا ہے امینِ حزیں کی 'زندہ باد'

یوسف خان دلیپ کمار — شہنشاہِ جذبات ممبئی

جناب امینِ حزیں کی کہی ہوئی توشیحی نظموں کا مجموعہ بعنوان ''توشیحی نظمیں'' فروری ۲۰۰۳ء میں جناب نذیر فتح پوری نے اسباق پبلی کیشنز، پونے سے شائع کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر اسلم حنیف نے پیش لفظ بعنوان ''امینِ حزیں..... اردو کے ممتاز توشیح نگار'' میں دبی پرشاد سحر بدایونی کے حوالے سے توشیح نظم کی تعریف یوں قلم بند کی ہے۔ ''توشیح وہ کلام نظم ہے کہ اگر حروفِ اول آخر جملہ مصرعوں یا ابیات جمع کریں تو کوئی نام یا بیت یا عبارت حاصل ہو''۔ توشیح کا ماخذ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، ''موشحہ لفظ ماخوذ ہے عربی لفظ 'وشاح' سے، جس کے معنی نہایت قیمتی پتھروں اور رنگا رنگ جواہرات سے مزین ہار یا چمڑے کا وہ گلوبند ہے جو عورتیں ایک کاندھے سے ترچھا لٹکا کر دوسرے پہلو تک پہنچتی تھیں۔ جواہرات سے مزین و مرصع تلوار اور کمان کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اہل عرب نقش و نگار والے قیمتی کپڑوں کو 'ثوب موشح' کہتے تھے۔ ایسی مادہ بز، جس کی گردن اور سینہ سفید ہو کو 'وشحا' کہا جاتا تھا۔ یمن کے ایک قبیلے کا نام 'واشح' تھا۔ اتشح، وشح اور توشح کے معنی متذکرہ ہار پہننے کے ہیں۔ موشحہ کے معنی میں تمام اقسام شعری ہیں جو لحن اور آہنگ اور ہیئت وقوافی کے اعتبار سے مروجہ تمام پابند نظموں سے

مختلف اور خوب صورت اجتہاد کی غماز ہوں۔ لفظ 'توشیح' بھی 'وشاح' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہار پہنانے کے ہیں۔ میرے خیال میں زیر بحث صنعت کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ شاعر ممدوح کے حروف کا ہار نظم کو پہناتا ہے''۔

سہ ماہی ''اسباق'' پونے، ہندوستان کے مدیر جناب نذیر فتح پوری نے امین حزیں کی خدمات کو خراجِ تحسین و محبت پیش کرنے کے لئے ستمبر ۲۰۰۳ء میں اسباق پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ''امین حزیں...... شخص، شاعر اور استاذ'' کے زیر عنوان ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں امین حزیں کی شخصیت، شاعری، ماہیہ نگاری، بچوں کے لئے شعری ادب، توشیحی نظموں اور ان کی نثر کا احاطہ کرتے ہوئے کتاب کو تصویروں سے بھی مزین کیا ہے۔

امینِ حزیں نے اصناف سخن میں نظم، غزل، ماہیے، اور بچوں کے لئے نظمیں کہی ہیں۔ ساتھ ہی میں انہوں نے نثر بھی لکھی ہے۔ ان کی تصانیف (۱) سلبھ اردو پریچے [یعنی ہندی سے اردو ٹیچر] ۱۹۶۰ء میں (۲) نگینے [بچوں کی نظمیں] ۱۹۷۲ء میں، (۳) فاتح [سوانح حضرت علیؓ ہندی میں] ۱۹۷۵ء میں، (۴) شگوفے اور (۵) گلدستے [بچوں کے لئے نظمیں بالترتیب ۱۹۷۶ء اور ۱۹۹۲ء میں، (۶) تعلیمی آبادی پر نظمیں ۱۹۹۴ء میں، (۷) گھنی چھاؤں کا پیڑ [ماہیوں کا مجموعہ] ۲۰۰۰ء میں اور (۸) توشیحی نظمیں ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہیں۔

میں نے پوچھا ''امین صاحب، آپ کا تاریخی نام کیا ہے''؟ کہنے لگے، ''شیخ امین الدین محی الدین۔ مگر میں نے مختصر کرکے ادبی نام امین حزیں بنالیا۔ ۲/ اگست ۱۹۲۷ء کو پونے (مہاراشٹر، ہندوستان) میں پیدا ہوا۔ اور بقول کسے 'زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد' اپنی زمین سے جڑا ہوا ہوں۔ اور کیوں نہ ہو کہ وضع دار انسان ہیں ہم۔ بالکل حضرت داغ کی طرح کہ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے''۔

''حضور، کوئی شعر سنایئے۔ آپ کا ہو تو بہتر ہوگا''، میں نے عرض کیا۔ تو کہنے لگے، ''بی بی، آپ زندہ شعرا کا تذکرہ لکھ رہی ہیں۔ خوب کر رہی ہیں۔ ورنہ یہاں تو یہ حال ہے۔

مرنے کے بعد پھولوں سے تربت نوازدی   ہوتا ہے کون زیست میں پرسانِ زندگی

اس خوب صورت شعر کو سننے کے بعد میں نے ان کی تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ فرمانے لگے، ''تعلیم بی اے ہے اور سینیئر ٹرینڈ مدرس ہوں راشٹر بھاشا (ہندی) میں پنڈت۔ تعلیم پونے میں ہی ہوئی۔ یہیں مدرسی کا پیشہ اختیار کیا انتالیس (۳۹) سال چھ (۶) ماہ تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد سپروائزر محکمہ تعلیم کے عہدے پر وظیفہ یابی حاصل ہوئی۔

میں نے ابتدائی عمر سے ہی سوشل ورک میں حصہ لیا۔ اردو کے لئے کافی کام کیا اور اب بھی کر رہا ہوں۔ مختلف تعلیمی اداروں میں خدمات جاری ہیں۔ مختلف سماجی و ادبی سرگرمیوں میں نمائندگی، اردو نرسری، سلائی کی کلاسیں، ایس ایس سی کوچنگ کلاسیں بھی جاری کی ہیں۔ غیر اردو دان طبقے کے لئے اردو سکھانے اور پڑھائی لکھائی کی مفت کلاسیں چلائی ہیں اور کتاب بھی لکھی ہے۔ آج اعظم کیمپس میں

نائب صدر کے عہدے پر ہوں"۔

انہوں نے مجھے یاد دلایا،" جب آپ نے پونے کا دورہ کیا تھا تو دکن لائبریری کی ایک ادبی نشست میں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ آپ اعظم کیمپس سے واقف ہوں"۔

اگلے سوال کے جواب دیتے ہوئے امینِ حزیں صاحب نے کہا،" میری ادبی زندگی کا آغاز جماعت ہفتم میں طالب علمی کے دوران ہی سے ہوا۔ میرا پہلا شعر یہ تھا۔

ایسی تو کوئی بات بھی سرزد نہیں ہوئی　　سوجھی ہے اُن کو خواہ مخواہ کیوں اشتباہ کی

میرا پہلا شعری مجموعہ ' نگینے' تھا۔ میں نے زیادہ تر بچوں کے لئے لکھا ہے۔ ملک کے اخبار اور بچوں کے پرچوں میں کافی کلام شائع ہوا ہے۔ آج صف اول کے شعرا میں مجھے شمار کیا جاتا ہے۔ ادب کے لئے پچھلے پچاس (۵۰) سال سے میری خدمات جاری ہیں۔ اللہ کا کرم ہے اور بس"۔

انہوں نے کہا،" نثری نظم اور نثری غزل کے تجربات ہو رہے ہیں۔ ہر ' زندہ ادب' میں تجربات کا دور آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ بھی ہوتا رہے گا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ ویسے میں اردو زبان اور ادب کے مستقبل سے پُر امید ہوں، لیکن رسم الخط کی تبدیلی کا کٹر مخالف ہوں کیوں کہ اردو میں جن دیگر زبانوں کی شمولیت ہے اُن کی 'صوتی خوب صورتی' رسم الخط کے بدلنے سے مسخ ہو جائے گی۔ اردو میں ایک ہی آواز کے ایک سے زائد حروف ہیں اور اپنے صوتی مزاج سے بہت مختلف ہیں۔ دوسرے یہ کہ اب اردو اپنی ذاتی طرزِ تحریر اور اپنے تمام تر حسن و جمال کے ساتھ نہ صرف بھارت میں بلکہ آپ جیسی ہستیوں کے ذریعے تمام دنیا میں اپنا سکہ جما رہی ہے۔ میری ایک نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قوسِ قزح کا رنگ ہے اردو　　سات سُروں کا سنگ ہے اردو
اس کی کوئی ذات نہیں ہے　　نفرت کی کوئی بات نہیں ہے
یک جہتی کا نعرہ اردو　　آزادی کا دھارا اردو
اس میں ہے اقبالؒ کا نغمہ　　پریم چند کے دل کا سپنا
میری اردو آپ کی اردو　　زندہ باد اے پرچم اردو

امینِ حزیں کا ایک ماہیہ بھی ملاحظہ ہو کہ جس کے ذریعے انہوں نے فہم و فکر کا ایک باب وا کیا ہے۔

مٹ جاتی ہے ہستی سے // قوموں کی بربادی // کردار کی پستی سے

اگلے سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ غزل کے سوا کوئی بھی صنف شاعری احساسات کی بہتر ترجمان نہیں ہے۔ غزل کا ایک شعر جو تاثر پیدا کرتا ہے وہ کوئی نظم یا کوئی اور صنف نہیں کر سکتی۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج کا ادب بھی اپنے عہد کا ترجمان ہے۔ شاعر جس عہد میں رہتا ہے اُس عہد کی ترجمانی کسی نہ کسی طرح ادب کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اردو زبان کو اپنا کر میں کیا کوئی بھی گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ اس کی شیرینی، اس کے آداب و

لہجے کا اثر کس پر نہیں ہوتا۔ جس نے اردو کو اپنایا وہ اسی کا ہو کر رہ گیا"۔

امین حزیں کے خیال میں وہ مولانا الطاف حسین حالی، داغ دہلوی، امیر مینائی، ذوق، نظیر اکبر آبادی، غالب اور سودا سے متاثر ہیں۔ اور اقبالؒ، جگر مراد آبادی، شکیل بدایونی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، مجاز، جاں نثار اختر، وغیرہم گزری صدی کے قدآور شعرا ہیں۔

انہوں نے کہا، "میری زندگی کا یادگار واقعہ ۱۹۷۲ء میں ڈی ایڈ کے امتحان کا ہے۔ جب ہمیں سوالیہ پرچہ اردو کے بجائے ہندی میں دیا گیا، میں نے طلبہ و طالبات کو اس زبان میں پرچہ لینے سے انکار کرنے کے لئے کہا اور امتحانات کا بائیکاٹ کرایا ذرائع ابلاغ سے اس خبر کو خوب مشتہر کیا۔ سرکار سے لڑائی شروع کی۔ مختصر میرا موقف یہ تھا کہ یہاں جب سندھی، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں سوالیہ پرچے ملتے ہیں تو اردو میں کیوں نہیں؟ میں نے یہ سوال مہاراشٹر کے ایوان میں اُٹھوایا اور اس پر بحث ہوئی۔ چنانچہ ایک اسپیشل قانون پاس کرایا کہ آئندہ کوئی بھی امتحان ہو کہ اردو کے طلبہ کے لئے اردو ہی میں پرچے ملنے چاہئیں خواہ شریک امتحان ایک ہی طالب علم ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میری یہ جدوجہد کامیاب ہوئی اور آج اردو میں سوالیہ پرچے ملنے لگے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خلوص نیت سے جدوجہد کی جائے تو اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔

Mr. Amin-e-Hazeen,
1062 Nanapeth, Pune, 411002, India

انتخابِ کلام

صبر و ضبط کے پیمانے جو بھر جاتے ہیں — ظلم اور جور کے شیرازے بکھر جاتے ہیں
نقش پا بھی نہیں ان کے جو گزر جاتے ہیں — مرنے والے یہ خدا جانے کدھر جاتے ہیں
مسکراتے نہیں انجام کی دہشت سے جو گل — اہلِ گلشن کی نگاہوں سے اُتر جاتے ہیں
داستاں جب میری چھڑ جاتی ہے مے خانے میں — رقص کرتے ہوئے پیمانے ٹھہر جاتے ہیں

محفلِ شعر و سخن سے نہیں نفرت اے امینؔ
ہاں بُلاتے ہیں محبت سے اگر، جاتے ہیں

باسمہٖ تعالیٰ

۱۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء

یقیں سا پھول تو آثار کھل رہا ہے مگر —
خزاں کے عہد میں وہم و گماں کی زد میں ہے

انوار فیروز

انوار فیروز

راولپنڈی، پاکستان

کہا جاتا ہے کہ ادب انسان کے تدبر اور اس کے تفکر کا جوہر ہوتا ہے۔ ادب ہی کی روشنی میں انسان اس کائنات سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے اور اپنے لئے راہِ عمل متعین کرتا ہے۔ ادب انسان کے ظاہر و باطن کا آئینہ ہے، اس کا اظہار بھی ہے اور اس کی طمانیت کا باعث بھی۔

اصنافِ ادب میں شاعری وہ ذریعۂ اظہار ہے کہ طبیعت موزوں ہو تو غزل کے ایک شعر میں اور نظم کے چند مصرعوں میں دعوتِ فکر مل سکتی ہے۔ بات چاہے فردِ واحد کی ہو یا پورے معاشرے کی، ایک شعر ہی ساری واردات کا آئینہ بن جاتا ہے۔ انوار فیروز کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

برسات پتھروں کی تھمے گی تو دیکھنا — ہم آئینۂ حیات کو رنگین کر گئے
ہر پھول کی جبیں پہ ہے کندہ ہمارا نام — تصویرِ کائنات میں یوں رنگ بھر گئے

انوار فیروز کو مختصر نظم کہنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ ان کی ایک نظم ہے ''شہر جنگل''۔

ہر طرف اندھیرے ہیں / ہر طرف درندے ہیں
شہر ہو گئے جنگل / لوگ اب کہاں جائیں

پروین شاکر کی یاد میں انہوں نے ایک مختصر ترین نظم کہی۔

جسم فانی تھا
مٹ گیا لیکن
اس کی خوشبو
نگر نگر باقی

انوار احمد خان عرف انوار فیروز ۵/ جون ۱۹۳۸ء کو حصار، مشرقی پنجاب (اب ہریانہ، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شہر فیروز پور (پنجاب، ہندوستان) میں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد کیمبل پور (اب اٹک شہر کہلاتا ہے) آگئے۔ ان کے والد صاحب نے نہ دکان حاصل کی نہ زمین۔ اس لئے ان لوگوں نے بڑا مشکل وقت دیکھا۔ بہر حال ۱۹۵۹ء میں بی اے (B A) کر کے محکمہ ولیج ایڈ (Village Aid) ہری پور، ہزارہ میں افسر تعلقاتِ عامہ ہو گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو اٹک شہر واپس آئے اور پھر ۱۹۶۲ء میں روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی میں چیف رپورٹر (chief reporter) مقرر ہوئے۔ بعد میں گارڈن کالج، راولپنڈی میں ایم اے اردو (M A Urdu) میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۶ء میں امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۹۷۵ء کے آخر میں روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی میں سینئر رپورٹر (senior reporter) مقرر ہوئے۔ اسی وقت سے اس اخبار کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ چودہ پندرہ سال تک رپورٹنگ (reporting) کے ساتھ ''نوائے وقت'' کے ادبی ایڈیشن کے انچارج بھی رہے۔

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ایران، ۱۹۷۳ء میں سنگاپور، ۱۹۷۴ء میں برطانیہ، جرمنی اور پورا یورپ بذریعہ ریل دیکھا۔ ۱۹۷۸ء میں صدر ضیاالحق کے ہمراہ ترکی اور سعودی عرب کا دورہ کیا۔ اسی دوران عمرہ بھی کیا۔ روضۂ رسولؐ کے اندر جانے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۹۸۹ء میں اپنی بچی کو لے کر امریکہ گئے۔ مگر صرف کیلی فورنیا ہی جا سکے۔ سان فرانسسکو، لاس اینجلس، ہالی وڈ اور ڈیزنی لینڈ دیکھا۔ ان دنوں ان کی صاحب زادی وہاں ہیوسٹن میں ہیں۔ اسی دورے میں دو ہفتے ان کا برطانیہ میں بھی قیام رہا۔

انوار فیروز نے بتایا کہ انہیں شاعری کے علاوہ سفرنامے اور افسانوی ادب سے دلچسپی ہے۔ کہنے لگے... ''دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ میری شاعری کسی مکتبۂ فکر سے نہیں، حالات سے متاثر ہے اور میں معاشرے کی ناہمواری کے خلاف بھرپور آواز بلند کرتا ہوں۔ میرا کلام پاکستان اور بھارت کے معیاری ادبی پرچوں میں شائع ہوتا ہے۔ جن میں فنون، اوراق، عوامی منشور، صریر، رابطہ، ابلاغ، تخلیق، تجدید نو، شاعر ممبئی، کہسار جرنل بھاگل پور اور دوسرے پرچے شامل ہیں۔ اخبار کی ملازمت نے کتابیں شائع کرانے کی فرصت یا مہلت ہی نہیں دی۔ تاہم ایک شعری مجموعہ 'سمندر مضطرب ہے' اور سفرنامہ 'نیا کولمبس' زیرِ اشاعت ہیں''۔

انہوں نے بتایا...'' میں شاعری، افسانوں کی کتابیں اور سفرنامے دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔

میری زندگی محنت اور کام سے عبارت ہے۔ اہم اور دلچسپ واقعات کیا لکھوں"۔

اگلے سوال کے جواب میں فرمایا..."اس میں شک نہیں کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اس کی دھوم سارے جہاں میں ہے۔ اس کے مخالف بھی بہت ہیں۔ خود پاکستان میں بھی اس کے مخالفین موجود ہیں۔ لیکن یہ دوسرے ملکوں میں بھی رابطے کی زبان ہے۔ اور مختلف غیر ملکوں میں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا مستقبل تابناک ہے"۔

انوار فیروز زیادہ تر غزلیں لکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے نظمیں، ہائیکو، ماہیئے اور قطعات بھی کہے ہیں۔ بہر حال زیادہ میدان ان کا غزل کا ہے۔ کہتے ہیں..."نثری نظم اور نثری غزل کا میں قائل نہیں۔ نظم نظم ہے اور نثر نثر۔ درمیان کی شے کوئی نہیں۔ الکٹرانک میڈیا نے اثر ڈالا ہے لیکن اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ ٹی وی یا ریڈیو پر مشاعرہ سُنا اور ختم جب کہ کتابیں مستقل اثر رکھتی ہیں۔ تاہم ہمارے ہاں افسوسناک بات یہ ہے کہ کتابیں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں، ساڑھے تیرہ کروڑ کی آبادی میں اشاعتِ کتاب ایک ہزار۔ ورنہ پانچ سو۔ یہی حال جرائد کا ہے۔ لوگوں کو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے مزید یہ کہ وہ کتابیں خرید کر پڑھیں مانگے تانگے کی نہیں"۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا..."ادب کی ترقی کے لئے تنقید کی بہت ضرورت ہے۔ اس کے فروغ کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ تنقید کا ترجمہ بھی ہو۔ اصل میں ہمارے ہاں محنت کا عنصر کم ہوگیا ہے۔ یہ افسوسناک بات ہے"۔

انوار فیروز صاحب اردو کے رسم الخط کو بدلنے لے حق میں نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ رسم الخط زبان کی شناخت ہے اور زبان قوم کی شناخت۔ اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے رسم الخط بدلنے کے بجائے اردو کی ترویج پر توجہ دینا زیادہ ضروری ہے۔

Mr. Anwar Feeroz,
D/538 Satellite Town, Rawalpindi, Pakistan 4630

انتخابِ کلام

عجیب دور ہے وہ لوگ معتبر ٹھہرے
ہزار قتل کے الزام جن کے سر ٹھہرے

بجا کہ ہم سے خطائیں بھی لازمی ہوں گی
کہ ہم فرشتے نہیں آخرش بشر ٹھہرے

❖

جو کشتیوں میں نہیں تھے وہ ساحلوں پر ہیں
یہ کیا کہ اپنے مقدر میں ہی بھنور ٹھہرے

❖

وہ پیڑ جس پہ کسی اژدھے کا ڈیرا ہو
مجھے بتاؤ کہ اس پر کہاں ثمر ٹھہرے

❖

زمیں نے شعلے اُگائے ہیں فصل کی صورت
اب ایسی آگ میں کیا سایۂ شجر ٹھہرے

❖

جنہوں نے ظلم کی تلوار توڑ دی بڑھ کر
سناں کی نوک پہ آخر ان ہی کے سر ٹھہرے

❖

وہیں سے منزلِ مقصود کا نشان ملا
تھکن سے چُور جہاں میرے ہمسفر ٹھہرے

❖

یہ میرا دل تو اُسی کا ہے غیریت کیسی
اُسے یہ چاہئے انوؔر اپنے گھر ٹھہرے

❖

در قفس پھر آ گئے زندوں میں اب تو بلبل لگے
بعد اسیر دامِ جاناں بھی ہمیں بے کل لگے
۲۰۰۲ (۱۸ فروری)
آدم چغتائی

آدم چغتائی

برمنگھم، برطانیہ

اب وہ زمانہ تو نہیں رہا کہ شاعری میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ الفاظ و تراکیب لائی جائیں کہ جو لفظ جہاں استعمال کریں وہ نگینے کی طرح جڑ جائے۔ وہ دور تو اساتذہ کے ساتھ گیا۔ اب میر تقی میر، ذوق، سودا، انشا، غالب، نظیر، میر انیس اور جوش کا زمانہ بھی نہیں کہ کلام سے اپنے زمانے کی تہذیب کے ساتھ ساتھ رسم و رواج، روایات اور قدروں کی بھی عکاسی ہو جائے۔ مغرب کے باسیوں کی شاعری اور افسانہ نگاری میں بے شک یہاں کی تہذیب کی عکاسی ہو جاتی ہے مگر آج کے شعرا اور شاعرات اپنے مصروف لمحوں میں سے اتنا وقت کہاں نکال پاتے ہیں کہ الفاظ کے پارکھ بنیں جیسا کہ خواجہ حیدر علی آتش کہہ گئے ہیں۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں ۔۔۔ شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مگر اب بھی کچھ اہلِ فن ہیں جو "مرصع سازی" کا جوکھم پالتے ہیں۔ انہیں میں ایک نام آدم چغتائی کا ہے جو برمنگھم، برطانیہ میں آباد ہیں۔ ان کی غزل سے مطلع ملاحظہ ہو۔ سہلِ ممتنع میں کیا خوب کہا ہے۔

دن کو کہہ دیں رات، ہم سمجھے نہیں ۔۔۔ یہ انوکھی بات ہم سمجھے نہیں

ان کا ایک اور شعر ہے۔

یوں تو اس فانی دنیا کی ہر شے آنی جانی ہے ۔۔۔ موت نیا اک موڑ ہے یارو زیست کا یہ انجام نہیں

آدم چغتائی کا نام عبدالواسع ہے اور آبائی شہر لاہور، پاکستان میں یکم نومبر ۱۹۳۵ء کے دن پیدا ہوئے۔ شہر لاہور سے ان کے بزرگوں کا تعلق تین سوا تین سو برسوں کا ہے۔ اور اس خاندان یعنی میاں فیملی کا ذکر "روسائے پنجاب" میں بھی ملتا ہے۔ اس خاندان کے کارناموں اور بزرگوں کی مرصع تصاویر (پینٹنگز paintings) آج بھی لاہور کے علاوہ بڑے بڑے شہروں کے عجائب گھروں میں نمائش کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے دادا ماجد حضرت میاں چراغ دین رئیس اعظم لاہور کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے والد حضرت حکیم محمد حسین المعروف ابراہیم عیسیٰ ایک نامور طبیب حاذق، حکیم اور مفکر تھے۔ عربی، فارسی اور خصوصاً علم القرآن پاک سے مالا مال تھے۔

آدم چغتائی نے بتایا... "مجھے بچپن ہی سے موسیقی اور شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ جب میں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک ایسے خاندان میں پایا جو فنونِ لطیفہ میں شہرت یافتہ تھا۔ ایک طرف چغتائی آرٹ کا شہرہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا تو دوسری طرف علم و حکمت کے نایاب نسخے تیار ہو رہے تھے۔ مشہور طبی جریدے "آفتابِ حکمت" اور "حکیم حاذق" چھپ کر منظرِ عام پر آ رہے تھے۔ خوش الحانی سے پڑھنے والے ہمارے بھائی محمد ادریس چغتائی مرحوم کے کلام اور آواز کا جادو میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ شعر و ادب کی معروف ہستیاں ہمارے ہاں جمع ہوا کرتی تھیں۔ ملکی حالات پر تبصرے، دینی اور علمی امور پر سیر حاصل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ میرا بچپن علم دوست ہستیوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھا اور ایامِ طفلی ہی سے علمی اور مذہبی مشاغل سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس پر اللہ کا یہ فضل کہ اُس نے اس خاکسار کے گلے میں غیر معمولی ترنم اور سوز عطا فرما دیا، جس کے باعث طالب علمی کے زمانے میں اساتذہ مجھ سے دعائیں پڑھواتے اور بعض شعرائے کرام بھی مجھ سے اپنا کلام ترنم سے پڑھنے کی فرمائش کرتے۔ شہر کے بڑے بڑے جلسوں میں بھی خاکسار کو نعتیہ کلام، نظمیں اور کلامِ اقبال پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ خوش گلوئی جو ورثہ میں ملی ہے لاہور کے اسکولوں، کالجوں، ادبی انجمنوں اور ریڈیو پاکستان، لاہور میں بھی نام کو بڑھاتا رہا۔ کالج کے زمانے میں سید عابد علی عابد اور بعد ازاں پرنسپل غلام عباس خان کی عظیم شخصیات نے دیال سنگھ کالج، لاہور کے اسٹیج کو بہت فن آفریں بنا رکھا تھا۔ وہاں مجھے بھی شعر و شاعری، نغمہ سرائی اور مختلف ڈراموں میں حصہ ملتا رہا۔ چند شخصیات نے رہنمائی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی کی۔ لہٰذا ۱۹۵۸ء میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے اس عاجز کو ایران جانے کا موقع ملا جہاں بین الاقوامی شخصیات کی موجودگی میں ایک ثقافتی پروگرام بمقام منظریہ تہران میں پیش کرنے کا موقع نصیب ہوا جس میں شاہ ایران بھی موجود تھے۔ جب پاکستان سے ۱۹۶۱ء میں انگلستان آیا تو ذوقِ سخن کی آبیاری کے لئے اپنے حقیقی بھائی محمد ادریس چغتائی اور دیگر رفقاً کے تعاون سے برمنگھم میں رائٹرس گلڈ (Writers Guild) کی بنیاد رکھی جہاں بعض معروف شعرائے کرام، جن میں حضرت عنایت حسین شاداں، جناب یوسف قمر، حکیم منیر احمد قریشی، جناب عطا جالندھری، ڈاکٹر صفی حسن اور ملک فضل حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وطن سے دور جب کبھی قومی اور دینی تہواروں

کا انعقاد ہوتا تو قومی ترانے، نعتیں، نظمیں پیش کرنے کے علاوہ اپنا کلام بھی سنانے کا موقع نصیب ہوتا۔ اہل شہر اور برطانیہ کے لوگوں نے پزیرائی کی اور ۱۹۹۱ء میں شاعر برمنگھم و شاعر ترنم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لہٰذا اسی شوقِ وارفتگی میں دیوانہ وار شعر کہنے پر مائل ہوتا چلا گیا۔ شعری ریاضت موسیقی کی دھنوں پر ترقی پاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اشعار اردو کی مروجہ بحروں کی نسبت سے موسیقی کی دھنوں پر مبنی ہیں۔ میرے کلام میں تخلیقی تجربے کچھ ادھورے کچھ مکمل در آئے ہیں۔ میری داخلی اور خارجی کیفیات کہاں تک میرے جذبوں کی ترجمانی کرتی ہیں اس کی منصفی آپ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ۔۔۔"

فن بہر حال صداقت کا ہنر ہی مانگے   بے ہنر زیست میں رسوائی ہی رسوائی ہے

آدم چغتائی کہہ رہے تھے۔۔۔ "میری ادبی زندگی کا آغاز گو ۱۹۵۱ء میں ہوا لیکن شاعری کی ابتدا آمد سحر سے ہوئی۔ میرے اندر کا شاعر ایامِ طفلی سے ہی مجھے لبھاتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے مصرعے ذہن میں آتے جاتے رہتے تھے لیکن پہلا شعر یوں ہوا۔

وہ میرے شیشۂ دل میں، بہت نزدیک ہیں آدم   مگر وہ سامنے ہو کر بھی اکثر دور ہوتے ہیں

میرا پہلا شعری مجموعہ "نوائے آدم" ۲۰۰۱ء میں لاہور میں شائع ہوا اور اس کا دوسرا ایڈیشن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پروفیسر مرزا سعید الظفر چغتائی صاحب نے دہلی سے شائع کروا کے ہندوستان کے مختلف کالجوں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تقسیم کیا"۔

چغتائی کی رائے میں موسیقی اور ترنم کا ہر دل عزیز کلام غزل ہی ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے غزل کے علاوہ نظم میں نعت، حمد، مراثی اور سہرے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

ان کا کہنا ہے۔۔۔ "اگر اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید نہ ہوتا تو اپنی زندگی کے چالیس (۴۰) سال اردو شعر و ادب کی خدمت میں کبھی صرف نہ کرتا۔ اردو کا رسم الخط بھی اپنی تاریخی حیثیت سے ہرگز ہرگز تبدیل نہیں ہونا چاہیئے۔ اور میں اردو زبان اپنا کر قطعی خسارے میں نہیں رہا۔ بلکہ میری رائے میں اردو کو اپنا کر ہم آئندہ نسلوں پر احسان کر رہے ہیں تا کہ وہ اپنی قومیت، اپنی زبان اور اخلاق سے واقف رہیں"۔

ان کے پسندیدہ چند شعرا میں علامہ اقبالؔ، اسداللہ خان غالبؔ، آتشؔ، ظفرؔ، میر تقی میرؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، فیض احمد فیضؔ، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، احسان دانشؔ، ناصرؔ کاظمی سرِفہرست ہیں۔

اپنی زندگی کے یادگار ایام میں انہوں نے یہ تین دن گنوائے۔۔۔ پہلا ۱۹۵۵ء میں شاہ ایران سے ملاقات اور تہران میں ان کے روبرو ثقافتی پروگرام کو پیش کرنا؛ دوسرا گورنر ہاؤس، لاہور میں گورنر پنجاب عبدالرب نشتر کے روبرو ملی ترانہ پڑھنا اور تیسرا این ای سی میں پاکستان کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے روبرو کلام اقبال، قومی اور ملی ترانے سنائے۔

Mr Adam Chughtai,
10 Mossfield Road, King's Heath, Birmingham, B14 7JB, UK

انتخابِ کلام

آشیاں پر برق گرنے کا نشاں ملتا رہا
آگ میں جھلسا ہوا ہر سائباں ملتا رہا

ان حریصوں کے لئے کافی نہ تھی خُلدِ بریں
کس کے صدقے پھر انہیں سارا جہاں ملتا رہا

کون جانے کون سی منزل پہ ہے آبِ حیات
زندگی کے ہر افق کو آسماں ملتا رہا

اک نہ اک دن منزلِ مقصود پالیں گے سبھی
آندھیوں سے گر غُبارِ کارواں ملتا رہا

ہر کرن کے حُسن میں مستور ہے تیری ضیأ
ہر کرن سے حُسن کا ہم کو نشاں ملتا رہا

اور کیا حیراں کرے گا حشر کو اپنا حساب
ہر کسی کو زیست میں سود و زیاں ملتا رہا

چن کے لایا ہے یہ کس گلشن سے آدم ایسے پھول
خوش بوؤں کا ہم کو جن سے کارواں ملتا رہا

باسم رئی

[illegible]

نیازمند
جگن ناتھ آزاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

جموں تاوی، جموں و کشمیر، ہندوستان

میں محترم جگن ناتھ آزاد (۱) کا تعارف لکھنے سے پہلے ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین اور ان کے کلام کا مطالعہ کر رہی تھی۔ مطالعے کے دوران جناب عارف عظیم آبادی (۲) کا مضمون بھی نظر سے گزرا۔ فاضل مضمون نگار نے مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں برسوں علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور شاعری سے تعصب برتا جاتا رہا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کا مرکز اسلام اور مسلمانوں کو بنایا حالانکہ ہندوستان میں ٹالسٹائی، گورکی، لینن، ملٹن، شیکسپیئر، مارکس، اینجلز اور نہ جانے کن کن شعرا اور ادبا کو نوازا گیا۔ ایسے نامواقف حالات میں ”تلاشِ اقبال“ کا مقدس اور اہم فریضہ پروفیسر

۱۔ محترم جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج ہی نہیں۔ ان کے فن و شخصیت پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ سخنور پنجم میں ان کے تعارف شامل کرنے کی میرے نزدیک ایک وجہ یہ ہی رہی ہے کہ قاری کو اگر ان کے بارے میں کئی کتابیں پڑھنے کا موقع میسر نہ ہو تو یہ تعارف چند ضروری معلومات فراہم کر دے گا۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ پروفیسر آزاد کی ذات سے وابستہ کوئی اہم معلومات تعارف میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے۔ سلطانہ مہر

۲۔ مطبوعہ ہفتہ وار ”پندار، پٹنہ“، ۱۴/ اکتوبر ۱۹۷۸ء؛ منقول ”جگن ناتھ آزاد ... حیات و ادبی خدمات“ صفحہ ۱۸۰۔۱۸۱، (طباعت بار دوم، ۱۹۹۸ء)، مرتب خلیق انجم؛ پبلشر محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی۔

جگن ناتھ آزاد نے انجام دیا۔ چنانچہ یہ توقع بے جا اور بے محل نہیں کہ اقبال سے متعلق تمام معقول اور اہم سرگرمیوں میں پروفیسر آزاد لازمی طور پر شریک ہوں یا شریک کیئے جائیں۔ لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق جموں وکشمیر یونیورسٹی میں قائم ہونے والے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بالکل الگ رکھا گیا۔ حد یہ کہ اس سلسلے میں جو سیمینار منعقد ہوا جس میں وزیر اعلیٰ شیخ عبد اللہ نے متذکرہ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے متعلق ریاستی حکومت کے فیصلے کا اعلان کیا اس میں بھی پروفیسر آزاد کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی جب کہ اخبار میں شائع شدہ خبر کے مطابق سیمینار میں غیر معروف لوگ بھی شریک تھے۔ سیمینار میں ان کی شرکت پروفیسر آزاد کے لئے باعث فخر نہ ہوتی بلکہ محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شرکت سیمینار کے منتظمین کے لئے باعث افتخار ہوتی۔

یقیناً یہ حرکت ان ہی لوگوں سے سرزد ہوئی ہوگی جو بزعم خود عالم ودانشور بنے بیٹھے ہیں۔ مضمون کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے مجھے جولائی ۲۰۰۳ء کے دن برمنگھم میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی شائع شدہ مختصر روداد یاد آگئی جس میں لکھا تھا کہ مذکورہ مشاعرے میں اس بزم کی جانب سے ان ہی شعرا کو موقع دیا گیا جو خداداد قابلیت کے مالک ہیں اور خود شعر کہتے ہیں، کسی دوسرے کا کلام چوری نہیں کرتے۔ اس قسم کی تحریریں لکھنے والے کی کم علمی اور بے بضاعتی کا مظہر ہوتی ہیں کیوں کہ کسی بھی مشاعرے میں نہ تو تمام شعرا مدعو کیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی سارے مدعوین شعرا شرکت کرتے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی ذات میں آپ ایک انجمن اردو ادب، ایک مکمل ادارہ، ایک مکمل روشن مینار ہیں لیکن یہاں وہاں آج بھی ایسے لوگ ہیں جو خود تو چاہے ایک سطر یا ایک جملہ اردو کا سیدھا نہ لکھ سکتے ہوں لیکن اپنی تکڑم بازی کے صدقے خود کو مشاعروں، کانفرنسوں کے صدر اور کنوینر بن جاتے ہیں اور ان حرکتوں کے آئینے میں لامحالہ بونے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک شعر سنیئے۔

سارے شاعر جیب میں میری میں مکھیا بن جاؤں   بس میں اگر ہو صدر بنوں اور ناظم بھی کہلاؤں

۵/ دسمبر ۱۹۱۸ء کو عیسیٰ خیل (اب پاکستان میں ہے) میں پیدا ہونے والے جگن ناتھ آزاد پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کی گنتی ان مضامین اور کتب سے زیادہ ہے جو انہوں نے خود لکھے ہیں۔ اس سال یعنی ۵/ دسمبر ۲۰۰۳ء کو وہ پچاسی (۸۵) برس کے ہوجائیں گے مگر اب بھی چاق وچوبند ہیں۔ سال رواں یعنی ۲۰۰۳ میں انہوں نے برطانیہ کا دورہ کیا۔ اس موقعہ پر برمنگھم میں ان سے انٹرویو کیا گیا۔ دوران گفتگو ان کی زندگی کے اہم واقعہ کے متعلق پوچھا گیا۔ کہنے لگے... "میری زندگی کا سب سے بڑا واقعہ تقسیم ہند کا ہے جس کی وجہ سے مجھے اپنا شہر عیسیٰ خیل چھوڑنا پڑا۔ ابتدائی تعلیم میں نے عیسیٰ خیل اور کلور کوٹ کے اسکولوں میں حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں میانوالی سے میٹرک رام موہن رائے ہائی اسکول سے پاس کیا۔ ۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج، راولپنڈی سے بی اے اور فارسی میں ایم اے ۱۹۴۴ء میں کیا اور ۱۹۴۵ء میں ایم او ایل کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے لی۔ ۱۹۴۶ء میں مشہور ادبی ماہنامہ "ادبی دنیا" کا چھ ماہ تک قائم مقام ایڈیٹر رہا۔ اس کے بعد اسی سال لاہور کے روزنامہ "جے ہند" کا ایڈیٹر رہا۔ قیام پاکستان

تک چند ماہ لاہور کے ڈی اے وی کالج میں اردو کا استاد بھی رہا۔ پھر جب ہندوستان گیا تو وہاں روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی کا اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا۔ ۱۹۴۸ کے اواخر میں ہندوستان کے محکمۂ اطلاعات ونشریات میں افسر مقرر ہوا۔ ۱۹۷۷ء تک مختلف شہروں میں اس محکمے کے کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۳ء تک جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی دوران اسی یونیورسٹی میں فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ کی ذمہ داریاں مجھے سونپی گئیں۔ ۱۹۸۳ء میں ہیڈ شپ اور ڈین شپ سے سبکدوش ہونے پر پانچ برس کے لئے مجھے پروفیسر ایمیریٹس (تاحیات) کا اعزاز دیا گیا۔ لاہور سے چونکہ میں دہلی آیا تھا لہٰذا ریاست جموں وکشمیر کے آئین کے مطابق میں جموں وکشمیر کا شہری نہیں بن سکا۔ میں اب دہلی میں بھی ہوتا ہوں اور کشمیر میں بھی"۔

"پھر کبھی میانوالی گئے"؟ میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا... "مئی ۱۹۸۰ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کی دعوت پر پاکستان گیا تھا تو عیسیٰ خیل اور میانوالی بھی گیا۔ مجھے جنم دینے والی مٹی کو میں نے چوما، آنکھوں سے لگایا۔ گو میرا دورہ مختصر تھا مگر میرے سارے وجود میں ایک سنسنی سی تھی۔ میں نے عیسیٰ خیل اور میانوالی سے واپسی پر جو کہا اس کے چند اشعار یہ ہیں اور میرا سرمایہ حیات ہیں۔

یہ چبھن بھی جاوداں ہوگی یہ اندازہ نہ تھا
پھر یہ کیا تھا تجھ سے ملنے کا جو خمیازہ نہ تھا

عمرِ رفتہ یوں اچانک لوٹ کر آجائے گی
اس سفر کا مجھ کو یہ پہلے سے اندازہ نہ تھا

میں وہاں قصرِ محبت میں مقید تھا جہاں
صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

وہ خلوصِ دل تھا جو احباب کے چہروں پہ تھا
وہ تکلف سے بھری تہذیب کا غازہ نہ تھا

اور

اس مسافر کا نصیبا تو بھی دیکھ آزاد جو
شام غربت سے چلا صبح وطن تک آگیا

جو کبھی گم ہوگیا تھا اپنی دنیا چھوڑ کر
پھر وہ آہوئے ختن دشتِ ختن تک آگیا

کل چمن سے جانبِ صحرا ہوا تھا جو رواں
آج انہی قدموں وہ پھر اپنے چمن تک آگیا

ایک مدت محفلیں غیروں کی گرمانے کے بعد
وہ شہیدِ نغمہ اپنی انجمن تک آگیا

جب میں میانوالی سے عیسیٰ خیل جارہا تھا تب کہا۔

مقدر کی سرفرازی پہ اب تک ناز کرتا ہوں
کہ دیکھا میں نے آج اپنے چمن کے نونہالوں کو

وطن کی خاک کے ذروں نے اے آزاد اٹھ اٹھ کر
دیئے بوسے میری آنکھوں کو، چوما میرے بالوں کو

اور

جیسے آہن سوئے مقناطیس، سوئے برق کاہ
میں میانوالی کو اے آزاد اسی صورت گیا

جگن ناتھ آزاد کی اپنی مٹی سے محبت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے فرنگیوں کے ہاتھوں سے اپنی مادر وطن کو آزادی ملنے کی خوشی میں پہلا "ترانہ پاکستان" لکھا جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا[1]۔ اس کا ذکر ایک

ا۔ کتابت پوری ہونے کے بعد پورا ترانہ موصول ہوا جس کو اس کتاب کے آخر میں ہم نے شامل کیا ہے۔ سلطانہ مہر

معتبر ادیب خواجہ احمد عباس مرحوم نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے۔۔" آزاد کا ارادہ پاکستان میں رہنے کا تھا مگر سرحد پار کے مخدوش حالات نے انہیں سمجھایا کہ وہ بالجبر ہی سہی اس سرزمین سے رخصت ہو لیں۔ لہٰذا آزاد اور رفیو۔جی کیمپ سے ایک لاری میں سوار ہو کر امرتسر اور پھر دہلی چلے گئے"۔

جب انہوں نے شعر و ادب کے دروازے پر دستک دی اور جس نے دروازہ کھولا وہ ان کے والد اور استاد پروفیسر تلوک چند محروم تھے۔ آزاد کی اوائل عمری میں یعنی جب یہ پانچ سال کے تھے ایک دن والد صاحب نے کہا بیٹا کتاب اُٹھاؤ۔ پھر انہوں نے ایک غزل پر انگلی رکھی۔۔۔ "یہ پڑھ کر سناؤ"۔ آزاد نے پڑھا۔

کوئی امید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

"بس بیٹا بس"! تلوک چند محروم بولے، "تمہاری ادائیگی خوب ہے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ میرا بیٹا چھا جائے گا"۔ یہ دوسرا جملہ انہوں نے خود اپنے آپ سے کہا۔ بہت بعد میں آزاد کو معلوم ہوا کہ وہ دیوان غالب تھا۔ پھر ایک دن جب آزاد اپنے والد کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے سے گزر رہے تھے، ان کے والد نے کہا۔۔۔ "آزاد دور تک دیکھو، کیا خوب صورت منظر ہے"۔ "پہاڑوں پر بنے ہیں مکان۔۔۔ بہت خوب" وہ یکا یک بولے۔ ان کے چہرے پر وہ روشنی پھیلی ہوئی تھی جب باپ اپنے بیٹے کو اپنے علم کا وجدان منتقل کرتا ہے اور اس کا چہرہ اعتماد اور فخر سے دمک جاتا ہے۔

"بیٹا! یہ تو مصرعہ ہو گیا۔ 'پہاڑوں کے اوپر بنے ہیں مکان'۔ بیٹے اس پر گرہ لگاؤ"۔ ہونہار بیٹے نے برجستہ کہا۔ 'عجب ان کی صورت، عجب ان کی شان'۔ تلوک چند محروم بولے "صورت نہیں، شوکت کہو"۔ آزاد نے پورا شعر پڑھا۔

پہاڑوں کے اوپر بنے ہیں مکان　　　عجب ان کی شوکت، عجب ان کی شان

"شوکت" سے "شان" کی نسبت کا اندازہ بھی آزاد کو بہت بعد میں ہوا مگر طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل ہوئی اور ان کے مطالعے میں اساتذہ کا کلام آیا۔ پہلے پہل غالب کی طرف جھکاؤ تھا۔ لیکن قدرت ان سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتی تھی۔ میانوالی کی کھلی فضاؤں میں گھومنے والے نوجوان طالب علم نے والد کو گنگناتے ہوئے سنا۔ اڑائی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے۔ آزاد نے بھی یہ مصرعہ گنگنایا۔ اس کے صوتی اثرات دل پر عجب نقش بنا رہے تھے۔ یہاں سے آزاد کی اقبال شناسی کی ابتدا ہوئی جو ذہنی قربت میں بدلی۔ پھر اقبال کو پڑھتے ہوئے ان کے کلام کے معانی اور کئی اسرار و رموز ان پر کھلتے گئے۔ وہ کلام اقبال کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے لگے۔ مگر عجب بات یہ ہے علامہؒ کے اس پرستار نے کبھی ان سے ملنے کی جرأت نہ کی۔ حالاں کہ وہ بار ہا لاہور میں علامہؒ کے گھر کے قریب سے گزرے لیکن اسی سوچ نے قدم روک لیے کہ ابھی ان میں وہ گن نہیں کہ اقبالؒ سے ملنے کا حوصلہ ہو۔ یہ ان کا خود اختیار کیا گیا جبر تھا جس نے آزاد کو وہ ہنر عطا کیا جو اقبالؒ کے حوالے سے ان کی پہچان بن گیا۔

آزاد کے ان اساتذہ میں جن سے انہوں نے فیض حاصل کیا، ان کے والد کے علاوہ شمس العلماء

مولانا تاجور نجیب آبادی، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر علیم الدین سالک اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور کئی دیگر شخصیات بھی تھیں۔ آزاد طالب علمی کے زمانے سے ہی حافظ اقبال مشہور ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس زمانے میں اقبالؒ کے لئے کام کیا جب برصغیر ہند کی تقسیم کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا میں اقبال کا نام لینا ممنوع تھا۔ انہوں نے اقبال پر ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دیئے۔ ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۳ء کے دن اقبال کے موضوع پر ایک نمائش کا سری نگر میں اہتمام کیا جو ۳/نومبر ۱۹۷۳ء تک جاری رہی۔ یہ ہفتہ اقبال صدی کے حوالے سے منایا جا رہا تھا۔ حالانکہ نمائش سے ربع صدی قبل جگن ناتھ آزاد اقبالؒ پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک پاکستان میں منائے جانے والے یوم اقبال میں متعدد بار شرکت کی۔ مگر ہندوستان میں اقبالؒ پر جتنا کام آزاد نے کیا اتنا اب تک کسی نے نہیں کیا۔ اب وہ اقبالؒ کے حوالے سے ایک چلتے پھرتے علم کے قاموس ہیں۔

انہوں نے جموں کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے قیام کے لئے بھی جدوجہد کی جو بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہوئی اور جس کے ڈائرکٹر پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ علامہ اقبالؒ کی سوانح حیات ''روداد اقبال'' کے علاوہ ''بچوں کا اقبال''، ''اقبال اور اس کا عہد'' اور انگریزی میں مضامین کا مجموعہ ''اقبال ... مائنڈ اینڈ آرٹ'' کے عنوان سے کتب لکھیں۔ اقبال کے فن پر امریکہ، کنیڈا، روس، اسپین، اسرائیل، برطانیہ، جرمنی کے علاوہ متعدد ممالک میں انہوں نے لکچر دیئے۔

جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کا فرانسیسی ترجمہ محترم ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے کیا جو خود اردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبان و ادب کے جید عالم تھے۔ یہ ترجمہ کتابی شکل میں ''ہومیج محومت (Hommage Mahomet)'' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ آزاد کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد ستر (۷۰) سے زیادہ ہے۔ خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور ان کے فن پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں انہیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا اور دیگر لاتعداد ایوارڈ بھی انہیں ملے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں انہیں ان کی شاعری پر غالب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

پروفیسر آزاد نے بتایا، انہوں نے مرثیہ، رباعی، غزل، نظم وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثری نظم کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا جو شعرا پابند شاعری نہیں کر سکتے وہ نثری نظم کا سہارا لیتے ہیں۔ میں اسے شاعری نہیں کہتا۔ نظم اور غزل میں مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کچھ شعرا نے نظم اور کچھ نے غزل میں اپنے احساسات کا بڑا بھرپور اظہار کیا ہے۔

اردو کے مستقبل اور اس کے رسم الخط کے سلسلے میں آزاد صاحب نے فرمایا... ''رسم الخط کی تبدیلی سے اردو اردو نہیں رہے گی۔ اب رہی اردو کے مستقبل کی بات تو اردو پھل پھول رہی ہے۔ اخبارات ورسائل کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ بیرون ہند و پاک مشاعرے اور سیمینار بھی خوب منعقد ہو رہے ہیں مگر نئی نسل تو اردو سے بیگانہ ہے۔ پھر اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا پوچھنا اور کیا کہنا۔ جس طرح ناروے میں مسعود منور بچوں کو اردو پڑھاتے تھے اسی طور اگر اردو پڑھائی جائے تو اردو باقی رہے گی ورنہ نہیں''۔

آزاد بتا رہے تھے کہ وہ بچپن میں حفیظ جالندھری سے متاثر تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی آواز اور ترنم کا اثر ہو۔ اس کے بعد غزل کے عصر حاضر کے عناصر اربعہ یعنی جگر، اصغر، فانی اور حسرت نے متاثر کیا۔ لیکن آج کی غزل کا محل ان چار ستونوں پر نہیں بلکہ چھ ستونوں پر قائم ہے۔ وہ دوسرے دو ستون یاس یگانہ چنگیزی اور مجاز ہیں۔ یاس کے ہاں ناموزوں مصرعوں کے باوجود درد و گداز کی جو کیفیت ہے اس کا جواب نہیں اور جگر بلاشبہ مشاعروں کے شاعر تھے۔

آزاد نے کہا انہوں نے علامہ اقبالؒ کے اشعار کی تضمین کی۔ عبدالقادر مرحوم نے ۱۹۴۶ء میں دیباچہ لکھا تھا لیکن وہ اور میرا بہت سارا دوسرا کلام ضائع ہوگیا۔ مجھے پتا تو چلا تھا کہ کتاب شائع ہوگئی ہے لیکن میری نظر سے نہیں گزری۔ ''بیکراں'' کے نام سے میرے کلام کا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا''۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کہہ رہے تھے کہ انہیں برطانیہ آکر اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ عاشور کاظمی کے گھر ڈاکٹر خلیق انجم کے ہمراہ مقیم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اگست ۱۹۹۱ء میں ''بریڈفورڈ لائبریریز''، ''انجمن فکر و فن، بریڈفورڈ''، ''بزم اردو، بریڈفورڈ'' اور ہفت روزہ ''راوی، بریڈفورڈ'' کے تعاون سے ہونے والی ''انٹرنیشنل کانفرنس... اردو بیرون برصغیر پاک و ہند'' میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ کانفرنس کے میزبان بریڈفورڈ لائبریریز سے ڈاکٹر صفات علوی، انجمن فکر و فن کی جانب سے ڈاکٹر مختار الدین احمد اور جاوید اقبال ستار، بزم اردو سے حضرت شاہ اور ہفت روزہ راوی سے مقصود الٰہی شیخ تھے۔ انہوں نے نوٹنگھم کے مشاعرے میں بھی شرکت کی تھی جس میں مسعود احمد، عاصی کاشمیری، افضال تبسم، سلطان محمد خان موج بھی تھے۔ میزبان مرزا یعقوب اور عاصی کاشمیری تھے۔ ۴/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو لندن میں منعقد ''جشن جوش'' کے موقع پر جوش اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں بھی انہوں نے شرکت کی تھی۔

میں نے کہا... ''آپ نے اس سیمینار کی صدارت کی تھی اور اس وقت آپ کے پڑھے ہوئے یہ اشعار ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اجازت ہو تو سناؤں''۔ انہوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ میں نے ان ہی اشعار میں اپنا خراج محبت و عقیدت ان کو پیش کیا۔ ملاحظہ ہو۔

اور ہوں گے جن کو ہوگا چاک دامانی پہ ناز	ہم جنوں میں چاک دامانی رفو کرتے رہے
اصل میں ہم تھے تمہارے ساتھ محو گفتگو	جب خود اپنے آپ سے ہم گفتگو کرتے رہے

اور دوسری غزل کا شعر۔

جس چمن کا تنکا تنکا تم اُڑا کر لے گئیں	اے ہواؤ اس چمن کا آخری تنکا ہوں میں

اردو زبان و ادب کے اس شیدائی کو میرا سلام کہ میری طرح ان کی بھی مادری زبان اردو نہیں اور وہ بھی میری طرح ''اہل زبان'' ہیں۔

Professor Jagan Nath Azad,
A-25, Government Quarters, Gandhi Nagar, Jammu Tawi, J&K, 18004, India

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

دنیا ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم — اک حسنِ بیاں حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم
ماحول کی ظلمات میں جس راہ سے گزرے — قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ گئے ہم

❖

اردو کو مٹاؤ گے تو مٹ جائے گی — خوش بو یہ فضا کو پھر نہ مہکائے گی
لیکن یہ بھی خبر ہے اے دیوانو — تہذیب میں کس قدر کمی آئے گی

❖

عزم کے ہاتھ میں شمشیرِ شجاعت دے کر — جہدِ ہستی میں اسے مائلِ پیکار کریں
روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدت سے — ذہنِ انساں کو اب اس دور میں بیدار کریں

❖

تمہارے واسطے اے دوستو! میں اور کیا لاتا — وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو — کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

❖

تجھ پہ اے دورِ سیاست! آفریں صد آفریں — اک مسافر آج اپنے گھر میں آ سکتا نہیں

❖

آغازِ بہاراں دیکھ لیا انجامِ بہاراں روشن ہے
تدبیرِ گلستاں کے صدقے تقدیرِ گلستاں روشن ہے
دیروز پہ جاں دینے والے افراد سے مایوس نہ ہو
کچھ ماضیِ انساں سے بڑھ کر مستقبلِ انساں روشن ہے
یہ ظلمتِ گلشن دیکھ کے کیوں آزاد ہو مایوس اتنا
کل جس کو نگاہیں دیکھیں گی وہ صبحِ بہاراں روشن ہے

❖

دھڑکن بن کر دل میں دھڑکے ہر دم تیرا نام
مٹ نہ سکے گا اپنے دل سے پیارے وطن کا نام

خواجہ محمد آصف
31.01.03

کوپن ہیگن، ڈنمارک

محمد آصف خواجہ

کوپن ہیگن، ڈنمارک

مجروح سلطان پوری کا یہ شعر محمد آصف خواجہ پر صادق آتا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر   لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

سیالکوٹ، پنجاب، پاکستان کی سرزمین پر جنم لینے والے آصف کو پاکستان سے جدا ہوئے پینتیس (۳۵) سال ہو گئے مگر پاکستان کی محبت آج بھی ان کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی ہے۔ پاکستان کی خوش بو اُن کے سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ شعر کہتے ہیں تو پاکستان کی یاد میں۔ ان کی نظم "پاکستان اور یادیں" کا یہ بند ملاحظہ ہو:

پاکستان میں رہنے کا
مل کر دکھ سہنے کا
اک اک پل یاد آتا ہے
دل کا کنول کھل جاتا ہے

انہیں اس کا بھی دکھ ہے کہ ہم پاکستانی ہونے کی شناخت قائم کرنے کے بجائے سندھی، پنجابی اور مہاجر کی حیثیت سے بٹ گئے ہیں۔ ان کی نظم "بچوں کا سوال" میں بچے ان سے پوچھتے ہیں:

جس مقصد کی خاطر اپنے لاکھوں سر کٹوائے
پاک وطن کی خاطر ہم نے بستے گھر لٹوائے
اس مقصد کو پا کر آپس میں دشمن بن جائیں
انکل جی آنٹی جی کیا ہے راز ہمیں بتلائیں
سندھی اور مہاجر کا فرق ہمیں سمجھائیں

خواجہ آصف بنیادی طور پر شاعر بھی ہیں، صحافی بھی اور استاد بھی۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ۲۳/ جولائی ۱۹۴۷ء ان کی پیدائش کا دن ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن (graduation) کیا۔ ڈنمارک آ کر ایجوکیشن کورس (A Course in Education) کرنے کے بعد معذور بچوں کو تعلیم دینے کے لئے اسپیشل کورس (Special Course) کیا۔ کوپن ہیگن کمیون کے اردو کمپیوٹر ایڈوائزر (Urdu Computor Advisor) ہیں۔ پچھلے سترہ (۱۷) برسوں سے تعلیم کے شعبے سے منسلک ہیں اور اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے میں کوشاں۔

میں نے پوچھا آپ نے ترکِ وطن کیوں کیا اور اس کے سلسلے میں آپ کے محسوسات اب کیا ہیں؟ ان کا جواب ہے... ''متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے ہجرت کا سبب اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ اور آج پینتیس (۳۵) سال دیارِ غیر میں گزارنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے خوابوں کی تعبیریں نوجوان اولادوں کی صورت میں اس معاشرے کی بنیادوں میں ضم ہو رہی ہیں۔ خوش حالی تو حاصل ہوگئی مگر بدحالی ہمارے ماتھے کا جھومر بن کر دوسروں کو درسِ عبرت دے رہی ہے، اگر کوئی سمجھے تو۔ ورنہ تاریخ کا چکر اسی طرح چلتا رہے گا۔ پاکستان میں رہنے والے باہر نکلنے کے لئے اور یہاں بسنے والے اپنے وطن کی مٹی کو چومنے کے لئے بے قرار و بے تاب ہیں۔ کون سچا اور صحیح ہے اس کا فیصلہ برسوں کی حاصلِ ضرب کے بعد نکلتا ہے۔ گھر سے پڑھنے پڑھانے کا شعور ورثے میں ملا۔ کالج کے زمانے میں کالج میگزین اور پھر سیالکوٹ سے نکلنے والے نیم ادبی جریدے 'فردوسِ ادب' کا مدیر معاون بن کر کام کرنے کا موقعہ ملا۔ 'فردوس' کے بانی اور مدیر مشہور شاعر جناب قیس شیروانی تھے، جن کا تعلق جموں و کشمیر سے تھا۔ اس طرح اس جریدے کو حکومت آزاد کشمیر سے کسی حد تک مالی معاونت مل جاتی تھی۔ ڈنمارک میں بسنے کے بعد ایک محبِ وطن ہونے کے ناتے ایک خیال دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا گیا کہ اس ملک میں ہماری آنے والی نسل کی بقا صرف اور صرف اسی صورت میں ہے کہ ان کا رابطہ اپنی زبان سے بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور زبان ہی کی بدولت ان کا تعلق اپنے دین، اپنے معاشرے اور اپنے لوگوں سے ہوگا۔ چنانچہ چند دوستوں کی مدد سے ایک فکری انجمن، جس کا نام 'بزمِ فکرِ نو' تھا، کا قیام ظہور پزیر ہوا اور ہم سب اپنے فارغ وقت میں اردو کی ترقی و ترویج میں کوشاں ہو گئے۔ اسی انجمن کی دعوت پر دنیا بھر سے شعرا اور دانشور ڈنمارک میں تشریف لاتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر ایک ماہنامہ بنام ''شاہین'' کا اجرا کیا۔ جس کے اخراجات کچھ تو مل کر اور کچھ اشتہارات کی مدد سے پورے کر کے لوگوں میں مفت تقسیم کیا جاتا۔ پانچ سال تک مقامی پرچے کی صورت میں اس نے کمیونٹی کی خدمات نمایاں طور پر ادا کیں۔ اس کے بعد چار رنگوں میں اس کو ''شاہین

انٹرنیشنل'' کا درجہ مل گیا، جس کی بدولت پورے یورپ کے لکھنے والے اور اہلِ دانش آپس میں مربوط ہوگئے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ اس پرچے کی مکمل کتابت، پروف ریڈنگ(proof reading)، کاپی پیسٹنگ(copy pasting)، پریس اور پھر اس کا ڈسٹری بیوشن(distribution) اس ناچیز کے ہی ذمے تھا، جب کہ جاب(job کام بسلسلۂ روزگار) کی ذمہ داریاں اس کے علاوہ۔ لیکن ایک خیال اور فرض کا احساس دل و دماغ کو احاطہ کیئے رکھتا کہ میں اپنے وطن کا مقروض ہوں۔ چنانچہ ''شاہین'' بھی قرض چکانے کی ایک صورت تھی''۔

آپ نے صحافت کے خارزار میں قدم رکھا تب آپ کے احساسات کیا تھے؟ آصف کہنے لگے...'' اس ضمن میں سب سے پہلے اس بات کی تعریف کرنی پڑے گی کہ صحافت ہے کیا؟ تو میری ناچیز رائے میں جستجو اور تحقیق کے بعد سچ اور حق کو انتہائی دیانت داری سے پیش کرنے کو صحافت کہا جاتا ہے۔ آج کل کی لفافہ صحافت کے لئے شاید لغت میں کوئی لفظ نہ ملے۔ اب جب میں اپنے پیش رو صحافیوں کی کاوشوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو میرے سامنے بڑے بڑے روشن مینار اپنی ضوفشانیوں کے ساتھ موجود ہیں، مولانا ظفر علی خان، شورش کاشمیری، حمید نظامی سے لے کر محمد صلاح الدین تک، کس کس کا ذکر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی میں ایک بات کی وضاحت بھی انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری صحافت کا تعلق ملک سے باہر کی صحافت سے ہے، یعنی دیارِ غیر میں مستقل رہتے ہوئے کام کرنا، جہاں اردو سے متعلق لکھائی سے لے کر چھپوائی تک سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے، یہاں محبت کرنے والے وہ قاری نہیں ہوتے جو انتہائی معقول آمدن کے باوجود کسی اخبار یا رسالے کو خرید کر پڑھیں، کیوں کہ میرے خیال کے مطابق برِ اعظموں میں پھیلے ہوئے نہ صرف وہ ادبا اور شعرا، جن کو آپ نے دن رات کی محنت سے 'گفتنی' اور 'سخنور' جیسی ضخیم کتابوں میں ایک مالا کی طرح پرو دیا ہے بلکہ ایک عام قاری اور لکھاری کی بھی یہ ہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی خدمت میں آپ یہ کتابیں مفت پیش کریں۔ بعینہٖ ایسا ہی سسٹم(system رویہ) یورپ اور امریکہ میں بسے ہوئے ہمارے اردو ادیبوں اور شاعروں میں رائج ہے۔ مفت ہو تو لے لیں گے اگر معمولی قیمت رکھ دی جائے تو مطالعہ کے لئے وقت نہیں ہونے کا بہانہ کریں گے۔ خیر یہ ہمارا قومی المیہ ہے، جہاں ہمیں پرنٹ میڈیا(print media) سے محبت کرنے کا درس دیا ہی نہیں گیا۔ میں نے چھ سال 'شاہین' کے لئے دن رات ایک کیئے ہیں اور مالی طور پر زیرِ بار ہوگیا اور آج اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ 'شاہین' کی پرواز کو جاری رکھ سکوں۔ اہم واقعہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر آپ دین اور حبِ وطن کو ایک طرف رکھ دیں تو کہیں نہ کہیں سے مدد کا ساماں آن موجود ہوتا ہے۔ لیکن اپنے وطن کو محبوب رکھنے والا، اس پر کہنے اور لکھنے والا ایسا کب کرتا ہے۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اردو جرائد اور کتابوں پر پیغمبری وقت آن پڑا ہے۔ انہوں نے کہا 'بزمِ فکرِ نو' کی دعوت پر ہر سال پاکستان سے شاعر ادیب اور دانشور تشریف لاتے رہے ہیں، ان میں عطا الحق قاسمی، شعیب بن عزیز، فیضان عارف، جمیل احسن اور حضرت ضمیر جعفری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

آصف بھی اردو کے مستقبل سے زیادہ پُر امید نہیں، اس کے باوجود کہ وہ کوپن ہیگن میں اردو زبان کی تدریسی شعبے سے وابستہ ہیں۔ ان کہنا ہے ...'' ہم میں سے بیشتر لوگ صبح اخبار تک نہیں پڑھتے، ٹی وی پر خبریں دیکھ کر کام چلا لیتے ہیں''۔

میں نے پوچھا کہ انگریزی اور اردو صحافت میں کیا فرق ہے؟ بہت سنجیدگی سے انہوں نے جواب دیا...'' انگریزی اور اردو زبان کی صحافت میں واقعی ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پہلی جو بات وہ ترتیب کی ہے جسے آپ پروفیشنزم (professionalism پیشہ ورانہ ڈھنگ) بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی کی بدولت انگریزی صحافت میں صحافی جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ سکتا ہے، جب کہ اردو زبان کے صحافی کو اپنی گردن بچا کر لکھنا ہوتا ہے، کیوں کہ شام کے بعد اسے گھر بھی جانا ہوتا ہے۔ ہماری اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ حق اور سچ لکھنے اور کہنے کی وجہ سے 'تکبیر' کے محمد صلاح الدین کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا۔ فرق جو ہے اس کو تو میں نے واضح کر دیا، رہا سوال کیوں کا؟ یہ کیوں ہم سب کو دعوتِ فکر بھی دے رہا ہے۔ ہم میں سچ بولنے (اور سننے) کی جب جرأت پیدا ہوگی تو اس 'کیوں' کا جواب بھی مل جائے گا''۔

کوپن ہیگن میں اردو کی تدریس کے متعلق جواب دیتے ہوئے آصف نے بتایا...'' میں یہاں اسکول میں اردو اور ڈینش (Danish) زبان کا استاد ہوں۔ میرا بنیادی کام ان بچوں کی رہنمائی کرنا ہے جو ڈینش زبان سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ہر اُس اسکول میں اردو پڑھائی جاتی ہے جہاں پاکستانی بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جس اسکول میں بھی بارہ (۱۲) پاکستانی بچے ہوں وہاں اردو کلاس کا اجرا ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں مختلف عمر کے بچے ہوں تو مختلف مدارج کی کلاسیں شروع ہو سکتی ہیں''۔

آپ ڈنمارک اور پاکستان کے نظامِ تعلیم میں کیا فرق پاتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا...'' سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ پاکستان میں صرف تعلیم دینے پر زور دیا جاتا ہے اور لارڈ میکالے کے کلیئے کی پیروی کی جاتی ہے جب کہ ڈنمارک میں تربیت پر بھی پوری توجہ دی جاتی ہے۔ کیوں کہ بچوں کے لیے سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کی سب سے بہتر یہی عمر ہوتی ہے۔ ڈنمارک میں نرسری اساتذہ کی تنخواہیں اتنی زیادہ ہیں کہ پاکستان یا کسی ترقی پذیر ملک میں اتنی تنخواہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نرسری کلاس میں تین استاد پڑھاتے ہیں ایک استاد بچوں کو تعلیم دیتا ہے اور باقی دو استاد تربیتی امور کے سلسلے میں بچوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور بچوں میں ایسی اخلاقی صفات اور صلاحیتیں اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو عملی زندگی میں ان کو ایک اچھا انسان اور بہتر شہری بننے میں مدد دیں''۔

اپنی شاعری کے حوالے سے انہوں نے کہا...'' میں نے بہت پہلے شعر گوئی کا آغاز کیا اگرچہ اپنی مصروفیت کے باعث بہت کم شعر کہتا ہوں۔ مگر اب جو کچھ کہتا ہوں وہ عموماً وطن کے حوالے سے لکھتا ہوں۔ میری بیشتر نظموں کا موضوع پاکستان کا پرچم ہے۔ میرا ایک ترانہ کوپن ہیگن میں بہت مقبول ہوا۔ ملاحظہ ہو:

دھڑکن بن کر دل میں دھڑکے تیرا نام — مٹ نہ سکے گا اپنے دل سے پیارے وطن کا نام

سبز ہلالی پرچم تیرا جس کی انوکھی شان — لہرائے تو واری صدقے ٹھہرے تو ایمان

سینوں میں ہے اس کی محبت جوش عمل سے زندہ — اس کی طاقت اور ہیبت ہے روشن اور پائندہ

مردہ دلوں میں سوزِ یقیں ہے اس کے پیار کا نور — اس کے گلستاں رشکِ جنت ارضِ وطن پرنور

اس کی خوش حالی سے آصف دل اپنا شاداب — روپ حقیقت کا پاتے ہیں سب سپنے سب خواب

Mr. Mohammad Asif Khawaja,
Kastrupvej 50, 1-B, 2300 Copenhagen S, Denmark

انتخابِ کلام

روشن روشن یہ چاند اور ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

کوئی پنجابی ہے نہ بلوچی کوئی — کوئی سندھی ہے نہ ہی سرحدی کوئی
نام تجھ سے وابستہ ہمارا رہے — سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

روشن روشن یہ چاند اور ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

جان قربان کرتے ہیں شاہ و گدا — سو سو بار جنم سو سو بار فدا
ہر ستم ہم کو یوں ہی گوارہ رہے — سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

روشن روشن یہ چاند اور ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

دنیا گھومے ہیں دیکھی ہے ساری زمین — تجھ سے اچھا نہ کوئی تجھ سے حسیں
یوں ہی ہم کو ہمیشہ تو پیارا رہے — سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

روشن روشن یہ چاند اور ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے

☆☆☆☆☆

☆☆☆

اس شخص کو میں دل میں جگہ دونگی آصفہ
اس شہر میں جو آئینہ خانہ بنائے گا
Akhtar
29.5.03

آصفہ جہاں آرا خان

برمنگھم، برطانیہ

آصفہ جہاں آرا خان ان کا نام ہے جو ان کی خالہ نے اپنی دوست شہزادی جہاں آرا کے نام پر رکھا تھا۔ گھر میں پیار سے انہیں بی بی کہا جاتا ہے۔ تخلص ان کا آصفہ ہے۔ ۳/دسمبر ۱۹۵۰ء کو تلہ گنگ ضلع چکوال، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم قریبی گاؤں سگھ ہائی اسکول اور بی اے تلہ گنگ سے اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ دوران تعلیم تین وظائف بھی حاصل کیئے۔ برطانیہ آکر ٹیچر ٹریننگ کی۔ اس کے علاوہ یہاں سے کئی اور ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورس بھی کیئے۔ ۲۰۰۲ء میں ایشین اچیومنٹ ان برٹین (Asian Achievement in Britain) کے تحت ایشین جوئل ایوارڈ (Asian Jewel Award) کے لئے وومن آف دی ائر (Woman of the Year) اپنے کالج کی طرف سے نامزد ہوئی تھیں۔ اس ایوارڈ کے لئے پچپن ہزار (۵۵۰۰۰) نامزدگیاں پیش ہوئی تھیں۔ مقابلہ اپنے میدان کے بہترین لوگوں سے تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نوازش اور ان کے بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ بی بی نے یہ مقابلہ جیت لیا۔

انہیں پاکستان کمیونٹی اور خصوصاً خواتین کی نمائندگی اور خدمت کر کے بے حد خوشی اور تسکین محسوس ہوتی ہے۔ یورپ کے ممالک اسپین، پرتگال، ہالینڈ، بیلجیم اور ناروے میں بھی پاکستانی خواتین کی

نمائندگی کرچکی ہیں۔ انٹرنیشنل ہوز ہو (International Who's Who) کی ایشین ڈائرکٹری (Asian Directory) میں گزشتہ پانچ سال سے ان کا تعارف مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں پاکستان فورم، برمنگھم (Pakistan Forum, Birmingham) کی تیرہ (۱۳) سالہ تاریخ میں پہلی بار انہیں خاتون وائس چیئر پرسن (Vice Chairperson) کی حیثیت سے بلامقابلہ منتخب کیا گیا ہے، جو ایک بہت بڑا چیلنج تھا کہ ایک پاکستانی عورت نے مردوں کی اجارہ داری توڑ دی۔ انگلینڈ کے بڑے کالجوں میں ایک واقع برمنگھم کالج میں چودہ (۱۴) برسوں سے انگریزی پڑھا رہی ہیں جن میں ایشین، افریقن اور یوروپین (Asian, African and European) سب ہی شامل ہیں۔

ذاتی زندگی میں ان کی تخلیقی کاوشوں کا پھل تین بچے ہیں، ایک بیٹی بیرسٹر ہیں اور دو بیٹوں نے کمپیوٹر کی اعلیٰ ڈگریاں لی ہیں۔

آصفہ کو بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔ مگر ان کے شہر کا ماحول ایسا نہ تھا جہاں لڑکیاں آزادانہ شعر و شاعری کو اپنا سکیں۔ آصفہ اپنی تک بندی کاوشوں کو رشتے کی ایک نانی کو دکھالیا کرتی تھیں جو بلاشبہ ذہنی طور پر بالغ تھیں۔ یوں آصفہ کے ذہن نے شاعری کے تانے بانے بن کر اپنے نہاں خانوں میں محفوظ رکھے۔ اب سے چھ (۶) سال قبل برمنگھم کے ایک نعتیہ مشاعرے میں آصفہ نے پہلی بار حصہ لیا اور پھر غزل بھی کہی جو بعد کے ایک مشاعرے میں سنائی جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

سانحہ آنکھ نم نہیں کرتا دل بھی اب کوئی غم نہیں کرتا
کس کی آواز ہے سرِ مقتل کون یہ سر کو خم نہیں کرتا

پھر رفتہ رفتہ آصفہ خان مشاعروں کی فضا سے مانوس ہوتی چلی گئیں اور اپنے احساسات و جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھالتی بھی چلی گئیں۔ مگر ابھی تک مجموعۂ کلام کی اشاعت کی ہمت نہیں پاتیں اور وقت کی منتظر ہیں۔

ان کا مزاج غزل کی طرف مائل ہے۔ بقول آصفہ غزل کی صنف میں تنوع اور ندرت بہت ہے۔ نظم کی فنی پابندیوں کی وجہ سے اس کا میدان محدود ہے۔ اس کے باوجود کہ نظم گو شعرا نے پائے کی نظمیں کہی ہیں مگر آصفہ غزل کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ نثری نظم یا نثری غزل کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ یہ ابھی تجربے کے مراحل میں ہیں۔

آصفہ کہتی ہیں... ''اردو زبان اپنی صدیوں پرانی روایات، اپنے رسم الخط اور صناعی کی وجہ سے بے مثال ہے۔ پاکستان اور ہندوستان سے نکل کر پوری دنیا میں اپنی خوب صورتی اور عظمت کو منوا رہی ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کا بھی ہے۔ چنانچہ اردو کا مستقبل میرے نزدیک تابناک ہے اور پھر اردو کا رسم الخط اس کی شناخت ہے اس لئے اس کو بدلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ دنیا کی ہر عظیم زبان کا اپنا رسم الخط ہے اور تیکنیکی اعتبار سے وہ ہی اس زبان کی بہترین طور پر نمائندگی کر سکتا ہے۔

گزری صدی نے عظیم شعرا پیدا کیئے ہیں۔ اس میں دنیائے ادب کی دیو قامت شخصیتوں کے جو نام آتے ہیں ان سب کی انفرادی اہمیت اور مقام دنیا میں جانا پہچانا ہے چاہے وہ جدید لہجے کے شاعر ہوں جن میں فیض احمد فیض اور قتیل شفائی کے نام نامی ہوں یا قدیم روایت کی شاعری کے علمبردار ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر اقبال کی شاعری پسند ہے۔ اس میں فلسفہ، تصوف، ترنم اور فنی حسن بہ یک وقت موجود ہے۔ ان سب خوبیوں کو شاعری کے اعلیٰ معیار سے سجا کر عوام تک پہنچانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اقبالؔ نے یہ کام اردو زبان وادب کی ایک عظیم ادبی خدمت کی شکل میں کر کے دکھایا۔

میری زندگی کا یادگار واقعہ دسمبر ۱۹۹۷ء کی اس شام کا ہے جب میں یوروپین ویمن کانفرنس (European Women Conference) میں لزبن، پرتگال سے واپسی پر رات کے دو بجے لندن ہیتھرو ایئر پورٹ پہنچی۔ دورانِ سفر فلائٹ میں میری دائیں جانب ایک ہندوستانی خاتون اور بائیں جانب ایک ترک مرد براجمان تھے۔ ان سے گفتگو بھی ہوتی رہی۔ میں سامان لے کر ایئر پورٹ سے باہر آئی تو وہ ہی ترک صاحب ساتھ ہو لیئے کہ وہ مجھے کوچ اسٹیشن تک پہنچا دیں گے۔ میں منع بھی کرتی رہی مگر وہ میری تعریفوں کے پُل باندھتے میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سنسان راستہ، میں گھبرا گئی اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ وہ اس 'ناگہانی آفت' سے میرا پیچھا چھڑوائیں۔ اسی اثنا میں وہ ہندوستانی خاتون بھی کہیں سے نمودار ہوگئیں اور ہیلو، ہیلو کی آواز لگائی۔ میں نے ترک مرد میدان سے کہا کہ وہ ان کی مدد کریں اور خود ایسی بھاگی کہ راستہ بھول کر دوسری جگہ نکل آئی۔ مگر اسی وقت دو صاحبان، ایک گورے اور دوسرے ایشین، سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ ان فرشتوں سے میں نے گزارش کی تو انہوں نے مجھے تسلی دی اور کوچ اسٹیشن تک پہنچا دیا۔ میں خدا کا شکر بجا لائی اور سوچتی رہی کہ اللہ تعالیٰ ہم جیسے نالائق بندوں کی بھی بوقت ضرورت ہماری پکار پر مدد کے لئے انسانوں کے بھیس میں فرشتے بھیج دیتے ہیں اور ہم، جن کے ہونٹ عام آدمیوں کو خوشامدانہ انداز میں شکریہ شکریہ کہتے نہیں تھکتے، کبھی دن میں بھول کر بھی ایک بار اپنے رب کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ کتنے خود غرض اور ناشکرے ہیں ہم۔ اس موقع پر میں آپ کو اپنا ایک شعر سناتی ہوں "

برہنہ پیڑ کی کرتا نہیں کوئی عزت   کسی بھی شاخ پر کونپل سی اک سجا لیا کر

Bibi Asifa Khan,

36 Coleshill Road, Hodge Hill, Birmingham, B36 8AA, UK

انتخابِ کلام

لگتا ہے پرندوں سے دعا روٹھ گئی ہے
وہ حبس ہے پیڑوں سے ہوا روٹھ گئی ہے

❖

اب دن کو بھی بستی میں اُجالا نہیں ہوتا
اس شہر کے لوگوں سے ضیاء روٹھ گئی ہے

❖

اک شخص کو چاہا ہے تو محسوس ہوا ہے
ہونٹوں سے مرے صوت و ندا روٹھ گئی ہے

❖

میں نے کسی کا بھی برا چاہا نہیں ہے
پھر کس لئے یہ خلق خدا روٹھ گئی ہے

❖

تم آصفہ گلدان میں کیا ڈھونڈ رہی ہو
پھولوں سے بھی جب بادِ صبا روٹھ گئی ہے

❖

باسم ربّی

بیٹھ کر گرداب کی کشتی میں اے آنند ہم
جائیں گے طوفان کا در کھٹکھٹانے کے لئے
— ودیا ساگر آنند

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند

لندن، برطانیہ

علم کا سمندر اگر ایک ساگر سے ملنے کو بے چین ہو اور کہے کہ مجھے اس "ساگر" کی سچائی نے مسخر کرلیا ہے اور میری تمناؤں میں ایک تمنا 'ودیا ساگر آنند سے ملاقات' کا اضافہ ہوگیا ہے، تب اس شخص آنند کے بارے میں اظہار خیال کے لئے سوچنا ہی پڑتا ہے۔

میں علم کے سمندر شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے محترم پروفیسر سید ابوالخیر کشفی کا ذکر خیر کررہی ہوں جو ودیا ساگر آنند کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت اور انسان سے اخوت اور محبت کرنے کا درس بھی دے گئے کہ یہی انسانیت کی معراج اور اس کا اعتبار ہے۔

محترم پروفیسر کشفی صاحب نے "ودیا ساگر کی سچی کمائی" کے عنوان سے ان کے کلام کے مجموعے "مے آنند" میں لکھا ہے... "ان کی ودیا نے انہیں صدیوں بلکہ ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی سچائی سے ہم آغوش کردیا ہے۔ اور پھر یہ ساگر تو بے کنار ہے۔ ان میں مذاہب کی بنیادی سچائیاں ہیں۔ انسان کی انفرادیت ہے اور انسان کی محبت ہے۔ ودیا ساگر آنند اردو کلچر کے ایک نمائندہ ہیں۔ یہ اردو کی عظمت ہی تو ہے کہ ہند، ہندو، ہندوستان اور تو اور ہندی، ان میں سے کونسا لفظ سنسکرت کا ہے۔ 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ ہماری جنگِ آزادی میں کس کے ہونٹوں پر نہیں رہا۔ ہندوستانی بھاشاؤں کی

سندرتا، عجم کی حسنِ طبیعت اور عرب کی سوزِ دروں، یہ ہیں اردو کے عناصر۔ اردو کا افق محمد عربیؐ، گوتم، رام اور کرشن کی تابانیوں سے جگمگا رہا ہے اور جگمگاتا رہے گا"۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندو شعرا نے جہاں حمد اور نعتیں کہی ہیں وہیں مسلمان شعرا نے بھی ہندوستان کے تینوں جلیل القدر انبیائے کرام کے بارے میں عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً اقبالؔ نے ایک بہت خوب صورت نظم بعنوان 'رام' کہی جس کے آخری تین اشعار یہ ہیں۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز	اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی	روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا	پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

پروفیسر کشفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا حسرت موہانی ہر سال متھرا میں حاضری دیتے تھے۔ ان کا شعر ہے۔

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری	سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

قمر ہاشمی کی طویل نظم "نروان کا ساگر" کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر کشفی نے لکھا ہے..."یہ نظم گوتم بدھ کے بارے میں ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ کوئی ایسی قوم نہیں جس میں ہم نے اپنا نذیر (خدا کا خوف دلانے والا) نہ بھیجا ہو۔ ہم ہندوستان اور دنیا کے ہر ملک میں ان رہنماؤں کو دائرۂ نبوت میں شامل کرنے کے منکر نہیں جو حضرت محمدؐ رسول اللہ سے پہلے تشریف لائے۔ یہ سب اسلام کے پیغمبر تھے"۔

ودیا ساگر آنند کی نعت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر کشفی نے لکھا ہے کہ اس میں ایک عجیب نکتہ خرد افروز ہے، وہ یہ کہ بار امانت قرآن مجید ہے۔ ملاحظہ ہو۔

آسمانوں سے بھی جو بار اُٹھایا نہ گیا	اور ملائک سے بھی جو راز سنبھالا نہ گیا
جب فرشتوں سے بھی وہ بار سنبھالا نہ گیا	تب خداوند نے قرآن تمہیں سونپ دیا

برمنگھم کی ایک معتبر شخصیت، ادیب و صحافی جناب محمود ہاشمی نے اپنے مضمون میں مرحوم معین الدین شاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ..."شاہ صاحب اپنے دو کارناموں کی وجہ سے بالخصوص یاد رہیں گے۔ ایک کارنامہ تو ان کا ماہنامہ 'اردو ادب' تھا اور دوسرا کارنامہ شاعر ودیا ساگر آنند کی دریافت۔ رسالہ 'اردو ادب' شاہ صاحب کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا البتہ ودیا ساگر آنند کی شاعری جاری ہے اور ترقی کی منازل طے کر رہی ہے"۔ ان ہی معین الدین شاہ مرحوم نے اپنے مضمون میں آنند کا تعارف کراتے ہوئے بڑی دل نواز باتیں کہیں۔ انہوں نے لکھا..."جو لوگ آنند صاحب کی سراپا جد و جہد اور مساعی پیہم زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سراپا جہد مسلسل بن کر بھی مسکرانا ہمت والوں کا کام ہے۔ آنند تو جد و جہد اور سعی مستقل کے پیکر ہی نہیں بلکہ خود علامت جہد بن چکے ہیں"۔

آنند کی اردو زبان سے محبت ان کا ایک خصوصی وصف ہے۔ اس کے باوجود کہ آنند کئی زبانیں جانتے ہیں اور انگریزی میں انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں لیکن اردو ہی کو اپنی مادری زبان کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔ ان کی اسی محبت کے

اعتراف میں اردو کے ایک پرستار محترم ساحر شیوی نے سہ ماہی "سفیر اردو" کے (جو لیوٹن برطانیہ سے شائع ہوتا ہے) اپریل تا جون ۲۰۰۳ء کے شمارے کو ودیا ساگر آنند کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس شمارے میں ساحر شیوی نے اپنے دوست ودیا ساگر آنند کے لئے چند قطعات بھی شامل کیئے ہیں۔ یہ قطعات ۹/ نومبر ۱۹۹۷ء کے دن ساؤتھ ایشین لٹریری اینڈ کمیونٹی ایوارڈ کی اس محفل میں ڈاکٹر آنند کو ان کی خدمات کے اعتراف میں "نغمہ زر" پیش کیئے جانے کے موقعہ پر کہے گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہاں ملاحظہ ہو۔

تو جو کرتا ہے خدمتِ اردو تیرا ایثار کام آئے گا
آسمانِ ادب پہ اے آنند ایک دن تیرا نام آئے گا

اپنی ایک اور نظم میں ساحر شیوی کہتے ہیں۔

عبادت اس کی طہارت کا ایک پہلو ہے ہو جیسے پیار کا سنسار ڈاکٹر آنند
ذرا بھی اس میں اے ساحر شک و گمان نہیں ہمیشہ اردو پہ بلہار ڈاکٹر آنند

خود ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا کہنا ہے کہ ان کا خمیر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کے دن اس خطے سے اٹھا جو پاکستان کے پنجاب کا علاقہ شاہ پور کہلاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی اس دھرتی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جس کی مٹی کی مہک ان کے خون میں رچی بسی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے ..."میں نے اپنے سورگ باشی والد جناب شودیال فرخ کے سایۂ عافیت میں پرورش پائی۔ وہ اردو اور فارسی کے عالم اور مدرس تھے اور اپنے زمانے کے مشہور و معروف شاعر بھی۔ مجھے یہ سخن فہمی ان کی محبتوں کے طفیل ملی ہے۔ ان کی محبتوں کے ساتھ ساتھ میں نے اردو کے ممتاز شاعر آنجہانی جناب ترلوک چند محروم اور جنگِ آزادی کے مشہور و ممتاز مجاہد اور فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب کے سب سے بڑے مخالف آنجہانی سندر لال کی معیت میں اپنی جوانی گزاری ہے اور اکتسابِ علم میں نے ان ہی سے کیا۔ ابتدائی تعلیم کیمبل پور، پنجاب اور گوز گاؤں میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ اور انگریزی میں گریجویشن کیا۔ انگلستان آکر لندن سے ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء کے دوران قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ انٹرنیشنل ریلیشنز (International Relations) اور یورپی تاریخ میں ڈگریاں حاصل کیں۔ میری تھیسس (thesis مقالے) کا موضوع تھا انڈین روولوشنریز ان جرمنی ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۵ (Indian Revolutionaries in Germany 1900-1905)۔ جنگ عظیم دوم کے ہندوستانی ہیروؤں (heros) اور ہیروئنوں (heroines) کی مختصر تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے جو ایک کتابچہ کی صورت میں موجود ہے"۔

برطانیہ میں اقلیت قوموں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے ودیا ساگر آنند نے بہت کام کیا ہے۔ وہ کئی سماجی اور رفاہی اداروں سے وابستہ ہیں۔ دامے درمے ان کی ہر طرح کی مدد کرتے ہیں۔ وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (Royal Asiatic Society) رائل سوسائٹی آف آرٹس اینڈ کامرس (Royal Society of Arts & Commerce) اور برٹش انسٹی ٹیوٹ آف ڈائرکٹرز

(British Institute of Directors) کے ممبر بھی ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں کئی لیڈروں کی سوانح بھی شامل ہیں۔ ان کی سماجی خدمات پر انہیں ہیومن رائٹس ایوارڈ (Human Rights Award) اور ہندرتن ایوارڈ (Hind Ratan Award) سے بھی نوازا گیا ہے۔ ہندرتن ایوارڈ انہیں دہلی میں ۱۹۹۱ء میں فنانس منسٹر من موہن سنگھ نے بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے دیا۔ اسی سال ڈاکٹر آنند کو مدر انڈیا ایوارڈ (Mother India Award) سے بھی نوازا گیا جو بھارت کی لوک سبھا کے اسپیکر شیوراج پاٹل جی نے عنایت کیا۔

ودیا ساگر آنند سن ساٹھ کی دھائی میں برطانیہ کی لیبر پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ وہ اقلیتی کمیونٹی کے پہلے ایشیائی شخص ہیں جو لندن ریجنل لیبر پارٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو ۱۹۵۷ء میں ہو چکا تھا۔ اردو میں نثر اور نظم، دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ پھر انگریزی زبان میں بھی مضامین لکھے۔ ودیا ساگر آنند بتارہے تھے کہ ان کی زندگی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

جس کی نظر میں سمائی ترے گلشن کی بہار — کیا ملے آنند اس کو باغ رضواں دیکھ کر

پہلا شعری مجموعہ ''مئے آنند'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کی طبع ثانی ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔

آنند نثری نظم اور نثری غزل کے سلسلے میں کہتے ہیں...'' یہ شاعر کے اپنے دل کی آواز ہے۔ فارم کوئی بھی ہو میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن میں اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہوں۔ اردو زبان اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے۔ دیوناگری رسم الخط اختیار کیا گیا تو ہندی زبان اس کو کھا جائے گی۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ اردو زبان کو اپنا کر کوئی بھی شخص، جسے اردو سے محبت ہوگی، گھاٹے میں رہے گا۔ کیا ہم پیدا ہو کر گھاٹے میں رہے ہیں''؟

آنند کے پسندیدہ شعرا کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سرفہرست رومی، میر، تلوک چند محروم اور ان کے والد شیو دیال فرخ ہیں جب کہ گزری صدی کے قد آور شعرا اقبالؒ، چکبست، فراق، مجاز اور مخدوم ہیں۔

ان کی زندگی کا یادگار اور اہم واقعہ ۱۹۵۷ء میں گوڑ گاؤں کا وہ مشاعرہ ہے جس میں جگر مرادآبادی، قتیل شفائی اور دیگر شعرا شریک تھے۔ آنند نے بھی اپنی نظم سنائی۔ اس موقعہ پر جگر مرحوم کی سنائی ہوئی غزل کا یہ شعر انہیں آج بھی یاد ہے ؎

یہ مہر و ماہ میرے ہم سفر رہے برسوں — اور میرے بعد میری گرد کو بھی نہ پا سکے

Dr. Vidya Saag'ar Aa'nand,
Institute for Media Communication, 32 Padington Street, London, W1M 3RG, Uk

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

تم چھوٹ کی باتوں سے کیوں دل کو جلاتے ہو　　دنیائے محبت میں کیوں آگ لگاتے ہو
دھرتی کی فضاؤں میں کیوں زہر ملاتے ہو　　سوئے ہوئے فتنے کیوں رہ رہ کر جگاتے ہو

⧗•⧗

یارب یہ تیری پوجا بندے سے لڑے بندہ　　میں ایسی پرستش سے باز آیا خداوندا

⧗•⧗

موتی کی رضا جوئی ہے کان کو خوش کرنا　　ہے ماں کی خوشی اس کی سنتان کو خوش کرنا

⧗•⧗

یہ پھوٹ کے سوداگر جب بین بجاتے ہیں　　مذہب کے تنبورے پر سرتال سناتے ہیں
ساتھ اپنی پٹاری کا منہ کھولتے جاتے ہیں　　پھنس جاتے ہیں جواں کو آپس میں لڑاتے ہیں

⧗•⧗

ذروں کی طرح خود کو صحرا میں ملا دینا　　قطروں کی طرح خود کو دریا میں بہا دینا
ان فرقہ پرستوں سے بھارت کو بچا لینا　　ان گھر کے چراغوں سے گھر کو نہ جلا لینا

⧗•⧗

محبت کرو تم اور صلہ پائے کوئی　　اس طرح کی ذات کا نشاں جڑ سے مٹا دو

⧗•⧗

کہیں رام رسول کا چرچا ہے کوئی عیسیٰ موسیٰ کہتا ہے
اک خم سے حقیقت میں آنند ساقی نے بھرے سب پیمانے
یہ گورے بنائے خالق نے کالے بھی بنائے ہیں اس نے
دونوں پر دھرتی کی مٹی ہے جیسی تیسی تھپی ہے

⧗•⧗

یہ سمٹ جائے تو اک نقطہ بھی کافی ہے اسے
پھیلنا چاہے تو کونین کی وسعت کیا ہے
ہے یہ وہ شمع جو جلتی ہی رہے گی ہر دم
اس کو گل کر سکے، طوفان کی ہمت کیا ہے

⧗•⧗

زندگی کس طرح سے گذری ہے
کیا بتائیں یہ بات ہماری ہے
بشیر جعفری 2002-3-6

بشیر النسا جعفری

ہیوسٹن، ٹیکساس، امریکہ

ویسے تو خواتین کا عالمی دن ۸/مارچ ہے مگر بشیر آپا کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ خواتین کا عالمی دن ۲۶/جولائی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ بشیر آپا نے اس دن جنم لیا تھا۔ انہیں کام کرتا دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ نے کسی مشین کے پہیئے کو گھما دیا ہے۔ اب جب تک کام ختم نہیں ہوتا وہ پہیا رُکتا نہیں۔ اُنہیں اس طرح کام کرتے ہوئے ہم نے خود دیکھا ہے۔ یہ بات ہے ہیوسٹن میں منعقدہ خواتین مشاعرے کی جو بشیر النسا جعفری نے اپنی ساتھیوں کی ٹیم (team) کی معاونت سے منعقد کیا تھا۔ اس میں نسیم جلالوی اور نسرین زیدی بھی شامل تھیں جنہوں نے بشیر آپا کی محنت اور ذہانت کو کئی بار سراہا۔ اس موقعہ پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا۔

پیار کی تصویر ہیں آپا بشیر — جہد کی تفسیر ہیں آپا بشیر
دیں انہیں لیلائے اردو کا لقب — مہر کی تنویر ہیں آپا بشیر

اکیس (۲۱) سال کی عمر میں یعنی ۵/ستمبر ۱۹۵۲ء کو ان کی شادی ہوگئی۔ اس وقت یہ انٹر سائنس میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ شادی کے بعد لائبریری سائنس میں کورس مکمل کیا۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے، قمر النسا، زاہدہ، سید مسعود حسن جعفری اور سید حامد حسن جعفری پیدا ہو چکے تھے۔ پھر تعلیم اور ملازمت کا

سلسلہ شروع ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ بعد میں اسی جامعہ سے لائبریری سائنس کی ڈگری بھی حاصل کی۔ بشیر آپا بتاتی ہیں ... ''میں نے ۱۹۵۵۔۵۶ء میں جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ (Department of General Administration) میں بحیثیت لائبریرین ملازمت کی۔ ۱۹۵۹ء سے گورنمنٹ ڈگری کالج فزیکل ایجوکیشن (Government Degree College Physical Education) میں بحیثیت لائبریرین چودہ (۱۴) سال خدمت انجام دی۔ پھر تبادلہ کیا گیا اور گورنمنٹ ویمن کالج، بیگم پیٹ (.Government Women College Begumpet) میں اسی عہدے پر پندرہ (۱۵) سال خدمت کرتی رہی۔ اس دوران دو (۲) سال تک بحیثیت اردو لیکچرار بی اے، بی کام اور بی ایس سی کی لڑکیوں کو اردو زبان کی تعلیم دیتی رہی۔ بعد میں حکومت نے اسی کالج میں اردو زبان کا باضابطہ پوسٹ (post اسامی) کا اجرا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ پانچ سال تک بحیثیت فزیکل ڈائرکٹر (Physical Director) کا کام انجام دیا جس کی وجہ سے فزیکل ڈائرکٹرز (Physical Directors) کے محکمے کا اجرا کیا گیا۔ یہاں پندرہ سال خدمت کرنے کے بعد میرا تبادلہ اندرا پریا درشنی گورنمنٹ کالج (Indira Priya Darshani Governmnet College) پر ہوا۔ وہاں تین سال بحیثیت لائبریرین کام کرنے کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئی۔ وظیفے کے بعد نصر اسکول، خیرت آباد نے میری خدمات حاصل کیں اور وہاں بھی بحیثیت لائبریرین امریکہ آنے تک کام کرتی رہی۔ ۱۷/ مارچ ۱۹۹۱ء کے دن امریکہ آ گئی۔

میرے والد سید محمد علی موسوی ایم ایل اے (MLA) اور کانگریس پارٹی لیجس لیٹیو اسمبلی (Congress Party Legislative Assembly) کے جنرل سکریٹری کے علاوہ حیدرآباد، دکن کے ایک مشہور تاجر بھی تھے۔ حیدرآباد دکن میں نظام ہفتم کی حکومت کے زمانے میں میرے والد بحیثیت میئر (Mayor) رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہر قسم کے سماجی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ نمائش مصنوعات ملکی کے بانیوں میں اُن کا نام سرِ فہرست تھا۔ اسی طرح ایسی کئی چیزیں اور کام اُن کے نام سے وابستہ ہیں۔ مجھے بھی یہ تمام چیزیں اُن سے ورثہ میں ملی ہیں۔ میں حیدآباد، دکن کی مختلف انجمنوں میں کام کرتی رہی ہوں۔ میرے شوہر سید سراج الحسن جعفری، جو پیشے سے وکیل تھے، میرے ہر کام میں حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ امریکہ آنے کے تین سال بعد میں نے ۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۹۴ء کو 'ہیوسٹن ادبی محفل خواتین' کی بنیاد ڈالی جو آج تک قائم ہے اور جس کے پروگرام پابندی سے ہوا کرتے ہیں۔ کافی تعداد میں خواتین اس انجمن کی ممبر ہیں اور کافی دلچسپی سے انجمن کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہیں۔ حال ہی میں خواتین کا بین الاقوامی اردو مشاعرہ بھی ہوا تھا جو اپنی نوعیت کا پہلا قدم تھا اور نہایت کامیاب رہا۔

میں بارہ (۱۲) یا تیرہ (۱۳) سال کی عمر سے شعر کہنے لگی۔ ڈرامے بھی لکھے۔ گرما کی اسکول کی تعطیلات میں محلے کے بچوں کو جمع کر کے ڈرامے کراتی تھی۔ مزاحیہ مضامین بھی لکھا کرتی تھی۔

آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد دکن سے ۱۹۵۴ء سے وابستہ رہی۔ نظموں اور غزلوں وغیرہ کے پروگراموں میں حصہ لیتی رہی۔ ریڈیو سے ماہ محرم کے پروگراموں میں مرثیے بھی پڑھا کرتی تھی جس کا سلسلہ ۱۹۹۱ء یعنی امریکہ آنے تک رہا۔

میں نے دکنی، ہندی اور اردو زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ دکنی لوک گیت بھی لکھے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد سے دکنی لوک گیت فائن آرٹس اکیڈیمی کے میوزک ڈائرکٹر اقبال قریشی صاحب اور جناب حمید الدین شاہد[1] صاحب جو آج کل پاکستان میں مقیم ہیں، ان دونوں کی مدد سے پیش کیئے۔

کسی بھی ادب میں نئے تجربات ضروری ہیں۔ اس سے ادب کی ترقی کا امکان یقینی رہتا ہے۔ نثری نظم و نثری غزل کے لئے ایسے تجربات کے نتائج ہی بتلا سکتے ہیں کہ بالآخر نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ مشق جاری رہے تو اچھا ہے۔ جدید شاعری میں مرکزی خیال کی اہمیت ہوتی ہے۔ خیال کو جس طریقے و انداز سے پیش کیا جاتا ہے اس سے شاعری پر نکھار آتا ہے۔

کسی بھی زبان کے مستقبل کا تعلق حال کے ماحول سے وابستہ رہتا ہے۔ میرے خیال میں اردو زبان کا مستقبل امید افزا ہے۔ اس کی دن بدن وسعت کبھی اس کو مٹنے نہیں دے گی۔ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی میں حامی نہیں ہوں۔ نظم میں کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے، اپنے احساسات کی باسانی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔

مجھ کو جن شعرا نے متاثر کیا ہے وہ میرؔ، غالبؔ، قلی قطب شاہ اور اقبالؔ ہیں۔ اس کے علاوہ جوشؔ، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی میرے پسندیدہ شعرا ہیں۔

میری زندگی کا سب سے اہم اور دلچسپ واقعہ میری شادی کا دن تھا جو ۵/ ستمبر ۱۹۵۲ء تھا۔ اس دن شہر حیدرآباد، دکن میں مکمل کرفیو (curfew) تھا۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبا کی ہڑتال اور ہنگامے کے سبب کئی طلبا وغیرہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی جانیں دے چکے تھے۔ اس کرفیو میں میرے ہونے والے شوہر کسی قیمت پر شادی ملتوی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میرے والد صاحب نے ہر طرح کی کوشش کہ ایک دو روز شادی ملتوی کر دیں مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ میں پریشان تھی کہ میری سہیلیاں، لکچرار اور عزیز و اقارب کیسے شریک ہوں گی۔ پھر یہ ڈر ہو رہا تھا کہ میرے ہونے والے شوہر کو کیوں اس قدر اصرار تھا کہ اسی دن شادی ہو۔ والد صاحب نے پولیس سے پرمٹ اور پاس حاصل کیئے اور کار اور سواریاں بھیج کر مہمانوں کو بلانے کا انتظام کیا۔ وہ دن میرے لئے عجب کشمکش کا دن تھا۔ پہلے سے مجھ کو تیز بخار بھی تھا اور پھر اس دن زوردار بارش ہو رہی تھی۔ تمام انتظامات، شامیانے، کرسیاں، پکوان وغیرہ سب خراب ہو رہے تھے۔ بہر حال والد صاحب قبلہ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور دولہا میاں کے آنے سے پہلے ہی تمام چیزیں از سر نو مکمل ہو گئیں اور کسی دعوتی کے آنے میں بھی کوئی کمی

۱۔ حمید الدین شاہد صاحب کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

نہیں ہوئی۔ ان تمام چیزوں کے تکمیل پا جانے سے مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اظہار کر نہیں سکتی۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتی۔ خصوصاً میری والدہ محترمہ بتول النسا بیگم صاحبہ مرحوم نے اس موقعہ پر میری ہمت افزائی کی، نہ صرف اس وقت بلکہ میری ہر مشکل میں اُن کی ہمت افزائی میرے لئے کارآمد ثابت ہوئی۔ ساتھ ہی میں اپنے شوہر کے عزم و استقلال کی بھی قائل ہوگئی۔

Mrs. Basheer-un-nisa Jafri,
12515 News Circle, Apt. C, Houston, TX 77082, USA

انتخابِ کلام

آئی بہار لائی سبزہ مرے صحن میں
گُل مسکرائے کلیاں چٹکیں میرے چمن میں
بادِ صبا جو آئی خنکی بھی ساتھ لائی
تازہ ہوا کے جھونکے پہنچے مرے بدن میں
کیسا سُہانا موسم کتنی سُہانی راتیں
یوں جگمگاتے آئے تارے نظر گگن میں
کیا ہوگیا ہے تم کو کس سوچ میں پڑے ہو
کیوں ڈھونڈتے ہو تارے یوں بار بار دن میں
کتنی دعائیں مانگیں شبھ کی گھڑی کی خاطر
لو آگیا ہے اب تو وہ دن ترے لگن میں
کیسا نرالا دیکھو قدرت کا کارخانہ
سورج و چاند ایسے کیوں آگئے گہن میں
لوگوں کی بھیڑ بھی ہے اور چار سو اُجالا
بیٹھی ہوئی ہوں پھر بھی تنہائی کی گھٹن میں
زیور لباس سادہ کیسا سجا ہے اس پر
کیا سادگی ہے دیکھو اس کے رہن سہن میں
اندازِ گفتگو ہے اُن کا ایسا بشیرؔ دیکھیں
پھولوں کا سا سماں ہے کانٹوں کی اس چبھن میں

کوئی بھی رشتہ نہیں درد کے رشتے سے بڑا
اور زخموں کے سوا بھائی کو بھائی کیا دے

پرویز مظفر
20/10/02

پرویز مظفر

برمنگھم، برطانیہ

منکسر المزاج پرویز جتنے اچھے انسان ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ پہلے پرویز سے ایک غزل سنتے ہیں پھر ان سے گفتگو کرتے ہیں۔

اکھوا سا پھوٹتا ہے میرے دل میں پیار کا	اے چشمِ سُرگیں مجھے پانی اُدھار دے
مظلوم کی پکار کو سنتا نہیں کوئی	یارب تو ظالموں کے دلوں کو سنوار دے
ظالم غریب لوگوں کے گھر پھونکتا ہے کیوں	آ میرے پاس اور مجھے نیزہ مار دے
دن ڈوبتے ہی سازشیں ہوتی ہیں شہر میں	اللہ مجھ کو تیغ دے بھگون کٹار دے

محترم و معتبر شاعر جناب مظفر حنفی کے صاحبزادے پرویز مظفر سے گفتگو کیجیے تو فوراً یہ کہاوت یاد آجاتی ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ۵/مئی ۱۹۶۵ء کے دن بھوپال، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آٹھ نو سال بھوپال میں گزار کر ۱۹۷۴ء میں دہلی آئے۔ مگر انہیں بھوپال اب بھی بہت بھاتا ہے۔ اور جب بھوپال یاد آتا ہے تو والد مظفر حنفی صاحب کا یہ شعر بھی بے اختیار یاد آتا ہے۔

کیوں مظفر کس لئے بھوپال یاد آنے لگا　　کیا سمجھتے تھے کہ دلّی میں نہ ہوگا آسماں!

اور ایک پرویز یا مظفر حنفی صاحب کا ہی یہ المیہ نہیں، ان سب کا ہے اور ہم سب کا جنہیں اپنی مٹی سے کسی حیلے

حوالے سے جدا ہونا پڑا۔

میں نے پرویز سے پوچھا ... "یہ بتاؤ کہ دہلی کیوں اور کب چھوڑا اور تعلیم کہاں حاصل کی"؟

پرویز کہہ رہے تھے ... "ابتدائی تعلیم کے کچھ سال چھوڑ کر باقی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے ۱۹۸۷ء میں بی اے اور ۱۹۸۹ء میں ایم اے سوشل ورک میں کیا۔ پھر دہلی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان پرسنل مینجمنٹ (Post Graduate Diploma in Personnel Managment) کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ دہلی میں ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۹۳ء میں انگلینڈ آ گیا۔ ایک سال لندن میں ملازمت کی اور اب برمنگھم سٹی کونسل کے سوشل سروسز کے ڈپارٹمنٹ سے منسلک ہوں۔ ہم پانچ بھائی اور ایک بہن ہیں۔ بہن، صبا تسنیم، سب سے چھوٹی ہے جو ہمارے گھر کی شہزادی ہے مگر بہت لائق اور سمجھدار۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین"۔

شاعری کا شوق کب پیدا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں پرویز کہنے لگے... "جب سے آنکھ کھولی گھر میں ہمیشہ ادبی ماحول پایا۔ پڑھنے پڑھانے کا ماحول ہمیشہ سے ہی گھر میں رہا۔ جب بھی نظر پڑی اپنے والد کو ہمیشہ لکھتے پڑھتے پایا۔ شروع ہی سے ادیبوں اور شاعروں کا گھر پر آنا جانا رہا۔ ہندو پاک کے تقریباً ہر ادیب اور شاعر سے ملاقات کا اعزاز حاصل کیا۔ ادبی سفر کا آغاز یونیورسٹی کے زمانے سے ہوا۔ مگر اس زمانے کی تخلیقات یونیورسٹی میگزین 'تخلیق' تک ہی محدود رہیں۔ دوسری وجہ یہ رہی کہ گھر پر کتابیں اور رسائل اتنے زیادہ آتے رہے کہ ان کو پڑھنے ہی سے فرصت نہیں ملی اور کبھی اس طرف خیال ہی نہیں گیا کہ لکھنا بھی چاہیئے۔ اب بھی یہی حال ہے کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو یہ دونوں شوق ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اور وہی لوگ دنیا میں نام کر جاتے ہیں"۔

کیا تم نے نثری نظم یا غزل کا تجربہ کیا؟ پرویز بولے... "گو آج کل میں غزلیں اور نظمیں، دونوں کہہ رہا ہوں مگر مجھے نثری نظم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جہاں تک تجربے کا تعلق ہے، تجربے تو ہر میدان میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے پھر ادب میں کیوں نہیں۔ مگر نثری نظم یا نثری غزل کے میدان میں ابھی تک کوئی بڑا نام یا بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ دیکھیئے وقت کیا کرشمہ دکھاتا ہے مگر کوئی امید نظر نہیں آتی"۔

پرویز نے غزل کے ساتھ ساتھ خوب صورت نظمیں بھی کہی ہیں۔ نظموں میں ان کی فکر بہتر طور پر نمایاں ہوتی۔ ساقی فاروقی کا بھی ان کے لئے یہی مشورہ ہے کہ الفاظ کو مانجھ کر نظمیں کہو۔ پرویز کی ایک نظم "زندگی نام ہے" بڑی فکر انگیز ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ایک ہی بار قتل ہو جاؤں تو اچھا ہے\
کہ صبح روز تلوار ہی طلوع ہوتی ہے!\
پھر خوف سے ابھرتا ہوں میں/ اور زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے\
موت سے ڈرنے لگتا ہوں میں/ اور اندر ہی اندر/ سوچتا ہوں!\
کہ ابھی اور جینا چاہتا ہوں/ مگر پھر خوف کے مارے/ ایسا لگتا ہے

کہ آج ضرور مارا جاؤں گا/ قصہ تمام ہوگا/ لیکن پھر بچ جاتا ہوں

کہ میں جینا چاہتا ہوں/ خوشی کے ساتھ بے خوف ہوکر

یوں مر مر کر جینا نہیں چاہتا

پرویز کا کہنا ہے کہ وہ اردو کے مستقبل سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے... ''اردو ہمیشہ زندہ رہنے والی زبان ہے جو اپنے اُجلے چولے میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ لیکن اس میں ساتھ مل کر اس کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اب دیکھیئے یہاں ان ممالک (برطانیہ اور امریکہ) میں لوگ اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتے ہیں۔ سب نہ سہی، مگر پچاس فیصد تو لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی مادری زبان نہ بھولیں۔ بلا شبہ اس کام میں ہمیں اور محنت کرنی ہوگی وسیع پیمانے پر۔ یہاں سیمینار اور مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں مگر ان پروگراموں میں ہماری نئی نسل کم کم ہی نظر آتی ہے۔ اگر اس طرف غور نہیں کیا گیا تو مستقبل میں ادبی محفلیں تو سجتی رہیں گی مگر اس میں شرکت کرنے والے سامعین کم ہوتے چلے جائیں گے۔ مگر اس کا حل یہ بھی نہیں کہ اردو کا رسم الخط تبدیل کر کے رومن یا دیوناگری کر دیا جائے۔ مشکلیں ہر دور میں رہی ہیں اور ان کا حل لوگوں نے ڈھونڈا ہے۔ آج یہاں پر کتنے لوگ ہیں جن کے گھر میں اردو رسالہ یا اخبار آتا ہے؟ آپ بچوں کے سامنے اردو بولنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن بچوں کے سامنے اردو رسائل اور اردو کتابیں نہیں ہیں۔ بیشتر گھروں میں بچے اردو بول تو لیتے ہیں مگر انہوں نے اردو کا رسالہ یا کتاب نہیں دیکھی تو ان میں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق کیسے پیدا ہوگا؟ ہندوستان اور پاکستان میں اور یہاں برطانیہ میں بھی ایسے گھرانوں کی مثالیں موجود ہیں کہ جن کے بچوں کا ذریعہ تعلیم اردو نہیں تھا یا ہے مگر گھر پر اردو کتابیں یا رسائل موجود ہونے کی وجہ سے آج وہ بہت اچھی اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان اور پاکستان میں اردو کا مستقبل زیادہ روشن ہے اور امکانات بھی روشن ہیں کیونکہ وہاں بہت کام ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں اردو کے رسم الخط کو بدلنے سے اردو کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اصل بھی کھو بیٹھیں گے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ چلیئے اردو کا رسم الخط بدل کر رومن یا دیوناگری میں کر دیا جائے تو اس کے لئے بھی جس کو زبان سیکھنے کا شوق ہوگا وہ محنت کرے گا اور وقت نکالے گا۔ اگر یہی محنت اور وقت اردو (موجودہ رسم الخط میں) سیکھنے کے لئے فراہم کر دیں تو برا کیا ہے۔ کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے مگر انہیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے اور ان لوگوں نے سال بھر میں ہی اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے''۔

پرویز کہتے ہیں... ''غزل اردو ادب میں تاج محل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مقابلہ نظم تو کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں نظم لکھنا آسان ضرور ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ نظم ہی احساسات کی بہتر ترجمانی کرے۔ یہ وصف تو غزل میں بھی موجود ہے۔ خوبیاں دونوں اصناف میں ہیں۔ غزل میں ایک خاص بات ہے جو نظم میں نہیں ہے وہ یہ کہ غزل میں جتنے اشعار ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ سارے اچھے ہوں۔ پوری غزل میں دو شعر اچھے ہو سکتے ہیں اور پانچ خراب، مگر وہ دو شعر اتنے اچھے ہو سکتے ہیں کہ آپ کو پوری غزل پسند آ جائے گی۔ مگر

نظم کے سلسلے میں یہ ممکن نہیں۔ ہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظم میں ایک وسیع کینوس ملتا ہے اور انفرادی نقوش زیادہ آسانی سے واضح ہو جاتے ہیں"۔

"میر، اقبال اور غالب سے دیگر لوگوں کی طرح میں بھی متاثر ہوں۔ پھر آگے چل کر فیض اور فراق سے متاثر ہوا۔ اور بھی کچھ شعرا ہیں لیکن مجھے اپنے والد محترم کی غزلیں بہت پسند ہیں۔ آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میر تقی میر کے بعد اب تک سب سے زیادہ غزلیں کہنے والے شاعر میرے ابو جان، مظفر حنفی ہیں اور وہ ستر (۷۰) سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں"۔

پرویز نے اپنی زندگی کا ایک ایسا دل چسپ واقعہ سنایا جسے سُن کر میں سوچنے لگی لوگ کس طرح دوسروں کی سادگی سے نہ صرف حظ اُٹھاتے ہیں بلکہ مالی فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ پرویز بتا رہے تھے ..."ایک بار دہلی میں ایک صاحب ہمارے گھر پر تشریف لائے اور ہم سے کہا کہ وہ ہمارے پاپا کے بچپن کے بہت قریبی دوست ہیں۔ اس وقت ہمارے پاپا، ممی، بہن اور ایک بھائی کلکتہ منتقل ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ پاپا کے بچپن کے دوست اور وہ بھی بہت قریبی، چنانچہ ہم لوگوں کا فرض تھا کہ ان کی خاطر مدارات اور احترام کرتے جو ہم نے کیا۔ ان محترم کا ہمارے گھر پر دہلی میں پانچ روز قیام رہا۔ اس دوران یہ خیال رکھا گیا کہ ان کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ کلکتہ فون کرنے پر معلوم ہوا پاپا شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ پانچ دن بعد جب پاپا واپس لوٹے تو ہم نے انہیں فون پر مطلع کیا کہ ان کے بچپن کے دوست کا قیام ہم لوگوں کے ہاں ہے۔ پاپا کا جواب سُن کر ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نام کا ان کا کوئی دوست نہیں۔ اور نہ ایسے کسی نام کے شخص سے وہ واقف ہیں۔ ان صاحب کو جب ٹیلیفون پر بلایا تو اُن کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔

جاتے ہوئے انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ نہ وہ ہمارے گاؤں کے ہیں اور نہ پاپا کے دوستوں میں سے ہیں، یہاں تک کہ کبھی پاپا سے ان کی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ وہ پاپا کی تخلیقات مختلف رسائل میں پڑھتے رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس عرصے میں وہ ہمارے گھر مقیم تھے اُس عرصے میں پاپا اُن ہی کے شہر میں مشاعرہ پڑھ رہے تھے۔

اس وقت تو ہم سب کو بہت غصہ آیا۔ مگر اب جب کبھی بھی سوچتا ہوں تو بہت ہنسی آتی ہے۔ خاص طور پر اپنی بھابی کو چھیڑنے میں بہت لطف آتا ہے جو اُن صاحب کی خاطر مدارات میں کبھی مرغ بنا رہی تھیں تو کبھی مچھلی پلاؤ۔

Mr. Parvez Muzaffar,

48, Sleaford Road, Hall Green, Birmingham, B28 9QP, UK

انتخاب کلام:

موت برحق ہے یقیناً موت سے ڈرتا ہے کون
زندگی کو بھی برتنے کی طرح برتتا ہے کون

⁂

اور اک صورت نکل آئی تری تصویر سے
نت نیا اک رنگ اس تصویر میں بھرتا ہے کون

⁂

اے وفا سے بے خبر یہ تو کبھی معلوم کر
روز تازہ پھول چوکھٹ پر تری دھرتا ہے کون

⁂

زخم کر دیتا ہے دل میں ڈال کر ترچھی نظر
مسکرا کر زخم دل کے مندمل کرتا ہے کون

⁂

پیار کا یہ راز افشا ہوگیا پرویزؔ پر
زندگی ہے عشق کرنے کے لیے مرتا ہے کون

⁂

باسم ربی

ڈاکٹر سکینہ ساجد پنہاںؔ

ڈیلاس، ٹیکساس، امریکہ

سکینہ ساجد پنہاںؔ خالصتاً غزل کی شاعرہ ہیں جن کے بارے میں جدہ میں مقیم شاعر نسیم سحر نے لکھا ہے... ''اتنی عمدہ اور معیاری شاعری کرنے والی شاعرہ اب تک اس طریقے سے ابھر کر سامنے کیوں نہیں آسکی جیسے کہ اسے آنا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دوسری شاعرات یا شاعروں کی پبلک ریلیشنز (public relations) پنہاں کی پبلک ریلیشنز سے کہیں زیادہ مضبوط ہے''۔ ماہنامہ ''تخلیق، لاہور'' کے مدیر اظہر جاوید لکھتے ہیں... ''پبلک ریلیشنز کے اعجاز سے ناآشنا اور گروپ بندیوں کی افادیت سے بے خبر پنہاں نے اپنے فن سے محبت اور تعلق رکھا ہے''۔ اسی حوالے سے معروف افسانہ نگار زاہدہ حنا نے لکھا ہے... ''پنہاں کے لئے شہرت خواہ کوئی مفہوم نہ رکھے لیکن اگر وہ اپنے باطنی تجربات کو اسی سچائی اور معصومیت کے ساتھ رقم کرتی رہیں تو خواہ وہ شہرت سے کتنی ہی گریزاں ہوں شہرت انہیں خود ڈھونڈ نکالے گی''۔

میں نے ڈاکٹر پنہاں کی نظموں کا مطالعہ بھی بغور کیا ہے۔ وہ اس صنفِ سخن میں بھی اظہار کا کمال رکھتی ہیں لیکن انہیں غزل سے دلی محبت ہے۔ ثبوت میں ان کا مجموعۂ کلام ''غزل سہیلی'' پیش کیا جاسکتا ہے اور حال میں کہی گئیں ان کی غزلوں سے چند اشعار کہ وہ دل میں ترازو ہو جاتے ہیں۔ ان

میں آفاقی سچائیاں ہیں۔ مثلاً

رقصِ شرارِ جاں ہے فضا کے حصار میں　　اک شمع جل رہی ہے ہوا کے حصار میں

اور

نظر آجاؤں خود کو روشنی اتنی نہیں ہے　　حقیقت جان لے، سب زندگی اتنی نہیں ہے

پنہاںؔ کے ہاں بغاوت کا اظہار بھی ہے۔ یہ بغاوت حالات سے ہو، معاشرے سے ہو یا ہمارے سیاسی دباؤ کا نتیجہ بہر حال اظہار جرأت مانگتا ہے اور پنہاں کے ہاں جرأت بھی ہے اور اظہار کا سلیقہ بھی۔ ذرا دیکھیے ۔

مجھے پاگل نہ جانو تو بتانا چاہتی ہوں　　میں دنیا توڑ کے پھر سے بنانا چاہتی ہوں

پنہاںؔ اپنی شاعری میں ہی نہیں عام زندگی میں بھی سچ بولتی ہیں۔ دورانِ گفتگو شاعرات کے حوالے سے تنہائی کے کرب کی بات ہوئی تو کہنے لگیں..."ہمارے ادب میں یہ المیہ بھی موجود ہے کہ اگر مرد شاعر ہوں اور تنہا ہوں تو اس کی تنہائی 'فکری تنہائی' سے معنون کی جاتی ہے جب کہ شاعرہ ہو تو پھر اس کی تنہائی کے ڈانڈے ازدواجی زندگی کی ناآسودگی کے ڈانڈوں سے ملائے جاتے ہیں"۔

پنہاںؔ نے سچ کہا اور پنہاں نے اور بھی سچ کہے ہیں۔ وہ لاہور، پاکستان میں ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئیں۔

"پنہاں۔ تم نے تعلیم کہاں حاصل کی"؟ سوال سن کر وہ اداس لہجے میں بولیں..."تعلیمی حالات کے حوالے سے ایک احساسِ محرومی ہے اور رہے گا۔ میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکی جس کا مجھے بے حد شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں سائنس اور خصوصاً ریاضی میں بہت تیز تھی۔ ریاضی میرا محبوب ترین مضمون تھا۔ میرے سارے استادوں نے مجھے سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا مشورہ دیا، مگر میرے نامساعد حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ریاضی اور سائنس کے علاوہ فلسفہ، منطق اور ادب سے بھی بہت دلچسپی تھی لہٰذا اس طرف نکل آئی۔ اردو ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔

زمانۂ طالب علمی سے ہی حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ درس و تدریس میں بھی مصروف رہی کہ یہی میرے آبا و اجداد کا پیشہ تھا۔ مختلف اسکولوں میں تعلیمی و تنظیمی خدمات انجام دیتی رہی۔ اور بچپن سے ہی پروفیسر بننے کا خواب دیکھتی رہی۔ ایم اے کرنے کے بعد ایک مقامی پرائیویٹ کالج کے شعبۂ اردو میں لیکچرار کی خدمت حاصل کی اور دو سال تک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی خدمت بھی انجام دی۔ اس دوران حکومت کے شعبۂ تعلیم تک رسائی کے صبر آزما مراحل سے بھی گزرتی رہی اور پبلک سروس کمیشن کے سلیکشن پر حکومتِ سندھ کے ایک ڈگری کالج کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرار مقرر ہوئی جہاں آٹھ (۸) سال درس و تدریس کے علاوہ دیگر مختلف علمی و ادبی خدمات بھی انجام دیتی رہی۔ اس دوران جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کے لئے 'خواتین کی اردو شاعری' پر تحقیقی کام میں بھی مصروف تھی۔ جس پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہوئی۔ پھر انتہائی ناگزیر حالات کی وجہ سے مجھے اپنی محبوب ترین ملازمت چھوڑنا پڑی اور مجھے اپنا شہر اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ آنا پڑا۔

یہاں ایک نیا پروفیشن (profession) تلاش کرنا پڑا۔ اس کی بھی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ امتحانات پاس کئے اور اب سند یافتہ 'ماہر آرائش گل' ہوں یعنی ٹیکساس ماسٹر فلورسٹ (Texas Master Florist) لیکن اپنی اس پروفیسر شپ کو بہت یاد کرتی ہوں جس کا خواب بچپن سے دیکھا تھا اور جس کی تعبیر کے لئے بڑی محنت و مشقت سے تعلیمات و اسناد حاصل کی تھیں۔ ایک ہوتا ہے خواب کا ٹوٹ جانا اور یہ تھا خواب کی تعبیر کے ساتھ بکھر جانا''۔

میں نے پوچھا... ''تمہیں کب پتا چلا پنہاں کہ تمہارے اندر ایک شاعرہ بھی موجود ہے''؟ وہ کہنے لگیں... ''میں بہت کم عمری ہی میں تک بندی کرتے کرتے اچھے بھلے شعر موزوں کرنے لگی تھی۔ اور ادبی رسالوں میں کلام کی اشاعت کا سلسلہ بھی جلدی ہی شروع ہوگیا تھا۔ باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز میں سمجھتی ہوں اس وقت سے شمار کرنا مناسب ہے جب سولہ برس کی عمر میں میری غزلیں ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے صاحب علم و ادب کے رسالے 'نیا دور' میں چھپنے لگیں۔ پہلی بار جب میری دو غزلیں 'نیا دور' کے شمارے (مئی ۱۹۷۳) میں چھپی تھیں اس وقت میں نے صرف میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور فرسٹ ایئر کی تیاری کر رہی تھی۔ اس رسالے میں میرے کلام کی اشاعت کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے معتبر ادبی رسالوں میں بھی میرا کلام بغیر کسی تعارف اور سفارش کے صرف اور صرف اپنے زور و اثر کے اعجاز سے چھپتا رہا۔ اور یوں میری حوصلہ افزائی ہوتی رہی''۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں... ''میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ شاعری تو میں بہت بچپن سے کر رہی ہوں مگر حقیقت میں وہ سب شاعری نہیں تھی۔ سعیٔ گویائی کی 'غوں غاں' تھی جو ٹوٹے ٹوٹے لفظوں اور بکھرے بکھرے مصرعوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ ویسے میں اپنے ابتدائی دور کا ایک ایسا شعر ضرور سنا سکتی ہوں جو میرا سب سے پہلا مشہور شعر ہے۔ میری ایک غزل فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور کے ایک رسالے میں چھپی تھی۔ اس کا ایک شعر زبان زد خاص و عام رہا، منتخب اشعار کے انعامی مقابلوں میں اول قرار دیا جاتا رہا، بیت بازی کے مقابلوں میں، ریڈیو اور ٹی وی پر، مضامین اور افسانوں میں، غرض کہیں نہ کہیں اکثر و بیشتر سنائی اور دکھائی دیتا رہا۔ شعر بہت معمولی سا ہے مگر اب سے پچیس چھبیس برس پہلے کی ایک مکمل گمنام شاعرہ کا بہت مشہور شعر ہے''۔

یہ رشتۂ خلوص ہے ٹوٹے گا کس طرح روحوں کو چھو سکے ہیں بھلا کب فنا کے ہاتھ

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ غزل پنہاں کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے اور بقول ان کے ہمیشہ رہے گی۔ وہ کہتی ہیں... ''غزل نے مجھے شاعری سکھائی، اعتماد بخشا اور اعتبار عطا کیا۔ اس کے مزاج اور اپنی طبیعت کی ہم آہنگی کے باعث اس کے اور میرے درمیان سہیلی جیسا رشتہ رہا ہے۔ اسی نسبت سے اپنے دوسرے مجموعے کا نام 'غزل سہیلی' رکھا جو سو (۱۰۰) منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ 'احساسِ ناتمامی' بھی بیشتر غزلوں پر ہی مشتمل ہے۔ لیکن نظمیں بھی کہتی رہتی ہوں، پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں۔ آزاد نظموں کی آزادی میرے مزاج کو زیادہ راس آتی ہے۔ شاید اسی

لئے میرے مجموعہ منظومات جس کا عنوان ہے 'آدھی رات کا پورا چاند' میں پابند نظمیں کم اور آزاد نظمیں زیادہ ہیں۔ مگر اب نثری نظم بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اتنی نثری نظمیں لکھی ہیں کہ انبار لگ گیا ہے۔ اور خاص بات یہ کہ بغیر کسی رغبت اور توجہ کے، بس جو کچھ زیر قلم آ گیا آ گیا۔ ذہن کا بوجھ سمجھ کے اُتارا اور پلٹ کر پڑھا بھی نہیں کہ کیا لکھا ہے۔ نہ صاف کرتی ہوں اور نہ ہی رسالوں میں اشاعت کے لئے بھیجتی ہوں۔ مگر اب یہ نثری نظمیں مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ اب ان پر نظر ثانی بھی کر رہی ہوں اور اشاعت کے لئے رسالوں کو بھیجتی بھی ہوں۔ مجھے خود اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ یہ کیسے ہوا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کبھی نثری نظمیں بھی لکھا کروں گی۔ میں بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہوں۔ مگر یہ کیسے ہوا مجھے نہیں معلوم۔ شاعری بہت عجیب فن ہے۔ یہاں 'کیا؟، کیسے؟، کیوں؟' میں شاعر کا اپنا اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا کسی اور کا ہوتا ہے ...کسی انجانی قوت کا جسے شاعری کی دیوی کہتے ہیں۔ میں جسے شاعری کا فرشتہ بھی کہہ سکتی ہوں''۔

پنہاں کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) ''احساسِ ناتمامی'' (غزلیں، نظمیں۔ ۱۹۸۱؛ اور طبع ثانی ۱۹۹۴)۔

(۲) ''غزل کہیلی'' (منتخب غزلیں۔ ۱۹۸۸؛ اور طبع ثانی منتظر ہے)۔

(۳) آدھی رات کا پورا چاند (سو منتخب نظمیں۔ ۱۹۹۳)۔

ان کے علاوہ کئی اور شعری مجموعے اشاعت کے منتظر ہیں، ایک مجموعہ سو (۱۰۰) منتخب غزلوں کا اور تین مجموعے نظموں کے جن میں ایک مجموعہ نثری نظموں کا بھی ہے۔

پنہاں کی رائے میں... ''اردو زبان اس وقت ایک ایسے دوراہے پر ہے جہاں ایک طرف اس کا مستقبل بڑا تابناک ہے اور دوسری طرف غیر محفوظ اور مایوس کن۔ یہ زبان اپنی فطرت میں بڑی جاندار اور تیز رفتاری سے ترقی کرنے والی زبان ہے۔ مگر سیاسی اور سماجی حالات اس کے مواقف نہیں ہیں۔ پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ ہر جگہ طرح طرح کے مسائل کا شکار ہے۔ مستقبل میں یہ زبان محدود ہوتے ہوتے یا تو مر جائے گی یا پھیلتے پھیلتے انگریزی زبان کی طرح ایک بین الاقوامی زبان بن جائے گی۔ سارا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اس کو درپیش مسائل کے سلسلے میں کس طرح اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس خوب صورت اور ہر دل عزیز زبان کو اپنی زندگی کے اس مشکل مرحلے پر مثبت فیصلوں، پُرخلوص نیتوں اور بروقت عملی اقدامات کی شدید ضرورت ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون گزشتہ دنوں لکھا ہے''۔

پنہاں کا خیال ہے... ''ہر دور کے اردو ادب کی طرح آج کے اردو ادب کی جڑیں بھی اس کی زمین میں پیوست ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب اس کی زمین بھی تو اپنی زمین پر نہیں ہے۔ اب وہ زمانہ آ رہا ہے جب زمین اور آسمان میں فاصلہ بہت کم رہ جائے گا۔ پھر یہ بحث بھی ختم ہو جائے گی۔ اور جہاں تک ترجمانی کا سوال ہے تو ادب محض ترجمان نہیں ہوتا ہے۔ صحافت کی طرح، بلکہ اعلیٰ

وارفع، ادب کا اعلیٰ وارفع منصب ترجمانی سے بہت آگے کی منزل ہے... بہتر نایافت منزلوں کی طرف اشارہ۔ ادب صرف انسانی شعور ہی کی نہیں لاشعور کی بھی تربیت کرسکتا ہے اگر ادب واقعی خالص ادب ہو۔ اور ہمارا بیشتر ادب ابھی اس اعلیٰ وارفع منزل سے بہت پیچھے ہے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے کے لئے ایک پاک صاف انسانی روح اور سچے پُرخلوص دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ہمارے یہاں کمی نہ ہوتی تو ہمارا معاشرہ کبھی انحطاط پذیر نہیں ہوتا۔

آپ کے سوال کے جواب میں کہ نظم گوئی کیا غزل گوئی سے بہتر ہے، تو یہ بالکل ایسی ہی بحث ہے جیسے میں یہ سوچوں کہ زمین زیادہ اہم ہے یا آسمان، سردی کا موسم اچھا ہے یا گرمی کا موسم۔ دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اور یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے جس کو جو راس آئے وہی صنف اس کے لئے بہتر ہے۔ ادب کی اور بہت سی اصناف بھی ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی حریفانہ مقابلہ نہیں۔ پھر آخر یہ غزل اور نظم کا جھگڑا کیوں ہے مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو شعرا صرف نظمیں لکھتے ہیں، غزلیں نہیں کہتے انہیں غزل گوئی سے نہ جانے کیوں اللہ واسطے کا بیر ہے جب کہ غزل کے شعرا جو نظمیں نہیں لکھتے انہیں نظم گوئی پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہی مناسب رویہ ہے۔ اور شاید یہ وسعتِ قلبی غزل نے ہی اپنے شعرا کو عطا کی ہے''۔

پنہاں اپنی زندگی کے واقعات یاد کرتے ہوئے کہنے لگیں:

''یوں تو زندگی بذاتِ خود ایک اہم اور دلچسپ واقعہ ہے، بے شمار چھوٹے بڑے دلچسپ اور غیر دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے۔ ان ہی میں سے ایک یہ کہ ایک بار ڈاکیہ کسی رسالے سے انعام کی رقم کا منی آرڈر لے کے آیا تو میرے والد نے اسے یہ کہہ کر واپس کردینا چاہا کہ اس نام کی کوئی صاحبہ اس گھر میں نہیں رہتی ہیں پتا غلط لکھ دیا گیا ہوگا۔ تب ڈری سہمی ان کے پیچھے کھڑی اپنی گھبراہٹ پر کسی طرح قابو پاتے ہوئے خشک ہوتی زبان سے بہ حالت مجبوری مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ میں ہی پنہاں ہوں۔ اس پر انہوں نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا 'تم پنہاں ہو۔ یہ تو کوئی شاعرہ ہے۔ اس کی غزلیں میں نے رسالوں میں دیکھی ہیں'۔ جی وہ میں ہی ہوں، میں نے آہستگی سے کہا۔ 'اچھا وہ تم ہو' یہ کہتے ہوئے انہوں نے منی آرڈر کی رسید جو ڈاکیئے کو واپس کر رہے تھے میری طرف بڑھا دی۔ اسی شام دیوانِ غالب کا نسخہ دست بہ دست موصول ہوا۔ یہ میرے والد کی طرف سے میرے شاعرہ ہونے پر انعام تھا...تہہ در تہہ اک جہانِ معانی، اک اشارہ، ایک استعارہ، ایک علامت''۔

یہ واقعہ سناتے ہوئے پنہاں کی آنکھوں میں اپنی فتح مندی کی چمک نمایاں تھی۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں میر اور غالب ہیں۔ پہلے میر زیادہ تھے اب غالب زیادہ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام شعرا و شاعرات کی قدر دان ہیں۔

ڈاکٹر پنہاں کو ''اردو مرکز انٹرنیشنل''، لاس اینجلس کی جانب سے ۲۰۰۲ء میں ۲۰۰۱ء کی بہترین شاعرہ کا ''احمد اڈایا'' انعام مبلغ پانچ ہزار ڈالر ($5000.00) دیا گیا۔ جناب احمد اڈایا کا تعلق

میمن کمیونٹی سے ہے۔ وہ شاعر نہیں مگر علم و ادب کے عظیم قدر دانوں میں سے ہیں۔

Dr. Pinhaan,
1752 Alpine Drive, Carrollton, TX 75007, USA

انتخابِ کلام:

اے خدا انساں اگر راز آشنا ہوجائے گا
کیا تجھے لگتا ہے پھر یہ بھی خدا ہوجائے گا

⌛◆⌛

زندگی سے جل کے دل ایسا دیا ہوجائے گا
جو بجھانے آئے وہ طوفاں ہوا ہوجائے گا

⌛◆⌛

حاجتیں لے کر فرشتے اس کے در پہ آئیں گے
آدمی ارض و سما سے ماورا ہوجائے گا

⌛◆⌛

لمحۂ موجود پر ماضی کی سازش کا اثر
کچھ نہیں معلوم مستقبل میں کیا ہوجائے گا

⌛◆⌛

مشکلوں ہی نے مجھے جینے کا بخشا حوصلہ
جانتی ہوں درد ہی میری دوا ہوجائے گا

⌛◆⌛

کیا اسے بھی آپ پتھر سا بنالیں گے حضور
موم سا یہ دل مرا جب آپ کا ہوجائے گا

⌛◆⌛

آپ اپنی ذات میں پنہاںؔ ابھی ہر معجزہ
ایک دن انسان خود پر رونما ہوجائے گا

⌛◆⌛

باسم ربّی

عجب ماحول یہ دیکھا ہے اپنے شہر میں ہم نے!
کہ سُورج ڈوب جاتا ہے مگر سائے نہیں جاتے!

تنویر پھولؔ

کراچی، پاکستان

تنویر پھولؔ نے کہیں پڑھا ہوگا کہ میں ''سخنور پنجم'' پر کام کر رہی ہوں، انہوں نے اپنی کتابیں مجھے بھجوادیں۔ ان کی صاحبزادی نے نیویارک سے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے سوال نامہ بھجوادیا، کیوں کہ جس شخص نے اردو زبان وادب کے لئے اتنی محنت کی ہے اُس کا حق بنتا ہے کہ اُسے میں اور لوگوں سے بھی متعارف کرادوں گو کہ اُس کا کام اور کلام خود اس کا تعارف ہے۔ مگر یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے کام کی روشنی کو دور تک پھیلانا چاہتا ہے۔ جیسے ڈیلاس، امریکہ کے ایک شاعر نے مجھ سے کہا ... ''سخنور میں شمولیت پر مجھے یوں خوشی ہوگی کہ میں بڑے شعرا کے درمیان موجود ہوں۔ اس حوالے سے لوگ مجھے بھی پڑھیں گے''۔

پھر جب میں تعارف لکھنے بیٹھی تو تنویر پھولؔ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو مجھے اُس وقت سے جانتے ہیں جب میں روزنامہ ''جنگ، کراچی'' میں صفحۂ خواتین کی ایڈیٹر تھی۔ میں تو اپنے بہت سے مداحوں کو بھول چکی ہوں۔ ایک جم غفیر تھا طالب علم لڑکیوں اور لڑکوں کا، خواتین کا، جن کی میں آئیڈیل (ideal) تھی۔ بہت سوں کی میں نے ذہنی اور ادبی تربیت کی۔ ان میں سے کئی نے ادب وصحافت میں اپنی محنت سے جگہ بنائی۔ ''جنگ'' کا صفحۂ خواتین ان کے لئے ایک ''تربیت گاہ'' تھا۔ بر منگھم،

برطانیہ کی معروف افسانہ نگار اور شاعرہ طلعت سلیم بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ ان کا تعارف میری کتاب ''گفتنی اول (نثر نگاروں کا تذکرہ)'' میں موجود ہے۔ پچھلے دنوں جب برمنگھم میں ان سے ملاقات ہوئی تو طلعت سلیم نے ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء میں میری طرف سے انعام کے طور ملی ہوئی کتاب مجھے دکھائی۔ اس وقت میں روزنامہ ''انجام'' میں صفحۂ خواتین کی ایڈیٹر تھی اور اسی زمانے میں میرے کام سے متاثر ہو کر محترم میر خلیل الرحمٰن مرحوم بانی و ایڈیٹر روزنامہ ''جنگ'' نے ''صفحۂ خواتین، جنگ'' کی ایڈیٹر کے طور پر مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

اب یہ سارے واقعات ایک کہانی بن گئے ہیں اور مشعلِ راہ بھی کہ اچھے کام کے اثرات تاخیر سے ہی سہی، مگر تعمیرِ کردار میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

؎ سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

اُن لالہ و گل میں سے ایک تنویر پھولؔ بھی ہیں۔ اُنھوں نے بڑی دلجمعی سے میرے سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات سے تنویر کے گہرے مطالعے کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔

تنویر پھولؔ کہتے ہیں... ''میرا خاندانی نام تنویر الدین صدیقی ہے اور ادبی نام تنویر پھولؔ۔ پھول عرف تھا جو بعد میں تخلّص کی شکل اختیار کر گیا۔ میں ۳/ستمبر ۱۹۴۷ء کو صوبہ بہار کے شہر مظفر پور میں پیدا ہوا۔ تقریباً چار سال کی عمر میں والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے کراچی آ گیا۔ میں نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول میں درجہ ہفتم میں داخلہ لے لیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے اسکول کے ہر امتحان میں فرسٹ پوزیشن (first position) حاصل کی۔ میں نے ڈی جے کالج اور اردو کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں درجہ اول میں گریجویشن (graduation) کیا اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ کراچی سے تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔ اُس وقت ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ بسلسلۂ ملازمت تقریباً اٹھائیس (۲۸) سال بینک دولت پاکستان سے منسلک رہا۔ میں نے تقریباً بارہ سال ماہنامہ 'غنچہ، کراچی' کی ادارت کی۔ یہ ماہنامہ ۱۹۶۰ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۹۷۹ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ 'غنچہ کلب' کے نام سے ایک ادبی تنظیم بھی قائم ہو گئی تھی جس کا معتمدِ مالیات میں تھا''۔

تنویر نے یاد دلایا ...''۱۹۶۹ء میں 'غنچہ کلب' کے زیرِ اہتمام آرٹس کونسل پاکستان میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت محترمہ سلطانہ مہر نے کی تھی۔ وہ اُس وقت روزنامہ ''جنگ'' سے منسلک تھیں۔ اُن کو رہائش گاہ سے آرٹس کونسل تک لانے والوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس موقع پر ایک مجلّہ ''شعاعِ ادب'' بھی شائع کیا گیا تھا جس کے مرتبین میں میں بھی شامل تھا۔ اس مجلّے کے صفحہ انچاس (۴۹) پر محترمہ سلطانہ مہر کا مضمون ان کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ سلطانہ مہر صاحبہ دیارِ غیر میں ہونے کے باوجود آج بھی 'سخنور' کے ذریعے اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا کام سرانجام دے رہی ہیں جو فروغِ اردو کی راہ میں ایک سنگِ میل

ہے۔ ان کا خاندانی نام فاطمہ ہے۔ اسی تناظر میں راقم الحروف نے یہ قطعہ کہا ہے۔

خوش بوئے مہر و محبت ہے "سخنور" میں نہاں
مہر کے مانند روشن کام سلطانہ کا ہے
گلشنِ شعر و ادب میں پھول ہے یوں شادماں
آبیاری فاطمہ نے کی ہے باغِ علم کی

سوال (۲) کے جواب میں عرض ہے ... "میری ادبی سرگرمیوں کا آغاز مارچ ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ ابتدا تو نثر نگاری سے کی تھی لیکن نثر نگاری کی نسبت شاعری کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ بے مقصد شاعری نہ ہو۔ میرا پہلا شعر یہ تھا۔

نقش اُلفت کا ہم اُبھاریں گے
زُلفِ گیتی کا خم سنواریں گے

مجھے تاریخ گوئی سے بھی کافی دلچسپی ہے، جس میں شاعری اور ریاضی کا امتزاج ہو۔ میٹرک کے امتحان میں مجھے ریاضی میں سو فیصد نمبر ملے تھے۔ تیرہ (۱۳) سال کی عمر میں سب سے پہلے میں نے واقعۂ کربلا کی تاریخ نکالی تھی۔ یہ قطعہ میرے شعری مجموعے 'دُھواں دُھواں چہرے' میں شامل ہے"۔

سوال (۳) کے جواب میں تنویر پھولؔ نے پروفیسر آفاق صدیقی کی یہ رائے پیش کی،
"... تنویر پھولؔ کثیر الجہات شاعر ہیں اور پچھلے تیس (۳۰) برسوں میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً 'گلشنِ سخن' ۱۹۷۰ء میں، 'خوشبو بھینی بھینی'، 'رشکِ باغِ ارم'، 'انوارِ حرا' ۱۹۹۷ء میں، 'تنویرِ حرا' اور 'دھواں دھواں چہرے' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں میں حمد و نعت، قومی و ملی منظومات، بچوں کے لئے لکھی گئی نظمیں اور قرآن حکیم کی منظوم تفہیم کے علاوہ، بہت سی غزلیں اور متنوع موضوعات پر تحریر کردہ نظمیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ تنویر پھولؔ نے کئی شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ 'رباعی' کہنا ایک مشکل فن ہے لیکن اس میدان میں بھی تنویر پھولؔ کامیاب رہے ہیں اور مناسب و موزوں الفاظ میں 'دوہے' بھی خوب کہے ہیں۔ زیادہ تر شعری تخلیقات مُقفّٰی ہیکوں میں ہیں مگر کچھ 'آزاد نظموں' میں بھی اُن کی مشقِ سخن کا بھرپور عکس ہے۔ تنویر پھولؔ نے اپنی غزلوں میں جہاں ایک طرف آدابِ غزل گوئی کے فنی تقاضوں کو بڑی مشاقی سے پورا کیا ہے وہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مضامینِ غزل میں بڑا تنوع ہے۔ اخلاقی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر تنویر پھولؔ نے ایسے ایسے فکر انگیز اشعار نکالے ہیں کہ شائقینِ ادب کے لئے ان میں بڑی کشش ہے۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ تنویر پھولؔ نے ہر صنفِ سخن میں اپنی شاعری کا جادو جگایا اور وہ بھی ایسی طرح داری سے کہ زبان و بیان اور فنِ شاعری کے محاسن کو بہر طور پیشِ نظر رکھا اور برتا"۔

چوتھے سوال کے جواب میں تنویر یوں گویا ہیں... "اردو دُنیا کی بڑی زبانوں میں ایک ہے۔ یہ ایک ایسی اجتماعی زبان ہے، جس میں پورے برِصغیر کی زبانوں کا بھرپور حصہ ہونے کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا عمل دخل بھی ہے اور اس نے سب سے کم عمر زبان ہونے کے باوجود علم دینی و دُنیاوی کا بڑا ذخیرہ اکھٹا کر رکھا ہے۔ اس زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہر قسم کا تلفظ آسانی سے ادا کر سکتی ہے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ چین، کوریا اور ملائیشیا وغیرہ نے پاک و ہند کے

بعد آزادی حاصل کی ہے اور انہوں نے اپنی زبان کو اپنا کر ہی پاک وہند سے کئی گنا زیادہ ترقی کی ہے جب کہ اہل اردو ابھی تک احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ اس روّیے کے باوجود اردو کو قدرتی طور پر کچھ نہ کچھ پزیرائی مل رہی ہے جس کی مثال چین کے انتخاب عالم اور جرمنی کی ڈاکٹر این میری شمل ہیں۔ خانہ کعبہ کی زیارت کے وقت مسجد الحرام میں اردو عبارت 'دفتر برائے گم شدہ اشیا' لکھی دیکھی۔ اسی طرح مدینہ منورہ کی مسجد قبلتین میں بھی تحویل قبلہ کے متعلق اردو عبارت لکھی ہوئی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ زبان آسانی سے ختم نہیں ہوگی اور ہر صورت میں اپنا وجود برقرار رکھے گی۔ ہمسایہ ملک بھارت میں صوبہ جاتی بنیاد پر 'اردو اکادمیاں' قائم کی گئی ہیں، مثلاً بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی وغیرہ۔ اسی طرح پاکستان میں بھی ہونا چاہیئے۔ ہر علاقے میں سرکاری سطح پر لائبریریوں کا قیام اور ان کے لئے کتب کی خریداری کا انتظام ہونا چاہیئے۔ لائبریری میں تعلیم بالغان کے گوشے بھی مخصوص کیئے جائیں۔ اس طرح خواندگی کا تناسب بھی بڑھے گا۔ ہمیں کتاب کلچر کو فروغ دینا چاہیئے۔ علم اور قلم کی یکجائی سے کتاب وجود میں آتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

خدا نے کیا دیا پیغام وحیِ اوّل میں قلم سے علم سکھانے کا سلسلہ دیکھو

اردو کے لئے اپنا رسم الخط ہی مناسب ہے کیونکہ عربی اور فارسی زبانوں سے اس کا گہرا رابطہ ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کی چاروں صوبائی زبانوں کا رسم الخط بھی حروف القرآن سے مشابہ ہے۔ اگر ہم رومن رسم الخط اپنائیں تو 'صدا' اور 'سدا' میں فرق کس طرح ظاہر کریں گے۔

بے شک اردو ادب کی جڑیں اس کی زمین میں پیوست ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق سلطنتِ مغلیہ کے خاتمہ نے فارسی کے تہذیبی اثرات کو بڑی حد تک کم کر دیا اور اس کی جگہ مغربی خیالات، اسالیب بیان، الفاظ و تراکیب، لغات و اصطلاحات کا زور بڑھا۔ اس عہد سے اردو کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے 'اردو کا عہد جدید' کہتے ہیں۔ اس دور کے نقیب سر سید احمد خان ہیں۔ سر سید اور اُن کے رفقاءٗ (جو اردو ادب کے عناصر خمسہ ہیں) کی کوششوں سے اردو زبان کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ بعد میں آنے والے دور میں نیاز فتحپوری نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اس میں تحقیقی مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا اُسے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اردو کی لسانی حیثیت، اس کے تاریخی ارتقا، اس کے سرمایۂ لغت، اس کی شاعری اور ادب اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کا مطالعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو ادب کی جڑیں اس کی زمین میں پیوست ہیں۔ مزید یہ کہ اردو شاعری اور دیگر اصناف ادب میں برِ صغیر پاک وہند کے جہادِ آزادی کی پوری تاریخ جھلکتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اُن مسائل کو اپنا موضوع بنایا جو آج کی زندگی کے مسائل ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کی اردو شاعری اور اردو ادب ایک مسلسل ادبی روایت سے اپنا سلسلہ قائم رکھتے ہوئے بھی دورِ جدید کے شعور سے آشنا ہے''۔

سوال (۶) کے سلسلے میں تنویر پھولؔ کا کہنا ہے..'' مختصر الفاظ میں اظہارِ خیال کے لئے غزل

ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کیئے جاسکتے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے غزل کی نسبت نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے کیونکہ اس میں تفصیلی اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں 'مثنوی' مناسب رہتی ہے۔ دوسرے نمبر پر 'مسدس' سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ آج کل آزاد نظمیں بھی کہی جارہی ہیں لیکن 'نثری نظم' کوئی چیز نہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہا جائے 'مردانہ عورت' یا 'زنانہ مرد'۔ نثر کے معنی ہیں 'بکھرا ہوا' جب کہ نظم کے معنی ہیں 'موتیوں کو ڈورے میں پرونا' یا 'ترتیب دینا'۔ نظم اور نثر دونوں متضاد الفاظ ہیں۔ اس لئے نثری نظم ایک مہمل ترکیب ہے''۔

ان کے پسندیدہ شعرا میر، آتش، اقبال، انیس، حفیظ جالندھری اور احسان دانش ہیں۔

تنویر کہتے ہیں... ''اردو زبان کو اپنا کر گھاٹے میں رہنے کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ اہل اردو اور تہذیب وثقافت کی سنجیدہ قدروں سے انحراف نہ کرنے والوں کی آزمائش بھی ہوسکتی ہے جس کا تذکرہ قرآن پاک میں ہے۔ راقم الحروف نے اس کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے:

پریشانی میں کر کے مبتلا ہم امتحاں لیں گے
تمہارا ضبط دیکھیں گے، تمہارا صبر دیکھیں گے
کبھی کچھ خوف و فاقہ سے، زیاں سے مال اور جاں کے
کبھی اچھائی کا ثمرہ بھی فوراً تم نہ پاؤ گے

غالب بھی اپنے دور میں گھاٹے ہی میں رہے تھے جس کا اظہار اُن کی تحریروں اور اُن کے تذکروں میں ملتا ہے''۔

تنویر نے اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے کہا... ''یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ صدر، کراچی میں اکبر روڈ پر ادبی رسالے 'نقش' کا دفتر تھا جس کے ایڈیٹر شمس زبیری تھے۔ یہاں مرحوم جوش ملیح آبادی بھی آیا کرتے تھے۔ میں اُس زمانے میں ڈی جے کالج میں تھا اور اکثر شام کو 'نقش' کے دفتر اپنے دوست سید ظہیر حسین سے ملنے آتا تھا جو شمس زبیری مرحوم کے معاون تھے۔ میرے ساتھ محمد ظریف بھی ہوتے تھے جو آج کل صادق آباد (رحیم یار خان) کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ ایک شام جب ہم وہاں پہنچے تو جناب جوش ملیح آبادی شمس صاحب سے خدا کے وجود پر بحث کر رہے تھے اور اُسے تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ بڑے زور وشور سے بحث جاری رہی لیکن جوش اپنی ضد پر اڑے رہے۔ آخر وہ واپس جانے کے لئے کھڑے ہوئے اور کہا... ''اچھا بھئی شمس! خدا حافظ''۔ شمس صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا... 'خدا وہ ہے جو منکروں سے بھی اپنے آپ کو منوا لیتا ہے'۔

Mr. Tanwir-ud-din Siddiqi Phool,
R- 340, Sector 15-A/3-B, Gulshan-e-Sir Syed, Karachi, Pakistan
E-mail:tanwirphool@yahoo.com

انتخابِ کلام:

یاں کا ماحول ہے وسوسوں کی طرح
دل میں چبھتا ہے جو کرچیوں کی طرح

شہر میں کیا ہوا کچھ پتا تو چلے
لوگ جا رہے ہیں قافلوں کی طرح

تتلیاں شاخِ گل پر تو آئیں مگر
بے وفا بن گئیں گل رخوں کی طرح

منتظر ہے سماعت صدا کے لئے
تم تو کہتے نہیں کچھ بتوں کی طرح

آج ہمسایہ غافل ہے ہمسائے سے
آج دیواریں ہیں سرحدوں کی طرح

آپ چہرے پہ چہرہ سجا لیجئے
دشمنی کیجئے دوستوں کی طرح

وعدہ کرتے ہیں لیکن نبھاتے نہیں
آپ تو ہوگئے شاعروں کی طرح

خوف اتنا ہے دہشت کے عفریت کا
شہر ویران ہیں جنگلوں کی طرح

شبنمی شبنمی آنکھ اُن کی ہوئی
اشک آئے نظر قمقموں کی طرح

سب کو سیراب کرتے رہو پھولؔ تم
کشتِ دل میں رہو ندیوں کی طرح

❖❖❖

جیسے حالات میں رہو تابش
جن خیالات میں رہو تابش
تم کو اتنا دھیان رکھنا ہے
اپنے اوقات میں رہو تابش

تابش خانزادہ 1/20/3

جاوید خان تابشؔ خان زادہ

لاس اینجلس، امریکہ

میں اُسے صرف تابشؔ خانزادہ کے نام سے جانتی تھی۔ اُس سے ملاقاتیں بھی مشاعروں کی محافل میں ہوا کرتی تھیں۔ خوش شکل، سیدھا سادا سا ایک نوجوان، ساتھ میں اُسی طرح کی خوش رنگ چہرے والی بھولی بھالی فاطمہ نامی ایک لڑکی بھی نظر آتی تھی جو اس کی شریکِ حیات ہے۔ دوسرے مرد شعرا اور سامعین چہلیں کرتے، چپکے چپکے مدہم لہجے میں کھسر پھسر کرتے، فقرے بھی کستے، پھر خوفناک آوازوں میں قہقہے بھی لگاتے نظر آتے۔ مگر ایک شخص جس کا نام تابشؔ خان زادہ تھا، وہ اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا نظر آتا یا پھر کوئی اپنی یاوہ گوئی کی طرف متوجہ کراتا تو وہ دھیمے سے مسکرا دیتا۔

پھر مجھے اس کی طویل طویل مگر دل میں اُتر جانے والی نظموں نے متاثر کیا۔ ہفت روزہ ''پاکستان لنک'' میں اس کے کالم پڑھتی رہتی تھی جو دل میں گھر کر جانے والے واقعات، ان کے انجام اور آخر میں تابشؔ کی رائے کی حلاوتوں میں گھلے ہوئے ہوتے۔ اُن کالموں میں کبھی وہ لکھتا... ''اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے اپنے اندر خود کو تلاش کیجیے۔ جو لوگ اپنی ذات کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں وہ اپنا مقصدِ حیات پا لیتے ہیں''۔ ایک اور کالم میں اس نے لکھا تھا،'' ہٹلر نے کسی سے کہا تھا کہ مسلمان ایک دوسرے سے لڑ بھڑ سکتے ہیں لیکن جب اُنہیں کوئی غیر ملکی طاقت چھیڑتی ہے تو وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ معلوم

نہیں کہ ہٹلر کے قول میں کہاں تک تاریخی حقیقت ہے ورنہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ طاغوتی طاقتیں اُن پر اپنی مرضی مسلط کر رہی ہیں اور یہ آپس میں لڑ جھگڑ کر اپنی طاقت کو کمزور تر کیئے جا رہے ہیں''۔

ایک اور کالم ''رضا'' میں اس نے حضرت رابعہ بصریؒ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا، ''انہوں نے ساری زندگی یہی دعا کی کہ میرے رب اگر میں تیری عبادت جنت کے حصول کی لالچ میں کرتی ہوں تو جنت مجھ پر حرام کر دے اور اگر دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو دوزخ مجھ پر واجب کر دے۔ جب کہ میں تیری عبادت تیری رضا کے لئے کرتی ہوں کہ تو مجھ سے راضی رہے''۔ تابش نے آگے لکھا کہ اُس کی نظر میں خدا اور انسان کا افضل ترین تعلق خدا کی رضا جوئی میں پوشیدہ ہے۔

تابش نے صرف کالم ہی نہیں لکھے، صرف شاعری ہی نہیں کی، بلکہ اُس نے اردو زبان کو حیاتِ جاوداں دینے کے لئے عملی جدوجہد کی ہے۔ تابش گو ایک ادارہ نہیں ہے مگر اُس نے اور اُس کی شریکِ حیات فاطمہ نے اپنے بچوں کے ساتھ مل کر ایک ادارے کا کام کیا ہے اور وہ ہے ''اردو فونکس''، ایک ایسا ویڈیو ٹیپ جس کو وی سی آر پر بچوں کو دکھا کر انہیں اُن کے ساتھ اُن بڑوں کو بھی جو اردو نہیں جانتے، اردو پڑھائی لکھائی جا سکتی ہے۔ یہ ویڈیو ٹیپ انگریزی کی روزمرہ گفتگو کا اردو متبادل ہے۔ یہ ان والدین کے لئے بھی بہت مفید و مددگار ثابت ہو سکتا ہے جو انگریزی بول چال میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یعنی اس ویڈیو ٹیپ کی مدد سے جہاں انگریزی نہ جاننے والے بڑے اردو کے ذریعے انگریزی الفاظ سے آشنا ہوں گے وہیں بچے انگریزی الفاظ کے متبادل اردو کے الفاظ سیکھیں گے کیوں کہ یہ ٹیپ بہت ہی سلیس، عام فہم اور روزمرہ کے استعمال کی زبان میں تیار کیا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے اور اس کے خاصے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔

ہم اردو والے شور بہت کرتے ہیں، مشورے بہت دیتے ہیں مگر جاوید خان نے بہت سنجیدگی اور دیانت داری سے اردو زبان سکھانے کے لئے حقیقی معنی میں جہاد کیا ہے۔ کسی قوم کی شناخت اس کی زبان میں ہوتی ہے اور یہ ہی اس کے تہذیبی ورثے کی امین بھی۔ بقول کسے جس نے اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھانے میں غفلت کی اُس نے بغیر کسی خطا کے انہیں تہذیبی جلاوطنی کی سزا دے دی۔ چونکہ اہل یہود اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اپنی زبان کے بغیر کوئی قوم اپنی انفرادیت و تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی اس لئے اسرائیل بسانے کے بعد یہودی قوم نے اپنی پرکھوں کی مردہ و متروکہ زبان ''عبرانی'' کو حیات نو دی ہے اور اب وہ پورے ولولے اور جوش سے اس کی ترویج و اشاعت کر رہے ہیں۔

تابش خان زادہ کا اصلی نام جاوید اقبال اور خان زادہ ان کا خاندانی یا نسبتی نام ہے۔ تابش اُن کا تخلص ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان، پاکستان کی سرزمین پر ۲۱ / اگست ۱۹۵۸ء کو جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم میٹرک تک وہیں حاصل کی۔ پھر ملتان سے بی ایس سی کیا۔ ساتھ ہی ملازمت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں فیصل آباد سے بائیو کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا۔ اسی سال بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی بھاولپور میں لکچرار ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں سیکرامینٹو (Sacramento) کیلیفورنیا، امریکہ پہنچے۔

حصولِ تعلیم کے لئے طرح طرح کے بوجھ ڈھوئے اور بغیر ہمت ہارے وہاں سے بھی بائیو کیمسٹری میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ اسی دوران میں ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس (Department of Justice) میں ٹوکسی کولوجی (Toxicology علم سمیات) کے شعبہ میں ملازمت مل گئی، جہاں فوج داری کے مقدموں میں ملوث نشہ آور دوائیں کھانے والوں اور زہر خورانی کے کیسوں میں متوفی اشخاص کے خون اور دیگر رطوبتوں کا سائنسی معائینہ کیا جاتا ہے۔

تابش کی شادی ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔ ان کے دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ تابش بتا رہے تھے کہ انہیں بچپن سے ہی مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ چوتھی جماعت میں تھے تب ہی علامہ اقبال کا ''شکوہ، جوابِ شکوہ'' زبانی یاد کرلیا تھا۔ ہر روز آٹھ گھنٹے اسکول کے درسیات میں گزارنے کے باوجود، اپنے ذاتی اخراجات کے لئے دوپہر ڈھائی بجے سے رات ساڑھے دس بجے تک نوکری کرتے تھے اور اس کے بعد مطالعہ۔ تابش نے بتایا کہ آٹھ سال تک وہ تین گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سوئے۔ تابش نے ایک اور جہاد بھی کیا۔ اُس نے ۱۹۹۲ء میں انگریزی زبان میں ایک مفید کتاب ''پیرنٹنگ ان اسلام (Parenting in Islam اسلام کے نقطۂ نظر سے بچوں کی پرورش) لکھی ہے۔ جاوید خان عرف تابش نے بتایا ... ''یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ میں نیا نیا امریکہ میں آیا تھا۔ ایک جنازے میں قبرستان جانا ہوا۔ وہاں ایک لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مسلمان ہوں۔ چونکہ وہ خود کفن دفن کی مسلم رسومات سے ناواقف تھا وہ تین دن سے کسی مسلمان کو ڈھونڈ رہا تھا تاکہ اس کے باپ کے مورچری (mortuary مردہ خانہ) میں رکھی ہوئی لاش کی اسلامی طریقے پر تجہیز و تدفین ہوسکے۔ یہ دکھ تھا جو (کہ یہاں پلنے والے بچے ہمارے مذہبی رسومات سے ناواقف اور ہمارے جدی ورثے سے محروم ہیں) اس کتاب کو لکھنے کا محرک بنا تاکہ ہماری نسلوں کو پتا چلے کہ اسلام کیا ہے۔

شاعری کا محرک بھی وہی زمانہ تھا۔ میں نے یہ کتاب تبصرے کے لئے اخبارات کو بھجوائی۔ ''پاکستان لنک'' کے سابق ایڈیٹر فیض رحمٰن صاحب نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اردو میں لکھوں۔ چنانچہ میں نے کالم لکھے، نظمیں لکھیں، غزلیں بھی کہیں مگر میرا رجحان نظموں کی طرف زیادہ تھا اور موضوعاتی نظموں کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ میری نظمیں ''پھول''، ''ماں نے کہا''، ''خدا'' اور ''وہ عورت'' خاصی شہرت پاگئیں۔ اب انشاءاللہ میرے کلام کا مجموعہ ''وہ ایک عورت'' سال رواں یعنی ۲۰۰۳ء میں شائع ہوجائے گا''۔

تابش نے کہا... ''میں نثری نظم کی مخالفت نہیں کرتا۔ تجربات ہونے چاہئیں اور جنہیں اس صنف پر عبور حاصل ہے، یقیناً ان کے تجربات کامیاب ہوں گے۔ مگر میں نے نثری نظم نہیں کہیں۔ جس طرح میرے لیے غزل کہنا آسان نہیں''۔

غالب اور اقبالؒ تابش کے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ وہ لاہور کے مشہور شاعر ساغر صدیقی کے کلام سے بھی متاثر ہیں۔ تابش نے اس موقعہ پر ساغر کا یہ قطعہ سنایا۔

اے کہ تخلیقِ بحر و بر کے خدا   مجھ پہ کتنا کرم کیا تو نے
میری کٹیا کے دیپ کی خاطر   آندھیوں کو جنم دیا تو نے

ہمارا آج کا ادب اپنے عہد کی ترجمانی کررہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں تابش کا کہنا ہے کہ لوگوں نے مطالعہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ریسرچ ورک (research work تحقیقی کام) نہیں کرتے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی (مقیم ٹورنٹو، کنیڈا)، ڈاکٹر گیان چند جین اور انہی طرح کے لوگ، جو محنت کرتے ہیں، کم رہ گئے ہیں۔ پاکستان میں بھی اردو کی سرپرستی کم ہوگئی ہے حالانکہ اردو کا مستقبل روشن پاکستان میں ہی ہوسکتا ہے کہ یہ وہاں کی قومی زبان ہے۔ مغل ترکی زبان لے کرآئے۔ پھر انہوں نے فارسی اپنائی لیکن داراشکوہ اور بہادر شاہ ظفر کے دور تک مغل دربار میں اردو اپنالی گئی۔ اور اب اگر ہم اس کا رسم الخط بدلیں گے تو اپنے ہاتھوں سے اردو کے جنازے کو دفن کردیں گے"۔

جاوید ایک سلف میڈ (self-made اپنے بل بوتے پر خود کامیاب ہونے والا) انسان ہیں۔ اس لئے انہوں نے اُن لوگوں کے لئے ایک ادارہ بنام ہلپ فاؤنڈیشن (Help Foundation) بنایا ہے، جس کی مدد مخیر حضرات کررہے ہیں تاکہ غریب طالب علموں کو اسکالرشپ (scholarship وظیفہ) دے کر ان کی مدد کی جائے، خصوصاً ان طالب علموں کی جو گریجویشن انجینیئرنگ یا میڈیسن کی تعلیم مکمل کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل پتے پر ان سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

Mr. Javed Khan, HelpFoundation, POBox 55309, Riverside, CA 92517, USA

جاوید اپنی زندگی کے بلکہ اپنی جد وجہد کے واقعات سُنا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے انہیں زندگی میں کبھی شرارت کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اب اپنے بچوں، تیرہ (۱۳) سالہ احمد اور دس (۱۰) سالہ سعدیہ کے ساتھ گیمز (games) کھیل کر اور کارٹون فلمیں دیکھ کر اپنا بچپن لوٹانے کی کوشش کررہے ہیں۔

تابش خان زادہ تم اپنے قارئین سے کچھ کہنا چاہو گے؟ میں نے رخصت ہونے سے پہلے پوچھا۔ "ہاں، ضرور ضرور"، اُس نے گرم جوشی سے کہا، "جب خدا نے خوب صورتی پیدا کی تو اس کا ننانوے فیصد حصہ اپنے لئے رکھا اور ایک فیصد اپنی مخلوق کے لئے۔ اس ایک فیصد حصے میں سے ننانوے فیصد حصہ حضرت یوسف کو عطا کیا اور باقی تمام مخلوق کو۔ اس ایک فیصد حصے میں سے ننانوے فیصد عورتوں کو عطا کیا اور باقی مردوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح جب خدا نے محبت بنائی تو اس کا ننانوے فیصد حصہ اپنے لئے رکھا اور باقی ایک فیصد اپنی مخلوق عطا کیا۔ اور اس ایک فیصد میں سے ایک فیصد مردوں کو عطا کیا اور باقی ننانوے فیصد عورتوں کو عطا کیا۔ ایک عورت اسی لئے سراپا محبت ہے۔ اس کا ہر روپ انمول ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ شاعروں، ادیبوں اور مصوروں نے عورت کو صرف صرف محبوبہ کے روپ میں دیکھا ہے۔ میرے خیال کے مطابق کسی بھی محبوبہ نے مرد کو بدنامی کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیا۔ مجنوں، رانجھا اور اس طرح کے باقی عاشق ہمیشہ عاقبت بدر اور بدنام زمانہ لوگ تھے۔ ان عاشقوں نے نہ صرف ان خواتین کو بدنام کیا بلکہ ان کے خاندان کی نیک نامی پر باعث حرف ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے

ایک سے زیادہ عورتیں ہیں۔ عورت اس دنیا میں چار مختلف روپوں میں آئی ہے۔ عورت کے باقی تمام روپ ان چار روپوں سے کسی نہ کسی طرح منسلک ہیں۔ مہد سے لحد تک عورت مرد پر خدا کی بخشی ہوئی محبت ہر روپ میں نچھاور کرتی رہتی ہے۔ میری یہ نظم ان چار روپوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ اپنی یہ نظم میں تمام خواتین قارئین کی نذر کرتا ہوں اور اگر آپ میرے مرد قاری ہیں تو آج اپنی زندگی میں محبت کے ان مناروں کو خراجِ تحسین پیش کیجیے۔

Mr Javed Khan Tabish Khanzada,
13723, Stockbrook Road, Moreno Valley, CA 92553, USA

انتخابِ کلام (وہ ایک عورت)

پہلا روپ

وہ ایک عورت
کہ جس نے مجھ کو گلے لگایا
مجھے محبت کا گُر سکھایا
پکڑ کے انگلی مجھے چلایا
اور لوریوں سے مجھے سلایا
جو میں نہ سویا وہ جاگتی ہے
وہ رات آنکھوں میں کاٹتی ہے
بہت ہی مجھ پر وہ مہرباں ہے
یقین کر لو وہ میری ماں ہے
وہ ایک عورت
کہ جس نے مجھ کو گلے لگایا
مجھے محبت کا گُر سکھایا

دوسرا روپ

وہ ایک عورت
جو مجھ سے بچپن میں کھیلتی ہے
کبھی کبھی مجھ کو چھیڑتی ہے
تو میں بھی اس کو چھیڑتا ہوں
سلائیاں تک اُدھیڑتا ہوں
میں اس کی گڑیا کو توڑتا ہوں
وہ سر مرا اُس سے پھوڑتی ہے
میں اس کو چٹیا سے کھینچتا ہوں
وہ کاٹنے مجھ کو دوڑتی ہے
وہ میرے رازوں کی آمنہ ہے
وہ میری چاہت مری بھلا ہے
اُسے محبت مجھے لگن ہے
کوئی نہیں وہ بہن ہے میری
وہ ایک عورت
کہ جس نے مجھ کو گلے لگایا
مجھے محبت کا گُر سکھایا

تیسرا روپ

وہ ایک عورت
جو ماں کی بابا کی راحتوں کو
جو بھائی بہنوں کی چاہتوں کو
سہیلیوں کی رفاقتوں کو
جو اپنے گھر کی محبتوں کو
میری محبت میں چھوڑتی ہے
وہ سارے رشتوں کو توڑتی ہے
وہ میری راتوں کی روشنی ہے
میری خزاں میں بہار ہی ہے
میری تو کُل کائنات ہے وہ
میری شریکِ حیات ہے وہ
وہ ایک عورت
کہ جس نے مجھ کو گلے لگایا
مجھے محبت کا گُر سکھایا

آخری روپ

وہ ایک عورت ہے
جو میرے آنگن میں دوڑتی ہے
جو کان میرے مروڑتی ہے
جو میرے گالوں کو چومتی ہے
جو میری انگلی کو تھامتی ہے
جو میری باہنوں میں جھولتی ہے
جو میرے کندھوں پہ بیٹھتی ہے
جو میرے بالوں سے کھیلتی ہے
جو میرے سینے پہ لیٹتی ہے
وہ جان دل مجھ پہ وارتی ہے
مجھے وہ ابو پکارتی ہے
وہ ایک عورت
کہ جس نے مجھ کو گلے لگایا
مجھے محبت کا گُر سکھایا

افضال مسرور تبسم

نوٹنگھم، برطانیہ

۱۹۵۹ء کی بات ہے سیالکوٹ کے سینما گھر ،لالہ زار، میں پاک و ہند مشاعرہ جناب جوش ملیح آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اور وہاں افضال مسرور تبسم کی غزل کے دو اشعار پر بقول ان کے جوش صاحب نے خوب داد دی اور مشاعرے کے بعد کندھے پر تھپکی بطور تصدیق دی۔ غزل کے وہ دو شعر یہ ہیں۔

سن کر سوال قبر میں معبود کون ہے ۔۔۔ بے ساختہ زباں پہ ترا نام آ گیا
دور خزاں میں ان کی نظر مہرباں ہوئی ۔۔۔ ٹوٹا ہوا تھا جام وہی کام آ گیا

فیروز پور، ہندوستان میں پیدا ہونے والے افضال مسرور نے اسلامیہ ہائی اسکول فیروز پور اور پھر مرے کالج سیالکوٹ اور بعد میں گارڈن کالج راولپنڈی میں تعلیم حاصل کی۔ نو عمری سے ہی ادب و شاعری میں دلچسپی رہی کیوں کہ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ والد مرحوم مسرور تخلص کرتے تھے۔

انہوں نے اپنی پہلی نظم جس مشاعرے میں پڑھی اس وقت افضال مسرور تبسم آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس کے بعد کالج کے زمانے میں بھی قافیے درست کرنے کی تھوڑی بہت مہلت ملتی رہی۔ لیکن شاعری کے ذوق کو جلا ۱۹۵۲ء میں ملی جب یہ وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر غم روزگار کی دل فریبی آزمانے سعودی عرب چلے گئے۔ اس ضمن میں سعودی عرب کی سرزمین پر پہنچنے کے بعد

انہوں نے جو پہلا شعر کہا تھا وہ یہ ہے

آتا نہ یوں میں اپنے وطن سے کبھی مگر   صحرا کی وسعتوں سے عقیدت ہے کیا کروں

کیوں کہ جواں سالی میں ہی وادئ غربت میں پائے گدا ملک خدا کا جغرافیہ ناپنے پر مجبور ہوئے تھے اس لئے ان کی شاعری میں وطن کی محبت، وطن سے دوری کی کسک اور اپنوں کی بے ثباتی کے تاثرات ملتے ہیں۔

انہوں نے اسکول اور کالج کے سالانہ اجلاس کے لئے ڈرامے لکھے اور ان میں نمایاں کردار بھی ادا کیئے۔ ۱۹۴۵ء میں "بزم ادب" کی بنیاد اسکول ہی کے زمانے میں رکھی۔ یہ بزم ادب شروع ہی سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی اور انہیں ادبی دنیا سے متعارف کروانے میں پیش پیش رہی۔ ۵۹۔ ۱۹۵۲ میں بزم ادب نے امریکن کمپنی، آرام کو کی وساطت سے اپنے وجود کو سعودی عرب میں سرکاری طور پر تسلیم کیئے جانے کا فخر حاصل کر کے وہاں ادبی محفلوں اور مشاعروں کی بنیاد اُس ماحول میں ڈالی جہاں کسی بھی نوعیت کی میٹنگ (meeting بیٹھک) خلاف قانون جانی جاتی تھی۔ اس کے بعد بزم ادب ننگھم (یو کے) میں وارد ہوئی اور بہت سے نئے لکھنے والوں کو سامنے لاکر اپنے شوق کو جلا دینے کے مواقع فراہم کرنے لگی۔

پاکستان بننے کے بعد تبسم کے مضامین اور افسانے لاہور کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا سفرنامہ حج بعنوان "مے خانے سے خانہ خدا تک" کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ سنجیدہ تحریر کے علاوہ مزاح نگاری میں بھی تجربے کرتے رہے اور مشہور جریدے "چاند" میں ان کے مضامین باقاعدگی سے شامل اشاعت ہوتے رہے۔

تبسم نے ایک دو آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ذاتی طور پر وہ اس زمین کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں نثری نظم اور نثری غزل کو "نظمی نثر" اور "غزلی نثر" کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیوں کہ ہوگی تو وہ نثر ہی۔

ان کا کہنا ہے... "اردو زبان اور ادب کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ماسوائے چند قابل ذکر امور کے کہ ہندوستان میں پروان چڑھنے والی یہ زبان ہندوستان ہی کے مرگھٹ پر ہلکی سلگتی چتا کی نذر ہو رہی ہے۔ اور پاکستان جہاں قومی زبان اردو ہے وہاں اردو کے ساتھ سرکاری سطح پر کیا سلوک ہو رہا ہے؟ البتہ بقایا دنیا میں اسے فروغ دینے، اس میں نئی روح پھونکنے اور اسے رواں دواں رکھنے کے لئے یاران طریقت سر توڑ کر کوششیں کر رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ، کنیڈا اور مشرق وسطی میں کئی ادبی جماعتیں اسی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی ممالک میں تولد نئی پود کو اردو بولنے، سمجھنے اور اسے فروغ دینے کے مزید مواقع فراہم کیئے جائیں"۔

تبسم جن شعرا کے کلام سے متاثر ہیں ان میں حسرت و رومانس کی شاعری میں ساحر لدھیانوی کا کلام سحر آلود محسوس ہوتا ہے، شراب و کباب میں عدم، فلسفۂ حیات میں علامہ اقبال۔ ان کے علاوہ فیض اور غالب کے رشحات قلم نے ان کے ذہن پر اپنے حسین نقش مرتب کیئے ہیں۔

تبسم کہہ رہے تھے... "اگر میں اپنی زندگی کا صرف ایک ہی یادگار واقعہ بیان کروں تو وہ کافی ہوگا کہ اس سے بڑا واقعہ کوئی ہوا ہی نہیں۔ یہ 1954ء کی بات ہے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے دوران میں نے ایک پوری رات حرم شریف میں خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر عبادت کرنے یا طواف کرتے رہنے میں گزاری۔ تہجد اور فجر کی نماز سے فراغت کے بعد واپس جائے رہائش پر آ کر کچھ آرام کیا اور پھر الٹے قدموں ظہر کی نماز کے لئے حرم شریف پہنچا تو معلوم ہوا کہ فجر کی نماز کے بعد خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ یہ سن کر میں نے شکوہ کیا، اے میرے مالک میں تمام رات آپ کے گھر میں بیٹھا آپ کی حمد و ثنا کرتا رہا، مولیٰ کریم یہ کیسی مہمان نوازی ہے کہ تمام رات آپ کے حضور میں جاگا کیا اور درِ رحمت کھلا بھی تو میرے جانے کے بعد۔ یہ اپنے رب سے ایک خاموش التجا تھی جو جسم کے روئیں روئیں نے کی، نم آلود آنکھوں نے کی، دل نے رو رو کر کی۔

عصر کی نماز کے لئے حرم شریف کے باب تک پہنچا جہاں حاجیوں کا، جمِ غفیر، احرام باندھے کندھے سے کندھا ملائے، ایک سمندر تھا۔ دور خانہ کعبہ پر نظر پڑی 'یا میرے اللہ، میرے مولا، یا میرے رزاق، میرے رحیم، دلوں کی پکار سننے والے میرے کریم' میں نے اپنے رب کو پکارا۔ اسی لمحے حرم شریف کے دروازے سے میں نے دیکھا کہ کعبہ کا دروازہ کھلا تھا۔

ایک ہی دن میں دو مرتبہ دروازہ کھلنے کی روایت تاریخ میں نہ تھی۔ ایک طرف احساسِ تشکر سے آنکھوں میں نمی آ گئی اور دوسری طرف شکوہ کی ندامت۔ بہر حال اب مسئلہ خانۂ کعبہ تک پہنچنے کا تھا۔ آگے بڑھنے کے لئے دھینگا مشتی خلاف آداب اور اُس جمِ غفیر میں ایک قدم آگے بڑھانا مشکل تھا۔ ایک مرتبہ پھر جسم کے روئیں روئیں سے، روح کی گہرائیوں سے ایک خاموش صدا، ایک خاموش پکار اٹھی، خدایا نہ جانے پھر کب یہ موقع نصیب ہو۔ صبح جس نوازش سے محروم رہا اپنے حبیبؐ کے صدقے اس مرتبہ محروم نہ رکھیئے۔ یا اللہ میری ہی بد قسمتی تھی کہ جو رات بھر حرم میں گزارنے کے بعد فجر کی نماز کے بعد جلد اُٹھ گیا تھا۔ میرا ہی قصور تھا جو اور نہ رُک سکا۔ میں آپ کے گھر مہمان ہوں یارب۔ مجھے اس مرتبہ اپنی مہمان پروری سے محروم نہ رکھیں۔

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا، آنکھیں کھولیں تو ربِ جلیل کی قدرت، میں نے اپنے آپ کو خانۂ کعبہ کے درِ مبارک کے نیچے کھڑا پایا۔ یقین کیجیئے کہ مجھے علم نہیں، آج تک میں یہ جان نہیں پایا کہ میں کس طرح وہاں پہنچا۔ میں نے وہاں پہنچنے کے لئے کوئی دھکا پیلی نہیں کی تھی۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ مشیت ایزدی تھی۔ میرے پاؤں زمین پر نہ تھے اور میں ہجوم میں لوگوں کے کندھوں کے درمیان معلق ہو کر ان کی کشمکش میں قدرت کے ایما سے آگے بڑھتا رہا۔

اچک کر دہلیز کو پکڑا تو نیچے کھڑے حضرات نے اسی میں سعادت جانی کہ میرا ایک ہاتھ تو چوکھٹ کو پکڑے ہے ہی اس لئے میرے پاؤں اور ٹانگوں کو پکڑنا بھی سعادت بہ وساطت رہے گا اور اُدھر میرا یہ حال اگر اس لٹکے ہوئے عالم میں میرا احرام کھل گیا تو کیا ہوگا، دم ہی تو نکل جائے گا۔ گردن

جھکا کر عربی میں آواز لگائی کہ بھائیو، یا حجاج، مجھے کیوں کھینچ کر خانہ کعبہ کے اندر کی زیارت سے محروم کر رہے ہو۔ مرحبایا اخی، مرحبایا حاجی اور انہیں لوگوں نے بجائے نیچے کھینچنے کے میرے پاؤں پکڑ کر اونچا دھکیل دیا۔ اور میں، جی ہاں میں! خانہ کعبہ کے اندر تھا۔

ہدایت کے مطابق خانہ کعبہ کے اندر چاروں دیواروں کی طرف نفل ادا کیئے اور اس کے بعد پتھروں سے بنی تاریک سیڑھیوں سے خانہ کعبہ کی چھت پر رسائی کی۔ بلا وجہ چھت پر رکنا ممنوع ہے۔ متولی کعبہ اس وقت غلاف کعبہ کو چھت پر لگی لوہے کی سلاخوں کے ساتھ باندھ کر محفوظ کر رہے تھے۔ اجازت لے کر پندرہ بیس منٹ تک غلاف لٹکانے میں ان کا ساتھ دیتا رہا اور اس کے بعد ہر سانس میں اس سعادت کے حاصل ہونے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر آ گیا۔

فجر کی نماز کے بعد دروازہ کھلنے پر محرومیت کے احساس کا خاموش گلہ، عصر کی نماز پر دوبارہ دروازہ کھلا پانے پر حصول سعادت کے لئے خاموش التجا اور اس کے بعد در کعبہ تک پہنچنے کی عالم غنودگی ایسے لمحات اور اس وقت پیدا شدہ جذبات و تاثرات منصفانہ طور پر بیان کرنے کے لئے کسی لغت میں بھی الفاظ موجود نہیں۔ اور الفاظ ادا بھی نہیں کیئے گئے۔ فقط احساس اور غبار تھا جو وجود میں آیا۔ آقا اور غلام کے درمیان ایک رابطہ تھا، ایک خاموش کلام تھا جس کے لئے الفاظ کی ضرورت بھی نہ تھی''۔

Mr. A M Tabassum.

12 Lulworth Close, West Bridgford, Nottingham, NG2 7UP, UK

انتخابِ کلام

چاروں طرف ایک عالم حسرت ہے کیا کروں ہر اک قدم پہ تازہ مصیبت ہے کیا کروں
سوز فراق بھی ہے غم روزگار بھی دل مبتلائے کرب و اذیت ہے کیا کروں
دامن ہے تار تار، گریباں ہے چاک چاک اہل کرم کی نظر عنایت ہے کیا کروں
ارماں تڑپ رہے ہیں دل نابکار میں ان کو وصال وصل سے نفرت ہے کیا کروں
آتا نہ یوں میں اپنے وطن سے کبھی مگر صحرا کی وسعتوں سے عقیدت ہے کیا کروں
ہر اک ادا پہ ان کی تجسم ہوا نثار
صد حیف پھر بھی ان کو شکایت ہے کیا کروں

تذکرہ اہل وفا کا ہو تبسم کس طرح
بانٹتے تھے جو محبت ۔ وہ لبنریں کھو گئے

3/1/2002

اکرام تبسم

لاہور، پاکستان

جناب اکرام تبسم سے مجھے ایک بہت ہر دل عزیز انسان اور شاعر پروفیسر سحر انصاری نے متعارف کرایا۔ اکرام صاحب نے اپنی کتابیں بھجوائیں۔ ان میں ''دکھ کا جزیرہ'' میرے سامنے ہے۔ ان کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اور روٹری انٹرنیشنل پاکستان کی جانب سے انعام یافتہ ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رائے ہے:

''کتاب خوب صورت گلابی کاغذ پر شائع ہوئی ہے اور خوش بو میں بسی ہوئی نہ ہو کر بھی عطر بیز ہے کیونکہ اسے اکرام تبسم نے 'منافقوں کے نام' سے منسوب کیا ہے اور اس کے نیچے قرآن پاک کی آیت سورۃ النسآء (پارہ ۵، رکوع ۱۸) سے دی ہے جس نے اس کتاب کے مواد کو ستاروں کی چمک دے دی ہے۔ یوں منافقوں کے نام سے منسوب کرنے والے نے ایک غیر منافق کی رائے کا احترام کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حبیب جالب سے بڑا غیر منافق ان کے دور میں کوئی نہ تھا۔ حبیب جالب نے بڑے مزے کی باتیں لکھی ہیں۔ پڑھیئے:.... 'مجھے فیض صاحب عوامی شاعر کا ایسا لقب عطا کر گئے ہیں کہ شعرا اور نقادانِ سخن میری طرف دیکھتے ہی نہیں'۔

اکرام تبسم نے میری رائے کو اتنی اہمیت دی کہ مجھے خود حیرت ہوئی۔ اب وہ سکہ بند نقادوں

سے خود نمٹیں گے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ بہت دنوں سے میں اسی لئے ٹال رہا تھا کہ وہ کسی عبدالرحمن بجنوری کو ڈھونڈیں۔ کوئی ویسا نہیں ملتا تو کم از کم ڈاکٹر سلیم اختر کو ہی زحمت دیں کہ وہ ہر سال ادب کو کھنگا لتے ہیں اور شاعروں کو اہم بناتے ہیں۔ یا وہ کسی کالم نگار سے رابطہ کریں جو اپنی تحریر سے اسے اپنے کالموں میں شہرت دے۔ میں ان شاعروں اور نقادوں کا بہت زخم خوردہ ہوں۔ مجھے پولیس نے اتنا زدوکوب نہیں کیا جتنا انہوں نے۔ چلو چھوڑو بے رحم لوگوں کو“...

اس کے بعد انہوں نے اکرام تبسم کی شاعری کو سراہا ہے۔ ان کے کئی خوب صورت اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں ایک شعر تو معرکے کا ہے۔

ڈوبتے ڈوبتے ایک بچہ بچا آج آیا ہوں یارو خدا دیکھ کر

اکرام تبسم کا دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو کہ اس میں آفاقی سچ ہے۔

دل میں پھولوں کی یہ سوغات بچا کر رکھ لے رُت بدل جائے گی ہر شاخ برہنہ ہوگی

اس مجموعے میں دیگر شعرا نے بھی اکرام تبسم کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ جن میں سلطان رشک، اظہر جاوید نشتر خانقاہی اور مخمور سعیدی کے نام ہیں۔ جناب نشتر خانقاہی نے بھی اپنی بے لاگ رائے دی ہے... ”تبسم نے جو سفر شروع کیا ہے اگر وہ جاری رہا تو اگلی منزلیں ایسی بھی آئیں گی جن تک رسائی پانا ان مسافروں کا مقدر نہیں جو ’ٹریفک کے سپاہی‘ کا اشارہ دیکھ کر اپنے پاؤں بڑھاتے ہیں“۔ آپ نے ’ٹریفک کے سپاہی‘ کا استعارہ تو ملاحظہ کر لیا اور آپ شاید یہ بھی جانتے ہوں گے کہ نشتر خانقاہی ایک لاجواب شاعر ہیں۔ ’پی آر‘ سے تعلق نہیں، اس لئے انہیں پڑھے لکھے لوگ ہی جانتے ہیں۔

ان کی رائے کو اکرام نے سلام کیا۔ اپنا شعری سفر ایک محنت اور لگن سے جاری رکھا اور پھر ۱۹۹۹ء میں اپنا دوسرا شعری مجموعہ ”محبت کا مسافر“ شائع کروایا۔ تیسرا مجموعہ ”خیال وملال“ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اب سندھ کے مشہور قلم کار تاج قائم خانی ان کے فن پر کام کر رہے ہیں اور ”اکرام تبسم... فن اور شخصیت“ کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔

ان کے بارے میں ڈاکٹر اجمل نیازی نے بھی خوب لکھا ہے۔ ایک اقتباس پیش ہے:

”اس کے دوسرے مجموعہ کلام کا نام ’محبت کا سفر‘ ہے۔ محبت کے سفر پر وہ بہت دیر سے نکلا ہوا ہے۔ اس سفر کے پہلے پڑاؤ میں وہ دکھ کے جزیرے پر جا پہنچا تھا۔ اور یہ جزیرہ آدمی کے اندر واقع ہے۔

دل دریا تے سمندروں ڈونگھے // کون دلاں دیاں جانے ہُو

گہرے سمندر اور سوہنے جزیرے ہر وقت اکرام تبسم کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کے پاس کشادگیاں بھی ہیں اور کیفیتیں بھی۔ وہ بھرپور زندگی بسر کر رہا ہے اور خوب صورت شاعری کرتا ہے۔ وہ ایک خوش حال آدمی ہے جو مشغلہ اختیار کرنا چاہے کر لیتا ہے۔ اس نے ذوق وشوق کو اپنا رہبر بنایا۔ اسے بھی خبر نہ تھی کہ وہ اتنا اچھا شاعر بن جائے گا“۔

تو آیئے اس اچھے شاعر سے خود اس کے بارے میں بھی پوچھ لیں:

اکرام بتاتے ہیں کہ ان کا نام اکرام صابر تبسم ہے۔ تخلص کے طور پر اکرام تبسم لکھتے ہیں۔
۶/مئی ۱۹۴۶ء کو انڈیا کے شہر نجیب آباد، یو پی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب کا شمار معروف تاجروں میں ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد ان کا خاندان لاہور میں آباد ہو گیا۔ یہیں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے بعد والد صاحب کے ساتھ کاروباری سرگرمیوں میں مصروف ہو جانے کے باعث مزید تعلیم جاری نہیں رکھ سکے۔ انہوں نے بتایا:

شعر و ادب سے لگاؤ تو ان کو اوائل عمری سے ہی تھا لیکن کاروبار حیات میں شدید مصروفیات کے باعث اپنے خیالات و احساسات کو لفظی جامہ پہنانے کی ضرورت انہیں ۱۹۸۴ء میں میسر آئی۔ البتہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء تک ماہنامہ 'کھلاڑی' ملتان کے لئے متواتر کھیلوں پر مضامین لکھتے رہے۔ پھر انہوں نے مولانا کوثر نیازی کے ہفت روزہ 'کہکشاں' لاہور میں سیاسی مضامین لکھے۔ نظریاتی طور پر خود کو 'ایک حقیقت پسند انسان' کہتے ہیں اور ادب پر کسی پارٹی، شخص یا گروہ کا غلبہ انتہائی نامناسب خیال کرتے ہیں۔ کہنے لگے "میں اپنا پہلا شعر کبھی بھی نہیں بھول سکتا کہ اس شعر کے باعث مجھے ہمیشہ عزت و تکریم میسر آئی ہے":

تتلیاں جاتی ہیں سجدہ کرنے پھول کے گھر میں خدا رہتا ہے

سوال نمبر ۳ کے جواب میں انہوں نے کہا ... "میں نے آج تک غزل، نظم اور گیت پر طبع آزمائی کی ہے لیکن رجحان غزل کی طرف ہے۔ ویسے میں آزاد نظم بھی جلد اور آسانی سے کہہ لیتا ہوں۔ نثری نظم یا غزل کے تجربات جو اصحاب کر رہے ہیں کرتے رہیں۔ نئی صنف کے طور پر نیا تجربہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ نثری غزل کے حوالے سے عرض ہے کہ غزل کے حُسن کو بگاڑنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ وہ لوگ اپنے تجربات کو نثر پارے یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام بے شک دے لیں لیکن غزل کی جگہ کسی غیر معروف، غیر معتبر نثر پارے کو لا کھڑا کرنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ کوئی بھی صنف سخن وقت کے ساتھ ساتھ اپنا مقام خود بناتی ہے جیسا کہ آزاد نظم ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئی ہے"۔

ان کا کہنا ہے ... "بلاشبہ اردو زبان اور ادب کا مستقبل روشن ہے۔ پچھلے دو اڑھائی سو سال میں اردو زبان نے بالعموم اور ادب نے بالخصوص نہایت ترقی کی ہے۔ جس زبان نے غالب، اقبالؔ، فیضؔ اور ساحر لدھیانوی جیسے اعلیٰ شاعر پیدا کیئے ہیں اس کے مستقبل سے ناامید ہونا قطعی غیر دانشمندانہ سوچ ہو گی۔

رہا رسم الخط کا مسئلہ تو اردو زبان کے مروجہ رسم الخط کو متعارف کرانے میں قریباً قریباً دو صدیوں سے زائد وقت صرف ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے تبدیل کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا بلکہ اردو زبان کو موت سے ہمکنار کرنے کے مترادف ہو گا"۔

"سوال نمبر ۵ کے جواب میں عرض ہے..." غزل اور نظم، دونوں ہی انسانی احساسات کی موثر ترین ترجمان ہیں۔ البتہ غزل کے اشعار میں شدت جذبات و احساسات زیادہ نمایاں ہیں۔ آج کا

ادب اپنے عہد کی مکمل ترجمانی یوں کرتا نظر آتا ہے کہ معاصر ادیب و شاعر اپنے عہد زندگی کو وسیع تر تناظر میں بیان کر رہے ہیں البتہ علامت نگاروں کے ہاں اس ترجمانی کا فقدان ہے۔ بے معنی جدیدیت اور نت نئے تجربات کے داعی اپنے عہد کے ترجمان نہیں کہلا سکتے۔

جہاں تک اردو زبان کو اپنانے کے حوالے سے آپ نے پوچھا تو الحمدللہ اردو زبان نے فکر و شعور کی جس اعلیٰ و ارفع کیفیات اور فخر و انبساط کے جس ناز آفریں مقام سے ہمیں نوازا ہے وہ کسی اور زبان سے میسر نہیں آ سکتا۔

میں شعرا میں حبیب جالبؔ سے متاثر رہا اور انہی سے اصلاح بھی لیتا رہا ہوں۔ یہ میری شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ اب ہر اچھے شاعر کے کلام سے متاثر ہوتا ہوں۔ معاصرین میں ہمہ جہت آرٹسٹ شاعر راجا نیرؔ کے خوب صورت کلام اور نکھری نکھری تحریروں سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔ ان کی شاعری عام فہم اور گہرے فکر و شعور کی غماز ہوتی ہے۔

میری نظر میں گزشتہ صدی میں اقبالؔ، فیضؔ، حبیب جالبؔ، منیرؔ نیازی، محسنؔ نقوی اور پروینؔ شاکر قد آور شعرا رہے ہیں اور ہیں۔

میری زندگی کا ہر پل حسین اور ہر واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایک شاعر کی نظر سے میں زندگی کے تمام تر پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور فطرت کی رنگا رنگی سے محظوظ ہونا شاعر کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ کوئی خاص واقعہ بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ زندگی کے سب ہی واقعات ناقابل فراموش یادیں ہوتی ہیں۔ میرے لئے یہی بہت ہے اس عمر میں بھی کچھ پیارے محبت بھری نظروں سے نوازتے ہیں"۔

Mr. Ikram Tabs'sum,
Bunglow No.113, Abbas Block, Mustafa Town, Lahore, Pakistan

انتخاب کلام:

پلک پہ خواب لبوں پر شگفتگی رکھ جا ہر اک لمحہ میں اک تازہ زندگی رکھ جا
تو حرف ساز ہے لفظوں کی پھیلی آنکھوں میں جہاں کا ظلم زمانے کی بے بسی رکھ جا
نکلتے وقت ہر اک روز گھر کی چوکھٹ پہ طلب خلوص کی خواہش کی سادگی رکھ جا
زمانہ یاد کرے تجھ کو اک زمانے تک ورق ورق پہ یہاں ایسی شاعری رکھ جا
کبھی تو آ کے تبسم کے خشک ہونٹوں پر چمکتی بولتی آنکھوں کی بے خودی رکھ جا

مانگنے کا بھی سلیقہ ترے جامی کو نہیں
تجھ سے مانگے ہے مگر تیرے سوا مانگے ہے

— جامی —

سید معراج جامی

کراچی، پاکستان

سید معراج جامی فدا خالدی دہلوی مرحوم کے شاگرد رہے ہیں۔ اور فدا خالدی کی نظرِ محبت جس کو چھو لیتی تھی وہ کندن بن جاتا تھا۔ سو معراج جامی کی صلاحیتیں بھی صیقل ہوئیں۔ کاش میں بھی اس ''پارس'' کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتی۔ مگر میری زندگی تو ایسی بھاگ دوڑ میں گزری کہ میں اساتذۂ فن کی روشنی سے صرف چند کرنیں ہی حاصل کر سکی۔ میں فدا خالدی صاحب سے ملی تھی۔ روزنامہ 'جنگ' کراچی کے کالم ''آج کا شاعر'' کے لئے ان کا انٹرویو بھی لیا تھا جو 'جنگ' کے صفحات پر کمپیوٹر میں محفوظ ہوگا مگر میرے پاس نہیں۔

سید معراج جامی کے مجموعۂ کلام ''روزنِ خیال'' میں محترم فدا خالدی فرماتے ہیں ''...شعر گوئی کو لوگ ایک آسان مشغلہ سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ شعر شعور سے مشتق ہے اور شعور کے کامیاب تجسس کا نام شاعری ہے۔ اس میدان میں وہ باہمت لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمہ وقت حادثات سے دوچار رہتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھتے ہیں۔ معراج جامی انہیں میں سے ایک باہمت شخص ہیں جو حالات کی ناسازگاری کے باوجود اس میدان میں مسلسل ترقی کی طرف گامزن رہے''۔

جامی کے استاد نے انہیں مروجہ طریقے سے شاعری نہیں سکھائی بلکہ انہیں وقتاً فوقتاً فن شاعری کی باریکیوں سے آگاہ کیا۔ اور چھ (۶) ماہ کے قلیل عرصے کے بعد ان کو تکمیل شعر گوئی کی سند عطا کی۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا بڑا اعزاز تھا۔

جامی بتاتے ہیں کہ ۱۹۸۵ء میں امریکن کلچرل سینٹر، کراچی کی جانب سے منعقد کیئے گئے مقابلۂ شعر گوئی میں اردو کے ایک سو چورانوے (۱۹۴) نوجوان شعرا کو مات دے کر انہوں نے غزل میں پہلا انعام حاصل کیا۔ آغاز شاعری کے صرف پانچ سال بعد یہ انعام و اکرام ان کے لئے دوسرا بڑا اعزاز تھا۔ یہ سب بقول جامی ان کی والدہ کی دعاؤں، والد صاحب برکت علی مرحوم کی تربیت اور جامی کے استادِ محترم حضرت فدا خالدی دہلوی کا صدقہ تھا۔ یوں دس سال کی محنت شاقہ کے بعد جامی کا پہلا مجموعۂ کلام ''روزنِ خیال'' کتابی صورت میں لیوٹن، برطانیہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ''سفیر اردو'' کے بانی اور مدیر ساحر شیوی (معراج جامی بھی مدیران میں شامل ہیں) کی کوششوں سے اسے ''کوکن اردو رائٹرز گلڈ'' نے شائع کیا۔ اس گلڈ کے تحت ساحر شیوی کئی اہل قلم کی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ساحر شیوی بھی ہماری طرح ''اہل بے زبان'' ہیں یعنی کوکن سے ان کا تعلق ہے اور کینیا کے دارالخلافہ نیروبی میں انہوں نے ' کوکن اردو رائٹرز گلڈ' قائم کر کے ایک مثال قائم کی ہے کہ اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والے اپنی آبلہ پائی کی پیمائش سے قطع نظر ہر قدم پر اردو کے پھول کھلاتے اور گلستان سجاتے نظر آتے ہیں۔

تو آیئے اب معراج جامی سے کچھ گفتگو ہو جائے۔

انہوں نے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا... ''میرا نام سید معراج مصطفیٰ حسین ہاشمی ہے جو مختصر ہو کر شعر و ادب کی دنیا میں صرف سید معراج جامی رہ گیا۔ جامی کا لاحقہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ سے روحانی عقیدت کے باعث ہے۔ ۱۲/ مارچ ۱۹۵۵ء تاریخ پیدائش ہے مگر یہ اسکول کے ریکارڈ کے مطابق ہے۔ میری پیدائش عین معراج کے دن کی ہے، یعنی میں ۲۷/ رجب کو صبح سات (۷) بجے پیدا ہوا تھا۔ مگر واقعہ معراج کے دن پیدا ہونے پر جب میں نے جنتری دیکھی تو پتا چلا کہ صحیح تاریخ پیدائش ۱۲/ اپریل ۱۹۵۳ء ہے کیونکہ ۱۹۵۵ء میں مارچ یا اپریل کی ۱۲/ تاریخ کو نہ رجب کی ۲۷ تھی اور نہ ہی دن اتوار کا۔ پیدائش لاہور کی ہے مگر شاید چند ہفتوں کا تھا تو اہل خانہ کراچی آ گئے اور کراچی میں چند سال گزرے تھے کہ والدین دادو، سندھ آ کر بس گئے جس کی وجہ سے میری ابتدائی تعلیم کا آغاز دادو سے ہوا۔ اس لئے میری جائے پیدائش معنوی اعتبار سے دادو ہے جو سندھ کا ایک خوب صورت ثقافتی شہر ہے۔

دادو میں پرائمری، سیکنڈری اور بی اے کی تعلیم ریگولر اسٹوڈنٹ (regular student) کی حیثیت سے حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں میٹرک، ۱۹۷۳ء میں انٹر اور ۱۹۷۵ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۷۷ء میں میرے اہل خانہ نے اپنے وطن میں دوسری اور میں نے پہلی ہجرت کی اور ہم کراچی آ گئے۔

بعد میں سندھ یونیورسٹی سے پرائیوٹ (private) ایم اے اسلامک اسٹڈیز (M A in Islamic Studies) اور ایم اے اردو (M A in Urdu) کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ایک ادبی انجمن "بزم تخلیق ادب پاکستان" کے نام سے بنائی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری قائم کی ہوئی خالص ذاتی ادبی انجمن بعد میں میری روزی کا ذریعہ بن جائے گی اور میں اس بزم کے تحت اشاعتِ کتب کا کاروبار کروں گا۔ لہٰذا اب اس بزم کے تحت میں اہل قلم کی کتب کی اشاعت کا کام کرتا ہوں۔

چھیالیس (۴۶) سالہ زندگی کی مختصر سوانح اگر چار ہزار چھ سو (۴۶۰۰) الفاظ پر مشتمل ہو تو مختصر نہیں ہوگی۔ تاہم اتنا عرض کروں کہ پرائمری اسکول کے زمانے سے مجھے ادبی کتب ورسائل کے مطالعے کی چاٹ لگ چکی تھی۔ اور ایسے کتب ورسائل پڑھ کر مجھے ذہنی اور روحانی سکون وسُرور ملتا تھا۔ ۱۹۶۸ء سے میں نے کتابیں اور رسالے خریدنا اور جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ گھر میں تنہا تھا۔ والد اور والدہ کے علاوہ ہمارے ساتھ اور میرا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ بہن اس لئے نہیں تھی کہ بہن اللہ نے دی ہی نہیں۔ میرے تین بھائی جو مجھ سے کئی سال بڑے تھے، کراچی اور لاہور میں رہتے تھے۔ دادو میں میرا بچپن کتابیں پڑھتے ہی گزرا کیونکہ بچپن کے کھیل ایسے نہیں تھے کہ میں ان میں حصہ لیتا۔ وہ سارے کھیل گاؤں دیہات والے گلی کوچوں میں کھیلے جانے والے کھیل تھے اور کچھ میں عادتاً بھی تنہا پسند تھا اور اب بھی ہوں۔ مگر اب اہل خانہ، عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لئے بزم سجالیتا ہوں۔ دادو میں ڈسٹرکٹ لائبریری (Distirct Library) بنی تو میں پہلا طالب علم تھا جس نے دو (۲) روپے ادا کر کے سالانہ ممبر شپ (membership) حاصل کی تھی اور ایک سال کے اندر اندر لائبریری کا اردو ادبی حصہ چاٹ گیا تھا"۔

"جامی آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟"، ہم نے پوچھا۔

"۱۹۷۱ء میں میٹرک کرنے کے بعد میں لاہور اپنے بڑے بھائی فیاض ہاشمی کے پاس گیا۔ لاہور میں میرا مہینہ بھر قیام رہا۔ روزانہ شام کو ہم دونوں باری اسٹوڈیو، شاہ نور اسٹوڈیو اور ایور ریڈی اسٹوڈیو (Bari Studio, Shah Noor Studio & Ever-Ready Studio) جاتے۔ ان دنوں فیاض ہاشمی صاحب کے نغمے تقریباً ہر آنے والی اردو فلم میں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ فلمی اسٹوری، اسکرین پلے اور ڈائیلاگ (film story, screen play & dialouge) بھی لکھ رہے تھے۔ فلمی نغموں سے ہٹ کر وہ غزل کے بے حد اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کا آہنگ اور اسلوب مروجہ غزل کے عمومی اسلوب سے ہٹ کر ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی غزلوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی ورنہ ان کی شاعری کے بارے میں مجھ سے پہلے یہ بات کوئی اور نقاد کہہ چکا ہوتا۔ ان کی صحبت کا اثر تھا یا لاہور کی طلسماتی فضا کا کہ لاہور پہنچنے کے تیسرے دن ہی سے مجھ پر شاعری کا نزول ہونے لگا۔ میں خوش بھی تھا مگر ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ میں اپنی شاعری بھائی جان کو دکھاؤں۔ مگر ایک دن بھتیجی نے میری ڈائری بھائی جان کے سامنے رکھ دی۔ بھائی جان بہت خوش ہوئے۔

میری اس شاعری میں قافیہ ردیف تو تھا مگر کہیں کہیں اشعار وزن سے بھی خارج تھے۔ خیر ان کی حوصلہ افزائی سے ہمت بڑھی۔ ۱۹۷۲ء میں دادو کالج کی جانب سے حیدرآباد بورڈ آف انٹرمیڈیٹ (Hyderabad Board of Intermediate) کے ایک طرحی مشاعرے میں نمائندگی کرتے ہوئے ہم تین دوستوں نے شرکت کی۔ اس پہلی مطروحہ غزل کو کالج کے پروفیسر شبنم صدیقی صاحب نے درست کی اور میں نے پہلی بار مطروحہ غزل اپنے شہر سے باہر دوسرے شہر میں جا کر پڑھی۔

۱۹۷۹ء میں کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن میں ملازمت کے دوران میری دوستی ادارے کے ایک ذہین قلم کار سے ہوئی، جن کی اُس وقت تک سولہ (۱۶) کتب مارکیٹ میں خوب چل رہی تھیں۔ ان کا نام ظفر اقبال ہے۔ اور ان کی جنرل نالج (general knowledge) پر مشتمل دس (۱۰) اور دیگر موضوعات پر چھ (۶) مرتب کردہ کتب نے ان کو معلومات کی دنیا میں ایک معتبر اور مشہور ہستی بنا دیا تھا۔ مجھ سے ملاقات کے بعد اور ہم دونوں کے مشترکہ مشغلے نے انہیں اور مجھے ایک ساتھ، آٹھ مختلف موضوعات پر کتابیں مرتب کرنے پر اُکسایا۔ لہٰذا ہم دونوں نے مل کر آٹھ کتابیں تیار کیں، جن میں ایک کتاب ''سنہرے اقوال'' کا انتساب انہوں نے میرے نام کیا۔ ایک کتاب ''دو ہزار بہترین اشعار'' ہے۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے معروف اور خوب صورت اشعار جمع کیے ہیں۔ حرف ''ز'' کے اچھے اشعار جمع کر رہے تھے، ایک شعر کی کمی تھی۔ تمام دواوین دیکھ ڈالے۔ جتنے اچھے اشعار تھے وہ ہم کتاب کے لئے لے چکے تھے کہ اچانک ایک شعر کی آمد ہوئی اور میں نے وہ شعر لکھ کر ظفر اقبال کو دیا جو انہیں پسند آ گیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ شعر کسی دیوان سے نہیں بلکہ مجھ دیوانے کے ذہن سے آیا ہے تو وہ خاصے حیران ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ شعر واقعی اتنا اچھا ہے مگر اس وقت انہوں نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اپنی کتاب میں بھی شامل کر لیا۔ اس شعر کی آمد سے البتہ یہ ہوا کہ شعر گوئی کا وہ سلسلہ، جو لاہور میں شروع ہوا تھا اور پھر امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا تھا، رواں ہو گیا۔ یوں سلسلہ شعر گوئی اتنا بڑھا کہ مجھے سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اور میری خوش قسمتی سے مجھے کراچی میں داغؔ کے اسکول کے آخری استاد حضرت فدا خالدی دہلوی جیسے استاد مل گئے اور انہوں نے مجھے اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔ اور میں ان کی سرپرستی اور تربیت سے کسی قابل ہو گیا''۔

جامی نے بتایا... ''ابتدا (۱۹۸۰ء) میں صرف اور صرف غزلیں ہی کہیں اور ۱۹۹۲ء میں غزلوں کا ایک مجموعہ ''روزنِ خیال'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر تقریباً ۱۹۹۳ء میں کچھ نظمیں کہیں۔ قطعات بھی لکھے جو کسی نہ کسی واقعہ پر ظہور پزیر ہوئے۔ نعت، منقبت، سلام بھی کہے۔ گزشتہ دو برس سے جاپانی صنفِ سخن ''ہائیکو'' اور ''سین ریو'' بھی کہہ رہا ہوں اور ان دو پر مشتمل مجموعہ انشاءاللہ جلد آ رہا ہے۔ تنقیدی اور تجزیاتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان مضامین کا مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ ماہیے کی جانب بھی پیش رفت ہے۔ پچھلے سال محترم ڈاکٹر فہیم اعظمی کے رسالے ماہنامہ ''صریر'' میں افسانچے شائع ہوئے جن کو ڈاکٹر صاحب نے بہت پسند فرمایا اور پھر ان کی حوصلہ افزائی پر مزید افسانچے لکھنے

شروع کیئے ہیں جو ہندو پاک کے جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان افسانچوں کا مجموعہ بھی انشاءاللہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوگا۔ ادب کی ان اصناف میں میں نے زبردستی دخل اندازی نہیں کی۔ بلکہ جب بھی کوئی خیال آیا تو اسے کاغذ پر اُتارتے وقت جس صنف کا تعین خود بخود ہوگیا اسی صنف میں اسے اُتارلیا''۔

اردو زبان کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا۔''اردو زبان کا مستقبل چونکہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے تابناک ہے۔ اور اردو پر ہی منحصر کیا، ساری زبانوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔ اردو رسم الخط بدلنے کی بات کوئی آج نہیں ہو رہی ہے یہ بہت پرانا ہنگامہ ہے۔ مگر اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ اردو رسم الخط کبھی بدلا نہیں جاسکے گا۔ لوگ کوشش کرتے رہیں گے مگر کامیابی انہیں حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ اردو کی اس قدر مخالفت کے باوجود اس کے نام لیوا اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے کمربستہ نوجوانوں کی رسد ہر دور میں تیار ملے گی۔ رسم الخط بدلنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا''۔

سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا...''اردو ادب کی جڑیں ہر دور میں اپنی زمین سے پیوست رہی ہیں۔ جس زمانے میں اردو ادب کے قابل قلم کار اور سنجیدہ قارئین تھے اس زمانے میں تو اردو ادب نے بڑی ترقی کی اور شاہکار تخلیقات وجود میں آئیں جو آج بھی روز اول کی طرح تر و تازہ اور سدا بہار ہیں۔ آج اردو ادب کی ڈور بیشتر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کی ضرورت ادب نہیں، شہرت اور دولت ہے۔ اور وہ شہرت اور دولت کی خاطر اردو ادب کی جڑوں کو کمزور کر رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا، اور میرا ایمان بھی ہے، اردو ادب کو ان نام نہاد قلم کاروں سے اگرچہ بہت نقصان پہنچ رہا ہے مگر اس کی جڑیں جو ماضی میں اس مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی اردو ادب کی جڑوں کو یہ لوگ اُکھاڑ نہیں سکیں گے۔ باقی رہا سوال کہ کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے تو اس کا بھی سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ آج کا ادب بالکل اپنے عہد کا ترجمان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کا عہد خالص نہیں ہے یعنی جیسی روح ویسے فرشتے''۔

اب ذکر چھڑا، نثری نظم کا۔ جامی کہنے لگے...''میں نثری نظم کو ادب کا حصہ ہی تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ حال ہی میں نثری نظم کے بانیوں میں سے ایک بہت معتبر ہستی نے نثری نظم کے ناکام تجربے پر واشگاف الفاظ میں اپنی شکست تسلیم کی ہے اور نثری نظم کی ترویج کے زمانے کو وقت کا ضیاع بتایا ہے۔ ویسے بھی نثری نظم اپنی موت آپ مرچکی ہے۔ نظم اور نثر کا مقابلہ بے سود ہے اس لئے کہ نظم اور غزل باقاعدہ معتبر اور مستند اصناف سخن ہیں۔ نظم اور غزل، دونوں، اپنی اپنی جگہ بہتر اور بھاری ہیں۔

میری زندگی کا اہم اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میں بچپن میں اپنے گھر میں تنہا جو کھیل کھیلا کرتا تھا وہ میری عملی زندگی کا مقصد بن گیا۔ یعنی میں بچپن میں بچوں کے رسالے کی ڈمی (dummy) بنایا کرتا تھا اور اس ڈمی پر بطور مدیر اپنا نام لکھتا تھا۔ آج عملی زندگی میں چار رسالوں کا مدیر بن گیا ہوں۔

برطانیہ سے نکلنے والے سہ ماہی ''سفیر اردو'' کا مدیر ثانی ہوں۔ سہ ماہی ''بانگیو ورلڈ''، سہ ماہی ''ماہیا روپ'' کراچی کا مدیر ہوں۔ ماہنامہ ''آگہی'' کراچی کا ایگزیکٹو ایڈیٹر (Executive Editor) ہوں۔ اس سے قبل ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی صاحب نے ماہنامہ ''رعنائیاں'' کراچی کا ڈکلریشن (declaration) محض میری وجہ سے لیا۔ میں اس کا مدیر تھا۔ آج بھی کبھی اس موضوع پر سوچتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اور یہ مصرعہ ذرا تصرف کے ساتھ گنگنانے لگتا ہوں۔

ع مرا مزاج لڑکپن سے ہی ''مدیرانہ'' تھا

Mr Syed Maeraj Jami
Post Box No. 17667, Karachi, 75300, Pakistan

انتخابِ کلام

تمام ہجر گزیدہ وصال کے پیکر
یہی تو اصل میں ہیں ماہ و سال کے پیکر

تراشتا ہوں ابھی تک اسی توقع پر
کبھی تو بول اٹھیں گے خیال کے پیکر

وجودِ حسن سے قائم حیاتِ فانی ہے
بنائے ہیں مرے رب نے کمال کے پیکر

مرے وجود میں دونوں ہی رقص کرتے ہیں
مسرتوں کے ہیولے، ملال کے پیکر

تخیلات میں بن بن کے جو بگڑتے ہیں
وہی ہیں خواب مجسم، خیال کے پیکر

اسی کا حسنِ ازل منعکس ہے ہر شے میں
ہر اک جگہ ہیں اسی خد و خال کے پیکر

وہ اس طرح سے سرِ بزم جلوہ آرا ہیں
رکھا ہے جیسے کسی نے سنبھال کر پیکر

یہی تھا خوف کہ یہ دن بھی آئے گا اک دن
جواب دینے لگیں گے سوال کے پیکر

کمند ڈالتے ہیں آسمانِ عظمت پر
کمال کرتے ہیں جامی زوال کے پیکر

یوں نہ کہا کہ نفرت اس شخص کو بسم کرتی ہے جو الفت کرتا ہے۔

جاوید اختر چودھری
برمنگھم

جاوید اختر چودھری

برمنگھم، برطانیہ

جس کے سارے حروف مدھم ہیں   زیست ہے اس کتاب کی مانند

اور

اس سے ہم طلب آب کیا کرتے   وہ تو تھا اک حباب کی مانند

غزل کے بعض اشعار شاعر کی زندگی کی کئی حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان ہی سے معاشرے میں موجود نا گفتہ معاملات و مسائل کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے بعض اشعار زبان زدِ عام ہو جاتے ہیں۔ کبھی کا سنا ہوا شعر مدتوں حافظے سے محو نہیں ہوتا اس کے باوجود کہ اس کے خالق کو اپنے شاعر ہونے پر کوئی زعم نہیں ہوتا۔

جاوید اختر چودھری بھی کہتے ہیں... "میری شاعری میری ذات اور میرے احساسات کا اظہار ہے"۔ انہوں نے اپنی غزل سے یہ مصرعہ سنایا۔

جذبات دل کو جس نے حرفوں کی شکل بخشی ہ

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "حصارِ ذات" اپریل ۱۹۹۹ء میں بزم فکر نو، کوپن ہیگن سے ان کے احباب کے اصرار پر شائع ہوا۔ ان کی فکر کو اجالنے میں محترم عطا جالندھری مرحوم کی محنت شامل ہے۔

عطا صاحب کو وہ اپنا استاد مانتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

ہے میرے ارتقا کو نسبت عطا کے فن سے ۔۔۔ وہ میر کارواں ہے شاعر ہے وہ جگر سا

۱۱/ نومبر ۱۹۴۰ء کو جاکھل منڈی ضلع حصار (حالیہ ہریانہ، بھارت) میں پیدا ہونے والے جاوید اختر چودھری کا گھرانہ بھی پاکستان کی آزادی کے لئے اپنے خون کا نذرانہ دے چکا ہے۔ ان کے دادا کے علاوہ دادی کی چھوٹی بہن اور ان کے تمام اہلِ خانہ شہید ہو گئے۔ جاوید کے والد اور دیگر اہل خانہ اپنے آبائی قصبہ سوہاوہ ضلع جہلم پہنچے۔ جاوید کی ابتدائی تعلیم سوہاوہ (جواب تحصیل کا درجہ اختیار کر چکا ہے) میں ہوئی۔ بعد کی تعلیم گورنمنٹ کالج، گوجر خان میں حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ادبی مطالعہ کا شوق تھا لیکن شعر گوئی کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کہتے ہیں... ''مجھے اچھے شعر یاد کرنے کا خبط تھا۔ جب بھی یاروں کی محفل جمتی میں شعر کی تضمین یا پیروڈی (parody) کرتا''۔ پاکستان میں ملازمت کے دوران ان کی ملاقات مختار احمد منہاس سے ہوئی جو ادبی حلقوں میں مختار جاوید کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی رفاقت میں جہلم کے مشاعروں میں شریک ہوئے لیکن طبیعت پھر بھی شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ غالباً ۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا کہ ان کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو راہ ملی، سنائے گونجے، چاندنی بھی ان دنوں گنگناتی تھی اور دریائے جہلم کی لہروں کی روانی پر ان کے اندر کا شاعر سُر تال سے آگاہ ہونے لگا۔ ساتھ ہی ایک اَن جانے درد کی لہر ٹیس بن کر اندر سے اُٹھتی اور ان کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ تب شاعر جاوید نے قلم تھاما اور کسی دوست کی محفل میں ایک مصرعہ طرح۔ پیکر ہستی کو جب مشکوک سا پاتا ہوں میں، پر گرہ لگائی۔

عظمتِ یزداں مجھے دیتی ہے پھر سے حوصلہ ۔۔۔ پیکر ہستی کو جب مشکوک سا پاتا ہوں میں

یوں شاعری کے پودے نے سر اُٹھایا مگر پھلنے پھولنے سے پہلے ۱۹۷۰ء میں شاعر کو ڈنمارک جانا پڑا۔ روزگار کا حصول اور دیارِ غیر۔

کہاں کی رباعی کہاں کی غزل ۔۔۔ گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

والی صورت حال تھی۔ ڈنمارک میں دو برس قیام کے بعد اپریل ۱۹۷۲ء میں برطانیہ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے دو سال انڈسٹریل الیکٹرانکس (Industrial Electronics) کا کورس کیا۔ اور بقول ان کے یہاں کے مشینی شکنجے نے ایسا جکڑا کہ مدت تک قلم سے دوستی کا رشتہ کٹا رہا۔ ۱۹۹۰ء میں طبیعت دوبارہ مائل ہوئی تو ایک مجموعہ کلام چھپوانے کی صورت بنی ورنہ وہی حصولِ روزگار کی مشقت کے شب و روز تھے جن کے لئے انہوں نے کہا۔

ارادے توڑتا کیوں کر جلاتا کشتیاں کیوں کر ۔۔۔ دبی چنگاریوں کو گر شرارا ایک مل جاتا

اور

ترے جاوید کو بھی منزل مقصود مل جاتی ۔۔۔ جو رستہ دیکھنے کو گر ستارہ ایک مل جاتا

شاعری کے ساتھ جاوید نثر بھی لکھتے رہے۔ ان کے افسانے مختلف جرائد میں شائع ہوئے جو ۲۰۰۰ء

میں ''اک فرصتِ گناہ'' کے عنوان سے کتابی صورت میں یکجا کر دیئے گئے۔

نثری نظم اور نثری غزل کے حوالے سے جاوید اختر نے ہنستے ہوئے کہا...'' مجھے لندن کی مشہور زمانہ میراتھن ریس (Marathon Race) یاد آرہی ہے۔ اس دوڑ میں حصہ لینے والے لوگ پورے برس تیاری کرتے ہیں۔ اس دوڑ میں تندرست لوگوں کے ساتھ ساتھ معذور افراد بھی حصہ لیتے ہیں۔ گزشتہ برس چھبیس ہزار (۲۶۰۰۰) افراد نے حصہ لیا تھا۔ یہ تو ایک صحت مند دوڑ ہے مگر آج کل ادب کے میدان میں بھی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کیا نثری نظم اور غزل، ہائیکو، ماہیئے، سب تجربات اچھے ہیں اور کچھ ادیب وشاعر تو دل جمعی سے کام کر رہے ہیں کہ اچھی تخلیقات پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور منہ کا مزا کر کرا نہیں ہوتا ورنہ گزشتہ چند برسوں میں ایسے شعرا منظرِ عام پر آگئے ہیں جو راتوں رات گوشۂ گمنامی سے نکل کر ایک سال میں چار کتابوں کے دھنی ہو گئے ہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں۔ مالِ مفت کا استعمال یوں بھی ہوتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں شہرت کی خاطر کتابوں کی رونمائی ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نثر نگاروں کو ابھی یہ بیماری نہیں لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا آج کا بیشتر ادب ہماری زندگی کا ترجمان نہیں۔ اچھے ادب کے تراجم کم ہو رہے ہیں۔ کتابیں وہی فروخت ہوتی ہیں جن کی پبلیسٹی (publicity تشہیر) ہوتی ہے۔ کتابوں کو سستا ہونا چاہیئے اور اس ضمن میں حکومتی ادارے معاونت کر سکتے ہیں۔ پبلیسٹی کی اس دوڑ کو دیکھتے ہوئے میں نے مدت سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بند کر رکھا ہے اور مشاعروں سے بھی کنارہ کش ہوں۔ بس اچھی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اچھا وقت گزر جاتا ہے''۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا...'' اردو ادب کو اپنا کر مجھے شہرت کے مقابلے میں عزت ملی ہے۔ اس بدولت مجھے آپ ملی ہیں۔ آپ کی رفاقت میں خسارہ کیا ہوگا۔ لہٰذا میں اردو زبان وادب کا شکر گزار ہوں کہ اس کے باعث میں تنہائیوں کے جہنم سے نکل گیا''۔

اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں بات چھڑی تو جاوید نے کہا...'' پاکستان میں مجھے اس کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں بھی اردو ادب کے لئے جو کام ہو رہا ہے وہ مایوس کن نہیں۔ ابھی چند دن قبل ہندوستان کے صدر ابوالکلام صاحب نے دلّی میں اردو اور پنجابی زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے احکامات جاری کیئے ہیں (حوالہ روزنامہ ''جنگ، لندن، مورخہ ۲۶/ جون ۲۰۰۳ء، صفحہ ۳، کالم ۱ اور ۲) اس کے باوجود کہ وہاں داغ کے مقبرے کو گرا کر بیت الخلا تعمیر کرنے اور ولی کے مقبرے کو زمین دوز کرنے کی روح فرسا خبریں آتی ہیں وہاں سے شائع ہونے والے اردو زبان کے جرائد اس کے خوش آئند مستقبل کی نوید دیتے ہیں جیسے ممبئی سے باقاعدگی سے ہر ماہ شائع ہونے والا جریدہ ''شاعر''، ''نیا ورق''، کلکتہ سے ''انشا''، الٰہ آباد سے ''شب خون، یوپی سرونج سے ''انتساب'' اور بہار در بھنگہ سے ''تمثیل نو''۔ یہ سب جرائد مالی انتشار کے باوجود اردو کے ناتواں شجر کی پائیداری کے لئے مسلسل انتھک محنت کر رہے ہیں''۔

رسم الخط کی تبدیلی کی جاوید نے شدت سے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا... ''ہمارا کلاسیک ادب کا خزانہ رسم الخط کی تبدیلی سے تباہ ہو جائے گا۔ میر تقی میر کے تذکرے سے لے کر محمد حسین آزاد اور دورِ حاضر میں آپ نے جو تذکرہ نگاری میں کام کیا ہے یہ سب کتابیں گمنامی کے غار میں چلی جائیں گی اور اس کے ساتھ وہ نام بھی جو آج اپنے کاموں کی وجہ سے زندہ و تابندہ ہیں''۔ انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا... ''یہ کام حکومت کا ہے کہ کسی بھی ایسی تحریک کو جو رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں ہو کامیاب نہ ہونے دے۔ ممکن ہے کہ آئندہ چند سالوں میں حکومت کو ایک سروے کے ذریعے عوام کی رائے جاننے کی ضرورت محسوس ہو تو اس ضمن میں یہ کتاب سخنور پنجم کام آئے گی جس میں رسم الخط کے حوالے سے اہلِ قلم کی مستند آرا شامل ہیں اور ساتھ ہی ان کے مشورے بھی''۔

جاوید بتا رہے تھے کہ انہیں اردو کے چند معتبر ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جب انہوں نے ان ادیبوں کو قریب سے دیکھا تو ان کی دورُخی پالیسیوں کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ ''ادیب اور شاعر اگر سچ لکھتا ہے تو پھر اس کی زندگی کے ہر ورق پر سچائی کی تحریر ہونی چاہیئے''...وہ کہہ رہے تھے ...''آج ہماری تحریر بے اثر ہے اور معاشرے میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان کے حالات پچاس پچپن برسوں کے بعد بھی نہیں سنبھلے۔ وجہ ہمارے لیڈروں کی بددیانتی اور غیر مخلصانہ پالیسیاں ہیں۔ یہی حال اخبارات کا ہے کہ انہیں سچ لکھنے کی اجازت نہیں۔ اور جب ہمارے ملک میں مارشل لاٗ نہیں ہوتا اور سچ لکھنے کی اجازت ملتی ہے تو ہمارے ایڈیٹر اور کالم نویس جو جھوٹ لکھنے کے عادی ہو چکے ہیں وہ خوشامد میں لگ جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اب ایسے کالم نویسوں نے ادب کی دنیا میں دخل در اندازی شروع کر دی ہے اور ناقد کا کردار ادا کر رہے ہیں، جو صحافت کی الف بے بھی نہیں جانتے اور نہ صحافت کی اخلاقیات سے واقف ہیں۔ وہ جس کو نوازنے کے موڈ میں ہوتے ہیں ان کے قصائد لکھتے ہیں اور جن کی ٹانگ کھینچنا مقصود ہوتی ہے اس کے بخیئے اُدھیڑنے لگتے ہیں۔ یوں نہ ہمارا آج کا ایڈیٹر سنجیدہ ہے اور نہ کالم نویس اپنے فرائض سے واقف ہیں اور واقف ہیں بھی تو لالچ اور خود غرضی کا شکار ہیں۔ انہیں من مانی کرنے سے روکنے والا ہے کون''؟

جاوید اختر کی زندگی کا اہم واقعہ ان کے استادِ محترم مرحوم عطا جالندھری کے وہ آخری لمحات ہیں جو موت سے قبل ان کے ساتھ گزرے تھے۔ دوسرا اہم واقعہ ایک میلے کا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے... ''ہم پاکستانی مہذب اقوام کے درمیان آن بسے ہیں مگر ہم نے اپنی عادتوں میں تبدیلی نہیں کی۔ میں اپنے بچوں کو لے کر کئی بار برمنگھم کے عید میلے میں شریک ہوا ہوں جو یہاں ایک خوب صورت اور وسیع کینن ہل پارک (Cannon Hill Park) میں لگتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے پاکستانی احباب سموسے، چپس کھاتے ہیں، کوک پیتے ہیں اور خالی تھیلیاں پارک میں اِدھر اُدھر پھینک دیتے ہیں جب کہ وہاں جگہ جگہ کچرے کے ڈبے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بار ایک برادر نے سموسے کی خالی تھیلی پھینکی تو ان سے ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑی ایک گوری خاتون نے وہ تھیلی اُٹھا کر ان سے کہا...'یہ آپ

کی ہے‘؟ بھائی ان کا منہ دیکھنے لگے۔ جب اس خاتون نے دوبارہ تنبیہہ کہا.. ’یہ آپ کی ہے‘ تب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ خالی تھیلی سرراہ پھینکنے کی نہیں کوڑے کے ڈبے میں ڈالنے کی ہے۔ میں دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور شرم سے اپنے آپ میں سمٹا جا رہا تھا کہ ہم پاکستانی کب خود کو مہذب قوموں میں شمار کرنے کے لائق خود بھی بنیں گے اور اپنے بچوں کو بھی یہ شہری آداب سکھائیں گے‘‘؟

’’اور میری زندگی کا اہم ترین واقعہ‘‘...وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے...’’ آپ کا میری زندگی میں شریک حیات کی حیثیت سے آنا، گویا ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے‘‘۔

Mr. Jawed Akhtar Choudhry,
2 Birchtrees Croft, Birmingham, B26 1EF, UK.

انتخابِ کلام

انجامِ زندگی پہ ہماری نظر نہ تھی
تھی دل فریب زیست مگر اس قدر نہ تھی

سوزِ غمِ حیات سے ہم بجھ کے رہ گئے
کیا شور اپنی ذات میں تھا کچھ خبر نہ تھی

یہ عقلِ نامراد لیئے در بدر پھری
لیکن بیانِ مدعا میں باہنر نہ تھی

دستِ خزاں نے دل کی کلی کو مسل دیا
شاید مرے نصیب میں بادِ سحر نہ تھی

احباب کا خلوص تھا فہمیدگی بھی تھی
لیکن دعائے دشمناں بھی بے اثر نہ تھی

دشمن نے میرے ملک کو دو لخت کردیا
اور رہبرانِ قوم کو کوئی خبر نہ تھی

دیتے تھے وہ تسلیاں جاوید کو ہزار
تخریب کاریوں میں بھی تو کوئی کسر نہ تھی

❖

گرتی ہوئی قدروں کے کھنڈر دیکھ رہے ہیں
ہم اہلِ وفا صورتِ دیوار ہیں صاحب

۱۶؍ فروری ۲۰۱۲ء

جاوید زیدی

ہیوسٹن، امریکہ

اس نے اپنے ایک ہاتھ میں اردو کا علم تھاما تھا، دوسرے میں قلم اور وہ لکھ رہا تھا۔

ولایت ہو کہ امریکہ، میری پہچان ہے اردو
مرا لوح و قلم، طبل و علم، ایمان ہے اردو
زباں کا روگ یارو، ماں نے یوں گھٹی میں ڈالا ہے
جہاں میں چار سو میری زباں کا بول بالا ہے
مرا خونِ جگر، فکر و نظر، طبعِ رواں اردو
وہ ہجرت ہو کہ غربت، ہے میری داستاں اردو
قفس اور آشیاں اردو، زمین و آسماں اردو
وہ جس کو اوڑھ کر سوتا ہوں، میرے خواب بھی اردو
ولایت ہو کہ امریکہ، میری پہچان ہے اردو

پھر اردو کے اس شیدائی نے اردو زبان کو محفوظ کرنے کے لئے "اردو ترجمہ بینک" کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا افتتاح جناب حمایت علی شاعر نے کیا۔ اُس وقت جاوید زیدی نے کہا تھا کہ اس ترجمہ

بینک کے قیام کا مقصد اردو کے علمی و ادبی سرمائے کو محفوظ کر کے اپنی نئی نسل تک پہنچانے کی ایک کاوش ہے۔ اس کے لئے انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ عام قاری اور سامع سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنی منتخب نگارشات کا ترجمہ کر کے انہیں بھجوائیں۔ جو ترجمہ نہ کر سکیں وہ اپنی تخیلقات ویسے ہی بھجوادیں تا کہ زیدی صاحب ان کا ترجمہ کریں۔ جاوید نے انگریزی سے کئی نظمیں ترجمہ کی ہیں اور اپنے چھوٹے بھائی عدیل زیدی کے مجموعے "چلتے چلتے" کا سارا کلام جاوید کے ترجمے کے ساتھ اس میں موجود ہے۔ ان کی ویب سائٹ کا پتا ہے www.urdutranslationbank.com اور ان کا ای میل ہے youngtrang@pdq.net اور خط و کتابت کا پتا ہے

12054 Miramar Shores-Drive, Houston TX 77065, USA

میں نے پوچھا: "جاوید! تم نے اردو سے عشق کا روگ کب سے پالا، صورت سے تو تم بھلے آدمی لگتے ہو"؟ حسب عادت جاوید نے ایک دیوار شگاف قہقہہ لگایا۔ چوں کہ اُس گھر کی دیواریں ان کی بیگم نسرین زیدی کی امان میں ہیں اس لئے جاوید کے "دھانسو" قہقہے کو جذب کر گئیں۔ قہقہہ رُکا تو جاوید بولے... "ارے آپا! کیا پوچھو ہو میر کے دین و ایماں کا۔ یہ روگ تو اُسی دن سے لگا ہے جب دنیا میں وارد ہو کر آنکھ کھولنے سے پہلے روئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے ہم روئے بھی اردو میں تھے اور اردو میں روتے ہی اردو کا غم گلے سے لگالیا۔ بقول خود ؎

یوں رفتہ رفتہ مری زندگی کے باب اُترے غمِ حیات، غمِ دوست، روزگار کے غم

غمِ دوست کا ذکر چلا تو جاوید نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا... "کیا شاعر تھا میرا دوست جون ایلیا۔ میرے سینے کو جدائی کے صدمے سے داغ کر چلا گیا۔ سنیئے! آپا سلطانہ مہر سنیئے ؎

سایۂ میر/ دیوار تلے/ ڈھل گیا ہے
دشتِ جنونِ وحشت/ اک آبلہ پا
بہل گیا ہے
جو کراہتا تھا/ تمام شب
وہ غریب جون مر گیا ہے

قہقہے لگانے والے شاعر کے تمام حوصلے بے دست و پا ہو گئے تھے۔ پھر نسرین، جو اس کی شریکِ زندگی اور شریکِ سفر ہیں اور اس کا مزاج سمجھتی ہیں، جاوید کو بہلانے کے گُر بھی جانتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں جاوید کے ہونٹوں پر بچوں کی مسکراہٹ تھی۔ "جاوید!"، میں نے فرمائش کی... "اچھے سے اشعار سنائیں"۔ جاوید گنگنانے لگے ؎

اس قدر انجمن میں تھے تنہا	ملنے جلنے کا فن نکھر آیا
کارواں منزلوں پہ جا پہنچے	اپنے حصے میں بس سفر آیا
وہ خوش نصیب ہیں زیدی	جن کو کوئی اپنا نظر آیا

پھر گفتگو کا رُخ شاعری سے اردو ادب کے مستقبل کی جانب پہنچا۔ جاوید کہہ رہے تھے ...''اردو کے سلسلے میں کہ بقول قرۃ العین حیدر، 'اردو کو ہندوستان سے ہائی جیک کیا گیا'، لیکن آج بھی اردو جسے وہ ہندی کہتے ہیں، نہ صرف برِصغیر میں بلکہ یورپ، افریقہ اور اب شمالی امریکہ میں بھی بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے'، میں ذاتی طور سے زبانوں کا معترف ہوں اور اس تہذیبی ورثے کو ہمیشہ جیتا جاگتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ نہیں معلوم کہ ارتقا کے ہاتھوں تہذیب وتمدن کے سفر میں کتنا عرصہ لگتا ہے لیکن زبان تہذیب کا اولین رکن ہے۔ اور اسے اپنی تہذیب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ میں اس سے قطعی طور پر مطمئن ہوں۔ 'عالمی اردو کانفرنس، لندن ۲۰۰۰ء' میں میرے مقالے کا موضوع یہی تھا۔ اردو والوں کو نئے ادب سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ علاوہ ان کے جو احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ارتقائی عمل دنیا کی تلخ حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ساتھ یہ عمل از خود لاگو ہوتا ہے۔ انگریزی، عربی اور ہسپانوی، ان سب زبان والوں کو یہی شکوہ ہے لیکن انہوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ ارتقائی عمل کے ساتھ اپنی روایت سے ناتا رکھنا ضروری ہے۔ اب رہی بات نئی نسل تک اپنی زبان وادب کے ورثے کو منتقل کرنے کی، تو اسی مقصد کے پیشِ نظر ہم نے 'اردو بینک' قائم کیا ہے۔ دیکھیئے اردو، فارسی، عربی اور سندھی کا رسم الخط مشترکہ ہے، جس طرح انگریزی، اسپینش، جرمن اور فرانسیسی۔ لیکن سب کے تلفظ اور معانی مختلف ہیں۔ اردو کو اپنے اوریجنل اور رومن رسم الخط میں زندہ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ عالمی اردو کانفرنس لندن اور عالمی اردو کانفرنس اقوامِ متحدہ نیویارک، دونوں میں ہم نے یہ مطالبہ زیرِ غور رکھا کہ اردو کے اوریجنل رسم الخط کے ساتھ رومن رسم الخط اور انگریزی ترجمہ کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر نئی شائع ہونے والی کتاب کو رومن رسم الخط اور انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا جائے۔ سلطانہ آپا! اس کی بنیادی رُکن آپ بھی ہیں۔ حمایت علی شاعر، حلیم سید، عدیل زیدی، عروج زیدی، یاور عباس، عاشور کاظمی اور زرین یاسین بھی ہیں۔ ہم نے اس بینک میں امیر خسرو سے لے کر دورِ حاضر کے شعرا و شاعرات کے کلام کو محفوظ کرنے کا کام شروع کردیا ہے۔ ہمیں تعاون چاہیئے۔ ہم انشااللہ کامیاب ہوں گے۔ اس کا مجھے یقین ہے''۔ جاوید کی آنکھوں میں اس کے عزم کی روشنی چمک رہی تھی۔

یہی پڑھا ہے کہ شاعری کو شاعر کی ذات کے بغیر سمجھنے کی کوشش جزو کو کل پر فوقیت دینے کی کوشش کے مترادف ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ شاعری سے شاعر کی زندگی، اس کی سوچ وفکر اور اس کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور اس صورت میں کہ شاعر خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کر رہا ہو، شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس پس منظر کے ساتھ مجھے سخنور اول تا چہارم کے دوران شعرا و شاعرات کے بارے میں لکھنے کے لئے ان کی شاعری سے بڑی مدد ملی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے بعض جگہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور بعض جگہ مصلحتاً، مجبوراً یا ضرورتاً پہلوتہی کی ہے۔ پھر ان کی شاعری کو فن کی کسوٹی پر پرکھنا میرا منصب بھی نہیں۔ لیکن جو شاعری دل کے عمیق گوشوں میں جا اُترتی ہے اس کے بارے میں اظہار نہ کرنا بھی بددیانتی سمجھتی ہوں۔

جاوید زیدی کو میں نے پڑھا ہے۔ ابھی ان کا کوئی مجموعۂ کلام منظرِ عام پر نہیں آیا۔ مگر جاوید کا جتنا کلام میری نظر سے گزرا ہے اس کے پیشِ نظر کہہ سکتی ہوں کہ جاوید نظموں اور غزلوں، دونوں اصناف پر ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دھیما پن ہے، خلوص ہے، اپنی تنہائی کا دکھ ہے اور ہجرتوں کی بخشی ہوئی تپش بھی ہے۔

سید جاوید اختر زیدی نجیب آباد، ضلع بجنور، ہندوستان میں ۶ / جنوری ۱۹۴۶ء کے دن پیدا ہوئے۔ قلمی نام جاوید زیدی اختیار کیا۔ انگریزی زبان کے معلم ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول شاعرانہ و ادیبانہ تھا۔ ان کے والد پروفیسر سید اختر رضا زیدی مرحوم ادیب، شاعر اور مورخ اور سندھ کے معروف معلمین (educators) میں تھے۔ جاوید کا رجحان شروع ہی سے ادب اور خصوصاً شعر کی طرف رہا۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی اور یوروپی ادب اور پھر امریکی ادب سے بھی انہیں سروکار رہا اور تا دمِ تحریر ہے۔

پاکستان میں محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہے۔ صحافت اور تشہیر (journalism & advertising) سے بھی خاصا تعلق رہا۔ امریکہ میں پچھلے اٹھارہ (۱۸) برس سے بحیثیت معلم ہائی اسکولوں اور کالجوں سے وابستگی رہی اور ہے۔ جاوید کہہ رہے تھے... "جو وقت غمِ روزگار سے بچ جاتا ہے وہ غمِ دوست کی نذر ہو جاتا ہے۔ ادبی و شعری محافل اور ریڈیو، مشاعروں اور اخبارات کے لئے لکھنا، پاکستان اور بھارت سے آئے اخبارات و رسائل و کتب کا مطالعہ بھی اچھی خاصی توجہ اور وقت چاہتا ہے۔ لیکن واقعہ ہے کہ جس دل جمعی کے ساتھ، سکونِ قلب کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کو جی چاہتا ہے، وہ میسر نہیں۔ بہر حال پھر بھی غنیمت ہے کہ میسر ہیں ہمیں یہ روز و شب بھی۔

مضمون نگاری، نظم و غزل اور خطوط پسندیدہ اصنافِ ادب ہیں۔ یوں میرؔ، غالبؔ، اقبالؒ، فیضؔ اور جوشؔ سے لے کر سلطانہ مہر تک کے فن کو سرمۂ چشم کرتا ہوں نئے شعرا اور ادبا کا مطالعہ کرنا اور انہیں تلاش کر کے متعارف کرانا میرا مشغلۂ جاں ہے۔ غزل کے مکتبۂ فکر میں میرؔ سے لے کر اپنے جون ایلیا تک اور نظم میں انیسؔ سے لے کر جوشؔ تک سب ہی قلم کاروں سے متاثر ہوں۔ دراصل نام نہیں، مجھے کام زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ خود نوشت، تاریخ، مجموعۂ سخن میری توجہ و دلچسپی خاص طور پر مطمحِ نظر رہتی ہے۔

میرا مجموعۂ کلام صلیبِ ہجرت زیرِ ترتیب ہے۔ دعا فرمایئے کہ زندگی کی صلیب سے اترنے سے پہلے میرے اشعار افقِ ادب پر نمودار ہو جائیں اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیا فرق پڑے گا؟

میری زندگی کا اہم واقعہ وہ دن ہے جب فرسٹ ایئر کالج میں بزمِ ادب قائم کرنے پر مجھے جوشؔ صاحب کی صدارت میں پہلا مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ زندگی کی یادگاروں میں سے ہے۔ جوشؔ صاحب نے کہا... 'میاں صاحب زادے، آپ کی مسیں نہیں بھیگیں، یہ آپ کن جان جوکھوں میں پڑ گئے'۔ وہ دن اور آج تک بقول انیسؔ عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں"۔

اب گفتگو ہو رہی تھی نثری نظم کے تجربات پر اور مشاعروں اور کتابوں کی فروخت پر۔ جاوید

بڑے پریم سے اپنی آپا کو سمجھا رہے تھے ..."سنیئے سلطانہ آپا! میری رائے میں نظم بہتر ذریعہ خیال ہے لیکن شعر میں موسیقی اور خیال آفرینی نہ ہو تو نثر میں مضمون نگاری، افسانے، ناول، خطوط، خودنوشت، طنز ومزاح میں بھی گویا بے حد گنجائش ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر شخص شاعری پر اصرار کرے یا شاعر نثر نگاری کرے۔ نثری نظم/غزل گویا کہ تجربے کی منزل میں ہیں اور ہماری طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ مشاعرے ہمارے تہذیبی روایت کی ایک کڑی ہیں۔ تخلیقی نشستیں بھی اپنا کردار ادا کرسکتی ہیں لیکن مشاعرے میں عوام الناس شاعر اور سامع کا ایک خاص ربط بنتا ہے جیسا نثر میں ادیب اور قاری کا۔

ایک نئی تحقیق کے معتبر حوالے سے دنیا میں کتب کی دکانیں سب سے زیادہ بڑھنے والا کاروبار ہے اور یہ اُن خطوں میں زیادہ ہے جو الیکٹرانک میڈیا میں ترقی یافتہ ہیں۔ پرنٹ میڈیا کا اپنا ایک مقام ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ البتہ کوالٹی کنٹرول اور مارکیٹنگ اور جہالت کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ فن کی حیثیت اول درجے پر ہے۔ صحت مند تنقید معاشرے کی ہر راہ میں مفید ہے لیکن پیشہ ورانہ تنقید اور تنقید برائے تنقید فن کار اور قلم کار کے لئے ناگزیر نہیں ہے اور فرمائیے۔ لیکن جانے سے پہلے میرا یہ شعر سنتی جائیے"۔ پھر آنکھیں بند کرکے گنگنانے لگے۔

یوں شعر اترے ہیں مجھ کم نصیب پر زیدی   زمینِ فکر پر جیسے نئی کتاب اترے

جاوید زیدی اور سلیم سید مل کر ریڈیو کا ایک پروگرام کرتے ہیں۔ بقول جاوید یہ شمالی امریکہ کا مقبول ادبی پروگرام ہے جو دنیا بھر میں اپنی ویب سائٹ پر سنا جاسکتا ہے۔ www.youngtrang.com

Mr. Javed Zaidi,
16334 Mellow Oaks, Sugarland, TX 77478, USA

انتخابِ کلام (جو ہوا نیو یارک میں)

آج دامن میں لگی آگ/ تو احساس ہوا/ آخر ہم کون ہیں
یہ آج ہمیں سوچنا ہے / ہم تو وہ لوگ ہیں جو اُنس کا لشکر لے کر
پار دریائے نفرت کے اُتر جاتے تھے/ کشتیاں اپنی جلا کر صاحب
نئی دھرتی کے خس وخاک میں مل جاتے تھے/ کیوں مقید ہیں ضرورت کی پناہ گاہوں میں
آج ایمان لئے پھرتے ہیں بازاروں میں!
دیکھیئے اُنس کی دیوار نہ گرنے پائے/ نسلِ انسان کا احساس نہ مرنے پائے
آیئے مل کے یوں بانٹ لیں دُکھ سکھ سب کے/ کوئی محرومی کا احساس نہ ہو
دشتِ نفرت میں اُگی پیاس نہ ہو/ جو ہوا نیو یارک میں وہ کاش نہ ہو!!

اے ہم نشیں دیکھ اسد کو قریب سے
ممکن ہے وسعتِ خاک میں صحرا دکھا ہی دے
اسد حسینی

سید اسد اللہ حسینی چکّر

لاس اینجلس، امریکہ

کچھ نہیں کرتے اگر تو شاعری کرتے رہو — سب سے بہتر ہے یہی اک مشغلہ، کہتے ہیں لوگ
اپنی بے علمی چھپانے کی غرض سے بزم میں — شعر سمجھیں یا نہ سمجھیں واہ واہ کہتے ہیں لوگ
ہیں ترے اشعار چکّر اس قدر مسحور کن — تو اگر دے گالیاں بھی مرحبا کہتے ہیں لوگ

اسد اللہ حسینی مشہور تو ہیں مزاح گو شاعر کی حیثیت سے، اور پھر اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال ان کی شاعری میں طنز و مزاح کی چاشنی کو دوچند کر دیتا ہے، مگر ان کی سنجیدہ شاعری بھی کچھ کم پُر اثر نہیں۔ اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے جو سنجیدہ نظمیں کہی ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں اور اپنے وقت کی ایک تاریخ مرتب کرتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کو ہوائی جہاز ٹکرانے سے نیویارک کے جڑواں ٹاور کی تباہی پر ایک نظم بعنوان "جارج بش کا پیام بن لادن کے نام" کہی۔ اس کے چند اشعار دیکھیے ؂

ہیں ہمارے قبضہ و قدرت میں سارے بحر و بر — ساری دنیا کو مٹا سکتے ہیں ہم چاہیں اگر
ہم تو جو چاہیں کریں گے، لوگ جو چاہیں کہیں — ہم سے اتفاق جو ر کھتے نہیں وہ چپ رہیں
ہم کو زندہ ہو یا مردہ ہو اُسامہ چاہیئے — سر نہ ملتا ہو تو اس سر کا عمامہ چاہیئے

ان کی دوسری نظم "۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد آج لمحۂ موجود" میں عراق پر امریکہ کی کرم فرمائی،

کی انہوں نے بہت پہلے پیش گوئی کردی تھی۔ موثر الفاظ میں زبان و بیان کی کاٹ کے ساتھ ان چند بندوں میں شاعر کے احساسات کی بہترین ترجمانی ملتی ہے۔

ان کو سمجھادو کہ امریکہ ہے اک 'سپر پوُر' — ساری دنیا "یولس اتے" کے ہی تو ہے زیر اثر
ہوں وہاں برباد گھر اور شہر ہوجائیں کھنڈر — تیل کے چشمے جہاں بھی ہم کو آجائیں نظر

ہم غضب دکھلائیں گے بھی تو کرم کے ساتھ ساتھ
تھیلیاں آٹے کی برسائیں گے بم کے ساتھ ساتھ

غالبؔ کے ہم نام اسد اللہ حسینی نظم کے ساتھ ساتھ نثر لکھنے میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے شیدائیوں میں سے ہیں اور ''غالب کا جذبۂ رشک و رقابت'' کے عنوان سے ایک طویل معلوماتی مضمون لکھ چکے ہیں۔ یہ مضمون لاس اینجلس کے ہفت روزہ ''پاکستان ٹوڈے'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اسے کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن اسد اللہ حسینی اس معاملے میں بڑے بے نیاز ہیں۔ احباب کے پُر زور اصرار کے بعد مارچ ۲۰۰۳ء میں ان کے کلام کا مجموعہ ''چٹکیاں'' حیدر آباد، دکن سے شائع ہوا ہے، وہ بھی ان کے برادرِ نسبتی کی کوششوں سے۔

سنتے آئے تھے کہ نام کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے۔ سو اسد اللہ حسینی پر بھی اسد اللہ خان غالبؔ کا اثر پڑا ہے۔ ان کے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا، لہٰذا اسد اللہ حسینی بھی یہ روایت قائم کریں گے اور ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' والے محاورے پر عمل کرتے ہوئے اسی ایک مجموعۂ کلام ''چٹکیاں'' پر اکتفا کریں گے، اس کے باوجود کہ دوسرے مجموعے کے لئے بھی ان کا بے شمار کلام منتظرِ لباس ہے۔

اسد اللہ حسینی حیدر آباد، دکن کے محلہ چنچل گوڑہ میں فروری ۱۹۲۵ء کے دن پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم سے گھر ہی میں حاصل کی جس میں اردو، فارسی (گلستاں اور بوستاں)، انگریزی اور حساب وغیرہ کے نصابی مضامین شامل تھے۔ ۱۹۳۸ء میں میٹرک درجہ اول میں پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی تکمیل کی۔ اپنے ہائی اسکول اور یونیورسٹی کے تعلیمی دور کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں کہ اس میں انہیں بڑے مشہور اور قابل ترین استادوں، پروفیسروں اور لکچراروں سے حصولِ تعلیم کا موقع ملا جو تعلیم و تدریس کو ایک نہایت ذمہ دارانہ اور شریفانہ مصروفیت اور پیشہ خیال کرتے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے محکمۂ اغذیہ (Food Corporation فوڈ کارپوریشن) اور دوسری جگہ اعلیٰ عہدوں پر ملازمت کی۔ جب حیدر آبادی حکومت (عثمان علی خان کی سلطنت) کو مرکزی حکومت ہندوستان میں شامل کرنے کی غرض سے حیدر آباد دکن پر ''پولیس ایکشن'' یا فوجی کاروائی کی گئی اور حیدر آباد دکن کو ''انڈین یونین'' کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا تو حیدر آباد کی حکومت کے بے شمار ملازمین (ادنیٰ سے اعلیٰ عہدوں تک) اس سیاسی انقلاب کا (خصوصاً مسلمان) بھیانک طور پر شکار ہوگئے۔ اسد اللہ حسینی صاحب نے بتایا کہ چونکہ یہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے والد صاحب نے ترکِ ملازمت کرکے (جب کہ یہ بفضلِ خدا برسرِ ملازمت تھے)، فوراً حیدر آباد دکن (شہریا

بلدہ) واپس ہونے کا حکم لکھ بھیجا۔ اور یہ حکم ملتے ہی آٹھ (۸) گھنٹے بعد ممبئی سے حیدرآباد جانے والی ٹرین (جو تقریباً پندرہ دن بند کردی گئی تھی) میں سوار ہوکر حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن سے سکندرآباد (شہر حیدرآباد کے نزدیک مشہور شہر اور فوجی چھاونی) تک پہنچنے میں جو مشاہدات، بھیانک اور روح فرسا مناظر ان کی آنکھوں نے دیکھے ہیں وہ ایک طویل اور دکھ بھری داستان ہے جس کو علیحدہ کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔

ترک ملازمت اور حیدرآباد میں واپسی کے بعد بعض احباب نے اپنے ساتھ انہیں پاکستان چلنے کا مشورہ دیا۔ لیکن انہوں نے اپنے والدِ محترم کی بے پایاں محبت اور ان کی قربت کے پیشِ نظر اس مشورے کو صاف ٹھکرادیا۔ پھر والد صاحب نے اپنے محکمۂ مال (Revenue Department ریوینوڈیپارٹمنٹ)، جہاں وہ معتمد (Assistant Secretary اسسٹنٹ سکریٹری) تھے، اہلکار درجہ سوم (3rd Grade Clerk تھرڈ گریڈ کلرک) کی اسامی پر ان کا تقرر کرادیا۔ یہ ایسی بات تھی جیسے انہیں ایک بلندی سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بڑی ہمت اور کشادہ پیشانی سے کام انجام دیتے رہے، جو ان کے احباب اور رشتہ داروں کے لئے ایک عبرت ناک اور افسوس ناک بات تھی، اس کے باوجود عہدہ داروں کے فرقہ ورانہ اور تعصبانہ جذبات اور خیالات نے انہیں پھر ایک بار بے روزگار بنا کر گھر بٹھادیا۔ اس زمانے میں ان کی شادی بھی کردی گئی تھی۔ لیکن ان کے والد نے پھر کوشش کر کے ملازمت دلانے والے محکمہ (Employment Department ایمپلامنٹ ڈیپارٹمنٹ) سے انہیں محکمۂ زراعت (Department of Agriculture ڈیپارٹمنٹ آف ایگریکلچر) میں دوبارہ اسی عہدے (اہلکار درجہ سوم) پر ملازمت دلادی۔ جہاں تین (۳) سال بعد ان کو ترقی ملی اور آٹھ (۸) سال بعد شعبہ تقرارت (Supdt. Section Officer) کا منتظم بنادیا گیا۔ اس عہدے پر یہ ستمبر ۱۹۷۰ء تک کارگزار رہے۔ ۱۹۶۸ء میں ان کے والد کے انتقال کے بعد ویسے بھی ان کی طبیعت حیدرآباد سے بیزار ہوچکی تھی۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ ان کا نام "مددگار ناظم" کی فہرست میں شریک کرلیا گیا تھا اور انہیں اس عہدے پر ترقی دی جانے والی تھی، انہوں نے ملازمت اور وطن، دونوں کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے بڑے سالے (برادرِ نسبتی) کی کوشش سے اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ کیلی فورنیا (امریکہ) آگئے، جہاں ان کے برادر نسبتی چودہ (۱۴) سال سے تھے اور اب خود اسد صاحب بھی بیس (۲۰) سال سے مقیم ہیں۔ اپنے خاندان کی کفالت کے لئے انہوں نے امریکہ میں ملازمت کی۔ بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد رقم جمع کی، مکان خریدا اور پھر ۱۸/ مارچ ۱۹۹۰ء کو وظیفہ (pension پینشن) پر سبکدوشی حاصل کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اسد صاحب بتاتے ہیں... "یہیں سے میری مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ اردو ادب اور انگریزی ادب کا طالب علم رہا ہوں اس لئے مجھے ہمیشہ سے ادب سے بے حد دلچسپی رہی۔ شاعری کے علاوہ میں چھوٹے چھوٹے مضامین، تنقیدیں اور تبصرے لکھا کرتا تھا جو مقامی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ شاعری کے تعلق سے

مجھے موسیقی سے بھی بہت کم عمری سے لگاؤ رہا۔ میری ادبی وابستگی میں وہ سارے محرکات اور اسباب شامل ہیں جو مجھے اسکول اور یونیورسٹی کے ماحول میں حاصل تھے۔ شاعری اس وقت اور اس زمانے سے میرے دل و دماغ میں گھر کرنے لگی تھی جب کہ شعر کا مطلب و مفہوم تو بہت دور کی بات تھی، مجھے شعر وزن کے ساتھ پڑھنا بھی مشکل سے آتا تھا۔ اس وابستگی کی سب سے بڑی وجہ اس کا بڑا محرک خود میرے والدِ محترم تھے، جن کو سعدیؒ، حافظؒ، غالب، میر، سودا، آتش، انشا، شیفتہ وغیرہ جیسے متقدمین و متوسطین شاعروں کے بے شمار اشعار یاد تھے اور وہ ہر موقع ومحل کے لحاظ سے ان شاعروں کے اشعار ترنم سے سنایا کرتے اور ان کا مطلب و مفہوم بھی سمجھایا کرتے تھے۔ ان کی آواز اور وہ اشعار آج بھی میرے حافظے اور سماعت میں محفوظ ہیں۔ اور غالب سے میری غیر معمولی وابستگی اسی کا نتیجہ ہے۔

شاعری سے وابستگی کا دوسرا محرک میرے اسکول کا ماحول تھا، جس میں میرے اساتذہ کی کافی تعداد شاعروں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ خود مجھے شعر کہنے کا شوق اس وقت پیدا ہوا جب حضرت فانی بدایونی مرحوم ۱۹۳۸/۱۹۳۹ میں میرے اسکول، چنچل گوڑہ ہائی اسکول، حیدرآباد کے ہیڈ ماسٹر بن کر آئے۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور حضرت فانی مرحوم ہمیں اردو نظم ونثر پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی پہلی غزل، جو پانچ مصرعوں پر مشتمل تھی، حضرت فانی کے گھر جاکر ان کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی تھی۔ ضرورت کے لحاظ سے اصلاح کردینے کے بعد غزل واپس کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا۔'اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ اس کی مشق جاری رکھو۔ اچھے شاعر بنوگے'۔ ان کے یہ الفاظ میرے لئے مشعل راہ تھے۔ میں نے غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہ بڑی دلچسپی سے ان کی اصلاح کرتے رہے اور میری حوصلہ افزائی بھی۔ لیکن یونیورسٹی جانے کے بعد اس کوشش میں کمی ہوگئی اور بات مشاعروں میں بکثرت شرکت پر ٹھہر گئی۔ اُدھر ملازمت اور پھر سیاسی انقلاب وغیرہ نے تو اس طرف سے میرا رخ ہی پھیر دیا۔ اب میں شعر گوئی کی طرف اسی وقت مائل ہوتا ہوں جب میں تنہا ہوتا ہوں اور اپنے ماضی وحال کے مشاہدات، تجربات، حادثات، سانحات، قلبی واردات اور احساسات پر اپنی پوری اور گہری فکر کو مرکوز کر سکوں اور اپنی اختیار تمیزی سے ان متفرق حصوں کو اشعار کی شکل دے سکوں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ایسے واقعات غیر متوقع طور پر واقع یا ظہور پزیر ہوتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ پر اتنا گہرا اور دیرپا اثر مرتب کردیتے ہیں کہ ہم چند ساعتوں یا دنوں تک اسی بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور آخر ہمارے قلبی جذبات ان کو نثر یا نظم کی شکل دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو مشاہدات یا تجربات میرے احساسات کو متحرک کردیں میں ان کو اشعار کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں، یہ عشق و عاشقی کی شکل میں یا اصلاحی طعن وطنز کی شکل میں، کیونکہ اب صرف نظریاتی اور تصوراتی شاعری کا زمانہ نہیں ہے۔ ہمارا مکتبِ خیال ہمارے اطراف واکناف کے ماحول اور لوگوں یا عوام کے رجحانات سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ پھر ابلاغ بھی بہت ضروری ہے ورنہ شاعری اور ادبی کاوشیں، دونوں بے فیض ہوکر رہ جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ اظہار اور ابلاغ میں چولی دامن والا معاملہ ہے"۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا... ''یہ بات بالکل درست ہے کہ ادبی اشاعتوں یا رسائل کی عدم مقبولیت سے نہ صرف نظم بلکہ نثر کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ لوگوں میں ادبی تصانیف یا کتابوں کے مطالعے کا ذوق وشوق بھی انحطاط پزیر ہوگیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ آج کل کا ادبی مذاق، رجحان اور طرزِ فکر کا انقلاب ہے جس کا تعلق ہماری بدلتی ہوئی دنیا اور ہمارے ترقی پزیر ماحول سے ہے۔ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے اس امریکی ماحول میں اردو زبان کی ترویج وترقی آج کل کا اہم ترین مسئلہ ہے جس کو تقریباً ہر ادیب اور اردو دوست شخص بہت تلخی کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ موجودہ نسل کو اردو زبان سے واقف رکھنا ہمارا بہت اہم ادبی اور اخلاقی فرض ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بچوں کے ماں باپ گھر میں ان سے صرف اور صرف اردو میں بات چیت کریں اور ان کو الفاظ کے معنی سمجھائیں اور ان کو اردو بولنے کی تاکید کریں اور اس کے لئے ہر وہ مناسب طریقہ اختیار کریں جو ان بچوں میں اردو زبان سے رغبت پیدا کر سکتا ہو۔ یہ صورت حال نہایت شدید اور فوری توجہ کی محتاج ہے''۔

میں نے پوچھا کیا ہمارا ادب ہمارے موجودہ عہد کا ترجمان ہے؟ حسینی صاحب کا جواب تھا ...''زندگی سے بھرپور ادب کی تخلیق صرف ایسی شاعری یا نثر سے ہوسکتی ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے عملی میدان سے ہو اور جو انسانی جذبات اور احساسات کا فطری اور حقیقی مظہر ہو اور وہ ہر انسان کو یکساں متاثر کرے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ آج کل کے ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار تو ہوسکتی ہیں لیکن اس کے عہد کی گواہ شاید نہیں ہوسکیں۔ ایسی شاعری جس میں کسی شاعر کے عہد کی تہذیب، رسم و رواج، طرزِ زندگی، معاشرت، علمی وادبی حالات وواقعات، مشاہدات وتجربات کو ظاہر کیا گیا ہو یا ان پر تنقید وتبصرہ موجود ہو تو اس عہد کی گواہ بن سکتی ہیں اور یہی صورت کسی ادیب کی نثر پارے یا کسی اور تحریر کی ہوگی۔ لیکن آج کی نظم ونثر میں یہ پہلو بہت کم نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بڑی شاعری کی پیدائش یا وجود، مطالعے کی وسعت اور مشاہدات وتجربات کی کثرت کا مرہونِ منت ہوتا ہے''۔

میرا اگلا سوال تھا... ''کیا مزاحیہ شاعری ویسی ہی مؤثر ہوسکتی ہے جیسی سنجیدہ تحریریں ہوتی ہیں''؟ حسینی صاحب بڑے اعتماد سے کہہ رہے تھے... ''یہ ایک حقیقت ہے کہ مزاحیہ شاعری طعن وطنز کا بہترین اور مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے بشرطیکہ اس میں بیان کردہ واقعات یا حالات کو سہل الفہم اور دل نشین طرز واسلوب کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اگر یہ خود مزاح گو شاعر کی ذات سے متعلق ہوں تو یہ اور بھی زیادہ اثر کن ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا شاعر خود اپنے آپ سے اپنی ذات ہی کو تنقید یا طعن وطنز کا ہدف بنا لیتا ہے اور ایک جیتی جاگتی مثال بن کر عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں اولیور گولڈ اسمتھ (Oliver Goldsmith, 1736-177) اس کی ایک تاریخی مثال ہے جس نے نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے باپ اور بہن کو طعن وطنز کا ہدف بنایا اور اسی وجہ سے انگریز ادیب وشاعر آج تک اُس کا نام بڑی تعظیم اور وقار سے لیتے ہیں''۔

اردو رسم الخط کی تبدیلی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''میں مارچ ۲۰۰۳ء میں حیدر آباد دکن سے لوٹا ہوں۔ میں نے وہاں اردو کے حالات مایوس کن نہیں پائے۔ کالجوں میں وہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ فکرمند تو ہمیں یہاں امریکہ اور یورپ میں ہونا چاہیے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اگر ہم اپنی نئی نسل کو اردو زبان نہیں سکھائیں گے تو پھر امید کس بات کی رکھیں۔ ببول بو کر پھولوں کی امید رکھنا نری حماقت ہے بی بی سلطانہ!''۔

اب آپ ان کے ایک قطعہ ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ انگریزی الفاظ کی پیوندکاری سے لطیف مزاح کیسے اوج پر پہنچ سکتا ہے۔

ویڈنگ (۱) کے دن وفاداری کا جو اقرار کرتا ہے ۔۔۔ محبت کا سرِ بازار بھی اظہار کرتا ہے
ہے ہر میریڈ ومن (۲) کو شکایت پھر بھی ہسبنڈ (۳) سے ۔۔۔ کہ بیوی سے زیادہ گرل فرینڈ (۴) سے پیار کرتا ہے

Mr. Syed A Hussain,
6545 Fulton Ave., # 204 Vannuys, CA 91401, USA

انتخابِ کلام

ہوگئی ہے لاپتا کل شام سے ۔۔۔ یوں سمجھ لو اب گئی وہ کام سے
عاشقی میں عمر بھر جھک مار کر ۔۔۔ باز آیا اب خیالِ خام سے
جب رہائی کی نہ تھی امید کچھ ۔۔۔ خود نکل کر آگیا ہوں دام سے
پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں راہ رَو ۔۔۔ جب گزرتی ہے وہ راہِ عام سے
ہے تمنا میں اُٹھالوں گود میں ۔۔۔ گر کے مرجائے اگر وہ بام سے
یاں مجھے ''باڈر'' (۵) کوئی کرتا نہیں ۔۔۔ سو رہا ہوں قبر میں آرام سے
امریکہ آتے ہی غافل ہوگئے ۔۔۔ شیخ اللہ سے برہمن رام سے
ایسی ویسی پر نظر ٹکتی نہیں ۔۔۔ جب سے آنکھیں لڑ گئیں گلفام سے
تم سے ملتے ہیں ہمارا ہے کرم ۔۔۔ ورنہ ملتا ہے کوئی بدنام سے؟
مرگیا ہے پھوڑ کر سر کوہ کن ۔۔۔ ڈر گیا تھا عشق کے انجام سے
وہ فقط جگر سمجھتے ہیں مجھے ۔۔۔ لوگ واقف ہی نہیں ہیں نام سے

۱۔ ویڈنگ (wedding) شادی؛ ۲۔ میریڈ ومن (married woman) شادی شدہ عورت؛ ۳۔ ہسبنڈ (husband) شوہر؛ ۴۔ گرل فرینڈ (girl friend) دوست لڑکی، معشوقہ؛ ۵۔ باڈر (bother) زحمت، پریشانی، تکلیف، دق کرنا، جان کھانا، ناک میں دم آنا وغیرہ۔

باسمہٖ تعالیٰ

بہت بلند مقامِ حیات ہے ہمدم
زمانہ ساز نگاہوں کو آگہی کیا ہے

حسن چشتی
۳۰ جنوری ۲۰۰۱ء

حسن چشتی

شکاگو، امریکہ

یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ شکاگو میں ''جشنِ حسن چشتی'' منایا جارہا تھا۔ اس موقع پر اردو زبان وادب کی عالم وجید ہستیاں موجود تھیں۔ کچھ تو ان دانشوروں کے علمی جلال وکمال کی روشنی اور کچھ حسن چشتی کی محبت بھری شخصیت سے پھوٹتی ہوئی روشنی نے ہال میں ایک معصوم سا نور پھیلا رکھا تھا۔ اس موقع پر کئی لوگوں نے اظہارِ خیال کیا، کچھ نے نثر میں اور کچھ نے منظوم۔ حیدرآباد، دکن کے اردو کے ریسرچ اسکالر اور لکچرار جناب قطب سرشار نے لکھا۔

عالم آدمیت جس کو ترستا ہے وہی — صدق واخلاص کے آثار حسن چشتی ہیں
صاحب شعروادب، مہرومروت کے نقیب — فکر واحساس کا اظہار حسن چشتی ہیں

سعید شہیدی نے لکھ کر بھیجا تھا۔

شکاگو میں چراغ اردو کا — تو نے روشن کیا حسن چشتی
تو نے خدمت جو کی ہے اردو کی — کوئی بھولے گا کیا حسن چشتی

اس موقع پر مشہور شاعر، صحافی اور سابق ایڈیٹر ''پاکستان لنک'' لاس اینجلس کے جناب رحمن صدیقی نے کہا... ''حسن چشتی نے پاکستان لنک کے ذریعے کئی نئے قلم کاروں کو متعارف کرایا ہے۔ ہر

کس و ناکس کی خدمت کرنا حسن چشتی کی گھٹی میں پڑا ہے"۔

اس تقریب میں اور احباب نے کیا کہا وہ بھی کم دل چسپ نہیں۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس وقت میں یہ کہنا چاہوں گی کہ خدا نے حسن چشتی کی ذات میں بہت سی خوبیاں بھر دی ہیں۔ ایسی خوبیاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو عطا کی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ ان خوبیوں سے دوسروں کو فیض پہنچاتے ہیں اور کچھ صرف اپنی ذات کو فیض یاب کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان صلاحیتوں کو کام میں لانا صرف بلند حوصلہ لوگوں یا قوموں کا مقدر ہے۔ ایسے لوگ مثبت طرز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ حسن چشتی کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں کرنا چاہوں گی۔ وہ ایک چراغ کے مانند ہیں جس کی روشنی میں لوگ اپنی منزلوں کا سراغ پاتے ہیں۔ حسن چشتی سے جو ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا سحر ہے ہی ایسا جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ لوگوں نے انہیں 'سفیر اردو' اور 'دلبر فتنہ' کے خطابات سے بھی نوازا ہے۔ وہ دوستوں کے دوست ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جن کا میری نظر میں کوئی دشمن نہیں۔ وہ جس سے ملتے ہیں پھر وہ انہیں دوبارہ یاد کرے یا نہ کرے حسن چشتی اس سے برابر رابطہ رکھتے ہیں۔ مشہور طنز نگار اور ابراہیم جلیس کے بھائی مجتبیٰ حسین کہتے ہیں... "حسن چشتی ہمارے ان دوستوں میں سے ہیں جو پچھلے انیس بیس برس سے رہتے تو دیار غیر میں ہیں لیکن کچھ اس ڈھنگ سے کہ کبھی ہمیں احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ہم سے ہزاروں میل کی دوری پر ہیں۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا کہ ان کا خط اور خط نہیں تو فون اور فون نہیں تو ان کا کوئی دوست نہ آیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ہم حیدرآباد میں تھے تو ہمارے اتنے گہرے مراسم کے باوجود ربط ضبط اتنا نہ تھا جتنا اب ہے۔ جینے کی یہ ادا اور پرانے دوستوں پر محبت نچھاور کرنے کا یہ سلیقہ اور ہزاروں میل دور رہ کر بھی دوستوں کو اپنی رگ جاں سے قریب رکھنے کا یہ اہتمام کتنا زندگی بخش ہے"۔(۱)

ان کے ایک دوست محمد نور الدین خان نے انہیں 'یوسف گم گشتہ' کہہ کر لکھا ہے... "حسن چشتی میں ایک پوشیدہ نیکی بھی ہے(۲)۔ ان کے چہرے کی موہنی مسکراہٹ ان کی شناخت بن گئی ہے"۔

شکاگو کے صحافی ایس زیڈ حسن نے لکھا ہے ... "یہ آدمی نہیں چلتا پھرتا سماج ہیں۔ ایک گشتی معاشرہ ہیں، ان کی ذات میں باپ کی شفقت، بیٹے کی سعادت، پڑوسی کی ہمدردی، شوہر کی ذمہ داری، شاعر کی حسیت، ادیب کی جراحی، دوست کی مہربانی، غرض وہ تمام جذبے جو باہم مل کر ایک مکمل معاشرہ بناتے ہیں، وہ تمام کے تمام اپنی اصلی صورتوں میں حسن چشتی کے اندر جذب ہو کر رہ گئے ہیں"۔ ان کے شاعر دوست خواہ مخواہ حیدرآبادی نے ان کے جشن کے موقع پر "منظوم محبت نامہ" پیش کیا۔ یہ اشعار بڑے دل نواز ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

۱۔ پچھلے دنوں حسن چشتی نے مجتبیٰ حسین کی چالیس سالہ مزاح نگاری کے کالموں اور خاکوں کا انتخاب بعنوان "مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں اور مجتبیٰ حسین کے سفر نامے" دو جلدوں میں مرتب کر کے طبع کرائی ہیں۔ سلطانہ مہر

۲۔ کار خیر کا ایک خفیہ فنڈ جس سے حسن چشتی ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔

جہاں ہنسنے ہنسانے، روح ہم سب کی ترستی ہے
حسن چشتی کی یہ محفل، گرانی میں بھی سستی ہے

فقط "دیوان[۱]"، کیا، سارا شکاگو ہے چمن ان کا
گزرتے ہیں جدھر سے پیار کی خوشبو مہکتی ہے

لبھا لیتے ہیں دشمن کو بھی زیرِ لب تبسم سے
دل ان کا دوستوں کے حق میں ارمانوں کی بستی ہے

نوزا ہے انہیں اللہ نے یوں دستِ قدرت سے
نظر اُن سے ملانے کو ترقی بھی ترستی ہے

سحر آمیز ہے کچھ اس قدر حُسنِ حَسن چشتی
کہ ان سے عشق کرنا بھی صریحاً بت پرستی ہے

ضعیفی پر شباب آیا ہوا لگتا تو ہے لیکن
شریر آنکھوں میں اب بھی نوجوانوں کی سی مستی ہے

خلوص و پیار کے تشنہ لبو، آؤ شکاگو میں
حسن چشتی کے میخانے میں ہر دم مے برستی ہے

وہاں نشو و نما اردو کی مشکل ہی سے ہوتی ہے
زباں کے مسئلے پر بھی جہاں مطلب پرستی ہے

جو اردو کے چمن کو خواہ مخواہ سیراب کرتی ہے
گلستانِ ادب میں وہ حسن چشتی کی ہستی ہے

اس موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی و علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر نے، جشن و مشاعرے کی اپنی صدارتی تقریر[۲] میں حسن چشتی کے والد اور پھر ان کی شخصیت کا سراپا جس پیارے انداز میں کھینچا ہے وہ ان ہی کے قلم کا کمال ہے۔ فرماتے ہیں ...

''حسن چشتی کے والدِ محترم مولوی سمیع احمد صاحب سے عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی (۱۹۳۸ء۔ ۱۹۴۴ء) میں واقف تھا۔ ان کی ایک خاص ہستی تھی اور وہ دفتر کے منتظم تھے، لیکن ان کے گورے چٹے رنگ اور ان کی وجاہت کی وجہ سے وہ اکثر پروفیسروں سے زیادہ جاذب نظر آدمی تھے۔ وہ آزادی کے مجاہدین کی طرح سفید کھدر کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ اُس زمانے میں صرف دو چار بزرگ ایسے تھے جو حضور نظام کی رعایا ہونے کے باوجود اور حکومت کی پالیسی کے خلاف مغربی کپڑوں کا بائیکاٹ کر کے کھدر پہنتے تھے۔ ان میں بیرسٹر اکبر علی خان، نواب میر احمد علی خان، پروفیسر جعفر حسن اور چند دیگر لوگ شامل تھے۔ ان کے مقابلے میں ہم لوگ ہیں کہ بظاہر مغرب کے مخالف ہیں لیکن ہجرت کر کے مغرب کو بسا رہے ہیں اور مغرب کی ہر ایجاد کی ہوئی چیز کو مغرب کے قرض کے نظام سے خرید کر ہمیشہ مقروض رہتے ہیں۔ اور پھر اس قرض کی وجہ بتا کر مغرب کو برا کہتے ہیں۔

مولوی سمیع احمد صاحب لڑکوں کی بڑی مدد کرتے تھے اور اسی لئے ہم لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔
چشتی صاحب مجھ سے عمر میں چھ سال چھوٹے ہیں۔ یہ نہ تو میری طالب علمی کے زمانے میں یونیورسٹی میں تھے اور نہ ہی میری وائس چانسلری کے زمانے میں لیکن انجینیئر نگ کے طلبہ جو میرے عزیز تھے ان سے ان کی خبر ملتی رہتی تھی کہ یہ بھی اپنے والدِ محترم کی طرح سب کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ویسے ان سے چند مرتبہ ملاقات ضرور ہوئی تھی۔

۱۔ شکاگو میں ایک سڑک "Devon Avenue" ہے۔ اس پر برصغیر کے کاروباریوں کی کئی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مقیمین کے لئے اشیائے خورد و نوش، ملبوسات، تفریحی سامان مثلاً موسیقی کے ٹیپ اور کتابیں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔

۲۔ پورا خطبہ بعنوان ''حسن چشتی ... ہر کسی کے کچھ نہ کچھ کام آنے کے لئے بے چین شخصیت'' روزنامہ منصف، ۲۶/ جولائی ۱۹۹۸ء میں چھپا۔ ہاشم علی اختر جون ۲۰۰۳ء کو شکاگو میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا علیہ راجعون۔

ہم ہندوستانی مغربی قوموں کے رنگ کے تعصب کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن رنگ کی جو اہمیت برصغیر میں ہے اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میرے رنگ کی وجہ سے، جب تک میں سول سروس میں منتخب نہیں ہوا تھا اور محض لکچرار تھا، شادی کے مارکٹ میں میری کوئی قدر نہیں تھی۔ لیکن امتحانی مقابلے میں اول آتے ہی سارے نواب خاندان مجھ میں دل چسپی لینے لگے۔ اسی طرح شادی کے اشتہاروں میں لڑکی کے فیئر کلر (fair colour کھلا رنگ) ہونے کا ذکر لوگوں کو متوجہ کرلیتا ہے اور یہ کمزوری مجھ میں بھی ہے۔ میں جب کسی سے ملتا ہوں تو اس کا گورا رنگ مجھے متاثر کرتا ہے۔ حسن چشتی گورے ہی نہیں خوش جمال بھی ہیں۔ ہمارے زمانے میں مخلوط تعلیم نہیں ہوا کرتی تھی، اس لئے ہمارے وقتوں کے لوگ صرف حسن دیکھتے ہیں صنف نہیں دیکھتے۔ لہٰذا حسن چشتی کا پہلا حربہ ان کی وجاہت ہے اور پھر آدمی ان کی دوسری خوبیوں سے واقف ہونے لگتا ہے۔

میں نے کئی برس پہلے ریڈرز ڈائجسٹ (Reader's Digest) میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ عنوان تھا ''دے ریٹائرڈ اینڈ گاٹ بزی (They Retired and Got Busy)۔ اس میں ایسے لوگوں کا ذکر تھا جو ریٹائر ہونے کے بعد بھی اپنی پچھلی زندگی سے زیادہ کامیاب رہے۔ حسن چشتی اس کا اچھا نمونہ ہیں۔ قبل از وقت ملازمت سے وظیفہ لینا ہمت کا کام ہے اور پھر اس عمر میں ایک نہیں دو دفعہ ہجرت کرنا کسی بھی بے ہمت سے ممکن نہیں۔ ۱۹۹۱ء میں جب میں یہاں مہاجر بن کے آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ حسن چشتی شکاگو ایریا میں حیدرآباد کے پبلک ریلیشنز افسر یا پی آر او (P R O) ہیں۔ مجھے کئی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے میرا پتا یا ٹیلی فون نمبر حسن چشتی سے حاصل کیا۔ چار پانچ خطوط میرے پاس ایسے ہیں جن میں کسی نے اپنی لڑکی کے لئے بر کی تلاش یا زر کی تلاش میں خط لکھا تھا یا اور کسی مدد کے لئے، اور انہوں نے لکھا تھا کہ حسن چشتی صاحب کو بھی خط لکھا ہے۔

سرکاری ملازمت کی تعریف کسی نے کی ہے کہ وہ مفلسی اور گمنامی کا نام ہے۔ برصغیر کی یونیورسٹی کی ملازمت مفلسی اور بدنامی کا نام ہے۔ حسن چشتی نے یہاں آ کر تجارت شروع کی اور اللہ کے فضل سے تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن مفلسی کے دور کے بعد اس افراطِ زر نے ان کے جسم پر کوئی اثر نہیں کیا اور خوش حالی کے باوجود ان کی خوش اخلاقی باقی رہی اور وہ افراطِ جمال میں مبتلا نہیں ہوئے۔ آپ نے افراطِ زر یا ان فلیشن (inflation) کی اصطلاح تو سنی ہوگی۔ عام لوگ عمر اور دولت میں اضافے کے ساتھ افراطِ جمال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں افراطِ جمال کی تعریف اس طرح کرتا ہوں کہ اگر کوئی حسین محض موٹا ہو جائے تو جس طرح روپیہ کی قوت خرید میں کمی ہو جاتی ہے، حسن یا چارم (charm) کی مجموعی مقدار تو وہی رہتی ہے لیکن اس کی فی مربع انچ مقدار کم ہو جاتی ہے۔ ان کی خوش اخلاقی شاید کنول پرشاد کنولؔ کے اس شعر کی صداق ہو جاتی ہے۔

ملو ہر ایک سے ایسے کہ پھر ملیں نہ ملیں — نہ جانے کونسا لمحہ بلانے آجائے

حسن چشتی ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی اور کتنے ہی اردو اخباروں اور رسالوں کے نمائندے کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمت اس ملک فرنگ میں کر رہے ہیں۔ اور حیدرآبادی تہذیب کے نمائندے کی حیثیت سے ہر مذہب و قوم کے لوگوں میں ہر دل عزیز ہیں۔ حسن چشتی کی زندگی وہاج الدین شمیم کے ان اشعار کی تفسیر معلوم ہوتی ہے''۔

تمنا یہ نہیں ہے کام کچھ نایاب ہو مجھ سے — دعا یہ ہے شگفتہ خاطر احباب ہو مجھ سے

پتھروں میں چشمہ سا دنیا میں سرگشتہ و آوارہ   کوئی سوکھی ہوئی کھیتی کبھی سیراب ہو مجھ سے

حسن چشتی کی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں لاس اینجلس کی "امریکن اردو رائٹر سوسائٹی کی جانب سے چیر پرسن، سلطانہ مہر نے انہیں ۲۰۰۱ء "حاصل زندگی ایوارڈ (Life-time Achievement Award)" سے نوازا۔ موصوفہ نے اس موقع پر جن خیالات [1] کا اظہار کیا وہ ذیل ہیں۔

کوئی شخص بھی زندگی کرنے کے مسائل سے نبرد آزما ہوئے بغیر اپنی منزل نہیں پاتا۔ یہ زندگی تو دکھوں اور آلام ہی کا دوسرا نام ہے۔ مگر حسن چشتی صاحب نے اپنی زندگی کے سارے دکھوں کو ایک ایڈونچر (adventure) بنا لیا ہے اور دوسروں کے دکھوں کا درماں بن گئے ہیں۔ انہوں نے حسن چشتی کو "خاموش خضر" کا خطاب دیا۔

پرائے درد کو اپنا ہی درد جانا ہے   ہم اہل درد کا رشتہ بڑا پرانا ہے

یہی بات جناب اقبال متین نے بھی حسن چشتی کا تعارف کراتے ہوئے کہی ... "حسن چشتی کے بڑے چھوٹے، سارے ہی رفاہی کاموں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ حیدرآباد میں جب حسن تھے تو وہاں بھی ادیبوں اور شاعروں کے دکھ اور بیماری میں اعانتی مشاعرے منعقد کرانے کے جتن کیا کرتے تھے۔ کینسر کے موذی مرض میں گرفتار طالب رزاقی کی اعانت کے لئے انہوں نے خواتین کا مشاعرہ منعقد کرایا تھا"۔

میں نے حسن چشتی سے جب بھی گفتگو کی یا جب بھی ٹیلی فون پر ان سے باتیں ہوئیں، ہمیشہ ہی میں نے محسوس کیا کہ حسن چشتی میرے سامنے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ مسکراہٹ کی یہ سوغات بانٹنا ان کی عادت ہے۔ اس کی تصدیق تو ہر اس شخص سے ہوگی جو ان سے ملا ہے۔ میں نے انہیں تصور میں بھی مسکراتے ہی دیکھا ہے۔ میرا تصوراتی نقش جھوٹا نہیں۔ اس کی تصدیق راولپنڈی کے امین راحت چغتائی اس طرح کرتے ہیں کہ جب حسن چشتی صاحب کو پہلی بار دیکھا تو ایسا لگا جیسے" چاند چہرے پر مسکراہٹ ایسی کہ ساری کائنات مسکراتی نظر آئے"۔ اقبال متین لکھتے ہیں... "مسکراتی آنکھیں اس کے اخلاص کو جب اس کے ہونٹوں پر بکھیر رہی تھیں تو پتا بھی نہ چلا کہ اس چمک دمک کے پیچھے کسی اشک چشیدہ دل حزیں کی گھلاوٹ بھی شامل ہے"۔ جدہ (سعودی عرب) کے شجاعت علی راہی نے کہا ... "حسن چشتی صاحب کام بھی کرتے ہیں اور مسکراتے بھی ہیں۔ اور یہ دونوں کام یقیناً عبادت کے زمرے میں آتے ہیں"۔ توفیق انصاری شکاگو سے لکھتے ہیں..." شکاگو کے بھتے بازار دیوان ایونیو کے گردونواح میں روشنی کا یہ چلتا پھرتا مسکراتا مینار دیکھنے والوں کو جگہ جگہ نظر آتا ہے"۔ کینیڈا کے تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا ہے..." حسن چشتی کی سدا بہار مسکراہٹ، مستقل مزاجی اور جذبۂ خدمت خلق نے انہیں ہر دل عزیز بنا دیا ہے"۔

۱۔ پورا مضمون بعنوان "حسن چشتی... سارے جہاں کا درد ان ہی کے جگر میں ہے" روزنامہ منصف، یکم اپریل ۲۰۰۱ء میں چھپا۔

جو شخص اتنا اچھا انسان ہو وہ اچھا شاعر کیوں نہ ہوگا۔ اچھی شاعری بھی تو تب وجود میں آتی ہے جب نظر میں وسعت ہو اور انسانی دردمندی زادِ سفر ہو۔

حسن چشتی ۱۵ / اکتوبر ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب، سمیع احمد کا تعلق صوبہ بہار میں ضلع گیا سے تھا۔ وہ اپنے وقت کے کٹر نیشنلسٹ (nationalist حامیِ قوم) تھے۔ اردو کی پہلی جامعہ (مادرِ عثمانیہ) کے منتظم بھی تھے اور حسرت موہانی مرحوم کے گہرے دوست۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے والے اور پرورش پانے والے حسن چشتی کو دردمندی کے ساتھ شعری ذوق ورثے میں ملا۔ حیدرآباد کے انوار العلوم سے میٹرک کیا۔ اور بتدریج تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں حیدرآباد، دکن سے نکلنے والے ماہنامہ ''پاسبان'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ان کی رومانی شاعری کا آغاز تو ۱۹۴۶ء سے ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں ہی انہوں نے بڑی مرصع غزلیں اور نظمیں کہیں۔ ۱۹۷۲ء میں معاون رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدے پر فائض ہوئے۔ ان ہی دنوں انہوں نے جامعہ عثمانیہ کی اسٹاف ایسوسی ایشن کے قیام کے لئے بڑی جدوجہد کی اور طویل عرصے تک، بانی تو تھے ہی، اس کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے رضاکارانہ طور پر وظیفہ حسن خدمت کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے سبکدوشی اختیار کی۔ ۱۹۷۸ء میں جدہ (سعودی عرب) گئے اور وہاں پر بھی انہوں نے علم و ادب کے شیدائیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ''حیدرآباد ایسوسی ایشن، جدہ'' قائم کی جس کے بینر تلے سماجی، فلاحی اور ثقافتی خدمات انجام دی جانے لگیں۔ اس انجمن کے علاوہ انہوں نے علمی و ادبی خدمات انجام دینے کے لئے ''بزمِ اردو، جدہ'' کی بنیاد ڈالی اور عرصے تک اس کے صدر بھی رہے۔ اس کے تحت پہلا بزمِ اردو جدہ ایوارڈ مبلغ پانچ ہزار (۵۰۰۰) سعودی ریال کی شکل میں حیدرآباد کے مشہور شاعر شاذ تمکنت کو ان کے علاج کے لئے دیا گیا۔

سعودی عرب میں آٹھ سال کے قیام کے بعد حسن چشتی ۱۹۸۵ء میں امریکہ آ گئے۔ یہاں بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے۔ شکاگو میں انہوں نے ''نان ریزیڈنٹ انڈین ایسوسی ایشن'' قائم کی۔ اب بھی یہ اس کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسٹیٹ نے انہیں ''کک کاونٹی'' کا نوٹری پبلک (Notary Public in Cook County) مقرر کیا۔ یہ خدمات تقریباً ایک عشرے سے انجام دے رہے ہیں۔ حسن چشتی کی کوششوں کے نتیجے میں شکاگو پبلک لائبریری کلچرل سینٹر کی جانب سے شعبہ جنوبی ایشیا کی توسیع عمل میں لانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر کی گرانٹ کی منظوری سے شکاگو کے کتب خانوں میں اردو کے علاوہ ہندی، بنگالی، تامل اور گجراتی کتب فراہم کی گئیں۔ انہیں بزمِ اردو شکاگو کے بانی اور سکریٹری جنرل ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اس ادارے کے تحت بین الاقوامی مشاعرے اور علمی کانفرنسیں ہر سال منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ عالمی اردو کانفرنس، دہلی کی جانب سے انہیں علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ''اسرار الحق مجاز عالمی ایوارڈ'' بھی دیا گیا۔

حسن چشتی پر شعروں کی آمد بھی اس وقت ہوتی ہے جب ان کے سازِ دل پر ضرب لگے۔

حسن کے اسکول کے ساتھی اور دوست شاذ تمکنت کی موت کی خبر ملی تو آنسوؤں کی خاموش برسات میں ان کا زخمی دل فریاد کناں ہوا۔

وہ میرا ہم سبق، مرا ہمدم، وہ میرا شاذ — جو روٹھتا تھا مجھ سے بہت کم وہ میرا شاذ
زلفِ سخن سنوار کے خاموش ہوگیا — دن تھے ابھی بہار کے خاموش ہوگیا
دیوانہ تھا پکار کے خاموش ہوگیا — اب اوڑھ کے سفید کفن شاذ تمکنت

چپ ہوگیا ہے جانِ چمن شاذ تمکنت

حسن کہتے ہیں شاعری میں ابلاغ پہلی شرط ہے ورنہ تحریر بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اپنے شعر کا حوالہ دیتے ہیں۔

یوں تو پہلے بھی ملا زہر بھرا جام مجھے — اب بھی سقراط مرا نام ہے کیا عرض کروں

حسن چشتی سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنا شعری سفر طے کر رہے ہیں۔ منزل سے بے نیاز ہر انسان کے دکھ درد کو سمجھ کر تعصب کی دیواریں گرا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے۔

پھر کوئی آبلہ پا گرم سفر ہے شاید — دشت کے نام بہاروں کا سلام آیا ہے
جانے کیوں جانبِ منزل نہیں اٹھتے ہیں قدم — شاید اے دل کوئی دشوار مقام آیا ہے

حسن چشتی نے اپنے غم کو، چاہے وہ غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں، انسانی برادری کے الم میں چھپالیا۔ ان کی اس جدو جہد میں ان کی شریک حیات زینت ان کا ہاتھ تھامے قدم بقدم ساتھ چل رہی ہیں۔ یوں قدم ملا کر چلنے سے اکیلا آدمی کبھی تھکتا نہیں اور تاریک راہوں پر کامیابی کے چراغ آپ ہی آپ روشن ہونے لگتے ہیں۔

تری نگاہ کرم ہے تو پھر کمی کیا ہے — ترے نثار مجھے فکرِ زندگی کیا ہے
عجیب شے ہے محبت کا جذبۂ رنگیں — پھر اس کے بعد بساطِ غم و خوشی کیا ہے
مری نظر ہے بہارِ چمن کی جلوہ شناس — میں جانتا ہوں مآلِ شگفتگی کیا ہے
بہت بلند مقامِ حیات ہے ہمدم — زمانہ ساز نگاہوں کو آگہی کیا ہے

الجھ رہے ہیں فریبِ نشاط میں جو حسن
سمجھ سکیں گے وہ کیا غم کی زندگی کیا ہے

حسن چشتی کے مداحوں میں شکاگو کے شاعر اور افسانہ نگار واجد ندیم بھی ہیں۔ انہوں نے اس جشن کے موقع پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

محبت، مروت، وفا بانٹتے ہیں — ہر اک درد و غم کی دوا بانٹتے ہیں
تبسم، تکلم ادا بانٹتے ہیں — تکلم، تبسم فزا بانٹتے ہیں
برائی کے بدلے بھلا بانٹتے ہیں — جفاؤں کے بدلے وفا بانٹتے ہیں
محبت کا ان کی گھلا رنگ جس میں — حسینوں کو ایسی حنا بانٹتے ہیں

لگا کر دکاں قلب 'دیوان' میں یہ — محبت کی اک اک ادا بانٹتے ہیں
انھیں لاکھ نفرت کے شعلے مگر یہ — محبت کی ٹھنڈی ہوا بانٹتے ہیں
سخن کڑوے کڑوے مٹانے کی خاطر — بہت میٹھی میٹھی صدا بانٹتے ہیں
خلوص و محبت کی پھیلا کے خوش بو — حسینوں کو رنگِ وفا بانٹتے ہیں
جو بیٹھے ہیں معصوم صورت بنائے — یہی دردِ دل کی دوا بانٹتے ہیں

دکاں پر ندیم ان کی جائیں گے اک دن
یہ دیکھیں گے ہم کو وہ کیا بانٹتے ہیں

حسن چشتی غزل ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھار نظم بھی کہہ لیتے ہیں، نثری نظم انہیں پسند نہیں۔ وہ اردو کا رسم الخط بدلنے کے حق میں قطعی نہیں کہ یہ رسم الخط ہی نہ صرف اردو کی بلکہ اردو کے پرستاروں کی شناخت ہے۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ وہ اس دن کو قرار دیتے ہیں جب انہیں ان کی وفا شعار شریک حیات ملیں۔

Mr. Hasan Chisti,
7033 N Kedzie, Apt. # 112, Chicago, IL. 60645, USA

انتخابِ کلام

وہ گلستاں کہ جہاں اپنا آب و دانہ ہے — اسے بھی برق و شرر نے عزیز جانا ہے
جہاں بھی شام ہوئی، بس وہیں ٹھکانا ہے — نہ کوئی شاخ ہے اپنی نہ کوئی آشیانہ ہے
پرائے درد کو اپنا ہی درد جانا ہے — ہم اہل درد کا رشتہ بڑا پرانا ہے
دکن گئے تو ملے فرشِ راہ دیدہ و دل — خلوص کیا ہے، یہ ہم نے وطن میں جانا ہے
جہاں نہ ٹھیس لگے دل کے آبگینوں کو — وہی قبیلہ ہے اپنا، وہی گھرانا ہے
گئے ہو جب سے، ہر اک سمت ہُو کا عالم ہے — بہت اداس ہمارا غریب خانہ ہے

غریب شہر ہیں لیکن کلاہ کج ہے حسن
یہ بانکپن تو ہمارا بہت پرانا ہے

❊•❊

امیرِ شہر بلاتا ہے اس لیے مجھ کو
میں دل جلاؤں گا، محفل میں روشنی ہوگی
حضرت شاہ
20/1/2003

حضرت شاہ

بریڈفورڈ، برطانیہ

ایک دن غیر متوقع طور پر حضرت شاہ کا فون آیا۔ وہ بریڈفورڈ میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں ہمیں مدعو کر رہے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں احباب کی زبانی بہت کچھ سن رکھا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حضرت شاہ جب تک آسودہ حال تھے بریڈفورڈ میں ان کے دم سے شعرا کا جم گھٹا لگا رہتا تھا۔ پھر ان کے ایک انٹرویو میں، جو جناب یعقوب نظامی صاحب نے لیا تھا اور ان کے ماہنامہ ''آئینہ'' میں شائع ہوا تھا، پڑھا ... ''بریڈفورڈ میں مشاعروں کی رونقیں اس وقت تک رہیں جب تک حضرت شاہ آسودہ حال تھے۔ جب مالی حالات خراب ہوئے تو یہ رونقیں بھی ماند پڑ گئیں''۔ تب مجھے بے ساختہ غالب کا یہ مصرعہ یاد آیا۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جو میں نے سنا ہے وہ سب اگر درست ہے تو احباب کی کرم فرمائیوں نے ہی انہیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ حضرت شاہ نے اس بارے میں کیوں نہ سوچا؟ احباب اگر خود غرض ہیں تو وہ اس وقت تک ہی منڈلاتے ہیں جب تک چھتے میں شہد موجود ہوتا ہے۔ بہر کیف میں بریڈفورڈ کے مشاعرے میں گئی اس کے باوجود کہ میں نے مشاعروں میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن میں

حضرت شاہ سے ملنا چاہتی تھی اور اس ایک سرسری ملاقات نے حضرت شاہ کی شخصیت کے کئی پہلو مجھ پر واضح کر دیئے۔

وہ بلاشبہ شاعر مزاج آدمی ہیں اور منکسر المزاج بھی۔ انہیں تو کوئی لوٹ کر لے جا سکتا ہے۔ اس کے لئے لوٹنے والے کا ''ٹھاگ'' ہونا شرط نہیں۔ یعقوب نظامی صاحب نے حضرت شاہ کا جو انٹرویو کیا ہے اس میں کئی واقعات ایسے ہیں جن سے ان حالات اور واقعات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ حضرت شاہ کہاں سے چلے اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے بعد بھی دوستوں سے اجنبیت کی منزل انہیں کیوں ملی؟

میرے پہلے ہی سوال کے جواب میں وہ معصوم سی مسکراہٹ سجا کر مدھم لہجے میں بولے...

''اب دیکھئے نا، جب نام ہی میں حضرت اور شاہ ہو تو پھر مزید اضافے اور تخلص کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ ویسے میں ۱۹۵۱ء میں کراچی کے سولجر بازار کے علاقے میں پیدا ہوا جب کہ میرے والدین ہری پور ضلع ہزارہ، پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد محترم چمن پیر شاہ برٹش راج میں آرمی میں ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور اسی دور میں ہاکی کھیلتے ہوئے انہوں نے آدھی دنیا دیکھ ڈالی تھی۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ والد صاحب ۱۹۵۸ء میں برطانیہ آ گئے اور ہم اپنی والدہ کے ہمراہ ۱۹۶۲ء میں برطانیہ آئے۔ جب سے میں بریڈفورڈ میں، جسے ''لٹل پاکستان'' بھی کہا جاتا ہے، مقیم ہوں۔ میری ابتدائی تعلیم کراچی میں رام سوامی کے قائد ہائی اسکول میں ہوئی۔ بعد میں حالی مسلم اسکول سے آٹھویں تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بریڈفورڈ برطانیہ آ گیا۔ یہاں پر اردو اور دیگر زبانوں میں او۔ لیول اور اے۔ لیول کیئے۔ یہ وہ دور تھا کہ بریڈفورڈ میں اپنی زبان بولنے والے بہت ہی کم لوگ تھے۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب اور دیگر دوستوں نے ''پاکستان سوسائٹی'' بنا رکھی تھی جس کے تحت کامیاب محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم نے بھی یہاں ''بزم اردو بریڈفورڈ'' کی بنیاد رکھی جو آج تک علم و ادب کی خدمت کر رہی ہے۔

گو ہمارے خاندان میں کوئی شاعر نہیں لیکن مجھے بچپن سے اچھے اشعار سننے کی عادت تھی۔ اسکول اور کالج کے علاوہ شہر کراچی کے مشاعروں میں بحیثیت سامع شرکت کرتا تھا۔ بریڈفورڈ آنے کے بعد موج فرازی صاحب مرحوم سے اصلاح لی اور دھیرے دھیرے مشاعروں میں شرکت کی۔ بعد میں والد صاحب کے دوست جناب سید ضمیر جعفری مرحوم نے میری شاعری کے معاملے میں دست شفقت سر پر رکھا۔ وہ بریڈفورڈ آتے تو ہمارے غریب خانے پر قیام کرتے۔ یوں ان کی شفقت سے میرا حوصلہ بلند ہوا''۔

حضرت شاہ کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (۱) بے گھر آنکھیں ۱۹۷۸ء؛ (۲) نئے دن کی آمد ۱۹۹۱ء اور (۳) دھوپ بھری چھاؤں ۱۹۹۸ء۔

حضرت شاہ کے مجموعۂ کلام ''دھوپ بھری چھاؤں'' میں جناب طاہر تونسوی نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ نے اپنے کرب اور دکھ سکھ کو اشعار کی مالا پہنا دی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

موسمِ گل کے آنے تک بھیجتے رہنا ڈاک کے پھول
لیراں لیراں کھلتے ہیں دیکھ گریباں چاک کے پھول

اور

کوئی آئے گا در کھلے رکھو دل کھلے رکھو گھر کھلے رکھو
تیرہ شب کے مسافروں کے لئے روشنی کے نگر کھلے رکھو

ندا فاضلی ممبئی سے لکھتے ہیں ... ''کمال ہے تم اچھے شاعر بھی ہو اور اچھے انسان بھی۔ ویسے جگر مرادآبادی نے اچھی شاعری کے لئے اچھے انسان کی شرط کو ضروری سمجھا لیکن عملی دنیا میں یہ اشتراک مشکل سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ تم نے اس مشکل کو آسان بنادیا یہ بڑی بات ہے''۔

قتیل شفائی مرحوم نے تو ۱۷/ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں حضرت شاہ کے مجموعۂ کلام ''بے گھر آنکھیں'' کے دیباچے میں یہ پیشین گوئی کردی تھی ... ''حضرت شاہ کے کلام میں بناوٹ اور ملاوٹ نہیں۔ یہ ایک ایسے فطری عمل کا نتیجہ ہے جو اس کی سوچوں پر کوئی نقاب گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسے نوجوان شاعر کا کلام ہے جو اپنی معصومیت کو سینے سے لگائے شعر و فنون کی پختہ کار منزلوں کی طرف رواں دواں ہے''۔

اور بلاشبہ حضرت شاہ نے شعری محاسن کی کئی منزلیں طے کیں اور کہا

دریا میں قدم رکھا سنبھلنا نہیں آیا ڈوبے تو کچھ ایسے کہ نکلنا نہیں آیا
ایسے میں کوئی آ کے مجھے راہ دکھائے تنہائی کا جنگل ہے نکلنا نہیں آیا
طوفاں کی طرح زور میں اٹھتا تو ہوں لیکن لہروں کی طرح مجھ کو بکھرنا نہیں آیا

''ہم سخن'' حضرت شاہ کی تازہ کتاب ہے جو بقول جناب خالد یوسف ایک معتبر تاریخی دستاویز ہے جو حضرت شاہ نے بریڈفورڈ ٹرائی ڈنٹ کے تعاون سے مرتب کی ہے جس میں بریڈفورڈ ہلٹل پاکستان، کے چھتیس (۳۶) موجود اور گزرے ہوئے اہل قلم کے باتصویر کوائف زندگی اور ان کے اردو/ پنجابی کلام کے نمونے شامل ہیں۔

ہمارے اگلے سوال کے جواب میں حضرت شاہ کہہ رہے تھے ... ''میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔ نثری نظم یا نثری غزل میں بہت سے احباب لکھ رہے ہیں اور میری رائے میں اس میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ میرے خیال میں یہ اچھی بات ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ کسی نہ کسی حوالے سے سبھی کچھ نہ کچھ لکھا تو جارہا ہے۔ اب وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ یہ تجربے کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں''۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ کی رائے میں اردو کا مستقبل مغرب میں تابناک ہے؟ حضرت شاہ نے کہا ... ''جہاں تک یورپ اور امریکہ میں اردو زبان کے مستقبل کا سوال ہے میں کافی حد تک پُر امید ہوں کہ بہر حال زبان زندہ رہے گی۔ دیکھئے نا جب میں ۱۹۶۲ء میں یہاں آیا تھا تو اسکولوں میں جرمن، ڈچ، فرانسیسی اور دیگر کئی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ طالب علم ان زبانوں میں او۔ لیول اور اے۔ لیول

کر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں کے اسکولوں میں اردو، پنجابی، ہندی اور دیگر زبانوں کو بھی شامل کیا گیا۔ ہمارے بچے ان زبانوں میں او۔لیول اور اے۔لیول کر رہے ہیں۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں؟ بریڈفورڈ جیسے شہر میں اب آپ اردو زبان میں تعلیم حاصل کر کے یونیورسٹی سے ڈگری تک حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان ترقی کر رہی ہے۔ اور پھر دیکھئے تا کہ ہمارے دور میں نئے لکھنے والوں میں کتنا شاندار اضافہ ہوا ہے۔ اب ہر شہر میں اردو زبان کے شاعر، افسانہ نگار اور دانشور اردو کے لئے کام کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں آنے والی نسلوں کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میری رائے میں حکومتِ پاکستان کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے تا کہ آج کی اداس نسل آنے والے دور کی ایک کامیاب سفیر بنے۔ اس طرح اپنے ملک اور اپنی زبان سے ان کی وابستگی مکمل طور پر ہو سکے"۔

اردو کے رسم الخط کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے حضرت شاہ کہنے لگے..."میں اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ رسم الخط کی تبدیلی سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ کئی نئے مسائل میں ہم الجھ جائیں گے"۔

اگلا سوال تھا کیا غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا... "میرے خیال میں آپ غزل میں بھی دل کی بات کہہ سکتے ہیں اور نظم میں بھی اپنے احساسات بخوبی اپنے پڑھنے والے تک پہنچا سکتے ہیں اگر ادائیگی کا سلیقہ ہو تو۔ اور دورِ حاضر میں جو ادب یورپ اور امریکہ میں تخلیق کیا جا رہا ہے وہ پاکستان اور انڈیا میں لکھے گئے ادب کے ہم پلہ ہے۔ بعض اوقات ملک سے باہر لکھا گیا ادب ملک میں لکھے گئے ادب سے بہتر ہوتا ہے لیکن بہتر فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ جس طرح غالب، میر اور ذوق کے عہد کا ادب ہم آج بھی پڑھتے ہیں اور آنے والے بھی پڑھیں گے۔ آج کا دور وہ دور نہیں۔ بڑی تبدیلیاں آئی ہیں اور تبدیلیاں آتی رہیں گی۔ اسی طرح ادب میں بھی تبدیلیاں لازمی ہیں۔ آج جو لکھا اور کہا جا رہا ہے مستقبل میں اس میں نکھار پیدا ہوگا۔

اب رہی اردو زبان کو اپنانے کی بات، تو میرے خیال میں اردو زبان کو اپنا کر ہم ہرگز گھاٹے میں نہیں رہے۔ انسان اپنی تہذیب، ثقافت، تمدن اور زبان سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اردو زبان دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اسے اپنے ہی گھر میں اہمیت نہیں دی۔ لیکن پھر بھی اردو زبان میں ادب کے لئے جو کام کیا گیا ہے وہ کسی اور زبان سے کم نہیں"۔

حضرت شاہ کے پسندیدہ شعرا میں غالب، مومن، مصحفی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ضمیر جعفری اور جوش سرِفہرست ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے حضرت شاہ نے کہا..."بے شمار یادیں ہیں۔ ایک دفعہ کراچی سے سلیم کوثر بریڈفورڈ تشریف لائے۔ لندن سے بریڈفورڈ کے سفر میں میرا فون نمبر اور گھر کا پتا بھول گئے۔ جب یہاں بریڈفورڈ اُترے تو اسٹیشن سے باہر پریشان کھڑے تھے۔ بریڈفورڈ میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور زیادہ ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے انہیں ٹیکسی میں بٹھایا اور سیدھے

میرے گھر پہنچادیا۔ گھر آ کر سلیم کوثر نے کہا کہ یہ ان کی زندگی کا یادگار واقعہ ہے کہ وہ میرے گھر آگئے اس کے باوجود کہ ان کے پاس نہ پتا تھا نہ فون نمبر۔ یہ واقعہ تو چھوٹا سا ہے مگر اس سے اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ظاہر ہوتا ہے کہ جس نے بریڈفورڈ میں مجھے بحیثیت شاعر ہی نہیں بحیثیت ایک انسان بھی ایک شناخت عطا کی"۔

حضرت شاہ شاعر تو ہیں ہی، صحافی بھی ہیں۔ وہ "آئینہ" کے نام سے ایک خوب صورت ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ ملنگ آدمی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ "آئینہ" کسی بھی رنگ ترنگ کا شکار نہ ہوگا۔

Mr. Hazrat Shah, President Bazm-e-Urdu UK,

19 Parkway, West Bowling, Bradford, West Yorks., BD5 8QD, UK

انتخابِ کلام

کھو جاتے ہیں دریا مٹی پیاسی رہ جاتی ہے
صدیوں رہنے والی زرد اُداسی رہ جاتی ہے

◆

آنکھ کے پیچھے کیا ہوتا ہے علم نہیں ہوسکتا
فنکاروں کی آخر رُوپ شناسی رہ جاتی ہے

◆

کھل کر اپنے عشق کا ہم نے تو اظہار کیا ہے
گھٹ کر رہ جائے تو چاہت باسی رہ جاتی ہے

◆

دو پہروں کو جاگتی رہتی ہے سایوں کی صورت
دن ہوجاتا ہے پر رات ذرا سی رہ جاتی ہے

◆

سرمائے کی گردش ہے ہر وقت ضروری حضرتؔ
جوہڑ بنتا ہے جب آب نکاسی رہ جاتی ہے

◆

انسان !
اپنی خواہش کے
تابع ہے
فطرتاً

خالد باجوہ

خالد باجوہ

بھاول نگر، پاکستان

میں پاکستان میں تھی جب میری غیر موجودگی میں خالد باجوہ کا مجموعۂ کلام ''میں ہر رُت کا بادل ہوں'' لاس اینجلس پہنچا۔ پھر مجھے حیرت ہوئی تو اس وقت جب خالد کی کتاب پڑھی جس کا پیشۂ آبا شاعری ہرگز نہیں رہا۔ خود خالد کی وابستگی زراعت سے ہے۔ لکھنا پڑھنا اور مطالعہ کاشت کاری کے موضوعات سے وابستہ ہے۔ لیکن شاعری بذاتِ خود ایسا نشہ ہے کہ چڑھے تو اترتا نہیں۔ یہی حال خالد باجوہ کا ہے۔ ''آبپاشی کے چند اصول'' پر مضمون لکھ رہے ہیں اور اشعار ذہن میں چٹکیاں لیتے ہیں کہ ہم سے گفتگو کرو، ہمارے ناز اٹھاؤ۔ چنانچہ غزل اور نظم سے محبوبیت کا برتاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ہجوم میں رہ کر بھی خود کو شاعری کا قیس محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

محبت میں ملی جو رسوائی ساتھ ہے ۔۔۔ زمانے بھر کی قیاس آرائی ساتھ ہے
فقط غیروں کے نہیں احساں مجھ پر ۔۔۔ عزیزوں کی کرم فرمائی ساتھ ہے
سوچوں میں اس کو کہاں بیٹھ کر ۔۔۔ جہاں جاؤں مری تنہائی ساتھ ہے

میں نے ان سے چند سوالات کیئے۔ خالد نے ان کے جواب دیتے ہوئے کہا۔ خالد اقبال باجوہ ان کا نام ہے۔ تخلص کبھی سخنور، کبھی خالد اور کبھی خالد باجوہ اختیار کرتے ہیں۔ ۲۰/فروری ۱۹۶۵ء کو

ٹی ڈی اے ضلع مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔

''شاعری کیسے شروع کر دی''؟ میں نے پوچھا۔ ہنس کر بتانے لگے...''اسے اتفاق کہیئے یا حادثہ میں نے ۱۹۸۹ء میں پہلا شعر کہا۔

تیری یاد میں ساجن رو رو کے میں نے سارا عالم رُلا دیا
اب کیسے کسی کو بتلاؤں اک پھول جو میں نے گنوا دیا

اس سے قبل شاعری کو پڑھنے اور سننے کی حد تک تو مجھے شوق تھا مگر اپنے شعر کہنے کا نہ تو ارادہ تھا اور نہ ہی کبھی اس کا خیال آیا۔ تاہم اسکول کے زمانے میں بیت بازی کے مقابلوں میں ضرور حصہ لیا کرتا تھا۔ اور ڈویژنل لیول (Divisional level) کے کئی مقابلوں میں ہم نے یعنی ہماری ٹیم نے اول انعام بھی حاصل کیئے۔ شروع شروع میں ٹوٹے پھوٹے شعر لکھ لیا کرتے تھے جو صرف دوستوں کی محفل میں سنانے تک ہی محدود ہوتے تھے۔ اور یہ سلسلہ تقریباً دس سال ایسے ہی چلا۔ اس دوران نہ تو مجھے کبھی شاعر کہلوانے کا شوق ہوا اور نہ ہی اپنی کسی شعری تخلیق کو چھپوانے کا۔ سن ۹۹۔ ۱۹۸۹ میں میں نے نثر لکھنا شروع کی۔ پڑھنے سے رغبت تو تھی ہی، جب ایک اخبار سے رپورٹنگ کی آفر (offer) ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اخبار کے لئے کالم لکھنا زیادہ بہتر رہے گا۔ بس پھر اس شوق کی تکمیل میں میں نے دن رات ایک کیا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے بعد صحافت سے زیادہ شعر و ادب کی طرف جھکاؤ ہوا اور میں نے باقاعدہ شعر کہنے شروع کر دیئے۔ یوں ادب کے ساتھ وابستگی اور دلچسپی بڑھتی چلی گئی جو دوستوں کی ذرہ نوازی سے ممکن ہوا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ادب ایک ایسا آئینہ ہے جو انسان کو حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ ادب ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جو ہر تہذیب کی جھلکیاں لیئے ہوتا ہے اور اس تہذیب کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں چند دوستوں کے اکسانے پر ایک کتاب ''میں ہر رُت کا بادل ہوں'' چھپوانے کا تلخ تجربہ بھی حاصل ہوا۔ یوں تو میں نے ہر صنفِ سخن میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا، مگر جن اصنافِ سخن میں اتفاق سے میں کچھ زیادہ لکھ پایا، وہ ہیں نثری نظم، آزاد نظم، آزاد غزل، ہائیکو اور دوہا۔ بیسویں صدی میں انجمن پنجاب اور حلقۂ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم سے نیچرل شاعری کی جو تحریکیں چلیں اور جنہیں سرسید، ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکیں کہا جاتا ہے، انہوں نے بھی انہی اصنافِ سخن کو زیادہ فروغ دیا۔ رہی بات نثری نظم اور نثری غزل کی، تو میں عرض کروں کہ نثری نظم کی ابتدا بیسویں صدی میں ایک نہایت ہی متنازعہ صنف کے طور پر ہوئی۔ یہ دراصل نظم کی ہی ایک ہیئت یا شکل ہے جسے اس کی شاخ کہنا بھی مناسب ہے۔ اس صنف کو ابتدا میں خاصی تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور پھر شاعروں کو اسے قبول کرنے پر اصرار بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی مقبولیت سے کسی کو انکار بھی نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کی ہیئت یا اس کے نمونے میں ذرا سی چھیڑ چھاڑ سے وہ اپنا وجود ہی کھو دیتی ہے

نوٹ: خالد باجوہ کی بہت جلد منظرِ عام پر آنے والی دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں: ریحانِ ادب: یادوں کی سوغات: مہر نیم روز: کسان رہبر اور زرعی نگارشات (سلطانہ مہر)

مگر میرے نزدیک تجربات کرنا ایک اچھی روایت ہے۔ آزاد غزل ہو یا مکالماتی غزل یا معاملاتی غزل، سب ہی غزل کی ترقی پذیر شکلیں ہیں۔ ایک محدود اور اکتفا کر لینے والے دائرۂ کار میں جکڑے چلے جانے کے بجائے اس سے باہر نکلنا اور تحقیق و جستجو یا کچھ نئی چیزیں تلاش کرنا ہی تو ترقی پسندی ہے''۔

''آپ کا اگلا سوال کہ آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے یا نہیں، ایک مشکل سوال ہے۔ اس کے جواب میں بس اتنا ہی دے پاؤں گا کہ ادب فلسفے کے بہت قریب ہوتا ہے۔ ہم کس طرح سوچتے ہیں اور تراش خراش کر کے کیا پیش کرتے ہیں، اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجیے۔ اس کے بعد میں دُکھی دل سے اظہار کرتا ہوں کہ بڑھتے ہوئے انسانی مسائل کا احاطہ کرنے میں ہمارے اُدبا ناکام رہے ہیں۔ اس کی وجہ شاید ان کے ذاتی حسد و رشک کے جذبات بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی اناؤں کے مسائل بھی درمیان میں آتے ہیں۔

رہا سوال کہ اردو زبان کو اپنا کر ہم گھاٹے میں رہے یا نفع میں، تو اس کا جواب بہت سیدھا سادا سا ہے اور وہ ہے 'گھاٹے میں'۔ ممکن ہے میرے اس جرأت مند اظہار کو متعصب لوگ پسند نہ کریں''۔

خالد باجوہ نے کہا... ''میں جن شعرا سے متاثر رہا ہوں، ان میں ہیں حسرتؔ، فیضؔ، اقبالؔ، غالبؔ اور گزری صدی کے قد آور شعرا کا نام لیتے وقت اخترؔ شیرانی، ن م راشد، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری اور اختر الایمان کو ترجیح دی جائے گی''۔

''اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں بڑے دکھ سے کہوں گا کہ یہ کچھ زیادہ روشن نہیں ہے مگر اتنا تاریک بھی نہیں۔ تاہم ترقی پسند تحریک کی طرح کی کوئی طاقتور تحریک ہی اس کے مستقبل کو تابناک کر سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ زبان و ادب کی ترقی بھی سماجی، معاشی اور اقتصادی ترقی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ جو معاشرہ، جو ملک یا جو قوم جس قدر خوش حال ہوگی اُسی قدر اُس کی زبان بھی پروان چڑھتی جائے گی۔ اس کی مثال آج کے ترقی یافتہ ممالک اور اقوام سے دی جا سکتی ہے۔ کمپیوٹر اگر ترقی کا زینہ نہ ہوتا تو اس سے روگردانی کو کون برداشت کرتا۔ یہ دور انقلابی رجحانات کا دور ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے فلسفے کو سمجھنا اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور جو بات ہے اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی تو میں عرض کروں گا کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ رومن رسم الخط میں لکھنے کی تحریک قرآنی زبان سے رشتہ منقطع کرنے کی عالمی سازش ہے، وہ کسی جذباتی کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں اور یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جو زبان بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلے گی وہی دیر تک باقی بھی رہے گی''۔

خالد نے ایک اندوہناک واقعہ سناتے ہوئے بتایا... ''میری زندگی کا یہ واقعہ معاشرے میں پائی جانے والی توہم پرستی کے حوالے سے ایک ایسا واقعہ ہے کہ جب کبھی یاد آتا ہے تو رونا آجاتا ہے اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں ایک پیر کی حرکات و سکنات جاننے کے لئے اس کے حجرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر ایک ڈراؤنی شکل کا آدمی گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا ہے،

کچھ مرید اس کے پاؤں دبا رہے ہیں اور فرش پر لیٹے ہوئے، بخار سے بدحال ایک تین چار سال کے بچے پر پیر صاحب پھونکوں پر پھونکیں مارے جا رہے ہیں۔ بچے کے وجود سے نکلتی حرارت وتپ وہاں موجود لوگوں کے چہروں کو جھلسا رہی تھی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ ماجرہ کیا ہے۔ بتایا گیا کہ بچے کو بخار ہے۔ میں نے از راہ ہمدردی اس بچے کے ماتھے کو چھوا تو یقین کیجیئے ایسا لگا جیسے میں نے کسی تپتے ہوئے تنور کی منڈیر پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں نے جلدی سے تھرمومیٹر منگوایا۔ بچہ کا درجہ حرارت ۱۰۶ درجہ فیرن ہائٹ تھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ معاملہ بہت گھمبیر ہے۔ بچے کی جان کو خطرہ ہے اور اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لیجائیں، لیکن پیر اور ان کے مرید میری بات تو کیا مانتے الٹا مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے یہ سب کچھ کہہ کر کوئی سنگین بے ادبی اور جرم کیا ہے۔ میں ابھی ایک قدم ہی واپس پیچھے ہٹا تھا کہ بچے کو تشنج کا دورہ پڑا، اس کا جسم ایک جھٹکے سے پھڑ پھڑایا اور اس کی روح قفسِ عنصری سے آن کی آن میں پرواز کر گئی۔ آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے اور معاشرے کی جہالت وتوہم پرستی پر رونا آتا ہے''۔

Mr. Khalid Bajwah,
Shaheed Chowk, Dist. Bhawalnagar, Pakistan

انتخابِ کلام (نئی فلاسفی)

لوگ سمجھتے ہیں کہ جیسے میرے پاس سب کچھ ہے
عزت، دولت اور شہرت
لیکن کاش وہ جانیں کہ دکھ ان سے زیادہ ہیں
لیکن جب میں نے اوروں کے دکھ دیکھے تو سوچا
میرے دکھ اور کٹھن دن رات
پھر بھی اوروں کی نسبت کم کٹھن ہیں
میں شکر کروں گا رب کا کہ میرے دکھ، میرا کرب
میرے لئے بنا نشانِ منزل/ میں نے ان سے وہ سب کچھ سیکھا
جو میری راہوں کو روشن کر گئے
اس فلسفے نے مجھے جینا سکھلایا کہ دکھ اور سکھ مل کر
اور یہ بھی زندگی کو ایک نیا رنگ دیتے ہیں
سو اب میں خوش ہوں/ ایک ''نئی فلاسفی کے ساتھ''

'لفافہ' میری قسمت میں کہاں تھا؟
صدارت دے کے بہلایا گیا ہوں

خالد عرفان
نیویارک ۲۱ اپریل ۲۰۰۹ء

سید خالد عرفان

نیویارک، امریکہ

غالباً ۱۹۹۸ء کی بات ہے، نیویارک میں میری دو کتابوں، "سخنور حصہ دوم" اور "سخنور حصہ سوم" کی تعارفی تقریب تھی۔ میں مسرور جاوید صاحب اور خالد عرفان صاحب کی مہمان تھی۔ اس تقریب میں خالد عرفان نے "سخنور" کے حوالے سے ایک دل موہ لینے والی نظم پڑھی۔ اور اب یہ نظم میری کتاب "سخنور حصہ چہارم" کے ابتدائی صفحات میں موجود ہے۔ یہاں اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تحقیق ہے، ادب ہے، مقالہ ہے یہ کتاب
اس عہد کے ادب کا حوالہ ہے یہ کتاب

اس کی کتب میں سارے سخنور ہیں ساتھ ساتھ
مامون ایمن اور حنیف اخگر ہیں ساتھ ساتھ

منزل پہ کوئی راہ بھی سیدھی نہ جائے گی
جب تک کوئی کتاب خریدی نہ جائے گی

ایک شخص کہہ رہا تھا "سخنور" کے باب میں
قیمت بری لگی ہے مجھے اس کتاب میں

اچھی ہے یہ کتاب کہ خانہ پری نہیں
گر مفت میں ملے تو "سخنور" بری نہیں

اس وقت مجھے دلاور فگار مرحوم یاد آ گئے۔ خالد عرفان کے پڑھنے کا انداز ہو بہو دلاور فگار کا ہے۔ دلاور فگار خالد کے استاد تھے۔ ان ہی کی یاد میں خالد نے نیویارک میں بھی "دلاور فگار میموریل سوسائٹی" قائم کی ہے۔ جس کے تحت خالد عرفان کے مجموعۂ کلام "مقمۂ شر" کی تعارفی تقریب نیویارک

میں ۴/ مارچ ۲۰۰۰ء کے دن منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں محترمہ نیر جہاں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد عرفان زندگی میں ہونے والے واقعات کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی بڑی خوب صورت عکاسی کرتے ہیں''۔ اس ضمن میں انہوں نے خالد کا کہا ہوا یہ قطعہ سنایا۔

لڑھکتا تھا بیئر کا ایک ڈبہ ریل کے اندر | سیاسی زندگی کا آئینہ معلوم ہوتا تھا
وہ سر جھکا دیتا تھا یوں گوروں کے قدموں میں | جنوبی ایشیا کا رہنما معلوم ہوتا تھا

لاس اینجلس کے شاعر، افسانہ نگار اور صحافی خالد خواجہ نے بڑے خوب صورت الفاظ میں اپنے ہم نام شاعر خالد عرفان کو خراجِ محبت پیش کرتے ہوئے کہا... ''جن معاملات پر ہم جھنجھلاہٹ اور بے دلی کا شکار ہوجاتے ہیں، ان ہی معاملات کو طنز و مزاح کا یہ شاعر اپنے قلم سے ایسا روپ دے دیتا ہے کہ بے کیفی اور بے دلی خوش دلی اور دل کشی میں بدل جاتی ہے۔ یہ قطعہ خالد عرفان کی اسی فن کاری اور مرقع سازی کا مظہر ہے''۔

میں ایک بھی مکان کا مالک نہ بن سکا | بارش کی زد میں ہوں کبھی لو کے اثر میں ہوں
اتنی نہ تیز چل کہ اکھڑ جائیں بام و در | اے سر پھری ہوا میں کرائے کے گھر میں ہوں

خالد کو میں نے جب بھی سنا، مجھے کبھی اکبر الہ آبادی یاد آئے تو کبھی ظریف لکھنوی۔ ظریف لکھنوی کو بھی پیروڈی (parody تضمین) کہنے میں کمال حاصل تھا۔ درج ذیل اشعار میں ان کی ظریفانہ مصوری دیکھیے جس میں الیکشن (election چناؤ) کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں۔

ووٹ دے دوں گا عوض خمسین کے | اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کی تلقین کے
حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے | اس سے کم لینا مرادف ہے مری توہین کے
ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرمادیجیے | ہے یہ کارِ خیر بس تعجیل فرمادیجیے

اکبر الہ آبادی نے جو محفل سجائی تھی اس میں آسان زبان و بیان کا لطف اپنا ایک علحدہ ذائقہ رکھتا تھا۔ اکبر نے یورپ کا سرد گرم سہا ہے اور عرفان بھی مغرب کے شب و روز کی گھلاوٹ سے آشنا ہیں۔ اکبر کہتے ہیں۔

اے خدا کردے مجھ کو صاحب لوگ | دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قلب مغربی | بھول جاؤں زبان بھی اپنی
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں | سب یہ سمجھیں کہ ''لاٹ صاحب'' ہیں

اور خالد کا تجزیہ کہتا ہے۔

جناب شیخ کی گوری سے ہوگئی شادی | بہت حسین نظارہ دکھائی دیتا ہے
جو پٹ رہا ہے شب و روز اپنی بیوی سے | گرین کارڈ کا مارا دکھائی دیتا ہے

ایک اور قطعہ بھی ایک اعلیٰ تجزیاتی فن پارہ ہے۔

طہارت نیپکن [1] سے فون موبائل [2] سے کرتے ہیں
وہ حملہ شرق پہ مغرب کے مزائل [3] سے کرتے ہیں

سٹی زن [4] ہوگئے ہیں جب سے اپنے مولوی صاحب
وہ شرعی کام بھی اب انگلش اسٹائل [5] سے کرتے ہیں

سید خالد عرفان کراچی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش پوچھی تو کہنے لگے۔

اب تک ہے یاد مجھ کو وہ خاتون دل نشیں
ایسی دروغ گوئی تو اس کے ہی بس کی تھی

سولہ برس کے بعد ملاقات جب ہوئی
سولہ برس کے بعد بھی سولہ برس کی تھی

قطعہ سنانے کے بعد کہنے لگے کیا اب بھی تاریخ پیدائش کی ضرورت ہے؟ ہم نے یہ سوال نظر انداز کرکے دوسرا سوال ان سے کیا... یہ ادب اور شاعری کے جراثیم کب سے پالے ہیں؟ اب خالد سنجیدہ ہوگئے۔ کہنے لگے... ''میں نے لکھنے کا آغاز ۱۹۶۸ء میں روزنامہ ''جنگ'' کے بچوں کے صفحے سے کیا۔ اس زمانے میں بھی بچوں کے لئے مزاحیہ نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اس کے بعد پاکستان میں سید محمد جعفری اور دلاور فگار کے مزاحیہ شاعری کے سنہرے دور کا آغاز ہوا تو میں نے باقاعدہ طنز و مزاح کی شاعری کی اور طنز و مزاح کا پہلا مشاعرہ ۱۹۷۲ء میں کراچی پریس کلب میں پڑھا۔ اس مشاعرے میں سینئر شعرا میں سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، مسٹر دہلوی اور انعام احسن حریف شریک تھے۔ اس مشاعرے میں ابن انشا مہمان خصوصی تھے۔ اس کے بعد پاکستان میں باقاعدہ مزاحیہ شاعری کے دور کا آغاز ہوا تو بہت سے شعرا اس میدان میں آئے۔ اور آج پاکستان میں طنز و مزاح کو باقاعدہ صنف سخن و ادب کی حیثیت دی جانے لگی ہے''۔

خالد نے اپنی محنت اور لگن سے شعرا کے اس ہجوم کے درمیان اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ انہوں نے متحدہ عرب امارات اور ہندوستان (انبالہ، حیدرآباد، دہلی اور ممبئی) کے مشاعروں میں شرکت کی اور پاکستان ٹیلی ویژن، اسلام آباد سے نشر ہونے والے سیاسی پروگرام ''ہفت روزہ'' میں باقاعدہ شرکت کی۔ خالد نے پی ٹی وی اسلام آباد کے پہلے مزاحیہ مشاعرے ''کشتِ زعفران'' میں شرکت کی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے نعتیہ شاعری بھی کی ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''الہام'' ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ لیکن ان کی وجہ شہرت مزاحیہ شاعری ہے۔ امریکہ میں لاس اینجلس، شکاگو، ہیوسٹن، ایری زونا، میامی، اور واشنگٹن کے مشاعروں میں بھی شرکت کر چکے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کے حالات، معاشرت اور ثقافت پر تیکھے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ایک قطعہ ادبی معاشرت پر بھی ایک تیکھا طنز ہے۔ عنوان ہے ای۔میل (e-mail)۔ ملاحظہ ہو۔

گرہ استاد سے لگوا رہے ہیں
وہ مصرعہ فیکس سے بھجوا رہے ہیں

بہت سے ''میل [6]'' اور ''فی میل [7]'' شاعر
غزل ''ای۔میل'' سے منگوا رہے ہیں

میرا اگلا سوال تھا کہ امریکہ آکر یہ محسوس تو نہیں ہوا کہ کاش اردو کے بجائے انگریزی زبان میں شاعری کرتا تو مالا مال ہوجاتا۔ خالد ہنسے اور کہنے لگے... ''یہ خیال تو نہیں آیا۔ ہاں بیٹے کا مشورہ تھا''۔

1-napkin; 2-mobile; 3-missile; 4-citizen; 5-English style; 6-male; 7-female

میرے بیٹے نے اک دن مجھ سے یہ از نیاز پوچھا
بہت پیسے کماتے اور بلند اقبال ہو جاتے
تمہیں اس شعر گوئی سے بھلا کیا مل گیا پاپا
تمہارا کیا بگڑتا اگر قوال ہو جاتے

خالد کی شاعری کا مزاج نظم ہی سے لگا کھاتا ہے کینیڈا کے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ان کے لئے لکھا ہے کہ خالد عرفان کی مزاحیہ شاعری کا اہم پہلو معاشرے کی گرتی ہوئی حالت اور حکمرانوں کی بددیانتی و خود غرضی کو ظاہر کرنا ہے۔ وہ درباری مزاج یا سلطانی گنبد کا کبوتر نہیں۔ خالد عرفان کے موضوعات اور زبان کے رچاؤ میں دلاور فگار کی طنز و مزاح کی کسک اور چاشنی رچی بسی ہے۔ دلاور فگار ہی طرح خالد عرفان بھی مشہور چٹکلوں، محاوروں طنزیہ فقروں اور دوسرے شعرا کے مصرعوں پر تضمین کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اب سیاسی اصطبل کا یہ نیا دستور ہے
اک گدھا آگے بڑھے گا دوسرا رہ جائے گا
جو گدھے کمزور ہوں گے کردیئے جائیں گے قتل
جس گدھے میں جان ہوگی وہ گدھا رہ جائے گا

خالد عرفان کی کتاب ''بڑے لوگ'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب امریکہ کی ممتاز شخصیات کے منظوم خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے بارے میں ان کے قطعات اور نظموں کا مجموعہ ''تھینک یو امریکہ''[1] بھی زیر طبع ہے۔ خالد عرفان ہفت روزہ ''نیوز پاکستان'' میں ہفتہ وار حالات حاضرہ پر قطعہ لکھتے ہیں۔

Mr. Saiyid Khalid Irfan, C/O. News Pakistan Weekly
168-05 Hill Side Avenue,Jamaica, NY 11432, USA
or,
171-L Sector 5-M, North Karachi, Pakistan.
e-mail: khalifirfan2003@yahoo.com

انتخابِ کلام (شاعر کی فریاد)

کبھی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہوں
کبھی بسکٹ پہ ٹرخایا گیا ہوں
جو لکھنا ہو حکومت کا قصیدہ
ایئر لائن[2] سے بلوایا گیا ہوں
کبھی شبلی، کبھی مہدی حسن سے
میں ساری رات بجوایا گیا ہوں
جہاں قوال دھوکہ دے گئے
وہاں میں یاد فرمایا گیا ہوں

اسے ذوقِ سخن بالکل نہیں ہے
میں جس بیوی سے چپکایا گیا ہوں

1.Thank You America; 2. Airline

رنجش کی آنچ دامنِ اجداد تک گئی ۔
گھر میں لگی وہ آگ کہ شجرے بھی جل گئے

(دستخط)

(عرفان دانش سکندری)

۲۳ جنوری ۲۰۰۱ء ۔

TRENTON N.J. 08629 USA.

عرفان دانش سکندری

نیوجرسی، امریکہ

کہتے ہیں کہ ہر چہرہ ایک بند کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کچھ کتابوں کے ٹائٹل تو بہت خوش نما ہوتے ہیں مگر وہ کتاب اندر سے اتنی ہی بے رونق ہوتی ہے، اپنے پڑھنے والوں کو قطعی مطمئن نہیں کر سکتی۔ مگر کچھ ٹائٹل ایسے ہوتے ہیں جو باہر سے تو بے رونق ہوتے ہیں مگر کتاب اپنے قاری کو مایوس نہیں کرتی، پڑھنے والا حظ اُٹھاتا ہے۔ مگر عرفان دانش کا پہلا مجموعۂ کلام ''رقصِ غبار'' ظاہری اور باطنی، دونوں صورتوں میں دل کش ہے۔ اور اس کا سرِ ورق مشی گن کی شاعرہ اور مصورہ انجم تاج نے بڑا ہی دل پذیر بنایا ہے۔ کتاب کا سرورق جس طرح نگاہوں کو مسحور کرتا ہے اسی طرح اس کتاب میں چھپی شاعری بھی اتنی ہی مسحور کن ہے۔ سجی سجائی کتاب میں فکر کو آراستہ کرنے والی شاعری اپنے حسنِ کلام سے آپ کو اپنی گرفت میں یوں لیتی ہے کہ آپ پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، صفحات پلٹتے ہیں اور کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور یہ صرف میرا ہی کہنا نہیں ہے کہ عرفان دانش کی شاعری قاری کی فکر کو زنجیر کرتی ہے، بلکہ کرشن بہاری نور بھی کہتے ہیں ... ''عرفان دانش کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی کشش ایسی ضرور ہے جس نے سوچنے اور شعر کی تہہ داری پر غور کرنے کو کہا''۔ یہاں دانش کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بوسیدگی پردۂ جسم اور جاں کی خیر
نوں لگی دوار ہے، برسات سر پہ ہے

یونہی بڑھتی رہی وحشت تو زنداں یہ دیواریں بھی کب تک اور کہاں تک
سفر کے شوق میں اڑ نا تھی، سو تو اڑ نا تھی ہم اپنی خاک کو زنجیر کب تلک کرتے
فضا کے رنگ بھی پھیکے پڑ گئے جب سے بدل گیا مرے اندر بہار کا موسم

اور

رکھیو ترکِ انا کی مت اُمید ہم سے یہ خودکشی نہیں ہوگی

تقریباً تقریباً ان ہی خیالات کی وضاحت ماہنامہ ''شاعر، ممبئی'' کے مدیر افتخار امام صدیقی ان الفاظ میں بڑے خوب صورت پیرائے میں کرتے ہیں... ''عرفان دانش کی ایک دوسری خصوصیت اور بھی نمایاں ہے۔ اور وہ ہے نئی نئی شعری زمینیں تراشنا اور معنی آفرینی پیدا کرنا۔ اپنی تخلیقی زمینوں میں شعر کہنا آسان نہیں ہے۔ اس میں بہت سارے احتمال موجود ہیں۔ اکثر شعریت غارت ہو جاتی ہے۔ لیکن عرفان صاحب نے اپنی شاعری میں جو موسیقی تخلیق کی ہے وہ حواس میں جذب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے''۔

اب ذرا حمایت علی شاعر صاحب کی بات بھی سنیئے... ''عرفان بات کہنے کا قرینہ جانتے ہیں۔ وہ ان شعرا میں سے نہیں ہیں جو شور زیادہ مچاتے ہیں مگر دلوں میں گونجتے نہیں۔ ناصر کاظمی کی طرح عرفان دانش کی شاعری بھی ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ؎ آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے!''

اب کہیئے کہ کہنے کو اور قائل کرنے کو کیا باقی ہے۔ بس کتاب اُٹھایئے اور یا تو خود اس کے سحر میں گم ہو جایئے یا اسے اپنے حواس پر چھا جانے کی مہلت دیجیئے۔

عرفان دانش کو میرے باؤلے بھائی جاوید زیدی نے ''غمِ میر کا امین شاعر'' کہا ہے۔ ان کو میں نے باؤلا اس لئے کہا کہ یہ میر تقی میر کے عشق میں مجھ سے لڑتے ہیں کہ میں ہوا غم خوار میر کا تم کیوں نہ ہوئیں' میں ٹھہری غالب کی طرف دار۔ مگر پیارے جاوید سے لڑے کون کہ اس نام کی حرمت لازم ہے۔

تو آمدم برسرِ مطلب اور بقول عاشور کاظمی اس نٹ کھٹ کرشن سے دو دونی چار کیا کرنا، آگے بڑھتے ہیں اور عرفان دانش سے گفتگو کرتے ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کو کون سے شعرا پسند ہیں اور یہ کن سے متاثر ہیں؟

عرفان بتاتے ہیں کہ انہیں غالب (سُن لو جاوید زیدی اور موٹے شیشوں کی عینک لگا کر پڑھ بھی لو اگر حسینوں کو دیکھنے سے فرصت مل جائے) کے بعد معاصرین میں پیرزادہ قاسم، اسد بدایونی اور عرفان صدیقی کی شاعری پسند ہے۔

اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کا نام عرفان شاہ خان اور تخلص دانش سکندری ہے۔ ۳/ اگست ۱۹۴۷ء کے دن رام پور، یو پی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ رام پوری چاقو کے بجائے رام پوری قلم رکھتے ہیں جو چاقو سے زیادہ تیز ہے۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی، اترپردیش، ہندوستان سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور یو پی سول سروسز کمیشن (U P Civil Ser-vices) کا امتحان الہ آباد، ہندوستان سے ۱۹۷۲ء میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔

عرفان کے والد محترم رحمن شاد خان فیض سکندری اچھے شعر کہتے تھے۔ اجداد میں فیروز شاہ خان فیروز رام پوری حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا شعری سرمایہ خصوصاً "مثنوی میلہ بے نظیر" اسٹیٹ رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ شعر گوئی کا ذوق اجداد کا ورثہ ہے جو ان کے حصے میں آیا ہے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۳ء تک اتر پردیش کے محکمہ بنیادی و ابتدائی تعلیم (Basic Education بیسک ایجوکیشن) میں ملازمت کی۔ ازاں بعد امپورٹ ایکسپورٹ کی تجارت شروع کی۔ مشرق بعید اور یورپ کے متعدد ممالک کے تجارتی سفر کیئے۔ ۱۹۹۳ء سے یو ایس اے (USA) میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ ہیوسٹن کے ایک موٹل (Motel) اور بعدہٗ کنکٹی کٹ (connecticut) میں ایک ڈیپارٹمنٹل چین اسٹور (Departmental chain store) کے مینجمنٹ (management) میں ملازمت کی۔ سردست نیوجرسی میں مقیم ہیں۔

دوران گفتگو عرفان نے بتایا کہ انہوں نے پہلا شعر تو طالب علمی کے زمانے میں ہی کہا تھا جو شاید اس قابل نہ تھا کہ یادداشت میں رہ جاتا۔ معروف استاد الشعرا حضرت خیال رام پوری مرحوم سے شرف تلمذ کے بعد انہوں نے باقاعدہ شاعری ۱۹۷۹ء سے کی اور بیشتر غزلیں ہی کہیں۔ چند نظمیں بھی ہیں لیکن وہ آٹے میں نمک کے مصداق ہیں۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام "رقص غبار" ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔

سوال نمبر ۴ کا جواب دیتے ہوئے عرفان نے کہا... "آئندہ معاشرے کی زبان وہ ہوگی جو آج ہمارے بچے سیکھیں گے اور اپنے روزمرہ میں استعمال کریں گے۔ آج اردو والے ہی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں اس لئے میں اردو کے مستقبل سے زیادہ پُر امید نہیں ہوں۔ یہ زبان بہت سخت جان ہے۔ اپنوں کی بے اعتنائی کے باوجود سرے سے ختم تو نہ ہوگی البتہ جو اہمیت اسے گزشتہ صدی میں حاصل رہی وہ اس صدی میں شاید برقرار نہ رہ سکے۔ ہندوستان میں بقول محترمہ قرۃ العین حیدر اردو کو سید ھا سید ھا ہندی نے ہائی جیک (high jack) کرلیا ہے۔ بیشتر ہندی رسائل و اخبارات کا رسم الخط دیوناگری ضرور ہے لیکن ستر فیصد اردو ہی ہندی کے روپ میں لکھی جارہی ہے اور اب وہ ہندی ہی کہلا رہی ہے اور آج کے بچے اُسے ہندی ہی سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہندوستان میں اردو کی پہچان مٹ رہی ہے۔ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن وہاں علاقائی زبانوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ چونکہ اردو زبان پاکستان میں ابتدائی نصاب کا حصہ ہے اور کہیں کہیں میڈیم آف انسٹرکشن (medium of instruction) ہے اس لئے اس کے زندہ رہ جانے کے امکانات ضرور ہیں البتہ ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کی رفتار اس خطۂ پاک میں بھی دھیمی رہے گی۔ مغربی ممالک میں بسنے والے دیسی لوگوں میں اردو ایک مخصوص ایج گروپ (age group) میں ہی رائج ہے اور اس ایج گروپ کے لوگوں کے معدوم ہوتے ہوتے شاید یہ بھی چل بسے۔ جہاں تک اردو کا رسم الخط بدل کر اس زبان کو زندہ رکھنے کی حمایت کا سوال ہے میں رسم الخط بدلنے کا حامی قطعی نہیں ہوں۔ رسم الخط اردو

کی پہچان ہے۔ کوئی زبان جس کا اپنا رسم الخط نہ ہو وہ کسی خطہ یا قبیلے کے لوگوں کی بول چال کی زبان تو ہوسکتی ہے ادبی زبان نہیں ہوسکتی۔ اردو ایک حساس زبان ہے۔ الفاظ کے صحیح تلفظ میں فرق پڑ جائے تو لہجہ اس کے نازک مزاج پر بار ہوتا ہے۔ اس کا حسن اور اظہار کی صلاحیت رسم الخط میں مضمر ہے۔ چنانچہ رسم الخط بدلنے سے تو یہ قبل از وقت ہی اپنی ادبی حیثیت کھودے گی۔ کم از کم میرے لئے رسم الخط بدلنے کے بعد اردو کا تصور ہی محال ہے''۔

میں نے پوچھا،'' کیا آج اردو ادب کی جڑیں اُس کی زمین میں پیوست ہیں اور کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے''؟ اس کے جواب میں عرفان نے بہت سوچ سمجھ کر کہا...'' دیگر عالمی زبانوں کی طرح اردو نے دوسری زبانوں سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن زمانہ موجود تک آتے آتے اردو نہ صرف کہ ایک مخصوص کلچر کی ترجمان بلکہ ایک کلچر بن گئی ہے۔ فی زمانہ اردو زبان میں ادب برائے ادب کم ہی تخلیق ہو رہا ہے۔ بیشتر جو سنجیدہ ادبی تخلیقات سامنے آرہی ہیں وہ زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمان ہیں۔ اردو قدرے خود کفیل ہو چکی ہے اور اس کی جڑیں یقیناً اپنی ہی مٹی میں پیوست ہیں۔ البتہ تکنیکی اصطلاحات وضع کرنے اور سائنس و تکنیکی موضوعات پر لکھنے کا کام نسبتاً کم ہوا ہے۔ یہ تکنیک کے عروج کا دور ہے۔ انفارمیشن تکنالوجی (information technology) و دیگر تکنیکی شعبوں میں برق رفتار ترقی ہوئی ہے۔ اردو ادب کو اس ترقی کے ساتھ چلنا ہے تو اس سمت میں اپنی رفتار کو مہمیز کرنا ہوگا''۔

عرفان نثری نظم کے حامی نہیں۔ ان کا کہنا ہے...'' شاعری جن کے بس کی بات نہیں اور شاعر کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ جوڑنے کے بضد ہیں ایسے حضرات کے لئے نثری نظم نے بڑی آسانیاں مہیا کردی ہیں۔ کسی چونکا دینے والے سطحی خیال پر مبنی ایک پیراگراف لکھنا، اُسے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں تقسیم کردینا (جن کا کوئی میٹر نہیں ہے) اور پھر اس کو نثری نظم کا نام دے دینا کوئی ہنرمندی نہیں ہے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اچھی نثر کی تخلیق کی جائے تاکہ خیال کی ترسیل قاری تک پوری دلکشی اور تسلسل کے ساتھ ممکن ہوسکے۔ نظم کے لئے نظم اور ضابطے کی شرطوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نظم اگر موزوں اور عروضی ضابطے کی پابند نہیں ہے تو وہ نظم نہیں ہے۔ نثری نظم کی تو ابھی تک کوئی 'ترکیب تخلیق' ہی متعین نہیں ہوسکی ہے۔ اس کا کوئی میٹر نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک یہ 'بے جہت' ہے۔ اب ایسی نظم گوئی کا، جس کا کوئی پیمانہ ہی نہیں ہے، کوئی روپ سروپ بن بھی پائے گا یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ میرے خیال میں نثری نظم میں بارآوری کی گنجائش کم ہی ہے۔ جہاں تک نظم گوئی کا غزل گوئی سے بہتر ہونے کا سوال ہے میں غزل گوئی کو بہتر خیال کرتا ہوں۔ جس مقبولیت اور اعتبار کی منزل میں غزل پہنچ چکی ہے دوسری اصناف سخن وہاں نظر نہیں آتیں۔ فی زمانہ نظم گوئی کو غزل گوئی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ آج کی غزل پہلے جیسی 'خودمست' صنف شعر نہیں ہے۔ آج غزل میں زندگی اور زندگی میں غزل کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ 'تغزل' کی جگہ 'غزلیت' نے لے لی ہے۔ اب غزل کہنے کے لئے تربیت یافتہ جذبہ،

ذہن ونظر کی بالیدگی، علمی وفنی بصیرت اور زبان والفاظ پر خلاقانہ قدرت لازمی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا آج کی غزل' مطالعہ نہیں اجتماعی محاکمہ ہے'، اور اجتماعی محاکے کے درجے تک پہنچنے والی شاعری بلا شبہ سنجیدہ عالمی شاعری کے ساتھ رکھ کر پڑھی جا سکتی ہے۔ غزل میں یقیناً 'بڑی شاعری' کے لئے بڑی گنجائشیں ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ غزل کا ایک شعر طویل تر نظم میں پھیلے ہوئے موضوع کو اپنے دو مصرعوں میں نہ صرف سمیٹ لیتا ہے بلکہ اظہار کی سطح پر نظم کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جادو جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو کلیم الدین احمد جیسے غزل کے نکتہ چیں بھی اس سچائی کا برملا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انسان جب تہذیب کے اعلیٰ ترین زینوں پر ہوگا اُس وقت اُس کی شاعری اشعارِ غزل تک محدود ہوگی''۔

عرفان سے اردو ادب کے کئی پہلوؤں پر بڑی وقیع گفتگو ہو سکتی تھی اگر وقت اور کتاب کے صفحات اجازت دیتے۔

Mr. Irfan Danish Sikandri,
621-B, South Olden Ave., Trenton, NJ 08629, USA

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

کچھ اور خاک عزیز و ضمیر زندہ پر
ابھی یہ جسم کے مرقد میں سانس لیتا ہے

اسی کو کہتے ہیں پردیس، جب ملے فرصت
کریدو زخم بھی، مرہم بھی آپ ہی سوچو

یہ آئنوں میں جو وحشت کی خاک در آئی
جنوں کی پھر کہیں زنجیر کھل گئی شاید

تھم گئی ہل کے زمیں ایک ہی لمحے میں مگر
آ گئے فرش پہ کچھ اونچے مکانوں والے

یوں بھی ہوتا ہے کہ اکثر ہم خموشوں کی زباں
بولتی رہتی ہے دُنیا، سوچتے رہتے ہیں ہم

شکستہ سوچ کی دیوار آ گئی اُس پر
خود اپنے خواب کے ملبے میں دب گیا اک شخص

اسے گماں کہ رشتہ اک اونچی شاخ سے ہے
مرے خدا کوئی آندھی غرورِ برگ کے نام

وہ تُو کہ چاندنی کا سمندر تھا موجزن
اور میں کہ تری روشنی میں ڈوبتا گیا

مجھ سے ہی مجھ کو دور نہ لے جائے آگہی
کیا کیا سکھا رہی ہے مری زندگی مجھے

اور

غزل میں فکر کا اظہار یہ ہے
سفر ہے زندگی کا استعارہ!

ہمیں یقین ہے کہ ہم پر ستم تمام ہوئے
ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہوں گے

عقیل دانش
۲۵ / ۳ / ۲۰۰۳

عقیل دانش

ویمبلی، مڈل سیکس، برطانیہ

حرف و صوت سے رشتہ زور و زر نہیں دیتا
بات صرف یہ دانش روح کے سکوں کی ہے

اتنی خوب صورت دلیل وہ بھی دو مصرعوں میں کوئی دانش ور ہی دے سکتا ہے اور عقیل دانش بلاشبہ دانش ور ہیں۔ سچے کی بات سنتے ہیں تو "انا" کا جھگڑا نہیں پالتے۔ کوئی ڈیڑھ دو سال قبل کی بات ہوگی ایک بار انہوں نے خیر خیریت پوچھنے کے لئے فون کیا۔ اس زمانے میں عقیل لاس اینجلس کے ہفت روزہ "پاکستان لنک" میں سیاسی کالم لکھتے تھے۔ میں نے دورانِ گفتگو ان سے کہا کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں مگر "سیاست" سے اپنے آپ کو آزاد کیجیے اور اردو ادب کی طرف آیئے۔ اردو ادب کو آپ کی ضرورت ہے۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ عقیل دانش نے اردو ادب کے حوالے سے اتنے مفید اور معلوماتی عمدہ کالم لکھے کہ ان کے تراشے محفوظ ہونے لگے۔ ایسا ہی ان کا ایک معلومات افزا کالم میں نے ۱۱/اگست ۲۰۰۰ء پڑھا۔ عقیل دانش نے اس میں "حرف کی طاقت" پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی ہی عمدہ معلومات فراہم کی تھیں مثلاً برطانیہ میں مطالعے کی کیا اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں عقیل یوں رقم طراز ہیں:

"قدرت نے انسان کو زبان عطا کی، گفتار کی قوت بخشی، مافی الضمیر ادا کرنے کی توانائی مرحمت فرمائی اور

گویائی کی صلاحیت ودیعت فرمائی... اور مزید کرم یہ کیا کہ حرف کو محفوظ رکھنے کے لئے امانت لوح وقلم تفویض کردی۔ اس طرح حرف کے اعجاز نے سوچ، فکر، خیال اور تصور کو اظہار کا روپ دے کر مجسم کردیا۔ اور پھر اسی نے تاریخ لکھی بھی اور بنائی بھی اور صاحب دانش یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔

الفاظ کے اسی اعجاز نے کتاب کو جنم دیا۔ کتاب جو ایک انسان کی سوچ، فکر اور بصیرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور یہ حرف اور لفظ کا ہی اعجاز تھا کہ وحی الٰہی کا آغاز "اقرا" سے ہوا اور جب تک مسلمانوں نے لفظ سے رشتہ وابستہ رکھا، لفظ انہیں اعزاز ووقار عطا کرتے رہے۔ لفظ اور کتاب سے مسلمانوں کی محبت اور وابستگی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یورپ میں انہی کی فکر کے چراغ جل رہے ہیں۔ علم اور لفظ سے یورپ کی وابستگی ہی نے اسے دنیا میں معزز اور سرخ رُو کیا۔ تیکنیکی ترقی کے باوجود آج بھی یورپ اور بالخصوص برطانیہ کا، لفظ سے اور کتاب سے رشتہ استوار ہے۔ کمپیوٹر کی حکومت کے باوجود برطانوی اب بھی کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق برطانیہ میں مطالعہ ایک سماجی سرگرمی ہے جو زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس جائزے میں پچاس ہزار افراد نے حصہ لیا نتیجۃً یہ بات سامنے آئی کہ ملک کے بانوے (۹۲) فی صد افراد اپنے دوستوں سے کتابوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ستانوے (۹۷) فی صد افراد کتابوں کے مطالعے کے لئے دوسروں کا مشورہ قبول کرلیتے ہیں۔ ستاسی (۸۷) فی صد لوگ دوسروں کو خوشی سے کتاب مستعار دے دیتے ہیں۔ چھیانوے (۹۶) فی صد افراد تحفے میں کتابیں پیش کرتے ہیں اور پچانوے (۹۵) فی صد افراد تحفے میں کتابیں لینا پسند کرتے ہیں۔ اور اسی جائزے کے مطابق انچاس (۴۹) فی صد افراد کتاب شروع سے آخر تک پڑھتے ہیں۔

مغرب میں تصنیف وتالیف ذوق مطالعے کی وجہ سے ایک صنعت کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ اگر کسی کی کوئی ایک کتاب عوامی مقبولیت حاصل کرلے تو اس کی پوری زندگی معاشی اور اقتصادی چکر سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ چاہے تو اپنے وقت کا ہر لمحہ، ہر پل لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے گزار سکتا ہے"۔

عقیل دانش کیا نہیں ہیں! ان کی شخصیت میں کئی دل کش رنگ اور روپ پوشیدہ ہیں۔ وہ شاعر، تنقید نگار، صحافی، براڈکاسٹر اور ماہر تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے احیاوفروغ کے لئے سنجیدگی اور پوری توانائی سے کام کر رہے ہیں۔ سادات گھرانے سے تعلق رکھنے والے عقیل دانش ۲۵/ جولائی ۱۹۴۰ء کو امروہہ، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے گھرانے کے ساتھ کراچی، پاکستان میں آکر آباد ہو گئے۔ جہاں چاروں طرف شاعری کی فضا پائی۔ چنانچہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کردیئے۔ ان کا نام عقیل احمد ہے اور تخلص کے ساتھ عقیل دانش کہلاتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی سے اردو اور نفسیات کے مضامین کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے سے وظیفہ پاتے ہوئے امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا۔ انہیں "تمغۂ بابائے اردو" سے بھی نوازا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی نیشنل ڈگری کالج کراچی میں بطور استاد تقرر ہوا، جہاں سال بھر اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۴ء سے گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی میں لکچرار رہے اور ۱۹۶۹ء میں انگلستان آگئے۔ یہاں کئی سال تک بی بی سی کی اردو سروس میں براڈکاسٹر رہے۔ اب بھی بی بی سی کے

لئے جز وقتی کام کرتے ہیں۔ اسی دوران لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورئنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔ پچھلے پچیس چھبیس برسوں سے یہ خدمات تاحال جاری ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں شادی کے مقدس بندھن میں بندھے۔ ۱۹۷۸ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں ''تمغۂ اقبال'' سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۴ء سے تاحال ارنسٹ بیون کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ فیلڈ کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

عقیل دانش اپنی بیگم کی زندگی میں ان کے تعاون سے اردو سینٹرڈے اسکول بہ نام ''اُجالا'' ۱۹۸۵ء سے کامیابی سے چلاتے رہے۔ ساتھ ہی وہ این ای اے (NEA) کے لئے جی سی ایس ای اور اے لیول کے امتحانات لینے اور نصاب ترتیب دینے کے کام بھی کرتے رہے ہیں۔ جنگ لندن میں دو سال سے ہفتہ وار کالم ''رسائی دل تک'' لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ جنگ لندن میں سو(۱۰۰) اسباق کا سلسلہ بعنوان ''اردو لکھیئے، اردو پڑھیئے، اردو بولیئے'' لکھا جو یورپ بھر میں بہت مقبول ہوا۔ انہوں نے جنگ لندن کا ادبی صفحہ بھی کچھ عرصہ تشکیل دیا۔ ان کی کالم نویسی اب بھی جاری ہے۔ لاس اینجلس کے ہفت روزہ ''پاکستان لنک'' میں باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔

''آپ نے شاعری کب شروع کی''؟ جواب میں عقیل دانش کہنے لگے ... ''پہلا شعر ۱۹۵۷ء میں کراچی میں کہا۔ جو یہ ہے۔

قدر انسان کی کرو ہر دم ۔۔۔ کہ یہ ہے شاہکار قدرت کا

میرے شعور کی آنکھ کھلی تو امروہہ کی مٹی سے شعری لطف اُٹھانا شروع کر دیا۔ چاروں جانب شاعری کی فضا پائی۔ کراچی میں بھی یہی ماحول ملا۔ فطرت میں شاعری تھی جو پندرہ سال کی عمر میں نوک قلم تک آگئی۔ اب غزل، نظم، رباعی، قطعہ اور کچھ آزاد نظم میں طبع آزمائی ہوتی ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل میرے لئے بھاری پتھر ہیں جنہیں میں نے چوم کر چھوڑ دیا ہے''۔

عقیل دانش کہہ رہے تھے کہ ان کی رائے میں موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے غزل اور نظم، دونوں ہی احساسات کی بہتر ترجمان ہیں۔ اور آج کا ادب بھی اس عہد کا ترجمان ہے۔ ادب اور زندگی کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا لیکن درحقیقت وقت چالیس پچاس سال بعد بتاتا ہے کہ ہمارے ادب نے معاشرے کو کس حد تک متاثر کیا۔ اور پھر معاشرے میں انقلاب بھی ادب سے آتا ہے مگر رفتہ رفتہ۔ نثر (فکشن) اور شعر میں ہزاروں لوگ زندگی کے کرب کا، اظہار کر رہے ہیں مگر بہت سے کام حکومت اور اداروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں مثال کے طور پر منشیات، جو زہر کی طرح معاشرے میں سرایت ہو رہے ہیں، کے خلاف بہت کچھ نظم و نثر میں لکھا گیا ہے، مگر اس کی روک تھام کی ڈور حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے عقیل دانش نے بہت سی اچھی باتیں کیں۔ انہوں نے کہا ''... ہم میں اور ہماری نسل میں زبان کے فرق سے ایک خلا سا آگیا ہے۔ مشاعرے میں وہی لوگ آئیں گے جن کو زبان سے لطف لینے کی حد تک دلچسپی ہوگی۔ دراصل نوجوان نسل کے دن رات کا زیادہ

حصہ انگریزی زبان سے وابستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی سوچ کا ذریعہ ترسیل انگریزی ہے۔ میں ربع صدی پہلے سے پڑھا رہا ہوں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے مگر چند گھنٹوں کے بعد ہی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے تو اندر سے جواب آیا کہ میں سوچتا تو اردو میں ہوں، پھر اس کا ترجمہ کرتا ہوں تو مجھے انگریزی بولنے والے کے مقابلے میں دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے بچوں کے ساتھ یہی مشکل اردو زبان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان بول لینا الگ بات ہے اور ادبی صلاحیت و استعداد کا پیدا ہونا علیحدہ۔ اور شعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے زبان اور ادب کی جو صلاحیت ہونی چاہیئے وہ ان بچوں میں نہیں ہے''۔

اس موڑ پر میں نے پوچھا... ''تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کل کلاں کو ہمارا ادب صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا''؟

''میں بہت بڑی بات عرض رہا ہوں کہ یہ صورت حال نہ صرف یہاں، برطانیہ میں، بلکہ پاکستان و ہندوستان میں بھی جلد یا بدیر آنے والی ہے''، انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا... ''ادبی ڈائجسٹوں کی اس صنعت نے ہمارے بہت سے اداروں کو تباہ کیا ہے۔ اس وقت کون سا ایسا رسالہ ہے جو دعویٰ کرے کہ وہ خالص ادبی ہے۔ ڈائجسٹوں نے ادب کی چاٹ لگا کر لوگوں کو پڑھنے پر مجبور تو کیا ہے مگر وہ خالص ادبی ہونے کے دعویٰ پر نہ کتاب بیچ سکتے ہیں نہ رسالے۔ یہاں پر نوجوان نسل کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ جی سی ایس ای اور اے لیول کے امتحانات میں اے گریڈ (A-grade) میں اردو پاس کرنے کے باوجود نوجوان نسل کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ انہیں اردو سے کوئی دلچسپی رہے۔ یہی بہت ہے کہ وہ تھوڑی بہت لکھ بول لیتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اگر اعلیٰ معیار کی اردو نہ بول پائیں تو کم از کم سمجھ ضرور لیں''۔

عقیل دانش نے کہا... ''اردو لکھیئے، اردو پڑھیئے، اردو بولیئے والا سو (١٠٠) اسباق کا سلسلہ میں نے خود بچہ بن کر لکھے تھے۔ دراصل زبان بولنا ایک بات ہے اور زبان پڑھنا اور چیز۔ میں تو ایک عمر تدریس سے وابستہ رہا ہوں۔ لہٰذا میں نے بڑی باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اسباق کو لکھا تھا۔ اس بابت یورپ بھر سے خصوصاً ماؤں کے خطوط ملے جنہوں نے اس سلسلے کو سراہا۔ دراصل گھر کا ایک فرد بھی اردو جانتا ہو، خصوصاً ماں، تو اس کا مطلب ہے کہ اردو کئی نسلوں تک منتقل ہو سکتی ہے''۔

برطانیہ کے تناظر میں اردو کے مستقبل کے بارے میں ان کی رائے ہے... ''وقت کا دھارا آدمی کو اپنے ساتھ بہا لیجاتا ہے۔ آنے والے کل میں اردو اس انداز میں تو شاید نہ رہے، مگر اردو رابطہ کی زبان ہے اور ہمارا رابطہ برصغیر سے ہے، لہٰذا ہمارے لوگ مستقبل قریب میں اردو بولتے رہیں گے، لکھتے رہیں گے اور پڑھتے رہیں گے، گو کہ ادبی انجمنیں اس سلسلے میں بہت کام کر رہی ہیں اور انفرادی کوششیں بھی اپنی جگہ ہیں مگر غالباً محفلوں کا یہ انداز باقی نہ رہے۔ اردو ضرور باقی رہے گی۔ بقول ظہیر کاشمیری:

ہمیں یقین ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب　　　ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

میں نے دریافت کیا ... ''اچھا ادب تخلیق کرنے والے اسے ذریعہ معاش کیوں نہیں بنا سکتے؟ یہ سسٹم ہمارے معاشرے میں کب تک چلتا رہے گا؟'' عقیل دانش نے کہا... ''اس کی بھی کوئی امید نہیں۔ ہمارے ہاں یہ روایت قائم ہی نہیں ہوئی۔ انگریزی (یا کسی دوسری زبان) کا قلم کار، چاہے وہ کسی اور ہی ذریعہ معاش سے وابستہ ہو، جب ایک ناول لکھ دے، اور وہ بک جائے تو راتوں رات ملینئر (millionaire لکھ پتی) بن جاتا ہے۔ ہندو پاک میں صرف ایک ہی آدمی ایسا نظر آیا جس نے اس ذریعے سے خوب پیسے کمائے وہ ابن صفی تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ان کے پاس جگوار کار اور ذاتی ڈرائیور تھا جو اُس زمانے میں تو کیا اس زمانے میں بھی کسی اردو قلم کار کا تصور نہیں ہوسکتا۔ ننانوے (۹۹) فی صد قلم کاروں کا ذریعہ معاش ادب سے علیحدہ ہے''۔

اردو رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں ان کا خیال ہے... ''رسم الخط کی تبدیلی میرے نزدیک زبان کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ رسم الخط میں کسی زبان کی ثقافت، مزاج، فکر اور سوچ موجود ہوتی ہے۔ اور پھر دوسری زبانوں سے اردو نے جو الفاظ لیئے ہیں تو ان کا املا ان زبانوں کے مطابق ہوگا اور رسم الخط کی تبدیلی سے یہ امتیاز ختم ہو جائے گا اور الفاظ کا صوتی ڈھانچا بھی بدل جائے گا۔ مثلاً! 'پہاڑ' کو 'پہار' لکھ دیں تو پہاڑ کی سطوت ختم ہو جائے گی''۔

اب میں نے پوچھا... ''آپ اردو زبان کو اپنا کر پچھتائے تو نہیں؟'' اور بلا کسی تردد ان کا جواب تھا... ''ہرگز نہیں۔ نہ ہی اردو زبان کو اپنا کر گھاٹے میں رہا۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں، اُس سوچ کا بڑا حصہ اردو کے ذریعہ میرے قارئین تک پہنچتا ہے۔ اور اردو ہی میرے روزگار کا ذریعہ ہے''۔

ان کے پسندیدہ شعرا میر، غالب، اقبالؔ، نظیر اور فیض ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق پچھلی صدی کے قد آور شعرا کی ایک طویل فہرست ہے لیکن غزل کے چار ستون یعنی فانیؔ، حسرت، جگر اور اصغر کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اب ان کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا یہ دلچسپ مگر عبرتناک واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''ایک ادبی محفل میں ایک خاتون اپنی ہمعصر افسانہ نگار و شاعرہ خاتون پر ایک مضمون پڑھ رہی تھیں۔ پڑھنے کے دوران انہوں نے ممدوحہ کے اشعار بھی پڑھے۔ جب وہ شعر پڑھتی تھیں تو مذکورہ ممدوحہ انہیں ٹوکتیں اور کہتیں کہ شعر یوں ہے۔ تیسری بار جب شعر غلط پڑھا گیا اور ممدوحہ نے تصحیح کی تو مقرر خاتون نے فرمایا... 'حقیقت یہ ہے کہ مجھے فرصت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ممدوحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اپنے متعلق خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر مضمون مجھے دیا تھا اس لئے پڑھنے میں غلطیاں ہو رہی ہیں''۔ ہے نا یہ اردو ادب کا ایک عبرتناک واقعہ!

ان سے رخصت ہونے سے پہلے یہ چند اشعار بھی سن لیں۔

ستم کی رات کو تاریخ کے حوالے کرو   اور اس کے بعد سے لمحے شمار کرتے رہو

زبان شعر کو تلوار کی صفت دے کر   لباس ظلم و ستم تار تار کرتے رہو

کبھی کبھی تو روایت بھی لطف دیتی ہے   غزل میں تذکرۂ گلعذار کرتے رہو

Mr. Aqeel Danish,
63, Windermere Ave., Wembley, Middlesex, HA9 8QU, UK.

انتخابِ کلام

بدلی ہے صدی صرف مقدر نہیں بدلا
انساں کی زبوں حالی کا منظر نہیں

◆

تنہائی کے اور غم کے امیں ہیں در و دیوار
یہ سوچا تو پھر ہم نے کبھی گھر نہیں بدلا

◆

فاتح کے جلو میں چلے سب مصلحت اندیش
وہ ہم تھے کہ ہارا ہوا لشکر نہیں بدلا

◆

تاریخ گواہ ہے کہ ہر اک ظالم و خود سر
بدلا نہیں جب تک اُسے مل کر نہیں بدلا

◆

قرنوں سے زمانے پہ ہے طاقت کی حکومت
ایسا ہے یہ سچ ذرہ برابر نہیں بدلا

◆

مہتاب کو بھی منبع انوار ہی سمجھے
جب تک کہ کبھی فکر کا محور نہیں بدلا

◆

تو! خندہ بہ لب سیلِ بلا میں بھی ہے دانش
یہ شخص عجب چیز ہے یک سر نہیں بدلا

لہجہ بدل دیا ہے درخشاں بدیس نے
اردو زبان کی وہ روانی کہاں گئی
درخشاں صدیقی ۳۱ مئی ۲۰۰۱ء

درخشاں صدیقی

ٹورنٹو، کینیڈا

میں جب جب کینیڈا گئی درخشاں سے میری ملاقات ضرور ہوئی۔ گو ملاقاتیں تقریبات میں ہوئی تھیں اور مختصر، مگر درخشاں کا پُرخلوص تبسم اور مصافحہ کی گرم جوشی اور ان کے رسالے ''المنائی، انٹرنیشنل'' کے شمارے بھی ان کی یاد دلاتے رہتے جن کی وہ مدیرہ اور پبلشر (publisher) ہیں۔ درخشاں کے ہمسفر محترم عدیل صدیقی صاحب اپنی کم گوئی کی وجہ سے یاد رہتے ہیں۔ معصوم صورت عدیل صدیقی صاحب نہ صرف محنتی ہیں بلکہ اپنے کام کے ساتھ دیانت دار بھی ہیں۔ اپنے ادارے سے اکتیس (۳۱) سالہ خدمات کے سلسلے میں ''۲۵ سالہ خدمات'' کا ایوارڈ (award) حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ درخشاں کو بھی اللہ تعالیٰ نے نوازا اور اگست ۲۰۰۲ء میں 'کین پاک چیمبر، ٹورنٹو، کینیڈا (Can-Pak Chamber, Toronto,Canada)' کی جانب سے انہیں 'لائف اچیومنٹ ایوارڈ (Life Achievement Award)' سے نوازا گیا۔ اس کے لئے جناب شاہد ہاشمی نے انہیں خصوصی طور پر نامزد کیا تھا۔ اس کے علاوہ درخشاں نے ۱۹۹۴ء میں رائل اونٹاریو میوزیم، ٹورنٹو، کینیڈا (Royal Ontario Museum, Toronto, Canada) کی جانب سے پچیس (۲۵) سالہ خدمات کا ایوارڈ حاصل کیا اور ۱۹۹۷ء میں اونٹاریو گورنمنٹ نے کمیونٹی کی نمایاں خدمات انجام دینے پر انہیں

ایوارڈ سے نوازا۔

درخشاں کہتی ہیں ...علامہ اقبالؔ نے سو فیصد سچ کہا ہے کہ

؎ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اور میں کہوں گی کہ ؎

محبت سلیقہ و ایثار ہم سے ۔۔۔ کہ بگڑے گھروں کو بنایا ہے ہم نے
پیمبر مجاہد ولی ہوں کہ عالم ۔۔۔ انہیں خونِ جگر کا پلایا ہے ہم نے
اکیلے بساتے نہ دنیا یہ آدم ۔۔۔ جو مانو تو اس کو بسایا ہے ہم نے
اندھیروں میں جبر و ستم کے درخشاں ۔۔۔ چراغِ اخوت جلایا ہے ہم نے

اب ہم نے ''سخنورِ پنجم'' کا سوال نامہ ان کے سامنے رکھا تو مسکرا کر بولیں ... ''سلطانہ مہر! آپ بے انتہا قابلِ ستائش ہیں۔ 'سخنور' کے لئے جس محنت، ہمت اور لگن کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نے سوالات اتنی خوبی سے مرتب کیئے ہیں کہ ان کی وجہ سے عالم اردو اور جواب لکھنے والوں کی تاریخ پڑھی جا سکتی ہے۔ تو جناب عرض ہے کہ میرا نام درخشاں صدیقی ہے۔ تخلص درخشاں رکھا۔ پیدائش ضلع بارہ بنکی (یوپی، انڈیا) کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔ وجودِ پاکستان کے بعد جلد ہی ابتدائی عمر میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے راولپنڈی، پاکستان آ گئی اور وہیں ہوش سنبھالا۔ اس کے بعد ہندوستان کبھی نہ جانا ہو سکا۔ والد سید اظہر الحسن وارثی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے (آنرز)، بی ایڈ اور ایم اے (اردو) کیا تھا۔ اس لئے پاکستان میں آتے ہی پنجاب اور سندھ میں محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ یوں تو پنجاب اور سندھ کے کالجوں میں پڑھایا لیکن بیشتر وقت راولپنڈی ڈگری کالج میں بحیثیت پروفیسر شعبۂ اردو اور دیگر زبانوں کے شعبے اور اردو مجلس کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر میں گورنمنٹ کالج ملتان سے بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہو کر ٹورنٹو میں قیام پزیر ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں یہیں انتقال ہوا۔

والد کی ملازمت کے سلسلے میں پنجاب کے کئی علاقوں میں قیام رہا۔ اس طرح پرورش اور تعلیم پنجاب میں پائی۔ گو کہ اردو بحیثیت مضمون کبھی نہ پڑھا لیکن زبان اور ادب سے محبت وراثت میں پائی۔ راولپنڈی سے بچوں کا پروگرام ریڈیو سے ہوا کرتا تھا۔ اس میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتی تھی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں جلسوں، ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں شوق سے حصہ لیتی رہی۔ اسکول کے زمانے میں میری پسندیدہ علامہ اقبالؔ کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اکثر کئی تقریبات کے شروع میں ترنم سے مجھ سے پڑھوائی جاتی۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۸ء میں پوسٹ گریجویٹ اکنامکس سوسائٹی، گورنمنٹ کالج، راولپنڈی (Post Graduate Economic Society, Government Collge, Rawalpindi) کی نائب صدر رہی۔ ایم اے (اکنامکس) کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شادی ہوئی اور میں اپریل ۱۹۶۸ء میں اپنے شوہر عدیل صدیقی کے پاس ٹورنٹو،

کنیڈا آ گئی۔

عدیل بھی ادب نواز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد بشیر احمد صدیقی کراچی میں سیکریٹری، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن (Secretary, Board of Secondary Education) تھے۔ اس زمانے میں میٹرک کے سرٹیفکیٹ (certificate) پر ان ہی کے دستخط ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، جو دنیائے ادب میں مشہور شخصیت ہیں، عدیل کے پھوپا تھے۔ ان کے بیٹے یعنی عدیل کے پھوپازاد بھائی احسان رشید صدیقی کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔

عدیل نے کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی (آنرز)، ایم ایس سی [BSc(Hons); MSc] کیا۔ ڈی جے سائنس کالج میں پڑھا اور پڑھایا۔ اس کے بعد پھر یونیورسٹی آف ٹورنٹو (University of Toronto) سے دوبارہ ایم ایس (M S) کیا۔ یوں وہ ۱۹۶۷ء سے اب تک یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور آج کل بحیثیت سپروائزر ٹیچنگ لیباریٹریز اینڈ ومس کوآرڈینیٹر زوالوجی ڈیپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف ٹورنٹو (Supervisor Teaching Laboratories & WHIMS Coordinator Zoology Department, University of Toronto) میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۹۶ء تک یونیورسٹی آف ٹورنٹو اور رائل اونٹاریو میوزیم میں ریسرچ (research) میں جیالوجی (Geology)، جیو بوٹنی (Geobotany) اور بوٹنی ڈیپارٹمنٹ (Botany Department) سے منسلک رہی۔ ادبی اور سماجی کاموں میں ہمیشہ حصہ لینے کا شوق رہا لیکن شروع میں ملازمت کے ساتھ تین بچوں کی نگہداشت میں فرصت کے لمحات کم ہی میسر آئے۔

اٹھائیس (۲۸) سال کے بعد ملازمت کو خیر باد کہہ کر اپنی ذاتی دلچسپیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ محفل خواہ ادبی، سماجی، ثقافتی یا مذہبی ہو سب ہی میں شرکت سے دلچسپی رہی۔ ادبی صحافت اور شعر و سخن سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ فرصت کے اوقات ملے تو ادب اور شاعری سے دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں کی ادبی فضا وقت کے ساتھ ساتھ خوش گوار اور خوب صورت بنتی جا رہی تھی جو ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرنے اور شعر کہنے میں معاون ثابت ہوئی۔ ادبی محفلوں میں شرکت نے شاعری کے شوق کو تحریک دی۔

جنوری ۱۹۹۶ء میں ''دی المنائی انٹرنیشنل اردو انگلش (The Alumni Internatinal Urdu English Magazine) کا پہلا شمارہ بحیثیت ایڈیٹر اور پبلشر اپنے شوہر کی مدد سے شائع کیا جو کہ یہاں کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس رسالے میں خاصی تعداد میں یہاں اور باہر کے اہل قلم اور ادب دوستوں کی تحریریں شامل ہیں۔ المنائی میگزین کے ذریعہ صرف ادبی تسکین ہی نہیں بلکہ مختلف درسگاہوں کے سابق طلبا کا آپس میں رابطہ بھی استوار ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہاں کے ادیبوں اور شعرا حضرات کی میں بے حد ممنون ہوں جنھوں نے المنائی کے ساتھ بھرپور قلمی اور اخلاقی تعاون کیا ہے۔ خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر شان الحق حقی، پروفیسر آفاق احمد

(سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال) اور مشہور شاعر و ادیب جناب تسلیم الٰہی زلفی (ٹورنٹو) کی میں بے حد ممنون ہوں۔ مشاعروں میں دعوت اور ادبی حلقوں کی حوصلہ افزائی سے مشاعروں میں شرکت کی تحریک بڑھی۔ ٹورنٹو کے بیشتر اخبارات میں کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ میرا پہلا شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

درخشاں زمانے میں ہم نام کرلیں　　　　کہ ہم خود بھی کیا ہیں یہ پہچان کرلیں

آپ کے تیسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ یوں تو ادب کی تمام اصناف سے دلچسپی ہے کہ شاعری کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ مجھے وہی شاعری پسند ہے جو آسان اسلوب میں کسی خاص جذبے یا نظریے کے تحت نہیں، بلکہ ہماری زندگی، ہمارے اردگرد کے ماحول، حالات، معاشرتی مسائل، تلخ حقیقتوں اور معاشرے میں ناانصافیوں کی ترجمانی اور عکاسی کر سکے۔ شعر اچھا اور بامعنی ہو تو شاعری کسی صنف میں بھی پسند کی جا سکتی ہے۔

میں اردو کے خوش گوار مستقبل سے پوری طرح پُر امید ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ پاکستانی، ہندوستانی اور دیگر اردو بولنے والے تارکین وطن کی تعداد یہاں خاصی بڑھتی جا رہی ہے جو اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے کی جدوجہد میں کوشاں ہیں۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں جب میں ٹورنٹو آئی تو تب سے اب تک اردو کی بے حد پزیرائی ہوئی ہے۔ لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد، اخبار و کتب کی نشر و اشاعت اور ادبی محفلوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑا ہے جو اس زبان کے روشن مستقبل کا ثبوت ہے۔ یہاں لائبریریوں میں اردو کا ہر قسم کا پڑھنے، لکھنے اور سیکھنے کا مواد فراہم ہے۔ اردو اور عربی کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

اردو کے رسم الخط کے بارے میں کہوں گی کہ آج کی نسل اردو بول تو لیتی ہے لیکن پڑھ نہیں سکتی۔ بچے رومن میں لکھ کر اردو پڑھتے ہیں۔ اس طرح اردو پڑھنے کا عمل تو جاری ہے۔ رسم الخط کو بدلنے سے نوجوان نسل کو آسانی ہو جائے گی۔ لیکن دل میں اندیشے ابھرتے ہیں کہ کہیں اس طرح اردو کا رسم الخط ہی ختم نہ ہو جائے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ اصل رسم الخط کو ہی ترجیح دیں اور ہر ممکن کوشش کی جائے کہ بچوں کو اردو بولنے اور پڑھنے کی تعلیم دی جا سکے۔

آپ کے پانچویں سوال کے جواب میں کہنا ہے کہ ہر دور میں اردو شاعری میں مختلف انداز میں طبع آزمائی اور تجربات کیئے گئے ہیں۔ اسی طرح نثری نظم بھی تجرباتی مراحل سے گزر رہی ہے۔ نئے تجربات اردو کو فروغ اور ایک نئی صنف دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں نثری نظم آزاد نظم کی توسیع ہے کہ آزاد نظم میں معرّا الفاظ کی ترتیب نثری انداز میں ہوتی ہے۔ نثری نظم اگر شعر کے بنیادی تقاضے پورے کر سکے تو اس میں ہرج بھی نہیں۔ ادب میں نئے تجربات وسعت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی ادب میں نثری نظم کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور نثری نظمیں خاصی تعداد میں لکھی بھی جا چکی ہیں۔ ادب اور شاعری کی وسعت پر پابندی لگانا نئی سوچ پر پابندی لگانا ہے۔

میرے خیال میں دنیا کا ہر ملک اور قوم اپنی زبان کی حفاظت میں کوشاں ہے۔ گو اردو ادب

کی جڑیں گہری اور مضبوط نہیں مگر اتنی کمزور بھی نہیں کہ انہیں آسانی سے اُکھیڑا جا سکے۔ ان جڑوں کی آبیاری کی کوششیں امید افزا ہیں۔ آج کا ادب مختلف ممالک، اقوام اور معاشرت سے متاثر ہے جس سے نئی نئی تخلیقات، رویے اور نظریات بھی اُبھر رہے ہیں اور بے شمار ادیب اور شعرا اردو کی ترویج اور اشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان سب کاوشوں سے اردو زبان کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

آپ کے پچھلے سوال کے دوسرے حصے کے لئے عرض ہے کہ آج کا ادب قطعی نہیں تو بیشتر اپنے عہد کا ترجمان ہے۔ آج کل ادیب اور شاعر زندگی سے بھرپور ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ آج کا ادیب اور شاعر ذہنی طور پر بیدار ہے۔ گل و بلبل کی داستان کے بجائے حقیقت کا اظہار اور دورِ حاضر کے مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ کبھی کبھار ادب کے نام پر بے ادبی کے مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں مگر پھر بھی میں یہاں کی ادبی فضا سے مایوس نہیں ہوں۔ آج کے ادب میں دنیا کے کسی بھی خطے میں ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج ہے۔ اچھا ادب بھی وہی ہے جو عہدِ حاضر کی ترجمانی کر کے سماجی اور سیاسی حالات کو پیش کرے۔ ظلم و استبداد، نیز استحصالی عناصر کی مذمت کرے۔ آج کے ادب اور شاعری میں نئی فکر اور نئے تجربات بھی شامل ہیں۔ اور نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ، یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں بھی زندگی سے بھرپور اور معیاری ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ یہاں اردو عالمی کانفرنس، سیمینار، ادبی اور تنقیدی نشستیں اور دیگر کامیاب اردو پروگرام منعقد کیئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار اردو اخبار، رسالے، کتب کی اشاعت اور ریڈیو اور ٹی وی پر باقاعدہ اردو پروگرام نشر کیئے جا رہے ہیں۔

ساتویں سوال کے جواب میں کہوں گی کہ ہر اچھے شاعر اور شعر کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتی ہوں۔ گو علامہ اقبالؔ کو میں بہت تو نہ پڑھ سکی لیکن کلامِ اقبال میں جو بیداری کا احساس ہے وہ مجھے بے حد متاثر کرتا ہے۔

آپ نے اپنے آٹھویں سوال میں زندگی کا کوئی اہم اور دلچسپ واقعہ پوچھا ہے تو مجھے اب تک یاد ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان میں ہجرت کر کے آنے والوں کے دلوں میں پاکستان کے لئے بے حد محبت اور جوش و ولولہ تھا۔ ہم لوگ اس وقت بچے ہوا کرتے تھے لیکن پھر بھی چودہ (۱۴) اگست کے دن اپنے ہاتھوں سے رنگ برنگ جھنڈیاں کاٹ کر اپنے گھروں کو سجایا کرتے تھے۔ میری عمر کوئی چھ سات برس کی رہی ہوگی کہ والد صاحب جس کالج میں پڑھاتے تھے وہاں کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا۔ ان دنوں اس قسم کے جلسوں کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسٹاف (staff) اور طلبا کے علاوہ معززینِ شہر کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ میرے والد نے اس جلسے میں پڑھنے کے لئے مجھے یہ نظم یاد کرائی:

بھارت کے مہابیر و بے کار ہے یہ سپنا	کیوں رنگ بدلتے ہو گرگٹ کی طرح اپنا
کشمیر ہمارا ہے اور سارے کا سارا ہے	سنتے ہو کہ بہرے ہو کشمیر ہمارا ہے

یہ نظم میں نے کچھ اس قدر جوش اور ولولے سے پڑھی کہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ پھر انعام کے طور مجھے ایک پیکٹ بھی عنایت کیا گیا جس میں رنگ برنگی ٹافیاں اور کہانیوں کی

کتابیں تھیں۔ میں ہال میں جہاں سے بھی گزری لوگوں نے بے حد سراہا اور شاباش دی۔ بعد میں کھانے پینے کی جو چیزیں بچیں وہ بھی ہمیں گھر لے جانے کو دی گئیں۔ یہ تھا میرا پہلی بار اسٹیج پر جانا جس نے مجھے ایسی مجالس میں شمولیت کی تحریک دی۔

Mrs. Darakhshan Siddiqi,
57 Kimbarak Cres., Union Ville, On. Canada. L3R 8P5

انتخابِ کلام:

آزاد فضاؤں کا نگر مانگ رہے ہیں
جس میں نہ ہو دیوار وہ گھر مانگ رہے ہیں

ہم ان سے عنایت کی نظر مانگ رہے ہیں
ہیں تابعِ تقدیر مگر مانگ رہے ہیں

بدلے جو نہیں اپنی کبھی تلخ مزاجی
مجھ سے وہ مرا حسن نظر مانگ رہے ہیں

جو قتل سے بچ جائیں گے، سولی پہ چڑھیں گے
اس خوف سے جھک جائے، وہ سر مانگ رہے ہیں

اس دوست کی پہچان کسی کو بھی نہیں تھی
سب جس سے پناہ شام وسحر مانگ رہے ہیں

دو بول محبت کے کہے گا وہ درخشاں
ہم اپنی دعاؤں میں اثر مانگ رہے ہیں

سید محمد علی طباطبائی راز لکھنوی (مرحوم)

سابق مقیم لاس اینجلس، امریکہ

وفائیں جب خطاؤں میں بدل جائیں تو کیا کیجئے
جناب راز کو جاں سے گزر جانا پسند آیا

یہ بریگیڈیر سید محمد علی طباطبائی راز مرحوم تھے جنھوں نے یہ مقطع سنا کر مجھ سے کہا تھا... "سلطانہ بی بی! ہم نے اپنی بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ زندگی بھر ساتھ نبھائیں گے۔ مگر ہم یہ وعدہ پورا نہ کر سکے اور اب اپنی اس وفا پر شرمندہ ہیں جو خطا میں بدل چکی ہے۔ اس لئے جان سے گزر جانے کی سزا اپنے لئے تجویز کرتے ہیں"۔

یہ جملہ انہوں نے اپنی مرحومہ بیوی کے چہلم کے روز کہا تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں سب جانتے تھے کہ بیوی کی موت کا صدمہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ اسی حوالے سے لاس اینجلس کے نامور شاعر خالد خواجہ نے اپنے کالم میں لکھا تھا... "ان کی شریکِ حیات کی جدائی طباطبائی بھائی کے لئے ایک صدمۂ جاں کاہ تھی۔ دیر تک رونے کے بعد کہنے لگے، یار خالد اب ہمارے چل چلاؤ کا موسم آ گیا۔ ہمارا ساتھی تو چل دیا۔ اب اپنے بھی دن گنے جا چکے ہیں۔ یہ سب انہوں نے ایسے رسان سے کہا کہ میں دہل گیا اور میں نے دل ہی دل میں دعا کی جب تک میں زندہ ہوں میرا دوست زندہ رہے۔ گو ہمارے درمیان عمر کا تفاوت تھا لیکن وہ بانکا سجیلا انسان ہمارے بہترین دوستوں میں سے تھا"۔

کچھ ایسی ہی بات لاس اینجلس کے معروف شاعر عرفان مرتضی نے اپنے کالم میں لکھی..." ہماری اور ان کی عمروں میں کئی میل کا فاصلہ تھا لیکن نہ جانے کب اور کیسے ہم اتنے قریب آگئے کہ عمروں کا فرق ہمارے درمیان بے معنی ہو کر رہ گیا۔ ہم دوستوں کی ایک چوکڑی تھی۔ اس چوکڑی میں اسد اللہ حسینی چکر، خالد خواجہ، میں اور طباطبائی راز لکھنوی شامل تھے۔ شہر میں کوئی تقریب ہو یا مشاعرہ، یہ چوکڑی سب کو ہمیشہ ایک ساتھ ہی نظر آتی۔ طباطبائی صاحب کی شخصیت میں ایک دبدبہ تھا اور گو ہم بھی بلیک بیلٹ تھے لیکن سابق فوجی دوست کی علمی بلندی کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے تھے۔ اس زندہ دل شاعر کو ان کی بیگم کے انتقال نے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ بلا ناغہ روز اپنی بیگم کی قبر پر جاتے، پھول چڑھاتے، روتے رہتے اور قرآن خوانی کرتے رہتے"۔

سید محمد علی طباطبائی کے بھتیجے جناب حیدر طباطبائی، مدیر سہ ماہی "شہزاد، لندن"، نے اپنے چچا کی وفات پر نیویارک کے ہفت روزہ اخبار "پاکستان ایکسپریس" میں لکھا وہ ویسٹ انڈیز گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انہیں چچا کی رحلت کی خبر ملی۔ دو سال قبل اُن کی اہلیہ اور ان کی چچی کے انتقال کی خبر انہیں ملی تھی۔ تب ہی ان کا ماتھا ٹھنکا تھا کیونکہ اُن دونوں میں مثالی محبت تھی۔

حیدر طباطبائی نے اپنے خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے والد کے پانچ بھائی تھے، احسن طباطبائی، باقر طباطبائی، سروش طباطبائی، سید محمد حسین طباطبائی اور راز طباطبائی۔ راز طباطبائی صاحب نے فارسی ادب میں فرسٹ کلاس میں ایم اے کیا تھا اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے نامور شاگردوں میں سے تھے۔ دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اُنہیں فوج میں کمیشن مل گیا۔ اُن کی شادی خاندان میں یعنی حضرت نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی کی سب سے چھوٹی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ آزادیٔ ہند کے بعد موصوف پاکستان چلے گئے۔ اس وقت وہ فوج میں کیپٹن کے عہدے پر تھے اور ۱۹۷۲ء میں بریگیڈیئر کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔ بھٹو کا عہد تھا۔ اُن پر اور کچھ دیگر افسران پر شیعہ ہونے کے ناطے آغا محمد یحییٰ خان کی حمایت کی وجہ سے عتاب تھا ورنہ وہ جنرل ہوتے۔

سید محمد علی طباطبائی راز لکھنوی سے میری کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہ مجھ پر بیٹی کی طرح شفقت فرماتے تھے۔ ایک شعری محفل میں میری غزل سنی جس کا مقطع تھا۔

میرے لئے رہے نا آشنائے مہر وہی　　　　کہ نام ہی سے ملیں جن کے راحتیں کیا کیا

مشاعرے کے اختتام پر کہنے لگے..." سلطانہ بی بی! میری ایک غزل بھی اسی ردیف اور قافیے میں ہے۔ سنو"۔ میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔

کسی کی چاہ میں جھیلیں مصیبتیں کیا کیا　　　　کوئی شمار ہے کائیں صعوبتیں کیا کیا
یہ دشت و کوہ تو میری صدائیں بن نہ سکے　　　　تمہارے واسطے طے کیں مسافتیں کیا کیا
جو رہ روان رہِ حق تھے ان کا کیا کہنا　　　　ہمارے واسطے چھوڑیں صداقتیں کیا کیا
کھلی کتاب ہے قرآں کبھی پڑھو تو سہی　　　　قدم قدم پہ ملیں گی ہدایتیں کیا کیا

جنابِ راز کو سمجھا کے تم نے دیکھ لیا ہمارا یار کرے ہے حماقتیں کیا کیا

راز صاحب کا تعارف میں نے ''سخنور دوم'' کے لئے کیا تھا۔ گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور علم کے دریا بہتے تھے۔ لگتا تھا کہ بہاؤ کو بند نہیں مل رہا۔ تمکنت اور وقار کی روشنی چہرے پر بکھری ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں ان کی باتیں نہ صرف سنی جائیں بلکہ لکھ کر رکھ لی جائیں۔ میں نے سوچا کہ ''سخنور دوم'' سے فارغ ہولوں گی تو ان کے پاس کسی دن چار پانچ گھنٹے بیٹھ جاؤں گی۔ مگر وائے حسرتا، اتنی مہلت ہی نہیں ملی۔

پھر جب مشہور ناول نگار اور شاعر اشرف شاؔد آسٹریلیا سے لاس اینجلس آئے تو میں نے ان کے اعزاز میں ''امریکن اردو رائٹرز سوسائٹی'' کی جانب سے ایک محفل منعقد کی۔ میں نے راز طباطبائی صاحب سے محفل کی صدارت کرنے کی درخواست کی۔ وہ وھیل چیئر (wheel chair) پر وقت کی پابندی کے ساتھ پہنچے۔ کیا پتہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ آخری محفل ہوگی۔ کاش وقت کی لگام تھامے رہنا ہمارے بس میں ہوتا۔ میں نے ان کے ساتھ جو بھی وقت گزارا وہ یادگار وقت تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا... ''راز صاحب اپنے بارے میں تفصیل سے بتائیں، ورنہ لکھ کر دیں''۔ اور وہ مسکرا کر بولے ''اچھا بیچ میں ٹوکنا مت اور سنو کہانی میری ...''۔

''۲۵/نومبر ۱۹۲۰ء کا دن تھا۔ میں لکھنؤ کی طباطبائی منزل، کٹرہ ابوتراب خان میں پیدا ہوا جس کے متعلق حضرت اثؔر لکھنوی نے فرمایا ہے۔

سقات کٹرہ کہہ کر لوگ ہم کو یاد کرتے ہیں سند خود لکھنؤ میں بھی تھا معیارِ زباں اپنا

میں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بسم اللہ کلام پاک کی تلاوت سے ہوئی۔ خدا جنت نصیب کرے میرے مولوی صاحب کو جو بڑی محنت اور شفقت سے پڑھاتے تھے۔ گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے آنرز اور ایم اے لٹریچر میں کیا۔ یہ بات ہے ۱۹۴۱ - ۱۹۴۰ء کی جب انڈین پولیس سروس کے امتحان کے سلسلے میں صوبہ یوپی سے ہم صرف تین لوگ سلیکٹ (select منتخب) ہوئے، ایک میں، دوسرے میرے نہایت ہی عزیز دوست محمود سلیمان (پسر سر محمد سلیمان) اور تیسرے میرے برادر عزیز امداد حسین جو بعد میں سندھ کے آئی جی پولیس بھی رہے۔ میں بسبب علالت فیڈرل پبلک امتحان میں شریک نہ ہوسکا۔ لہٰذا کچھ عرصے بعد فوج کا رُخ کیا۔ حالانکہ خاندان بھر میں کسی نے سول سروس یا زمینداری کی نگہداشت کے علاوہ فوج کی ملازمت کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی دہرہ دون سے کمیشن حاصل کیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا۔ برصغیر ہند کی جب تقسیم ہوئی تو میں نے پاکستان کے لئے آپٹ (opt انتخاب) کیا اور ''اسکیم سی کراس'' کے تحت ممبئی سے اُس ارضِ پاک تک پہنچ گیا جس کی عرصے سے مجھے تمنا تھی، جو کچھ عرصہ پہلے ایک شاعر کا خواب تھا اور اس کا قیام ایک قومی لیڈر کی ضد تصور کی جاتی تھی۔ اُس وقت میں کیپٹن تھا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں بذریعہ ہوائی جہاز ایک بار پھر لکھنؤ گیا اور لکھنؤ سے لاہور تک ایک اسپیشل

ٹرین لایا جس کی کمان جی او سی یو پی ایریا جنرل سے اس شرط پر حاصل کی کہ ٹرین کی حفاظت کے لئے مجھے حفاظتی دستہ دیا جائے جو خالصتاً مسلمان اور سردار صاحبان جوانوں پر مشتمل ہو۔ شکر ہے اس معبود کا کہ میری کوشش کامیاب رہی۔ گو مشرقی پنجاب سے گزرنے میں کئی خدشات درپیش ہوئے مگر ہم ٹرین لے کر بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے۔ اور دو ہزار سے زیادہ پاکستانیوں نے پاکستان زندہ باد، کیپٹن طباطبائی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے اور کیوں نہ لگاتے کہ یہ ٹرین جب لکھنؤ سے چلی تھی تو اس وقت صرف نو سو (۹۰۰) مسافروں پر مشتمل تھی، مگر میرا حکم تھا کہ راستے میں جو بھی پاکستان کا عاشق ملے اسے بٹھاتے جاؤ۔ چنانچہ جب ہم لاہور پہنچے تو دو ہزار سے زیادہ مرد اور عورتوں نے ارضِ پاک کو بوسہ دیا، اس کی مٹی کو چوما اور اس کو آنکھوں سے لگایا۔

پاکستان فوج میں اپنی پوری ملازمت کی، جو اکتیس (۳۱) سال سے بھی زائد عرصے پر محیط ہے، اگر مختصر تفصیل بھی تحریر کروں تو سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے۔ بہت مختصراً اتنا کافی ہے کہ اس معبود کے فضل و کرم سے تمام ملازمت انتہائی خوش اسلوبی اور باعزت طریقے سے کی۔ تین چار بار ملک سے باہر جانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ یہ بڑا طرۂ امتیاز تھا۔ انگلینڈ اور امریکہ کی فوجی تنصیبات میں کئی کورس کیئے۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت پاکستان نے پہلی بار یونائیٹڈ نیشنز (United Nations) کی امن فوج میں حصہ لیا۔ چنانچہ پاکستان کی فوج کے پہلے دستے یعنی کانٹجنٹ (contingent) میں میں نے ایک میجر کی حیثیت سے ایک سال سے زائد کانگو میں، جو وسطی افریقہ کا بڑا ملک ہے، یو این او کی امن فوج کے ساتھ گزارا۔ اکتیس (۳۱) سال کی طویل مدت میں جنرل ٹکا خان تک جتنے کمانڈر انچیف گزرے ان کا زمانہ دیکھا۔ زیادہ تر جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں قیام رہا اور ۱۹۷۷ء پانچ سال تک بریگیڈیئر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوا۔ اسی دوران جنرل ٹکا خان نے فرمایا کہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ایڈوائزر (adviser) لگ جاؤ۔ تو تقریباً دو سال تک ایڈوائزر رہا۔ پھر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر انسان پر تین عناصر کا، اول خون (آج کل کی اصطلاح میں جینز [genes])، دوم تربیت اور سوم ماحول، بے انتہا اثر پڑتا ہے اور یہ اثر پیدائش کے بعد جلد ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ اس معبود نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جہاں دینی اور دنیوی تعلیم، حسن کردار، حسن اخلاق، ادب اور تہذیب کے بڑے بڑے قد آور مینار ضوفشاں تھے۔ یہ تھے میرے والدین اور میرے دیگر بزرگ، خاص طور پر میرے چچا اور بعد میں میرے خسر محترم حضرت اثر لکھنوی۔ میرے برادران بزرگ احسن، سروش اور باقر طباطبائی، ان سب نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ ان ہی کی صحبت اور شفقت کا فیض تھا کہ زبان، ادب اور شاعری نے، خواہ اردو، انگریزی یا فارسی ہو، مجھے طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنا گرویدہ بنالیا۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ لکھنؤ میں شعر و سخن کی محفلیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی۔ اُلٹے سیدھے مصرعے اور موزوں ناموزوں اشعار نظم کرنے کی سعی رائگاں

کرتا جن کی تصحیح بڑے بھائی کر دیتے اور مشاعروں میں مجھے بااصرار ترنم سے پڑھواتے۔ بہر حال میری یہ تک بندی آخر کار یوں رنگ لائی کہ والد مرحوم کو خبر ہو گئی۔ میری پیشی ہوئی۔ والد صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے میرے کسی بڑے بھائی کو شاعری کرنے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی تھی جب تک کہ وہ بی اے پاس نہ کر چکے ہوں جب کہ میں نے تو میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ اس دن سے میری توبہ۔ میں نے عہد کر لیا کہ نہ شاعری نہ تک بندی، سب کچھ ختم! پر شعر گوئی نہ سہی سخن فہمی ہی سہی شعر و ادب سے تعلق اور شوق قائم ہی نہیں رہا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ فوج کی ملازمت اس میں رخنہ انداز ضرور ہوئی مگر چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ چنانچہ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ جب بھی حضرت آثر لکھنوی ہم لوگوں سے ملنے کے لئے لاہور یا راولپنڈی تشریف لاتے تو میرا غریب خانہ چمنستان شعر و ادب بن جاتا۔ جناب حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت، مولانا سالک، عابد علی عابد، فیض احمد فیض، امتیاز علی تاج، جنرل شفیق الرحمن، ضمیر جعفری، شوکت تھانوی اور دیگر شعرا و شائقین بزم شعر و ادب کی رونق بنتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد شعر و سخن کی وہ چنگاری جو ایک مدت سے میرے سینے میں دبی ہوئی تھی لو دے اُٹھی اور مشق سخن ہوتی رہی۔ مشاعروں میں شرکت سے اجتناب کرتا مگر اپنے اطمینان اور تسلی کی خاطر کبھی جناب جمیل جالبی، کبھی رئیس امروہوی، کبھی پروفیسر کرار حسین ایسے کرم فرماؤں کو بہ نظر اصلاح کلام سناتا۔ مشفق من جناب مشفق خواجہ سے جب بھی ملاقات ہوتی تو ایک آدھ غزل ان کو سناتا۔ شعبہ طباعت سے ناواقفیت کی بنا پر میں نے حضرت آثر لکھنوی کا، جن کا میں قانونی وارث ہوں، سارا کلام اور دیگر تصنیفات (جن کی فہرست بڑی طویل ہے) مشفق بھائی کے سپرد کر دی تھیں تاکہ وہ شائع کروائیں۔ یہ تھے میری شاعری سے وابستگی کے محرکات"۔

اردو زبان کی بقا اور اس کے رسم الخط کے سلسلے میں رازؔ صاحب یوں گویا ہوئے..."ان کے جوابات فرداً فرداً یا مجموعی طور پر بے انتہا اہم اور اتنے وضاحت طلب ہیں کہ صفحے کے صفحے لیپ ڈالیے پھر بھی سیری نہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ زمانہ اتنی تیزی سے بدلا، قدریں اس سرعت سے بدلیں، خیالات اس شتابی سے بدلے اور لوگ بھی بدلے کہ جہالت علم پر غالب آ گئی۔ وہ خاندان، وہ گھرانے جو کبھی تہذیب، اخلاق، زبان و ادب کے گہوارے تھے اس تیز گامی میں سب کچھ بھلا بیٹھے۔ جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ سب اُتھل پُتھل ہو گیا۔ اب نہ کسی کو وطن سے محبت ہے اور نہ اپنی قومی زبان اردو سے۔ بایں ہمہ وہ لوگ جو اتنے متعصب ہو چکے ہیں جن کی رگوں میں صوبائی تعصب اتنا پیوست ہو چکا ہے کہ اب وہ کھلم کھلا اعلان فرما رہے ہیں کہ وہ صوبائی زبان کو قومی زبان پر ترجیح دیتے ہیں تو پھر کہاں کی قومی زبان اردو، کہاں کا ادب اور کہاں کی شاعری۔ چو کفر از کعبہ برخیزد...اب انشااللہ پھر کبھی ان موضوعات پر قلم اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔ تاہم اس وقت یہ کہوں گا کہ یہ مرض اتنا مہلک بھی نہیں کہ لاعلاج سمجھا جائے۔ یہ تو سب کچھ 'تو از ماست کہ بر ماست' ہے"۔

میں نے فروری ۲۰۰۱ء میں امریکن اردو رائٹرز سوسائٹی کی جانب سے انہیں لائف اچیومنٹ ایوارڈ (Life Achievement Award انعام ماحاصلِ زندگی) دینے کا پروگرام بنایا تھا۔

جنوری میں ان سے گفتگو ہوئی۔ بظاہر بے حد خوش تھے اور تقریب میں شرکت کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر انہیں اپنے رب جلیل سے ملنے کی اتنی جلدی تھی کی ۱۳/ جنوری ۲۰۱۰ء کے دن وہ سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا یہ "انعام ماحاصلِ زندگی" ان کی دو صاحب زادیوں نے، تنویر فاطمہ اور ان کے شریک حیات شوکت حسین مرزا اور دوسری بیٹی ڈاکٹر مہر طباطبائی اور ان کے شریک زندگی سید قیصر نے آہوں اور آنسوؤں کے درمیان وصول کیا۔ اس تقریب میں شریک ان کے تمام احباب اس موقعہ پر چشم نم، آزردہ و سوگوار تھے۔

راز صاحب مرحوم کے بڑے بیٹے افضل طباطبائی نیویارک میں انجینئر ہیں۔ ان کی بیگم کا نام گل طباطبائی ہے۔ دوسرے چھوٹے صاحب زادے انور طباطبائی اسلام آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کی بیگم کا نام نینا طباطبائی ہے۔

لاس اینجلس کے ایک معتبر شاعر سید ظفر عباس نے ان کے لئے اپنے ایک شعر میں انہیں یوں خراج عقیدت پیش کیا۔

وہ تیرا طرزِ تخاطب، وہ اعتماد ہنر　　سخن، عروسِ سخن تھی تو تیرے دم سے تھی

جناب اشرف شاد کے اعزاز میں منعقد کی گئی محفل میں راز مرحوم نے بحیثیت صدر کئی غزلیں سنائیں۔ میں نے حسب عادت چند اشعار نوٹ کیئے تھے۔ اب تبرک کے طور پر یہاں انتخاب کلام میں ملاحظہ ہو۔

ہجومِ عاشقاں میں ڈھونڈتا پھرتا رہا برسوں
مگر تجھ کو نہ مجھ سا ایک بھی عاشق نظر آیا

◆

گماں مجھ کو ہوا، میں عاشقِ صادق نہیں ورنہ
کوئی تو ہم نفس، ہم راز، ہم آواز مل جاتا

◆

اسی الجھن میں سرگرداں چلا میں جانبِ صحرا
شجر کے سائے میں دیکھا تو اک انسان سوتا تھا
مخاطب جب کیا میں نے تو وہ آرام سے اُٹھا
ردا رُخ سے ہٹی دیکھا تو وہ انسان میں خود تھا

◆

مرے اشعار میں گر راز کی باتیں نظر آئیں
تو سمجھو فیض ہے یہ شاعرِ مشرق کے شعروں کا

◆

باسمِ ربی

سارے چہروں پہ وہی ایک سی حیرانی ہے
زندگی جیسا کوئی اور تماشا بھی نہیں

راشد فضلی
۱۰ فروری ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر راشد آفضلی

ریاض، سعودی عرب

جناب محمد یحییٰ فاروقی عرف راشد آفضلی سے میری ملاقات ۱۰/فروری ۲۰۰۱ء کے دن ہوئی تھی۔ اس دن میں بہت اُداس تھی کیونکہ اُسی دن مجھے مرحوم محترم عبدالقوی ضیا کا تکلیف دہ لب ولہجہ کا خط ملا تھا جب کہ اُسی دن میں خاصی خوش بھی تھی کہ میری تین کتابوں کی تعارفی تقریب میرے احباب نے منعقد کی تھی اور اس تقریب میں شرکت کے لئے شکاگو سے بھائی حامد امروہوی، بہن تحفی امروہوی، ڈیلاس سے محترم بھائی یونس اعجاز، میری لینڈ سے ہماری دوست بہن مونا شہاب نے شرکت کی تھی۔ محترم راشد آفضلی، جو سعودی عرب سے امریکہ آئے تھے اور بطور خاص اس تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اسی دن انہوں نے مجھے اپنے کلام کا مجموعہ ''خواب آنکھیں'' عنایت کیا۔ جس میں ان کے اس ایک شعر نے پل بھر میں میری رہی سہی ساری کوفت اور تھکن دور کردی۔

بے فیض گھروں کی ہے یہی ایک علامت
دیوار تو ہوگی وہاں سایہ نہیں ہوگا

پھر اس مجموعے میں محترم بھگوان داس اعجاز کی اس خوب صورت تحریر نے توجہ کھینچ لی... ''شاعری پیغمبری نہیں ہوتی جزو است از پیغمبری ہوسکتی ہے۔ شاعری کو اس لئے 'فن شریف' بھی اکثر کہا گیا ہے، یعنی ایسا ہنر جو جذبات انسانی کی پرورش کے ساتھ ان کی تہذیب بھی کرتا ہے، روح کو بالیدگی اور وجدان کو

تازگی عطا کرتا ہے۔ اسی لئے دوسرے لوگ کان لگا کر شاعری کے پیرائے میں ڈھلی بات دھیان سے سنتے، سر دھنتے اور سرور محسوس کرتے ہیں۔ اور یوں اپنی ذہنی تھکن کچھ ساعتوں کے لئے بوسیدہ لبادے کی طرح اُتار پھینکتے ہیں اور زندگی کی تگ و تاز میں پھر نئے سرے سے لگ کر اپنی توانائیوں کا ذخیرہ کرلیتے ہیں۔ اس طرح شاعری کا زندگی سے بڑا گہرا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ مگر شاعری وہی کر پاتے ہیں جن کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے، جو نت نئے تجربات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تجربات عزم سے حاصل ہوتے ہیں یا بزم سے، مگر محض تجربے ہی کافی نہیں ہوتے۔ زبان و بیان کی نفاست و لطافت بھی ناگزیر ہوتی ہے''۔

پھر میں نے راشد کا کلام بزبانِ راشد سنا تو ان سے گفتگو میں اور بھی لطف آیا۔ راشد نے کہا تھا۔

دنیا کی اس روش سے بڑا ڈر لگا مجھے ہر شخص اپنے آپ سے باہر لگا مجھے
ساحل سے دیکھتا تھا سمندر کی یورشیں اک ایسا شخص جو کہ سمندر لگا مجھے
کٹنے کو کٹ گئی ہے اسی میں تمام عمر رہتا ہوں جس مکان میں کب گھر لگا مجھے
تو ذات کے اندھیرے کنوئیں سے نکال دے اے فکرِ خود شناس ذرا پر لگا مجھے
آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ اک خارزار ہے غفلت کی نیند میں وہی بستر لگا مجھے

میں نے کہا...راشد فضلی صاحب اب ذرا سوال جواب ہوجائیں۔ وہ ہمہ تن متوجہ تھے۔ جغرافیہ میں پی ایچ ڈی کرنے والے اس شاعر کی داستانِ حیات بڑی دلچسپ ہے اور اس پر راشد کا اندازِ بیان بھی خوب ہے۔

راشد کہہ رہے تھے...''یوں تو شاعری سولہ (۱۶) برس کی عمر میں شروع کردی تھی لیکن اوائلِ عمری میں شاعری بطور تفریح شروع کی جاتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں اور ادبی تربیت کے بل بوتے پر ہائی اسکول تک عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی میں اتنی تربیت ہوچکی تھی کہ شاعری آہستہ آہستہ درونِ ذات اپنی جگہ بنانے لگی اور ہر زبان کی شاعری اپنی جلوہ گری سے میرے دل کے نہاں خانوں کو روشن کرنے لگی۔ اشعار فوراً یاد ہوجاتے تھے جب کہ نثر میں دل کم لگا۔ بڑے شعرا خاص طور پر میر، غالب، سودا، درد، مومن اور اقبال کے مطالعے نے میرے اندر بھی اظہارِ ذات کی امنگ پیدا کردی۔ میں نے شاعری شروع کردی۔ لیکن اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ مجموعے کی اشاعت کو مسلسل موخر کرتا رہا جب کہ میرے دوست احباب اور بہت سے چاہنے والے مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ بھائی اپنا مجموعہ کلام چھپوالو۔ تمہاری شاعری سے لوگ فیضیاب ضرور ہوں گے۔ لیکن میں ابھی تک تذبذب کا شکار رہا۔ میرے بڑے بھائی نجم فضلی صاحب نے ایک بار پھر میری حوصلہ افزائی کی جیسا کہ وہ بہت پہلے میرے پی ایچ ڈی کے زمانے میں کرچکے تھے۔ واقعہ یوں تھا کہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے علی گڑھ میں مقالہ لکھ رہا تھا۔ اس کی طوالت اور نوکری کی شدید ضرورت نے مجھے بالکل مایوس کردیا تھا۔ اور میں تقریباً اس سے بے نیاز ہوچلا تھا کہ بڑے بھائی نے دو جملے کراچی سے لکھ کر میری زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ جملہ یہ تھا...

| بھائی مجھے معلوم ہے تمہارے نزدیک پی ایچ ڈی کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تم پی ایچ ڈی میرے لئے کروگے

کیونکہ یہ میری دیرینہ خواہش ہے۔ ا۔
غرض میں نے پی ایچ ڈی مکمل کر کے الحمد اللہ ڈگری لے لی۔ اور اگر اس مجموعہ کلام کے سلسلے میں بھی بھائی طباعت کا سارا بوجھ اپنے ذمہ نہ لیتے تو شاید میں اپنا مجموعہ "خواب آنکھیں" پیش کرنے سے قاصر رہتا"۔

میں نے پوچھا... "آپ کے اندر شاعری خارجی اثرات سے متاثر ہو کر ڈھلتی ہے یا..."۔

راشد درمیان میں بولے..." میں شاعری کو بہت ذاتی اور داخلی چیز سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہمیشہ سے رہا ہے کہ اچھی داخلی شاعری اپنے اندر آفاقی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے خیال میں کائنات کے سارے رنگ اور خوش بو فرد واحد کی سوچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ سوچنے والا فرد واحد (thinking individual) ہی ہے، جس کے دم سے ساری کائنات کا اثبات ہوتا ہے۔' میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں (I think, therefore I am)۔ دراصل زندگی اسی اصل حرارت کا نام ہے۔ اسی سوچ اور مشاہدے کی بنیاد پر فرد کی ذات کسی حد تک مکمل ہوتی ہے۔ شاعری میں تخییل ایک بنیادی اساس ہے جس پر تجربات اور مشاہدات کا جامہ پہنا کر اسے ایک پیکر عطا کیا جاتا ہے۔ کسی بھی شاعری میں لفظوں کا استعمال شاعر کی شبنمی نگاہ کے زیر اثر اس کے تخییل کو پروان چڑھاتا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش اپنے تخییل کی بنیاد پر ہر شاعر کرتا ہے اور جتنی وسعت اس میں شاعر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اُسی کے مطابق اس کا اپنا معیار بھی قائم ہوتا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لفظ جب اپنے لغوی معنوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تب وہ شاعری بننے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعری میں لفظوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ زبان و ادب کی وسعت کے لئے ضروری بھی ہے۔ نئی ترکیب اور نئے استعارے جب ہی بنتے ہیں جب لفظ ٹوٹ کر جڑتے ہیں اور جڑ کر ٹوٹتے ہیں۔ بہر حال شاعری میں نے کی نہیں، مجھ پر اُتری ہے"۔

"کیا کچھ پایا اس شاعری سے"؟ میں نے پوچھا۔

"شاعری کے اس طویل عرصے میں مجھے جو کچھ ہاتھ آیا وہ خواب تھا"، راشد مسکرا کر بولے، "کیوں کہ ہر لمحہ جو گزرتا جاتا ہے وہ خواب بنتا جاتا ہے اور جو آنے والا ہوتا ہے وہ بھی خواب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کے جسم کی سب سے اہم چیز آنکھ ہوتی ہے۔ میں یہاں ظاہری آنکھ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس آنکھ کی بات کر رہا ہوں جو بصارت کو جنم دیتی ہے۔ اور یوں آنکھ اور خواب مل کر انسان کے وجود اور اس کی کائنات کا احاطہ کر لیتے ہیں"۔

راشد کہہ رہے تھے کہ ان کے مجموعہ کی اشاعت میں اُن کی شریک حیات ڈاکٹر ذکیہ فاروقی ان کی شہ رگ رہی ہیں اور ان کے بچے بھی اس میں ذہنی اعتبار سے شریک رہے ہیں۔ امی سائرہ جبار (خوش دامن)، برادران نسبتی صلاح الدین پرویز اور عبدالسلام قریشی وقتاً فوقتاً انہیں روشنی میں لانے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اور پھر کچھ شاعر دوست ہیں جن میں بشیر بدر، شبنم مناروی، ظفر مہدی بہت اہم ہیں ویسے تو ان کے احباب کی فہرست بہت لمبی ہے۔ لیکن راشد کا کہنا ہے کہ دل کے جو قریب ہیں

ان کا صرف شکریہ ادا کر کے ان کی محبتوں کا قرض نہیں چکایا جا تا جیسے ڈاکٹر پرویز احمد صاحب کا کہ انہوں نے کتاب کے سرورق کے لئے خواب رنگوں کو قرطاس کی زینت بنا دیا۔

اب میں نے پوچھا... ''کچھ اپنے بارے میں بتایئے، کہاں پیدا ہوئے؟ تعلیم کہاں حاصل کی''؟ کہنے لگے... ''کوبریا پار، اعظم گڈھ، اتر پردیش، ہندوستان میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کالج فیض آباد سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کیا۔ وہاں میرے والد مولنا محمد فضل الرحمن وائس پرنسپل تھے۔ اس کے بعد دو سال عربی کی تعلیم حاصل کرنے مئو ناتھ بھنجن (دارالعلوم) میں بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ اور پھر گورکھپور یونیورسٹی سے بالترتیب بی اے ۱۹۶۱ء میں اور ایم اے جغرافیہ ۱۹۶۳ء میں ممتاز نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک میرٹھ کالج میں لکچرار اور جان ہاپ کنز یونیورسٹی (John Hopkins University) کے ریسرچ پروگرام میں بالترتیب کام کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرار ہو گیا۔ اسی سال ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۸ء میں ریاض، سعودی عرب میں بحیثیت ڈائرکٹر پرچیزنگ اینڈ شپنگ (Director Purchasing & Shipping) کام کرتا رہا اور ابھی تک وہیں پر اپنے بزنس (business) کے سلسلے میں مقیم ہوں''۔

''اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کیسے کی''؟۔ اس سوال کے جواب میں راشد نے کہا... ''میں ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۷ء سے شروع کر چکا تھا۔ انگریزی کی دو نظموں کے منظوم ترجمے کے علاوہ غزلیں اور نظمیں کہنا شروع کر دی تھیں جو گورکھپور یونیورسٹی کے میگزین میں اور بعد میں 'شب خون' میں شائع ہوئیں۔ مجھے اپنا پہلا شعر تو یاد نہیں ہے مگر اس زمانے کی غزل کے دو شعر جو فراق گورکھپوری کے سامنے پڑھے تھے پیش کیئے دیتا ہوں''۔

ہاں ہو چکی ہے مات ذرا یاد تو کرو	مٹنے کو ہے حیات ذرا یاد تو کرو
اپنے تعلقات ذرا یاد تو کرو	مجھ سے گلہ کہ تم سے تعلق نہیں رہا

''میں نے غزل، نظم، نثری نظم اور افسانہ سب ہی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر غزل اور نظم ہی میرے موضوع زندگی بنے رہے اور آج تک میرے ساتھ ہیں۔ بچپن سے ایک مصرع میرے کانوں میں گونجتا رہا ۔ سارے دیواں ہیں ایک مصرع نہیں۔ اس لئے اتنے دنوں تک دیوان چھپوانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اب چوں کہ میرے دوستوں اور خاص طور پر میرے بھائی انجم فضلی صاحب کا اتنا دباؤ پڑا کہ اپنا پہلا مجموعہ 'خواب آنکھیں' میں نے شائع کروا دیا ورنہ بقول غالب ۔ نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ''۔

سوال نمبر ۴ کے جواب میں انہوں نے کہا... ''میں اردو زبان کے مستقبل سے اس لئے پُر امید ہوں کہ اردو اب انٹرنیشنل (international بین الاقوامی) سطح کی زبان بن چکی ہے۔ یہ ہند و پاک کا مزاج اور کلچر (culture تہذیب) ہے اور اٹھتے بیٹھتے بولی جانے والی، دلوں پر حکومت کرنے والی زبان ہے۔ اپنی عمیق جڑوں کے ساتھ زندہ رہنے والی زبان ہے۔ اس میں اعلیٰ ادب پیدا ہوا ہے

اور ہوتا رہے گا۔ لیکن میں رسم الخط کی تبدیلی کا مخالف ہوں کیونکہ یہ زبان اپنے موجودہ اور مروجہ رسم الخط کی وجہ سے ہی اتنی دور تک سفر کر کے آئی ہے۔ اور یہی رسم الخط اس کی اساس ہے۔ رسم الخط بدلنے کے بعد میں سمجھتا ہوں اردو اپنا وقار کھو دے گی۔ 'ق' 'ک' میں اور 'خ' 'کھ' میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی شیرینی اور لطافت بالکل ختم ہو جائے گی"۔

راشد کہہ رہے تھے..." اردو ادب آج دنیا کے کسی بھی ادب سے آنکھ ملانے کے قابل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہری اور بہت پھیلی ہوئی ہیں ورنہ ادب کی اتنی بڑی عمارت اس پر تعمیر کرنا ممکن نہیں تھا۔ میر، غالب، انیس، اقبالؔ کو دنیا کے بڑے بڑے شعرا کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کی غزلوں کے مزاج کا تو شاید کسی اور ادب میں ثانی ملنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ آج کا ادب بھی اپنے عہد کی ترجمانی کر رہا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے صرف گنے چنے لوگ ہی آج کل ایسے ہیں جو اس کے وقار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اس ادب کی آبیاری میں کثرت سے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بڑا ادب پیدا کرنے والے پچاس (۵۰) یا سو (۱۰۰) سال میں دس پانچ ہی نکلتے ہیں۔ یہ بات صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر ادب کی ایک ہی کہانی ہے"۔

راشد کے خیال میں..." نثری نظم کہنے میں کوئی ہرج نہیں۔ ادب میں جب تک تبدیلی نہیں ہوتی اس وقت تک زبان پروان نہیں چڑھتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ مختلف اصناف سخن میں لوگ طبع آزمائی کریں۔ رہا غزل گوئی یا نظم گوئی کا مقابلہ، تو یہ مقابلہ کرنا بے معنی ہے کیونکہ دونوں ہی اصناف اپنے اندر بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں اور اپنے اپنے طور پر بڑا ادب پیدا کرتی رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غزل ہمارا مزاج اور کلچر ہے اور نظم آج کی بھاگتی زندگی کی اہم ضرورت"۔

راشد نے کہا..." میری زندگی کے اہم دن شعر و ادب کے حوالے سے وہی تھے جب میں نے شاعری شروع کی تھی اور جگرؔ، فراقؔ، نشورؔ واحدی، فنا کانپوری وغیرہ کے سامنے اپنے شعر پڑھنے کی جرأت کر سکا تھا اور اس وقت خوشی کی انتہا نہیں ہوتی تھی جب ان سے داد ملتی تھی"۔

پھر کہنے لگے، دوسرا یادگار واقعہ بھی سن لیں..." میں اپنے والد صاحب سے بہت ڈرتا تھا مگر چوں کہ اردو فارسی کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی اس لئے میرا یہ بہت بڑا شوق تھا کہ انہیں اپنی شاعری بھی سناتا۔ اور جب پہلی بار ۱۹۵۹ء میں انہیں میں نے اپنے کچھ اشعار سنائے اور انہوں نے مجھے شاباشی دی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑے واقعہ سے کم نہیں کہ میرے والد نے مجھے سب سے زیادہ جن شعرا سے متعارف کرایا وہ شیخ سعدیؒ، حافظؒ، میر، غالب اور اقبالؔ تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر میری شاعری کا کوئی معیار اس وقت ہے تو ان ہی شعرا کا رہین منت ہے۔ فراقؔ، جگرؔ اور جوشؔ میرے پسندیدہ شعرا رہے ہیں مگر میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ میں راشد فضلی ہی رہوں اور کسی کا اثر میری شاعری پر شعوری طور پر نہ پڑے۔ یہ تو اب وقت ہی بتائے گا کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔

غیر شعوری طور پر فراق، ناصر کاظمی اور محبوب خزاں وغیرہ کا شاید مجھ پر کچھ اثر پڑا ہو۔"
آیئے اب راشد سے ان کی ایک نظم بعنوان ''آج کا المیہ'' سنتے ہیں:

عجیب بے حس سی قربتیں ہیں، عجیب بے حس سے فاصلے ہیں
نہ آئینوں میں ہے عکس واضح نہ زندگی میں ہے زندگی کا سراغ باقی
یہ سارے چہرے سپاٹ دھرتی سے اُگ رہے ہیں
نہ مر رہے ہیں، نہ جی رہے ہیں
سپاٹ چہروں پہ پھیلی آنکھوں میں حیرتوں کا گزر نہیں ہے
گداز باتوں کا سارا رشتہ زبان والفاظ کی حدوں سے گزر چکا ہے
نگاہ وقلب وجگر کی باتیں، جمال وحسن ونظر کی راہیں بھی
زندگی کی حسین راہوں سے منحرف ہیں
یہ کیسا وقت ہم پر آپڑا ہے
کہ قربتوں میں ہے قربتوں کی تلاش جاری
کہ فاصلوں کی حدوں سے آگے بھی فاصلے ہیں
اِدھر کو دیکھو، اُدھر کو دیکھو، جدھر کو دیکھو وہیں پہ دیوار کا سماں ہے
عجیب بے حس سی قربتیں ہیں، عجیب بے حس سے فاصلے ہیں
یہاں تو دیوار کا سماں ہے

Dr. Rashid Fazli, Director Purchase & Shipping,
P O Box 4551, Riyad, 11412, Saudi Arab

انتخابِ کلام

بے حس گھروں کی چاہتیں دیوار و در سے ہیں — ہم آج اپنے گھر میں پڑے رہ گزر سے ہیں
وہ لوگ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی — جو لوگ زندگی میں بہت مختصر سے ہیں
آنکھوں میں زندگی کی کثافت ہے دھند ہے — جو دیکھتے ہیں آج بھی اہلِ نظر سے ہیں
گہری جڑوں کو لے کے جو ہم ریگ میں اُگے — اب آندھیوں کے بیچ کھڑے اک شجر سے ہیں

لہریں سمندروں کی یہ کہتی ہیں دوستو
ہم اپنی قوت آج بھی اپنے سفر سے ہیں
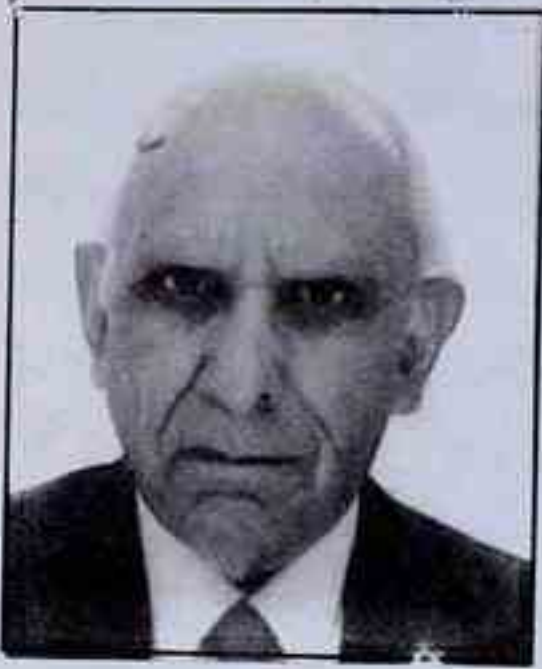
میری ماں! تیرے دُکھ کا جب بھی سوچوں
تیرے قدموں میں میرا سر جھکتا ہے۔
سوہن راہی
۱۲/۱۱/۲۰۰۵

سوہن راہی

سربٹن، سرے، برطانیہ

کبھی گیت سنتے تھے اور بڑے چاؤ سے۔ پنکج ملک کی آواز میں آرزو لکھنوی کا لکھا ہوا گیت تو آج بھی ایک عجیب سحر پیدا کر دیتا ہے۔

یہ کون آج آیا سویرے سویرے // کہا روپ نے چاند ہے چودھویں کا
مگر چاند کیسا سویرے سویرے....!

تین مصرعوں میں روپ کی پریت اور پریتم کی ایک دل موہ لینے والی پوری کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے جیسے ساون میں پپیہے کی پی کہاں، کوئل کی کوک اور جنگل کے مور کا رقص، سب اکٹھے ہو گئے ہوں۔

مدتوں بعد سوہن راہی جی کو ایک محفل میں گیت سناتے پایا تو لگا کہ ہر بول جیسے ایک الگ تال پر مدھرتا بکھیرتے ہوئے خود پر بیتی سنا رہا ہو۔

سارے رنگ ہیں آنچل تیرے، کلی کلی تری دھڑکن
بات بات میں تالی تیری، ڈال ڈال تیرا جوبن
کیسا شور مچاتا ہے تو، اب میری تنہائی میں
زخموں جیسے پھول کھلے ہیں، دھرتی کی انگڑائی میں

الفاظ کا زرت کہیں تو فطرت کے ساز کا عکاس ہے کہیں جوگی کی تنہائی کا مظہر اور کہیں ایک البیلی ناری کے دکھ کا اظہار جس کو اپنے پریتم کی جدائی میں کھلے ہوئے پھول بھی زخم لگیں۔ ایک علیحدہ مصرعہ ہی ایک کہانی بن جاتا ہے جیسے امیر خسروؔ نے کہا ؎ کاہے کو بیاہی بدیس، لکھی بابل مورے۔

اور گیت کے یہ بول ؎ نہ انگ چیناں، نہ نیند نیناں نہ آپ آئے نہ بھیجے پتیاں

آج بھی گیت کے دبستانوں کا سرمایہ ہے۔ اس پر گیت سنانے والا سُر تال سے واقفیت رکھتا ہو تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

سوہن راہی جی کی، جو تقریباً نصف صدی سے خود کو شاعری کی دنیا سے وابستہ کیئے ہوئے ہیں، پہلی تخلیق ان کا گیت ہی تھا جس کا مکھڑا ہے

؎ کیوں من میں آگ لگاتی ہو، کیوں گیت برہا کے گاتی ہو

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''زخموں کے آنگن'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اب تک نہ صرف گیت کہے بلکہ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، دوہا، تروینی اور ''نثرِ لطیف'' میں طبع آزمائی کی ہے۔ ''نثر لطیف کی ترکیب پر میں چونکی۔ ان سے پوچھا تو اپنی مترنم آواز میں بولے...'' آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ نثری نظم یا نثری غزل کے بارے میں میری کیا رائے ہے۔ تو محترمہ عرض یہ ہے کہ نثری نظم نام کی کوئی صنف ہی نہیں ہوتی، یا تو نظم ہوتی ہے یا نثر۔ ایک شاعر جب اپنے خیالات کو نثر میں قلم بند کرتا ہے اور اس میں آہنگ بھی پایا جاتا ہے تو کیوں نہ ہم اس کو اُسے نثری نظم کے بجائے 'نثرِ لطیف' کہیں۔ اسی طرح نثری غزل کی ترکیب بھی گمراہ کن ہے۔ اسے آپ 'نثرِ نفیس' کا نام دیں تو بہتر ہے کیوں کہ کوئی بھی تخلیق جو فن کے اصولوں اور پابندیوں سے آزاد ہو وہ دیرپا نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ دونوں اصناف مغربی ادب پاروں کی نقالی میں لکھی جا رہی ہیں۔ اور نقالی کا تو کوئی مستقبل ہوتا ہے نہ اس کی پزیرائی ہوتی ہے''۔

ہم اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ سوہن جی نے کہا...'' میں مایوس تو نہیں، فکر مند ضرور ہوں کیوں کہ ہماری نئی نسل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہم نے انہیں سنجیدگی سے اس طرف متوجہ کیا ہے۔

رسم الخط کے بارے میں میری رائے ہے کہ مغرب میں ایشیائی بچوں کو اردو سکھانے کے لئے رومن رسم الخط یا دیوناگری رسم الخط معاون ثابت ہو سکتا ہے تو ابتدائی کلاسوں میں یہ فارمولا استعمال کیا جائے مگر اردو رسم الخط کو بھی زیرِ مشق اور زیرِ بحث لایا جائے تاکہ طالب علم اردو زبان و ادب کے صحیح رنگ و روپ کو اپنا سکیں''۔

سوہن راہی کی رائے میں کوئی بھی شاعر کسی بھی صنفِ سخن میں اپنے احساسات کو بہتر طور پر رقم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس صنفِ سخن میں اظہار پر مکمل قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور نہ ہر شاعر امیر خسرو ہے نہ میر تقی میر، نہ غالبؔ، نہ ٹیگور اور نہ ہی اقبالؔ۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ غزل کے مقابلے میں نظم

احساسات کے اظہار کی بہتر ترجمان ہے۔ اسی طرح آج کا بیشتر ادب اپنے عہد کا ترجمان نہیں۔ اس کی تفصیل خاصا وقت مانگتی ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ اردو زبان نے مجھے اپنایا ہوا ہے۔ میں اپنے جذبات اور افکار کے اظہار کے لئے اسے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ پھر بھلا اردو کو اپنا کر گھاٹے کا سودا کیسا کہ وہی تو میرے ہونے کا جواز ہے''۔

سوہن راہی نے نثر بھی لکھی ہے۔ لیوٹن سے ساحر شیوی کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی جریدہ ''سفیرِ اردو''، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء کا شمارہ سوہن راہی جی کی اردو زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں ان کے نام وقف ہے۔ اس میں پاکستان کے شاعر اور کالم نویس ابن انشا مرحوم سے سوہن راہی کا لیا ہوا آخری انٹرویو اور کرشن چندر، ضیا فتح پوری، کیول دھیر اور پریم وار برٹنی پر لکھے ہوئے سوہن جی کے مضامین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی نظموں، غزلوں اور گیتوں سے بھی یہ شمارہ مرصع کیا گیا ہے۔ سوہن راہی کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی معتبر ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔

دورانِ گفتگو سوہن راہی جی نے بتایا کہ وہ ۲۱/ جون ۱۹۳۵ء کے دن پنجاب کے گاؤں لسائڑہ ضلع جالندھر، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں اس دن پورن ماشی تھی۔ پورا چاند آکاش کو اپنی باہوں میں لیئے ہوئے تھا۔ سو اس رات کا اثر تو کہیں نہ کہیں آنا تھا۔ سوہن راہی کی شخصیت نے بھی پورن ماشی کا کچھ حصہ خود میں جذب کرلیا ہے۔ آج ان کے گیتوں میں پورن ماشی کی ٹھنڈک اُسی طرح موجود ہے، جس طرح ان کی شخصیت میں ہے۔ اپنے احباب سے وہ ایسے ملتے ہیں کہ لمحوں میں ساری محبت اور شفقت نچھاور کرنے کو بے تاب نظر آتے ہیں۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم قصبہ پھگواڑہ ضلع کپورتھلہ، پنجاب، ہندوستان میں حاصل کی۔ اردو میں ادیب عالم اور میکینیکل ڈرافٹس مین شپ (Mechanical Draftsmanship) کا ڈپلوما حاصل کیا۔ اردو سے لگاؤ کی بنا پر انہوں نے اپنے طور پر اردو پڑھی۔ ان کے چچا آنجہانی بھگت رام چنگا پنجابی کے معروف انقلابی شاعر تھے۔ گھر میں اردو کے مقبول جرائد شاہراہ، ادب لطیف، ہمراہی، آج کل اور بیسویں صدی آتے تھے۔ چچا کا ساتھ اور جرائد کا مطالعہ کام آیا۔ ساتھ ہی سول انجینیر اور آرکی ٹیکٹ (Civil Engineer and Architect) بننے کی لگن کے باعث دہلی کی ایک فرم میں انہوں نے معمولی تنخواہ پر جونیئر اسسٹنٹ (Junior Assisstant) کے طور پر کام بھی کیا اور اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں سردار بشن سنگھ ریٹائرڈ ایکس ای این (X-EN) اور محترم ڈی آر شرما ریٹائرڈ اگزکٹو انجینیر (Executive Engineer) کی رہنمائی میں اپنے شہر پھگواڑہ میں باقاعدہ آرکیٹیکچر کی فرم 'میک آرچی کو (Mech-Archi Co.) قائم کی۔ اس فرم کے تحت انہوں نے کوٹھیاں، رہائشی مکانات، فیکٹریاں اور قصبہ گورایا ضلع جالندھر میں ایک سینما گھر ڈیزائن کیا، لدھیانہ میں ایک ہوزری فیکٹری ڈیزائن کی، مختلف کولڈ اسٹوریج کے نقشے بھی بنائے اور دیگر بہت سے پروجیکٹ مکمل کیئے۔

نومبر ۱۹۶۳ء میں اپنے چند نزدیکی دوستوں کی تجویز پر اپنا دفتر اپنے چھوٹے بھائی کے

حوالے کر کے آرکیٹیکچر کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اور بہتر روزگار کے سلسلے میں انگلینڈ چلے آئے اور جب سے یہیں ہیں۔ تب سے اب تک ان پر کیا بیتی بقول ان کے ..."یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس کو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ تاہم یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ انگلینڈ میں سب سے پہلے برمنگھم میں اپنا ڈیرا جمایا۔ اس دوران میں ایک فیکٹری میں کرین ڈرائیور (Crane Driver) اور بسوں میں بس کنڈکٹر (BusConductor) کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے آرکی ٹیکچر کی تعلیم کے لئے آسٹن یونیورسٹی برمنگھم (Aston University Birmingham) میں جزوقتی کورس کے لئے داخلہ لیا اور آر آئی بی اے پارٹ ون (RIBA Part 1) تک تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے پیشے آرکی ٹیکچر کا کام برمنگھم کے گرد و نواح میں بطور آرکیٹیکچر اسسٹنٹ ۱۹۷۵ء تک کرتا رہا۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۹ء تک بی بی سی لندن (BBC London) میں بطور سینئر آرکی ٹیکچرل اسسٹنٹ (Senior Architectural Assisstant) کے عہدے پر مامور رہا۔ بی بی سی سے ریٹائرمنٹ کے بعد گیارہ برس تک نیوز ایجنسی کا بزنس کرتا رہا۔ لیکن بھاری نقصان اٹھانے کے بعد توبہ کر لی"۔

سوہن راہی کہتے ہیں..."میں ہر اُس شاعر سے متاثر ہوتا ہوں جس کا فن اور جو خود زندگی کی سچائی کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ویسے میں میرا بائی، کبیر، میر تقی میر، غالب، فراق، فیض احمد فیض، پریم وار برٹنی، ساحر لدھیانوی اور نریش کمار شاد سے زیادہ متاثر ہوں۔ گزری صدی میں قد آور شعراء میرے خیال میں علامہ اقبالؔ، فراقؔ گورکھپوری، یاس یگانہ چنگیزی اور فیض احمد فیضؔ کے نام لیئے جا سکتے ہیں"۔

اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگے..."غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ ایک فیکٹری پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ جب وہ نقشہ مکمل ہو گیا تو اُسے اپنے گاہک دولت رام کلسی کو قصبہ بنگہ ضلع جالندھر دینے کے لئے گیا تو اس نے مجھے حسب وعدہ ایک سو دس (۱۱۰) روپے دے دیئے اور میں نے اس رقم سے دس (۱۰) روپے گڈول (good will) کے طور پر واپس کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگا راہی صاحب اور کیا حال ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ جیسے بزرگوں کی دعائیں ہیں اور آشیرواد ہے کہ میں محنت کرتا ہوں اور اچھا کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ میری بات سُن کر انہوں نے کہا راہی صاحب آپ اچھا کھائیں پیئیں گے تو اچھا اچھا سوچیں گے بھی۔ ان کی یہ بات میں آج تک نہیں بھول پایا کہ اچھے کھانے سے مراد روغنی کھانا نہیں بلکہ صحت مند کھانے سے ہے اور کنجوسی سے نہ رہنے کی نصیحت بھی اس میں پوشیدہ ہے"۔

Mr. Sohan Rahi,
63, Hamilton Avenue, Surbiton, Surrey, KT6 7PW, UK

انتخابِ کلام (گیت)

چاروں اور ہیں میرے بھیس، ان سب میں ہوں میں درویش
اک اونکار ہے درشن جگ میں، ایک خدا ہے ایک مہیش

پھول کی چاہت شبنم موتی
دیپ کو پیاری جھلمل جیوتی
کجراری ریناں بھی ڈھونڈے، سندر کرنوں جیسے کیس
چاروں اور ہیں میرے بھیس، ان سب میں ہوں میں درویش

کوکھ جلے دو روٹی کارن
ہونٹھ ہیں سوکھے پانی کارن
بھوکی پیاسی دھرتی بھیجے، برکھا کو نس دن سندیش
چاروں اور ہیں میرے بھیس، ان سب میں ہوں میں درویش

بندیا چاہے سپن سلونے
نت کومل کلیوں کے بچھونے
جیون جوت اُجاگر کرنے، آن پڑے ہیں ہم پردیس
چاروں اور ہیں میرے بھیس، ان سب میں ہوں میں درویش

چندا مانگے سورج مکھڑا
میں مانگوں دھرتی کا ٹکڑا
راہی اس دھرتی پر سکھ کا کب ہوگا شری گنیش
چاروں اور ہیں میرے بھیس، ان سب میں ہوں میں درویش

نظم (ندائے حق)

کتنی بے نام گزرگاہوں سے ہو کر نکلے
کتنے گم نام شبستانوں کے سایوؤں کے تلے
عہد فردا کے نئے چاند ہو کر نکلے
کتنے خاموش سیہ گہرے سمندر کاٹے
کتنے دکھ درد کے صحراؤں سے ہو کر اُبھرے
کتنے آلام کے رنگوں سے نکھر کر آئے
کتنے ذرات کو وہ حُسنِ زرینہ دے کر
ارضِ خاکی کے نئے نقش منور کر کے
کتنے جسموں میں وہ لفظوں کے لہو کو بھر دے
وہ لہو جس میں تغیر کی پکاریں ہیں نہاں
وہ لہو جس کی ہے وسعت تہِ کون و مکاں
وہ لہو جس میں ضیا بار نگا ہیں دم لیں
وہ لہو جس میں ہیں تاریخ کی عظمت کے نشاں

"گلوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے"

رضیہ اسماعیل 15/3/03

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برمنگھم، برطانیہ

بچپن میں والدین کی دی ہوئی تعلیم زندگی بھر کے لئے مشعل راہ بنی رہتی ہے۔ رضیہ کے والد نے بھی انہیں بچپن میں حوصلہ مند رہنے اور سچ بولنے کی تعلیم دی تھی۔ رضیہ نے اس پر ہمیشہ عمل کیا۔ گو بقول رضیہ اس "خوبی" نے انہیں بہت دکھ بھی دیئے۔ مگر انہوں نے ریاکاری اور منافقت سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ جو سچ جانا اسے بانگ دہل کہا اور یہی رویہ رضیہ نے اپنی شاعری میں بھی اپنایا۔

جوان چہرے لٹے لٹے سے، نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اجڑی جوانیوں کو میں کیسے عہد شباب لکھوں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ۹/ جون کو پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ایک چھوٹے سے گاؤں "بھروکی چیمہ" میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد مولانا عبدالغفور مرحوم ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ سارا گاؤں ان کی عزت کرتا تھا اور لوگ ایک خاندان کی طرح آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ رضیہ کو ڈاکٹر کی بیٹی کے نام سے پکارتے تھے۔ شادی سے پہلے ان کو رضیہ خالدہ سلطانہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شادی کے بعد رضیہ اسماعیل کے نام سے ان کی شناخت ہے۔ رضی تخلص اختیار کیا مگر اس تخلص کو عام پاکر انہوں نے تخلص کے استعمال کا جھگڑا ہی ختم کر ڈالا۔

رضیہ کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی، کیوں کہ گاؤں میں کوئی مناسب اسکول ہی نہیں تھا۔ بڑی بہنیں تو پرائمری کے بعد وزیر آباد ہائی اسکول میں چلی گئیں اور رضیہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے اپنی امی کے پاس گاؤں میں رہیں۔ پھر ان کے والد نے گھر ہی کو اسکول میں تبدیل کرلیا کیوں کہ گاؤں کے چند اونچے پکے حویلی نما مکانوں میں سے ایک ان کا گھر بھی وسیع تھا۔ ان کے والد ایک جید عالم اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ اپنے وقت کے ممتاز نعت خوان اعظم خان ان کے دوست تھے۔ مذہبی اجتماعات میں بچپن میں رضیہ نے ان کی نعتیں سنیں اور انہیں زبانی یاد بھی کرلیا۔ گاؤں کی کھلی فضا، لہلہاتے کھیت، بہتی ندیاں اور تاروں بھری راتوں کی مسحور کن فضا میں بالخصوص تہجد کے وقت ان کے والد کے "اللہ ہُو" کے دل فریب ورد نے رضیہ کو بہت متاثر کیا۔ کم سن ننھی لڑکی رضیہ کے ذہن میں اُس کے اطراف و نواح کے ماحول سے جنم پانے والے سوالات نے اس میں غور و فکر کی عادت ڈال دی لیکن ان کا جواب اسے بہت بعد میں ملا۔

رضیہ کا تعلیمی کیریر (career) شاندار رہا۔ ہر امتحان اسکالرشپ (scholarship) کے ساتھ پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے درجہ اول میں بی اے کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں ایم اے (انگریزی) کی طالبہ تھیں کہ انہیں برطانیہ آنا پڑا۔ یہاں آکر سول سروس میں ملازمت کی مگر اس کی یکسانیت سے اُکتا کر لندن مانٹی سری کالج (London Montessori College) میں داخلہ لے کر ٹیچر ٹریننگ (teacher's training) مکمل کی۔ بعد میں یونیورسٹی آف سنٹرل لندن سے سوشل ورک کی ٹریننگ کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہیں درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ پھر سوشل ورک میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کیا۔ ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع تھا "برطانیہ میں ایشیائی کمیونٹی میں خانگی تشدد اور بچوں پر اس کے اثرات"۔ اور یوں انہوں نے سوشل ورک اور سماجی خدمات بالخصوص خواتین کے ساتھ کام کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ انہوں نے "آگہی" نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی ہے جو اسی مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔

۱۹۷۱ء میں رضیہ کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی اسماعیل سے ہوئی۔ شادی دونوں کی پسند سے تھی۔ اب دو بیٹیاں ثنا اسماعیل اور وردہ اسماعیل ہیں۔

رضیہ کا پہلا شعر ہے۔

بدلا ہوا ہے رنگ چمن اُڑ رہی ہے خاک بدلی تری نظر تو نظارے بدل گئے

پھر رضیہ نے باقاعدہ شاعری کے دشتِ خارزار میں آبلہ پائی کی۔ کالج کے طرحی مشاعروں حصہ لیا۔ سالوں کی ریاضت کے بعد اپنا پہلا مجموعۂ کلام "گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو" شائع کرایا۔ ان کا یہ شعر کتاب کی پشت پر درج ہے اور رضیہ کے مزاج کا غماز ہے۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو مجھے کانٹوں پہ چلنا آگیا ہے

اس کا دیباچہ مرحوم عدیم ہاشمی نے لکھا تھا۔ عدیم مرحوم نے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا... "رضیہ ایک

اوریجنل (original) اور جینیوئن (genuine) شاعرہ ہے۔ وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے بیریئر (barrier) اگر کراس (cross) نہیں کر چکی تو انہیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو، سوائے افتخار نسیم کے، رضیہ اسماعیل سے خائف رہنا چاہیئے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام و مرتبے پر فائز ہو سکتی ہے"۔

رضیہ نے صنفِ شاعری میں غزل کے ساتھ نظم (آزاد اور پابند، دونوں) نثری نظم، ماہیئے اور دوہے بھی کہے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں ان کی تین کتابیں نظموں کا مجموعہ "سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں"، ماہیوں کا مجموعہ "پیپل کی چھاؤں میں" اور نثری نظموں کا مجموعہ انگریزی تراجم کے ساتھ "میں عورت ہوں" شائع ہوئی ہیں۔ رضیہ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے لکھے۔ اردو اور انگریزی میں مختصر دورانیئے کے اسٹیج ڈرامے بھی لکھے۔ کالم نویسی اور رپورتاژ بھی کی۔ مگر طبیعت کی روانی انشا پردازی اور ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی طرف مائل رہی۔ چنانچہ ۲۰۰۰ء میں "چاند میں چڑیلیں" کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا۔

نثری نظم اور نثری غزل کے حوالے سے ان کا کہنا ہے... "نثری نظم اور نثری غزل بلکہ مسلسل غزل، آزاد غزل، تضاداتی غزل اور مکالماتی غزل کے تجربے ہونے چاہیئیں۔ انسانی طبیعت یکسانیت سے اُکتا جاتی ہے۔ اس لئے ایسا مزاج قدرتاً انسان کو رنگ رنگ کی تتلیاں پکڑنے اور چیزوں کو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ تلون ادب کے حصہ میں ہی نہیں، دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی کارفرما ہے۔ آزاد نظم کو دیکھیں، جب یہ لکھی گئی تب میرا جی، مجید امجد اور ن م راشد وغیرہ نے مخالفتوں کا سامنا کیا کیونکہ روایت شکنی چاہے کیسی بھی ہو کسی کو گوارا نہ تھی۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ اردو ادب میں نثری نظم کو ابھی تک اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا جس طرح دیگر 'درآمد' جدید اصناف نے اپنے لئے جگہ بنالی۔ نثری نظم ہمارے ماحول کے لئے اجنبی ہے اور اپنی جگہ بنانے میں اسے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن انگریزی ادب میں یہ تجربہ نیا نہیں ہے اور اب یہ وہاں ایک پختہ صنف کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس کے بارے میں جارج ایلیٹ نے لکھا کہ شاعری کی معراج نثری نظم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو ادب میں ابھی تک کوئی ایسا بڑا نام نثری نظم کے حوالے سے سامنے نہیں آسکا۔ دراصل نثری نظم نے فرانس میں جنم لیا۔ اس نظم نے آگے چل کر آزاد نظم کی صورت اختیار کی۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے نثری نظم زیادہ قدیم ہے۔ فرانس میں بعض شعرا کی نثری نظمیں بہت مقبول تھیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں آزادی سے پہلے آصف علی نے جیل میں نثری نظمیں لکھیں بعد میں بہت سے شعرا نے جن میں افتخار جالب، مبارک احمد، کشور ناہید، عبدالرشید، سعادت سعید، رضیہ جوزی، سارہ شگفتہ، کامران جیلانی، فرحت عباس اور ماورا عنایت کے نام نمایاں ہیں"۔

رضیہ نے بات جاری رکھتے ہوئے اس عمومی خیال کی طرف اشارہ کیا کہ نثری نظم لکھنا بہت

آسان کام ہے لیکن یہ درست نہیں جیسا کہ کشور ناہید نے اس کی وضاحت کی ہے... ''نثری نظم لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا سوچ لیا گیا ہے۔ ایک اچھی اور موثر نثری نظم اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک لکھنے والا شاعری کے رموز سے واقف نہ ہو۔ اس کی سوچ میں گہرائی نہ ہو۔ جہاں دونوں باتیں ہوں وہیں ایک اچھی اور پختہ نظم تخلیق ہوتی ہے''۔

اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے رضیہ کا کہنا ہے... ''اردو زبان و ادب کے بارے میں اگر ہم برطانیہ کی حدود سے باہر بات کریں تو جواب قدرے مختلف ہوگا۔ لیکن عمومی طور پر اردو زبان و ادب کے مستقبل کے بارے میں بات کی جائے تو میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کو ایسا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ سنسکرت کے مانند اردو 'بند کواڑوں' والی زبان نہیں ہے۔ یہ بہت وسیع القلب ہے اور اطراف و اکناف کی معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انجذاب کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کتنی ہی مشرقی اور مغربی زبانوں کے الفاظ کو برس ہا برس سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور نئے الفاظ و نئی تراکیب کے لئے ہر وقت اپنا دامن پھیلائے رکھتی ہے۔ گویا ایک طرف اگر بھکاری ہے تو دوسری طرف حاتم طائی بھی ہے۔ بس اردو زبان مختلف رنگوں اور لہجوں کے ساتھ دنیا کے کروڑوں انسانوں کی ضرورت ہے اور ایک ایسے رابطہ کی زبان ہے جو محلوں سے جھونپڑوں تک آپس میں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے استعمال میں ہے۔ اس لئے اسے کوئی کلیتہ ختم نہیں کر سکتا۔

جہاں تک اردو رسم الخط کو بدلنے کی بات ہے تو یہ اردو کے خلاف ایک بہت نمایاں اور گھناؤنی سازش ہے۔ میں اس کو بدلنے کے قطعی خلاف ہوں۔ آخر دنیا میں اتنی بہت ساری زبانیں ہیں۔ ان کے رسم الخط کو بدلنے کی بات کیوں نہیں ہوتی۔ ہندی [illegible] رسم الخط میں کیوں نہ بدل دیا جائے۔ اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی بات صرف ایک مخصوص لابی (lobby) کی طرف سے اٹھتی ہے اور اس کے جو عزائم ہیں ان سے کون باخبر نہیں ہے''؟

پانچویں سوال کے جواب میں رضیہ نے کہا... ''کبھی غزل نظم کے مقابلے میں احساسات کی بہترین ترجمانی کر دیتی ہے اور کبھی نظم غزل کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ اس میں لکھنے اور پڑھنے والے کے اپنے مزاج اور اپروچ (approach) کی بات ہے۔ ویسے ذاتی طور پر میری طبیعت غزل کی نسبت نظم سے زیادہ قریب ہے کیونکہ میری ذہنی ہیئت تسلسل، تنظیم اور مربوط پن کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس لئے میں نے زیادہ نظمیں لکھی ہیں''۔

رضیہ کے خیال میں ادب ہمیشہ اپنے عہد کا ترجمان رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے... ''کسی قوم کی تہذیب و معاشرت کا جاننا ہو تو وہاں کے ادب کا مطالعہ کیا جائے اور بالخصوص اس کے افسانے اور ناول کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا جس ماحول میں، جن حالات میں رہ رہا ہوتا ہے اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ اس کے داخلی و خارجی جذبات و احساسات، مشاہدات و واقعات ہی کسی ادب پارے کو تخلیق کرتے ہیں۔ جس زمانے میں قصہ باغ و بہار یا فسانہ عجائب لکھا گیا ان میں اسی عہد کی تصویر کشی ہے۔

لیکن اگر آج کوئی اسی نہج پر لکھنا شروع کردے تو یہ اپنے عہد کی ترجمانی نہیں کرے گا"۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے رضیہ نے کہا... "گو اردو میری مادری زبان نہیں ہے، آنکھ کھولتے اور شعور کی سطح پر آتے ہی جس زبان اور اس کے لب ولہجے سے کان آشنا ہوئے وہ پنجابی تھی مگر اردو میں ساری تدریس وتربیت ہوئی، اس لئے اس زبان سے ایک خاص رشتہ قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان میرے اندر رچ بس گئی۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے طویل عرصہ ہوگیا ہے۔ انگریزی زبان پر کافی عبور ہے لیکن اس کے باوجود جذبات واحساسات کی سطح پر صرف اردو میں اظہار کرکے سکون ملتا ہے اور آسودگی محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ انگریزی میں بولتے اور لکھتے وقت میں تو اردو میں سوچتی ہوں کیونکہ یہ ہی وہ زبان ہے جس میں میرے فکری عمل کا ارتقا ہوا ہے۔ باقی جہاں تک نفع نقصان کی بات ہے تو خدا کا شکر ہے اس نے اردو زبان میں اظہار کا موقعہ اور سلیقہ دیا۔ ورنہ تو سوچتے سوچتے ہی عمر بیت جاتی۔ اس طرح اردو کو اپنا کر میں قطعی گھاٹے میں نہیں رہی"۔

رضیہ کے پسندیدہ شاعر غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ ساتھ میر تقی میر، شکیب جلالی، فیضؔ، ناصر کاظمی، ن م راشد اور عدیم ہاشمی ہیں۔ شاعرات میں اہم نام ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر اور سارہ شگفتہ کے گنواتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے..." پروین شاکر نے جس طرح نسوانی جذبات اور نفسیات کی ترجمانی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اور اس لئے اردو شاعری میں پروین کی شاعری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے مرد حضرات سے سنا ہے کہ پروین کی شاعری جینڈر بیریر (gender barrier تذکیر وتانیث کی حد بندی) توڑ دیتی ہے، میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے جینڈر بیریر نہیں توڑے بلکہ ان کو مضبوط کیا ہے۔ انہوں نے صرف اور صرف ایک عورت بن کر عورت کے داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ پروین نے مردوں کی ترجمانی نہیں کی۔ پروین کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ خیال بڑی شدت سے دامن گیر رہتا ہے کہ یہ ایک عورت کی شاعری ہے کیونکہ مردوں کو عورت کے جذبات واحساسات کے اس قدر مکمل بیان پر قدرت ہو ہی نہیں سکتی جو ایک عورت ہی کرسکتی ہے۔ پروین کے بعد بہت سی شاعرات بھی نسائی احیائی ادب لکھ رہی ہیں۔ جس طرح نثر میں عصمت چغتائی نے عورتوں کو بات کہنے کا حوصلہ دیا اسی طرح پروین نے نسائی جذبات وخیالات کو بیان کرنے کا قرینہ سکھایا"۔

رضیہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا..." میں سمجھتی ہوں کہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی عورت کا استحصال ہوا ہے۔ اگر عورت تذکیر وتانیث کے خانوں سے اُٹھ کر بات کرنا چاہے تو اس پر یہ الزام آجاتا ہے کہ یہ تو کسی مرد کی شاعری لگتی ہے۔ وہ لُغت جو عورت کے جذبات و احساسات کی ہر رنگ میں ترجمانی کرے جہاں وہ کبھی عاشق اور کبھی معشوق، کبھی عورت اور کبھی مرد بن کر سوچے وہ زبان ابھی ہم نے ایجاد نہیں کی۔ جب تک ہم نسائی شعور کو سمجھنے کے لئے اس سطح تک نہیں پہنچ جاتے جو عورت کے ان نر ورلڈ (inner world باطنی نفس) کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ہمیں

عورتوں کی تحریریوں کو کھلے دل و ذہن سے سننا اور سمجھنا چاہیے''۔

ساتویں سوال کے جواب میں رضیہ یوں گویا ہوئیں۔۔۔'' ویسے تو زندگی میں کئی یادگار واقعات نے جنم لیا۔ بچپن میں ہیلن کیلر کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس وقت تو دھنگ سے یہ بھی نہ معلوم تھا کہ یہ خاتون کون ہیں اور جب پتا چلا تو بہت خوشی ہوئی کہ کیسی عظیم عورت کو دیکھنے کی سعادت ملی۔ نیلسن منڈیلا کی رہائی، ذوالفقار بھٹو کی پھانسی، مدر ٹریسا کی رحلت، پرنسز ڈایانا کی اچانک موت، یہ سب واقعات یاد کے خانوں میں خوشی وغمی کے ملے جلے کوئی نہ کوئی اثر چھوڑ گئے۔ مگر ذاتی طور پر دو واقعات میری زندگی میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے میری سوچوں کے دھارے اور زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ یہ دونوں واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ میں چونکہ اپنے والد سے بہت قریب تھی اس لئے ۱۹۶۴ء میں ان کے اچانک برطانیہ چلے آنے پر بے حد ملول تھی۔ ان دنوں ہم وزیر آباد میں تھے۔ میں بس گم سم ہو کر رہ گئی۔ ان کی کمی شدت سے محسوس کی۔ جو بھی رفاقت دس گیارہ سال کی عمر تک والد سے ملی بس وہی قیمتی سرمایہ ٹھہرا۔ اس جدائی نے میری ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی نشوونما کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ برطانیہ آئی تو ایک سال بعد وہ وفات پا گئے۔ بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ میں کھو سی گئی۔ ایک گہری خاموشی، اذیت اور کرب نے بہت عرصے گھیرے رکھا۔ پھر یہ کیفیت میری پہلوٹھی بیٹی کی پیدائش پر ختم ہوئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے مجھے غم و اندوہ کے مقام پر سے، جس میں جہاں میں برسوں سے کھڑی تھی، پوری شدت کے ساتھ دھکیل کر باہر نکال دیا۔ گویا میری بیٹی کے جنم کے ساتھ میرا بھی دوسرا جنم ہوا اور یوں ماں بننے کا اعزاز حاصل کرنا ہی میری زندگی کا یادگار ترین واقعہ قرار پایا۔ یہ ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ اُس حالت میں جو نظم ہوئی اور 'اُجالا' کے عنوان سے میرے مجموعۂ کلام 'سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں' میں شائع ہوئی، یہاں آپ کی نذر ہے'':

پاکیزہ محبتوں سے محرومی نے، میرے اندر اندھیرے بھر دیئے
زندگی کی راہ تلاش کرتے کرتے، میں گہرے سمندر میں جا گری
منہ زور سمندر نے مجھے پوری رعونت سے، ساحل کی طرف دھکیلا
جہاں زندگی منتظر ملی اور لہروں نے سلامی دی
میری بیٹی کے ایڑیاں رگڑنے سے مقدس زمزم کے چشمے پھوٹ نکلے
ممتا کے لازوال محبت کے چشم، اندھیرے اجالے بن گئے
پیاس بجھ گئی، میں کائنات کی/ مقدس ترین ہستی بن چکی تھی
میں ماں بن چکی تھی!

Dr. Mrs. Razia Ismail,C/O, Aagahee,
10 Augusta Road, Acocks Green, Birmingham B27 6LA, UK

انتخابِ کلام

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں ایک دیپ جلا ہوتا

❖

کچھ غم تو اندھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا

❖

راتوں کا اندھیرا ہے تنہائی ہے اور میں ہوں
ایسے میں کوئی جگنو پہلو سے لگا ہوتا

❖

گھر ڈھونڈنے نکلے تھے ویرانے میں آ پہنچے
اے کاش کہ رستوں میں ترا نام لکھا ہوتا

❖

ہے جال اندھیروں کا جاؤں تو کدھر جاؤں
رستے میں ترے گھر کے کوئی دیپ جلا ہوتا

❖

اک آگ جدائی کی جلتی ہے نہ بجھتی ہے
شعلہ سا اٹھا ہوتا دل راکھ بنا ہوتا

❖

تو اور کہیں پر ہے میں اور کہیں پر ہوں
میں تجھ کو ملی ہوتی تو مجھ کو ملا ہوتا

❖

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرِ مژگاں جو ستارے ہیں انہیں مت روکو
عارضِ گل اسی شبنم سے نکھر جائے گا
ہاتھ تھامو تو دھنک پر ہی قدم رکھتی چلوں
راستہ دشت کا رنگوں سے سنور جائے گا

رضیہ قاضی
۱۷ر جون ۲۰۰۳ء

پروفیسر ڈاکٹر رضیہ قاضی

سان فرانسسکو، کیلی فورنیا، امریکہ

''اُس دن صبح ہی صبح سلطانہ مہر صاحبہ کے فون نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا کہ نہ معلوم انہوں نے مجھ کو کیسے ڈھونڈ لیا۔ پھر ''سخنور'' کی چار ضخیم جلدوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس دھان پان سی خاتون نے دنیائے ادب کے ساتوں سمندروں کو کھنگال ڈالا۔ بلا امتیاز مذہب وملت جہاں کئی دُر ہائے آبدار ولُولوئے شہوار برآمد کئے وہاں مجھ سی سنگ ریزہ پر بھی ان کی نگاہ انتخاب پڑی۔ ضرور کوئی روحانی یا ماورائی طاقت ان سے یہ کام کرواتی ہوگی جو (معذرت کے ساتھ کہوں گی) دس (۱۰) مرد مل کر بھی انجام نہ دے سکیں۔ نازک مزاج قلم کاروں سے فرمائشی کام حاصل کرنا آسان نہیں۔ فون کالیں، ذاتی رابطے، مسافتیں اور پروازیں جو سارے جہاں پر محیط ہوں غیر معمولی حوصلے کی بات ہے۔ اور یہ ان میں ہے۔ کیوں نہ ہو ان کا نام ہی سلطانہ ہے۔ اقلیم ادب کی ملکہ جو ٹھہریں تو اس میں درپیش مہمات کو سر کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ سلطانہ رضیہ وہ واحد حکمران خاتون تھیں، برصغیر ہند جن کے زیرنگیں تھا لیکن سلطانہ مہر کی کمندیں تو عالمگیر ہیں''۔ محبت کا یہ نذرانہ پروفیسر ڈاکٹر رضیہ قاضی نے اپنے خط کے ذریعے مجھے بھیجا تھا۔ پھر لکھا تھا۔ ''لیجئے آپ کی فرمائش کی تعمیل کرتی ہوں۔ آپ بیتی سن لیجئے۔ میں نے حیدرآباد دکن کے ایک معروف علمی وادبی گھرانے میں ''مرزا منزل'' کی وسیع کوٹھی میں آنکھ کھولی۔ رضیہ سلطانہ نام

تجویز ہوا جو بعد شادی رضیہ قاضی میں تبدیل ہوا۔ والد صاحب ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے اور یقین رکھتے تھے کہ اساتذہ ہی اصلی معمار قوم ہیں۔ تدریس وہ معزز پیشہ ہے جس کو شاہجہاں نے اپنی نظر بندی کے دوران پسند کیا تھا اور جس پر اورنگ زیب نے کہا تھا "ابھی تک آپ کے سر سے خوئے حکمرانی نہیں گئی"۔ لیکن والد کو اس سے اختلاف تھا کہ اس پیشے میں بمشکل سفید پوشی کا بھرم نبھایا جا سکتا ہے جب کہ ڈاکٹری کا پیشہ عزت و افتخار کے ساتھ ساتھ مالی فراغت کا بھی ضامن ہوتا ہے۔ چنانچہ آپا مرحومہ اور میں تدریس سے منسلک ہوئے اور بقیہ تینوں بہن بھائی ڈاکٹر بنے۔ والدہ کے اجداد رؤسائے دہلی سے تھے۔ پرنانا سید ناصر ولی بہادر جو ظلِ سبحانی عالم پناہ بہادر شاہ کی گودی کے کھلائے تھے۔ جنگ آزادی کے مجاہد تھے۔ برٹش راج سے بغاوت کے جرم میں ان کے وارنٹ جاری تھے تو دکن آ کر نظام کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔ انہیں جاگیر منصب اور خطاب سے نوازا گیا۔ یہ رؤسا ایک سے ایک درویش صفت صوفی منش تھے۔ باہر قابل اساتذہ لڑکوں کو عربی فارسی اور دینی علوم کی تعلیم دیتے جب کہ درون خانہ مغلانیاں اور استانیاں لڑکیوں کی خانہ داری کی تربیت کرتیں اور علوم دینیہ سکھاتیں۔ پھر مشن اسکول قائم ہوئے جس میں والدہ نے تعلیم پائی۔ بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ تحریر و تقریر فصیح و بلیغ ایسی ہوتی تھی کہ جامعہ کے اساتذہ، اسلامک سنٹر کے علما (امریکہ میں) قائل تھے، بلکہ مجھ سے پوچھا "تم نے اپنی عظیم ماں سے کچھ حاصل کیا"؟ انہوں نے اپنے خاندان کی دوسو (۲۰۰) سالہ تاریخ سنہ عیسوی و ہجری کے ساتھ انتہائی صحت و صفائی سے محض حافظے سے "روداد چمن" کے نام سے لکھی جو میں نے شائع کی۔

چودہ (۱۴) سال کی عمر میں میرٹ (merit) کی بنا پر وظیفے پر دہلی یونیورسٹی کے لیڈی اروِن کالج میں ہوم اکنامکس کی تعلیم کے لئے بھیجی گئی۔ وہاں سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ گھر پر لکچرار کی تقرری کا مراسلہ آیا۔ پڑھاتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی سے بھی ڈگری لی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ماحول شعر و ادب کے لئے بڑا ساز گار تھا۔ اردو اوڑھنا بچھونا تھی۔ دہلی اور دکن ہر دو جامعات میں کالج میگزین کے اردو سیکشن کی ادارت کے لئے مجھے نامزد کیا گیا۔ ساٹھ کی دہائی میں حکومت کی جانب سے ہوم اکنامکس کے شعبہ غذا و غذائیات (Food and Nutrition) میں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا گیا جہاں سے ماسٹر کی ڈگری لی۔ امریکہ کے آزاد معاشرے کا عجیب تجربہ تھا۔ ان دنوں مجھے قطعی علم نہ تھا کہ ڈیٹ (date) کے معنی کھجور کے سوا بھی کچھ اور ہیں۔ جب وہاں پر میری ایک ہم جماعت نے پوچھا، "Razia do you have dates in your country? (رضیہ کیا تمہارے ہاں ڈیٹ ہوتے ہیں؟)" تو میں نے لاپروائی سے جواب دیا، "Yes, plenty (ہاں بہت زیادہ)" کیونکہ میں نے سوچا ... کیا تمہارے ہاں کاریں ہیں؟ کیا وہاں خواتین پڑھتی ہیں؟ تم نے اتنی اچھی انگریزی کیسے سیکھی؟ کی قسم کا سوال ہوگا۔ پھر جب اس نے حیرت و حسرت سے کہا، "How lucky (کتنی خوش نصیب ہو)" تب میں نے بھی اتنی ہی حیرت سے کہا، "اس میں اتنی کونسی خوش نصیبی ہے؟ بازار جاؤ جتنا چاہو خریدلو"۔ پھر اس نے پوچھا، "کیا یہ خریدے جاتے ہیں؟"۔ میں نے کہا، "بالکل، اتنے روپے فی کیلو"۔ بلکہ آگے

سمجھائی گئی کہ ماہ رمضان میں اس کی بڑی مانگ ہوتی ہے کیونکہ ان سے روزہ افطار کیا جاتا ہے اور عید میں اس سے شیر خرما پکاتے ہیں۔ تب اس نے ''ہے ہے!'' کہتے ہوئے جگانے کے انداز میں ہاتھ آنکھوں کے آگے لہراتے ہوئے کہا،''تمھیں پتا ہے ڈیٹ کیا ہوتی ہے''؟ میں نے کہا،'' ہاں اچھی طرح سے، وہ ان اونچے درختوں پر لگتی ہیں''۔ پھر اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے جو اس کی تفہیم کی تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ جی چاہا کہ فوراً بھاگ جاؤں۔ شروع شروع میں انہیں میرے پاکستانی لباس پر اعتراض تھا۔ پھر بتدریج میرے لباس، دیسی کھانوں اور مشرقی تہذیب کو سراہنا شروع کیا یہاں تک کہ جب میں نے ان کی الوداعی دعوت کی تو ڈین (dean)، صدر شعبہ، اساتذہ اور میرے ہم سبق سب نے (میرے دیئے ہوئے) پاکستانی لباس زیب تن کیئے۔ دسترخوان پر بٹھا کر میں نے بریانی، قورمہ، شاہی ٹکڑوں وغیرہ سے ان کی ضیافت کی۔ انہیں ہاتھ سے کھانے کو کہا۔ قبل از طعام اور بعد از طعام کی دعائیں پڑھیں۔ سب نے سر ڈھک کر احترام سے جھک کر ہاتھ اٹھا کر دعائیں سنیں۔ تصاویر لیں۔ یہ سارا احوال اخبار میں اس سرخی کے ساتھ چھپا ...''پاکستانی طالبہ نے ایک رنگارنگ تقریب میں ڈین و صدر شعبہ کی ضیافت کی''۔ بہر حال واپسی پر ہوم اکنامکس کالجوں کی داغ بیل پڑی۔ اس کے خد و خال متعین ہوئے۔ نصاب مرتب ہوا۔ میں نے اسکولوں اور کالجوں کے لئے ''علم تغذیہ'' پر کتابیں لکھیں۔ زیادہ زور دیسی غذاؤں کی افادیت اور صحیح طریقۂ پکوان پر رہا۔ یہ سب اب شامل نصاب ہیں۔ میں نے تیس (۳۰) سال درس و تدریس کے لئے وقف کیئے ہیں۔

پہلے ہوم اکنامکس کالج، لاہور؛ پھر گورنمنٹ کالج فار ویمن، شاہراہ لیاقت، کراچی کی پہلی پروفیسر پھر پرنسپل رہی۔ میری کتابوں کو باہر بھی پذیرائی ملی۔ سعودیہ سے تعلیمی وفد پاکستان آیا تو بطور خاص وہاں پر ''اقتصاد المنزئی'' (ہوم اکنامکس) کے ''تخصص تغذیہ'' کے شعبہ کی تاسیس و تدریس کے لئے مجھے منتخب کیا۔ بفضل خدا درسا ۃ عالیہ (گریجویٹ اسٹڈیز graduate studies) کی بحیثیت پروفیسر پانچ سال کلیۃ البنات، جدہ میں خدمت انجام دی۔ الحمد للہ پانچ حج اور کئی عمرے نصیب ہوئے جو میرے حاصل زیست ہیں۔ فارغ اوقات میں حرمین شریفین کے سائے میں گنبد خضریٰ اور حطیم کے روبرو عبادت کی۔ یہاں پر کئی منظوم دعائیں از خود زبان پر جاری ہوجاتی ہیں، جنہیں نہ لکھا نہ چھاپا۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

در کعبہ پر: ''ظل حرم''

میں جہاں سر بہ سجود ہوں وہ فرش رشکِ عرش ہے
یاں تجلیوں کا ظہور ہے یہ زمین کوہ طور ہے
تو رحیم ہے تو عطائے جود و سخا بھی ہے
تیرے در پہ آئی ہے سائلہ تیرا دست گہر بار ہے
میرے ہاتھ میں وہ غلاف ہے میرے سر پر سایۂ عرش ہے

مجھے اور کچھ اب طلب نہیں اسی در پہ جان اب نثار ہے
یہی زندگی کا ہے ماحاصل یہی منتہائے حیات ہے
میری خاک پیوند ہو یہاں کہ یہ کنج باغ و بہار ہے

درِ رسولؐ پر

مولاؐ کے در پہ آئی، آقاؐ کے در پہ آئی
خاکِ حرم کو اپنا سرمہ بنانے آئی

سعودی عرب میں میرا قیام بڑا ہی بصیرت افروز تھا۔ ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک بار جب ایک امیرہ (شہزادی) نے اپنا مقالہ (تھیسس thesis) پیش کیا تو اس نے اپنے ذاتی صرفہ پر پُر تکلف ظہرانہ دیا جس میں کئی دم پخت سالم دنبے رکھے تھے۔ ساری خادماؤں کو نئی پوشاکیں، اساتذہ کو تحائف اور گھڑیاں دیں۔ ایسی ہی مجلس میں میں نے حکمرانِ وقت ملک عبدالعزیز کی صاحبزادی کو دیکھا جو انتہائی سادگی سے عربی برقع (عبایا) میں عام صف میں بیٹھی بڑی توجہ سے مقالے کی پیشکش سن رہی تھی۔ کوئی اس کی جانب بڑھتا تو خود سنتِ رسولؐ کے بموجب سلام میں پہل کرتی۔ میں نے دل میں اس شہزادی کا مقابلہ پاکستان کے ایک وزیرِ تعلیم کی بیگم سے کیا جنہیں طالبات نے میرے کالج میں میلاد النبی کے جلسے پر مدعو کیا تھا۔ انہیں غصہ تھا کہ کیوں ان کو صرف ایک ہار پہنایا گیا، کیوں انہیں عام اساتذہ کی صف میں جگہ دی گئی (ان جلسوں میں صرف نعت خواں طالبات اسٹیج پر ہوتی ہیں اور باقی سب فرش پر) اور یہ بھی کہ انہیں صرف شیرینی کے تبرک پر ٹرخایا گیا۔ میں نے بڑی جراٴت سے کہا ''آپ مالک ہیں حکم فرمائیں میں کالج کا کونسا فنڈ استعمال کروں''؟ ہمارے پس ماندہ ملک میں اس قسم کی عیاشی کے لئے کوئی فنڈ نہیں ہوتا۔ بے ایمانی کی اور بات ہے۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا جب شہریار دکن جو اپنے دور کے امیر ترین فرمانروا تھے، بہادر یار جنگ جیسے آتش نوا خطیب کو سننے ان کے جلسۂ میلاد النبی میں تشریف لے گئے اور پچھلی قطار میں جوتوں کے پاس بیٹھ گئے۔

میری بڑی آرزو تھی کہ وہیں ارضِ مقدس میں پیوند خاک ہوں لیکن والدہ محترمہ نے یہ کہہ کر میری آنکھیں کھول دیں'' کیا ارضِ مقدس وارض ناپاک۔ مسلمان کی شناخت تو صرف اس کے اعمال سے ہے۔ مٹی میں کیا دھرا ہے۔ بلکہ یہاں آکر چیلنج قبول کرو اسی میں بہادری ہے۔ بچوں کی خبر لو کہ یہی حکمِ خدا ہے''۔ چنانچہ میں واپس آگئی کہ اس آزاد معاشرے میں (امریکہ کے) بچوں کے لئے والدین کی سرپرستی لازم ہے۔

رسم الخط کے سلسلے میں میرا کہنا ہے کہ دیوناگری یا رومن رسم الخط اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ 'خ' اور 'ق' کا فرق، 'ؤ' اور اضافت اس میں واضح طور پر ادا نہیں ہوسکتے۔ عربی یا فارسی کی اصطلاحات اور ان کے حوالے دینا، جو اردو کی شان بان ہے، انتہائی دشوار ہے۔ ویسے اب ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط کا چلن عام ہے۔ اردو کے بڑے رسالے جو اردو کے رسم الخط میں

شائع ہوتے تھے جیسے 'بیسویں صدی، شمع' وغیرہ بند ہو رہے ہیں یا ان کی اشاعت برائے نام رہ گئی ہے کیونکہ ان کے پڑھنے والے معدوم ہو رہے ہیں۔ بابائے اردو خود اس رسم الخط کے مخالف تھے۔

اردو میں اتنی وسعت اور لچک ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں علوم، فنون اور طب کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی لیکن اب امریکہ اور یورپ میں بچوں کو اردو زبان پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی نہ ان کے والدین کو دلچسپی ہے کہ انہیں اردو پڑھائیں۔

میں فطری طور پر نظم گوئی کی طرف مائل ہوں۔ غزل کی صنف آسان نہیں۔ نظم کا دائرہ غزل سے وسیع تر ہے۔ نثری نظم میں تو قلم کار اور زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ اس کے احساس و خیالات کھلے اور وسیع افق میں، ردیف و قافیے کی بندش سے آزاد محو پرواز ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تخیل کی زیادہ اہمیت ہے۔ آخر انگریزی شاعری بھی تو ہم بصد شوق پڑھتے ہیں صرف ان کے تخیل کی پرواز سے مسحور ہو کر نہ کہ عروض و بلا دو قافیہ پیمائی کی بنا پر۔

میری زندگی کا یہ واقعہ میں کبھی نہیں بھولتی۔ میں چھ سات سال کی تھی۔ میری دادی اماں میرے لئے محبت کا پیکر تھیں۔ بہت لاڈ دلار کرتیں، ہر ضد پوری کرتیں جب کہ میری والدہ کی تربیت میں نظم وضبط اور سختی تھی۔ دادی ماں کی رحلت کے بعد بھی جب میں نے ان کے چاندی کے کٹورے میں دودھ پینے اور سرخ پھولدار پلیٹ میں ہی کھانے کی ضد کی تو والدہ نے فوراً میرے آگے سے پلیٹ یہ کہہ کر کھینچ لی "اس کا مطلب ہے تم کو بھوک نہیں ہے۔ میں یہ پلیٹ دروازہ پر بیٹھی اس فقیرنی کو دیتی ہوں۔ دیکھو بھوک کیا ہوتی ہے۔ جو رزق کا شکر گزار نہیں ہوتا اس سے رزق چھین لیا جاتا ہے"۔ اس فقیرنی نے جس شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ، ممنونیت اور احترام کے جذبوں سے اُٹھ کر بڑے شوق سے دونوں ہاتھوں سے پلیٹ لی اور جس رغبت اور شوق سے کھا کر آسمان کی طرف اور پھر ماں کی طرف منہ کر کے "شکر ہے" کہا اس کو میں سہم کر حیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔ بس بچپن اسی لمحہ رخصت ہو گیا۔ اب تک میں کھا کر اسی انداز میں "الحمد اللہ" کہتی ہوں چاہے جو بھی روکھی سوکھی ملے۔

ایک اور نا قابل فراموش واقعہ میدانِ عرفات میں پیش آیا جہاں میں اپنی مرحومہ بہن کا حج بدل ادا کر رہی تھی اور عبادت میں مصروف تھی کہ اچانک مجھے سرخ گلابوں کی خوشبو کا تیز جھونکا محسوس ہوا جیسے کسی نے ٹوکرا بھر گلاب میرے سامنے اُلٹ دیئے ہوں یا کوئی عرق گلاب کی پوری شیشی انڈیل دی ہو۔ میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی لیکن جو حجاج وہاں موجود تھے وہ اس واقعہ سے قطعی بے خبر ویسے ہی خاموشی سے مصروفِ عبادت تھے۔ ان کے چہروں پر کسی غیر معمولی واقعہ کا کوئی تاثر نہ تھا۔ پھر دوبارہ اسی حج کے دوران جب میں طواف کر رہی تھی، مقامِ ابراہیم پر ویسے ہی گلابوں کی خوشبو کا جھونکا مجھ سے ٹکرایا۔ وہاں بھی حجاج کرام اپنی دھن میں خضوع وخشوع سے طواف کی دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے طواف کر رہے تھے جب کہ میں چند لمحوں کے لئے ساکت کھڑی ہو گئی تھی۔ جب میری والدہ نے سنا تو کہا کہ "جب کسی نیک روح کا گزر ہوتا ہے تو خوشبو محسوس ہوتی ہے"۔ ایک اور واقعہ ہوا۔ جب میں مملکت سعودیہ کو ملازمت پر گئی تو اپنے مکان کو کرایہ پر اٹھا دیا۔ بے ایمان کرایہ دار نے جب دیکھا کہ یہ لمبے عرصے کے لئے بیرون ملک گئی ہے تو اس نے جعلی بیع نامہ تیار

کیا اور مکان پر قبضہ کر بیٹھا۔ میں جب مقدمے اور پیشیاں بھگتاتے تھک گئی تو جنرل ضیالحق سربراہ پاکستان سے ملنے کا سوچا۔ مرحوم آتے جاتے ضرور کعبہ شریف اور مدینۃ المنورہ تشریف لاتے۔ اُن کے آنے کی خبر پر میں حرم نبوی گئی اور اپنی آنکھوں سے انہیں عصر تا مغرب محوِ عبادت دیکھا۔ جب وہ نکلے تو سعودی سپاہ کی حفاظتی پہرہ میں تھے اور عوام الناس کو ایک فاصلہ پر روکا گیا تھا۔ میں نے دور سے عرضی لہرائی اور انگریزی میں کہا "مسٹر پریزیڈنٹ سر!"۔ اس کے ساتھ ہی باڈی گارڈ اور سپاہی نے مستعد ہو کر بندوقیں تان لیں۔ صدر نے بندوق کی نالیوں کے نیچے سے جھانک کر اردو میں کہا "کیا بات ہے بی بی" اور ہاتھ کے اشارے سے بُلایا۔ میں نے عرضی پیش کرتے ہوئے کہا "میرے مکان پر ناجائز قبضہ ہے"۔ صدر نے مسکرا کر اور سر ہلا کر درخواست لی، چہرے پر واضح تاثر تھا کہ اس در پر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بس مارشل لاء اتھارٹی نے مجھے دو ماہ کے اندر مکان دلوا دیا اور اس بے ایمان کو جیل ہو گئی۔ ہمیشہ دعا کرتی ہوں کہ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین"۔

Professor Dr. Razia Qazi,
4477 Muirwood Drive, Pleasanton, C A 94588, USA

انتخابِ کلام (کہسار پری)

سیل بلا اور صحن کشادہ
لرز رہی ہے شاخ نشیمن

شبنم کے قطرے سارے چمن میں
اشکوں کے موتی ڈالی کے کنگن

چندا کی کرنیں چھن چھن کے برسیں
پیڑوں کے پتے تانے ہیں چلمن

کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں
خالی کب سے ہے زیست کا دامن

باوری کوئل کس کو پکارے
صحرا صحرا گلشن گلشن

ٹکرا کر خود تجھ پہ لوٹیں
نالے اپنے خود سن برہمن

دریا کی موجیں کشتی کو ڈھائیں
بادِ خزاں نے لوٹا نشیمن

گلچیں نے توڑے سب پھول و غنچے
خاک بسر ہے سارا ہی گلشن

گل رخ سارے خوں میں غلطاں
شعلے برسیں خرمن خرمن

رقص اجل ہے گھر گھر در در
آہ و فغاں اب آنگن آنگن

طوفانوں سے کہاں مفر ہے
چاروں طرف ہے قدغن قدغن

سر ہے بریدہ تن ہے دریدہ
تاراج ہے سارا راج سنگھاسن

رحمت یزداں کیوں ہے گریزاں
چشم ہے نم اور پھیلا دامن

باسمِ ربّی

منزل ہے تیرے سامنے سوچتا ہے اب تو کیا رفیق
پا کے حیات جاوداں محو تجلیات ہیں

ڈاکٹر رفیق خان

پروفیسر ڈاکٹر رفیق خان

لاہور، پاکستان

خاکِ پاکستان سے جنم لینے والے ذرے، جو بعد میں اپنی محنت اور جد و جہد سے ایسے ایسے گوہر آب دار بھی بنے ہیں کہ مملکتِ پاکستان نے ان پر ناز کیا ہے۔ ان ہی میں ایک ڈاکٹر رفیق بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جنہیں خوشامد کر کے جینے کا ڈھنگ نہیں آیا وہ ظاہری شہرت حاصل نہ کر سکے مگر ان کے تاریخی کارناموں نے، ادب ہو یا سائنس، ہر ایک میدان میں آنے والی نسلوں کی رہ نمائی کے لئے مشعلیں روشن کر دی ہیں۔

چک نمبر ۳۵ جنوبی، ضلع سرگودھا (پنجاب) میں یکم فروری ۱۹۳۸ء کو محمد رفیق خان پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزری، یہ واقعات بھی کم دلچسپ نہیں اور بیان خود ان کا کہ وہ بات کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں کیوں کہ انہوں نے ایک زندگی درس و تدریس کے میدان میں گزاری ہے۔ ہزارہا طالب علموں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔

۱۹۹۹ء کے اوائل میں ڈاکٹر رفیق خان اپنے بیٹا اور بیٹی کے پاس امریکہ تشریف لائے۔ خلق کی خدمت کرنے والے جناب حسن چشتی مقیم شکاگو نے (جنہیں ہم نے "خاموش خضر" کا خطاب دیا ہے) ہمیں ان سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر رفیق لاہور میں بھی رہتے ہیں اور امریکہ میں اپنے بچوں

کے پاس بھی۔

ڈاکٹر رفیق نے اپنے دو مجموعہ کلام '' دھنک کے سائے '' (مطبوعہ ۱۹۹۳ء) اور '' سوچوں میں کہرام '' (مطبوعہ ۱۹۹۹ء) عنایت کیئے تو ہم نے انہیں '' سخنور چہارم '' کا سوال نامہ بھجوا دیا۔

ان کی سوانح پڑھیے تو ایک اہم بات کی نشان دہی خاص طور پر ہوتی ہے کہ اگر ایک کندہ ناتراش طالب علم کو (جو کہ ہر طالب علم ہوتا ہے) ایسے ذہین استاد مل جائیں جو اپنی روزی حلال کر کے کھانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں، تو ان کے کندہ ناتراش طالب علم ہیرے ہی کی جوت کے مانند علم کی روشنی سے دمکتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیق خان کہتے ہیں ... '' میں جب گاؤں کے اسکول سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ہائی اسکول کی جماعت پنجم میں داخل ہوا تو میرے اسکول کے اساتذہ میری اندرونی صلاحیتوں سے بہت جلد روشناس ہوگئے۔ میرے ایک استادِ محترم نے مجھے دو تقاریر 'خطبۂ حجۃ الوداع' اور 'قرآن بطور ضابطۂ حیات' لکھ کر دیں جو اس قدر اہم تھیں کہ میں مارننگ اسمبلی (morning assembly) میں لگاتار چھ سال تک تقریر کرتا رہا۔ اس دوران مجھے علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفۂ اقبال سے اس حد تک متعارف کروایا گیا کہ یہ میرے خون میں رچ بس گئے۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے شعرا مثلاً میر تقی میر، اسد اللہ خان غالب، الطاف حسین حالی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، سیف الدین سیف، ابراہیم ذوق، اکبرالہ آبادی وغیرہ کی شاعری کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں بیت بازی کا بہت رواج تھا۔ مجھے اتنے اشعار یاد تھے کہ مقابلۂ بیت بازی میں ایک طرف تنہا میں اور دوسری طرف پوری کلاس بھی ہوتی تو پھر بھی جیت میری ہوتی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے دو غزلیں اُس وقت لکھیں جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ان میں سے ایک غزل بعد ازاں گورنمنٹ کالج سرگودھا کے سالانہ میگزین 'نوید صبح' میں شائع ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخلہ لیا۔ ادب کی طرف رجحان بالکل کم رہا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے یہ ڈر رہتا تھا کہ ادھر دیا گیا وقت کہیں میرے اصل مقصدِ حیات کو نقصان نہ پہنچائے۔ ایف ایس سی کے بعد انجینئر بننے کا خیال چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۹ء میں بی ایس سی کیا۔ چار سال کے دوران کبھی ٹیوٹوریل گروپ (tutorial group) میں غزل یا نظم سنانے کا موقع ملتا یا کبھی کبھار کالج کی مجلسِ ادب میں چلا جاتا۔ ایک دو دفعہ انگریزی میں تقریر کا موقع ملا تو لوگوں نے یہ ریمارک (remarks آرا) دیئے کہ بڑے کام کا فی البدیہہ مقرر ہے۔ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ میں نے کالج ہاسٹل میں لٹریری سوسائٹی کے تحت منعقد کردہ تقاریب میں ایک دو جامع اور مفصل مضامین انگریزی میں پیش کر کے خوب داد پائی۔

اسکے بعد گورنمنٹ کالج بہاول پور کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے پنجاب یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری میں ایم ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۶۱ء میں ایم ایس سی مکمل کر کے پی سی ایس آئی آر لیب (PCSIR Lab) میں بطور ٹیکنیکل اسسٹنٹ (Technical Assistant)

ملازمت شروع کی۔ ابھی پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے گورنمنٹ کالج منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں لیکچرر ان کیمسٹری (Lecturer in Chemistry) کی پیش کش ہوئی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہر ہفتے کسی نہ کسی ادبی محفل کا اہتمام ہوتا تھا اور نامور شعرا بشمول مجید امجد سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میں انگلش لٹریری سرکل کے اجلاس میں بھی باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا۔ وہاں سے میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج نواب شاہ (سندھ) میں ہوگیا۔ چھ ماہ کے قیام کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور آ گیا۔ یہاں بھی ادبی سرگرمیاں خوب خوب میسر آئیں۔ یہاں ظہور نظر کو سننے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ شاعر مجھے بہت پسند تھا۔ مجھے اہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا چنانچہ مجھے ایک سال کے بعد کالج اسٹاف یونین کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ تین چار سال وہاں گزارے۔ وہاں سے اچانک میرا تبادلہ گورنمنٹ بوائز کالج لیہ کر دیا گیا جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ بعدازاں سارے داغ دھل گئے کیوں کہ میری ایک نظم بعنوان ''احساس'' جو شاہکار مانی جاتی ہے، اور جسے لندن میں فیض احمد فیض صاحب کے ساتھ ایک شام میں مجھے سنانے کا شرف بھی حاصل ہے، لیہ کے ریتلے ٹیلوں پر بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔ صرف تین ماہ کے عرصے میں وہاں کے لوگوں نے مجھے جتنا پیار دیا، جن محبتوں سے نوازا، میں انہیں مرتے دم تک نہیں بھلا سکوں گا۔ مجھے کبھی کبھی اب یہ احساس مارڈالتا ہے کہ ان پس ماندہ علاقوں میں طالب علم اچھے اور قابل اساتذہ کے لئے کتنے ترستے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے نومبر میں میرے تبادلے کے احکامات گورنمنٹ کالج لاہور کے آگئے جو کہ میری زندگی کا سنگِ میل ثابت ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں چھ سال ایف ایس سی، بی ایس سی اور ایم ایس سی کی تدریس کے علاوہ تحقیق میں بھی دل چسپی لیتا رہا۔ میری کارکردگی کی بنا پر مجھے ۱۹۷۳ء میں سنٹرل اوورسیز ٹریننگ اسکالرشپ (Central Overseas Training Scholarship) پر برائے اعلیٰ تعلیم برطانیہ بھیج دیا گیا۔ وہاں میں نے بائیو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی آف اسٹرتھ کلائڈ، گلاسگو (University of Strathclyde, Glasgow) میں پی ایچ ڈی کے لئے کام شروع کیا۔ میری کارکردگی کی بنا پر مجھے گلاسگو پاکستانی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا لائف ممبر منتخب کیا گیا۔ وہاں یہ اعزاز اس سے پہلے کسی پاکستانی طالب علم کو حاصل نہیں ہوا۔ میں نے تین سال میں پی ایچ ڈی مکمل کرلیا۔ ۱۵/ اپریل ۱۹۷۶ء سے ۱۴/ اپریل ۱۹۷۸ء، یعنی دو سال کی مدت کے لئے مجھے پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلوشپ (Post-Doctorate Fellowship) کی پیش کش کی گئی۔ اس منصوبے کا مقصد اقتصادیات اور ٹیکنالوجی کے اشتراک سے ترقی پذیر ممالک میں غربت اور بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے موزوں ٹیکنالوجی کی تلاش تھا۔ اس کے لئے تقریباً ایک درجن صنعتوں کا تقابلی مطالعہ کرنا تھا۔ ضروری اور متعلقہ ڈاٹا (data) جمع کرنے کے لئے، اس کام کے دوران مجھے یو ایس اے، یو کے، برازیل، کولمبیا، میکسیکو، جاپان، ہانگ کانگ، پاکستان اور مغربی جرمنی کے دورے کرنے کا موقع ملا۔ جن لوگوں سے بات کرنے کا موقع ملا ان میں ٹیکنیکل لوگ شامل تھے۔ واپس جا کر رپورٹ تیار کی جو اسکاٹش اکیڈیمک

پریس ایڈنبرا (Scotish Ikrimik Press, Edinburgh) نے کتابی شکل میں شائع کی۔ سنا ہے کہ اب یہ بین الاقوامی مارکیٹ کی سیریز ٹو ویلو (Series Twelve) میں سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں سے ہے۔

فیلوشپ کا دورانیہ ملا کر برطانیہ میں میرا قیام پانچ سال دو ماہ بنتا ہے۔ اس دوران میں نے ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیا۔ تین مشاعرے گلاسگو میں منعقد ہوئے۔ پہلے میں جن معروف شعرا نے حصہ لیا ان میں حفیظ جالندھری مرحوم، احمد فراز، قتیل شفائی کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے مشاعرہ بسلسلہ صد سالہ تقریبات اقبال میں شمولیت کے لئے مجھے گلاسگو سے لندن بلایا گیا۔ میں نے اپنی نظم "عقیدت کے پھول" سنائی۔ بعد ازاں اسی سلسلے میں "انز آف کورٹس سوسائٹی لندن (Inns Courts Society, London) نے علیحدہ اپنی تقریب منعقد کی اور فیض احمد فیض کے ساتھ مجھے بطور مقرر دعوت دے کر گلاسگو سے بلایا۔ فیض صاحب اردو میں بولے اور میں نے انگریزی میں تقریر کی۔ فیض صاحب نے میری تقریر کی دل کھول کر تعریف کی، تاہم اتنا ضرور کہا کہ تقریر اردو میں ہونی چاہیے تھی کیوں کہ سامعین پاکستانی تھے۔ بہرحال میں انگریزی میں تقریر کر کے مطمئن تھا کہ وہاں مجھے ایسے چہرے بھی نظر آئے جن کا تعلق مغرب سے تھا اور وہ مجھے سن متاثر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جب ایک بار سحاب قزلباش سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ فیض صاحب کے ساتھ لندن میں ایک شام منائی جا رہی ہے۔ مجھے بھی آنے کی دعوت دی گئی۔ وہاں میں نے اپنی نظم "احساس" سنائی۔ فیض صاحب نے اس کی بہت تعریف کی۔ یہ نظم میرے مجموعۂ کلام 'دھنک کے سائے' میں شامل ہے۔

پاکستان واپس آ کر میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں مئی ۱۹۷۸ء کو بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر دوبارہ فرائض سنبھالے۔ ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ میری گلاسگو میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بابت جناب فضا الرحمٰن، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کو بتا دیا گیا۔ جس پر انہوں نے مجھے کالج اسٹوڈنٹس یونین کا وائس پیٹرن (Vice Patron نائب مربی) بنا دیا۔ یہ ذمہ داری اتنی اہم تھی کہ ایک دفعہ ہمارے بزرگ دوست ڈاکٹر رضی واسطی صاحب کہنے لگے ...'ڈاکٹر رفیق! کیا آپ جانتے ہیں کہ وائس پیٹر کالج کا ورچول (virtual فی الواقع) پرنسپل ہوتا ہے'؟ اس وقت تو ہم نے ان کی بات سُنی اَن سنی کر دی لیکن بعد ازاں مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا فرمان ٹھیک تھا۔ میں تمام نصابی سرگرمیوں کا منتظم تھا۔ پرنسپل صاحب مجھ سے روزانہ مشاورتی ملاقات کرتے تھے۔ کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جس کی طرف سے مجھے دعوت نہ دی گئی ہو۔ دعوت نامے زیادہ تر بطور جج یا صدر ہوا کرتے تھے۔

اس دوران میں نے چار بائیو کیمسٹری کی کتابیں تصنیف کیں جو اب مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی اہمیت کے حامل جریدوں میں تحقیقی مقالہ جات بھی شائع کیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جہاں غیر نصابی سرگرمیوں میں مجھے بلند ترین اعزاز حاصل رہا اس کے ساتھ ساتھ تدریسی سرگرمیوں میں بھی رہا۔ اس محنت کے بارے میں جو خاص بات ہے وہ یہ ہے

کہ کبھی قوم سے کسی ایوارڈ کی امید نہیں رکھی۔ البتہ اب بھی اعتماد ہے کہ سچی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔

دسمبر ۱۹۹۴ء میں مجھے گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت لاہور کے پوسٹ گریجویٹ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کا چیئر مین بنا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی بطور چیئر مین سوسائیٹیز بورڈ کے فرائض بھی سونپ دیئے گئے۔ وہاں چار سال اور کچھ ماہ کاٹنے کے بعد یکم فروری ۱۹۹۹ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گیا۔ گورنمنٹ کالج آف سائنس کے شعبہ کیمیا میں جو اہم کام انجام دیا وہ عملی کام کی تحقیق کی روایت کا قیام ہے اور ساتھ ہی میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں، مثلاً قرات، نعت خوانی، تقریری مقابلے، علمی مباحثے، ڈرامے وغیرہ، کا اجرا شامل ہے۔

میرے دو شعری مجموعوں کے علاوہ ایک سفر نامہ بعنوان 'کھول آنکھ زمیں دیکھ' شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ میں نے کتابوں کا ایک نیا سلسلہ بنام '' اِن سرچ آف اپروپریٹنیس (In Search of Appropriateness)'' شروع کیا ہے اور اس سلسلے کی پہلی جلد 'چوائس آف ٹیکنیک ان ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (Choice of Technique in Education & Research) شائع ہو چکی ہے۔ بہت کچھ مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔ 'دیدۂ بینا' میرا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں وہ نظمیں شامل ہیں جو امریکہ میں رہائش کے دوران مشاہدات و تجربات حاصل ہوئے۔ ان میں افغانستان، مشرقِ وسطیٰ، فلسطین اور کشمیر کے عنوانات پر لکھی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور امریکہ سے متعلق ایک سفر نامہ بھی زیرِ طبع ہے''۔

ڈاکٹر رفیق کہتے ہیں... '' میرے نزدیک نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے نے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہر کوئی شاعر بن گیا ہے۔ بسیار نویسی کی وجہ سے کتاب پر کتاب آنے لگی ہے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ کسی ناشر کے پاس شاعری کا مسودہ لے کر جائیں تو وہ اشاعت کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ بہانہ یہ ہوتا ہے کہ شاعری سوائے ان شعرا کے جنہیں میڈیا کے ذریعے شہرت حاصل ہو چکی ہے، عام آدمی پڑھتا ہی نہیں۔ لہٰذا لوگ اکثر اپنے خرچے پر کتاب چھپواتے ہیں یا کتابوں کی کچھ تعداد اپنے پلّے سے خریدتے ہیں۔ نثری نظم کے بجائے اگر اچھی نثر (انشائیے وغیرہ) لکھی جائے تو میرا نہیں خیال کہ اس میں کم دل کشی ہوگی۔ غزل چوں کہ بحر میں ہونا لازم ہے لہٰذا نثری غزل کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

مشاعروں کے سلسلے میں عرض کروں گا کہ مشاعرے اور تخلیقی نشستیں، دونوں ہی اردو ادب کے فروغ کے لئے ضروری ہیں بشرطیکہ دونوں میں غیر جانب داری سے کام لیا جائے۔ تنقیدی حلقوں میں جس طرح آج کل تنقید ہو رہی ہے اس میں گروہ بندی کا بہت زیادہ عمل دخل ہے جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

الیکٹرانک میڈیا یورپ اور امریکہ میں بمقابلہ ترقی پذیر ممالک کے کہیں زیادہ مضبوط و منظم ہے۔ لیکن پرنٹ میڈیا پڑھنے والوں کی کمی بھی نہیں۔ دونوں میڈیا اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ پھر بھی الیکٹرانک میڈیا اپنی بقا کے لئے پرنٹ میڈیا کا نہ صرف ممنون بلکہ اس پر انحصار کرتا ہے۔اس کے علاوہ

الیکٹرانک میڈیا کم از کم ترقی پذیر ممالک میں شعرا اور ادیبوں کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہے۔ یہ خاص گروہوں کی سرپرستی کرتا ہے اور ان کو ہر جگہ نمائندگی دیتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ترقی پذیر ممالک میں الیکٹرانک میڈیا نے 'قبضہ گروپوں (پریشر گروپس Pressure Groups)' کو جنم دیا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ بس الیکٹرانک میڈیا کے ارباب اختیار کو انصاف کرنے کا درس دینا چاہیے ورنہ بہت بڑے بڑے شاعر اور ادیب گم نامی کی زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہوتے رہیں گے اور اردو ادب کو نقصان پہنچتا رہے گا۔ میری اس بات سے جو بات نکلتی ہے (بالخصوص اردو ادب کے محافظوں اور سرپرستوں کے لئے) وہ یہ ہے کسی ادیب یا شاعر کا معروف ومشہور ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ شاعر یا ادیب بھی اتنا ہی بڑا ہے لہٰذا معیار بدلنے کی ضرورت ہے۔

Professor Dr. Rafiq Khan,
491-B,Canal View, Multan Road, Niazbaig Thokar, Lahore, Pakistan
(OR), Dr. Adnan Khan and Dr. Shamaila Khan, 4427 W. Metairie Ave.,
Metaire, Louisiana, 70001, USA

انتخابِ کلام

میں ہوں راہرو اُسی رات کا، وہ جو رات جس کی سحر نہ ہو
مری منزلیں ہیں وہ منزلیں، جہاں روشنی کا گزر نہ ہو

ہے یہ زندگی بڑی کشمکش، ہے کہیں یہ کوہ کہیں جبل
تری زندگی نہیں زندگی، کہ یہ کوہ کن سی اگر نہ ہو

ذرا من میں ڈوب کے دیکھ تو، کہ یہ من ہی اصلِ حیات ہے
اُسے زندگی کا ہو کیا پتا، جسے قدرِ سوزِ جگر نہ ہو

مرے دوست! مجھ سے خفا نہ ہو، ذرا دیکھ لے مجھے پیار سے
یہ جو چار دن کی ہے زندگی، کہیں رنجشوں میں بسر نہ ہو

تو غرور و جاہ و جلال ہے، سرِ راہ تھوڑا سنبھل کے چل
تری رہ گزر ہی بسا ہوا، کوئی حسرتوں کا نگر نہ ہو

جو ہو زندگی کی تجھے طلب، تو خودی میں خود کو تلاش کر
نہ وہ جی سکے نہ وہ مر سکے، جو رفیقؔ! اہلِ نظر نہ ہو

باسم ربی

بچے کی ضد پوری کرنا آخر کو مجبوری تھی
جس سے کھلونا مول لیا تھا دن بھر کی مزدوری تھی

سعید روشن

صفات، کویت

محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے، ۲۷/ جولائی ۱۹۹۷ء کے روزنامہ 'جنگ' کراچی میں اپنے مضمون میں لکھا ہے ... "ادب ایک ایسے سلیقے اور ایک ایسے شعور کا طالب ہے جس سے لکھنے والا اپنے پورے وجود اور توجہ کے ساتھ ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے یا زاویہ نظر پیش کیا ہے اگر وقت کے ساتھ وہ نا قابل عمل ہو جائے تو بھی وہ تحریر دلچسپی سے پڑھی جا سکے یا پھر اس میں اتنی تہیں ہوں کہ آنے والے زمانے میں اس سے معنی اور مفہوم کی نئی روشنی پھوٹنے لگے، جیسے میر امن کی باغ و بہار۔ برخلاف اس کے آج کی تخلیقی تحریریں پڑھیئے تو ان میں سے اکثر و بیشتر جلد جلد کاٹنے اور لے دوڑنے کا عمل نظر آئے گا"۔

کویت کے صحرا میں بسنے والے سعید روشن ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ گو آج کا دور بہت مصروف دور ہے، پہلی جیسی وہ فرصتیں میسر نہیں اور روزگار کے حصول کے لئے لوگ دنیا کے ان حصوں میں بھی آباد ہونے پر مجبور ہیں جہاں اردو ادب پڑھنے کی بات تو دور سونگھنے کو اور اس سے لذت آشنا ہونے کو بھی دستیاب نہیں۔ اس کے باوجود سعید روشن کو ادب کے مطالعے کا شوق بچپن سے رہا۔ سو انہوں نے دنیا کا بیشتر ادب جوں جوں موقع ملا پڑھ ڈالا۔ اس میں فارسی، عربی

(زمانۂ جہالت قدیم)، ہندی، روسی، انگریزی اور فرانسیسی ادب شامل ہے۔ ادب کے ہر صنفِ سخن کو پڑھتے ہیں چاہے نثر ہو یا نظم ہو یا تنقید و تحقیق۔ دو دہائی سے کویت میں مقیم ہیں اور عمر کا بیشتر حصہ ہجرت میں ہی کاٹا۔ کہتے ہیں۔

عمر تو ساری کٹی پردیس میں
گاؤں جانے کی اب ہے حسرت بہت

نام ان کا سعید گل خان وزیر زئی ہے اور تخلص روشن۔ ۲/دسمبر ۱۹۵۶ء کو بانس واڑہ، راجستھان، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پہلے ادیب کامل اور پھر ایم بی اے کیا۔ سیاحت، تجارت و انسانی حقوق میں ڈپلوما لیا۔ نیشنل جیوگرافک سوسائٹی امریکہ (National Geographic Society America) کے رکن ہیں۔

باجوڑ کے پٹھان وزیر، گل زئی قبیلے سے والد کا تعلق ہونے کی وجہ سے والد کی مادری زبان پشتو رہی۔ مگر ان کی والدہ ایک سید خاندان سے تھیں، جو مذہبی خیالات اور دینداری کے معاملات میں پیش پیش رہتی تھیں۔ ان کی مادری زبان اردو تھی۔ اسی بنا پر ان کی بہنیں، جو عمر میں ان سے بڑی تھیں، دینی اور ادبی رسائل پڑھتی تھیں۔

سعید روشن کہہ رہے تھے... ''میری ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی۔ اس دور کے رواج کے مطابق اسمٰعیل میرٹھی کی تحریر کردہ ابتدائی کتابیں پڑھ کر اردو سے آشنائی کے مراحل طے کیئے۔ بچپن میں مولانا حالؔی اور نظیرؔ اکبرآبادی کی نظمیں بھی حفظ کرائی جاتی تھیں۔ اس ماحول نے شاید مجھ میں شاعری کا ابتدائی شوق پیدا کیا۔ حمد، نعت، غزل، نظم، دوہے اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی۔ پھر اردو دنیا کے تمام ادبی اور معیاری رسائل میں کلام شائع ہوتا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ میری غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''نئے موسم کا پہلا دن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے''۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا... ''میں اردو زبان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ آج اردو برصغیر سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اور دنیا کی کئی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں اس کے شعبے قائم ہو چکے ہیں اور جہاں سے کئی طالب علم فارغ ہو کر اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کے فروغ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو کی مقبولیت اور اس کے روشن مستقبل کا پتا چلتا ہے۔ مگر ایک بات پھر بھی تشویش ناک ضرور ہے کہ ہم جو دیارِ غیر میں مقیم ہیں ہماری آنے والی نسل اردو زبان سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ اردو بولنے کی حد تک تو یہ نسل اردو بول لیتی ہے مگر اس کو لکھنے پڑھنے سے قاصر ہے۔ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ جہاں تک رسم الخط کا سوال ہے اس کو تبدیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آج ہندوستان میں فلم، ڈرامہ اور ٹی وی کوئی ہو، سب ہی اردو کا استقبال کرتے ہیں۔ اردو ہندی بولنے میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا سوائے رسم الخط کے۔ ان دونوں زبانوں میں ایک معمولی سا فرق ہے اور وہ ہے صرف رسم الخط کا۔ ایسے ماحول میں اردو کا

رسم الخط تبدیل کر دیا جائے تو اس کی پہچان ختم ہو جائے گی اور اردو زبان خود بخود ختم ہو جائے گی''۔

ان کا کہنا ہے ...'' میرے نزدیک اردو ادب میں غزل ہی اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ دو (۲) مصرعوں میں مکمل اور پُر تاثر بات کہہ دی جاتی ہے اور ردیف قافیئے سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے وہ نظم میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل آج بھی سب سے زیادہ ممتاز صنف سخن ہے۔ رہا نثری نظم کا سوال تو یہ اردو میں ابھی اپنی جگہ نہیں بنا پائی ہے۔ جہاں تک اظہار کا سوال ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے کتنے اچھے طریقے سے اور کس انداز سے اپنی بات میں تاثر پیدا کیا ہے۔

میری رائے میں ادب میں تجربات ہوتے رہتے ہیں اور تجربات کرنے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ یہ وقت ہی بتائے گا کہ نثری نظم کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ میرے پسندیدہ شعرا میں غالبؔ، میرؔ، داغؔ، مومنؔ اور اقبالؔ ہیں اور ان سے میں متاثر بھی ہوں اور ان کا کلام بار بار پڑھتا ہوں''۔

سعید روشن بہت پختہ گو شاعر ہیں اور حساس فن کار بھی۔ ان کی گہری فکر ان کے اشعار میں واضح ہے۔ میں ان کے ان اشعار پر آپ کی توجہ چاہوں گی:

سمندروں کی گود میں پلے ہوئے ہیں ہم مگر
کھڑے ہوئے ہیں تشنہ کام موج آب بیچ کر
وہ اپنی خوشبوؤں کا کس طرح بھلا حساب دیں
جو پتھروں کے دیس میں جئے گلاب بیچ کر
لہو لہو سی ہو گئیں سُروں کی سب لطافتیں
خریدنے چلے ہیں تیغ ہم رباب بیچ کر

سعید کہتے ہیں ...'' میں ادب کے کسی گروپ یا نظریئے سے وابستگی پسند نہیں کرتا۔ میں صرف یہ مانتا ہوں کہ اگر شعر میں تاثیر ہے تو خود بخود قاری کی توجہ کا مرکز بن جائے گا ورنہ صفحے سیاہ کرتے جایئے کسی کو کیا پڑی ہے کہ یاد رکھے۔ میرا مقصد، میری منزل زبان و ادب کی خدمت ہے۔ باقی نام رہے اللہ کا''۔

Mr. Saeed Roshan,

P. O. Box 21538, Safat, 13076, Kuwait (AG)

انتخابِ کلام

درمیاں اک دوسرے کے رابطہ رہنے دیا
جسم میں ہم نے لہو کا ذائقہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

ذہن و دل کی بستیوں میں برملا رہنے دیا
جو محبت کا وہاں پر راستہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

یاد وابستہ رکھی میں نے سفر کی اس طرح
پاؤں میں رستا ہوا اک آبلہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

میں محبت سے ملا ہوں ہر کسی سے دوستو
ملنے والے نے ہمیشہ فاصلہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

خود ہی طے کرتا رہا عرفان کی سب منزلیں
لن ترانی چھوڑ دی اور سلسلہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

اک پرندہ دے گیا ہے عزم مجھ کو اس طرح
اُڑ گیا تنہا سفر پہ قافلہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

لوگ پتھر مارتے ہیں جو عقیدت سے بھرے
اس نگر میں ہم نے روشن آئینہ رہنے دیا

⧗ • ⧗

ذرا ہری شاخ پہ چڑیا کو بٹھا کر دیکھو
خود ہی کھل جائے گا ہم میں ہیں درد سے کتنے

زرین یٰسین
۱۲ جنوری سنہ ۲۰۰۷ء

زرین یٰسین

نیو جرسی، امریکہ

زرین یٰسین کو میں نے پہلی بار نیو جرسی کی ایک شعری محفل میں دیکھا۔ وہ بڑی دل جمعی اور بڑے اعتماد سے نظامت کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ شعری محفلوں کی نظامت عموماً مرد اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ مشاعرہ بگڑے تو سینہ پھلا کر وہ سارا الزام "جاہل سامعین" کے سر رکھ دیں گے اور جو مشاعرہ کامیاب ہو جائے تو ان کی پو بارہ۔ مگر خواتین یہ سہرا اپنے سر خود نہیں لیتیں۔ میں نے خود کئی شعری نشستوں کی نظامت کی ہے اور خاصے ہوم ورک (homework) کے ساتھ۔ میری پہلی نظامت کراچی کے "چاندنی کا مشاعرہ" کے لئے تھی جو سید صابر علی جعفری (شاعر بدر جعفری) نے غالباً ۱۹۶۶ء میں منعقد کیا تھا اور خصوصی اہتمام یہ تھا کہ نہ صرف شعرا و شاعرات بلکہ سامعین سے بھی سفید لباس زیب تن کرنے کی گزارش کی گئی تھی، یہاں تک کہ تاروں پر سفید کاغذ لپٹا ہوا تھا اور چاندنی کی رعایت سے مشروب سفید اور اشعار روپہلے تھے۔ اُس دور کی میں پہلی ناظم خاتون تھی اور یہ جدّت بدر جعفری ہی کر سکتے تھے۔ لہٰذا زرین کی نظامت کو دیکھ کر مجھے فخر کا احساس ہوا کہ ایک جرأت مند خاتون اس شہر میں بھی موجود ہیں جو ضابطے کے ساتھ نظامت کرتی ہیں ورنہ نظامت کے فن کے بغیر تو کوئی بھی "ناظم" بن سکتا ہے کہ جاتا کیا ہے پلّے سے آخر!

زرین سے میری دوسری ملاقات ان کی کتاب "میرے خواب" سے ہوئی۔ اس سے قبل میں

انہیں "سخنور سوم" کے لئے سوال نامہ دے چکی تھی۔ زرین شاعرانہ تساہل کا شکار رہیں، جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ پھر نیویارک کے مشہور مزاح نگار، خالد عرفان اور نیویارک کے شاعر اور مشہور کالم نگار، مسرور جاوید نے "سخنور سوم" کی تعارفی تقریب کے لئے مجھے نیویارک بلایا تب میں نے دوبارہ "سخنور چہارم" کے لئے انہیں سوال نامہ دیا۔ سخنور چہارم بھی مکمل ہوگئی۔ پھر میری ملاقات "جشن حمایت علی شاعر" کے موقعہ پر ہیوسٹن، ٹیکساس میں ہوئی۔ یہ جشن جاوید زیدی کی جانب سے تھا جنہوں نے اُسی دن حمایت صاحب کے ہاتھوں "اردو بینک" کا افتتاح بھی کرایا تھا اور زرین یٰسین سے خصوصی گزارش کی گئی کہ وہ ہمارے شعرا و شاعرات کے کلام کا ترجمہ انگریزی میں کر کے اسے "اردو بینک" میں جمع کرائیں تا کہ ہماری نئی نسل کے وہ بچے جو اردو نہیں جانتے اس سے فیض یاب ہوں۔ زرین ترجمہ کی ماہر ہیں۔ گفتگو بھی میٹھی کرتی ہیں۔ مجھے سلطانہ آپا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ جشن اور مشاعرے کے بعد ہم سب عشرت آفرین کے گھر نہاری کھانے پہنچے۔ عشرت اور ان کی امی غضب کی مہمان نواز ہیں۔ فوراً دونوں انتظام میں جُت گئیں اور گرم گرم روٹیاں نہاری کے ساتھ آئیں تو حمایت صاحب، جاوید زیدی، زرین اور میں مشاعرے کی جگاری کی تھکن بھول گئے۔ چائے کے دوران میں نے سخنور پنجم کا، کہ میں ہمیشہ اپنے لکھنے پڑھنے کے سارے ہتھیاروں سے لیس رہتی ہوں، سوال نامہ زرین اور عشرت کو تھماتے ہوئے ایک تگڑی سی ایسی ڈانٹ بھی پلائی کہ دونوں نے چائے کے گھونٹوں کے ساتھ اسے بھی اپنے اندر اُتار لی۔ اور پھر کمال ہی ہوا کہ سخنور پنجم کے لئے زرین کا تعارف بھی ہوگیا اور عشرت کا بھی۔ دونوں ہی میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ تو آیئے زرین یٰسین سے ملتے ہیں کہ حروف ابجد کے حساب سے بھی "ز" بعد میں آتا ہے اور آفرین یعنی عشرت آفرین سے تو آپ اسی کتاب میں مل چکے ہیں۔ دونوں ہی غضب کی شاعرہ ہیں۔ اور اس وقت ہماری ہم نشین زرین ہیں لہٰذا ان کی غزل سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک دیا کب تک جلے گا رات کی تردید میں ۔۔۔ ہم برابر جی رہے ہیں صبح کی امید میں

بات بھی کرنی ہے اب تو آپ کی تائید میں ۔۔۔ اک رفاقت کے عوض رکھا رہن گویائی کو

اور وفاؤں کا چلن ہم کو رہا تاکید میں ۔۔۔ وہ تو اک حرف محبت سے رہا نا آشنا

شہر دل میں آس کی چوکھٹ پہ کوئی منتظر

رات بھر سویا نہیں ہے آرزوئے دید میں

زرین کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں..." اس دور میں جب کہ نام نہاد 'جدید شاعری' ناموزوں مصرعوں تک جا پہنچی ہے زرین یٰسین کا کلام جھلساتی گرمی میں بادنسیم کے ایک فرحت بخش جھونکے کی طرح مشام جاں کو معطر کرتا ہے"۔

بلاشبہ زرین کی شاعری کا مطالعہ کریں تو افتخار عارف کی کہی یہ بات یاد آتی ہے ..."شاعر اور ادیب اقوام کے درمیان ایک ایسے پُل کا کام کرتے ہیں جس کے ذریعے فاصلے قربتوں میں اور نفرتیں محبتوں میں بدل سکتی ہیں۔ زرین یٰسین کی شاعری اس اعلیٰ نصب العین کی ترویج کے لئے اہم کردار ادا کر رہی ہے"۔

اب میں آپ کو اس زرین سے ملاؤں جو شاعرہ زرین کے دامن میں چھپی بیٹھی ہے۔ زرین ان کا

نام اور تخلص ہے اور یٰسین ان کے مجازی خدا کا نام ہے۔ یکم فروری ۱۹۶۰ کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ان کا تعلق یوپی کے ایک معزز زبیری خاندان سے ہے۔ ان کے دادا مرحوم کا گھرانہ علم وادب کا گہوارہ تھا۔ زرین کے تایا، تاج میرٹھی کے نام سے لکھا کرتے تھے اور پھوپیاں حیا میرٹھی اور حور میرٹھی بھی اُس زمانے کی ادبی دنیا میں معروف تھیں۔ خواتین کا پہلا رسالہ "خاتونِ مشرق" انہوں نے ہی شروع کیا تھا۔

زرین کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ شروع شروع میں بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھا کرتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ غزل کہنا شروع کی۔ کالج میں آنے کے بعد سی بی کالج واہ کینٹ کی نمائندگی کی۔ بہت سارے انٹر کالجیٹ (inter-collegiate بین الکلیاتی) مشاعروں، مباحثوں اور مذاکرات میں انہوں نے ٹرافیاں اور انعامات حاصل کیئے۔ ریڈیو پاکستان کے "جواں سال" اور "کالج میگزین" پروگراموں میں اناؤنسمنٹ (announcement نشر کاری) کے فرائض بھی انجام دیئے۔ دورانِ تعلیم ہی ان کی شادی یٰسین زبیری صاحب کے ساتھ ہوگئی۔ تاہم شادی کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور جب یٰسین صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں بیرونِ ملک جانا پڑا تو یہ بھی ان کے ساتھ پہلے یورپ اور پھر مستقلاً امریکہ آ بسیں۔ زرین نیویارک کے ادبی حلقوں سے تعارف کے بعد باقاعدگی سے شمالی امریکہ کے مشاعروں اور نشستوں میں شرکت کرتی رہیں۔ یٰسین زبیری شمالی امریکہ کی ایک بڑی ادبی تنظیم "حلقۂ فن وادب" کے جنرل سکریٹری رہے اور ان کے ساتھ زرین "حلقۂ فن وادب" کی بحیثیت آرگنائزنگ سکریٹری منسلک رہیں۔

زرین نے کچھ عرصے پاکستان میں پی اے ایف کالج میں پڑھایا اور امریکہ آنے کے بعد نیویارک کے سی پی لنگویج انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی اور اردو پڑھائی۔ ترجمہ کا کام بھی کیا۔ "حلقۂ فن وادب" اور شمالی امریکہ میں ہونے والے تمام بین الاقوامی مشاعروں کی مسلسل نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ انہوں نے چند کتابوں پر مقالے بھی لکھے ہیں۔ ان میں زاہدہ حنا کی "قیدی سانس لیتا ہے" اور ڈاکٹر صبیحہ صبا کی کتاب "چشم ستارہ شمار" قابل ذکر ہیں۔ ایک اور مقالہ فن وشخصیت کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی شاعری پر، بعنوان "احمد ندیم قاسمی ...جدید دور کا شاعر" لکھا۔ اس کے علاوہ ایک مقالہ "اردو شاعری کے سات سو سال" رٹ گر یونیورسٹی (Rutger University) نیوجرسی کے طلبہ کے لئے لکھا اور اس عنوان پر ان کو ایک لیکچر بھی دیا۔

زرین کہہ رہی تھیں ..."ہمارے پاس اردو شاعری کا اس قدر وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم کسی مکتبۂ فکر سے متاثر نہیں ہیں تو یہ بجا نہیں ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاعری میں روایت ہماری بنیاد ہے۔ اور اس بنیاد کے بغیر ہم جو بھی عمارت تعمیر کریں گے وہ کھوکھلی اور کمزور ہوگی۔ میں روایتی شاعری میں میر اور غالب سے متاثر ہوں۔ بلکہ میں اگر یہ کہوں تو زیادہ درست ہوگا کہ غالب تو ہر دور کا شاعر ہے۔ جدید شعرا فیض احمد فیض اور احمد فراز میرے لئے مشعل راہ ہیں۔ فیض کی شاعری میں جو امیجری (imagery تصورات) ہمیں ملتی ہے وہ اردو ادب میں اور کہیں نہیں ہے۔ تو پھر شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ میں کسی ایک مکتبۂ فکر سے متاثر نہیں ہوں اور اچھے شاعر کی شاعری کو پڑھنے کے حق میں ہوں خواہ وہ روایتی ہو یا جدید"۔

شاعری کے علاوہ انہیں کلاسیکی ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات کے موضوعات، بالخصوص ہیومن سائیکی (human psyche) پر کتب کا مطالعہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ رنگ اور کائنات میں موجود خوب صورت اشیا اور ان کے زاویئے ان کو خاصا متاثر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اچھی مصورہ بھی ہیں۔ یہ اپنے فارغ اوقات میں مصوری کے مختلف نمونوں کا بغور مطالعہ کرتی ہیں۔ شاعری کے سلسلے میں زرین کہتی ہیں... "میں علامتی شاعری کے خلاف نہیں ہوں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر علامتی شاعری ابہام کی صورت اختیار کر لے تو بے معنی ہو جاتی ہے۔ مزاحمتی شاعری وقت کی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور اگر معاشرے پر مثبت اثر ڈالتی ہے تو یہی شاعری موثر بھی ہو سکتی ہے"۔

زرین کا کلام فنون، افکار، تخلیق، دنیائے ادب اور ماہنامہ شاعر ممبئی میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام اشاعتی مراحل میں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے معروف شعرا و شاعرات کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے جو ایک ضخیم دستاویز کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہے۔ اور اس کو جلد ہی شائع کرانے کا ارادہ بھی ہے۔

زرین ایک حساس خاتون ہیں اور اسی لئے اتنے اچھے شعر کہتی ہیں۔ زندگی کے واقعات نے انہیں ایک حساس شاعرہ بنانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ زرین کی زبانی ہی سنیئے... "محلے کے ہم تمام بچے ہمیشہ مل کر کھیلا کرتے تھے۔ ایک بہت ہی شرارتی سا بچہ اکثر نجانے کیسے چڑیوں کو پکڑ لیا کرتا اور پھر میری بہت منت سماجت کے بعد چھوڑ دیتا۔ ایک مرتبہ جب ہم باہر کھیل رہے تھے تو اس نے سب کو پاس بلا کر کہا کہ دیکھو اس کے پاس کس قدر خوب صورت چڑیا ہے۔ نیلے رنگ کی ایک ننھی سی چڑیا اس نے اپنے ہیٹ (hat) میں قید کر رکھی تھی۔ حسب معمول میں نے اس کی منت سماجت شروع کی کہ وہ اُسے آزاد کر دے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ میں اُس کی امی کے پاس شکایت کرنے گئی۔ جب انہوں نے بھی اُسے ڈانٹ پلائی تو اچانک اس نے غصے میں ہیٹ کو زمین پر رکھا اور خوب زور زور سے ہیٹ پر کودنے لگا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں بے تحاشہ چیخ رہی تھی اور رو رہی تھی اور وہ کودے چلا جا رہا تھا۔ وہ ننھی سی چڑیا بری طرح کچلی گئی۔ ہم سب بچوں نے مل کر اسے مٹی میں دفن کر دیا اور میں گھر آ کر بھی بہت دیر تک روتی رہی۔ اور پھر میرا معمول ہو گیا کہ اگر میں کسی کے گھر بھی کوئی چڑیا یا پرندہ پنجرے میں قید دیکھتی تو موقع ملتے ہی پنجرہ کھول کر اُسے اُڑا دیتی اور بعد میں بڑوں سے ڈانٹ کھاتی۔

دوسرا واقعہ اس وقت کا ہے جب میں ایف اے فرسٹ ائر میں زیر تعلیم تھی۔ کوئنز میری کالج، لاہور کے ایک مشاعرے میں مدعو تھی۔ جب ہم طالبات ہال میں پہنچیں تو دیکھا کہ سامنے کی نشستوں میں سے ایک پر فیض احمد فیض صاحب تشریف فرما تھے۔ میں تیزی سے بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی اور اپنے کلف لگے سفید یونیفارم کی پرواہ کیئے بغیر اُن کے سامنے زمین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا نام زرین ہے اور مجھے آپ کی شاعری سے عشق ہے۔ انہوں نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے مسکرائے۔ میں نے فیض صاحب کی شاعری پر ایک نظم تحریر کی تھی۔ میں نے وہی نظم ان سے اجازت لے کر سنائی۔ وہ میری اس معصوم حرکت پر مسکراتے رہے۔ میں نے اپنی چھوٹی سی ڈائری میں فیض صاحب کی بے شمار نظمیں

اور غزلیں نقل کر رکھی تھیں۔ دو جگہ ان سے آٹوگراف بھی لیئے جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ فیض صاحب سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی جو میری زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے"۔

اب زرین سے میں نے اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں پوچھا۔ زرین نے کہا "اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں پروان چڑھی اور اب یہ وہاں کی مٹی میں رچ بس گئی ہے۔ کمپیوٹر اور الکٹرانک میڈیا کی ترقی نے اردو کو دنیا کے ہر کونے میں متعارف کروا دیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اردو ہمارے خمیر میں کچھ اس طرح رچ بس چکی ہے کہ ہم اس سے الگ نہیں رہ سکتے۔ جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کا تعلق ہے اردو زبان ظاہر ہے ترقی پزیر ہے۔ برصغیر سے باہر کے ممالک میں مثلاً اردو زبان یورپ اور امریکہ کی زمینوں کا نہ تو حصہ ہے اور نہ ہی ان کے کلچر کا۔ چنانچہ ہماری جو نسل ان ممالک میں پل بڑھ رہی ہے اگر ہم ان کو اردو زبان سے صحیح طور پر متعارف نہیں کرائیں گے تو یہ یہاں ہماری نسل کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ میں مجموعی طور سے اردو کے مستقبل سے نا امید نہیں ہوں"۔

اگلے سوال کے جواب میں زرین نے کہا... "میں سمجھتی ہوں کہ غزل تو خود بخود ہوتی ہے اور الہام کی طرح اترتی ہے۔ غالب نے بالکل صحیح کہا تھا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اظہار خیال کے لئے میں غزل کو بہتر سمجھتی ہوں۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کہ غزل کی خوب صورتی ہی مجھ سے غزل کہلواتی ہے۔ دوسری اصناف میں بھی میں نے تجربہ کیا ہے۔ آزاد نظم بھی کہتی ہوں۔

نثری نظم ایک نیا تجربہ تھا جس کو وقت شاید رد کر دے۔ نثری نظم کا تجربہ تمام معروف شاعرات نے کیا ہے جن میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن تجربہ سب کا کامیاب نہیں رہا۔

نثری غزل کوئی صنف ہی نہیں۔ بلکہ میرے نزدیک یہ غزل کا مذاق ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو زبان اور پھر اردو شاعری کا اپنا ایک منفرد حسن ہے، اپنا ایک خاص رویہ اور تہذیب ہے۔ اردو زبان کے بہت سے الفاظ ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ہماری تہذیب کا خاص رچاؤ ہے جو ہماری ہی زبان کا خاصہ ہے۔ ہر زبان اپنے کلچر کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس خیال کی روشنی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ مغربی ادب کی نقالی کی جائے۔ اردو شاعری نے حقیقتاً مغرب سے ٹیکنیک ضرور لی ہے لیکن ہمارے مسائل، ہمارا احساس و شعور قطعی مختلف ہے۔ اور اگر کچھ لوگ ایسا کر رہے ہیں تو ان کا فن پارہ اردو ادب کا حصہ نہیں بن سکتا۔ وہ محض ترجمہ ہے جو کسی اور زبان سے اردو میں کیا گیا ہے۔ ہمارا احساس، ہمارے سوچنے کا انداز، ہماری گلیاں، گاؤں، کھیت، نہریں، گیت اور موسم سب کے سب مغرب سے مختلف ہیں تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ مغرب کے رجحانات ہماری زبان کا حصہ بن سکیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغرب میں گزشتہ پچاس سالوں میں شعری حوالے سے کوئی ایسا قابل ذکر ادب پیدا بھی نہیں ہوا۔ میں انگریزی ادب کی طالبہ ہونے کی حیثیت سے مختلف کتب کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں اور پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ انگریزی شاعری بری طرح ابہام کا شکار ہے"۔

زرین مشاعروں کی حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے..." مشاعروں نے اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشاعروں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم بہت سے مختلف مکتبہ فکر کے شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیتے ہیں اور بہت سے نئے لکھنے والوں کا سینئیر شعرا کے علاوہ عوام سے تعارف ہوجاتا ہے۔ لیکن کسی شاعر کو پرکھنے کے لئے یا صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مشاعرہ کوئی کسوٹی نہیں کیونکہ اچھے سے اچھا شاعر وہاں بے داد ہوسکتا ہے۔ تاہم مشاعرے ہماری تہذیب کا ایک اہم حصہ ضرور ہیں۔ کسی شاعر کی نشو و نما میں ادبی تنقیدی نشستیں بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں کیونکہ ادبی نشستوں میں عام طور سے وہی شریک ہوتے ہیں جو گہرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ وہاں شعر کو سننے اور سمجھنے کے مواقع زیادہ ملتے ہیں، نئے رجحانات سے شاعر کا تعارف ہوتا ہے۔یوں ادبی نشستیں ادب کی تخلیق میں اپنا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

لیکن جہاں تک کتابوں سے عوام کی دلچسپی کا تعلق ہے، مطالعہ کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے۔البتہ کمپیوٹر نے بڑی خوب صورتی سے کتابوں کو محفوظ کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ مستقبل کے لئے ایک اچھا قدم ہے۔ جس طرح مغرب میں کتابوں کے مطالعے پر زور دیا جارہا ہے اور ہر بچے کے لئے گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران پانچ چھ کتابیں پڑھنا لازمی قرار دیا جاتا ہے یہی رواج ہمارے آبائی ملک میں بھی ہونا چاہیئے اور بچوں کو ٹی وی کے سحر سے ہٹا کر کتاب پڑھنے کے لطف سے روشناس کرانا چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ دوستوں کو قیمتی تحائف دینے کے بجائے کتابوں کے تحفے دیں تو شاید اس طرح عوام میں کتاب پڑھنے کا رواج دوبارہ جنم لینے لگے۔

Mrs. Zarreen Yasin,
241 Jeff Street, Metuchen, NJ 08840, USA

انتخابِ کلام

خاک ہوجائیں کہ جینا چاہیے — زندگی تجھ کو تماشہ چاہیے

اجنبی لوگوں کی کالی بھیڑ میں — اک سخن آثار چہرہ چاہیے

ذہن کی وہ سوچ کیا سمجھے بھلا — اس کو تو بس ایک گڑیا چاہیے

دوستو عرضِ ہنر دشوار ہے — بات کرنے کا سلیقہ چاہیے

خواب کے قیدی ہیں چلنے کے لیے — گہرے جنگل میں تو رستہ چاہیے

دل کو بھی اب تو دھڑکنے کے لیے — ہر گھڑی اک زخم تازہ چاہیے

ہم فقط اک کھیل کے کردار ہیں — پردہ اُٹھنے کا اشارہ چاہیے

جس میں ظالم بھوک ہو نہ پیاس ہو — ہم کو زرّیںؔ ایسی دُنیا چاہیے

بہر نام ہما کا نہ سلطان سمجھ دلوں پر حکومت چلائے ہوئے ہیں
سلطان الحسن فاروقی ۲۹۔۲۰۰۰ء

سلطان الحسن فاروقی

لندن، برطانیہ

محترم شاعر سلطان الحسن فاروقی اپنی ذات میں انجمن ہیں اور ایسی انجمن کہ برسوں اس بزم کی رنگینی، شائستگی اور پاکیزگی آپ کے دل کو، آپ کی فکر کو اور آپ کے احساسات کو گرماتی رہے گی۔ وہ دوستوں کے شیدائی ہیں، انسان کے قدر دان اور اردو کے پرستار ہیں۔ ان کے یہ اشعار میں کبھی نہیں بھولتی۔

کیا ہے غسل جس نے کوثر و تسنیم سے سلطان وہ پاکیزہ و شائستہ ہے اردو زباں میری

اور

آدمی کی قدر کیجئے یہ خدا کا شاہکار ہے

فیاض عادل فاروقی کہتے ہیں کہ سلطان الحسن فاروقی سعدیؒ مغرب ہے اور ایک صاحب ایمان شاعر بھی۔ وہ مزید کہتے ہیں ... ''شعرا کے متعلق عام اہل دین حضرات کا خیال ہے کہ یہ ایک بے دین اور مے خوار قسم کی مخلوق ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اس وقت ان حضرات کا دھیان حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، ملا عبدالرحمن جامیؒ، شیخ سعدیؒ، میاں محمد بخش عارف کھڑی شریف، سلطان العارفین باہو جھنگوی، شاہ حسین وارثؒ، شاہ لطیف بھٹائی، مولوی عبدالستارؒ اور علامہ اقبالؒ کی طرف کیوں نہیں جاتا جنہوں نے شاعری کے پیرائے میں خدمت اسلام کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ بعض افراد شعرا کی تنقیص کے لئے

قرآن مجید کی سورۃ الشعرآء میں استدلال کرتے ہوئے چند آیات پیش کرتے ہیں۔ قرآن اقدس اور دین کے دیگر علوم سے عدم واقفیت کی بنا پر شعرا اور ادبا اس نصِ قطعی کے حوالے کے بعد خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورۃ الشعرآء کی آخری تمام آیات یعنی ۲۲۴ تا ۲۲۷، انتہائے سورۃ تک مکمل طور پر تلاوت کی جائیں تو مبحث مکمل کر سامنے آجاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ منشائے خداوندی میں تمام شعرا راندۂ درگاہ نہیں بلکہ اس کلیہ کی مستثنیات بھی ہیں جن پر ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے غور و خوض نہایت ضروری ہے۔ اس لئے سب سے پہلے آیاتِ مبارکہ کا متن سماعت فرمائیے:

بعدِ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم فرمان باریٔ الصمد ہے:

والشعراءُ یتبعهمُ الغاوٗن○ الم تر انهم فی کلِ وادٍ یهیمون○ و انّهم یقولون مالا یفعلون○ الاالذین امنو و عملو الصلحٰتِ و ذکرہ الله کثیر○ او انتصرو امن بعد ماظُلِموا ایَّ مُنقلَبٍ ینقلِبونَ○

خداوندِ قدوس کے اس قول کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اور رہے شاعر، تو ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، کیا آپ نہیں دیکھتے کی یہ (خیال کی) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور یہ لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود کر کے نہیں دکھاتے، ہاں سوائے ان لوگوں (یعنی ایسے شاعروں) کے جو ایمان لے آئے اور اچھے عمل بھی کیئے اور کثرت سے اللہ کو یاد کیا (یعنی اپنے کلام میں) اور پھر کامیابی بھی حاصل کی (یعنی فتح یا ہجو کے ذریعے) اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد، البتہ جن لوگوں نے ظلم و زیادتی کی وہ عنقریب جان لیں گے کہ اُن کا انقلاب (تبدیلی اور انجام) کیسی جگہ کی طرف ہوا''۔

صاحبان! دیکھیئے یہاں قرآنِ عزیز نے ظلم اور انقلاب کا ذکر کیا ہے جو آج کے عظیم شعرا کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ہاں قرآنی اندازِ گفتگو (فحوائے کلام) سے انقلاب کے منفی پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ تبدیلی یا انقلاب اچھے نتائج کے علاوہ برے نتائج کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ مترشح ہو گیا کہ شاعر برے بھی ہیں اور اچھے بھی۔ اور یہی حال شاعری کا بھی ہے۔ شاعری بری اور بد نتائج بھی ہوتی ہے اور اچھی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے فقہ میں اچھی شاعری مستحسن اور بری شاعری مقبوح تسلیم کی گئی ہے اور یہی فطری دین کا تقاضا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا میرے متقی اور دیندار بھائیو! جملہ شعرا کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکیئے۔ ان میں سلطان الحسن فاروقی جیسے صاحب ایمان و عمل، اللہ کو یاد رکھنے والے اور ظلم کا مقابلہ کرنے والے بھلے مانس بھی ہیں۔ سلطان صاحب کو اپنی شاعری کے پند و نصائح کی بنا پر بلادِ مغرب کا شیخ سعدی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

ان کے جس شعر کو میں حاصل کلام سمجھتا ہوں اور ایمانی شاعری کے محاکات میں سے مانتا ہوں وہ یہ شعر ہے۔

آخرت کے کاروان کی کائنات صرف دھول ہے

بعد میں وقوع پزیر ہونے والے جہانِ آخرۃ کو موخر کے بجائے متقدم دیکھنا اور کائناتِ دنیا کو اس

کاروان کی گرد کے طور پر مختصر رکھنا ایک صاحب ایمان اور صاحب نظر شاعر کا مقام ہے۔ اقبالؔ جیسے مرد مومن کے کلام میں جہاں عاقبت کی منظر کشی 'منزل ما' کے طور پر ہے لیکن اسے ایک 'وادیٔ خاموش' کے طور پر دیکھا گیا ہے، جب کہ یہاں سلطان اسے ایک رواں قافلے کی صورت میں دیکھ کر تمام عالم موجود کو کس بے وقعتی سے گرد راہ سے بھی زیادہ حیثیت کا حامل سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ شاید اسی قسم کے مشاہدے اور وژن (vision وسعت نظر) کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے... الشعراء تلامیذ الرحمٰن

اب ہم آپ کو اُس سلطان الحسن فاروقی سے ملواتے ہیں جو شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی، تنقید بھی لکھتے ہیں اور مصور و اداکار بھی ہیں۔

یہ محترم شاعر ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۲ء میں ریاست گوالیار کے علاقہ اجین میں پیدا ہوئے۔ راجپوتانہ بورڈ ریاست بھوپال سے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے دوران کراچی آ کر آباد ہو گئے۔ اسلامیہ کالج کراچی سے جغرافیہ اور پولیٹیکل سائنس سے گریجویشن کیا۔ کالج کے بزم ادب کے سیکریٹری بھی رہے۔ پہلے اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کی۔ پھر امریکن ایمبیسی میں بطور آرٹسٹ رکھے گئے۔ مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں (Advertising Agencies) کے لئے بھی کام کیا۔ دورانِ تعلیم افسانے لکھے جو "ساقی" اور "نقوش" میں شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری، جوشؔ اور ابوالخیر کشفی کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ لہٰذا ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب برطانیہ آ کر آباد ہوئے تو شاعری میں سخن آزمائی کے بعد "چھوٹی بحر کے سلطان" کہلائے۔ یہاں پر انہوں نے سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹس سے پینٹنگ اور گرافک ڈیزائن کی سند حاصل کی۔ اسی دوران مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں کام کرتے کرتے ایک دن آرٹ ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اب کونسل اور دینی اداروں کے علاوہ کتابوں کے سرورق ڈیزائن کرتے ہیں۔ یوں بچپن کا شوق ان کا ذریعہ معاش بن گیا۔

۱۹۷۸ء میں "انجمن اردو" کی بنیاد رکھی جس کے تحت ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کرواتے تھے۔ اسی دوران "ایشین سینٹر (Asian Centre)" کے سکریٹری بھی رہے۔ لندن میں آغا شمس الدین کے مشہور ڈرامے میں، "مرزا غالب لندن میں"، مرزا غالب کا کردار ادا کیا۔

نئی صدی ہجری کے شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر کلیم صدیقی مرحوم کی ایما پر ڈاک ٹکٹ ڈیزائن کیئے جن کی نہ صرف کامیاب نمائش ہوئی بلکہ ڈاک کے یہ نئے ٹکٹ پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، کویت اور سعودی عرب نے اپنے نام اور کرنسی کے ساتھ چھاپے، جو ایک اعزاز ہے۔ مشہور جریدے "امپیکٹ" کے لئے کارٹونسٹ کی حیثیت سے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اپنی متعدد خوبیوں کے متعلق سلطان صاحب کہتے ہیں

کتھا کہانی، چتر کویتا، ناٹک اور سنگیت
راج محل کی ان پریوں میں قید ہوا سلطان

ان سے ہمارا پہلا سوال تھا... "دنیا میں کوئی بھی کام کوئی بھی شخص کر سکتا ہے سوائے شاعری

کے۔ شاعری اگر فطرت میں ہو تو بھی کسی چوٹ، کسک کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کا محرک کیا تھا''؟

''اگر چوٹ لگی ہوتی تو اس سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔ دراصل ادبی صحبت ملی، اچھے شعرا کو سنتا تھا، جوش صاحب سے ہر ہفتہ ملاقات رہتی تھی یوں شوق کو شاعری لازم ہو گئی''۔

''اچھا شاعر اچھا مصور اور آرٹسٹ بھی ہوتا ہے کہ اپنی جزئیات نگاری سے ہی بھرپور نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ آپ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور آرٹسٹ بھی۔ کیا اس سے شاعری دوآتشہ ہوئی''؟

''آرٹ تو میرا ذریعہ معاش ہے صرف شاعر ہوتا تو بھوکوں مر جاتا۔ اب شاعری پیٹ تو نہیں بھرتی نا۔ ویسے بھی کسی چیز سے متاثر ہوتا ہوں تو غزل فوراً نہیں ہوتی۔ مصروف آدمی ہوں، ٹائم (time وقت) نہیں ملتا۔ فرصت کے اوقات کا، البتہ شاعری دلچسپ اظہار ہے۔ مطالعے کا شوق ہے، مگر میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ علم حاصل کر کے انسان حکیم لقمان تو بن سکتا ہے، شاعر نہیں۔ ویسے افسانہ نگاری کی حیثیت سے خود کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اظہار آسان ہے مگر میں اس میں فنی جدت پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری کہانیاں وہی عام معاشرے کی کہانیاں ہوتی ہیں مگر زاویہ نگاہ مختلف ہے''۔

''آپ کے نزدیک شاعری کی تعریف کیا ہے''؟

''انسان داخلی و خارجی طور پر جو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اس کی جدت انفرادیت سے پیش کرنے کا انداز، الفاظ کے مناسب چناؤ اور نظم و ضبط شاعری ہے۔ شاعری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس میں شاعر دقیق خیال کو سادہ انداز میں پیش کرتا ہے اور ایک وہ جس میں سادہ خیال کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتا ہے جیسے ...آنسو دل کا بھید بتائے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

نثری نظم اور آزاد شاعری کے متعلق جوش کا ہم خیال ہوں۔ وہ کہتے ہیں جو کاہل بھی ہے اور جاہل بھی وہ آزاد نظم کہتا ہے''۔

ہم نے پوچھا... ''بڑے بڑے نامور شعرا ہیں جنہوں نے آزاد شاعری اپنائی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں وہ شاعر نہیں تھے''

مسکرا کر بولے... ''یہ خیال ہے میرا آزاد شاعری کے متعلق۔ کسی کو شاعر ہونے یا نہ ہونے کی سند میں کیسے دے سکتا ہوں۔ ورنہ تو ایسے بھی شاعر ہیں جو شاعر تو نہیں مگر قافیہ ردیف ناپ کر شاعر کہلاتے ہیں''۔

''آپ کن شعرا سے متاثر ہیں''۔

''جوش اور جگر سے زیادہ متاثر ہوں۔ اور غالب سے تو کوئی منہ موڑ ہی نہیں سکتا۔ ان کو پڑھنے کے بعد میری جرأت اظہار کو تحریک ملتی ہے''۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں انہوں نے کہا... ''اردو زبان جس طرح انگریزی سے خلط ملط کی جارہی ہے اس سے بہت دل برداشتہ ہوں۔ یہاں تک کہ اردو اخبارات و رسائل جو زبان کی ترسیل کا کام کرتے ہیں وہ بھی انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بھئی اگر اردو زبان میں پہلے ہی

سے ایک لفظ بلکہ متعدد جگہ کئی کئی الفاظ موجود ہیں ان کو ہٹا کر آپ انگریزی لفظ کسی نظریے کے تحت استعمال کر رہے ہیں؟ اردو زبان عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت کے الفاظ صرف اس لئے سمیٹ لیتی ہے کہ مزاجاً ایک جیسی ہیں۔ انگریزی کا تو مزاج ہی مختلف ہے۔ ہمارے حکمران طبقہ تک کو اپنی زبان میں بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہے"۔ ہم نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا... "شاید اس لئے کہ انگریزی عام ذریعہ اظہار بنتی جا رہی ہے۔ زیادہ تر علوم بھی اسی زبان میں ہیں"۔ انہوں نے دلیل دی ... "فرانس، جرمنی، جاپان انگریزی کیوں نہیں اپناتے۔ مثالیں ہیں یہ ہمارے لئے کہ ہماری ترقی ہماری اقدار میں ہے۔ مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیم عام نہ ہو۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ حکومت خاص طور پر اس کا خیال رکھتی ہے کہ لوگ پڑھ لکھ نہ جائیں ورنہ حکومت کیسے قائم رہے گی۔ یہاں برطانیہ میں تو اردو کو قائم رکھنا اور بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ دراصل ہمارا معاشرہ اتنا مادہ پرست ہو گیا ہے کہ میرے اپنے بچے تک یہ کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے کیا مل جائے گا، کیا آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یہاں اپنا مستقبل بنانا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا وہ بولنے کے ساتھ تھوڑا بہت اردو پڑھ لیتے ہیں وہی بہت ہے۔ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے سے ہو سکتا ہے کہ ان میں زبان کا شوق پیدا ہو۔ مگر انڈیا پاکستان میں ہی دیکھ لیجیے کتنے بچے مشاعروں یا ادبی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں یہاں تو پھر بھی زبان کے فرق کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ بہرحال اندھیرا کتنا ہی ہو روشنی کی امید رکھنی چاہیئے"۔

غزلوں، نظموں، نعتوں اور گیتوں پر مشتمل اپنی کتاب کے لئے سلطان صاحب کام کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے... "لندن میں طباعت کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میری کتاب پاکستان سے شائع ہو۔ قدردانوں کا تقاضا تو ہے دیکھیئے کیا ہوتا ہے"۔

اردو کے رسم الخط کے بارے میں انہوں نے کہا... "میں اردو رسم الخط تبدیل کرنے کے سخت خلاف ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک مشرقی مہذب دوشیزہ کو بے غیرت مغربی لباس پہنا دیا جائے۔ انگریزی رسم الخط میں وہ حسن، وہ نزاکت اور علمیت ہے ہی نہیں جو اردو رسم الخط میں ہے"۔

آخر میں جناب فیاض عادل فاروقی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو سلطان الحسن فاروقی کے ساتھ منائی گئی شام میں انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی نذر کیئے گئے

اُس کا ایماں پہ ایمان ہے — وہ فقیری میں سلطان ہے
شاعری، خوش نویسی، ادب — کارِ سلطاں کا میدان ہے
اس کے شعروں سے ہو باغ باغ — جس کا دل بھی پریشان ہے
بحر چھوٹی میں کہنا بڑی — بات، سلطاں کو آسان ہے
بے ملمع ہیں پند و مزاح — یہ کھرے زر کی ہی کان ہے
رنگ و نکہت کی برسات ہے — یہ دھنک ہے، گلستان ہے

'تیرگی میں کرو روشنی' | نور، سلطاںؔ کا فرمان ہے
غیظ و غیبت غرور و غضب | سب تباہی کا سامان ہے
جس کے دل میں نہیں درد و غم | وہ محبت سے انجان ہے
کاروانِ وفا کے بغیر | زندگی، دشتِ ویران ہے
جس ادب میں نہ پیغام ہو | وہ نگارش کا شمشان ہے
شاعری، بن گئی بندگی | میرے مالک کا احسان ہے
وہ سماعت کو شیریں کرے | سحر، سلطاںؔ کا الحان ہے
ہے وہ بزمِ سخن کا دبیر | ساری محفل کی وہ جان ہے
خندہ پیشانی صدق و خلوص | یہ ہی سلطاںؔ کی پہچان ہے
اُس کے لب پہ تبسم، مگر | اُس کے سینے میں طوفان ہے
دل کسی کا دُکھاتا نہیں | کیا مرنج و مرنجان ہے
وہ فرشتہ تو عادلؔ نہیں | ہاں وہ پیارا سا انسان ہے

Mr. Sultan-ul-Hasan Farooqi,
12 Burlington Road, Muswell Hill, London, N10 1NJ, UK

انتخابِ کلام

دردِ محبت دل تک پہنچے | عشق مہِ کامل تک پہنچے
بن کے دُھواں محفل سے نکلے | جو شمعِ محفل تک پہنچے
خون کے دریا سے جو نہ گزرے | کشتی میں ساحل تک پہنچے
تلوار گری ہاتھوں سے چُھٹ کر | جب غازی قاتل تک پہنچے
کاش ہمارا زرّیں ماضی | حال اور مستقبل تک پہنچے
ناممکن ممکن ہوجائے | لاحاصل حاصل تک پہنچے

سلطاںؔ ہم نے جو شعر لکھے
دل سے نکلے دل تک پہنچے

چھوٹے سے اک ملبے میں دنیا سما گئی
جانے کہاں گیا مرا آنگن مرا بھرا
سیفی سرونجی 13-1-2001

ڈاکٹر سیفی سرونجی

سرونج، مدھیہ پردیش، ہندوستان

تم کو کھلے ملیں گے ترقی کے راستے
پہلا قدم اُٹھاؤ تو لیکن یقین سے

اس شعر کے خالق سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۹ء میں پونا، ہندوستان میں ہوئی۔ مشہور افسانہ نگار قاضی مشتاق کے اعزاز میں ایک محفل رسالہ ''اسباق'' کے مدیر نذیر فتح پوری اور احباب کی جانب سے منعقد کی گئی تھی۔ اسی محفل میں ڈاکٹر سیفی سرونجی نے بھی مقالہ پڑھا تھا۔ پھر ان کا سہ ماہی رسالہ ''انتساب'' ملا۔ سیفی سے ملاقات اور پھر رسالہ ''انتساب'' سے ملاقات کے بعد حیرت تو ہونا تھی کہ دبلا پتلا یہ نوجوان مضبوط اعصاب اور مستقل مزاجی کا مالک نہ ہوتا تو ۱۹۸۲ء سے سرونج جیسی چھوٹی سی غیر مانوس زمین پر اردو زبان کے پودے کی آبیاری اس کے پائے استقلال میں چھالے ڈال دیتی۔ اور کیا عجب کہ وہ آبلہ پا ہوا بھی ہو اور بار ہا ہوا ہو۔ سیفی کا یہ شعر اس کی اسی تنہا صحرا نوردی کی عکاسی کرتا ہے۔

گھر میں میرے بھیڑ، اکیلا ہوں مگر
شکوہ نہیں ہے پھر بھی کسی بھی مکین سے

اپنی آرزوؤں کو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں پامال ہوتے اور ریزہ ریزہ بکھرتے دیکھ کر بھی اس نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکوہ کی ایک شکن بھی اپنے ماتھے پر ظاہر نہ ہونے دی۔ چہرے پہچان کر

بھی وہ اجنبی بنا رہا اور کہا تو یہ کہ

جب بھی کیا ہے وار، خدا نے بچالیا چہرے مگر ہیں سامنے کچھ کچھ مہین سے

سیفی نے زندگی کے ہر راستے اور ہر موڑ پر رکاوٹوں کے کنکر چنے ہیں۔ مگر لہولہان ہونے کے باوجود سُرخ رُوئی حاصل جہد بنانے کی تمنا کے پودے کو مرجھانے نہیں دیا۔

سیفی نے بتایا... ''سرونج کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'موّا کھیڑا' میں ۱۹۵۳ء کو جنم لینے والے بچے کا نام والدین نے رمضانی رکھا۔ سرونج کے اسلامی مدرسے میں قرآن کے چھ سات پارے حفظ کیئے۔ مگر غربت کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور کم سنی میں ہی بیڑیاں بنانے کی مزدوری کرنے لگا۔ وہیں شاعرانہ ماحول ملا۔ پھر آئے دن شعری نشستوں میں بیٹھ بیٹھ کر خود بھی شعر کہنے لگا۔ کارخانے میں صادق سردھنوی، نسیم حجازی، عبدالحلیم شرر کی کتابیں اور الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا جیسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ کتابوں کا شوق سیفی لائبریری کے قیام کا محرک بنا۔ اور دس پندرہ سال کے اندر لگ بھگ سات سو (۷۰۰) غزلیں کہیں اور درجنوں کہانیاں لکھیں جو چھپ گئیں لیکن ڈگری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اُن ہی دنوں توفیق صاحب جیسے شفیق استاد نے حوصلہ بڑھایا اور میری فیس جمع کر کے زبردستی ادیب، ادیب ماہر، اور کامل کا امتحان دلایا۔ اسی طرح ایم اے کرنے کے بعد میں سرکاری اسکول میں اردو کا ٹیچر ہو گیا۔ ۱۹۹۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سچائی تو صرف یہ ہے کہ زندگی میں ایک چیز سے محبت کی ہے اور وہ ہے کتاب''۔

سیفی بتا رہے تھے کہ ۱۹۶۸ء میں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ پہلا شعر ہے

دیکھا عجیب ہم نے کرشمہ کتاب کا لایا ہے رنگ زیست میں پڑھنا کتاب کا

نثر بھی اسی زمانے میں لکھنا شروع کی۔ انہوں نے اردو ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں نعت، غزل، ہائی کو، افسانے، انشائیے، ماہیے، نثری نظم وغیرہ شامل ہیں۔ کتابی شکل میں چھ شعری مجموعے ''روشن الاؤ؛ ایک لمحہ ایک خواب؛ گنبدِ خضرا؛ رنگ اور خوش بو؛ جنگل کا نٹے دھوپ؛ ناؤ سمندر موجیں'' اور تین نثری مجموعے ''ہم رہ گئے اکیلے'' (افسانے)، ''رنگوں کا امتزاج'' (مضامین) اور ''ہم بھی ایڈیٹر بن گئے'' (انشائیے) شائع ہو چکے ہیں۔

سیفی نے کہا... ''میں بلاشبہ اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید ہوں۔ ہاں رسم الخط کی تبدیلی کو زبان کی موت سمجھتا ہوں اس لئے کہ رسم الخط ہی زبان کی پہچان اور اس کی شان ہوتی ہے''۔ انہوں نے نثری نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کا کہنا ہے... ''نثری نظم لکھنے کا حق صرف اس شاعر کو ہے جو پابند نظم کہنے میں مہارت رکھتا ہو۔ اس طرح وہی شاعر اس صنف میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے''۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا... ''آج کا ادب بھی ہر عہد کے ادب کی طرح اپنے عہد کا ترجمان ہے''۔ سیفی نے اپنے بزرگ اور اپنے ہمعصر شعرا کا کلام پسند تو کیا لیکن آج تک کسی ایک شاعر سے متاثر نہیں رہے۔ کہتے ہیں... ''کبھی کبھی کسی اجنبی اور نئے لکھنے والے کی تحریر بھی اتنی

اچھی اور جاندار ہوتی ہے کہ اُسے نامور ادیبوں کی تحریر کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔

اپنی زندگی کے دو اہم واقعات انہوں نے سنائے جو اُن کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ ایک تو انہوں نے وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' خریدنے کے لئے تین راتیں جاگ کر بیڑیاں بنائیں اور پیسے جمع کر کے کتاب خریدی۔ یہ ان کے علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اور دوسرا، ان کی پہلی کتاب کی تقریب اجرا کے موقع پر ایک ایسے شخص کا ان سے آٹوگراف لینا جس نے کبھی ان کی غربت کا مذاق اُڑا کر ان کی توہین کی تھی۔

Dr. Saifi Sironji,
Saifi Library, Sironj, 464228, M P, India.

انتخابِ کلام

غالبؔ نہ تھا نہ ہی کوئی حسرتؔ نہ میرؔ تھا
پھر بھی مری غزل کا زمانہ اسیر تھا

پتھر ہوا نصیب بس اک لفظ پر مجھے
بچہ تمہارے شہر کا کتنا شریر تھا

بچ کر میں کیسے رہتا بھلا اس کے وار سے
شعلہ تھا اس کا چہرہ نگاہوں میں تیر تھا

خاموش رہ کے جس کی وہ سنتا تھا گالیاں
ہم نے سنا ہے وہ کوئی روشن ضمیر تھا

کل رات جس کا قتل ہوا تیرے شہر میں
آیا تھا چل کے دار سے وہ اک سفیر تھا

سیفؔی عجیب بات ہے دولت کے باوجود
مانگا تھا اس نے پیار وہ کیسا فقیر تھا

اپنا ہے کون، کون پرایا ہے ان دنوں
یوں تو سبھی نے ہاتھ ملایا ہے ان دنوں

11/12/00

شاہد اسحاقی

شکاگو، امریکہ

آج نومبر ۲۰۰۲ء کی اٹھائیس (۲۸) تاریخ ہے۔ اگلے ہفتے میری برطانیہ روانگی ہے۔ روانگی سے قبل میں وہ انٹرویو یا تعارف زیادہ سے زیادہ تعداد میں لکھ لینا چاہتی ہوں جن کے ساتھ شعرا کی تصانیف اور مجموعۂ کلام موجود ہیں تا کہ مجھے کتابیں ساتھ نہ لے جانا پڑیں۔ میں ٹالنے والا کام نہیں کرتی چنانچہ شعرا کے مجموعۂ کلام کو توجہ سے پڑھتی ہوں تا کہ جو حوالہ دینا ہو میں کتاب سے دے سکوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کام گھر پر یا اسپتال کی لابی (lobby) میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے بیگ (bag) میں مسودے اور کتابیں بھر لاتی ہوں۔ آج بھی یہ ہی ہوا۔ اور اسپتال کے حوالے سے یاد آیا کہ آج میں جس شاعر کے بارے میں لکھ رہی ہوں وہ بیمار ہے۔ پچھلے ہفتے محترم حسن چشتی صاحب سے فون پر شکاگو میں بات ہوئی تھی تو دورانِ گفتگو شاہد اسحاقی صاحب کا ذکر آیا اور انہوں نے بتایا وہ بیمار ہیں۔ میں اسی تگ و دو میں رہی کہ ان سے فون پر خود گفتگو کر لوں مگر مجھے روانگی کی تیاریوں اور گھر کے دیگر کاموں نے بھلائے رکھا۔ ہم جب تک خود پہاڑ تلے نہیں آتے ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ مختصر سی زندگی، جس کے لئے ہم ایک طوفان ہر دن کھڑا کیے رہتے ہیں، بڑی بے وفا، بے مروت اور کمینی ہے۔ شاید اسی لئے ہمیں عزیز ہے کہ ہماری، یعنی انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کے پیچھے دوڑو جو ہم سے منہ موڑے چاہے وہ دولت ہو، شہرت ہو یا اور کوئی اور چیز۔

شاہد اسحاقی سے میری ملاقات نظیر باقری کے ذریعے ہوئی تھی۔ نظیر دو تین سال قبل مشاعرے میں آئے تھے، غالباً ۱۹۹۸ء میں۔ وہ شاہد کے گھر مقیم تھے۔ نظیر خود بھی پائے کے شاعر ہیں۔ شاہد ان کے دوست ہیں اور بہت خلیق اور دوستوں کے لئے نقد و جاں حاضر کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ہنستے آنسو" میرے ہاتھوں میں ہے جس کا نام و انتساب نظیر باقری کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

دونوں آنکھوں میں ہیں دو طرح کے ہنستے آنسو کہیں روتے ہوئے آنسو کہیں ہنستے ہوئے آنسو

شاہد ادب دوست اور سخن پرور انسان ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ شاہد خود بتائیں گے کہ انہوں نے اردو زبان کے پودے کی آبیاری کے لئے شکاگو کی غیر معروف زمین اور سرد ترین موسم میں کتنی جد و جہد سے بیج ڈالے اور یخ بستہ ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے مشاعرے اور دیگر کئی پروگرام کیئے۔ شاہد کی یہ خدمات بھلا دینے والی تو نہیں ہیں۔ میں انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ وہ جلد صحت مند ہو جائیں اور اردو زبان کے پودے کو تر و تازہ رکھنے کے لئے مستعدی سے کام کریں۔

میں نے پوچھا... "شاہد اپنے حالاتِ زندگی کے ضمن میں یہ بتائیں کہ آپ امریکہ کب اور کن حالات میں آئے"؟

شاہد کہنے لگے... "میں حیدر آباد دکن کے ایک مُرشدی گھرانے میں ۱۹/ اگست ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوا۔ مذہبی ماحول میں پرورش ہوئی کیوں کہ والد ماجد حضرت سید احمد صاحب قبلہ انتہائی متقی اور پرہیز گار مُرشد اور تہجد گزار تھے۔ والدہ ماجدہ خورشید بانو صاحبہ بھی مُرشدی گھرانے ہی سے تعلق رکھتی تھیں اور ماشاءاللہ گیارہ (۱۱) کی ٹیم (team) تیار کی تھی جس میں میرا نمبر تیسرا تھا۔ میرا نام سید محمد شاہ رکھا گیا تھا۔ میرے پردادا بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں جن کا اسمِ گرامی سید اسحٰق (اسحاق) تھا اور اسی نسبت سے ہمارا خاندان اسحاقی کہلاتا ہے۔ چنانچہ میں نے جب اپنا قلمی نام یا تخلص شاہد رکھا تو اس کے آگے اسحاقی اسی لئے رکھا ہے۔ تعلیمی وطن بھی حیدر آباد ہی رہا جہاں خوش قسمتی سے ہائی اسکول تک اردو میڈیم (Urdu medium) میں پڑھنے کا موقع ملا اور اسی وجہ سے اردو کی بنیادی تعلیم بھی حاصل ہو سکی۔ مڈل اسکول سے ہائی اسکول تک اردو کے بہترین استاد مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی شاگردگی نصیب ہوئی جنہوں نے بہت کچھ سکھایا۔ اس دوران شاعری ہی نہیں بلکہ نثر، ڈرامہ، ناول، موسیقی غرض دنیا کی ہر دلچسپ چیز سے لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اور ہاں یہ بتانا بھول گیا کہ والد صاحب مُرشد ہوتے ہوئے بھی مزاح کی گہری حس رکھتے تھے۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی فرماتے تھے۔ تخلص "حضت" فرماتے تھے۔ زندگی بھر چائے، پان یا سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا لیکن ان کی مزاحیہ غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیئے۔

سنے میرے شعراں تو لوگاں یہ بولے حضت آج پی لے کو، کیا کیا کی بک رئیں

والد صاحب کی کرم فرمائی تھی اور زندہ دلانِ حیدر آباد کے مشاعرے میں بھی پابندی سے جاتا رہا ہوں جہاں والد صاحب کے علاوہ سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب اور دیگر شعراء سے بھی کافی متاثر تھا۔ لہٰذا ہر وقت کچھ نہ کچھ تک بندی کرتا رہتا تھا۔

کچھ عرصے تک تو یہی سوچا کہ کسی کی ہجو کرنا ہی طنز و مزاح کہلاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں

آئی کہ طنز و مزاح تو سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں اور مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ یوں طنز و مزاح سے دل چسپی بے حد بڑھ گئی کیوں کہ جس طرح ایک کارٹونسٹ (cartoonist) اسکیچ (sketch) میں بعض خطوط کو گھٹا بڑھا کر اُن پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے جن پر طنز کرنا ہو یا جن کی ہنسی اُڑانا ہو اسی طرح طنز و مزاح نگار اپنے ذریعۂ اظہار یعنی زبان پر اتنا قابو حاصل کر لیتا ہے کہ وہ اس کے ان دیکھے پہلوؤں کی طرف پڑھنے والے کے ذہن کو متوجہ کر کے ایک انوکھا تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ مبالغہ جو سلیقے اور تناسب کے ساتھ ہو، اس فن کی جان ہے۔ یہ مبالغہ اس اعتبار سے حقیقت آمیز ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے زندگی، شخصیت یا کسی شئے کے مختلف خارجی یا داخلی عناصر کے اُس عدم تناسب کو پڑھنے والوں کی نظروں میں بخوبی عیاں کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر اپنا ہی ایک 'چوا' (دکنی میں چار مصرعوں کو 'چوا' کہتے ہیں) پیش ہے۔ ان چار مصرعوں میں اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ لوگ کس طرح اپنی زبان کی نفی کرتے ہیں اور اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ان کے بچے انگریزی سیکھ گئے ہیں۔ امریکہ میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی امریکن سے کوئی بھی سوال کریں تو عموماً وہ 'آئی ڈونٹ نو (I don't know مجھے نہیں معلوم)' پہلے کہے گا پھر سارا جواب تفصیلی اور تسلی بخش دے گا۔ اس ٹکڑے کو میں نے ردیف کے طور پر استعمال کیا ہے۔

چلتے چلتے رستے میں اک آدمی سے جب رستہ پوچھا	ہاتھاں ہلا کو مونڈھے چڑھا کو فوراً بولا 'آئی ڈونٹ نو'
اپنے لوگاں بچوں کو انگریزی سکھا کو خوش ہوتیں	باپ کا نام اردو میں پوچھا، بچہ بولا 'آئی ڈونٹ نو'

اسی طرح ہر آدمی کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش خدا نے ایک کے بجائے دو دل دیئے ہوتے خصوصاً جب دل زخمی ہو گیا ہو تو اس صورت حال کو ایک مزاحیہ نظم میں کچھ اس طرح بیان کیا کہ انداز آپ بیتی کا ہے مگر وہ جگ بیتی اور وہ بھی دکنی میں کہی ہے۔ نمونتاً صرف پہلے دو مصرعے پیش ہیں۔

دو آنکھاں، دو کاناں، دو ہاتھاں، دو پاواں دے ڈالا	دینا چ تھا تو دو دینا تھا دل کئی کو اک دے ڈالا

ہائی اسکول کے زمانے کا ذکر چل رہا تھا۔ بہر حال ہائی اسکول کے بعد جب کالج کا وقت آیا تو عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میڈیم برخاست ہو چکا تھا۔ ہر طرف انگلش میڈیم ہی رہ گیا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اردو گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ مختلف رسالے، ناول اور کلیات، غرض سب ہی کچھ پڑھنے کا شوق تھا اور ہے۔ اردو سے ایسا عشق ہوا کہ سب اس کے سامنے ہیچ لگنے لگے۔ کئی محبوبائیں آئیں اور گئیں لیکن یہ محبوبہ نہ کبھی چھوٹی نہ کبھی چھوٹے گی۔ ایک دل چسپ واقعہ یاد آرہا ہے کہ جب میں اس پس و پیش میں تھا کہ میڈیسن (Medicine) میں داخلہ لوں یا اگریکلچر (Agriculture) میں یا پھر وٹرنری (Veterinary) میں کیوں کہ ہائی اسکول میں تو ٹاپ ڈویژن (top division) میں پاس ہوا تھا لیکن سائنس میں جن مارکس (marks) پر میڈیسن میں داخلہ مل سکتا تھا اس میں صرف 0.5 یعنی آدھا نمبر کم تھا۔ اور ایسی صورت میں عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخلہ مشکل تھا اور دوسرے کالجوں میں ڈونیشن (donation) کی بڑی رقم دے کر مارکس کم ہونے کے باوجود داخلہ لیا جا سکتا تھا۔ لیکن والد صاحب اس پوزیشن (position) میں نہیں تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر والد صاحب کے ایک دوست، جو شہر کے ایک معروف وکیل تھے فوراً گھر پہنچے اور آفر (offer) دی۔ 'آپ کے لڑکے کو میڈیکل ہی

میں داخلہ لینا چاہیئے۔ ہم جہیز کے علاوہ نہ صرف جوڑے کی رقم دیں گے بلکہ میڈیکل کے داخلے کے لیئے ڈونیشن بھی دیں گے اور تعلیم کا سارا خرچ بھی اٹھائیں گے۔ ہماری بیٹی سے رشتہ پکا کر دیں۔ والد صاحب نے حسب روایت اُن کی مہمان نوازی کی اور پھر ہنس کر جواب دیا" وکیل صاحب کسی اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایئے۔ یہاں کا جج نہ بکاؤ ہے نہ اُس کا کارندہ (یعنی میں)"۔ وکیل صاحب اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے شاعری چھوڑ دی اور نثر لکھنے لگا۔ چنانچہ میرا پہلا افسانہ 'سونرتا آنچل' کے عنوان سے حیدرآباد کے موقر روزنامہ 'ملاپ' کے اردو ایڈیشن میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا جس میں جہیز اور جوڑے کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ وہ اس قدر مقبول ہوا کہ پھر جہیز کو 'بلیک میل (black mail)' کا نام دے کر مختلف رسالوں اخباروں وغیرہ میں مضامین لکھے۔ غرض جہیز کے خلاف اچھی خاصی مہم چلائی۔ تھوڑا سا جھکاؤ سیاست کی طرف ہوا تو 'نوجوانان مسلم مجلس مشاورت، آندھرا پردیش' کا جنرل سیکریٹری (General Secretary) بن گیا۔ اُدھر کلچرل ایسوی ایشن (Cultural Association) میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ دو تین انجمنوں کی صدارت بھی کی۔ مختلف پروگرام پیش کیئے۔ کالج ختم کر کے ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ آف آندھرا پردیش کی پانچ سالہ ملازمت کی۔ اس دوران نثر اور شاعری دونوں جاری رہے۔ پھر ۱۹۷۲ء میں اپنے عزیز ترین دوست امتیاز احمد انصاری عرف سکندر سے ملاقات کے لئے امریکہ آ پہنچا۔ ارادہ تھا کہ اس سے مل کر کچھ عرصے بعد تفریح وغیرہ کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح پھنس ہی گیا۔ پھر ایک سال بعد میرا دوست خود شادی کرنے کے لئے ہندوستان گیا۔ لیکن وہاں شادی سے دو روز قبل ٹریفک ایکسیڈنٹ (traffic accident) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جب یہ خبر مجھ تک پہنچی تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہاں سے سنجیدہ شاعری کی طرف جھکاؤ ہو گیا۔ ایک نئی کار خریدی اور سارا امریکہ یوں ہی بے مقصد اکیلا گھومتا رہا۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ اور ایسی صورتِ حال میں اسی طرح کی شاعری ہوتی ہے جیسے ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیئے

مری طرح مرا سارا سفر اکیلا تھا   وہ ہمسفر تھا مرا مگر میں اکیلا تھا

غرض جب صحرا نوردی کا دور ختم ہوا تو ہالی ووڈ میں قیام پزیر ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد دل اُچاٹ ہو گیا۔ تو پھر شکاگو چلا آیا۔ یہاں آ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ چند احباب نے مل کر زندہ دلانِ شکاگو کی بنیاد ڈالی جس میں میرے ساتھ غوثیہ سلطانہ اور واجد ندیم پیش پیش تھے۔ غوثیہ سلطانہ نے بہت کام کیا اور ہم نے مل کر مزاحیہ مشاعرے بھی کیئے، اسٹیج شو (stage show) بھی اور خاکے بھی۔ مختصر یہ کہ یہاں منی حیدرآباد (mini Hyderabad) بنا دیا۔ اس سے لوگوں میں اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

میں نے حیدرآباد دکن میں صداکاری کی تھی اس شوق کے تحت ۱۹۷۹ء میں یہاں کے اکلوتے ریڈیو پروگرام 'سنگیتا' میں بحیثیت اناؤنسر (announcer) شرکت کی۔ پہلا انٹرویو مہدی حسن کا پیش کیا۔ لوگوں نے نہ صرف اردو لب و لہجہ بلکہ آواز بھی بہت پسند کی۔ اور مقبولیت بڑھتی گئی۔ پھر ایک ٹی وی پروگرام پیش ہوا۔ اس میں مزاحیہ اور سنجیدہ، دونوں قسم کی شاعری کو فروغ دیا۔ لیکن جب وہاں اردو/ ہندی کا جھگڑا شروع ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال کروں بلکہ اردو بولوں ہی نہیں صرف شدھ ہندی بولوں تو میں نے یہ کہہ کر

علیحدگی اختیار کرلی تو ہندی کو پرموٹ (promote) کرنے والے تو بے شمار ہیں لیکن اردو کا کوئی نہیں۔ اور میں صرف اردو کو فروغ دینے کے لئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے ایک بڑی آرگنائزیشن (organisation) کی بنیاد ڈالی جو ایشین آرٹس فاؤنڈیشن (Asian Arts Foun-dation) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسی کے تحت اپنے ریڈیو پروگرام 'رنگین محفل' کا آغاز کیا۔ 'رنگین محفل' اس لئے نام رکھا کہ اس میں ہر ملک، مذہب و ملت کے لوگ حصہ لے سکیں۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔ چنانچہ اس پروگرام کی مقبولیت ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلادیشی لوگوں ہی میں نہیں بلکہ ان تمام کمیونٹیوں (com-munities) میں بھی ہے جو اردو بولتے یا سمجھتے ہیں۔ ہر سال اس کی سالگرہ پر اسٹیج شو ہوتا ہے جس میں مختلف قومیت کے فن کاروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ڈانس، ڈرامہ، غزل، گانے وغیرہ کے پروگراموں کے علاوہ اردو مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں 'رنگین محفل نائٹ' یعنی 'رنگین ریڈیو' کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر جو مشاعرہ ہم نے کیا تھا اس میں ہندوستان کے مشہور شعرائے کرام کو دعوت دی گئی تھی جس میں فلمی شاعر حسرت جے پوری، گلشن باورا، ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی، عادل لکھنوی اور نظیر باقری کے علاوہ تاجور سلطانہ، حنا تیموری، عارفہ شبنم اور ریحانہ نواب نے حصہ لیا تھا اور نظامت جناب ثقلین حیدر مرحوم نے کی تھی۔ درمیانی برسوں میں پاکستانی فلم اسٹار اور ہندوستانی فلم اسٹار اور پلے بیک سنگروں کے پروگرام ہوئے۔ پھر ۲۰۰۰ء میں عالمی مشاعرہ ہوا جس میں میرے شعری مجموعے 'ہنستے آنسو' کی رسم اجرا بھی شامل ہے۔ اس موقع پر ہندوستان سے کرشن بہار نور لکھنوی، دلکش آفریدی، نزہت نگار، سنیل کمار تنگ عنایت پوری، پرویز اللہ مہدی، کریم انور، طالب خوندیسری اور نظیر باقری، ڈیٹ رائٹ سے انجم تاج اور شکاگو سے خواجہ ریاض الدین عطش نے حصہ لیا۔ بہر حال قصہ پانچویں درویش کا بہت طویل ہوا جا رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ 'ایشین آرٹس فاؤنڈیشن' اور 'رنگین محفل' کے بینر (banner) تلے اردو کو پروان چڑھانے اور زندہ جاوید بنانے کی بھرپور کوشش چل رہی ہے۔ اور پھر دوسری کئی انجمنیں بھی اردو کا کام کر رہی ہیں۔ اس لئے یہاں آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں کہ یقیناً میں اردو کے مستقبل سے ہرگز مایوس نہیں ہوں۔

آپ کے بقیہ سوالوں کے جوابات اس طرح ہیں:

میرا کلام بیسویں صدی، شمع، بانو، شگوفہ، شاعر، سخنور، بلٹز (اردو)، انقلاب غرض بہت سے جرائد کے علاوہ اخباروں میں بھی چھپتا رہا ہے۔

میں اردو کے مستقبل سے ہرگز مایوس نہیں ہوں کیوں کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہونے کے علاوہ دنیا کی سب سے میٹھی زبان بھی کہلاتی ہے۔ جس کا اعلان اقوام متحدہ نے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔

شاعری میں نثری نظم کے تو حق میں ہوں لیکن نثری غزل ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کوئی کہے تو اُسے 'غزل' کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ شاعری میں بہترین ذریعۂ اظہار خیال میری نظر میں غزل، رباعی یا قطعہ اور اس کے بعد روایتی نظم ہو سکتی ہے۔

آج کے دور میں مشاعروں اور تنقیدی نشستوں، دونوں کی ضرورت ہے۔

میں آپ کی رائے سے متفق ہوں کہ واقعی تنقید برائے نام رہ گئی ہے جب کہ ادب کی ترقی کے لئے تنقید بے حد ضروری ہے۔

رہا سوال رسم الخط کا تو اس سلسلے میں میں میری کتاب تو آپ کی خدمت میں روانہ کر چکا ہوں جو ایک طرف سے اردو اور دوسرے طرف سے ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ اس طریقے کے تو میں حق میں ہوں لیکن اردو کا موجودہ رسم الخط ختم کر کے صرف دیوناگری رکھنے کے سخت خلاف ہوں کیوں کہ رسم الخط ہی زبان کی اصل پہچان ہے۔ اسی لباس سے تو اس کی خوب صورتی ہے، اس کا حسن ہے۔ رسم الخط کو ختم کرنے یا بدلنے کا خیال ہی غلط ہے"۔

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغؔ — سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

Mr. Shahid Ishaqi,

365 W. Greenleaf, Skokie, IL. 60076, USA

انتخابِ کلام (دو آنکھاں ایک دل)

دو ہاتھاں، دو پاواں، دو آنکھاں، دو کاناں دے ڈالا
دیناچ تھا تو دینا تھا، دل کئی کو اک دے ڈالا
کتا اچھا ہوتا دل بی دو دے دیتا اوپر والا
اک دل عشق لڑاتا دوسرا دل غم کھاتے چ رہتا
ان کی نظر کے تیراں چلے تو کوئی فکر کی بات چ نیں تھی
اک دل ان کے تیراں کھاتا دوسرا اُس کی ڈھال بن جاتا
اک دل اُن کی زلفوں کے چھاؤں میں لیٹ کو اُن کے گن گاتا
دوسرا اُن کے رخساروں کی دھوپ میں لیٹ کو "سن باتھ"(1) لیتا
جب بی اُنوں کے دل کو دُکھاتے دوسرا اُس کے آنسو پونچھتا
یا پھر اُن سے دور نکل کو اور کسی کے دل میں گھستا
کیا دھوم مچاتے شاہدؔ سینے میں گر دو دل ہوتے
اک دل گر مجبور بی ہوتا دوسرا تو آزاد ہوتا
کاش کہ اوپر والے تو نے اک دل اور دیا ہوتا

1۔ sun bath۔ غسلِ آفتابی

باسمہٖ تعالیٰ

اللہ اللہ رمزِ حسنِ یار کی رعنائیاں
اک تبسم پر ہوئیں ہر سو رقص آرائیاں

شاہد نجیب آبادی

شاہد علی خان شاہدؔ

بحرین، عربین گلف

شاہد علی خان ۳/ جولائی ۱۹۲۷ء کو نجیب آباد، ہندوستان میں پیدا ہوئے مگر ان کی نصف سے زیادہ عمر بحرین (گلف Gulf) میں گزری کیونکہ یہ ۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان کے محکمۂ اطلاعات سے وابستگی کی بنا پر، بحرین ریڈیو میں بحیثیت سینیر انجینیر خدمات انجام دیں اور جب انہوں نے اس ملازمت سے ریٹائرمنٹ لی تو بحرین کی حکومت نے انہیں بحرین کی شہریت سے بھی نوازدیا۔ اب شاہد علی خان صاحب بحرین امریکہ اور کنیڈا کے سفر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ ان کے ایک صاحبزادے آصف شکاگو، امریکہ میں بسے ہوئے ہیں، دوسرے ناصر بحرین میں اور تیسرے صاحبزادے عارف کنیڈا میں ہیں۔

شاہد علی خان نے بارہ (۱۲) سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کئے۔ ان کا پہلا معیاری شعر انہیں اب تک یاد ہے جو جولائی ۱۹۴۲ء میں کہا

ہو اگر شوق تکلم تو یہاں آجانا
خامشی کہتی ہے یہ مجھ سے بیابانوں کی

غالبؔ، جگرؔ مرادآبادی اور پروین شاکر ان کے پسندیدہ شعرا میں نمایاں ہیں۔ انہیں بحرین کے معتبر اور

نامور شاعر سعید قیس کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

پتوں نے ہاتھ اٹھا کے تو مانگی بہت دعا
بارش نہیں ہوئی یہ زمیں کا نصیب تھا

جہلم، پاکستان کے شاعر شہزاد قمر جو ایک عرصہ بحرین میں رہے ان کا یہ شعر شاہد علی خان کے ذہن پر نقش ہے۔

پردیس تو شہزاد ہے خیمے کی رہائش
خیمے کی رہائش میں کبھی گھر نہیں ہوتا

شہزاد قمر تو اب اپنے وطن پاکستان لوٹ گئے ہیں اور شاہد علی خان بھی بحرین میں کم رہتے ہیں کیونکہ کینیڈا میں علاج معالجے کی سہولتیں زیادہ ہیں۔ مگر جب بھی بحرین جاتے ہیں وہ بحرین میں مقیم عبدالحق عارف، جناب رخسار ناظم آبادی اور افضل نجیب کو دیکھ کر ان سے مل کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ بحرین میں اردو زبان وادب کے چراغ کو جلائے رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

شاہد علی خان کی زندگی بھی اردو زبان وادب کی خدمت میں گزری ہے۔ انہیں دکھ ہے کہ آئندہ بیس پچیس سالوں میں اردو کی اہمیت اتنی بھی نہیں رہے گی جتنی کہ اب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو جب اپنے ہی گھر سے نکالی جارہی ہے تو پردیس میں اس غریب کا پرسان حال کون ہوگا۔ امریکہ اور یورپ میں نئی نسل اس زبان سے بے گانہ ہے اور کوئی ایسی تنظیم بھی نہیں جو انہیں اردو کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرے۔

ان کا کہنا ہے کہ اردو کا رسم الخط تو وقت کے ساتھ تبدیل ہوگا کیونکہ یہ اپنے ذاتی رسم الخط میں نہیں پڑھی جارہی ہے۔ اب جغرافیائی حالات کے تحت اس کا جو بھی رسم الخط جہاں بھی ہوگا یہ آنے والی نسل کا مرہون منت ہوگا کہ وہ اردو کے رسم الخط بدلنے کے باوجود اس زبان میں دلچسپی لیں۔ اس الیکٹرانک (electronic) دور میں نئی نسل کو کتابوں سے وہ دلچسپی نہیں جو انٹرنیٹ (inter-net) سے ہے۔ کتابی علم کم ہوجائے گا اور یوں اردو ادب کا کلاسیک ورثہ بھی ختم ہوجائے گا۔

شاہد علی خان کی رائے میں ضروری نہیں کہ نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہو۔ دراصل یہ غزل ہی ہے جو احساسات کی بہتر ترجمان ہے۔ نظم میں تو صرف ایک عنوان ہوتا ہے اور شعر کو وہ آزادی نہیں ملتی جو غزل کے ایک شعر میں ملتی ہے۔

شاہد علی خان کو فخر ہے کہ وہ اردو زبان سے وابستہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں... "میں خود کو دولت مند تصور کرتا ہوں کیونکہ اردو زبان کا سرمایہ سینکڑوں سال پرانا ہے اور جید عالم ہستیاں اس سے وابستہ رہی ہیں"۔

شاہد علی خان نے غزل، نظم، قطعہ اور خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، (۱) رمز حسن ۱۹۸۶ء میں اور (۲) رمز عشق ۱۹۹۰ء میں اور تیسرا زیر طبع ہے۔ دو نثری کتابیں "پٹھانوں کا آغاز" ۱۹۹۰ء میں اور "نواب نجیب الدولہ" ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ۱۹۴۲ء میں نجیب آباد کے ایک

مشاعرے میں اپنا نام مشاعرے میں کلام سنانے کے لئے دیا۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ (۱۵) سال تھی لیکن کلام میں پختگی یوں تھی کہ چھوٹی عمر سے ہی شعر موزوں کرنے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ مشاعرے میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ کسی سے کلام لکھواتے ہیں۔ مگر وہاں موجود اساتذہ کو بھی چھان بین کر کے معلوم ہو گیا کہ یہ ان کی اپنی مشقِ سخن کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ انہیں خوب داد ملی۔

شاہد علی خان بڑی دلچسپ گفتگو کرتے ہیں اور پُر بہار لہجے میں شگفتہ جملوں کی ادیگی کہتی ہے کہ انہوں نے کسی مستعلیق ادارے میں تعلیم حاصل کی ہے اور بلاشبہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا ہے۔ شاعری میں آسان زبان استعمال کرنے کے حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میر تقی میر کا کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ بات زبان سے نکل کر تیر کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ہماری روایتی شاعری، جو دراصل ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے، ایک محبت بھرا پیغام ہے جس سے روح کو تازگی، حلاوت اور شعور کو بینائی ملتی ہے۔ ان کا یہ قطعہ ان ہی جذبات کا عکاس ہے۔

باہمی ربط و کشش سے سارے عالم کو ثبات
ماہ و انجم کی ہو یا شمع پروانے کی بات
ذرہ ذرہ ہے جہاں کا مستقل محوِ طواف
یعنی رمزِ عشق میں مضمر حدیث کائنات

Mr. Shahid Ali Khan,
P O Box 26572, Bahrain, (A.G. Gulf)
OR,
Apt. No. 2003, 25 Mabelle Avenue, Etobicoke, M9A 4YA,
Ontario, Canada

انتخابِ کلام

دیکھنے میں ہے گلستاں کی طرح
زیست ہے موسمِ خزاں کی طرح

میں حساب و کتاب سے خائف
اور وقت سر پہ امتحاں کی طرح

وہ دھڑک کر نہ راز سب کہدے
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

پہلے دل میں سمایا وہ، اور پھر
چھا گیا گرد آسماں کی طرح

وہ مقدس کتاب کی مانند
اور میں حافظِ قرآں کی طرح

سطح پر میں حباب سا لرزاں
اور وہ بحرِ بے کراں کی طرح

اس کا ہر ایک لمحہ ہے انمول
اور میں عمرِ رایگاں کی طرح

میں تو پل میں گزر گیا شاہدؔ
وہ جو گزرا تو کارواں کی طرح

ماحول دل شکن سہی ہمت جوان رہے
انسان جس زمیں پہ رہے آسمان رہے
افتخار اجمل شاہین
۴ ۹/۲۰۰۲

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

کراچی، پاکستان

پروفیسر افتخار اجمل شاہین سے جناب مشفق خواجہ کے گھر اور پھر شاید کسی مشاعرے میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔ میں انہیں بھول جاتی مگر ان کے چند اشعار کی وجہ سے میں انہیں بھلانہ پائی۔ ان کا ایک شعر ہے ؂

ہر سخن ہے معتبر، ایسا نہیں
کہہ رہا ہے کون ! یہ دیکھا کرو

یہ تنبیہ، یہ مشورہ ان کی زندگی، اور اس کے طویل تجربات کا نچوڑ ہے۔ اور سارے تجربات شیرینی گھلے ہوئے نہیں ہوتے۔ جو چراغ روشنی دیتے ہیں وہ دھواں بھی دے جاتے ہیں۔ پروفیسر افتخار اجمل نے کہا ؂

بجھے چراغ ہتھیلی پہ جو جلائے تھے
چراغ چھوڑ گئے ہیں دھواں ہتھیلی پر

مگر افتخار اجمل شاہین کا حوصلہ ہمیشہ سے بلند رہا۔ مزاج میں جو نیکی رچی بسی تھی اس نے ہمیشہ منزل کی راہ دکھائی۔ کہتے ہیں ؂

ہم اہل جفا جیتے ہیں کس شان سے دیکھو
لوگو! تمہیں جینے کا یہ انداز نہ آیا

اردو زبان سے انہیں ہمیشہ محبت رہی۔ اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ اسی محبت کے حوالے سے سناتے ہوئے انہوں نے بتایا... ''میری عمر کوئی آٹھ نو سال کی رہی ہوگی۔ والد صاحب کسی آپریشن کے سلسلے

میں اسپتال میں داخل تھے۔ میں اکثر اسپتال اور آس پاس کے بازاروں کے چکر لگایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پرائمری اسکول کا طالب علم تھا۔ ایک بار اسپتال کے آوٹ ڈور (Out Door) مریضوں کے لئے نوٹس بورڈ پر آویزاں اطلاعات، جو انگریزی اور ہندی میں درج تھیں۔ انہیں اردو زبان میں نہ دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اسی لمحے جیب سے قلم نکال کر اسپتال کی سفید دیوار پر اردو میں ہدایت نامے کو نقل کرنے لگا۔ جب مکمل کرلیا تو اپنی بدخطی دیکھ کر سوچنے لگا کہ کاش یہ کام بھی کوئی خوش خط انجام دیتا۔ اسی وقت اسپتال کی جانب سے ایک خاتون، جو غالباً میڈیکل آفیسر یا سپرٹینڈنٹ تھیں آگئیں اور مجھے ڈانٹا کہ دیوار کیوں گندی کررہا ہوں۔ آٹھ سالہ بچے نے مسکینی صورت بنا کر تفصیل بتاتے ہوئے اپنا دفاع کیا۔ وہ خاتون تو تنبیہ کرکے چلی گئیں لیکن میں باز نہ آیا اور اس کے بعد بھی ریلوے اسٹیشنوں اور بازاروں میں جہاں اور جب موقعہ ملتا ہندی کے سائن بورڈوں پر اردو میں تحریر لکھتا"۔

اس کام کو انہوں نے پیشہ نہیں بنایا۔ مگر اردو زبان کو وسعت دینے اور سینہ در سینہ محفوظ کرانے کی لگن نے انہیں استاد کے درجے پر فائز کر دیا۔ آیئے اب اس سفر کی تفصیل ان ہی سے پوچھیں۔

انہوں نے بتایا کی ان کا نام افتخار اجمل ہے اور تخلص شاہین کرتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں شیخ پورہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی عبدالحنان صاحب بڑے معروف عالم تھے۔ شاہین نے میٹرک تک کی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول شیخ پورہ سے حاصل کی اس کے بعد پٹنہ (عظیم آباد) چلے گئے۔ ۱۹۵۸ء میں بی این کالج پٹنہ سے انٹر کیا۔ جامعہ پٹنہ سے ۱۹۶۰ء میں بی اے آنرز فارسی اور وہیں سے ۱۹۶۲ء میں ایم اے فارسی کیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے اور بسلسلہ ملازمت چاٹگام اور ڈھاکہ میں مقیم رہے۔ وہاں جا کر شاہین درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئے اور اپنی تعلیم کو بھی مزید جاری رکھا۔ ۱۹۶۶ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں بی ٹی اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ کراچی سے ایم ایڈ کیا۔ ۱۹۶۵ء میں حکومتِ ایران نے فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے اسکالرشپ پیش کیا لیکن والد کی بیماری کی وجہ سے اس سے مستفید نہ ہوسکے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں بحیثیت سینئر ٹیچر سنٹرل گورنمنٹ اسکول میں تقرر ہوا اور ۱۹۶۷ء میں بذریعہ پبلک سروس کمیشن بحیثیت لکچرار اردو منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک گورنمنٹ کالج آف کامرس، چاٹگام میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی آگئے اور جامعہ ملیر ٹیچر ٹریننگ کالج میں تقرری ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ اردو کے استاد منتخب ہوئے۔ پہلی تقرری سراج الدولہ گورنمنٹ کالج، کراچی میں ہوئی۔ اس کے بعد ڈی جے سندھ گورنمنٹ کالج، کراچی میں تبادلہ ہوگیا اور وہیں سے مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد بحیثیت صدر شعبہ اردو ۹/فروری ۲۰۰۱ء کو ریٹائر ہوئے۔

شاہین بتا رہے تھے ... "میری ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ اول مضامین لکھے اور ہندی اور انگریزی کہانیوں کے تراجم اردو میں کیئے۔ چند طبع زاد افسانے بھی لکھے لیکن بعد میں طبیعت

شعر و شاعری کی طرف مائل ہوگئی۔ ابتدا میں انگریزی میں بھی چند نظمیں لکھیں۔ دو تین نظمیں اور غزلیں فارسی میں بھی کہیں لیکن پھر اردو شاعری اور مضمون نگاری کی طرف پوری توجہ دی اور تادم تحریر یہ سلسلہ جاری ہے"۔ ان کا کلام ملک اور بیرونِ ملک کے متقدر رسالوں میں چھپتا ہے۔ تاہنوز ان کا کلام کسی کتابی شکل میں نہیں آیا جس کی وجہ یہ اپنی خود کی تساہلی بتاتے ہیں۔ شاہین کہتے ہیں... "میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر میں نے خسارے کا سودا کیا ہے۔ بلکہ اس کے سبب مجھے شناخت ملی ۴۔ پاک و ہند میں لوگ مجھے اس کے حوالے سے جانتے ہیں۔ ہاں مقبولیت کی بات الگ ہے۔ یہ کسی کسی کے حصے میں آتی ہے"۔

شرفِ قبولیت جو ملے تو بات ہے بڑی   کیوں روگ اپنے ساتھ شہرت کا پالئے

شاہیؔن کا خیال ہے... "ادبی گروہ بندیوں نے اردو ادب کو نقصان بھی پہنچایا ہے اور فائدہ بھی۔ نقصان اس طرح کہ اس سے اردو ادب کی خدمت کا دائرہ محدود ہو گیا اور لوگ اپنے اپنے حلقے یا گروہ کے شعراو ادبا کی تشہیر میں لگ گئے جس سے بعض حقیقی شعرا کی حق تلفی ہوئی۔ مگر اس سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ مختلف گروہوں کے زیر اثر کچھ علمی و ادبی کام بھی ہوا۔ مسابقت کے جذبے نے کام کی رفتار بڑھا دی۔ مسابقت کی دوڑ شروع ہوئی جس نے ان گروہوں سے منسلک لوگوں کی ادبی کاوشوں میں اضافہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہوا کہ مخالف گروہ ایک دوسرے سے متحارب ہو کر اپنی تخلیقی قوتوں کا غلط استعمال کرنے لگے۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی نے جدید تخلیق کرنے والوں کی اس طرح پزیرائی کی کہ جدیدیت کے نام پر اور ان کی حمایت میں چیستانی اور غیر ادبی کاوشوں کو بھی شائع کرنے لگے۔ احمد مشتاق کو انہوں نے فراق پر ترجیح دے دی۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے گروپوں میں سرد جنگ کا سلسلہ چلا۔ گو ایسا کم ہوا لیکن پھر بھی بعض اوقات متحارب گروہ اپنے ادبی حلقوں سے منسلک اور حامیوں کی ایسی کاوشیں شائع کرنے لگے جو معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں"۔

پروفیسر افتخار اجملؔ کی رائے میں پاکستان اور ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا ہے۔ کہتے ہیں... "ہمارے یہاں اردو زبان قومی زبان ہے۔ چاروں صوبوں میں اردو لکھی پڑھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے وہ اردو میں شاعری کر رہے ہیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ پنجاب، سرحد اور سندھ کے لوگوں نے اردو کی بڑی قدر کی ہے اور آج بھی ان علاقوں میں بہت سے اچھے ادیب اور شاعر موجود ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ بے شمار اردو کے رسالے اور کتابیں پاکستان سے شائع ہو رہی ہیں۔ جب تک یہ صورت حال ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ ایک خرابی ضرور در آئی ہے کہ جگہ جگہ پرائمری لیول سے انگریزی میڈیم کے اسکول کھل گئے ہیں جو ہماری آنے والی نسلوں کو اردو سے بے گانہ کر رہے ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم صرف بحیثیت اختیاری مضمون جاری رہے تا کہ جو طلبا ملک سے باہر جائیں ان کو مشکلات پیش نہ آئیں۔ ویسے جو طلبا جاپان،

چین اور روس جاتے ہیں ان کی انگریزی دانی ان کو کوئی مدد نہیں پہنچاتی ان کو وہاں کی قومی زبان سیکھنی پڑتی ہے"۔

شاہین اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے خلاف ہیں۔ وہ ڈاکٹر عبد المغنی (ایڈیٹر مریخ، پٹنہ) کے اس قول سے متفق ہیں کہ اردو کا رسم الخط ہی اردو زبان ہے۔ اگر اردو کا رسم الخط بدل گیا تو ہم اردو کے اہم اور قدیم ادبی و علمی سرمایے سے محروم ہو جائیں گے۔ کئی صدیوں کے اتنے ضخیم اور اہم سرمایوں کی کسی دوسرے حروف میں نقل حرفی نہیں کر سکتے۔ اور یہ نقل حرفی کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ بہت سے حروف کی آوازیں ایسی ہیں جن کے لئے رومن حروف کی آوازیں متبادل نہیں ہو سکتیں۔

Professor Aftikhar Ajmal Shaheen,
Flate No: 3, Amina Apartments, Block M, North Nazimabad,
karachi 74700, Pakistan

انتخابِ کلام

رکھ دو اے شاہیں اب تیر و کمان
ہے پرندے کی بہت اونچی اڑان
جب کبھی چاہو پھر جگا دینا مجھے
سو رہا ہوں اوڑھ کے لمبی تکان
اب ہوا سے بھی ہوئے محروم ہم
جب سے بننے لگ گئے اونچے مکان
عزم انسانی کے آگے پست ہے
ہے بلندی پہ اگرچہ آسمان
اس کو پہنچائیں گے ہم تکمیل تک
جو لیا ہے دل میں ہم نے اپنے ٹھان
خونِ دل سے کشت یہ ہوگی ہری
شاعری کو اس قدر آساں نہ جان
زیست ہے اپنی مسائل میں گھری
روز ہوتا ہے نیا اک امتحان
سحر آگیں ہوتی ہے کتنی سحر
صبح دم سنتا ہوں شاہیں جب اذان

حرف جب چاپ تری ہوگی سرِ منزلِ شب
صبح کی آنکھ میں افسانے کہاں سے آتے

شاہین

۱۲ مئی ۲۰۰۱ء
آٹوا ۔ کینیڈا

سید ولی عالم شاہین

آٹوا، کنیڈا

ٹورنٹو، کنیڈا میں میر انیس پر سیمینار اور مشاعرہ تھا۔ اطہر رضوی صاحب اس کے کرتا دھرتا تھے۔ اسی موقع پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نابغۂ روزگار کتاب ''تجزیہ یادگار مرثیہ'' کا افتتاح بھی ہونا تھا۔ یہ کتاب کئی برسوں کی کوشش اور عرق ریزی کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے تیار کی تھی۔ اطہر رضوی صاحب کے معاونین میں شاہد ہاشمی بھی تھے جن کو خواہش پر میں بھی اس سیمنار، افتتاحی تقریب اور مشاعرے میں شریک ہوئی۔ میں جب بھی ٹورنٹو جاتی ہوں شاہد اور ان کی اہلیہ سیما ہاشمی میرے میزبان ہوتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے لانے اور واپسی میں ایئرپورٹ پہنچانے تک وہ مجھ پر محبتیں نچھاور کرتے ہیں اور پھر اب تو ڈاکٹر تقی عابدی اور ان کی اہلیہ گیتی بھی اس خواہش میں شامل ہوگئے ہیں۔

اسی مشاعرے میں ولی عالم شاہین بھی بیگم کے ساتھ تشریف لائے تھے اور شاہد ہاشمی کے گھر مقیم تھے۔ رات گئے تک محفلیں جمتیں اور علمی و ادبی گفتگو کے ساتھ پر لطف لطائف کا دور بھی چلتا۔ شاہین صاحب کے ساتھ جنھوں نے محفلیں جمائی ہیں انھیں معلوم ہے کہ گفتگو میں وہ علم کا دریا بہاتے ہیں۔

ہماری محفل میں گفتگو کا موضوع اردو زبان تھی۔ کسی نے کہا کہ مادری زبان بہترین ذریعہ اظہار و ابلاغ کا ہے۔ اس پر شاہد ہاشمی نے کسی سے سنا ہوا یا کہیں پڑھا ہوا ایک واقعہ یوں بیان کیا۔ ''

ترکی کے صدر کے دورۂ پاکستان کے موقعہ پر ایک صاحب ترجمان کے فرائض انجام دے رہے تھے اور انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ صدر ایوب کا زمانہ تھا۔ دونوں صدور ڈھاکہ سے گزر رہے تھے کہ صدر ترکی نے ترجمان سے پوچھا، آپ اپنی قومی زبان اردو کو چھوڑ کر انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنانا کیوں پسند کرتے ہیں؟ ترجمان نے یہ سوال صدر ایوب کی طرف منتقل کرنا چاہا تو صدر ترکی نے مداخلت کی اور کہا کہ میں یہ سوال آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ فاضل ترجمان نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی کہ دراصل مغربی اور مشرقی پاکستان کی علاقائی زبانیں الگ الگ ہیں جن کو قومی سطح پر بولا اور سمجھا نہیں جاسکتا۔ اس لئے ہم نے انگریزی کو مشترک ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ صدر ترکی اس پر مسکرا دیئے مگر ان کی زیر لب مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ ترجمان صاحب نے لطیفہ خوب گھڑا ہے"۔

اور اب، تب سے اب تک یعنی ۱۹۶۵ء سے ۲۰۰۲ء تک ہم نے اردو کو کہاں پہنچایا ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ حد یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ کو تو چھوڑیئے، خود پاکستان میں ہماری نئی نسل کو اردو زبان سے کتنی محبت رہ گئی ہے، لیکن ایسا کیوں ہے؟ یہی سوال میں نے سخنور پنجم کے لئے شاہین سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

شاہین کہنے لگے.. "امریکہ اور یورپ میں پروان چڑھنے والی نئی نسل اردو سے اس لئے بیگانہ ہے کہ اردو اس کی ضرورت نہیں۔ البتہ بعض اردو داں والدین شعوری طور پر اپنے بچوں کی تربیت میں ثقافتی ورثے کے تحفظ کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ناسازگار حالات کے باوجود اردو اپنی شریانوں میں دوڑتے سیال کے بل بوتے پر پھول پھل رہی ہے۔ میرے نزدیک اس کا مستقبل تابناک ہے۔ دراصل ہمارے ہاں ایک غلامانہ ذہنیت درپے آزار ہے اور ہمیں اسی ذہنیت کا سدِ باب کرنا ہے۔ زبان سے روزگار کی وابستگی اس کے فروغ میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہوتی ہے۔ اردو کی تعلیم عام، سہل الحصول اور لازمی قرار دی جائے۔ لغات میں نت نئے الفاظ شامل کیئے جائیں۔ علوم وفنون کے ترجمے اور انگریزی کی جگہ اردو کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہماری ساڑھے سات سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری زبان اور ادب کا ورثا ایک بے حد قیمتی ورثہ ہے۔ اس وراثت کو عالمی سطح پر متعارف کرایا جائے۔ بین الاقوامی اداروں میں اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا جائز مقام دلایا جائے۔ ۱۹۹۱ء میں ماریشس میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس کے اختتام پر کئی قراردادیں پیش کی گئی تھیں لیکن اس کا زبردستی گلا گھونٹ دیا گیا جب کہ نومبر ۲۰۰۰ء کے اٹلانٹک منتھلی، جلد ۲۸۶، شمارہ ۵ (AtlanticMonthly, vol.286,No.5) میں باربرا وال راف (Barbara Wallraff) اپنے مضمون 'کونسی عالمی زبان (What Global Language)' میں یوں رقم طراز ہیں:

انگلش کمپنی کے تیار کردہ زبان کے استعمال کے ایک ماڈل کے مطابق، جس کا نام اس کمپنی کے نام پر انگلکور رکھا گیا ہے، اب سے پچاس سال بعد ۲۰۵۰ء میں چینی زبان بولنے والوں کی تعداد ایک ارب اڑتیس کروڑ چالیس لاکھ

ہو جائے گی جب کہ ہندی اور اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد پچپن کروڑ ساٹھ لاکھ ہوگی (تعداد کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر) اور انگریزی بولنے والے پچاس کروڑ اسی لاکھ کے لگ بھگ ہوں گے"۔

شاہین کہہ رہے تھے۔۔۔ "چند مہینے قبل این آر بر مشی گن کی مسجد میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ امام نے جمعہ کا خطبہ پورا کا پورا اردو میں پیش کیا جس کا حق ترجمانی کسی اور شخص نے انگریزی میں ادا کیا۔ زبان کو متعارف کرانے کے ہزار طریقے ہیں۔ اردو کی مخاصمت ہندی یا انگریزی کسی سے نہیں۔ البتہ متعصب ذہنیت ہر کہیں موجود ہے"۔

اسی حوالے سے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اردو کا رسم الخط بدلنے کے حامی ہیں؟ شاہین نے کہا۔۔۔ "رسم الخط بدلنے کی تجویز ایک سیاسی ریشہ دوانی ہے۔ اس تبدیلی کی وکالت کرنے والے اردو کی بھلائی نہیں چاہتے۔ اردو کو دیوناگری رسم الخط اپنانے کا مشورہ اسے غیر مؤثر اور رفتہ رفتہ معدوم کرنے کے مترادف ہے۔ صدیوں کے اس سرمائے کی قدر و قیمت کو پرکھنے والے ہی نہ ہوں گے تو اسے پوچھنے والا کون ہوگا۔ اردو کا بے نظیر حُسن اس کے رسم الخط اور آوازوں کا مرہونِ منت ہے۔ اسے ایک فقید المثال گنگا جمنی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ رسم الخط کوئی لباس نہیں کہ جب چاہیں بدل لیں۔ یہ تو زبان کی کھال ہے"۔

اب میں گفتگو شاہین کے بارے میں کرلوں۔

ان کا پورا نام سید ولی عالم ہے اور تخلص شاہین۔ صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں غازی پور نامی گاؤں واقع ہے جہاں ولی عالم میٹرک سرٹیفکٹ کے مطابق ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ لیکن وہ کہہ رہے تھے اصل پیدائش ۱۹۴۰ء کے آس پاس کی ہوگی۔ یہ اسکول میں اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل آتے تھے۔ چنانچہ لگاتار چار جماعتیں چھلانگ مار کر پار کرلیں۔ ان کے اسکول آدرش وِدیالیہ تاراپور کے ایک استاد نے آگاہ کیا کہ کم عمری کے باعث میٹرک کے امتحان میں انہیں شامل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ساتھ ہی میں انہوں نے ایک تدبیر بتائی کہ تاریخ پیدائش بڑھا کر لکھ دینے سے یہ دشواری حل ہو جائے گی۔ لہٰذا ان کے کہنے کے مطابق ۱۱/ جنوری ۱۹۳۸ء اس اعتبار سے ایک مناسب تاریخ تھی۔ چنانچہ بورڈ کا فارم بھرتے وقت یہی تاریخ درج کی گئی۔

شاہین کے والد مرحوم میر نوید علی نہایت خدا ترس، نماز روزے کے پابند، نیک نفس انسان تھے۔ والدہ اور ان کا چھوٹا بھائی ۱۹۴۶ء میں ہندو مسلم فسادات میں مارے گئے۔ ان کا کنبہ ان کی شریک حیات، روشن آرا، دو بیٹیوں، صائمہ اور نغمہ اور دو بیٹوں، فیصل اور کیفی پر مشتمل ہے۔

شاہین کے تعلیمی مراحل غازی پور، تاراپور، ہمری، بختیار پور، بھاگل پور، ڈھاکہ اور آٹوا (کنیڈا) میں طے ہوئے۔ بہار یونیورسٹی سے ایم اے (شماریات) اور کارلٹن یونیورسٹی کنیڈا سے ایم ایس سی (ریاضی شماریات) کی اسناد حاصل کیں۔ چار سال یعنی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک بطور لکچرار مارواڑی کالج، بھاگل پور میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ پاکستان ٹی بورڈ میں ماہر شماریات اور آدم جی جوٹ ملز لمیٹڈ

میں ۱۹۷۱ء تک سربراہ شعبۂ شماریات کی منصبی ذمہ داریاں پوری کیں۔ مناپلی کنٹرول اتھارٹی، اسلام آباد میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۳ء تک اسسٹنٹ ڈائرکٹر شماریات کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۳ء میں ترک وطن کے بعد سے اب تک ان کا آٹوا، کنیڈا میں قیام ہے۔ یہیں مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں میں بیس (۲۰) سال کام کرنے کے بعد انہوں نے منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں پالیسی ایڈوائزر کے عہدے سے ۱۹۹۴ء میں ذاتی وجوہ کی بنا پر قبل از وقت سبکدوشی حاصل کی ہے۔

میں نے پوچھا... شاہین آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا؟

شاہین بولے... ''تک بندی آٹھ نو سال کی عمر میں شروع کردی تھی۔ باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہوا۔ ایک نظم ماہنامہ بانو، دہلی کے ۱۹۵۲ء کے عید نمبر میں میں شائع ہوئی جس کا پہلا بند یہ تھا۔

جلوہ فگن ہلال ہوتا ہے   عید کل ہے خیال ہوتا ہے
زندگی اف یتیم بچے کی   ایک دن ایک سال ہوتا ہے

۱۹۵۵ء میں صوبہ بہار کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ادبی مقابلے میں میری نظم 'دولت' اول قرار دی گئی۔ اور مجھے سید شاہ عذیر منعمی، وزیر جیل و بحالیات کے ہاتھوں 'لی کپ (Lee Cup)' انعام میں ملا۔ ٹی این جے کالج، بھاگلپور کے میگزین میں انعام لیتے ہوئے میری تصویر پورے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں دو اور مقابلوں میں میری نظمیں اول آئیں۔ ۱۹۵۶ء تک میری تخلیقات ماہنامہ 'شاہراہ'، دہلی؛ ہفت روزہ 'آئینہ'، دہلی؛ ماہنامہ 'افکار'، کراچی؛ ماہنامہ 'ماہ نو'، کراچی؛ ماہنامہ 'شاعر'، ممبئی؛ ماہنامہ 'سہیل'، گیا؛ ماہنامہ 'آجکل'، دہلی اور کئی دوسرے رسالوں میں چھپ چکی تھیں۔ دسمبر ۱۹۵۷ء کے ہفت روزہ 'لیل و نہار'، لاہور کے کسی شمارے میں میری دو اور تین مصرعوں کی نظمیں شائع ہوئیں ایک نظم 'انتظار' بے حد مقبول ہوئی اور اسے کئی رسالوں نے نقل کیا۔ اس نظم کے تین مصرعے یہ ہیں۔

رات گئے جب آہٹ سی محسوس ہوئی
ہاتھ بڑھا کر برہمن نے پٹ کھول دئے
آنے والا سرد ہوا کا جھونکا تھا

بعد میں اس خیال کو کئی شاعروں نے اپنی اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ اس زمانے میں ایسی مختصر نظمیں کم لکھی جاتی تھیں۔ اُن دونوں میری تخلیقات شاہین غازی پوری کے نام کے تحت شائع ہوتی تھیں''۔

کیا آپ نثری نظم کے حامی ہیں؟ میں نے دریافت کیا۔

۱۔ بہار کے شہر مونگیر میں ایک پبلک گارڈن تھا جو برٹش راج میں شاید انتظامی امور سے متعلق کسی انگریز کی شخصیت کے نام پر ''لی گارڈن'' کہلاتا تھا۔ آزادی کے بعد اس کا نام ''شری کرشن بھائی باغ'' کردیا گیا۔ شاید اس انگریز کے نام پر یہ انعام قائم کیا گیا ہوگا۔ ورنہ بین الاقوامی طور پر دو ''لی کپ'' مشہور ہیں ایک David Lee کے نام پر میں پریمیر لیگ اسپورٹ میں اور دوسرا Olive Lee کے نام پر عورتوں کی تیراکی کے مقابلوں میں دیئے جاتے ہیں (مرتب)۔

"فرانس میں شارل بولیئر (Charles Baudeliare) نے انیس (۱۹) ویں صدی کے وسط میں اس صنف میں متعدد نظمیں لکھی تھیں۔ ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال کے دوران بھی اسے خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ادب کسی مخصوص صنف کا پابند نہیں ہوتا، یہ طے ہے کہ ہر صنف ادب تخلیق کے لئے یکساں موزوں نہیں ہوتی۔ مجھے اگر نظم کہنی ہو تو نثری پیرایہ اختیار کرنے سے گریز کروں گا۔ لیکن یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ میں نے گیتانجلی اور عالمی شعری ادب کا حصہ نثری ترجمے کی وساطت سے پڑھا اور اسے بھی شاعری گردانا"، شاہین نے بڑے ٹھہراؤ سے جواب دیا۔ پھر اپنی ایک نظم بعنوان "گلاب بکف" سنائی۔ بڑی دل پذیر نظم ہے۔ آپ بھی ضرور پڑھیں۔

بہار کی یہ دل آویز شام، جس کی طرف
قدم اٹھائے ہیں میں نے، کہ اس سے ہاتھ ملاؤں
اور ایک شگفتہ شناسائی کی بنا رکھوں
پھر اپنی خانہ بدوشی کی مشترک لے پر
اسے گلاب بکف خیمۂ جنوں تک لاؤں
کچھ اس کی خیر خبر پوچھوں، اور کچھ اپنی کہوں
کہوں کہ کتنے پت جھڑ کے موسم آئے گئے
مگر ان آنکھوں کی سحر البیانیاں نہ گئیں
کہوں کہ گرچہ عناصر نے تہمتیں باندھیں
جنوں زدوں کی مگر سخت جانیاں نہ گئیں
کہوں کہ ایک ہیں اندیشے سب مرے تیرے
کہوں الگ نہیں جینے کے ڈھب مرے تیرے
کہوں کہ ایک سے ہیں روز و شب مرے تیرے
کہوں کہ ملتے ہیں نام و نسب مرے تیرے
کہوں کہ ازل سے جنوں کا کاروبار اپنا ہے
ہزار جبر ہو کچھ اختیار اپنا ہے

میرا اگلا سوال تھا... آپ نے کن اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

شاہین نے بتایا کہ انہوں نے پابند، معرا، آزاد، سانیٹ (Sonnet)، ٹرزارائما (terza rima) اور اکیسی (ikisi) کے علاوہ ایک مصرعے، دو مصرعوں اور تین مصرعوں کی نظمیں بھی لکھیں۔ نیز بڑی تعداد میں غزلیں تصنیف کیں۔ "رگ ساز" اور "بے نشان" شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ اردو نظموں اور ان کے انگریزی ترجموں پر مشتمل ایک تیسرا مجموعہ "ڈریمس اینڈ ڈیسٹی نیشن (Dreams and Destination)" ڈاکٹر نصرت یار خان نے مرتب کیا جو کنیڈا سے شائع ہوا۔ دو اور شعری

مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ اب تک جن نقادان گرامی نے ان کی شاعری کا محاکمہ کیا ہے ان میں پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جناب رئیس امروہوی، ڈاکٹر انور سدید، جناب افسر ماہ پوری، پروفیسر سحر انصاری، جناب خادم حسین صدیقی، جناب منظر علی خان، جناب اکرام بریلوی، جناب یونس احمر، جناب محمود واجد، پروفیسر عبدالقوی ضیا، جناب فاروق حسن، جناب مناظر عاشق ہرگانوی، جناب شہزاد منظر اور ڈاکٹر نصرت یار خان شامل ہیں۔ تبصرہ کرنے والوں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر سید احتشام حسین، جناب مختار صدیقی (ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگرام 'شیراز' میں)، ڈاکٹر قمر رئیس، جناب سبطِ حسن، جناب رشید امجد، جناب ادیب سہیل، جناب صبا اکرام، محترمہ رعنا اقبال، جناب علی حیدر ملک، جناب اختر پیامی، جناب انور عنایت اللہ، جناب سلطان رشک، جناب راجند سنگھ ورما (آل انڈیا ریڈیو، جالندھر) اور جناب افتخار اجمل شاہین کے علاوہ متعدد ادبا کے نام آتے ہیں۔ شاہین کی بہت ساری تخلیقات کا انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

میں نے ان سے مزید پوچھا... کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے؟ اور شاہین دھیمے لہجے میں بتا رہے تھے... ''ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور ادب ہی صحیح معنوں میں عصری آگہی کا رمز شناس ہوتا ہے۔ انحطاط پزیر معاشرے میں تخلیق کیا جانے والا ادب زوال آمادہ قدروں کا اشاریہ ہوتا ہے۔ آج کا ادب بھی اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت اپنے عہد کا ترجمان ہے''۔

ہم گرم کمرے میں اخروٹ اور بادام کی گریاں ٹونگ رہے تھے۔ چائے بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ تب میری ترجمانی کرتے ہوئے سیما ہاشمی نے کہا... ''شاہین صاحب اپنی زندگی کا کوئی اہم اور یادگار واقعہ سنایئے''۔ شاہین برجستہ بولے... ''واقعات تو بہت سارے ہیں تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ ایک معمولی سے مکالمے پر بات ختم کروں گا۔ تین سال سے کچھ زیادہ ہوا مشرقی انٹاریو بالخصوص آٹوا میں زبردست برفانی طوفان آیا۔ دس دن تک گھروں سے بجلی غائب رہی۔ لوگ بے گھر ہوئے۔ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بجلی کے کھمبے اور ناور تنکے کی طرح بیچ سے ٹوٹ کر گر گئے۔ کئی اشخاص سردی سے اکڑ کر مر گئے۔ منجمد برف سے ڈھکی درختوں کی برہنہ شاخوں پر نکیلے کانچ کے خنجر سے گڑے نظر آتے تھے۔ سانجھ ڈھلے تیرہ و تار خالی مکانوں سے بھری بستیاں آسیب زدہ لگتی تھیں۔ ایک دن میں کار میں اپنی چار سالہ نواسی ثنا کے ساتھ اپنے مکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے اس سانحے کے متعلق اس کا تاثر جاننا چاہا۔ جواب میں ایک بچے کے دل سے نکلا ہوا یہ مختصر سا جملہ... 'درخت بہت اداس لگتے ہیں'، مجھے کئی کتابوں پر بھاری لگا''۔

Mr. W. A. Shaheen,
Post Box 2276, Station D, Ottawa, ONT., K1P 5W4, Canada

انتخابِ کلام

اپنا سودا خود سرِ پیمانہ کر جائے گی شام
آگ سلگاؤ کہ پل بھر میں بکھر جائے گی شام

دیر تک یوں ہی دھواں دیں گی یہ گیلی لکڑیاں
اور پھر آنکھوں میں دکھ کے زہر بھر جائے گی شام

جی میں خوش تھے خیریت سے دن ہوا اپنا تمام
کیا خبر تھی ناگہاں اک وار کر جائے گی شام

آہٹوں پر کان دھرنے والا اب کوئی نہیں
لوٹ کر خالی مکانوں سے کدھر جائے گی شام

یہ نشہ جاناں، جنوں کی رُت میں کم ہوتا نہیں
زلف سے نکلی تو آنکھوں میں اتر جائے گی شام

یوں تو ہے اس کا مقدر کُو بہ کُو آوارگی
آشنا گر مل گیا کوئی، ٹھہر جائے گی شام

اس گلی میں آؤ تو، شاہینؔ چوکس ہی رہو
بے سبب بھی ورنہ پھر الزام دھر جائے گی شام

کیسی ہوائیں تیز تھیں، سارے چراغ بجھ گئے
وہ جو ابھی ہے جل رہا وہ تو دیا ہی اور ہے

صدیقہ شبنم

صدیقہ شبنم

سڈکپ، کینٹ، برطانیہ

واقعی وہ بڑا کڑا دور تھا جب لکھنے پڑھنے کی پابندیاں صرف لڑکیوں پر عائد تھیں جب کہ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کی نہ صرف کھلی آزادی تھی بلکہ اگر زبان سیکھنا چاہیں تو طوائف کے کوٹھے پر بھی جانے کی آزادی تھی۔ تاہم ۱۹۳۰ء کی دہائی میں چند باہمت خواتین نے جہاد کیا اور چپکے چپکے صف آرا ہوئیں۔ اور ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اردو ادب میں یہاں وہاں ان کے خاصے نام نظر آنے لگے۔

نامور شاعر مغنی تبسم کی بہن صدیقہ شبنم بھی ان ہی باہمت خواتین میں سے ہیں جنہوں نے بلاشبہ جہاد کیا۔ شبنم حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو ادب اور اکنامکس میں ایم اے کیئے۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے، تقسیم ہند کے بعد ان کا پورا خاندان ہندو پاک میں بٹ گیا۔

میں نے پوچھا کہ اتنے قدامت پرست ماحول میں انہوں نے شعر گوئی کیسے شروع کی؟ شبنم مسکرائیں۔ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ بڑی دل آویز کہانی ہے۔ اور واقعی اُس دور کی ایک لڑکی کی ادبی جہاد کی کہانی معمولی نہیں ہو سکتی۔ وہ بتا رہی تھیں ... "میرے والد محمد عبد المغنی اور تایا محمد صدیق، دونوں کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ وہ دونوں خود بھی شاعر تھے۔ اس لئے ہمارے گھر میں شعر و ادب کا تذکرہ

کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میرے والد ملازمت کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ سیشن جج تھے۔ جب کہ میرے تایا بنیادی طور پر ایک تاجر تھے۔ مگر دونوں بہت اچھے سخن ور اور سخن فہم تھے۔ گھر میں شعر و شاعری کے ذکر اور مباحثے کی وجہ سے مجھے بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی پروفیسر مغنی تبسم بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ ان کے شعری ذوق کی وجہ سے مجھے بھی شعر لکھنے کا شوق ہوا اور میں نے مصرعے جوڑنے شروع کردیئے۔ گویا کہ میرے شعر گوئی کی طرف مائل ہونے کا اصل سبب میرے گھر کا ماحول تھا۔ میں نے جس وقت شعر کہنا شروع کیا اس وقت میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ گھر میں صرف اپنے بھائی سے ہی شعری موضوعات پر بات کیا کرتی تھی کیونکہ گھر کا ماحول آزادانہ نہیں تھا۔ اس لئے میرے بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر شعر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھنا ہے تو میں اپنے لکھے ہوئے شعر کسی کو نہ سناؤں ورنہ میری کالج کی تعلیم کا سلسلہ بھی بند ہوسکتا ہے۔ میں اس وقت جو شعر لکھتی تھی تو اس پر صرف مغنی بھائی ہی داد دیا کرتے تھے۔ میں شعر کہہ کر اپنے پاس رکھ لیا کرتی تھی۔ مجھے مشاعروں میں جا کر شعر سنانے کی اجازت نہیں تھی۔ مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ میں نے انگلینڈ آنے کے بعد شروع کیا۔ یہاں جس مشاعرے میں پہلی بار شرکت کی وہ میرے مرحوم شوہر حبیب حیدرآبادی نے ۱۹۶۸ء میں نوٹنگھم میں کرایا تھا۔ اور جس میں اکبر حیدرآبادی، شاداں صاحب، عطا جالندھری مرحوم اور سجاد مشی شریک ہوئے تھے۔ ان دنوں میر بشیر صاحب کے ہاں ماہانہ نشست ہوا کرتی تھی۔ ساٹھ کی دہائی میں بی بی سی نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا جس کے میزبان سلیم شاہد تھے۔ اس مشاعرے میں فیض احمد فیض اور میرے علاوہ ایک سکھ شاعر بھی شریک ہوئے تھے۔ اس مشاعرے کے طفیل فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ فیض صاحب میرے پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شخصیت تھے اور ہیں۔ ظاہر ہے ان سے ملاقات میرے لئے ایک بہت بڑی بات تھی۔ پہلی بار جب میں ان سے ملی تو میری ان سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی کیونکہ وہ ویسے بھی خاموش طبع انسان تھے"۔

میں نے دریافت کیا... "کیا آپ کو اپنے شوہر سے تعاون ملا"؟ صدیقہ نے بتایا وہ خود بھی شاعر اور نثر نگار تھے۔ وہ شاعری کے سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی انہوں نے برطانیہ میں مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ شروع کیا اور یہاں کے ادبی حلقوں میں انہیں ایک شاعرہ کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ صدیقہ کے شوہر نے ان کے پہلے مجموعۂ کلام "تنہائی" کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔

میں نے مزید پوچھا... "ایک نئے ماحول میں آپ کی شاعری میں کیا تبدیلیاں آئیں"؟

"یہ بھی ایک دکھ بھری داستاں ہے" صدیقہ نے اداس ہو کر کہا۔ "جب میں برطانیہ میں آئی تو ابتدا میں مجھے یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بہت افسردہ رہتی تھی۔ ظاہر ہے میں جس ماحول اور معاشرے کو چھوڑ کر آئی تھی وہ اس ملک کے معاشرتی حالات سے بالکل مختلف تھے۔ شروع شروع میں بہت سی

چیزوں کی کمی محسوس کرتی تھی۔ برطانیہ میں میرے ابتدائی دس سال بہت اداسی میں گزرے کیوں کہ جن دنوں ہم یہاں آئے تھے تو پاکستانی یا انڈین لوگوں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی تھیں۔ اس کیفیت نے مجھے بیمار کردیا اور تقریباً دو برس ہسپتال کے چکر میں پڑی رہی۔ اداسی کے ان دس برسوں نے مجھے کچھ لکھنے بھی نہیں دیا۔ بہرحال جب برطانیہ کے ادیبوں اور شاعروں کے آپس میں رابطہ کی صورت نکل آئی تو کچھ گہما گہمی شروع ہوئی۔ اسی دوران اردو شاعری کی کتابیں بھی برطانیہ آنے لگیں۔ ہم نے نوٹنگھم میں ایک اردو لائبریری بھی قائم کی۔ لائبریری کے قیام سے جب ادیبوں اور شاعروں کو کتابیں پڑھنے کا موقعہ ملا تو انہیں لکھنے کی تحریک بھی ملی۔ گویا اردو لائبریری کے قیام اور میر بشیر صاحب کے ہاں ماہانہ شعری نشستوں کے انعقاد نے اردو شعروادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا"۔

میں نے صدیقہ سے پوچھا کہ ابتدا میں وہ کن شعرا سے متاثر ہوئیں؟ کہنے لگیں..."میں نے جس وقت شعر کہنا شروع کیئے اس وقت جگر مرادآبادی سے بہت متاثر تھی کیونکہ اس دور میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور ان کا لہجہ ہر نئے لکھنے والے کو متاثر کرتا تھا۔ ان کے بعد مجھے فیض احمد فیض نے متاثر کیا کیوں کہ فیض ہمارے ایم اے کے نصاب میں بھی شامل تھے۔ اسی طرح ناصر کاظمی کی شاعری دل کو بہت لگی کیوں کہ ان کی شاعری اپنی سادگی اور معنویت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جدید شاعروں میں مجھے ظفر اقبال بھی پسند ہیں جو اپنے اسلوب اور انداز میں یقیناً دورِ حاضر کے دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے مختلف ادوار میں کئی شاعروں نے متاثر کیا۔ دراصل جب آپ اردو کے کلاسیکل شعرا سے لے کر جدید شعرا کو توجہ سے پڑھتے ہیں تو آپ کو بہت سے شاعروں کا پیرایۂ اظہار، خیال آفرینی، لفظوں کی بندش اور اسلوب کے مختلف حوالے پسند آنے لگتے ہیں کیوں کہ ہر شاعر کا اپنا خاص اندازِ بیان ہوتا ہے، اپنی خاص انفرادیت ہوتی ہے جو قاری کے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر اُسے متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بہت سے شاعروں کے کلام کا ان کی انفرادیت کی وجہ سے مطالعہ کیا"۔

مغرب میں بسنے والے اور بہت سے شعرا اُدبا کے بچوں کی طرح صدیقہ کے بچے بھی اردو شاعری سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ کہہ رہی تھیں..."میرے بچے میری شاعری پڑھ نہیں سکتے۔ مگر وہ میرے اشعار سن کر خوش ہوتے ہیں۔ میرے بڑے بیٹے کا، جو امریکہ میں رہتا ہے، تعلق گو انگریزی ادب سے ہے مگر وہ اردو بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس لئے وہ میری شاعری کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور یہ مسئلہ برطانیہ میں پروان چڑھنے والی ہماری نسل کا ہی نہیں ہے بلکہ مجھے انڈیا اور پاکستان سے جن عزیز رشتہ دار نوجوان بچے بچیوں کے خط آتے ہیں وہ بھی انگریزی ہی میں ہوتے ہیں۔ وہاں بھی چند گھرانوں کے بچے ہی اچھی اردو لکھ، پڑھ اور بول سکتے ہیں۔ یہاں برطانیہ میں یہ مسئلہ واقعی گھمبیر ہے کہ ہمارے بچے زیادہ وقت چونکہ اسکول میں گزارتے ہیں اور جب وہ گھر آتے ہیں تو انہیں ماں باپ سے کمیونی کیشن (communication) کا موقع یا وقت نہیں ملتا جس کی وجہ سے وہ اردو زبان نہیں سیکھ پاتے۔

اس کے علاوہ ماں باپ شعوری طور پر بھی اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے پر توجہ نہیں دیتے۔ اور جو شاعر وادیب ہیں انہیں صرف اپنے مشاعروں سے غرض رہتی ہے۔ وہ اس بات پر زیادہ دھیان دیتے ہیں کہ انہیں آئندہ مشاعرے میں کون سی غزل پڑھنی ہے۔ بیشتر لوگ اپنے بچوں کی مثبت تفریح اور ان کی دلچسپیوں کا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے پہلے ان کی اولاد زبان سے دور ہوجاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ان سے بھی دور ہونے لگتی ہے۔ برطانیہ میں اب گنتی کے گھرانے ایسے رہ گئے ہیں جن کے بچے اردو بول، لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ یہ صورت حال یقیناً ہم سب کے لئے لمحہ فکر ہے۔ اگرچہ لوکل کونسلوں کی طرف سے اردو پڑھانے کا انتظام اب پہلے سے زیادہ بہتر طور پر موجود ہے مگر اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں۔ بچوں میں اردو سکھانے اور رائج کرنے کے لئے اردو کے محافظوں کو اجتماعی طور پر کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ جس کا پہلا مرحلہ میرے خیال سے گھر میں بچوں سے اردو بول چال کو فروغ دینا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ہم اس ضمن میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کریں گے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا''۔

صدیقہ نے بتایا کہ برطانیہ کی ادبی تنظیمیں یہاں اردو زبان اور شعروادب کے فروغ کے لئے بہت کام کررہی ہیں۔ ان تنظیموں کی وجہ سے ہی یہاں ادبی سرگرمیوں کی شمع روشن ہے۔ ہر تنظیم اپنی اپنی استطاعت اور وسائل کے مطابق کام کرتی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ اردو مرکز کے زمانے میں لندن میں ادبی سرگرمیوں کو بہت فروغ ملا۔ ویسے بھی افتخار عارف بہت باصلاحیت آدمی اور بہترین منتظم تھے۔ ان کے پاس وسائل کی فراوانی بھی تھی۔ ان کے خیال میں اردو مرکز کی وجہ سے لندن کو اردو کا تیسرا بڑا مرکز کہا جاتا تھا۔ اب اردو مرکز کے بند ہوجانے کی وجہ سے نہ تو یہاں اُس طرح کی تقریبات ہوتی ہیں اور نہ ہی ویسی گہما گہمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ موجودہ حالات میں اردو مرکز کی کمی کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صدیقہ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ضیاالدین شکیب نے ۱۹۹۴ء میں یورپین اردو لٹریچر کانفرنس منعقد کرکے یقیناً اردو زبان کے سلسلے میں ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

میں نے اردو رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ صدیقہ نے بڑے دکھ سے کہا... ''یہ تحریک آخر شروع کیوں کی گئی؟ ہر دس بارہ سال بعد اردو رسم الخط کو بدلنے کی تحریک اُٹھتی ہے۔ اس تحریک سے یہ صورت حال سامنے آئے گی کہ دو گروپ بن کر آپس میں دست و گریباں ہوجائیں گے۔ بھلا جس کو زبان ہی نہ آتی ہو وہ رومن میں پڑھ کر اس کو کیا سمجھے گا۔ سلطانہ صاحبہ رسم الخط کا زبان سے وہی تعلق ہوتا ہے جو جسم کا رُوح سے ہوتا ہے۔ اس طرح کی تبدیلی کے بہت بڑے نقصانات ہیں۔ چھ سو سالوں کا ادب اور متفرق موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ اور بلاشبہ ہم خود اپنی تہذیب کو، ماضی سے کاٹ کر، بے جان کردیں گے۔ اردو کا رسم الخط صوتی اعتبار سے مکمل ہے۔ جس میں سب آوازیں شامل ہیں یعنی عربی آوازیں، فارسی آوازیں اور ہندی آوازیں۔ اس میں برصغیر ہند کی دیگر زبانوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ یورپی زبانوں کی

آوازوں کو سمو لینے کی گنجائش بھی ہے۔ ہاں یہ دلیل مانی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی انفرادی طور پر اپنی ذاتی ضرورت کے لئے اردو کو رومن رسم الخط (یا کسی اور خط) میں استعمال کرلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور یہ بات بھی بتاتی چلوں کہ جناب رالف رسل (۱) نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ جو لوگ ان کے نام سے یہ حوالہ دیتے ہیں وہ غلط بیانی ہے''۔

صدیقہ کے رفیقِ حیات مرحوم حبیب حیدرآبادی کی وفات کے بعد صدیقہ شبنم بہت تنہا ہوگئیں۔ مرحوم کا شعر و ادب سے بہت گہرا تعلق تھا۔ صدیقہ رنج و غم کی کیفیت میں بتا رہی تھیں ''میرے شوہر بہت نفیس اور بامروت طبیعت کے تھے۔ ان کی وفات کے بعد دو سال تک میں شدید ڈیپریشن (depression) کا شکار رہی۔ اور اس دوران میں نے جو شعر لکھے ان میں بھی یہ کیفیت بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس لئے وہ شعر میں کسی کو سناتی نہیں ہوں۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے ڈیپریشن پر قابو پالیا ہے۔ وقت مرہم نہیں ہوتا مگر زندگی کے سفر کو چونکہ جاری رہنا ہوتا ہے اس لئے انسان رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتا کرلیتا ہے۔ تنہائی اپنی جگہ اٹل ہوتی ہے اور حالات انسان کو اس کا عادی بنا دیتے ہیں''۔

Ms. Siddiqua Shabnam,

2 Lyminge Close, Sidcup, Kent, DA14 6RE

انتخابِ کلام

رات آئی تو تری یاد کے جگنو بولے
پھر مری آنکھ میں سوئے ہوئے آنسو بولے

یوں خیالوں میں ترے لہجے کی نرمی آئی
تُو نہ بولے تو تری آنکھ کا جادو بولے

ہے خموشی میں بھی اندازِ تکلم اُس کا
کبھی آنکھیں، کبھی چہرہ، کبھی بازو بولے

رات سُنسان ہے شبنم کسی جنگل کی طرح
کوئی آسیب ہی آئے کوئی جادو بولے

۱۔ رالف رسل صاحب نے A New Course in Hindustani for Learners in Britain اور A New Course in Urdu and Spoken Hindi for learners in Britain میں رومن حروف اور اس کی چند متبادل شکلیں استعمال کی ہیں تاہم انہوں نے کہیں اس بات کی ترویج نہیں کی کہ اردو کا موجودہ رسم الخط رومن ہونا چاہیے اور نہ ہی وہ اس کے داعی ہیں کہ اردو کو رومن رسم الخط اپنا لینا چاہیے (سلطانہ مہر)۔

دل کے نگر میں عمر بھر اک روشنی رہی
کچھ اجنبی سے لوگ تھے آکر چلے گئے
شبنم مناروی 2000-12-19

شبنم مناروی

ریاض، سعودی عرب

شبنم مناروی کا تیسرا مجموعۂ کلام "پنکھڑی اور کائنات" میرے سامنے ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر ان اشعار پر جا ٹھہری ۔

کون کہتا ہے کہ شبنم مر گیا — وہ تو دیوانہ جہاں کو کر گیا
صبح دم چمکا تھا سورج کی طرح — شام جب آئی تو اپنے گھر گیا

اور اس دم مجھے مرحوم علی سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" کے چند شعر یاد آرہے ہیں ۔

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں

... ـــ مر جاتا ہوں

صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں

میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

علی سردار جعفری جب یاد آتے ہیں تو بے شمار یادیں بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ ۱۹۸۶ء کا زمانہ تھا جب ''شاہ بانو'' کا کیس (case) چل رہا تھا کہ اسلامی قانون کے تحت انہیں نان نفقہ کب تک ملنا چاہیئے۔ ہندوستانی قانون کے تحت کیس میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔ علی سردار جعفری شاہ بانو کے حوالے سے اس طرح تنہا چھوڑ دی جانے والی خواتین کو زیادہ سے زیادہ حقوق دلوانے کی بات کر رہے تھے۔ انہی اختلافات کے تحت کچھ شدت پسند مسلمان اُن سے خفا تھے۔ یہ حیدر آباد، دکن کا قصہ ہے جہاں علامہ اقبالؒ کے سلسلے میں سیمینار (seminar) اور مشاعرہ تھا۔ میں بھی مدعو تھی۔ سیمینار میں جب علی سردار جعفری تقریر کر رہے تھے تو دو صاحبان اسکوٹر پر آئے، پنڈال کے دروازے پر اسکوٹر کھڑا کیا اور اسٹیج کی طرف بڑھے۔ جوتوں کا ایک ہار انہوں نے مقرر کے گلے میں ڈالا اور اسکوٹر پر یہ جا وہ جا۔

بدتہذیبوں اور جہلا کی دنیا میں کب کمی تھی۔ احتجاج کے تو کئی طریقے تھے۔ ایک معروف عالم اور دانشور کے خیالات سے اگر ہم متفق نہیں تو بھی یہ حق ہم کو کہاں پہنچتا ہے کہ ہم سرِ عام اس کی توہین کریں یا اس سے بدتمیزی سے پیش آئیں۔

جعفری صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ سادہ دل، پُر خلوص، پُر عزم اور سچائی کا دامن تھامے رہنے والے ایسے لوگ صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔

شبنم مناروی کا رشتہ بھی اپنے قارئین سے ایسا ہی ہے۔ وہ اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں اپنے قارئین سے کہتے ہیں... ''ہر نظم، ہر شعر، ہر حرکت جو شاعری میں در آتی ہے اپنا ایک مخصوص وجود رکھتی ہے۔ شاعر کے الفاظ ڈکشنری کے محتاج اور پابند نہیں ہوتے بلکہ اپنے معانی کی وسعتوں کا تعین اپنی تخلیقی دنیا میں خود کرتے ہیں۔ آج تک جو دریافت ہو چکا ہے اس کا ادراک شاعر کے خلاق رویے سے اپنی نوعیت کا اظہار کرتا ہے۔ تخلیق اپنے اندر نہ جانے کتنے زمانے اور کتنی وسعتیں لیئے ہوئے ہوتی ہے۔ جس طرح تخلیق کو زمانے لگتے ہیں اسی طرح شاعر تک پہنچنے میں بھی زمانے لگتے ہیں۔ سو قارئین! میری تخلیقات کو بھی اسی آگہی، شعور اور احساس سے پڑھیئے، ایک نشست میں صرف ایک تخلیق۔ پھر دیکھیئے 'پنکھڑی اور کائنات' میں آپ کے لئے کیا کچھ ہے''۔

اب آپ ضرور جاننا چاہیں گے کہ شبنم مناروی کون ہیں۔

ان کا پیدائشی نام ہے ملک محمد حسین۔ یکم جون ۱۹۴۰ء کو منارہ، ضلع چکوال، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم اے ۱۹۶۴ء میں کیا اور انگریزی میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ۱۹۷۱ء میں کیا۔ پاکستان میں بارہ (۱۲) سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۷۵ء سے سعودی حکومت کے ساتھ منسلک ہیں۔ کہتے ہیں ''یوں تو پرائمری اسکول کے زمانے میں ہی شعر کہنا

شروع کردیا تھا لیکن پہلی باقاعدہ غزل ساتویں جماعت میں اس وقت کہی جب کراچی سے شائع ہونے والا ایک بے باک اور شدت پسند ہفت روزہ میں پاکستان کی الٹرا ماڈرن (ultra modern) خواتین نے پاکستانی عورتوں کی وکالت کی، ان کی بے حیائی ایک مسلم معاشرے کے لئے باعث شرم تھی۔ یہ میرا ان کے آدرش کے خلاف ایک تخلیقی ردعمل تھا۔ اس غزل کے کچھ اشعار کو میرے خط کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ایک دو شعر یاد ہیں۔

تم عورت ہو، میں مرد مگر دونوں میں ازل سے یارانہ
تخلیق کی پہلی کروٹ تھی آدم سے حوا کا مل جانا
ہر روز کلب میں جاتی ہیں کولھوں کو انہیں ہے مٹکانا
اب تم شبنم خاموش رہو، مت چھیڑو پرانا افسانا

ان ہی دنوں کے ایک دو شعر یہ ہیں۔

دیکھا انہیں تو دفعتاً پہلو سے دل گیا نازک سی ایک شاخ پہ اک پھول کھل گیا
کہنے کو ایک اشک تھا لیکن مرے ندیم سرمایۂ حیات تھا، مٹی میں مل گیا

شبنم نے مزید بتایا ..."میں نے نظم اور غزل، دونوں کو بڑے تواتر سے قبول کیا ہے۔ میرا پہلا مجموعہ 'خوابِ حیات' جولائی ۱۹۶۸ء میں راولپنڈی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 'پانی پہ بہتا پھول' دسمبر ۱۹۸۲ء میں نئی دہلی سے چھپا۔ تیسرا مجموعہ 'پنکھڑی اور کائنات' سیپ پبلی کیشنز، کراچی نے جنوری ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔ اس دوران میں میرا کلام پاکستان اور ہندوستان کے ممتاز ادبی جرائد میں چھپتا رہا، جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

سیپ، اوراق، فنون، شاعر، شب خون، تخلیق، صریر، سخنور، ادب لطیف، اخبار جہاں، الفاظ، اردو نیوز، بادبان، پہچان، تعمیر، جنگ، مورچہ، بیسویں صدی، فلمی ستارے، نیرنگ خیال، نقش، الفتح، قندیل، سحاب، نوائے وقت، لکیریں، اردو زبان، ہلال وغیرہ

ان کے علاوہ انگریزی کے مجلات 'اوراق پوئٹری' لاہور، 'سکائی لارک' علی گڑھ، اور 'سیپ' کراچی نے میری نظموں اور غزلوں کے خود کردہ انگریزی تراجم چھاپے"۔

اردو کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے بتایا..."اردو جدید انسان کے دور جدید میں میل ملاپ سے، بین اللسانی ٹکراؤ سے فطری طور پر عالم وجود میں آنے والی تازہ ترین اور شاید سب سے انوکھی متحرک زبان ہے۔ اردو اپنی وسعت کی بنا پر ہر لب ولہجہ کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا موجودہ رسم الخط ہر قسم کی اصوات پر محیط ہے۔ انگریزوں کے دوران حکومت میں رومن رسم الخط رائج رہا۔ آزادی کے بعد بھی عساکر کو رومن رسم الخط میں اردو پڑھائی جاتی رہی۔ انٹرنیٹ (inter net) کے جدید دور میں جہاں بھی ضروری ہو کوئی بھی رسم الخط استعمال کیا

نوٹ: ۱۹۸۳ء میں 'سخنور' کراچی نے اپنے سرورق پر میری تصویر کے ساتھ شبنم مناروی نمبر چھاپا۔ شبنم مناروی

جا سکتا ہے لیکن اس کا موجودہ خط ہمارے عظیم ثقافتی اور مذہبی ورثے کا امین ہے۔ اگر اس کا رسم الخط تبدیل کر دیا جائے تو اردو کی جدید حیثیت اور اعلیٰ انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ ایک طرف تو اس کے زیادہ حروف اور دوسری طرف زیادہ اصوات کے انجذاب میں نمایاں کمی آنے کا خطرناک خدشہ ہے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات اس کا عربی اور فارسی زبان سے رشتہ ہے۔ قرآن کریم ہماری زندگی اور ہماری روح کا مقدس آئین ہے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی سیرت اور احادیث سے براہ راست ثقافتی رشتہ بھی اسی رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ بھرپور عرب وعجم کے ساتھ بھرپور رشتہ بھی اسی امر کا مرہونِ منت ہے۔ اردو ہماری ثقافت میں اتنی پیوست ہو چکی ہے کہ علاقائی مادری زبانوں والے فن کار بھی اس کو بڑی خوبی سے تخلیقی ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ رسم الخط رومن کرنے سے اردو دان طبقہ کی انگریزی بھی گنڈمنڈ ہو جائے گی"۔

میں نے ان سے کہا... "شبنم صاحب۔ اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ بتائیے"۔ سوچا اور پھر مسکرا کر بولے... "میری زندگی بچپن سے ہی شعور اور لاشعور کی انتہائی شدید کشمکش سے عبارت ہے۔ خوابوں میں چلنا، خوابوں میں اکثر اُڑتے پھرنا اور پھر مافوق فطری مخلوق کے ساتھ جدوجہد میری زندگی کا حصہ ہے۔ بڑے ہی عجیب وغریب واقعات ہیں۔ میرا بچپن ایک پہاڑی گاؤں میں گزرا۔ مناظر فطرت کی کھوج میری عادت اور میں اُن کا ایک جزوِ لاینفک رہا ہوں۔ پیڑ پودے، چٹانیں، چشمے، جانور، پرندے، پھول، تتلیاں میری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ فصلیں اور مویشی مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں۔

پھر انسانوں کے انبوہِ غفیر میری زندگی میں داخل ہوئے۔ گزشتہ ستائیس (۲۷) سال سے مکہ اور مدینہ میں لاکھوں لوگوں کا حصہ، جذب وشوق کی منزلیں، کارواں در کارواں وہی منزلیں وہی راستے... کعبہ اور مسجد نبوی، روضۂ رسولؐ، ان کے اردگرد بدلتے ہوئے مناظر میرے دل ودماغ پر اس طرح چھائے رہتے ہیں کہ کبھی کبھی تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں۔ اللہ کا اتنا کرم ہے حج کی سلور جوبلی (silver jubilee پچیس سالہ جشنِ مسرت یا سالگرہ) منا چکا ہوں۔ مدینہ منورہ میں بھی بار بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ یہی میری زندگی ہے۔ لیجیے 'مدینہ میری منزل' کے عنوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں"۔

گناہوں کے پہاڑوں کو اُٹھائے ناتواں سر پہ
جھکی گردن جھکائے آ گیا ہوں آپؐ کے در پہ
عقیدت ایک جذبہ ہے تو دل معمور ہے میرا
خُدا سے مانگنا چاہوں تو شیشہ چُور ہے میرا
مدینہ میری منزل تھا، مدینہ میری منزل ہے
وہی میرا سمندر ہے، وہی طلبیدہ ساحل ہے

سخنور کو سُخن کی دولتِ کونین مل جائے
خزاں کی زد پہ آ کر بھی دلِ پژمردہ کِھل جائے

کچھ عرصہ قبل ان کی رفیقۂ حیات، ناہید وفات پا گئیں۔ شبنم بہت دل برداشتہ رہے۔ اب ان کی زندگی تین بیٹوں، بہوؤں، بچے اور خاندان کے دیگر افراد کی خوشیوں سے وابستہ ہے۔ فرصت کے وقت میں شعر کہنا زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔

شبنم نظمیں بھی کہتے ہیں۔ ایک نظم بعنوان "نارسائی" پیش ہے۔

جہاں میں ہوں
وہاں سب استعارے نارسائی کی علامت ہیں
ہر اک شے رات کی تاریکیوں سے خوف کھاتی ہے
ستارے بولتے ہیں!!
آدمی خاموش رہتا ہے
(حوالے کے لئے میری پُرانی شاعری دیکھو)
مجھے پھر خواب آور گولیاں لادو
کہ مرنے سے بہت پہلے...
مرے نغمے، میرے کانوں کے پردوں سے نہ ٹکرائیں

○

جہاں تم ہو
وہاں ہر سمت دل کی حکمرانی ہے
بڑی جھوٹی کہانی ہے

شبنم مناروی کے تین مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ احباب اب ان کے چوتھے مجموعے کے منتظر ہیں۔

Mr. Shabnam Manarvi,
P O Box 0317, Riyadh, 11352, Saudi Arabia

انتخابِ کلام

ہجر کی رات کٹی درد کے سائے نہ گئے
وہ میرے شہر میں اک بار بھی آئے نہ گئے

⁂

عشق کی تان پہ گونجے تھے ہزاروں قصے
حُسن کے ساز پہ دو چار بھی گائے نہ گئے

⁂

جن کو سمجھا تھا کبھی رگ و جاں سے بھی عزیز
اُن سے بھی پیار میں پیمان نبھائے نہ گئے

⁂

ڈھل چکا عہدِ جوانی تو تیرا پیار ملا
ہم سے کھنڈرات میں انسان بسائے نہ گئے

⁂

کس قدر گھاؤ تھے جو محو ہوئے وقت کے ساتھ
کتنے ارمان تھے جو دل سے مٹائے نہ گئے

⁂

تم میں جو پیار کے انداز ہیں نیلی چڑیا
وہ کسی بُت، کسی اوتار میں پائے نہ گئے

⁂

نوٹ: ۲۳/ مارچ ۱۹۷۳ء کو ''اخبار جہاں'' کے سرورق پر پہلی بار نئے تعمیر شدہ 'مینار پاکستان' کی تصویر چھپی۔ ٹائیٹل کے اندورن صفحہ پر انتخاب کلام والی یہی غزل میرے سراپا کے ساتھ چھپی تھی۔ تبسم مناروی
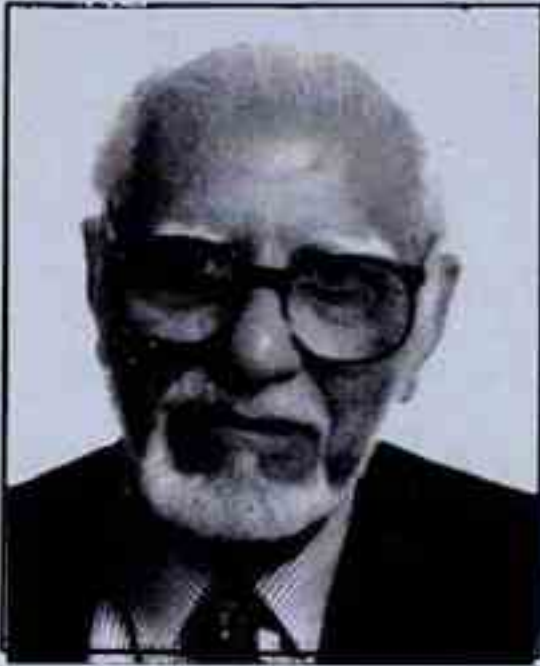
باسمہ ربّی

شمس جیلانی

رچمنڈ، برٹش کولمبیا، کنیڈا

وینکور، کنیڈا میں مقیم شاعر شمس جیلانی کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ان کے دادا جلال الدّین جلالؔ مرحوم صاحب دیوان شاعر تھے۔ اُن کا مجموعۂ کلام ''کلیات جلال'' کے نام سے موسوم ہے اور علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ان کے والد کمال الدّین نے اردو کا ایک اخبار'' الکمال'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔ وہ بھی صاحب دیوان تھے اور شمس کے چچا ڈاکٹر ذکا الدّین شایاںؔ بھی شاعر ہیں۔ ٹورنٹو کے مشہور شاعر جناب حفظ الکبیر قریشی نے جناب شمس کے مجموعۂ کلام کے حوالے سے لکھا ہے...'' شمس جیلانی کا مجموعۂ کلام 'صدا بہ صحرا' کی چند خصوصیات اچھوتی ہیں۔ مثلاً اس کتاب کی قیمت انہوں نے ایک نیکی رکھی ہے۔ نیکی ...چاہے انسان یا حیوان کے ساتھ کی جائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حقوقِ اشاعت انہوں نے انسانیت کے نام وقف کردیئے ہیں۔ ان دو باتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ اردو زبان اور مذہب سے ان کا لگاؤ اور جذبۂ ایثار ہے۔ میرے علم میں یہ پہلی مثال ہے''۔

صوبہ برٹش کولمبیا جیسے دور افتادہ علاقے میں اردو کی شمع جلائے رکھنے میں شمس جیلانی کو جو تگ ودو کرنی پڑی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو برصغیر پاک وہند سے نکل کر کسی دیارِ غیر میں

بس گئے ہوں۔ ایک اجنبی سرزمین کے اجنبی لوگ جن کا معاشرہ الگ، رسمیں الگ اور جن کا رکھ رکھاؤ الگ، تہذیبی وتمدنی میلانات الگ، ایسی سرزمین اور ایسے معاشرے میں کسی نئے پودے کو لگانا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک تو اپنی زبان بولنے والے خال خال اور اگر اکا دکا کوئی مل بھی جائے تو ضروری نہیں کہ وہ ادبی شغف رکھتا ہو۔ ایسے نامساعد حالات میں شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن شمس جیلانی نے یہ کام کر دکھایا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے اردگرد ایک حلقۂ ارباب ذوق بھی پیدا کرلیا اور یوں سلسلۂ شعروشاعری چل نکلا۔

شمس جیلانی ملنگ انسان ہیں، بہت مخلص اور سچے۔ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں ...''میرا نام شمس الدین احمد رکھا گیا تھا۔ یہ نام ایک بزرگ کا عطا کردہ تھا۔ لوگ کہنے لگے کہ یہ نام جلالی ہوتا ہے لہٰذا اُنہوں نے فرمایا کہ نام تو یہی تفویض ہوا ہے۔ تم احمد لگا لو تو جمالی ہو جائے گا۔ میں نے دونوں اثر دیکھے۔ شادی سے پہلے جلالی تھا اور شادی کے بعد جمالی ہو گیا اور جمالی بنانے میں میری بیوی کا بہت ہاتھ ہے۔ اس محنت کے نذرانے کے طور پر میں نے اپنی پہلی کاوش اُن کے نام منسوب کرکے اپنی محبت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا تخلص شمس ڈھکیاوی تھا۔ ڈھکیا زمینداری خاتمہ ایکٹ کے تحت ہندوستان کی حکومت نے چھین لی۔ لہٰذا یہ بخ بھی ختم ہو گئی اور دوبارہ شمس جیلانی کے نام سے ہی لکھ رہا ہوں۔ میں ۱۱/ دسمبر ۱۹۳۱ء کے دن پیلی بھت میں پیدا ہوا جو یوپی، ہندوستان میں ہے۔ تعلیم پہلے تو گھر پر اتالیقوں سے حاصل کی لیکن جب پتے ہوا دے گئے تو ڈھا کہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے چکر بھی لگائے اور کچھ سندیں حاصل کیں لیکن ابھی تک طالب علم ہوں۔ ویسے کونسل آف ہومیو پیتھی حکومتِ پاکستان نے مجھے رجسٹریشن ایچ بی ۱۸۱۵ (HB 1815) دے رکھا ہے جو بہت قدیم ہے۔ اصل میں ہوا یہ کہ میرے دادا نے اپنی بیدار مغزی کی بنا پر زمینداری کا حشر بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا جدید فارمنگ (farming) کی طرح ڈالی اور میرے تایا کو ۱۹۲۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ بھجوا دیا اور میرے والد اور دو چچاؤں کو ڈاکٹر ضیا الدین (مرحوم) کے سپرد کر دیا لہٰذا وہ اپنے ساتھ علی گڑھ اور لندن سے کاشتکاروں کے لئے ہمدردی کا گوشہ لے آئے۔ اور جب دادا نے کاشتکاروں کو بے دخل کرنا چاہا تو وہ خم ٹھونک کر حمایت میں آ گئے اور دادا اپنے خواب لیئے جا سوئے۔ مگر سزا مجھے بھگتنی پڑی کیونکہ اُنہیں خود پڑھا کر جو حاصل کیا تھا وہ دُہرانا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا مجھے گھر پر مقید رہنا پڑا اور ایک عرصہ تک اتالیقوں کے زیرِ مشق رہا۔ ہاں میرے ایک چچا خوش قسمت تھے کہ میرے ہم عمر ہوتے ہوئے بھی علی گڑھ تک جا پہنچے۔ وہ آج کے نقاد اور مشہور شاعر ڈاکٹر ذکا الدین شایاں ہیں جو ابھی تک پیلی بھت میں ہیں۔ حال میں اُنہوں نے اپنا تازہ کلام 'منظر بہ منظر' میرے نام موسوم کرکے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا جس کے لئے میں شرمندہ بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔

میں نے پاکستان میں بھی بہت سے میدانوں میں طبع آزمائی کی اور اب کینیڈا میں بھی وہی

عالم ہے۔ ۱۹۹۵ء میں یہاں کے شہریوں نے کثرت رائے سے اپنوں کو چھوڑ کر مجھے فخر شہر (کمیونٹی اچیور Community Achiever) کا خطاب دیا اور جب سے سزا کے طور پر میری تصویر کمیونٹی کارنر (Community Corner) میں لگی ہوئی ہے۔

لکھنے کی ابتدا میں نے بچوں کے رسالے سے کی۔ پھر بڑے ہونے کے بعد کئی پرچوں کا مدیر معاون بھی رہا۔ نسیم انہونوی صاحب مرحوم سے یاد اللہ تھی لہٰذا اُن کے زنانہ رسالے ''حریم'' میں بھی لکھتا رہا۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ میرا پہلا شعر یہ ہے:

لکھا جو حق تھا پورا تمام ہو کے رہا

عزیز مصر کا یوسف" غلام ہو کے رہا

آخری دفعہ ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ کے مشاعرہ میں پڑھا تھا جب اختر لکھنوی مرحوم انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس کے بعد فکر معاش میں ایسا پھنسا کہ یہاں کے دوستوں نے چند سال پہلے ہوش دلایا کہ یہ بھی پیغام دینے کا ایک ذریعہ ہے جس کا تفصیلی ذکر میں نے 'صدا بہ صحرا' میں کر دیا ہے۔ اور آج کل اقبالؔ اور حالیؔ کا چربہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں، پر کہاں وہ اور کہاں میں۔ جو کچھ ۱۹۵۲ء تک کہا تھا ہو گیا ہے پہلا مجموعۂ کلام یہی 'صدا بہ صحرا' ہے، جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ جس کی قیمت ایک نیکی ہے اور جملہ حقوق عوام کے نام محفوظ ہیں کیونکہ میرا مشن انسانوں کی خدمت، اسلام کی خدمت اور ادب کی خدمت ہے۔ البتہ ایک کتاب ہندی میں بھی ہے 'اتم ہے انسان'۔ وہ بھی ساتھ ہی چھپی تھی۔ اُس کے دیباچہ میں پنڈت دیویدی جی نے 'سفیر انسانیت' کا خطاب دے ڈالا۔ اسے شاعری ہی سمجھیں۔

میری رائے میں تراجم کے لئے نثری نظم کی صنف بہتر ہے۔ لیکن جو مزہ غزل میں ہے وہ کسی صنف میں نہیں۔

اردو زبان کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اسے کبھی کسی بادشاہ کی سرپرستی نہیں رہی۔ اگر بہادر شاہ ظفرؔ کا نام لیں لیکن وہ دور ہی کتنا تھا اور سلطنت اَز دلی تا پالم تھی۔ مگر اردو پھیلتی گئی کیونکہ یہ عوام الناس میں دارجلنگ سے لے کر راس کماری تک مواصلات کا ذریعہ تھی اور آج بھی ہے، چاہے دیوناگری رسم الخط میں لکھیں یا عربی میں یا فارسی میں لکھیں یا رومن میں لکھیں۔ یہاں رومن میں بھی ضروری ہوگی کیونکہ نئی نسل اردو رسم الخط سے نابلد ہوتی جا رہی ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اردو میں ہمارا مذہبی سرمایہ اور حصہ اتنا ہے کہ خود عربی میں بھی نہیں ہے کیونکہ عربوں کو ترجمہ اور تفاسیر کی اتنی ضرورت ہی نہیں تھی جتنی ہمیں تھی۔ چنانچہ پہلی تفسیر بھی ایک سندھی عالم نے عربی میں کی تھی۔ وہ ابھی بھی ہمیں عجمی سمجھتے ہیں۔ شاید ہوں بھی۔ اُس کا ثبوت عرب لیگ، عرب قومیت اور عرب تحریک ہیں حالانکہ ہم ابھی تک اسلامی قومیت کی بات کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہترین ترجمان ہے؟ میرا جواب ہے یقیناً۔ کیونکہ جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ غزل میں اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکتے اور اگر کہیں گے تو اساتذہ اس قدر کہہ گئے ہیں کہ کسی کا چربہ ہی معلوم دے گی۔ ورنہ آپ کو مشکل الفاظ کا سہارا لینا پڑے گا اور وہ عوام کے سر پر سے گزر جائے گی کیونکہ اردو کی فہم روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ جب کہ نظم کا میدان ابھی وسیع ہے اور حالات حاضرہ کی ترجمانی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ادب ہمیشہ سے اپنے دور کا ترجمان رہا ہے۔ شاعر جو دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ گھاٹے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے بولنے والے، لکھنے والے گھاٹے میں نہیں رہے۔

میں سب سے زیادہ اقبالؔ اور مولانا حالیؔ سے متاثر ہوں اور میرا انداز داغؔ کے قریب ہے۔ زندوں میں بھی کچھ سے متاثر ہوں مگر نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ گروپ بندی کا ٹھپہ لگوانا نہیں چاہتا ورنہ آپ کا نام بھی اُن میں لکھتا آپ نے بھی اردو کے لئے یہاں بہت کام کیا ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ بلکہ یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔

میری زندگی کے یادگار واقعات ویسے تو بہت سے ہیں مگر ایک یاد آ رہا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ۱۸/ ستمبر کو میری شادی تھی۔ میں ہندوستان گیا تو ایک صرّاف کے پاس چلا گیا۔ مجھے کچھ زیورات چاہیئے تھے۔ میں ایک عزیز کو اپنے ساتھ لے گیا اور صرّاف سے کہا کہ یہ آپ کے پاس بیٹھے رہیں گے میں جب تک یہ دکھا کر لاتا ہوں۔ کہنے لگا، 'یہ کیوں؟ کیا میں آپ کو جانتا نہیں ہوں'؟ میں نے کہا، 'تمہیں معلوم ہے کہ میں پاکستان چلا گیا ہوں'۔ کہنے لگا، 'ہاں! مگر میں آپ کے باپ دادا کو جانتا ہوں، مہربانی کر کے میری بے عزتی نہ کریں، جو آپ چاہیں لے جائیں اور جو خریدیں رکھ لیں باقی واپس کر دیں'۔ دکاندار کا مجھ پر جو اعتماد تھا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اور یہ دوسرا واقعہ اس کی ضد ہے۔ اس کا مجھے سندھ، پاکستان میں تجربہ ہوا۔ دکان دار مہاجر تھا۔ پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان کا مالک تھا۔ مجھے ایک شیٹ کاغذ درخواست لکھنے کے لئے چاہیئے تھی۔ میرے پاس پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ وہ کہنے لگا، 'میرے پاس کھلا نہیں ہے'۔ میں نے کہا، 'اچھا تم کاغذ دے دو میں ابھی واپس آ کر تمہیں پیسے دے جاؤں گا'۔ کہنے لگا، 'کاغذ رکھ جایئے جب پیسے لے آئیں تو لے جایئے گا'۔ میں نے کاغذ رکھ دیا اور میری آنکھیں اُس واقعہ کو یاد کر کے بھر آئیں۔ ہجرت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم نے اپنی ساکھ کھو دی جو صدیوں پرانی تھی۔

چونکہ آپ نے فون پر حکم دیا تھا کہ آپ کے پاس جو منارت (Minarat) کا انگلش ورژن ہو ز ہو (English version Who's Who) ہے اُس کو اردو میں منتقل کر کے بھیج دوں تو یہ تعمیل کر رہا ہوں۔ تقریباً اسی مضمون کو 'ترجمان، ٹورنٹو' نے بھی حال میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ اُس کو مختصر کر کے نیچے رقم کر رہا ہوں۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ:

'میں ایک عملی مسلمان ہوں۔ تقویٰ پر یقین رکھتا ہوں۔ تمام مسائل کا حل قرآن اور سنت

میں ڈھونڈتا ہوں اور عمل کرتا ہوں۔ خدمت انسانیت میرا مذہب ہے۔ اور میرے خیال میں ہر مذہب اسی لئے بنا ہے۔ میں صرف محبت کرتا ہوں۔ نفرت نہ میں نے سیکھی ہے نہ صلاحیت ہے۔ الحمد اللہ میں نے پوری زندگی کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا۔ لہٰذا میں ہندوستان میں پاکستان میں اور اب کنیڈا میں انسانیت کی خدمت کرتا رہا اور کر رہا ہوں۔ یہ ہی میری زندگی کا مشن ہے۔ ۱۹۹۵ء میں رچمنڈ نے کمیونٹی اچیور (Community Achiever) کا اپنا خطاب مجھے عطا کیا تھا جو کہ لوگوں کی کثرت رائے کی بنا پر تھا۔ رچمنڈ نیوز (Richmond News) نے لکھا تھا کہ 'انسانوں کی خدمت اُس کی زندگی کا مقصد ہے'۔ اُس پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ کامیاب رہوں۔

اس وقت میں اوتھ کمشنر (Oath Commissioner) ہوں۔ سینئر ایڈوائزری کونسل رچمنڈ کارپوریشن (Senior Advisory Council Richmond Corporation) کا ممبر اور سینئر سٹیزن کونسل (Senior Citizen Council) وزارت صحت کی طرف سے ہوں۔ گریٹر وینکور کی ٹرانسپورٹ ایڈوائزری کمیٹی (Greater Vencover Transport Advisory Committee) کا بھی ممبر ہوں۔ پہلے صوبائی جیل خانہ جات اور رچمنڈ ہیلتھ بورڈ کی پلاننگ کمیٹی (Richmond Health Board Planning Committee) کا ممبر اور میونسپل کارپوریشن کی متعدد ایڈوائزری کمیٹیوں کا ممبر رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک درجن سے زائد خدمتِ خلق کے اداروں میں محرک ہوں اور کنیڈا اردو ایسوسی ایشن کا صدر اور ہندی کا سکریٹری ہوں"۔

اگلے صفحے پر ان کی ایک حمد اور نعت انتخاب کلام میں ملاحظہ ہو

Mr. Shams Jilani

11260 Blundell Road, Richmond, BC, V6Y 1L3 , Canada,

انتخابِ کلام

حمد

دل میں مقیم تو یا تری آرزو رہے — تو سامنے بھی ہو تو تری جستجو رہے
بلبل سے بات ہو یا چمن کے طیور سے — کوئی بھی ذکر ہو تری گفتگو رہے
دل پاک ہو زباں ہو، بس ہو خیال پاک — مومن کو کب روا ہے کبھی بے وضو رہے
سوچوں میں تو رہے تو خوابوں میں تو مکیں — وردِ زباں ہو ذکر سدا تو ہی تو رہے
خشیتِ ایزدی کا تقاضہ زباں ہو بند — آنکھیں ہی نم رہیں کہ چمک ہو نمو رہے

معدوم شمسؔ ہو یہ ستارے عدم وجود
سر پر رہے جو عرش، مری آبرو رہے

☆☆☆

نعت

خدا کے بعد تمہاراؐ جو نام لیتے ہیں — زمامِ وقت کو دیکھا ہے تھام لیتے ہیں
دیار ہند ہو یا کہ دیار نیل و فرات — مقام قیصر و کسریٰ غلام لیتے ہیں
رہِ وفا میں جنوں ہی رہی مری منزل — بھٹک رہے ہیں خرد سے جو کام لیتے ہیں
عروجِ عشق ہی رد حجاب ہوتا ہے — جواب آتے ہیں جن کے سلام لیتے ہیں
اگر ہو عشقِ محمدؐ تو بات بنتی ہے — خدا کا نام تو بندے تمام لیتے ہیں
جمال دوست وہ ہجر و وصال کے قصے — لبوں کو آئیں تو ہونٹوں کو تھام لیتے ہی

یہاں تو پائی تھی تا عمر تشنگی ہم نے
چلو اے شمسؔ کہ کوثر سے جام لیتے ہیں

☆☆☆

مصطفیٰ شہاب

ہیرو، مڈل سیکس، برطانیہ

یہ دسمبر ۲۰۰۲ء کے کسی دن کی بات ہے۔ میں نے مصطفیٰ شہاب کو لندن ٹیلی فون کیا۔ جو ایک کام ان کے سپرد کیا تھا اس کی یاددہانی کی۔ بھلے آدمی ہیں۔ فوراً معذرت کرلی کہ تاخیر ہوگئی۔ لیکن مصطفیٰ شہاب سے پہلے ایک خاتون نے ٹیلی فون اٹھایا تھا۔ میں نے نام پوچھا۔ انہوں نے بتایا "شاہ رُخ"۔ مزید گفتگو سے پتا چلا کہ وہ مصطفیٰ کی اہلیہ ہیں۔

آج جب مصطفیٰ کا تعارف لکھنے بیٹھی تو ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "شام ڈھلے سویرا" کھولا۔ انتساب کے صفحے پر لکھا ہے "شاہ رُخ کے نام..." مجھے یاد آگیا ایک مصنف نے اپنی کتاب کے انتساب میں لکھا تھا "پیاری بیوی کے نام... جس کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ کتاب مکمل ہوگئی"۔

مگر مصطفیٰ پر ایسی کچھ نہیں بیتی کہ انہوں نے شاعری ہی چھپن (۵۶) سال کی عمر میں شروع کی یعنی ۱۹۹۲ء میں پہلی غزل کہی۔ اور پھر ان کا پہلا مجموعہ "شام ڈھلے سویرا" جنوری ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اسی لئے ان کے پیارے دوست راشد آذر نے لکھا ہے اور درست لکھا ہے... "ستاون (۵۷) سال کی عمر تک کے جو تجربے ان کے دل و دماغ میں جذباتی اظہار کا وسیلہ ڈھونڈ رہے تھے تازہ شعری اظہار کی صورت میں لاوے کی طرح بہہ نکلے۔ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء کی تین سال کی قلیل مدت میں مصطفیٰ شہاب نے چار چھ نظمیں اور تقریباً ایک سو

غزلیں کہی ہیں۔ مصطفیٰ اور شہاب ایک جسم کے دروں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور یہ دو شخصیتوں کا تضاد ایک دوسرے سے مختلف بھی ہے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر کبھی کبھی دونوں کو ایک دوسرے میں ضم بھی کر دیتا ہے۔ شہاب ایک بچہ ہے، جوان ہے اور ا ٹینیز عمر کا بھی ہے اور آنے والی عمر کا شعور بھی رکھتا ہے۔ مصطفیٰ ایک کاروباری شخصیت ہے، جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا تجربہ بھی رکھتی ہے اور ان سے نمٹنا بھی جانتی ہے۔ لیکن ان تلخ تجربوں کے اظہار کا سلیقہ نہیں رکھتی۔ اس لئے اس نے یہ کام شہاب کے سپرد کر رکھا ہے۔ خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ شہاب مصطفیٰ کے تجربوں کے خزانے سے جو ہاتھ لگے اُٹھا لیتا ہے اور ان کو جذباتی اظہار کی جلا دے کر اس فن کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے یہ مال مصطفیٰ کا ہے یا شہاب کا"۔

راشد آذر نے مصطفیٰ کا کلام پڑھا اور پھر دوست ہونے کے ناطے وہ ان کے صبح و شام سے بھی واقف ہیں۔ اس لئے راشد آذر کا تجزیہ غلط نہیں۔ شہاب کا کلام خود اس تجزیے کا گواہ ہے۔ یہ چند شعر دیکھیئے۔

روشن نہیں تو کیا مری دہلیز پر دیا — جل کر بجھے دیے کا دھواں راستے میں ہے

ہے زندگی میں ہر اک راز کائنات — ہر ایک راستے کا نشاں راستے میں ہے

اور

بات ہو محرومیوں کی، اور ہو تو کس کی جب — ایک بچہ ماں کی انگلی تھام کر روتا ملے

دو گھڑی رُک کر سفر کا اپنے کر لینا حساب — تھک کے جب کوئی مسافر چھاؤں میں سوتا ملے

اپنی کشتی سر پہ رکھ کر چل رہے ہیں ہم شہاب — یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے موڑ پر دریا ملے

شہاب کے پہلے مجموعے میں غزلیات ہیں۔ جناب مغنی تبسم نے انہیں مشورہ دیا کہ نظمیں بھی کہیں۔ اور شہاب نے خوب خوب نظمیں کہیں، وارداتی نظمیں، تجرباتی نظمیں اور بھرپور کہانی سے مرصع نظمیں۔ وہ گفتگو بھی ایسی ہی کرتے ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات لندن میں ساقی فاروقی کے گھر ہوئی۔ ۱۳/ ستمبر ۲۰۰۲ء کے بادلوں اور ہلکی رم جھم سے آراستہ دن جب ساقی فاروقی نے مجھے اور اپنے چند دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ یشب تمنا، ارشد لطیف، عدیل صدیقی، جتندر بلو، ڈاکٹر جاوید شیخ، مصطفیٰ شہاب اور اسلام آباد کے شاعر غضنفر ہاشمی کی خوش گپیوں میں چند گھنٹے یوں گزر گئے جیسے بارش کی بوندیں انگلیوں کے پوروں سے پھسل جائیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ مصطفیٰ شہاب کی گفتگو میں شعریت بھی تھی اور شعور بھی تھا۔ وہ اردو زبان و ادب کے پرستار کی حیثیت سے ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کا جریدہ "شب خون" دوستوں میں مفت تقسیم کرتے ہوئے انہیں تحریک بھی دلا رہے تھے کہ وہ اس جریدے کی سرپرستی کریں۔ اسی دن انہوں نے مجھے اپنے کلام کے دو مجموعے بھی عنایت کیئے۔ دوسرا مجموعہ کلام "سفر آمادہ" نومبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جسے شہاب نے اپنے تمام دوستوں کے نام منسوب کیا ہے کہ ان دوستوں کے بغیر وہ زندگی کا تصور نہیں کر سکتے۔

اسی مجموعے میں افتخار عارف نے لکھا ہے... "شہاب کو موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔ وہ موسیقی کو حل کر کے اپنے مصرعوں کا آہنگ بناتے ہیں۔ بہت سے مصرعے حد سے زیادہ تازہ اور جدید ہیں"۔ اس بات کو ساقی نے بڑی گھن گرج سے یوں لکھا ہے... "میں پینتالیس (۴۵) برس سے یہی ڈھول بجا

رہا ہوں کہ اپنا لکھو، اپنا سوچو۔ گھڑے گھڑائے استعاروں اور تشبیہات پر قناعت مت کرو۔ تمام عمر ایک ہی صبح، ایک ہی مقتل، ایک ہی قاتل پر وقت مت ضائع کرو۔ یوں محسوس ہوتا ہے میرے طبل، نقارے اور دمامے کی آواز مصطفیٰ تک پہنچی ہے۔ ان کے ہاں ایک ایسی معصومیت ہے جو ان کی شخصیت کی پرچھائیں ہے۔ انہوں نے زبان کو سیکھا ہے اور اس میں اپنی شخصیت کی تازگی بھر دی ہے''۔

ساقی کی یہ بات سو فی صد کھری ہے۔ مصطفیٰ شہاب کی ایک بڑی دل کش نظم ''منتظم انتشار (organised chaos)'' اس کا ثبوت ہے۔

کہا جاتا ہے
جنگل کی بہت آزاد دنیا ہے
وہاں ہر کوئی اپنے ہی لئے جیتا ہے، اپنی ہی بقا ملحوظ رکھتا ہے
پرندے ہوں چرندے ہوں
گھنیری گھاس ہو، بیلیں ہوں، پودے ہوں، قد آور پیڑ ہوں
ندی ہو نالے ہوں
کہ ہر جانب سے سرکنڈوں نے اپنے سر نکالے ہوں
جہاں بھی، جس قدر، جس کو جگہ مل جائے اس کی ہے
وہ اپنی ہی جگہ میں پھیلتا، مضبوط ہوتا ہے

☆☆☆

جہاں ہم لوگ رہتے ہیں
ہمارے لان کا سبزہ ذرا سر اُٹھاتا ہے تو اپنا سر گنواتا ہے
کبھی جو اونچا نیچا صحن کا حصہ، کسی برسات میں
اک جھیل کے مانند بھرتا ہے، تو مالی اس جگہ مٹی بچھا کر
صحن کو ہموار کرتا ہے
چنبیلی کی کوئی بے باک الھڑ بیل
اُٹھ کر ناشپاتی کے درختوں پر لٹک کر جھولنا چاہے
تو اس کو ٹوک دیتے ہیں... پھر اس کی نرم باہیں موڑ کر
ایک بدنما دیوار کا پردہ بنا کر
اس کو، اس کی سرکشی سے روک دیتے ہیں
پرندے اڑتے اُڑتے حرص میں جب موسمی پھل کے درختوں پر اُترتے ہیں
تو کچھ ناداں شکاری ان پرندوں پر نشانے ٹھیک کرتے ہیں
کہیں بچوں کی جیبوں میں چھپی، ماچس کی ڈبیاؤں میں

جھونپڑے، بھون بھناتے ہیں
کہیں کچھ لوگ رنگین تتلیوں کا خوش نما البم بناتے ہیں

☆☆☆

میری بیوی نے کل مجھ سے شکایت کی
کہ بیٹا آج کل کھیلوں میں سارا دن گنواتا ہے
اسے اک ڈاکٹر بننا ہے
اور بیٹی کتابوں، ڈگریوں میں غرق رہتی ہے
اسے گھر بھی بسانا ہے
ذرا بچوں کو سمجھاؤ...

دیکھا آپ نے کس قدر مؤثر نظم ہے اور انسان کی ذاتی آزادی کی علم بردار بھی۔ آیئے اب ذرا مصطفیٰ شہاب سے ان کے بارے میں ان کی زبانی سنیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا پورا نام مصطفیٰ علی خان، تخلص شہاب اور جائے پیدائش حیدرآباد دکن ہے۔ تاریخ پیدائش بتانے میں انہوں نے اوروں کی طرح تکلف نہیں کیا جو ۸ / مئی ۱۹۳۶ء ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ اردو ادب سے دل چسپی ان کے اچھی طرح ہوش سنبھالنے سے شاید پہلے سے رہی ہو، تاہم انہوں نے پہلی غزل ۱۹۹۲ء میں بعمر چھپن (۵۶) برس کہی۔ اور تیسرے سوال کے جواب کو یہاں مدغم کرتے ہوئے کہا... "پہلے صرف غزلیں لکھیں۔ اب غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھتا ہوں۔ نثری نظم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ خود اچھی نثر لکھنا ہی بے حد مشکل کام ہے کجا نثری نظم۔ مجھے صرف عذرا عباس اور گلزار کی نثری نظمیں پسند ہیں"۔

چوتھا سوال سن کر ایک گہری سانس لی اور گویا ہوئے... "اس بات کا اطمینان ہے کہ کم از کم خود کو جان جانے تک اردو جاننے والوں کے درمیان زندہ ہوں اور اردو بول رہا ہوں، پڑھ رہا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ اور اسی لئے بڑی پُر لطف زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر اردو کی موت کے بجائے اس کو رومن رسم الخط کے لائف سپورٹنگ سسٹم (life supporting system حیات کفیل نظام) پر رکھا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کم از کم آنے والی نسلیں غالب، میر، فیض اور اقبال سے واقف اور مستفید ہو سکیں گی۔ جو حضرات اور خواتین اس کی مخالفت کرتے ہیں انہوں نے کیا اپنے بچوں کو اردو پڑھائی ہے یا وہ کتنے اردو کے رسالے اور کتابیں ہر ماہ خرید کر پڑھتے ہیں؟ ہاں ان چند گنے چنے لوگوں کو جن کی روزی آج بھی یہ بے چاری اردو مہیا کر رہی ہے انہیں ضرور رسم الخط بدلنے پر اعتراض ہوگا"۔

میں نے پوچھا... "نظم اور غزل میں سے کون سی صنف احساسات کی بہتر ترجمان ہے"؟ جواب ملا... "اگر احساسات کی بات ہے تو شاعر کو کہنے کا سلیقہ آنا چاہیئے۔ نظم اور غزل، دونوں ہی میں بہت گنجائش ہے"۔ شہاب کو صرف اچھے شعر اور نظموں نے متاثر کیا ہے، چاہے وہ کسی کے بھی ہوں۔

اپنے یادگار واقعے کے متعلق شہاب نے کہا۔ "اب تو وہ یادوں کے سب سے نچلے، اندھیرے اور ٹھنڈے تہہ خانے میں شاید ایک مبہم سے احساس کے دھوئیں کی شکل میں قید ہو۔ پہلی بار اچانک، ایک معجزے کی طرح اس دنیا میں اپنی آنکھیں کھولنا... اور پھر رونا..."۔

مگر میرے خیال میں یہ واقعہ بھی کم دلچسپ نہیں جو مصطفیٰ شہابؔ نے سنایا اور ان کی کتاب "شام ڈھلے سویرا" میں یوں درج ہے کہ ان کے ایک عزیز دوست اور ممتاز شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام کی رونمائی لندن میں منعقد ہوئی۔ اس دور کے عظیم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی اس جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ ان کے دوست کی کتاب میں ان کی شاعری کی بابت بڑے بڑے جید عالموں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کی آرا شامل تھیں۔ یوسفی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا ... "ہمارے ہاں ایک رواج ہوا کرتا تھا کہ جب کنواری لڑکیاں ڈولی میں سوار ہونے جاتیں تو پہلے ہی سے اس ڈولی میں وزنی پتھر رکھوا دیے جاتے تاکہ کہاروں کو کنواریوں کے وزن کا صحیح اندازہ نہ ہو"۔

اس لطیف اشارے کے بعد مصطفیٰ کہتے ہیں ...

لیکن مصطفیٰ شہاب کچھ کہیں نہ کہیں وہ یوسفی صاحب کو کبھی زحمت نہیں دیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

Mr. Mustafa Shahab,
28 Weighton Road, Harrow, Middlesex, HA3 6HZ, UK

انتخابِ کلام

اس جہاں میں سب کو ہے، اپنی آگہی تھوڑی　　ذات اک سمندر ہے اور زندگی تھوڑی

اس جہانِ خود رو میں، جو ہے جسم میں آباد　　میری سانس کے دم سے، ہے ہما ہمی تھوڑی

اک دیا جلانے کو سو جتن ضروری ہیں　　خود بہ خود بکھرتی ہے اُس سے روشنی تھوڑی

تیرے قرب سے نسبت ہو تو ہونے لگتی ہے　　رات کاسنی تھوڑی، صبح سرمئی تھوڑی

شب کو ساحروں کے ساتھ دن کو دائروں کے ساتھ　　ٹالنے سے ٹلتی ہے یوں بری گھڑی تھوڑی

ورنہ کون سی شئے تھی جو نہ مل سکی، لیکن　　پھر تو یوں ہوا دنیا ہم کو پڑ گئی تھوڑی

جانے کب شہاب آئے خود سپردگی اس میں

روز بڑھتی جاتی ہے مجھ میں بے خودی تھوڑی

٭٭٭

ایک روز ایک چاند دیکھا تھا
پھر مجھے کچھ نظر نہیں آیا

راجہ محمد صادق شاد سہر از بحرین
29 مئی سنہ 2003

راجہ محمد صادق شاد

بحرین، عربین گلف

ہم تجھ سے منافق کو نصیحت نہیں کرتے
یہ حرف ہنر ہے ترے اندر ہی نہ جائے

اس شعر کے خالق اور صدر بزم سخن، بحرین راجہ محمد صادق شاد سے جس نے بھی گفتگو کی ہے وہ یہی کہے گا کہ شاد روتوں کو ہنساتا ہے اور ان کا دل شاد کرتا ہے۔ انہیں لطیفے بھی خوب یاد ہیں۔ ایک لطیفہ شاد کے نام سے منسوب ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں:

"کہتے ہیں ذہانت اور ذہین آدمی کا امتحان کسی مشکل موقع پر ہی ہوتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک نواب صاحب کو، جو دانشوروں کی بے حد قدر کرتے تھے، ایک بہت ہی ذہین اور چالاک شخص نے مرعوب کر رکھا تھا۔ اس شخص کو 'ہر فن مولا' ہونے کا دعویٰ تھا۔ درباری اس سے بہت چڑتے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب کے وقتاً فوقتاً کان بھرے تھے مگر نواب صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن ایک عربی دان کے اعزاز میں نواب صاحب نے دعوت کی۔ ایک درباری نے 'ہر فن مولا' کو نیچا دکھانے کے لئے پوچھا... حضور! ذرا یہ بتلائیے کہ ٹھنڈے شوربے کو عربی میں کیا کہتے ہیں۔ ہر فن مولا لمحے بھر کو ٹپٹایا مگر دوسرے لمحے ہی قہقہہ لگا کر بولا... کیوں بے وقوف بناتے ہو یار، عربی شوربے کو ٹھنڈا ہونے ہی

کب دیتے ہیں"۔

ایک زوردار قہقہہ کی گونج ختم ہوئی تو میں نے پوچھا... "صادق، یہ اشارہ کس طرف ہے"؟

ہنس کر بولے... "میرا شعر سنیئے"۔

میری بیساکھیوں پر چلتے چلتے مرے قد کے برابر ہوگیا ہے

چنانچہ سلطانہ مہر صاحبہ کس کس کا نام لیا جائے۔ اب تو یہاں بقول میر۔

عجب بدلا ہوا ہے اس کا لہجہ وہ متشاعر سخنور ہوگیا ہے"

صادق شاد کا موڈ دیکھ کر میں نے کہا... "لگتا ہے دوستوں سے بڑے زخم کھائے ہیں آپ نے۔ چلیئے اپنی زندگی کا کوئی اہم اور یادگار واقعہ سنایئے"۔

جواب میں شاد نے جناب سعید قیس کا یہ شعر سنایا۔

اک روز اک چاند دیکھا تھا پھر مجھے کچھ نظر نہیں آیا

راجہ محمد صادق شاد جناب سعید قیس کے شاگرد ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے استاد سے متاثر بھی ہیں لیکن ساتھ ہی انہیں ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری نے بھی متاثر کیا ہے۔ شاد کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے قد آور شعرا میں غالب، میر اور ذوق کے کلام نے انہیں اپنے سحر میں رکھا ہے۔

راجہ محمد صادق ۱۲/اپریل ۱۹۵۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں شعر و شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا تو اپنے علاقہ پھوار کی ایک قدیمی طرز کی شاعری میں، جسے "بیت" کہا جاتا ہے، طبع آزمائی کی۔ "بیت" چار اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اپنی رباعیات کے ساتھ انہوں نے غزل کے میدان میں قدم رکھا۔ اب غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے۔

راجہ صادق شاد کا کہنا ہے... "اردو زبان کو اپنا کر ہم مسلمان فخر محسوس کرتے ہیں ورنہ ہمیں ہندی اور سنسکرت جیسی ثقیل زبانوں سے واسطہ پڑ جاتا۔ اردو کی ہمہ گیری کی وجہ سے اس کا مستقبل روشن تر ہے"۔

راجہ صادق شاد اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی رائے میں آج کا ...و ادب اپنے عہد کا ہی ترجمان نہیں بلکہ یہ ہر عہد کا ترجمان رہا ہے اور رہے گا۔ حالات کے ساتھ اس کے زاویے بدلتے رہتے ہیں"۔

راجہ محمد صادق کو مطالعے کا شوق ہے۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے ساتھ مطالعے کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ دورانِ گفتگو انہوں نے اپنا ایک شعر سنایا۔

بخیہ گر اس دور کے استاد ہیں فن رفو کرتے ہیں میرے شہر میں

میں نے پوچھا... "دوستوں سے بہت نالاں رہے ہیں؟ انہیں بھول کیوں نہیں جاتے، بقول ساحر لدھیانوی۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں اچھا کیا جو تم نے فراموش کردیا

راجہ شاد نے فوراً تصحیح کی... "یہ شعر ساحر لدھیانوی کا نہیں، حسن لطیفی کا ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۳ء میں

ہوا تھا۔ اور ان کا مجموعۂ کلام'' کلام لطیف'' ان کے انتقال کے بہت عرصے بعد ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا''۔

اپنی معلومات میں اضافے سے مجھے خوشی ہوئی اور میں نے راجہ صادق کی اس شعری پیش گوئی ۔

اب گردشِ دوراں تجھے پہچان گئی ہے
ممکن ہے ترے پاؤں کا چکر ہی نہ جائے

کی متمنی دعا ہی تا کہ راجہ صادق ان تمام چکروں سے آزاد ہو کر اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی طرف توجہ دیں، آمین۔

Mr. Raja Mohammad Sadiq Shad,
P O Box 698, Manama, Behrain, Arabian Gulf

انتخابِ کلام

رات کے پیروں میں زنجیر بھی ہو سکتی ہے — چاند نکلنے میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے
ایک اشارہ ایک ستارہ بن سکتا ہے — ایک مسرت ایک لکیر بھی ہو سکتی ہے
جس نے اپنی چھت پر چاند اُگا رکھا ہے — وہ پاگل لڑکی تو ہیر بھی ہو سکتی ہے
تم چاہو تو داغ چراغ بھی بن سکتا ہے — زخم کے اندر کچھ تعمیر بھی ہو سکتی ہے
ایک دیا رکھا جا سکتا ہے شعروں میں — ایک غزل رشکِ تنویر بھی ہو سکتی ہے
ہم تو اپنی خام خیالی سے ڈرتے ہیں — ہم لوگوں سے کچھ تقصیر بھی ہو سکتی ہے
سچی بات کہو تو یہ بھی دھیان میں رکھنا — سُولی چڑھنے کی تدبیر بھی ہو سکتی ہے
تتلی کے رنگوں کو یوں غور سے مت دیکھو — کوئی خواہش دامن گیر بھی ہو سکتی ہے
ہم سادہ لفظوں کے وارث ہیں — بات ہماری گمبھیر بھی ہو سکتی ہے

اپنی گردن آپ بچا کر چلنا صادق
غیر کے ہاتھوں میں شمشیر بھی ہو سکتی ہے

کسی مسیحا کا ذکر چھیڑا ہے
جان سی پڑ گئی فسانے میں

ضیاء جبل پوری کاماریڈی
8-8-2001

ضیا جبلپوری

کاماریڈی، آندھرا پردیش، ہندوستان

میں نے "سخنور پنجم" کے سوال نامے میں ایک سوال "اردو رسم الخط" کے بارے میں بطور خاص رکھا کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی رائے اور فکر سے ہمارے قارئین استفادہ کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ضمن میں کئی مفید مشورے بھی سامنے آئے ہیں۔ میں نے خود بھی اس موضوع پر مختلف آرا کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک مضمون کا حوالہ یہاں ضرور دینا چاہوں گی جسے ڈاکٹر محمد صدیق شبلی [1] نے تحریر کیا ہے اور پھر ہم محترم ضیا جبلپوری کی رائے سے استفادہ کریں گے کہ وہ بھی بلاشبہ اہم ہے اور فکر کے راستے ہموار کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیق شبلی نے اپنے مضمون 'اردو رسم الخط کا تحفظ کیوں ضروری ہے' میں لکھا ہے [1] ...

"زبان کے رسم الخط کی تبدیلی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ دیتی ہے۔ ماضی کا سارا سرمایہ اس کے لئے بے معنی ہو جاتا ہے۔ ترکی میں مخصوص حالات کے تحت مصطفیٰ کمال نے لاطینی رسم الخط اختیار کیا۔ اس خط کو زبردستی نافذ کیا گیا۔ ترک آج بھی مسجدوں میں خطاطی کے اعلیٰ نمونوں کو حسرت و یاس سے تکتے ہیں اور ترکی کے عظیم الشان کتب خانے بڑا ہی عبرت انگیز منظر پیش کرتے ہیں۔ علوم اسلام کے ان نادر

(۱) مطبوعہ ہفت روزہ پاکستان لنک، لاس اینجلس ۲/ جون ۲۰۰۰ء۔

خزینوں سے استفادہ کرنے والے ترک آج خال خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح روس نے اپنے مخصوص مقاصد و مفادات کے تحت وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں میں ان کے رسم الخط موقوف کر کے اس کی جگہ 'سریلیک (Cyrillic)' رسم الخط کو رواج دیا۔ اس طرح ایک تو ان کا رشتہ اسلامی دنیا سے کاٹ دیا اور دوسرے ماضی کے سارے علمی و تہذیبی سرمائے سے بھی ان کا تعلق ختم کر کے رکھ دیا۔ روس سے آزادی پانے کے بعد ان ممالک میں پرانے رسم الخط کے احیا کی تڑپ تو موجود ہے لیکن اب یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایران سے، اسلام کی آمد کے بعد، پارسی ایک بڑی تعداد میں ترک وطن کر کے جب ہندوستان کے علاقے گجرات اور کاٹھیاواڑ وغیرہ میں پہنچے تو وہاں کے راجاؤں نے انہیں وہاں آباد ہونے کی اجازت اس شرط پر دی کہ پارسی اپنی زبان اور رسم الخط ترک کر دیں گے۔ یہ بات پارسیوں نے مان لی اور اس کے بعد وہ پارسی گجراتیوں سے بڑھ کر گجراتی ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کے ناموں پر بھی گجراتی زبان کے گہرے اثر ہو گئے۔ چنانچہ یہ واضح ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کوئی معمولی بات نہیں ہے"۔

میں نے ضیا صاحب سے بھی یہی سوال کیا کہ وہ اردو کے مستقبل اور رسم الخط کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا ... "میں اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید ہوں۔ مگر اس کے لئے ہم اردو والوں کو محنت کرنا پڑے گی۔ لیکن میں اردو کے موجودہ رسم الخط کو بدلنے کا حامی نہیں۔ یہ خوب صورت اور رواں ہے۔ ہاں اردو کی ترقی کے لئے مزید رسم الخطوں کا حامی ہوں، دیوناگری مقامی ضرورت کے لئے اور رومن بین الاقوامی ضرورتوں کے لئے۔ یہ اردو کی ترویج و اشاعت میں معاون ہوں گے۔ یہ آئندہ آنے والی نسلوں کی ضرورت ہے۔ امریکہ، انگلستان اور مشرق وسطیٰ میں بسنے والے نوجوان جو صحیح اردو نہیں لکھ سکتے، اب بھی مجھے رومن اردو میں خطوط لکھتے ہیں۔ تمام دنیا سمٹ کر ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہم پتھر کے زمانے سے نکل کر اب نیوکلائی، خلائی اور کمپیوٹر ایج (computer age کمپیوٹر کا دور) میں داخل ہو چکے ہیں"۔

ضیا جبلپوری نظام آباد کے موضع کاماریڈی میں سکونت کرتے ہیں۔ اور جیسا ان کے بارے میں شاغل ادیب ایم اے نے لکھا ہے کہ گزشتہ تیس پینتیس سال سے شہر سے دور ایک غیر ادبی ماحول میں رہتے ہوئے بھی دامن اردو کو اپنے ادب پاروں سے بھرتے ہی جا رہے ہیں۔ پھر نہ صرف وہ شاعر ہیں بلکہ افسانہ نگار بھی ہیں۔

ان کے دو مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا "بیاض فکر" ۱۹۸۲ء میں اور دوسرا "کوہ نور" ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر مقبول فاروقی (آندھرا پردیش، انڈیا)، ڈاکٹر گیان چند جین (لاس اینجلس، امریکہ)، ہاشم علی اختر[1] (سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، انڈیا) ڈاکٹر امیر عارفی (دہلی یونیورسٹی، انڈیا)، ڈاکٹر ضیاالدین شکیب (لندن، برطانیہ) اور جمیل نظام آبادی (مدیر ماہنامہ گونج، نظام آباد، انڈیا) کے تاثرات

۱۔ جناب حسن چشتی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ ہاشم علی اختر مرحوم ۲/جون ۲۰۰۳ء کو شکاگو، امریکہ میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ماں بھی شامل ہیں۔

اپنے بارے میں ان کا کہنا ہے ...''میرا نام محمد ضیاالدین ضیا، جائے پیدائش مراد آباد، یوپی، جو حضرت جگر مرادآبادی کا بھی وطن ہے، تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۳۲ء ہے۔ والد محترم جبلپور میں طبیب تھے۔ اُن کا وطن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔ والدہ صاحب کا وطن بھی قصبہ حبیب والہ ضلع بجنور تھا۔ میں نے انجمن ہائی اسکول جبلپور میں تعلیم پائی۔ اجمیر بورڈ سے انٹر کیا۔ ۱۹۵۴ء میں محکمۂ ریلوے سے منسلک ہوگیا۔ ۱۹۹۲ء میں وظیفہ پایا۔ کاماریڈی، آندھراپردیش میرا وطن ثانی بن گیا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں ہائی اسکول کے زمانے ہی سے غزلیں کہنے لگا تھا۔ میرا کلام 'خلافت' اور 'انقلاب'، 'بمبئی' میں شائع ہوتا تھا۔ اس زمانے کے اساتذہ نہ صرف قابل ہوتے تھے بلکہ شاگردوں پر بڑی محنت بھی کرتے تھے۔ میرے استادانِ گرامی میں اردو کے محمود صاحب، جغرافیہ کے احمد علی صاحب اور حساب کے عاشق علی صاحب نے مجھ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ غزلیں میں نے اوائل عمری میں کہی تھیں، بعد میں نظموں کی طرف مائل ہوگیا۔ مرکزِ ادب، نظام آباد کے جناب کاظم علی خان کے طرحی مشاعروں کی بدولت غزلیں کہنے لگا''۔

ضیا صاحب کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''برانچ لائن'' زیرِ ترتیب ہے۔ انہوں نے روزنامہ ''سیاست، حیدرآباد'' میں کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا...''اردو ادب دو قسموں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک کلاسیکل اور دوسرا جو مغرب کی نقالی میں لکھا جا رہا ہے اور دونوں کی جڑیں زمین میں پیوست نہیں ہیں۔ ایک عام آدمی کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ تیسرے قسم کا ادب جو صحافت کی مدد سے پروان چڑھ رہا ہے وہ ضرور اپنے عہد کا ترجمان ہے''۔

ضیا کہتے ہیں...''نظم غزل کی بہ نسبت خیالات کی بہتر ترجمان ہے۔ ادب کی کائنات ردیف، قافیے اور اوزان سے آگے بھی ہے۔ میں نے بچپن میں فیض اور ساحر کو پڑھا تھا۔ بعد میں نریش کمار شاد اچھے لگے۔ پھر جاں نثار اختر سے یہ سلسلہ احمد فراز تک پہنچا۔ آج کل ناخدائے سخن میر تقی میر میرے پسندیدہ شاعر ہیں''۔

ان کا کہنا ہے...''اردو زبان کو اپنا کر میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ میں نے کھویا کم اور پایا زیادہ ہے۔ اردو نے مجھے شہرت، عزت اور دولت بخشی ہے۔ میں نے اردو کو کم دیا ہے۔ اردو کا قرض مجھے ابھی ادا کرنا ہے''۔

انہوں نے بتایا ...''میری زندگی کا اہم واقعہ تقسیم ہند تھا، جو میں نے اپنے آنکھوں سے دیکھی۔ دوسرا غیر دلچسپ واقعہ بابری مسجد کی شہادت تھی، جو مجھے اس زندگی میں دیکھنی پڑی۔ میں بچپن سے فلسطینیوں کی شہادت اور اقوام عالم کی بے حسی دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے کسی سے محبت کی ہے ورنہ تو

شعر و ادب افسانے غزلیں، سب دھوکا ہے   لفظوں کی بے معنی فصلیں، سب دھوکا ہے

ضیا جبلپوری قطعہ نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ اور بقول شاغل ادیب ان کے بعض قطعات رباعیوں کا مفہوم لیئے ہوتے ہیں اور جوش کی رباعیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

شہرت ملی زعم خود نمائی بھی ملا | یاران وفا سے زخم جدائی بھی ملا
جب اہل سیاست سے ہوئی ہے یاری | دولت تو ملی کاسۂ گدائی بھی ملا

ان کی کہی یہ نعت بھی خوب ہے۔

زمانے تجھے شعور سفر نہیں آتا | وہ رہنمائے زمانہ اگر نہیں آتا
نہ ہوتی شمع رسالت تو ہم بھٹک جاتے | بنا رسولؐ کے حق بھی نظر نہیں آتا
شب فراق میں کیا کرتے ماہتاب شناس | عرب کا چاند اگر بام پر نہیں آتا
ہے ایک نور مجسم کا فیض، ورنہ تھا | بڑا اندھیرا کہ سورج نظر نہیں آتا
درود پڑھنے کی تاکید ہے سبحان اللہ | بغیر اس کے دعا میں اثر نہیں آتا
خدا کی حمد و ثنا اور رسولؐ کی توصیف | ضیا کو اس کے سوا کچھ ہنر نہیں آتا

Mr. Zia Jabalpuri, (Journalist, Retired Station Master),
1-2-104 Old Bus Stand, Kamareddy, 503111, A. P. India

انتخابِ کلام

قطرہ قطرہ آسائش ہمیں لے ڈوبی ہے
بے موسم کی یہ بارش آج ہمیں لے ڈوبی ہے
اونچا اُڑنے کی دھن میں بال و پر بھی کھو بیٹھے
چاند کو چھونے کی خواہش آج ہمیں لے ڈوبی ہے
تھک تھک کر سب چُور ہوئے طوفاں، کشتی، پیمانے
تیری نگاہوں کی جنبش، آج ہمیں لے ڈوبی ہے
اپنی خام خیالی میں میر سی غلطی کر بیٹھے
ساعدِ سیمیں کی لرزش آج ہمیں لے ڈوبی ہے
شہروں کے سردار تھے ہم، دشمن سے ہشیار ضیا
لیکن اپنوں کی سازش آج ہمیں لے ڈوبی ہے

+++

میں دعا تو مانگتا ہوں مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے
جو قبول ہو گئی تو میرا دم نکل پڑے گا

ضیاء خان
لوس اینجلز امریکہ۔

ضیا خان

لاس اینجلس، امریکہ

جیسے کہ ان کی عادت ہے وہ دورانِ گفتگو پل بھر کے لئے خاموش ہوئے پھر کہنے لگے، '' آپا! میرا یہ شعر سنیئے

ہوگی ضرور پوری اس کا یقیں ہے مجھ کو — اللہ سے دعا میں اردو میں مانگتا ہوں

ان کے ہونٹوں پر معصوم سا تبسم تھا اور ان کی دعا بھی اتنی ہی معصوم تھی جتنا ان کا تبسم۔

'' اللہ، ضیا بھائی! آپ کی دعا ضرور پوری ہوگی کیوں کہ اللہ تعالٰی ساری زبانیں سمجھتے ہیں اور خصوصاً اپنے نیک اور اچھے بندوں کو تو وہ کبھی مایوس نہیں کرتے''، میں نے کہا۔

ہم گفتگو کر رہے تھے اردو زبان کے حوالے سے کہ جانے دیارِ غیر میں ہم لکھ لکھ کر جو ڈھیر لگا رہے ہیں ہمارے بعد کے لوگ انہیں پڑھیں گے بھی یا نہیں۔ اور ضیا بھائی مجھے یقین دلا رہے تھے ... '' آپا بات صرف ہماری دل چسپی لینے کی ہے۔ جو لوگ اردو سے محبت کرتے ہیں وہ اس کی بقا کا سامان بھی کرتے رہیں گے۔ ہاں ہمیں اس کا رسم الخط نہیں بدلنا چاہیئے کیوں کہ کوئی بھی زبان اپنی بنیاد چھوڑ کر دوسروں کی بنیاد پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اور ایک زبان کے مٹ جانے سے پوری تہذیب مٹ جاتی ہے''۔ انہوں نے مثال دی ... '' جیسے چوڑیوں کی جھنکار، اس کو آپ اردو رسم الخط میں لکھ کر ہی

اس کی رومانٹک آواز سے محظوظ ہو سکتے ہیں، رومن رسم الخط میں یہ جھنکار معدوم ہو جائے گی اور یوں محسوس ہوگا جیسے ٹھیکرے بجائے جارہے ہوں"۔

انہوں نے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہونے والی اردو/ انگریزی لغت کا بھی حوالہ دیتے ہوئے کہا۔" اس کی مدد سے ہم اپنے بچوں کو اردو کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی جب ہم اپنے بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں تو وہ عربی رسم الخط سے واقفیت کی بنا پر اردو رسم الخط سے انسیت کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ لیکن اگر آپ اپنے بچوں کو عربی میں قرآن نہیں پڑھائیں گے جیسا کہ بعض والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے ہو رہا ہے، تو بچے اردو تو کیا ہی پڑھیں گے قرآن پڑھنے کے اُس ثواب سے بھی محروم رہیں گے جو ایک مسلمان کا عقیدہ ہے"۔

ضیا خان اپنے احباب میں بھی اپنے کھرے نظریات کی وجہ سے مقبول ہیں۔ سعودی عرب کے شہر ریاض میں مقیم اردو کی معروف افسانہ نگار عذرا نقوی ان کے لئے لکھتی ہیں..." ان سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے غیر محسوس طریقے سے ضیا خان کب ضیا بھائی بن گئے مجھے یاد نہیں۔ یہ ان کے مزاج کی سادگی، خلوص اور ایک خاص قسم کی دیانت داری تھی جو ان سے میرے شوہر ڈاکٹر پرویز احمد کی دوستی کا سبب بنی۔ ان کی بیگم ٹینا میں بھی زندگی اور انسانی رشتوں کے تئیں جو دیانت داری ہے اس نے بھی دوستی کے رشتے کو مزید مضبوط کیا۔ ہم ہندوستان میں پلے بڑھے ہیں۔ ضیا بھائی کا تعلق پاکستان سے ہے اور ٹینا امریکن ہیں لیکن جب دل کے در کھلے ہوتے ہیں اور پیار کی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے تو کوئی غیریت باقی نہیں رہ سکتی"۔

ریاض ہی میں مقیم خوب صورت نثر لکھنے والے غلام فرید بھٹہ نے ضیا خان کے لئے لکھا ہے ..." ان کا اپنی مٹی سے بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ ان کی شاعری میں وطن سے دوری کا کرب اور اپنی مٹی سے گہری عقیدت ومحبت کا اظہار ملتا ہے۔ بلاشبہ وطن سے دوری، خواہ کسی وجہ سے ہو، دوری ایک صدمہ لیئے ہوتی ہے اور دولت کے انبار اور دیگر شان وشوکت ایک محب وطن کے لئے نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتے۔ اپنی مٹی سے ضیا کو جو پیار ہے وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

پیاسا وطن سے بہت دور جا بسا اب کیوں کھڑے ہو ہاتھ میں ساغر لیئے ہوئے

ضیا کو اپنی مٹی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی مٹی سے بھی پیار ہے۔ ملاحظہ ہو

ہے مدینہ ایک زندہ معجزہ ارضِ طیبہ باغ جنت ہوگئی
ذاتِ احمدؐ تو ہے محبوب خدا عشق احمدؐ کیسے بدعت ہوگئی
جذب ہے عشق نبیؐ میں تو اگر کر یقیں تیری شفاعت ہوگئی
باوضو جب بند کیں آنکھیں ضیا سبز جالی کی زیارت ہوگئی

آئیے اب ضیا خان سے ملیں۔

ذہین اور بچپن سے ہی ہر ایک کو اپنی محبت کی روشنی سے جلا دینے والے اس شخص کا نام

ضیاالرحمٰن خان ہے، یعنی اسم بامسمیٰ۔ اس لیے تخلص بھی ضیا اپنایا۔ ۳۰/ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول شروع ہی سے ادبی و دینی تعلیم کا گہوارہ تھا۔ ادب سے لگاؤ اور شاعری سے وابستگی کی بنیاد اسی گھریلو ماحول میں پڑی اور تعلیمی اداروں میں پروان چڑھی۔ گھر میں ادبی و دینی رسائل بکثرت مہیا تھے۔ یہ پڑھتے رہے، شوق بڑھتا رہا۔ پھر لائبریریوں کے چکر لگنے لگے۔ بات رسالوں، ناولوں اور دیوانِ غالب اور کلامِ فیض تک جا پہنچی۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی جاری رہا جو آج تک جاری ہے۔

شروع کے چند سال کراچی میں گزارنے کے بعد مستقل رہائش راولپنڈی میں رہی۔ ہائی اسکول کی تعلیم 'پاکستان ایئر فورس پبلک اسکول لوئر ٹوپہ (مری ہلز) سے مکمل کر کے گارڈن کالج، راولپنڈی سے انٹر سائنس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری لی۔ اعلیٰ تعلیم کی جستجو ۱۹۶۷ء میں امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا لے گئی۔ ۱۹۷۱ء میں لاس اینجلس سے الیکٹریکل انجینیئرنگ کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ضیا کہتے ہیں... "حصول علم کے ساتھ ساتھ ملازمت کا سلسلہ ۱۹۶۳ء سے شروع ہو گیا تھا۔ ٹیلی کمیونی کیشن کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد چند سال کراچی میں گزارے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ امریکہ میں جاری رہا۔ ۱۹۷۸ء میں امریکہ سے مختلف ممالک جانے کا دور شروع ہوا۔ ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان، کویت، عرب امارات، مصر، بلجیم اور یونان جانا اور رہنا ہوا۔ ملازمت کے دوران چھٹیوں میں دنیا کے مزید ممالک کی سیاحت کا موقعہ ملا۔ فہرست تو بہت طویل ہے لیکن روم، میلان، وینس، پیرس، لندن، ایمسٹرڈیم، ہیگ، جنیوا، زیورخ، ہمبرگ، فرینک فرٹ، ویانا، میڈرڈ، نیروبی اور قاہرہ سب ہی ان کے جانے پہچانے شہروں اور ملکوں کے نام ہیں۔ زندگی کا یہ دور بڑی خوش گوار یادوں سے مزین ہے۔ نئی نئی بستیاں، نئے نئے لوگ، تجربات کو حدِ نظر وسعت دینے اور علم حاصل کرنے کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ انسانی قدروں کا تضاد بھی دیکھا اور فطرت انسانی کی یکسانیت بھی۔ سعودی عرب کے قیام میں ایک سال کا جو عرصہ مدینہ منورہ میں گزرا یقیناً وہ حاصل زندگی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

جنت کی تمنا ہے جو ضیاؔ، چپکے سے مدینہ آجاؤ
جنت بھی لگی ہے اس دھن میں سرکار کے در پر میں جاؤں

میں نے پوچھا ... "کچھ اپنی شاعری کے بارے میں بتائیے کہ کب یہ سانحہ گزرا؟"۔ ضیا مسکرائے اور بولے ... "جیسا میں نے کہا کہ شعر و سخن سے دل چسپی تو بچپن سے تھی ہی، مطالعہ کا شوق بھی پورا ہوتا رہا، سفر و سیاحت کے دوران مختلف ممالک کے ادب سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ جزیرہ کریٹ میں چھ ماہ کے قیام کے دوران یونانی ادب سے شناسائی ہوئی اور کافی متاثر ہوا۔ لکھنے کا شوق اسکول / کالج کے دور سے شروع ہو چکا تھا۔ غزلیں اور مضامین گاہے بگاہے شائع ہوتے تھے۔ یوں تو

طبع آزمائی کے لئے تحقیقی مقالے بھی لکھے، علمی و دینی موضوعات پر بھی قلم آرائی کی، سیاحت نامے میں بھی بہت دل چسپی ہے مگر شاعری اور غزل سے مجھے پیار ہے اور گھوم پھر کر غزل کی دنیا میں واپس آجاتا ہوں۔ ہاں نظمیں اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ایک دور تھا جب مشاعرے سننے کا شوق تھا (اب بھی ہے)۔ جب تک پاکستان میں رہا، ریڈیو پاکستان کے نشری مشاعرے سنتا رہا۔ شہر کراچی میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر داد دینے پہنچ جاتا تھا۔ پھر لاس اینجلس میں بزم ادب۔ لاس اینجلس کی محفلیں ہونے لگیں تو ان میں شریک ہونے لگا۔ لاس اینجلس میں پاکستانی کمیونٹی کے لئے ادبی و سماجی پروگرام بڑے جوش و خروش سے کرتا رہا۔ غرض جب اور جہاں موقعہ ملتا میں نے شوق ادب کی تسکین کا سامان پیدا کر لیا۔ لاس اینجلس کا پہلا مشاعرہ میں نے بڑی محنت سے منعقد کیا تھا۔ اب یہ محفلیں باقاعدگی سے ہونے لگی ہیں۔ ان سب باتوں سے دل بہت خوش ہوتا ہے کہ شمع اردو کی روشنی پھیل کر کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ میں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی کئی تحریریں اور نظمیں لکھی ہیں اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں۔ لاس اینجلس کے انگریزی ادب کے حلقوں میں بھی سنانے کا موقع ملا ہے۔ خصوصاً سفرنامے اور سیاحت سے متعلق مضامین بہت پسند کیئے گئے''۔

میں نے پوچھا ... ''غزل یا نظم میں کون سی صنف احساسات کی بہترین ترجمان ہے''؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔'' میری نظر میں تخلیق ادب کے لئے اجزا کا یکجا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم ہے ایک گہرا مطالعہ جو ایک طویل عرصہ سے جاری ہو اور ادب کے مختلف اصناف پر مبنی ہو؛ دوم زبان پر خاطر خواہ دسترس، الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ اور ان کا صحیح اور برجستہ استعمال اور سوم انسان (ادیب/ شاعر) کے ذاتی گوناگوں تجربات، احساسات و نظریات۔ جب شاعر اپنے تجربات، احساسات اور نظریات کو الفاظ کا خوب صورت جامہ پہنا سکے ایسا کہ جو قاری پر اثر انداز ہو، اس میں انفرادیت اور نیا پن ہو اور انسانی زندگی کا ترجمان ہو تو پھر بات بن گئی چاہے وہ غزل ہو یا نظم۔ دراصل ادیب یا شاعر اپنے ماحول اور اپنی زندگی کے حاصل کردہ تجربات، احساسات اور نظریات کی عکاسی کی کوشش اپنی تحریر میں کرتا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتا ہے اور اگر کہہ سکے اس طرح کہ اس کی تحریر پڑھنے والے پر اپنا تاثر چھوڑ جائے تو یہ اس کی کامیابی ہے۔ ضروری نہیں کہ ادب صرف نظریاتی ہو۔ بسا اوقات سادہ سی بات بھی دل پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے ذریعے کوئی پیغام بھی دے دیتے ہیں، کبھی قاری کی سوچ کو جگایا جاتا ہے۔ اپنی شاعری میں میری کوشش یہ ہے کہ سادہ سے مگر خوب صورت الفاظ و انداز میں اپنے تجربات، خیالات اور محسوسات اور نظریات کو ڈھال سکوں۔ اپنے اس حیاتی سفر میں انسانی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ محسن انسانیت کی زندگی کا بھی مطالعہ کثرت سے کیا اور یہی مطالعہ میری شاعری کی بنیاد ہے''۔

میں نے صحرا قریب سے دیکھا — کتنی بارش ہو نم نہیں ہوگا
فلسفۂ زیست ہے ضیاؔ اتنا — پلکیں جھپکیں تو دم نہیں ہوگا

''ضیا خان! کیا آج اردو شاعری ونثر اپنے موجودہ دور کی عکاس ہے''؟ میں نے پوچھا تو ولولہ انگیز لہجے میں بولے ... ''اردو شاعری کے موجودہ دور کو بین الاقوامی دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ اردو کے پرستار دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یورپ، آسٹریلیا، افریقہ، مشرق وسطیٰ، شمالی امریکہ میں کثرت نقل کے باعث اردو دانوں کی کثیر تعداد رہائش پزیر ہے۔ مانا کہ ان ممالک میں برصغیر پاک وہند سے زندگی کی رفتار کچھ مختلف ہے، ماحول نیا نیا ہے، معاشرتی قدریں بھی مختلف ہیں، ہر زمین کے اپنے اپنے حالات ہیں، اپنے اپنے مسائل ہیں اور یہ جڑیں اتنی گہری ابھی نہیں لیکن زندگی سے بھرپور ہیں۔ اردو زبان میں ایک نیا ادب، نیا انداز ورجحان شامل ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو ادب وشاعری میں ان نئی تخلیقات کو لوگوں میں متعارف کرایا جائے اور برصغیر پاک وہند سے باہر کے اردو لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو ایک لشکری زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ اس نے ایک مسلمہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔ شعر سے اس میں نکھار پیدا ہوا اور یہ خوب پھولی پھلی۔ ابتدا میں لشکر مختلف ممالک سے برصغیر پاک وہند میں آتے تھے اور اردو کی جڑوں میں نیا خون، نئے الفاظ، نئے خیالات اور نئے احساسات سے آبیاری کرتے تھے۔ آج کا دور وہ ہے کہ اب اردو دانوں کے کارواں مختلف سرزمینوں کی جانب رواں ہیں۔ ایک بار پھر نئی فکریں، نئے خیالات اور نئے تجربات سے اردو ادب کی جلا ہو رہی ہے۔ اردو اب بھی لشکری زبان ہے مگر یہ لشکر اب برصغیر میں آ نہیں رہے بلکہ وہاں سے باہر جا کر پھیل رہے ہیں۔ شاید قدرت نے زبان اردو اور اس کے ادب کی قسمت میں اُبھرنا وترقی کرنا اور اس کی نشوونما اسی طور پر لکھی ہے۔ نیا ادب اور نئے ادیب اپنے عہد کے ترجمان ہیں۔ آج کا ادیب اور آج کا شاعر اپنے عہد کا گواہ ہے۔ یہ مشینی دور جو کمپیوٹر اور ٹیلی مواصلات کا دور ہے۔ یقیناً ادب کے پرستاروں کو آپس میں قریب لانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ تنقید نگاروں کا یہ کہنا کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جارہا ہے اور لفظ دل میں نہیں اُترتا یا اس کی سمت اور ہے، درحقیقت درست نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اردو کے اس بین الاقوامی دور میں ایک عام روش سے ہٹ کر سوچنے کا انداز اپنانا چاہیئے۔ تنقیدی نگاہ کے لئے ایک نئی عینک کی ضرورت ہے۔ دیکھنا اور سمجھنا یہ ہے کہ آج کے ادب میں عصر حاضر کے مسائل کا کتنا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک گہرائی اور وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ آج کا ادب جس انداز میں مختلف ممالک کے ادب ومعاشرے سے متاثر ہو رہا ہے، شاید اس سے قبل کبھی ایسا نہ تھا۔ اردو ادب کی نئی تخلیقات میں نئے نظریات کے نقوش شامل ہیں۔ اس کے خدوخال کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ شاید یہی چیز تنقید نگار کی فکر کو پریشان کیئے ہوئے ہے۔ درحقیقت آج کا ادب چاروں جانب کی زندگی سے متاثر ہے۔ اس میں نئی زندگی کے دھارے شامل ہو رہے ہیں۔ نئی ہم آہنگی کا دور ہے۔ اسی وجہ سے تنقید نگار کو یہ کیفیت طوفانی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ادبی دنیا کے اس مدوجزر میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہوگا۔ اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ ایک اچھا شاعر روح عصر کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ شاعری جس کی

بنیاد خیال و فکر کی گہرائی، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعے پر مبنی ہو تو اچھی شاعری ہوگی"۔

اگلے سوال کے جواب میں ضیا نے کہا۔" دورِ حاضر کے شاعروں میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اور احمد فراز مجھے پسند ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر کچھ نام اُبھر رہے ہیں لیکن پہچان ہونے میں شاید وقت لگے۔ اچھا شعر اور اچھی تخلیق ایک پھول اور اس کی خوش بو کی مانند ہے۔ نئے پھول کھلتے رہیں گے۔ خدا کرے کہ اردو کا چمن شاد و آباد رہے۔

Mr. Zia Khan,
P O Box 34025, Fullerton, CA 92634, USA

انتخابِ کلام (کوہِ طور)

طور تیرا یہ سفر کاش مجھے راس آئے
میں بڑھوں تیری طرف، تو بھی میرے پاس آئے

ہیں فلک بوس چٹانیں ترے ایوانوں کی
ایک دنیا ہی الگ ہے ترے ویرانوں کی
پی کے مدہوش ہوئے مئے ترے پیمانوں کی
قابلِ رشک ہے قسمت ترے دیوانوں کی

فکر و احساس میں کچھ ربط ہوا جب پیدا
گفت و کردار میں کچھ ضبط ہوا جب پیدا
ریگ زاروں میں ترے نقشِ قدم چھوڑ آیا
خواہشِ نفس کی دنیا کے صنم توڑ آیا

بات جو ضد کی کہو فطرتِ انسانی تھی
نور میں لپٹی ہوئی رحمتِ ربانی تھی

دامنِ طور میں ہوں کیوں نہ مرا دل آئے
میری فطرت میں بھی ضد مجھ کو بھی کچھ مل جائے

ہے اب بھی تپش باقی ان راکھ کے ذروں میں
دیکھو کوئی چنگاری پھر نہ سلگ جائے

ضرورت کے قفس میں قید ہیں سب
خوشی سے درد کے مارے پرندے

محمد اقبال طارق

۲۴- مئی ۲۰۰۳ء
بحرین

محمد اقبال طارق

بحرین، عربین گلف

''میرا پیدائشی نام تو محمد اقبال ہے۔ طارق اسمِ معروف بھی ہے اور تخلص بھی۔ میں راولپنڈی کی تحصیل گوجر خان (جسے قلب پھوار بھی کہتے ہیں) سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر واقع موضع گلیانہ میں ۲۸/ جولائی ۱۹۶۲ء کے دن پیدا ہوا۔ مادری زبان پنجابی ہے لیکن جب میں نے سلطان الہندؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو پڑھا اور یہ بھی کہ حضرت امیر خسروؒ نے اردو زبان کی آبیاری کی تو مجھے بھی اردو زبان سے محبت ہو گئی۔ اور آپ نے پوچھا ہے کہ اردو زبان کو اپنا کر مجھے کبھی کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا، بھلا جسے حضرت امیر خسروؒ سے محبت ہوگی اسے پچھتاوا کیوں ہوگا''؟

میں بحرین میں مقیم طارق سے اردو زبان کے مسائل پر گفتگو کر رہی تھی۔ طارق اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اردو کے ساتھ اس کے اپنے گھر ''پاکستان'' میں جو سلوک ہو رہا ہے وہ اس سے آزردہ ہیں۔ کہنے لگے... ''ہم پاکستانیوں کو جب اردو سے محبت نہیں تو ہم غیروں سے کیا گلہ کریں''۔ انہوں نے اس ضمن میں جناب امتیاز احمد دریا کے ایک مضمون کا حوالہ دیا جو ''اخبار اردو، اسلام آباد'' مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں لکھا ہے... ''اہل عرب گزرے زمانے میں اپنے بچوں کی زبان درست کرنے اور اسے فصیح و بلیغ بنانے کی غرض سے انہیں دیہاتی علاقوں میں

بھیج دیا کرتے تھے مگر ہمارے ہاں تو بچے کو ابتدائی عمر سے ہی کانونٹ، کنڈرگارڈن، ہیکلن ہاؤس اور اچیّ سن جیسے اسکولوں میں بھیجا جاتا ہے جہاں زبان تو بگڑتی ہی ہے ذہن بھی بگڑتا ہے اور اس کی خبر لینے والا کوئی نہیں"۔

طارق نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے زمانے سے ہی شعر گوئی کی ابتدا کر دی تھی۔ بحرین کے ایک معتبر اور سینئر شاعر سعید قیس، جنہیں طارق باباجی کہتے ہیں، طارق کے استاد ہیں۔ اُن کی استادانہ شفقت کے طفیل طارق کا پہلا شعری مجموعہ "تمہارے قرب کا موسم" جنوری ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ہے جس میں غزلوں کے ساتھ چند آزاد نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔

طارق کے شعری تیور کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے۔

اس نے سورج سے چار کیں آنکھیں
جس نے منظر تھا رات کا دیکھا

طارق کو خود اپنا یہ شعر بہت پسند ہے

جہانِ دل مجھے ہے ناز تجھ پر
مرے رسوا، تری نیت کھری ہے

اپنے پسندیدہ شعرا کے بارے میں کہتے ہیں..."اقبالؔ گزری صدی کے سب سے قد آور شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ ساغرؔ صدیقی مرحوم اور میرے باباجی سعید قیس کی شاعری نے ہمیشہ مجھے اپنے حصار میں رکھا"۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے وہ بے حد اداس ہو گئے۔ کہہ رہے تھے..."۱۹۸۰ء کی شاید نومبر دسمبر کی کوئی رات تھی جب میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال (سول ہسپتال)، راولپنڈی میں ڈسپنسر کورس کر رہا تھا، اس رات کوئی عزت، غربت یا بھوک سے مجبور ماں اپنے نومولود بچے کو ہسپتال کے اندر جھاڑیوں میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ بچہ مجھے ملا۔ میں نے وہ بچہ ایک نرسنگ سسٹر کے توسط سے ایک ایسی عورت کے حوالے کر دیا جس کی ممتا لفظ 'ماں' سننے کے لئے بے چین تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اَب بھی نومبر دسمبر کی سرد تاریک راتوں میں مجھے بے چین کر دیتا ہے۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے۔ میری آنکھیں اس رات کی تمام دُھند اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں اور گرم پانی سے بھر جاتی ہیں۔

Mr. Mohammad Iqbal Tariq S/O, the Late Master Maroof Khan
Dhook Sawar Khan; township Dulmi Tam'a; Tehsil Gujar Khan,
District Rawalpindi, Pakistan

مسٹر محمد اقبال خان ولد ماسٹر معروف خان (مرحوم)
ڈھوک سوار خان، موضع ڈلمی طمعہ، تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی، پاکستان

انتخابِ کلام

اور دنیا میں ہم نے کیا دیکھا
صرف تیرا ہی راستہ دیکھا

اُس نے سورج سے چار کی آنکھیں
جس نے منظر تھا رات کا دیکھا

سسکیاں چاند کی سُنیں ہم نے
جب ستاروں کو ٹوٹتا دیکھا

میرے دامن میں پیاس کتنی ہے
میں نے دریا کا راستہ دیکھا

حُسن دیکھا تو انگلیاں کاٹیں
کیا کریں گے اگر خدا دیکھا

ہر شکن پھوٹ پھوٹ کر روئی
رات جب خواب کربلا دیکھا

جب قبائے جنوں رفو کرلی
دامنِ دل کٹا پھٹا دیکھا

عکس اپنا دُھواں دُھواں پایا
آج طارق جب آئینہ دیکھا

آپ کا نام لے لیا۔ آپ کا نام لکھ دیا۔
ہم نے ہر اک سوال میں۔ ہم نے ہر اک جواب میں۔
طلعت اشارت
۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء

طلعت اِشارت

پنسلوانیا، امریکہ

جس کسی نے بھی یہ کہا غلط نہیں کہا... "عورت کی آواز کا حسن اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ نرم اور دھیمی ہو"۔ یہ نرم اور دھیمی آواز نسائیت کی شناخت ہے۔ اور یہ ہی لہجہ جب شاعری میں اختیار کیا جاتا ہے تو شعر میں ایک ترنم، ایک رمز رچ بس جاتا ہے۔ یہ ہی رمز اور ترنم طلعت اشارت کی شاعری کا حسن ہے۔

مری رگ رگ میں بہتا ہے لہو کے ساتھ ساتھ — اس کی چشمِ کور میں رمزِ شناسائی نہیں
بے نیازی کی بھی گویا انتہا کہئے اِسے — اُس نے دل رکھنے کو بھی اپنی قسم کھائی نہیں

اور

طے شدہ ہے کہ وہ نہ آئیں گے — بے سبب ہی سنور رہی ہے رات
میں تو خاموش ہوں مگر طلعت — شاعری مجھ سے کر رہی ہے بات

طلعت کی شاعری پچھلے چند سالوں کی بات نہیں۔ یہ حادثہ تو اگست ۱۹۵۶ء میں پیش آیا تھا جب ان کی پہلی نظم "نقاد، کراچی" میں شائع ہوئی تھی۔ ان دنوں طلعت میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ اس نظم کا پہلا شعر تھا۔

عجب ہے یہ جہاں زرد پتوں کا — یہاں پہ دورِ خزاں ہے بہار کا حاصل

یہ نظم طلعت کے مجموعۂ کلام "اشارت" میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا جب کہ طلعت کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے اسکول کے زمانۂ طالب علمی سے ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ روزنامہ "جنگ" اور "بھائی جان" کے بچوں کے صفحات کے لئے بڑے ذوق وشوق سے لکھا کرتی تھیں۔

طلعت ۲۳/ دسمبر کو الہ آباد، اتر پردیش، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ طلعت خان نام ہے اور اشارت ان کا تخلص۔ کراچی یونیورسٹی سے انہوں نے مائیکروبیالوجی (Microbiology) میں بی ایس سی آنرز اور ایم ایس سی کیا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد تقریباً سال بھر اپنے فیلڈ (field تخصص) میں انہوں نے ملازمت تلاش کی۔ ان کے ابا کا خاصا اثر رسوخ تھا۔ لیکن ان کے والد صاحب کا کہنا تھا کہ اثر رسوخ استعمال کر کے کسی کو ملازمت دلوانے کا مطلب ہے کسی حقدار کا حق غصب کرنا، جو پاکستان کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ وہ میرٹ (merit اہلیت) کے زبردست حامی تھے۔ آوٹ آف میرٹ (out of merit نا اہل) لوگوں کو کسی بھی جگہ کا ملنا، ان کے نزدیک پاکستان کی ترقی اور تحریکِ پاکستان کی روح کے منافی تھا۔ طلعت کے بھائی نے فزکس (physics) میں ایم ایس سی میں ٹاپ (top) کیا تھا۔ مگر ایسے ماحول میں جہاں ہر ہر قدم پر رسوخ استعمال ہوتا تھا وہاں ان کے ابا جیسے آئیڈیلسٹ (idealist مثال پسند) نے اپنی اس فکر کی وجہ سے ایک شمع بجھانے سے انکار کردیا۔ چنانچہ طلعت کے بھیا کو جاب (job ملازمت) نہیں ملا تو طلعت کو کیا ملتا جب کہ ان کی ڈگری پر تو سیکنڈ کلاس لکھا تھا۔ تنگ آ کر طلعت نے اس میدان میں قسمت آزمائی کی جو ان کے تعلیمی میدان سے مختلف تھا مگر جہاں طلعت کا تھوڑا بہت نام جانا پہچانا تھا۔ چنانچہ انہیں روزنامہ "جنگ، کراچی" کے صفحۂ خواتین کے انچارج کے طور پر دوسری ملازمت ملی۔ پہلی ملازمت بھی ایک رسالے میں تھی جس کا نام اب طلعت کو یاد نہیں۔ مگر ان کے بقول جسے کوئی شاہ صاحب چلاتے تھے اور جس کا کوئی شمارہ انہوں نے نہیں دیکھا۔ پھر چند دوستوں نے کہا۔ "کہاں پھنس گئی ہو نکلو"۔ چنانچہ انہوں نے وہ جاب (جس کی اکلوتی تنخواہ بقول طلعت شاہ صاحب پر اُدھار ہے) چھوڑ دی۔ "جنگ" میں چھ ماہ کام کرنے کے بعد یہ ہفت روزہ "اخبارِ خواتین" کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہوگئیں۔ آج کی معروف کالم نگار، مسرت جبیں اخبارِ خواتین کی مدیرہ تھیں۔ وہیں معروف صحافی شمیم اختر، افسانہ اور کالم نگار زاہدہ حنا اور شاہدہ پروین بھی تھیں۔ پھر طاہرہ جلیل (۱) بھی آ گئیں۔ اخبارِ خواتین میں ملازمت کے دوران ہی ۱۹۶۸ء میں طلعت کی شادی ہوگئی۔ ان کے شوہر، معین الوحید خان فارمیسٹ (Pharmacist عطار) ہیں۔ ماشاءاللہ تین بچے ہیں۔ صوفیہ، عاصم اور عامر۔ فی الوقت طلعت کا خاندان فلاڈلفیا کے شمالی نواحی بستی لینگ ہاون میں قیام پزیر ہے۔ یہ امریکہ کی ریاست پنسلوانیا میں واقع ہے۔ طلعت نے کہا۔ "امریکہ ہم ۱۹۷۲ء میں آئے تھے۔ جب میرے سب سے چھوٹے بچے نے فل ٹائم (full time کل وقتی) اسکول شروع کیا تب میں نے یہاں انٹرنل ریوینیو سروس (Internal Revenue Service) کے محکمے میں ملازمت کرلی۔ اسپیشل ایجوکیشن (Special Education) کے ذریعے گریجویشن (graduation) کیا۔ تب میں نے ریٹائرمنٹ

۱۔ طاہرہ اب مسز طاہرہ حسین ہیں اور "عوام، نیو یارک" کی مدیرۂ خاص ہیں۔

(retirement) حاصل کر لی۔ اب میں گھر پر رہ کر روز و شب کے حساب کتاب رکھتی ہوں"۔

صنفِ شاعری میں طلعت نے نظم، غزل، قطعہ، رباعی، آزاد نظم سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ کہتی ہیں..." مجھے آزاد مگر ردھمک (rhythmic لے دار) نظم کہنا اور پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ نثری نظم سے تو بہتر ہے کہ نثر ہی لکھ دی جائے۔ اور نثری غزل کی تو کوئی تک ہی نہیں"۔

کوئی تہذیب و تمدن راتوں رات جنم نہیں لیتا ہے نہ پنپتا ہے۔ صدیاں گزرتی ہیں جب یہ موتی اپنی آب و تاب پاتا ہے۔ نظم کے تمدن نے بھی عرصے بعد اپنی شناخت پیدا کی ہے۔ طلعت نے بھی بڑی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ میرے سامنے ان کی ایک نظم "دوسری عورت سے" ہے۔ کیا دل پذیر لہجہ ہے اس نظم کا۔ ملاحظہ ہو:

تم یہ کہہ رہی ہوتا! وہ اگر مرا ہوتا
پھر تو تا کنارِ جاں، شہرِ دل بسا ہوتا
اشک بھی اگر آتے، میری نرم پلکوں پر پھول کی طرح کھلتے
ریشم ایسے چہرے پر، میرے مسکراتے لب،
اس کا قرضِ زیبائی، شوق سے ادا کرتے۔
مجھ کو دیکھتا جب وہ، گنگناتی نظروں سے
گل فزا تصور سے رنگِ رخ سجا کرتے۔
اس کے چاند پیکر سے، آئینہ نگاہوں سے،
میری مانگ میں جگنو، روشنی بھرا کرتے۔
پھر تو تا ابد دل سے دل کا سلسلہ ہوتا!
کاش وہ مرا ہوتا!

☆☆☆

شوق اور حسرت کی جس نگاہ سے تم نے
آج اس کو دیکھا تھا
جس خیالِ آزردہ کی پناہ سے تم نے چھپ کر اس کو پرکھا تھا۔
بے قرار آنکھوں میں، مرگِ خواب کے ماتم سی نمی نمایاں تھی۔
انتظار کی ساری بے کلی ہویدا تھی، وہ زبانِ خاموشی،
اس شبِ خموشی میں، دل کو میرے ڈستی ہے۔

☆☆☆

جس حسیں کے قدموں کو رقصِ زیست کا باعث، حرزِ جاں سمجھتی ہو۔
جس تبسم آمادہ، خوب رو جواں کو تم، آسماں سمجھتی ہو۔

جس کے گھر کی راہوں میں بکھرے سنگریزوں کو،
تم نے زعمِ منزل میں شانِ آشیاں سمجھا
جس کے جسمِ خاکی کو، تم نے چشمۂ حیواں، آبروئے جاں سمجھا
اس نے تم کو جتنی بار مسکرا کے دیکھا،
تم اس کی ہر نظر کے نام آرتی اُتارا کیں۔
مشعلِ تمنا سے جل اُٹھیں تو
وزدیدہ، بے اماں نگاہی کو، رسمِ اعتنا سمجھیں

☆☆☆

ہاں۔ وہی حسین میری زندگی کا ساتھی ہے۔
ہاں۔ اسی کے بازو ہیں میری ناؤ کے پتوار۔
گہرے نیلے پانی کی وسعتوں میں، میں ہوں اور...
وہی میرا لاپرواہ، بے نیاز مانجھی ہے
آؤ تم کو بتلاؤں، اس شوخ کی آنکھوں میں
اس کی چشمِ وحشت میں کیا تپش ہے شعلوں کی
اس کے ہاتھ کی دل کش، نرم جلد کے نیچے سخت کوش پٹھے ہیں۔
اس کے دل میں نرمی کے، یوں تو ہیں کئی گوشے
پھر بھی اس کا پتھر دل
تم سے کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے کچھ نہیں کہتا۔
روزگارِ ہستی کی تال پر دھڑکتا ہے۔
اس کا دل ربا لہجہ، نہ اشارتِ دل ہے، نہ سماعتِ جاں ہے
رسم وراہِ دنیا سے، اس کا عہد و پیماں ہے۔
تم نیابتِ احساس پر نہ اتنی نازاں ہو۔
سیم وزر کی موسیقی کی طلائی دھن پر وہ رقص کرتا رہتا ہے۔
بونڈز[1] اور بلین[2] کے نقرئی نگر میں وہ محوِ صد تماشا ہے۔

☆☆☆

عام آدمی ہے وہ۔ خام دل ربا ہے وہ
میں بھی یہ ہی کہتی ہوں، کاش وہ مرا ہوتا!!

☆☆☆

اگلے سوال کے جواب میں طلعت نے کہا... ''غزل اور نظم دونوں ہی احساسات کی ترجمان

1- Bonds 2- Bullion

ہیں۔ بعض خیالات نظم میں ہی بیان ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی غزل کی تعریف ہے... 'خوب صورت عورت سے گفتگو۔ لیکن یہ تعریف نہ پہلے درست تھی نہ اب ہے۔ آج کا ادب کیا ہر دور کے ادب کو اپنے عہد کا ترجمان ہونا پڑتا ہے۔ ادیب اور شاعر جس ماحول میں رہتے ہیں اسی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ فراری تخلیقات جنم دیتے ہیں تو لگتا ہے کہ ماحول کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت اس بارہ سنگھے کا عمل کر رہے ہوتے ہیں جس نے جھاڑی میں سر چھپا کر سوچا تھا کہ شیر اسے نہیں دیکھ پائے گا"۔

طلعت اردو کے مستقبل سے ناامید نہیں ہیں۔ وہ کہتی ہیں... "جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ ذرا دیکھیں تو اردو کو کمک کہاں سے ملی! ہندوستانی فلم انڈسٹری سے، جنہوں نے اردو کو مسخ کرنے کی کوشش کی مگر پھر اردو کی خوب صورتی اور نفاست کی جانب انہیں لوٹنا ہی پڑا۔ موسیقی (گائیکی) میں بھی، خوبصورت غزلوں کی ہی جیت ہوئی۔ اردو کا رسم الخط بھی بہت خوب ہے۔ اسے تبدیل کرنے کی کوشش ایسی ہی لگتی ہے جیسے اردو کو شدھ کرنے کی تھی۔ اور اب جب کمپیوٹر کے ذریعہ اردو رسم الخط پرنٹ ہو رہا ہے تو ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ ایک مکمل خط ہے"۔

طلعت متعدد شعرا سے متاثر رہی ہیں۔ ہر اچھی تخلیق، خواہ وہ کسی بھی ہو، انہیں متاثر کرتی ہے۔ ان کی رائے میں گزری صدی کے قد آور اور ان کے انتہائی پسندیدہ شاعر اقبالؔ اور غالبؔ ہیں۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں فیضؔ احمد فیضؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، احمد فرازؔ، حمایت علی شاعرؔ، محسنؔ بھوپالی (خصوصاً محسن کے قطعات)، جوشؔ ملیح آبادی اور ساحرؔ لدھیانوی سرفہرست ہیں۔ کافی کے گھونٹوں اور خنک شام کی رومانی فضا میں طلعت کہہ رہی تھیں... "سلطانہ! کوئی یادگار واقعہ کیا بتاؤں۔ زندگی بھری پڑی ہے یادگار واقعات سے۔ ایک تحریر کروں تو دوسرے کو شکایت ہوگی۔ متعدد یادگار واقعات میں سے ایک میرے بچوں کے بارے میں ہے۔ جب پہلی دفعہ میرے قدموں کے نیچے جنت تعمیر ہو رہی تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ سبز پوش نے مجھے بلایا ہے۔ وہ ایک دیوار کے قریب کھڑے ہیں۔ میں ان کے پاس پہنچی تو انہوں نے ایک پیاری سی بچی کو دیوار پر سے اُتار کر مجھے دے دیا اور کہا ...لو۔ صوفیہ۔ میں بچی کو لیجانے لگتی ہوں تو وہ کہتے ہیں ...ٹھہرو۔ لو۔ عاصم بھی لو۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے یہی تعبیر سمجھی کہ مجھے پہلے ایک بٹی اور پھر ایک بیٹا ملے گا۔ میں ان دنوں 'اخبارِ خواتین' میں تھی۔ اپنے میز کے کیلنڈر پر میں نے یہ نام لکھ دیئے۔ اور پھر اسی ترتیب سے پہلے صوفیہ اور پھر عاصم میری زندگی میں آئے"۔

Mrs Talat Isharat,
8, Green Meadow Drive, Langhorne, PA 19047-5771 USA

انتخابِ کلام

وہ جو موسم گرما کی پہلی بارش کا چھینٹا تھا
تپ والے آنگن میں سوندھی خوشبو بن کر بکھرا تھا

***

اس کی بابت پہروں سوچتے رہنا اچھا لگتا تھا
بات کوئی بھی یاد نہیں، ہاں لہجہ دھڑکن جیسا تھا

***

ہم نے کب جھولے ڈالے تھے، ہم نے کب پینگیں لی تھیں
پیڑ کی سب شاخوں پہ زمانے کی آنکھوں کا پہرا تھا

***

ہم محتاط بہت تھے پھر کیوں ایسے در پہ دستک دی
جس کے گھرانے کی ہر پگڑی کا ہر شملہ اونچا تھا

***

نذر کیا ہر شاہجہاں نے ہر ممتاز کو تاج محل
دل کا راج سنگھاسن دینا، دل والوں کا خاصا تھا

***

ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہیں، زنجیر ہے گزرے لمحوں کی
بجلی چمکی، برکھا برسی، کُل قصہ دو پل کا تھا

***

عشق کیا یا ریت نبھائی، کیسے بتائیں کیا بیتی!
آنکھوں میں اک سیلِ بلا اور دل میں تپتا صحرا تھا

***

بابل کا آنگن، ساجن کا دوار، پرائے تھے دونوں
کون سی چوکھٹ عورت کی تھی کون سا امبر اس کا تھا

***

کوئی اگر پوچھے کہہ دینا طلعتؔ یہ بھی بھول گئے
جس کارن ہم خود کو بھولے، وہ من موہن کیسا تھا

ظفر براہِ عقیدت یہ جشنِ شاعر ہے
ہماری بزمِ ادب کے ادب کا اک گوہر
ظفر کراروی
۱۸ اگست
ہیوسٹن

ڈاکٹر ظفر کراروی

ہیوسٹن، ٹیکساس، امریکہ

ڈاکٹر سید ظفر حسین کراروی جو ظفرؔ کراروی تخلص کرتے ہیں اردو کی محبت میں شعر کہتے ہیں ورنہ غمِ روزگار سے اتنی فرصت کہاں۔ زیرِ نظر اشعار انہوں نے ہیوسٹن میں ''جشن حمایت علی شاعرؔ'' کے موقع پر پڑھے تھے۔ پھر میں نے انہیں گھیر گھار کر وقت لیا اور جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ بھی حاضر ہے۔ پہلے یہ اشعار پڑھیے۔

ادب نواز شہر میں ادب کا سوداگر ہے مہماں ہمارا ''حمایتؔ'' شاعر
ہنر ہے صحافت کا طرہ امتیاز اگر قلم ہے وقت کی نبضوں کا باکمال اثر
ہے یہ مفکر و شاعر ادب کا شیدائی براہ شعر و سخن اس کا کامیاب سفر
اسی کو کہتے ہیں جو اسم بامسمّیٰ ہے ہے شاعری کا شرف اور نام ہے شاعرؔ
ظفر براہِ عقیدت یہ جشن ''شاعرؔ'' ہے ہماری بزمِ ادب کے ادب کا اک گوہر

ظفر کراروی نے اردو زبان و ادب کی آبیاری کے لئے ایک عمر صرف کی ہے۔ اردو سے ظفر کی محبت کا یہی ثبوت کیا کم ہے کہ انہوں نے اردو کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا ہے۔

ظفر کہہ رہے تھے...''میں لکھنؤ شہر میں ہندوستان کی آزادی سے چند سال قبل پیدا ہوا۔

آبائی وطن قصبہ کراری ہے۔ (سادات) جو الہ آباد سے تقریباً پچیس (۲۵) میل دور ہے۔ بچپن اور نوجوانی کا پورا وقت الہ آباد میں گزرا۔ والد مرحوم استاد الشعرا حضرت شعلہ کراروی کے ساتھ کم عمری سے نوجوانی تک برابر چھوٹے اور بڑے مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا اور قرب و جوار کے مشہور شعراٗ میں فراق گورکھپوری، نوح ناروی، محشر مرزاپوری، بسمل الہ آبادی، شفیق الہ آبادی، شاداں دریابادی، سراج الہ آبادی، رنگین الہ آبادی، ثمر یلوری، فنا بنارسی اور مضطر مرزاپوری کو بارہا سننے کو ملا۔ والد محترم پہلے حضرت نیساں کے شاگرد تھے لیکن نیساں کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد اور میری والدہ کے چچا حضرت تحمل الہ آبادی کی شاگردی میں آ گئے۔ والد صاحب کا مجموعہ کلام "نغمہ فکر" پچیس (۲۵) سال پہلے منظر عام پر آ چکا ہے۔ تحمل صاحب کی استادانہ شاعری اور ان کا اپنے شاگردوں کے کلام کا آناً فاناً تصحیح کرنے کا پورا عمل میری نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے میں نے بی ایس سی (BSc) کیا اور پھر انجینئر نگ میں ایم ایس (M.S. in Engineering) کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کے اٹامک انرجی (Atomic Energy) ادارہ میں کلاس ون (Class I) آفیسر کے درجے پر نوکری شروع کر دی۔ بچپن سے مجھے ہمیشہ پی ایچ ڈی (PhD) کی تمنا تھی۔ اس لئے موقعہ ملنے پر گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ کر یونیورسٹی آف ہیوسٹن، ٹیکساس میں الیکٹریکل انجینیئر نگ (Electrical Engineering) کے شعبے میں تعلیم شروع کر دی اور صرف دو سال میں ڈاکٹریٹ پوری کی جو وہاں کا اب تک ریکارڈ ہے۔ ۱۹۶۹ء سے اب تک ناسا (NASA) کے مختلف شعبوں میں، جن میں اسپیس شٹل (space shuttle) اور اسپیس اسٹیشن (space station) شامل ہیں، کام کرتا رہا ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ مقامی یونیورسٹی میں تیس سال سے لگاتار ایڈجنکٹ پروفیسر (Adjunct Professor) کی حیثیت سے پڑھا رہا ہوں۔ امریکہ میں شہر ہیوسٹن میں ۱۹۶۷ء سے مستقل قیام ہے۔ بین الاقوامی ٹیکنیکل (technical) اداروں اور شعبوں میں تقریباً تیس (۳۰) سال سے مختلف عہدوں پر رہا جہاں سے مجھے درجنوں میڈلز (medals تمغوں) اور اعزازات سے نوازا گیا جس میں فیلو (Fellow) اور ایسوسی ایٹ فیلو (Associate Fellow) شامل ہیں۔

الہ آباد کے کرسچن کالج میں سالانہ شاعری کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ پہلی دفعہ اسی میں طبع آزمائی کا موقعہ ملا۔ والد صاحب نے کسی مصلحت سے میری غزل کی خود تصحیح نہ کر کے مجھے حضرت محشر مرزاپوری کے پاس بھیجا، جنھوں نے میرے خیالات کو برقرار رکھتے ہوئے الفاظ کے ردوبدل سے میری غزل کو اتنا معنی خیز بنا دیا کہ مجھے مقابلہ میں دوسرا نمبر ملا۔ زندگی کی وہ پہلی غزل میری تعلیم کی سختی کی نذر ہو گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ طبع آزمائی کا جذبہ ختم تو نہیں مگر دب گیا جو ۱۹۷۰ء کے آخری سالوں میں پھر ابھرا۔

کبھی کبھی دیار غیر میں انسان وہ کر لیتا ہے جو اپنے وطن میں شائد نہیں کر پاتا۔ آج کل ہیوسٹن میں تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی ہوں گے۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں صرف اٹھارہ (۱۸) پاکستانی اور باون (۵۲) ہندوستانی تھے (اور بنگلہ دیش کا وجود بھی نہیں تھا) اور میں سب کو

جانتا تھا۔ مگر سب ہی لوگوں کی یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ انگریزی میں بات چیت کریں۔ پھر ہندو پاک کی جنگ کا سلسلہ چل نکلا جس کی وجہ سے شہر ہیوسٹن میں کافی کشیدگی ہوگئی۔ ہندو پاک کے کمیونٹی کو یک جا رکھنے کے لئے ہم نے 'اردو سوسائٹی' کا انعقاد کیا جس کے مشاعرے میں ہم اردو غزلیں اور موسیقی کا پروگرام کرتے تھے۔ کئی سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ گو اس سے لوگوں کو غزلوں کی دھنیں تو یاد ہو گئیں اور موسیقی میں دلچسپی بھی بڑھ گئی مگر اردو کی خاطر خواہ نشو و نما نظر نہیں آئی۔ جون ۱۹۷۹ء میں میری اہلیہ نسیم فاطمہ (عابدی) نقوی (تخلص نسیم جلالوی) اور میں نے طے کیا کہ طرحی مشاعروں کی بنا ڈالی جائے جس میں عروض کی پابندی کا خاص مقام ہو۔ 'بزم ادب' کے مشاعروں کا یہ سلسلہ ہمارے غریب خانے سے ۹/ جون ۱۹۷۹ء کو شروع ہوا۔ اس مشاعرے میں اور اس کے بعد ایک سال تک ہمارے طرحی مشاعروں میں شرکت کے لئے ہر شاعر یا شاعرہ کے لئے کم سے کم تین اشعار باقاعدہ ردیف اور قافیے کے ساتھ لانا ضروری تھا۔ پہلے دو مشاعروں میں جو لوگ ردیف و قافیہ اور وزن سے واقف نہ تھے ان کو طریقہ بتایا گیا۔ نتیجہ کے طور پر لکھنے والوں کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ایک سال میں تین طرحی اشعار کی قید ہٹا دی گئی لیکن لکھنے والے بڑھتے گئے اور شعرا کی تعداد پندرہ (۱۵) سے اٹھارہ (۱۸) تک پہنچ گئی۔ وہ خواتین و حضرات جو اب بھی طبع آزمائی نہ کر سکے ان کے لئے غیر طرحی اور بیت بازی کا دور رکھا گیا۔ لیکن پہلے تین (۳) برسوں میں ہمارے مشاعروں میں، جو سال میں پانچ بار ہوتے تھے، ہر شرکت کرنے والے کو کم سے کم ایک شعر ضرور سنانا پڑتا تھا۔ سنا گیا ہے کہ ہمارے مشاعروں میں شرکت کے لئے لوگ ایک ڈالر فی شعر خریدتے تھے۔ واللہ اعلم یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ 'بزم ادب' کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ وہ خواتین اور حضرات جنھوں نے یہاں سے طبع آزمائی شروع کی تھی آج امریکہ کے دوسرے شہروں میں اور واپس جا کر پاکستان اور ہندوستان میں ادب کا نام روشن کر رہے ہیں۔

'بزم ادب' کی طرف سے ہم نے ہیوسٹن میں متعدد بین الاقوامی مشاعرے کیئے جس میں طرحی اور غیر طرحی دونوں دور شامل ہوا کرتے تھے۔ ہم نے ان مشاعروں میں برصغیر ہند و پاک کے مشہور شعرا کو مدعو کیا جنھوں نے واپس جا کر اپنے سفرناموں میں ہیوسٹن کی 'بزم ادب' کے طرحی مشاعروں کا تذکرہ کیا۔ ان شعرا کی فہرست میں چند نام یہ ہیں:

حمایت علی شاعر، پیرزادہ قاسم، وسیم بریلوی، غفار اثر، بیگم ممتاز مرزا، قتیل شفائی، بشیر بدر، مظفر شکوہ، جمیل الدین عالی، افتخار عارف، احمد فراز، رئیس امروہوی، جگن ناتھ آزاد، منیر نیازی، کشور ناہید، صہبا اختر، حسن عابد، شان الحق حقی، صہبا لکھنوی، شعلہ کراروی، مجروح سلطانپوری، حفیظ میرٹھی، منظر بھوپالی، سلیم کوثر، آشفتہ چنگیزی اور خواہ مخواہ حیدرآبادی۔

ہر سال 'بزم ادب' چار سے پانچ طرحی مشاعرے، ایک طرحی مسالمہ اور ایک طرحی نعتیہ مشاعرہ کرتی آئی ہے جس کا سلسلہ ۱۹۷۹ء سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے اور جس کی وجہ سے ہم سب ممبران 'بزم ادب' کو غزل، سلام اور نعت لکھنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے۔ میں بھی 'بزم ادب' کے طرحی

کلام کی بندش کی وجہ سے تئیس (۲۳) سال سے غزل، نظم، قصیدہ، سلام، نعت اور سہرا وغیرہ لکھتا رہا ہوں لیکن کلام چھپوانے کا کبھی شوق نہیں ہوا۔ میں نے وقت کی کمی کی وجہ سے باہر شہروں کے مشاعروں کے دعوت نامے بھی کم قبول کیئے ہیں''۔

نثری نظم کے حوالے سے انہوں نے فرمایا... ''طبع آزمائی کے لئے یہ شرط ہے کہ اشعار میں تخئیل ضرور ہو چاہے وہ خیال پرانا ہو یا نیا۔ تخئیل کی ادائیگی کے لئے چنیدہ الفاظ ہوں اور اسی کے ساتھ اشعار کا وزن موزوں ہو۔ میں نثری نظم کو شاعری کہنے کے لائق نہیں سمجھتا۔ تخئیل کی پرواز، آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعری کو پٹری سے اُتار دیا جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ خیالات کو نثر میں پیش کیا جائے جس میں اظہار خیال کی زیادہ گنجائش رہتی ہے اور شاعری کو بدنامی سے بچایا جائے۔ ظاہر ہے کہ میری اس رائے سے وہ متفق نہ ہوں گے جو نثر اور نظم کی بنیادی تعریف کو سمجھنا نہیں چاہتے۔

اردو زبان اور ادب ایک مستحکم ادارہ اور درس گاہ (institution) ہے اور ہماری تہذیب کا ایک اہم رکن ہے۔ اگر ہم نے اردو زبان اور اردو ادب کو بھلا دیا تو گویا ہم نے اپنی تہذیب کو ختم کر دیا۔ پچیس (۲۵) سال پہلے ہمارے کچھ دوست واحباب کا کہنا تھا کہ دس (۱۰) برس بعد اس ملک میں اردو ختم ہو جائے گی۔ مگر 'بزم ادب ہیوسٹن' اور ایسی دوسری انجمنوں کی محنت سے اردو کا مستقبل بہت ہی پُر امید نظر آتا ہے۔ میرے غریب خانے پر ہر اتوار کو چھوٹے بچے قرآن اور دینیات کے ساتھ ساتھ اردو بھی سیکھتے ہیں۔ مقامی مذہبی اور قومی اداروں نے بھی اب اس طرف فکر کرنا شروع کر دی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں بھی وہ لوگ جو اپنے بچوں کو گھر میں اردو نہیں پڑھاتے میری اردو کے مستقبل کی رائے سے متفق نہ ہوں گے''۔

اگلے سوال کے جواب میں ظفر نے ایک پتے کی بات کہی۔ انہوں نے کہا... ''ہاں کچھ لوگوں نے اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی تجویز کی ہے جو میرے خیال میں اردو کے خلاف بہت ہی سخت سازش ہے۔ ہندوستان میں اردو کے دشمنوں کی یہ مہم ہے کہ اردو رسم الخط کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور صرف دیوناگری (ہندی/سنسکرت) رسم الخط پڑھایا جائے۔ اردو ادب سے متعلق مضامین اور کلام، اور ادبی اور اسلامی تاریخ کو ہندوستانی کتابوں سے نکالا جا رہا ہے۔ اردو کو نصاب سے یہ کہہ کر نکالا جا رہا ہے کہ اب اردو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی کیوں کہ اب غزلوں اور نظموں کو ہندی میں پڑھا جا سکتا ہے (بقول 'غزل' کو 'گجل' اور 'نظم' کو 'نجم')۔ ان ہی کرم فرماؤں کی وجہ سے ہندوستان کی نئی پود نے اردو سیکھنا بند کر دیا ہے۔ ان سب ہی بڑے اور چھوٹے شہروں میں، جہاں اردو کا بول بالا ہوا کرتا تھا، اب دور دور تک اردو کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ اس ملک میں ہمارے بچے اسپینش (Spanish ہسپانوی)، فرنچ (French فرانسیسی)، جرمن (German المانی) سیکھتے ہیں اور مہارت حاصل کرتے ہیں۔ کیا ہم اسی طرح ان بچوں کو اردو نہیں سکھا سکتے؟

یہاں امریکہ میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنے بچوں کو اردو کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ان کی سہولت کے لئے ان سے کہتے ہیں کہ تم کو اردو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہم اردو شاعری کا ترجمہ انگریزی میں فراہم کردیں گے۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ میں شاعر کے خیالات کے ساتھ ساتھ ترجمہ کرنے والے کے خیالات بھی شامل ہو جاتے ہیں جس سے اشعار کی اصلیت ختم ہو جاتی ہے۔ بچوں کو اردو نہ پڑھا کر اور صرف شاعری کے ترجمے کو پڑھانے کے خلاف نہ جانے کتنے دلائل دیئے جاسکتے ہیں۔ بات یہیں پر ٹھہرتی ہے کہ اگر ہم بچوں کو اردو پروگراموں میں شامل کریں اور گھر پر والدین باقاعدگی سے اردو پڑھائیں تو اردو کا مستقبل پُرامید ہوگا ورنہ نہیں''۔

ظفر کا کہنا ہے... ''غزل متفرق خیالات کے اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے اور نظم ایک ہی موضوع کے خیالات کو اشعار میں باندھتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے غزل کے مقابلہ میں نظم اپنے عہد کی ترجمانی زیادہ کرتی ہے۔ مگر نظم وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔ میرے رائے میں اردو اتنی قیمتی، نفیس اور اعلیٰ زبان ہے کہ اس کو اپنا کر کوئی بھی گھاٹے یا نقصان میں نہیں رہ سکتا۔

میں بنیادی طور پر روایتی (ٹریڈیشنل traditional) شاعری کا دلدادہ ہوں، گل و بلبل نہیں بلکہ شاعر کا اپنے خیالات کو انوکھے الفاظ کے چناؤ سے اشعار میں باندھنا اور عروض کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ میر، غالب اور مومن میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ میرا نظریہ اور کوشش یہی ہے کہ ہمارے اشعار باوزن اور بحر میں ہوں اور ہماری طبع آزمائی سے میر اور غالب کی روحوں کو اذیت نہ ہو''۔

ظفر نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا:

''میں نے شہر ہیوسٹن میں پہلا دیسی ریڈیو پروگرام شروع کیا جس کا نام تھا 'افروایشین کلچرل کاروان (Afro-Asian Cultural Caravan)'۔ اس کے بعد غزلوں اور موسیقی کے دوسرے پروگرام 'سنگیت بہار' اور 'جھنکار' نام کے شروع کیئے۔ جن میں میری اہلیہ تسنیم جلالوی میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ ان پروگراموں میں ہم نے ہند و پاک کے وزیروں، سفیروں اور فلمی ہستیوں کے انٹرویو پیش کیئے۔ ان مہمانوں میں گلوکار، موسیقار بھی شامل تھے۔ ایک غیر معمولی موقعہ وہ تھا کہ جب ناسا (NASA) کی ایک ٹرپ (trip) پر سب لوگ موسیقار کلیان جی آنند جی کے دستخط (آٹو گراف autograph) لے رہے تھے اور کلیان جی مجھ سے میرے آٹو گراف کی فرمائش کر رہے تھے۔

مجھے خوشی ہے کہ سلطانہ مہر صاحبہ نے شعرا کے بارے میں مضامین اکٹھا کرنے کا یہ سخت اور مشکل کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ ان کی پچھلی تصانیف میری نظر سے گزری ہیں اور یہ ان ہی کی ہمت ہے کہ وہ ایسی مشغول زندگی میں بھی اتنا سب کچھ کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہمت میں اضافہ کرے اور وہ اسی طرح ادب کی خدمت کرتی رہیں''۔

Dr. Zafar Kararvi,

9874 Sageaspen, Houston, Texas, USA

انتخابِ کلام:

فصلِ گل دیکھا کئے دورِ خزاں دیکھا کئے
ہم زمانے کی یوں ہی انگڑائیاں دیکھا کئے

نور کے پردے میں ظلمت کو نہاں دیکھا کئے
آتشِ غم درد کی چنگاریاں دیکھا کئے

دم بخود حسرت سے شب بھر یہ سماں دیکھا کئے
مانگ جیسی آسماں پر کہکشاں دیکھا کئے

وقت آخر وہ سرِ بالیں اگر آئے تو کیا
ٹکٹکی باندھے فقط وہ ہچکیاں دیکھا کئے

راہ غربت میں جو تھک کر ہو گئے بیہوش اور
ہوش جب آیا تو گردِ کارواں دیکھا کئے

تھے قفس در آشیاں جب پھر ظفر کرتے ہی کیا
آشیاں جلتا رہا ہم تیلیاں دیکھا کئے

دے اگر کوئی محبت سے محبت کا جواب
خوش نہ ہونا چاہیئے، حیران ہونا چاہیئے"

عابد ودود

عابد ودود

بریڈفورڈ، برطانیہ

مجازؔ... اسرارالحق مجازؔ، اپنے وقت کا ایک معتبر شاعر... اس کی انا بھی اس وقت زخم زخم ہوئی تھی جب اُسے محض شاعر جان کر اس معاشرے میں یوں نظر انداز کیا گیا تھا کہ جیسے وہ اس معاشرے کا ناکام ترین فرد اور عضوِ معطل ہو۔ تب مجاز نے خود احتجاجاً ہی اپنے آپ کو نظر انداز کرنا شروع کردیا اور اس زر پرست معاشرے سے انتقام لینے کے لئے خود کو گردِ راہ بنالیا۔ وہ جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرتے پھرتے خود اپنے آپ سے اپنے غم کا مداوا پوچھ رہا تھا۔ اے غم دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں۔

عابد ودود کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے مجاز بہت یاد آیا۔ میری اردو دنیا کا ایک حساس شاعر، ایک معتبر شاعر معاشرے کی بے اعتنائی کی نذر ہوگیا۔ وہ کل کی بات تھی اور یہ آج کی بات ہے۔ آج کا ایک معتبر شاعر عابد ودود کہتا ہے۔

کس نے افلاس کی دنیا بنا ڈالی ہے
ایسے لگتا ہے کہ یہ زندگی ایک گالی ہے
کیسے میں حالِ دل کہوں دورِ ستم کا یارب
سچ کا اظہار تو قاتل کے لئے گالی ہے
شہرِ افرنگ میں عابد ہوں جہاں مدت سے
دھن کی بارش ہے مروت کی قحط سالی ہے

اور یہ بھی عابد ودود نے کہا جیسے وہ محفل میں ہو کر بھی تنہا ہو۔

محبتیں ساری اُڑ گئی ہیں بس اب تو کہنے کو دوستی ہے
جسے بھی دیکھو خدا بنا ہے کچھ ایسی اب ہوا چلی ہے
سکوت اتنا ہے شہرِ دل میں کہ ذوق ہنگامہ چاہتا ہے
کسی کو ہو درد تو وہ چیخے کہ آج تو چیخ بھی بھلی ہے

عام انسان کی عزتِ نفس بھی زخمی ہوتی ہے مگر شاعر کے زخموں کی ٹیسیں فریاد بن جاتی ہیں کہ وہ عام انسانوں سے مختلف اور زیادہ حساس ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ادب کے گہر پارے کس طرح وجود میں لائے۔ ایسوں سے ہمارا برتاؤ بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ عابد ودود کی زندگی میں بھی ایسے کئی کئی واقعات اور حادثات موجود ہیں جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ کچھ شعور کا حصہ ہو جاتے ہیں باقی تحت الشعور کے نہاں خانوں میں دبکے پڑے رہتے ہیں۔ تاہم جب یہ سر اٹھاتے ہیں تو نفس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور انسان مر مر کر زندگی کا ساتھ نبھاتا ہے۔ انہوں نے دو ایسے واقعے سنائے جس نے ایک شاعر کی عزت نفس کو بری طرح مجروح کیا۔ پہلا واقعہ انہیں اس وقت پیش آیا جب وہ تین چار سال پہلے اپنے آبائی وطن پاکستان عزیز واقرباً سے ملنے گئے۔ عابد بتا رہے تھے... ''وہاں میرے ایک دوست اور کرم فرما جناب ابراہیم فانیؔ نے، جو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں استاد ہیں اور خود اربعہ اللسان شاعر ہیں، میرا تعارف اپنے ایک جان کار سے کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں شاعر ہوں اور انگلینڈ میں مقیم ہوں۔ ان کے دوست نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا کہ شاعری کے علاوہ اور کیا کچھ کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ بس شاعری کرتا ہوں۔ اس پر ان کے چہرے پر کچھ تشنج کے آثار نمودار ہوئے اور فوراً معذرت خواہی کے ساتھ مصافحہ کرکے یہ کہہ کر چلے گئے کہ انہیں کوئی ضروری کام اچانک یاد آ گیا۔

دوسرا واقعہ میری شادی کے چند دن بعد کا ہے جب ایک قریبی عزیز نے تاسف اور اپنی حیرت برملا سمیت یہ کہہ کر ظاہر کیا کہ کیا لڑکی والوں کو لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھمانے سے پہلے معلوم تھا کہ میں شاعر ہوں''؟

عابد ودود ان کا نام بھی ہے اور نام کے دونوں حصے تخلص کے طور پر بھی استعمال کیئے جاتے ہیں۔ ان کی جائے پیدائش زوبی ہے جو سابق ضلع مردان (موجودہ ضلع صوابی)، صوبہ سرحد پاکستان میں واقع ہے۔ تاریخ پیدائش ۲۸/ جولائی ۱۹۵۳ء ہے۔ عابد نے بتایا انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے ۱۹۷۶ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۹۰ء میں بریڈفورڈ کالج (برطانیہ) سے بی اے آنرز کیا۔ اس سے قبل ۱۹۸۹ء میں اسی کالج سے ڈپلوما ان ہائر ایجوکیشن (ڈیپ ایچ ای DipHE) کر چکے تھے۔ انہیں ایم اے کرنے کی خواہش ہے لیکن ابھی تک ذاتی و معاشی مشکلات کی وجہ سے اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکے۔

عابد بتا رہے تھے... ''میں نے والدہ کو فارسی اور پشتو کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے بچپن سے دیکھا۔ گو ان کی پیرانہ سالی اب انہیں مطالعے کی اجازت نہیں دیتی تاہم اب بھی وہ مجھ سے کتابیں

پڑھوا کر سنتی ہیں اور اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین اور ذہنی بصارت کو تغذیہ فراہم کرتی ہیں۔ میرے لئے ان کی ذات ادبی روشنی کا مینار ہے۔ اسلامیہ کالج، پشاور میں ایف ایس سی کے سال رواں میں احمد فراز اردو پڑھاتے تھے، پروفیسر محسن احسان انگریزی زبان وادب اور پروفیسر سحر یوسف زئی (اردو/ پشتو کے شاعر، 'آگ اور سائے' کے مصنف) پشتو کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح اسلامیہ کالج کی عام فضا شاعر پرور تھی۔ یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے جب میں نے سال اول میں اپنے جیب خرچ سے بچت کر کے اسّی (۸۰) روپے جمع کیئے اور اپنے کلام کا ایک کتابچہ بعنوان 'آنسو' کی سو (۱۰۰) کاپیاں چھپوائیں۔ اس وقت مجھے نہ تو یہ علم تھا کہ شعر کے لئے باٹ بنے ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ شاعری کی دنیا میں بحر بھی ہوتے ہیں۔ کتابچہ چھپ کر آ گیا تو ایک ناقابل بیان احساس تسکین اور اپنے آپ میں کچھ ہونے کا احساس دل میں انگڑائی لینے لگا۔ اپنی اس کامیابی میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چناں چہ میں نے جناب احمد فراز کو، جب وہ ہمارے ہوسٹل میں کیمسٹری کے پروفیسر اور ہوسٹل کے وارڈن جناب حقانی صاحب سے ملنے تشریف لائے، اس کتابچے کی ایک کاپی پیش کی۔ انہوں نے کتابچے کی ورق گردانی کی اور شفقت سے اپنے پاس بٹھا کر دریافت کیا کہ چھپائی کے لئے پیسے کہاں سے آئے۔ میں نے انہیں سچ سچ بتا دیا کہ میرے والد ایک بحر نورد (seaman سی مین) ہیں، میری پڑھائی اور کھانے پینے کے اخراجات ماہ بماہ بھیجتے ہیں اور اس میں سے بچت کر کے میں نے چھپائی کے لئے رقم جمع کی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر میرے جذبے کو سراہا اور مشورہ دیا کہ آئندہ کلام چھپوانے سے پہلے انہیں دکھلایا کروں اور ضروری تصحیح کروالیا کروں۔ انہوں نے کہا کہ اس میدان میں بے انتہا محنت اور لگن کی ضرورت پیش آتی ہے اور اگر میں ایسا کر سکا تو میرے لئے بہت کچھ ہے کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ آئندہ چل کر میں لکھ سکوں گا۔ میں نے باقاعدہ شاعری تو ۱۹۷۲ء میں انگلینڈ آ کر شروع کی۔ اور یہاں آ کر جو پہلا شعر کہا وہ یہ ہے ؎

یہ زندگی کس جگہ کھڑی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ نہ تیرگی ہے نہ روشنی ہے

میرا پہلا مجموعۂ کلام 'کڑی دھوپ کا مسافر' القلم، اسلام آباد سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی نے ۲۰۰۰ء میں طبع ثانی کی اور اب حرف اکیڈمی، راولپنڈی نے طبع ثلاثہ کا اہتمام کیا ہے۔ دوسرا مجموعہ بنام 'زرِ خاک' زیر ترتیب ہے اور انشاءاللہ ۲۰۰۳ء کے آخر تک منظر عام پر آجائے گا"۔

اصناف سخن میں عابد ودود غزل سے مانوس ہیں۔ ان کا کہنا ہے..."میں غزل کا شاعر ہوں۔ ویسے کبھی کبھار معرا اور آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ جہاں تک نثری غزل کا سوال ہے، ایسی کوئی صنف ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ترکیب ہی غلط ہے، نثر نثر ہے اور غزل غزل۔ جو لوگ شاعر نہیں اور اپنے آپ کو شاعر منوانے پر تلے ہوئے ہیں وہ ایسی شعبدہ بازی کا سہارا لیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تجربے کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی ورنہ ترقی کے تمام امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ اگر تجربے منفی پہلو لے لیں تو نتائج بھی منفی مرتب ہوں گے

اور منفی نتیجہ کوئی قابل قبول نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس سے علم و ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بفرض محال اگر نثری غزل بحیثیت ایک صنف مان بھی لی جائے تو غالب کے خطوط، پریم چند کے افسانے اور دیگر بہت سے نثری ادب پارے، سب غزل کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔ کیا ہم ان کو غزل تو دور کی بات ہے، شعر کے زمرے میں شامل کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟

میں رسم الخط کے بارے میں کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، یہ زندہ رہے گی، اس کا ادب ہوسکتا ہے پاکستان سے باہر زندہ نہ رہ سکے۔ شاید پاکستان سے باہر یہ زبان بھی مشکل سے ہی پنپے''۔

انہوں نے کہا۔.. ''میں نہیں مانتا کہ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے۔ غزل کے ایک شعر یا مصرعے میں اختصار سے وہ تمام باتیں سموئی جاسکتی ہیں جو نظم کے کئی اشعار کے بند میں یا پوری نظم کی طوالت میں کہی جاتی ہے۔ نظم احساسات کا ایک طویل بیانیہ ہے اور غزل احساس کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام۔ شاید فارسی کے کسی شاعر کا یہ شعر اس بات کی بہتر تفسیر کرسکتا ہے کہ شاعر کو اپنے احساس کی ترجمانی کے لئے کسی بھی صنفِ سخن کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

می پرس از نے کہ چہ می گوئید   نہ کے از نے نواز کہ چہ می گفت

یہ درست ہے غزل آج سکہ رائج الوقت ہے اور غالبؔ و میر اس صنف کے امام ہیں۔ لیکن بعض شعرا کی پہچان نظم سے ہوتی ہے جیسے جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، ن م راشدؔ۔ انہوں نے پچھلی نصف صدی میں نظم کو درجہ کمال کو پہنچادیا تو کون کہہ سکتا ہے آئندہ پچاس ساٹھ سال بعد نظم کا مقام کیا ہوگا''؟

عابد کے پسندیدہ شعرا کی فہرست میں پرانے امام غالب اور میر ہیں۔ ان کی رائے میں اقبالؔ ہر عہد میں موجود ہے کوئی شاعر ان کو طرح دے کر آگے نہیں نکل سکا۔ پچھلی صدی کے آخر میں فیض احمد فیضؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور احمد فراز کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ احمد فرازؔ کی شاعری آج کی بولتی شاعری ہے جب کہ قاسمی صاحب کی شاعری آفاقی پہلو سے معمور ہے۔

آیئے اب ان کی فکر کا عکس ان کے چیدہ چیدہ متفرق اشعار میں دیکھیں۔

Mr. Abid Wadood,

75 Lansdale Street, Bradford, West Yorkshire, BD3 0AL, UK

انتخابِ کلام

لندن ہو کہ پیرس، مجھے اچھے نہیں لگتے
میں نے تو پشاور کی سی دنیا نہیں دیکھی

تھوہر کھائی جس نے بھوک مٹانے کو
کون سی دنیا کی لڑکی تھی، کس کی تھی

غرورِ ذات کی مسند پہ بیٹھنے والا
بھگت رہا ہے دل آزاریوں کا خمیازہ

ہر ایک شخص تعاقب میں دوسرے کے ہے
معاشرت نے وفا کا بکھیرا شیرازہ

زبان پہ آیا ہوا مدعا نہ کہنے دے
مرے خدا تو مجھے مانگنے سے پہلے دے

مری غریبی مری عمر بھر رفیق رہی
کہاں کی دوستی، کہاں کے عزیز، رہنے دو

کوئی تو کھوٹ ہے اخلاص میں اماموں کے
صلوٰۃِ عشق سے بھی بدگمانیاں نہ گئیں

آدم کا وارث ہوں عابدؔ
دنیا کی ہر چیز مری ہے

میں جوشِ گل کی ہوں رباعی، میں چشمِ تر نہیں
جمالِ زخم مرا، اشک کا اسیر نہیں

عابدہ کرامت
۳۰ مارچ ۲۰۰۱ء
ٹورانٹو

عابدہ کرامت

رچمنڈ ہل، کنیڈا

۲۴/مئی ۲۰۰۲ء کی شام تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ اور شکاگو کی یہ شام رات میں ڈھل رہی تھی جب حامد امروہوی اور تحقی امروہوی کی صاحب زادی محترمہ زہرہ قادری کی دعوت پر ہندوستان، پاکستان، امریکہ اور کنیڈا کے شعرا و شاعرات ایک ہال میں جمع تھے۔ یہ مشاعرہ مستحق لوگوں کو تعلیمی امداد فراہم کرنے کے لئے زہرہ قادری نے اپنی پیاری باجی جگنو کی معاونت سے اپنی انجمن "زیم زہوپ (Zam's Hope)" کی طرف سے منعقد کیا تھا۔ ایک طرف افتخار نسیم افتی نوشی گیلانی کی خیر خیریت پوچھ رہے تھے تو ایک صف میں محترمہ رضیہ فصیح احمد، ان کی بہن صفیہ سمیع احمد، خالد خواجہ اور میں مدتوں کے بعد یک جائی پر محبت کے پیغام کا تبادلہ کر رہے تھے کہ عابدہ کرامت کے نام کا اعلان ہوا۔ ہم سب متوجہ ہوگئے۔ عابدہ نے اپنی نئی غزل سے آغاز کیا۔

بے وفائی کیسے ہو تربیت ہی ایسی ہے
کس طرح بدل جائیں شخصیت ہی ایسی ہے
جس جگہ پہنچتے ہیں لوگ جان جاتے ہیں
آئینہ ہے پیشانی، شہریت ہی ایسی ہے

کیا کاٹ ہے اس شعر میں کہ ہال میں جیسے تہلکہ مچ گیا تھا۔ اور عابدہ کہہ رہی تھیں

حال پوچھنے والے تھک چکے ہیں سُن سُن کر
اور کیا بتائیں بس ، خیریت ہی ایسی ہے
خود لیا ضرب دے کر ، مجھ کو کر دیا تقسیم
اب کتابِ دنیا میں علمیت ہی ایسی ہے

ہر شعر ایک ضرب کی مانند تھا۔ احساسات چیخ جاتے تھے اور عابدہ کا کلام اپنی اپنی صورتِ حال پر چسپاں نظر آتا محسوس ہوتا تھا۔ اگلا شعر اپنے اپنے غلام ملکوں کی ذہنیتوں کے تناظر میں دیکھیئے کہ عابدہ کا کلام ہم سب کو آئینہ دکھا رہا تھا۔

ہم فریب کھاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں
بھولنا ہی پڑتا ہے ، حیثیت ہی ایسی ہے
پھول پھل رہا ہے بس ، اک نظامِ طاغوتی
ہم بھی اس میں شامل ہیں ذہنیت ہی ایسی ہے

عابدہ اور ان کے شریک حیات کرامت غوری کو میں کم و بیش پینتیس (۳۵) سال سے جانتی ہوں۔ وہ زولوجی (zoology علم الحیوانات) میں ایم ایس سی کر رہی تھیں۔ کرامت غوری سے شادی ہوئی تو عابدہ ایم ایس سی ڈگری کو طاق میں رکھ کر گھر داری کرتی رہیں اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کو فرض اوّلین بنا لیا۔ عابدہ کی جائے پیدائش جھانسی ، ہندوستان ہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ والدین کے زیر سایہ ہجرت کر کے کراچی آگئیں۔ چونکہ کرامت حکومتِ پاکستان کی فارن سروسز سے وابستہ تھے ، وہ شادی کے بعد شوہر کے سنگ ملکوں ملکوں گھومتی رہیں۔ یوں عابدہ نے نیویارک ، ارجنٹینا ، فلپائین ، جاپان ، چین ، الجزائر ، کویت اور ترکی میں ایک زندگی گزار دی۔

عابدہ کی بنیادی وابستگی شاعری سے ہے۔ گو کہ ان کے ننھیالی یا ددھیالی گھروں میں کوئی شاعر نہ تھا لیکن ان کی دادی اماں کو اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ بس شاعری عابدہ کی گھٹی میں پڑی اور ایسی پڑی کہ اب ان پر اچانک آمد ہوتی ہے جو اکثر ہفتوں قائم رہتی ہے۔ اس پر بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ اپنا کلام کہیں اشاعت کے لئے بھیجنے کا اہتمام نہیں کرتیں۔ کبھی کراچی کے ''سیپ'' میں چھپ گیا تو کبھی دہلی کے ''بیسویں صدی'' میں۔ ''حاصلِ آگہی'' عابدہ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اور دوسرا ''رت جگوں کی چاندنی'' جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ عابدہ کا کلام جو ستر (۷۰) اور اسّی (۸۰) کی دہائیوں میں کہا گیا تھا وہ ۲۰۰۱ء میں کہیں جا کر ''بچھڑی ساعتوں'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر تو فکر کا سیلِ رواں چل پڑا۔ اور ''ٹوٹا ہوا دروازہ'' ، متاعِ صراط'' اور'' دوپٹے میں کہاں تک جذب کرتی'' کے نام سے ان کی شاعری صحیفوں میں محفوظ ہوگئی۔ مگر عابدہ کی محبت نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان سے وہ کلام بھی کہلوایا جو بہت سے شعرا اور شاعرات کی توجہ سے محروم رہا اور وہ ہے ''رباعیات''۔ اس ساری کتاب میں ان کی

نوائے رباب' سے ان کے پیار کے نقوش الفاظ کی صورت میں اور الفاظ سے اشعار بن کر محبت کی ایک دل آویز مالا پہنے ہوئے ہیں۔ کرامت کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ عابدہ جو بہت محبت کرنے والی بیوی ہے اور اپنے بچوں کو دیوانگی کی حد تک چاہنے والی ماں ہے، اس کے ہاں احساسات کی شدت اور جذبوں کی گہرائی اتنی ہے کہ اس کے امتزاج نے شاعری کے اس گل دستے میں مختلف رنگوں اور خوش بوؤں کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک نے اردو ادب کے چمن کو ایک نیا نکھار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ان پھولوں کے پیرہن میں وہ کانٹے بھی چھپے ہوئے ہیں جو عابدہ کے سوز و گداز کے ترجمان ہیں اور جن کے بغیر پھولوں کے رنگ نکھرتے نہیں۔

عابدہ جس دور میں زندگی کر رہی ہیں اس میں آسمان ادب پر شاعرات کی کئی کہکشائیں سجی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود عابدہ کے اظہار نے اپنی ایک الگ راہ اختیار کر کے ان کہکشاؤں میں ان کے نام کے گرد ایک مدھم مدھم روشنی کا ہالہ سا بنا دیا ہے جو خود اپنی پہچان کراتا ہے۔ اس حوالے سے عابدہ کہتی ہیں... "آج کی شاعرات نے اپنی فکر اور سوچ کو لب و رخسار تک محدود نہیں رکھا۔ آج غزل میں بھی گرد و پیش کے مسائل کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔ آج کی شاعری زندگی کی دوسری جہتوں کی بھی ترجمان ہے۔ زندگی کے وہ پہلو اور زاویے جو لب و رخسار سے کہیں زیادہ محترم ٹھہرتے ہیں آج کی شاعری کی پہچان بنے ہوئے ہیں"۔

اردو کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے عابدہ کہتی ہیں... "نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں بلکہ اردو کے شیدائیوں کو مغرب میں خصوصی طور پر اپنے بچوں کو اردو سے روشناس کرانے کے لئے والدین اپنے وقت کی قربانی دیں اور بچوں کو گھر پر اردو کی تعلیم دیں۔ کم از کم لکھنے پڑھنے کی حد تک انہیں اردو سے متعارف کرائیں اور گھر پر اردو میں گفتگو کریں۔ ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود کرامت اور میں نے اس بات پر خاص توجہ دی کہ جب ملک سے باہر رہنے کے باعث بچوں نے انگریزی اور فرانسیسی اسکولوں میں تعلیم پائی اس وقت ہمارے بچے اردو سے دور نہ ہو جائیں۔ اور ہم دونوں کو خوشی ہے کہ ہمارے بچے اردو جانتے ہیں"۔

عابدہ کے پسندیدہ شعرا میں رضی اختر شوقؔ مرحوم، حمایت علی شاعرؔ، احمد فرازؔ اور احمد ندیم قاسمی کے نام سر فہرست ہیں۔ ان کا کہنا ہے ... "شاعری چھوٹی بڑی نہیں ہوتی کیونکہ ہر شاعر اپنا تجربہ اور نکتہ نظر بیان کرتا ہے۔ ہاں فکر اور مطالعہ شعر کو سقم سے پاک کر کے اس کو پختگی دیتا ہے۔ اس میں فکر کا رچاؤ ہوتا ہے اور اسلوب میں نکھار پیدا ہوتا ہے جس سے اشعار میں ایک وارفتگی سی پیدا ہو جاتی ہے"۔

عابدہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے دیال سنگھ کالج، لاہور کے پروفیسر اختر شمار نے کہا ..."یوں تو بعض شاعرات کے ہاں جذبات نگاری اخلاقی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ایسی شاعری باعث تلذذ ہونے کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے مگر عابدہ کرامت کی شاعری عورت کے تقدس اور علم و آگہی کا ایک حسین گل دستہ ہے۔ ان کی شاعری سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خواتین فقط

اپنے ہونے اور صرف نسائی جذبات اور احساسات کی شاعری نہیں کرتیں بلکہ شعور و آگہی، علم و حقائق اور دردمندی کو بھی موضوعِ سخن بنا سکتی ہیں''۔

Mrs. Abeda Karamat,
7 Cantex Court, Richmond Hills, Ontario, L4S 1B1, Canada

انتخابِ کلام

کٹھن ہے رشتوں کی اس آگ سے گزرنا بھی
ہیں جن سے اچھے مراسم اُن ہی سے ڈرنا بھی

وہ جس نے اتنی محبت سے مجھ کو پھول کہا
سو اُس کے حکم پہ کھلنا بھی تھا بکھرنا بھی

وفا کا کچا گھروندا ہمیں بچانے کو
پڑا ہے بامِ انا سے ہمیں اُترنا بھی

جو ایک لاش اُٹھائی تو اور اُٹھیں گی
غضب ہوا ہے مرے شہر میں تو مرنا بھی

لگی ہوئی تھی ہر اک سمت آگ بستی میں
اس تپش میں تھا جذبوں کو سرد کرنا بھی

جھڑی تھی اشک کی ہر سرد مہر موسم میں
کمال تھا اُسی بارش میں زخم بھرنا بھی

باسم ربّی

تھا تقاضا فن کا عارف سچ بہت کڑوا نہ ہو
سچ کہا لیکن زباں میں دلکشی رکھنی پڑی

خواجہ محمد عارف

۱۵ جون ۲۰۰۴ء

خواجہ محمد عارف

برمنگھم، برطانیہ

محترم بھائی مقصود الٰہی شیخ کی کاوش رسالہ ''مخزن'، شمارہ ۲'' کی چھوٹی سی تعارفی تقریب تھی۔ میزبان محمد عارف تھے۔ اس سے قبل میں ایک مشاعرے میں عارف کو سن چکی تھی۔ ان کی میزبانی میں گفتگو کا موقع بھی ملا۔ ان کو دیکھ کر اور گفتگو کر کے مجھے لگا کہ انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق دو طرح کی تعلیمات حاصل کی ہیں، یعنی ایک وہ تعلیم جو خوش حال زندگی کی نقیب بنے، انسان دنیا میں رہتے ہوئے اس تعلیم کے ذریعے ایک باوقار زندگی گزار سکے اور جو دنیا کے ہر شعبۂ حیات میں اس کی ممد و معاون ہو۔ دوسری وہ تعلیم جس کے ذریعے قربِ خداوندی حاصل ہو کیوں کہ قربِ خداوندی کی ہر شاہراہ جستجو اتباعِ رسول کی راہ سے گزرتی ہے۔ حضورؐ نے اول الذکر تعلیم کے استاد کو ''شیخ الشریعت'' اور آخر الذکر تعلیم کے استاد کو ''شیخ الطریقت'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

محمد عارف شیخ الشریعت یا شیخ الطریقت ہوں یا نہ ہوں مگر ان کا طرزِ گفتگو اور طرزِ حیات عام الناس سے علیحدہ ہے۔ انہوں نے شاعری کی اصناف میں اپنا یہ ہنر آزمایا ہے۔ ملاحظہ ہو

جب بھی نیت ہو کہ لکھنا ہے قصیدۂ رسولؐ — کم سے کم ایک درود آپؐ پہ پڑھ کر لکھو
صرف الفاظ سے اوراق نہ کالے کر دو — خون سے اسمِ نبیؐ تختیِ دل پر لکھو

ان کی توصیف میں دن رات برابر لکھو ۔۔۔ لکھتے جاؤ کہ نہیں انؐ کے کمالات کی حد

اور

جادہ و منزل و رہبر ہے مدینہ تیراؐ ۔۔۔ زادِ رہ عشق تر ہو تو مسافر کے لئے

"سخنور، پنجم" کے لئے سوال کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے دورانِ گفتگو کہا، غالب کا کوئی شعر جو آپ کو پسند ہو سنایئے۔ کہنے لگے ..."غالب کی زمین میں اپنا ایک شعر سُناتا ہوں۔

آدمیت کا ارتقا نہ ہوا ۔۔۔ آدمی نے بہت ترقی کی

مجھ میں جو طفل تھا بڑا نہ ہوا ۔۔۔ ڈھل گیا آفتابِ عمر مگر

تو آپ کو غالبؔ بہت پسند ہیں؟ میں نے پوچھ لیا...اور کن شعرا سے متاثر رہے؟

عارف کا جواب تھا... "ہر لکھنے والا اپنے متقدمین سے ضرور کوئی نہ کوئی اثر لیتا ہے۔ بعض لوگوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا یا وہ کھل کر اعتراف کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ میں نے بہت سے شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی حد تک اثر بھی لیا ہے جن میں سب سے نمایاں اقبالؔ ہیں۔ ان کے علاوہ مومنؔ، غالبؔ کا بھی اپنا ایک جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اسی طرح خالصتاً مذہبی حوالے سے نہ دیکھا جائے تو نظم میں میر ببر علی انیسؔ کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا۔ مولانا ظفر علی کی شاعری صحافتی اور ہنگامی ہونے کے باوجود ایک خاص رجزیہ جوش اور طنطنہ رکھتی ہے۔ داغؔ، جگرؔ اور شہرتؔ بخاری، غزل کے حوالے سے؛ حفیظؔ جالندھری، احمد ندیمؔ قاسمی، احسان دانشؔ، نظم کے حوالے سے؛ اکبرؔ الہ آبادی اور ضمیرؔ جعفری، مزاح کے حوالے سے؛ قتیلؔ شفائی اور ساحرؔ لدھیانوی گیت نگاری کے حوالے سے؛ پروین شاکرؔ جدید غزل میں نسوانی احساسات کی نمائندگی کے طور پر؛ اور اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے لئے فطری شاعری اور منظر نگاری کے حوالے سے اپنا لوہا منواتے ہیں۔ ان سب کو میں نے پڑھا ہے پھر بھی میں نے اپنا لہجہ اور تاثر کی انفرادیت قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے"۔

"اب کچھ اپنے بارے میں بتایئے عارف۔ زندگی کے سفر میں کب کہاں سے گزرے اور اپنے ادبی سفر کے بارے میں بھی اپنے پڑھنے والوں کو بتایئے ...."۔ عارف انکساری سے مسکرائے۔ میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ پھر چائے کا گھونٹ بھر کر انہوں نے سلسلۂ کلام شروع کیا... "نام تو میرا خواجہ محمد عارف ہے اور عارف تخلص۔ جنوری ۱۹۶۰ء کے دن میرپور آزاد کشمیر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ میٹرک قریبی قصبہ چکسواری کے ہائی اسکول سے اور ایف ایس سی گورنمنٹ ڈگری کالج میرپور سے ۱۹۷۸ء میں کیا۔ اسی سال ہی برطانیہ آ گیا۔ یہاں ۱۹۷۸ء سے مسلسل مزدوری کر رہا ہوں۔ وہ جو حسرت موہانی مرحوم نے کہا ہے کہ ؎ ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی۔

میرے ادبی پس منظر میں خاندانی حالات کا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی لڑکپن میں کوئی ایسا ماحول مجھے میسر آیا۔ کالج کے زمانے میں ادب سے دلچسپی پیدا ضرور ہوئی لیکن وہاں بھی کوئی خاص ادبی ماحول نہیں تھا جہاں سے کچھ سیکھا جا سکتا ہو۔ البتہ تک بندی کرتا رہا۔ برطانیہ آ کر اپنے طور پر اردو

ادب کا مطالعہ کیا اور مقامی طور پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شرکت سے یہ ذوق پروان چڑھتا رہا۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر عنایت حسین شاداں مرحوم سے فنِ عروض سیکھا۔ مختلف رسائل اور اخبارات میں کلام چھپتا رہتا ہے۔ ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا، لیکن اب جلد ہوگا انشاءاللہ"۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد کہنے لگے ..."میں نے غزل اور نظم، دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی نظم کی اکثر اصناف استعمال کی ہیں کیوں کہ موضوعات کے لحاظ سے اس میں تنوع پایا جاتا ہے مثلاً حمد، نعت، منقبت، قومی و ملی نغمے اور ترانے، سیاسی حالات، بچوں کے لئے مضامین، تراجم، رومانی تاثرات پر مشتمل کیفیات، مزاح اور ذاتی یا نجی تاثرات اور دیگر متفرق موضوعات نظم کیئے ہیں۔ قطعات بھی کہے ہیں۔ چند ایک نثری نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن نثری نظم میرے ذوق کے موافق نہیں۔ ویسے تجربہ برائے تجربہ کوئی عیب نہیں لیکن میرے محدود مطالعے کے دوران میری نظر سے ابھی تک کوئی ایسی نثری نظم نہیں گزری جو دل کو لگی ہو یا جس نے کوئی گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا ہو۔ میرے خیال میں تو نثری نظم کی ترکیب بذاتِ خود ایک بے معنی اور مہمل ترکیب ہے۔ اردو زبان میں اوزان اور قوافی کی قید میں رہ کر لکھنا کوئی خاص مشکل کام نہیں ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ لکھنے والے کے پاس کہنے کے لئے کچھ موجود ہو۔ اسلوب اور معیار ہر شخص کا اپنے اپنے ذوق، وسعتِ مطالعہ و مشاہدہ اور صلاحیت کے مطابق ہوگا۔ وزن کی پابندی، قافیہ اور ردیف کا استعمال اکثر اوقات کمزور خیال میں بھی حسن پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً غزل میں اکثر کہنہ مشق اساتذہ کے بھی سارے اشعار بلند پایہ نہیں ہوتے لیکن قافیہ ردیف کی لڑی میں منسلک ہو کر غزل کا مجموعی تاثر خاصا اچھا پیدا کر دیتے ہیں جب کہ نثری نظم میں ایک اچھا خیال بھی پھیکا پھیکا ہی رہتا ہے۔ اگر کسی کو عروض و قواعد میں رہ کر لکھنا مشکل ہو تو نثر میں لکھے"۔

اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے عارف نے کہا..."اردو زبان کا مستقبل اگر بہت زیادہ روشن نہیں تو انشاءاللہ تاریک بھی نہ ہوگا۔ جدید ٹیکنالوجی، زمانے کی تیز رفتاری اور ہر چیز کو تجارت بنا لینے کی وجہ سے عالمی سطح پر زبان دانی کا معیار گرتا جا رہا ہے اور اس سے اردو بھی متاثر ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں عالمی معیار کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ کسی بھی زبان میں بہت ہی اعلیٰ معیار کا اور صدیوں زندہ رہنے والا ادب بہت کم پایا جاتا ہے۔ اور ہر زبان کے نابغۂ روزگار ادیب و شعرا انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔

اب رہی بات رسم الخط کی تو میری ناچیز رائے میں کسی زبان کے رسم الخط میں اس کی ناگفتہ تاریخ پنہاں ہوتی ہے، یہ اس کا صرف ظاہری لباس نہیں ہوتا کہ جب چاہا بدل دیا اور اس کی شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔ اس لئے رسم الخط کو بدلنے کی تجویز صرف اور صرف کم فہمی پر مبنی ہے۔ اگر رسم الخط میں کچھ مسائل و مشکلات ہیں تو انہیں اسی رسم الخط میں رہ کر ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ رسم الخط بدلنے سے یہ مسائل حل ہونے کے بجائے نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش

کی جاسکتی ہیں۔ کمپیوٹر نے کتابت کے بہت سے مسائل حل کر دیئے ہیں۔ اگر املا اور ہجوں کی مشکلات کو چھیڑا جائے تو پھر اردو کا نظام ہجی انگریزی کے ہجی اور صوتی نظام سے بدرجہا بہتر ہے"۔

عارف کا کہنا ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم میں جذبات اور احساسات کی بہتر ترجمانی ہوتی ہے۔ غزل میں اختصار، رمز، کنائے اور ابہام وغیرہ سے ایک خاص اخفا، خاص حسن اور اثر پیدا ہوتا ہے لیکن نظم میں تفصیل اور وضاحت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ موضوع اور خیال کے مطابق ہی غزل اور نظم میں سے کسی کا انتخاب مناسب ہوتا ہے۔ ویسے اس کا انحصار شاعر کے مزاج پر بھی ہے۔ عارف کے خیال میں مجموعی طور پر آج کا ادب مکمل طور پر اپنے عہد کی ترجمانی نہیں کرتا کیونکہ آج ادیب اور اس کے قاری میں زیادہ قربت نہیں، لیکن پھر بھی حالات زیادہ مایوس کن نہیں۔ بہت سے اچھے اچھے لکھنے والے موجود ہیں جو لگن اور محنت سے لکھ رہے ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں عارف نے بڑے اطمینان سے کہا... "اردو کو اپنا کر مالی لحاظ سے مجھے فائدہ یا نقصان کچھ بھی نہیں ہوا البتہ فکری اعتبار سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ویسے اردو سے محبت ہے اور ...محبت کے سودے میں بھلا نقصان کیسا"۔

خواجہ محمد عارف نے بچوں کے لئے بھی لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ ان کی ایک نظم بعنوان "بکری" میں ذکر ہے عاشی نامی ایک بچی کی بکری کا جو ایک دن کسی کے باغ میں گھس گئی اور۔

سبزی، پودے، پھول پنیری — جو شے دیکھی چٹ کر ڈالی
مالی کی جب آنکھ کھلی تو — دیکھا باغ تھا خالی خالی
بکری نے جو باغ اُجاڑا — ایک نصیحت بھی کر ڈالی
بولا سچ ہے جو سوتا ہے — وقت گنواتا ہے اور روتا ہے

ان کی زندگی کا اہم واقعہ برمنگھم یونیورسٹی میں ہونے والا ۱۹۸۴ء کا مشاعرہ ہے جس میں فیض احمد فیض مہمان خصوصی تھے۔ عارف کی اس میں شرکت اور اپنے کلام پر فیض صاحب سے داد و تحسین کے پھولوں کا حصول ان کی یادوں کا سرمایہ ہے۔ جب بھی عارف قلم سنبھالتے ہیں، ان پھولوں کی خوش بو ان کے کلام کو مہکانے کا سبب بن جاتی ہے۔

Mr. Khawaja Mohammad Arif,
72, Adria Road, Sparkhill, Birmingham, B11 4JN, UK

انتخابِ کلام

سوال — جواب

انسانیت کا کون جہاں میں امام ہے؟ — آقائے دو جہاںؐ ہے جو خیر الانامؐ ہے

کیا انبیاؑ میں شاہِ اممؐ کا مقام ہے؟ — تارے ہیں وہ سب اُن میں یہ ماہِ تمام ہے

کیا شے ہے جو قرارِ دلِ خاص و عام ہے؟ — ذکرِ خدا کے ساتھ محمدؐ کا نام ہے

یہ بزمِ کائنات سجائی گئی ہے کیوں؟ — سب کچھ مرے نبیؐ کے لئے اہتمام ہے

کیا چیز ہے محیط جہاں کو کیے ہوئے؟ — رحمت مرے حضورؐ کی اور فیض عام ہے

اندوہِ روح و دل کی کہاں سے دوا ملے؟ — سب سے بڑا علاج درود و سلام ہے

تشنہ لبوں کو حرفِ تسلی تو دو کوئی؟ — کیا تشنگی جو ساقیِ کوثرؐ کا جام ہے

آلامِ دو جہاں سے ملے کس طرح نجات؟ — آزاد ہے جو خیرِ بشرؐ کا غلام ہے

کیا چیز ہے کہ اسوۂ کامل کہیں جسے؟ — میرے نبیؐ کی ذات ہے، ان کا نظام ہے

عارفؔ کہاں تلاش کروں مصطفیٰؐ کو میں؟ — ہر امتی کے قلب میں انؐ کا قیام ہے

باسم ربی

عارضی دوست غنیمت ہیں سفر میں عاصم
ڈھونڈو تو تم بھی کسی دل میں سرائے کوئی

صباحت عاصم واسطی
01/06/03

ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی

شیفیلڈ، برطانیہ

ہمارے اور آپ کے، بلکہ اردو شاعری سے محبت کرنے والے تمام احباب کے سورگ باشی فراق گورکھپوری نے اپنے ایک انٹرویو میں شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا... "کائنات وحیات کے اجمال و تفصیل کا ایسا احساس شاعری کی روحِ رواں ہے جو وجد آفریں ہے۔ یہی کیف وجد اس احساس میں وہ تحریک پیدا کرتا ہے یا وہ پیدا کر دیتا ہے جو اپنے آپ کو کلام موزوں کی شکل میں شاعر سے کہلواتا ہے"۔

اب فراق صاحب کی اس تعریف کی کسوٹی پر ڈاکٹر صباحت عاصم کے یہ اشعار ملاحظہ کیے جائیں تو فکر و فہم کے معانی کے کئی پرت کھلتے ہیں۔

میں رکھ نہ سکا توازن اڑان میں قائم — مرے پروں میں کہیں ایک پر زیادہ ہے
خدا کرے کہ ہمیشہ مجھے گمان رہے — کہ میرے پاس ضرورت سے زر زیادہ ہے

اور

کیا خبر تھی کہ ستائش میں وہ حد کر دے گا — میری قامت سے زیادہ مرا قد کر دے گا

کسی شاعر کی زندگی اور فن کا کسی بھی انداز سے جائزہ لینے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کے بیشتر کلام کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کے فن سے واقفیت ہو سکے، جو ان صفحات میں ممکن نہیں۔ مگر ایک

شاعری چند غزلیں اور نظمیں اس کے مزاج اور آہنگ کا پتا ضرور دیتی ہیں۔

ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی کی یہ چھوٹی سی، تین مصرعوں کی مختصر نظم میں ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے ایک چھوٹے سے کینوس پر ایک ایسی بھرپور تصویر بنا دی ہے جس میں اس کی فکر کے سارے رنگ اور سارے شیڈ (shade عکس) اس طرح ابھر کر سامنے آئے ہیں کہ اسے تصویر منتخبے کہہ سکتے ہیں۔

دستک سی ہوئی تھی
در کھول کے دیکھا
میری تنہائی کھڑی تھی

صباحت عاصم کا تعلق شعرا کے اس گروہ سے ہے جنہوں نے ظلم کے خلاف اپنے قلم کو علم بنایا۔

تنظیم کا یہ حال ہے اس شہر میں عاصم — بے ساختہ بچے بھی شرارت نہیں کرتے

اور

مانا کسی ظالم کی حمایت نہیں کرتے — ہم لوگ مگر کھل کے بغاوت نہیں کرتے

عاصم کی شاعری میں الجھاؤ نہیں زبان صاف اور اشارے واضح ہیں۔ یُوں اسے نسبت عوام سے ہے اس کے باوجود بقول خود عاصم۔

میں اپنے عہد میں عاصم ابھی پہنچا نہیں ہوں — کئی پچھلے زمانے راستہ روکے ہوئے ہیں

اسی ضمن میں عاصم نے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سنایا۔ عاصم نے بتایا۔ "پشاور گرینز ہوٹل میں میرے والد نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ شرکت کے لئے میں بھی گیا۔ مشاعرے میں دوسرے شعرا کے علاوہ حبیب جالب بھی شریک تھے۔ میں نے اس مشاعرے میں اس وقت کی مارشل لا حکومت کے خلاف ایک غزل پڑھی۔ اُس کے ایک دو شعر کچھ یوں تھے۔

فلک سے رنگ نہ برسے تو پھر چمن والے — متاعِ سرخیِ خوں سے ہی کِھل جائیں گے
جو اپنے دل کے اندھیرے فرو نہیں کرتے — ہم ان کی ذات سے کیا قرضِ ضیائیں گے

مشاعرے کے اختتام پر حبیب جالب نے مجھے بلایا اور ذاتی طور پر میری کاوش کو سراہا۔ پھر فارغ بخاری سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس نوجوان کو اپنے سائے میں لے لو۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سائے میں لینے کا معاملہ کیا ہے۔ دوستوں سے استفسار پر پتا چلا کہ یہ بات اشتراکیت کی تحریک میں شمولیت کی تاکید تھی۔ فارغ صاحب میرے والد کی طبیعت سے واقف تھے۔ مجھ سے اس بارے میں اور بات نہ کی لیکن اس کے بعد میری شاعری میں دلچسپی لینے لگے اور بڑی شفقت سے اپنی رائے سے ہمیشہ نوازا۔ اسی مشاعرے کے بعد ایک اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میری اسی غزل کا ایک شعر چُھپ چُھپا کر شائع کیئے جانے والے پیپلز پارٹی کے ایک جریدے نے سرورق پر چھاپ دیا۔ میری والدہ کو بڑی تشویش رہی کہ میں سرکار کی نظر میں آیا ہی آیا۔ وہ مجھے کئی روز باہر جانے سے روکتی رہیں اور دروازے کی دستک کا جواب نہ دینے کی تاکید کرتی رہیں جب کہ میں نے اس بات کو ہنسی میں اُڑا دیا"۔

عاصم ۵ /نومبر ۱۹۵۷ء کو پاکستان کے شہر مردان میں پیدا ہوئے۔ وہ کہہ رہے تھے ... "میری پیدائش کے چند روز بعد ہی میرے والد کا تبادلہ گورنمنٹ کالج مردان سے گورنمنٹ کالج کوہاٹ ہوگیا۔ میری زندگی کے پہلے چھ سات سال کوہاٹ ہی میں گزرے۔ میرے والد شوکت واسطی کو شاعری اور ادب سے بے حد لگاؤ رہا۔ وہ جس کالج میں تعینات ہوتے وہاں مشاعرے ضرور کرتے۔ ان کے پاس اکثر ادبی شخصیات کا آنا جانا رہتا اور یوں مجھے بہت کم عمری ہی سے شعر و ادب کی محفلوں میں شرکت کرنے کے مواقع میسر آئے۔ یہ ہی محفلیں آگے چل کر مرے ذہن میں شعر کے آہنگ کے رچنے بسنے کا سبب بنیں۔ میری تعلیم کا آغاز سینٹ جوزف اسکول کوہاٹ میں ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں میری ہمشیرہ نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تو ان کی تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے ہم نے کوہاٹ سے پشاور ہجرت کی۔ وہاں سینٹ میریز ہائی اسکول سے میں نے ۱۹۷۲ء میں میٹرک پاس کیا۔ اور کنٹونمنٹ پبلک کالج پشاور سے ۱۹۷۴ء میں ایف ایس سی کیا۔ باقی تعلیم خیبر میڈیکل کالج سے ۱۹۸۲ء میں مکمل کی۔ ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد چند ماہ افغان رفیوجی کیمپ میں کام کیا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں مزید تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے برطانیہ آگیا اور تب سے یہاں مقیم ہوں۔ برطانیہ آنے کے بعد میں نے مختلف ہسپتالوں میں کام کیا، ایم آر سی پی کی ڈگری حاصل کی اور ملازمت کے مختلف درجات سے ہوتا ہوا ۱۹۸۸ء میں نارورن جنرل ہسپتال میں کنسلٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوں"۔

عاصم کی ادبی زندگی کا آغاز سن ۱۹۶۸ ۔ ۱۹۶۹ میں ہوا۔ وہ بتاتے ہیں... "پہلی حمد کا مصرعہ کچھ یوں تھا۔ ترے ہی حکم سے یارب سنورتی ہیں تقدیریں۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے ٹوٹے پھوٹے مصرعے جوڑ لیا کرتا تھا"۔ والد اور بڑی بہن کی حوصلہ افزائی کے سبب عاصم کی شاعری پروان چڑھی۔ ان کی اردو کی استاد مس سرتاج شاہ عالم نے بھی ان کی کاوشوں کا سراہا اور فرمائش پر یوم اقبالؒ یا یوم پاکستان پر نظمیں لکھوا کر ان کے شوق کو بڑھاوا دیا۔ عاصم کہہ رہے تھے ... "ہمارے والد صاحب کے سبب ہمارے گھر پاکستان بھر سے بڑے بڑے قدآور شعرائے کرام آتے۔ ان کی محفلوں میں بیٹھ کر شعر و شاعری کا لطف لیتا۔ ان گراں قدر شخصیات میں عبدالحمید عدم، حفیظ جالندھری، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا، جمیل الدین عالی، احمد مرزا، محسن احسان، رضا ہمدانی، قتیل شفائی، حبیب جالب، اور پروین شاکر کے علاوہ بہت سے اور باکمال اہل سخن شامل ہیں۔ ان صحبتوں کا مجھ پر لاشعوری اثر یہ پڑا کہ میرے کم سن ذہن میں شعر کا آہنگ رچ بس گیا۔ فنی معاملہ بندی تو خیر بہت دیر بعد سمجھ میں آئی مگر وزن میں شعر کہنا جلد آ گیا۔

باقاعدہ شاعری کرنا اور مشاعروں میں جانا میں نے میڈیکل کالج میں داخلے کے بعد شروع کیا۔ پشاور میں اُن دنوں مجھ جیسے نوجوان شاعروں کے لئے ماحول بہت سازگار تھا۔ شفیق بزرگوں میں میرے والد کے علاوہ فارغ بخاری، رضا ہمدانی، محسن احسان اور خاطر غزنوی شامل تھے جنہوں نے خوب خوب حوصلہ افزائی بھی کی اور رہنمائی بھی۔ احمد فراز صاحب کو مشاعروں میں سنا اور خوب سنا۔

اُن کی شاعری نے جو تاثر ذہن پر مرتب کیا اُس نے بھی اول اول بڑی مدد دی۔ میرے ان دنوں کے ہم عصروں میں نذیر تبسم، عزیز اعجاز، اشرف عدیل، طارق احد نواز اور خاور سعید رہے۔ ان بزرگوں اور ہم عصروں کی رفاقت میں شاعری کا معاملہ تک بندی سے آزاد ہوا اور ایک باقاعدہ شوق بن گیا۔ مجھے یاد ہے کہ پشاور کے ایک مشاعرے میں میرے دو شعر بے انتہا پسند کیئے گئے۔ وہ کچھ یوں تھے۔

کہ اپنے واسطے سورج چراغ جلتا تھا	سحر ہوئی تو نگاہوں میں دم ہی اٹکا تھا
وگرنہ مجھ سے ترا فاصلہ ہی کتنا تھا	وہ یوں ہوا کہ فصیلِ انا نے روک لیا

نجانے کیوں اُس شام گھر لوٹتے مجھے خیال گزرا کہ میں شاعروں میں شمار کیا جانے لگا ہوں۔ پھر میں نے ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۳ء مسلسل لکھا۔ ۱۹۸۴ء میں برطانیہ آنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک شاعری اور ادبی حلقوں سے کنارہا۔ ۱۹۸۹ء میں کئی برس پہلے کہے ہوئے کلام پر نظر ثانی کر کے ''کرن کرن اندھیرا'' کے نام سے کتاب شائع کرائی۔ ۱۹۹۴ء سے ادبی حلقوں میں آنا جانا شروع کیا اور اب برطانیہ بھر میں ادبی محفلوں میں شرکت رہتی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں میری دوسری کتاب ''آگ کی صلیب'' شائع ہوئی۔

ویسے زیادہ تر غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن آزاد نظم اور پابند نظموں کے علاوہ قطعات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ نثری نظم اور نثری غزل مجھے شاعری کی اصناف محسوس نہیں ہوتیں۔ یہ دونوں اصناف شاعری سے زیادہ نثر سے قریب تر ہیں اور یوں اسے شاعرانہ نثر سمجھنا چاہیئے۔ شاعری کو نثر کرنے کا رجحان اُن زبانوں کے لئے ٹھیک ہے جن میں بلٹ ان (built in) ردم نہ ہو۔ اردو جیسی شاعرانہ زبان میں اس طرز کی تخلیقات بے جواز ہیں۔ ان اصناف کا صرف ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ اُن بستیوں میں جہاں اردو عام بول چال کی زبان نہیں اور جہاں سے اردو بولنے اور سمجھنے والوں کے لئے شاعرانہ آہنگ وغیرہ کی عادت بنانا ممکن نہیں وہاں شاعرانہ نثر کو رواج دینے سے نئے سمجھنے والوں کو اردو شاعری کی طرف توجہ دینے کا موقع ملے گا''۔

اگلے سوال کے جواب میں عاصم نے کہا... ''زبان کے مستقبل کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ زبان کی بقا صرف تب ممکن ہو سکتی ہے جب اس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے باقی رہیں۔ اب بھی دنیا میں ہر سال کئی زبانیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ مستقبل قریب میں اردو کے ختم ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں مگر مستقبل بعید میں اس کا امکان ضرور ہے۔ اس کا خطرہ اس لئے ہے کیوں کہ اردو کو اپنانے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں کی زبانیں الگ الگ ہیں بلکہ بعض اوقات ایک ہی صوبے کے مختلف علاقوں کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں۔ سرحد، بلوچستان سے اردو کا رشتہ قدرے کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ سندھ میں کراچی کے سبب اردو کو کچھ سہارا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں پنجاب میں پنجابی زبان کی تحریک نے زور پکڑا ہے۔ ہندوستان میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کی تیسری اور چوتھی نسل کو اردو پڑھنے اور لکھنے میں دقت پیش آ رہی ہے اور وہاں ہندی کی منظم و فعال تحریک کے تحت بیشتر اردو ادب کو ہندی میں ضم کر لیا گیا ہے۔ زبان کی بقا کے لئے اس کی معاشی اور معاشرتی افادیت بہت

ضروری ہے۔ صرف ادب کے زور پر کوئی زبان غیر فانی نہیں ہو سکتی۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر مجھے اردو کے مستقبل پر تشویش ہے اور میں نے بارہا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کو عالمی سطح پر ایک ایسی تحریک چلانی چاہیئے کہ ہم اردو کی مشکلات کی طرف حکمرانوں کی توجہ مبذول کرا سکیں۔

اب رہی بات رسم الخط کی، میں اس سلسلے میں فراخ دل ہوں۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ اردو کے موجودہ رسم الخط سے مانوس آنکھوں میں روز بروز اور بتدریج کمی ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط زیادہ پڑھا اور لکھا جانے لگا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں پاکستانی اور اردو بولنے والے ہندوستانی ماں باپ کے بچے اگر اردو بول بھی لیں تو اردو پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن اس کے باوجود انٹرنیٹ پر یہ بچے اردو میں آپس میں تبادلۂ خیال بھی کر رہے ہیں اور ادب سے دلچسپی کا اظہار بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انگلستان میں اور امریکہ میں اردو کی کلاسیکی ادب کی کچھ کتابیں رومن رسم الخط میں شائع کی جائیں تو ہماری نئی نسل انہیں پڑھنے لگے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے چوسر کی کینٹر بری ٹیلز (Chaucer's Canterbury Tales) جدید رسم الخط میں یہاں مہیا ہونے کے باعث قابل مطالعہ ہے۔ میرے نزدیک اس میں کوئی عار نہیں کہ اردو کی تحریریں بیک وقت دو یا زائد رسم الخطوں میں دستیاب ہوں۔ اس سے اردو لکھنے والوں اور پڑھنے والوں، دونوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

اب میں آپ کے اگلے سوال کے جواب میں عرض کروں گا کہ ہر عہد اپنا ادب خود ساتھ لے کر آتا ہے۔ اسی طرح ہر ماحول بھی اپنا ادب خود تشکیل دیتا ہے۔ اردو کے لکھنے والوں کو جدید تر تحریریں لکھنے کی شعوری کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ان کی آنکھیں کھلی ہیں، کان سن رہے ہیں اور دماغ سوچ رہا ہے اور ہم پوری طرح آج کے عہد میں زندگی گزر رہے تو سوائے معاصر ادب کے اور کوئی ادب تخلیق ہی نہیں ہو سکتا۔ بے سبب جدیدیت کے نام پر زبردستی قلانچیں بھرنے سے مصنوعی ادب تو پیدا ہو سکتا ہے، جدید اور پر اثر نہیں۔ آج کا اردو ادب بالکل ہمارے عہد کا ترجمان ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اردو ادب کو ان نظموں اور غزلوں سے پرکھتے ہیں جو مقبولیت کے پیمانہ پر پوری اتریں۔ مقبول ادب اور معیاری ادب میں بہت فرق ہے۔ اردو کی بدقسمتی یہ رہی ہے کی اس زبان کا مقبول ادب معیاری ادب پر غالب رہا ہے۔

شاعری میں کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کا انحصار خود شاعر پر ہے۔ حال ہی میں کچھ دوستوں سے الفاظ کے نئے اور پرانے ہونے پر میری بحث ہوئی۔ گھر لوٹتے ہوئے خیال آیا کہ یہ نظم کے لئے ایک خوب صورت موضوع ہے۔ دوسرے روز ایک شعر نے میری پوری کیفیت اور احساسات کو سمو لیا"۔

لکھتے لکھتے سوچنے بیٹھ گیا ہوں عاصم   کیسے کیسے لفظ پرانے ہو جاتے ہیں

اب عاصم نے ہنستے ہوئے اگلے سوال کے جواب میں کہا۔ "اردو کو اپنا کر گھاٹے میں رہنے کا سوال خوب ہے۔ صرف اتنا کہوں گا اردو نے جتنا کچھ مجھے دیا ہے کاش اس کا کچھ حصہ اردو کو لوٹا سکتا۔

امید کرتا ہوں کہ شاید کبھی کوئی مصرعہ یا شعر اس قرض کا ذرا سا حصہ ادا کر سکے۔ اردو کو اپنا کر صرف فائدہ ہی فائدہ نظر آیا۔

میں نے بہت پہلے ایک کلیہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ کچھ یوں تھا، یہ مت دیکھو کہ کون کہتا ہے بلکہ یہ سنو کہ کیا کہتا ہے: یہ مت سوچو کہ کس نے لکھا ہے، یہ پڑھو کہ کیا لکھا ہے۔ اسی سبب سے میں کسی شاعر سے متاثر نہیں ہوا مگر بہت سے اشعار نے مجھے متاثر کیا۔ مثال کے طور پر

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے (انیسؔ)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا (میرؔ)

مصحفیؔ ہم تو سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا (مصحفیؔ)

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے (غالبؔ)

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر (اقبالؔ)

اذاں پہ قید نہیں بندشِ نماز نہیں — ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں (نجم نیلیؔ)

وہ وقت آئے گا جب مری کافری کا وقار — تم اپنے سارے خدا بیچ کر خریدو گے

(شبیہ الحسن رضوی)

یا علی محمد فرشی کی نظم ملبہ۔ جو مجھے ہر معیاری شعری تخلیق شخصی حوالے کے بغیر متاثر کرتی ہے۔ میری نظر میں گزری صدی کے قد آور شعرا میں علامہ اقبالؔ، جگرؔ مراد آبادی، عبدالحمید عدمؔ، ناصر کاظمی، مجید امجد، ن م راشد، فیض احمد فیضؔ اور شکیب جلالی ہیں۔ ان شعرا نے پچھلی صدی کے شاعری کا مزاج اور رجحان مرتب کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

Dr. Sabahat Aasim Wasti,
27 St. Quentin Rise, Sheffield, S17 4PR, UK

انتخابِ کلام

گھٹتی ہوئی سانسوں کو اٹھا لائے گلی میں — جب حبس بڑھا لوگ نکل آئے گلی میں

ہر ایک دریچے میں سے آنکھیں نکل آئیں — جاتے ہوئے دیکھے گئے دو سائے گلی میں

آہٹ سے مری نیند ذرا دیر کو ٹوٹی — کتے بھی زیادہ نہیں غرائے گلی میں

بچوں سے مشقت کے ستم ہم نے چھپائے — گھر پہنچے تو کچھ دیر ستائے گلی میں

دیوار گرانے کا ارادہ ہے تمہارا — دیکھو کہیں ملبہ نہ بکھر جائے گلی میں

غیروں کے محلوں کو بڑے رشک سے دیکھا — خود ہم نے مگر پھول نہ لگوائے گلی میں

کل رات مری نیند اڑائی گئی عاصمؔ — کچھ لوگ کسی بات پہ چلائے گلی میں

باسم ربّی

ساز ہستی کا اعتبار کہاں
کیا خبر ٹوٹ جائے تار کہاں

خورشید علیگ
10/07/2003

محمد خورشید عالم

بحرین، عربین گلف

متین، سنجیدہ اور پھر متبسم چہرہ، جناب مرتضیٰ برلاس نے صحیح اندازہ لگایا کہ یہ شخص شاعر ہوگا۔ پھر جب انہوں نے محمد خورشید عالم، عرف خورشید علیگ کو بحرین کے مشاعرے میں سنا تو اپنے قیاس کی تصدیق سے انہیں خوشی ہوئی۔

امجد اسلام امجد نے بھی جب پہلی بار خورشید علیگ کو ایک محفل میں ترنم سے غزل پڑھتے ہوئے سنا تو بقول امجد اسلام امجد خورشید کی آواز اور شاعری، دونوں کا ایک خوش گوار تاثر دیر تک قائم رہا جو بعد کی ملاقاتوں میں گہرا ہوتا چلا گیا۔ اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ انہوں نے بحرین کے ایک معتبر استاد شاعر سعید قیس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ بحرین کی ایک اور معتبر شخصیت جناب شاہد نجیب آبادی کی بھی رفاقت انہیں حاصل رہی۔ اور سونے پر سہاگا، طالب علمی کے زمانے میں انہیں جید شاعر پروفیسر معین احسن جذبی کی سرپرستی میسر رہی۔ لہٰذا خورشید کے کلام میں نکھار تو پیدا ہونا ہی تھا۔

لیکن علم و ادب کے پہلے زینے پر ان کی ملاقات اپنے والد محترم پروفیسر محمد رضا برنوی سے ہوئی۔ یہ حادثاتی ملاقات ایک دل خوش کن تبدیلی کی نوید لائی۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے خورشید علیگ کہتے ہیں... ''میں نویں جماعت کا طالب علم تھا اور بنگالی رس گلوں کا شوقین۔ ابو کرسی پر بیٹھ کر

ردیف 'جی چاہتا ہے' پر مشق سخن فرما رہے تھے اور میں بضد کہ مٹھائی لانے کے لئے بازار چلیں۔ اسی اثنا میں میں نے ان کے کاندھے پر جھک کر ان کے اشعار پڑھے اور بے ساختہ بول پڑا... ابو اس میں کیا بڑی بات ہے۔ ایسی شاعری میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابو نے آنکھ سے چشمے کو ناک پر سرکاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا.. کیا فرمایا منو بھائی آپ نے [وہ مجھے ہمیشہ میرے عرف کے ساتھ بھائی لگا کر ہی بلاتے تھے]۔ میں نے اپنی زندگی کا کہا ہوا پہلا شعر انہیں سنایا۔

کوئی سر منڈا آتا ہے اسکول میں جب چپت تب لگانے کو جی چاہتا ہے

اور پھر انعام میں مجھے بہت سارے رس گلے ملے۔ ابو نے حوصلہ افزائی کی اور اس طرح وہ میرے پہلے استاد قرار پائے۔ میں والد محترم کے اشعار پڑھتے پڑھتے اردو شاعری کی طرف راغب ہوا۔ میں نے بہت کم اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن پیروڈی، گیت، قطعہ، غزل و نظم لکھی ہیں۔

نثری نظم اور نثری غزل کے سلسلے میں عرض ہے کہ تجربات کی حد تک ہی لوگوں نے اسے قبول کیا ہے۔ اس کے لئے بھی مستند شاعر ہونا شرط ہے جنہیں سجانے اور سنوارنے کا گر بھی آتا ہو اور ارکان اور مصرعوں کی ترتیب میں وہ آزادی برتنے کے باوجود عروض کے آداب کا احترام کرتے ہوئے تجربات کرتے ہیں"۔

خورشید عالم کہتے ہیں... "اردو زبان و ادب کے مستقبل سے میں بالکل پُر امید ہوں۔ ہاں اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لئے نئی نسل میں اردو زبان کو متعارف کرانے اور اس سے آشنائی اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے گھر کے ماحول کے ساتھ ساتھ میڈیا کی جدید تکنیک، کمپیوٹر، ویڈیو، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ مدد لینے کا مشورہ دوں گا تا کہ نئی نسل اس کی طرف مائل ہو۔ انفرادی کوشش کے ساتھ ساتھ اجتماعی کاوشیں بلاشبہ ضروری ہیں۔

آج کا ادب موجودہ عہد کا ترجمان ہے۔ کیوں کہ مظلوموں کے احساسات اور معاشرے کے زوال پزیر اخلاقی قدروں کے ضمن میں جو ادب لکھا جا رہا ہے وہ اس دور کا آئینہ دار ہے۔ اردو زبان کو وسعت دینے کے لئے میری رائے میں نئے شاعروں اور ادیبوں کی نئی تخلیقات کو متعارف کرانے کے لئے ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے کیوں کہ یہ ہی نئے ادیب اپنے آنے والے دور کے ترجمان ہوں گے"۔

خورشید عالم اقبال، ساحر، فیض، قتیل، جذبی، فراز، پروین شاکر اور اپنے استاد محترم سعید قیس کی شاعری سے متاثر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے گزری صدی کے قد آور شعرا میں بھی کئی نام اہم ہیں جیسے اقبال، ساحر، فیض، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، قمر جلالوی، مجاز، جوش ملیح آبادی اور کسی حد تک قتیل شفائی بھی۔

خورشید عالم کا مختصر تعارف یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں صوبۂ بہار، پٹنہ (کبھی عظیم آباد کے نام سے جانا جاتا تھا اور تاریخی اعتبار سے علم و ادب کا مسکن رہا ہے) کے ایک ادب نواز گھرانے

میں یکم جنوری ۱۹۵۶ء کے دن جنم لیا۔ شاعری انہیں ورثے میں مل گئی۔ ان کے والد ماجد پروفیسر جناب رضا برنوی شمال بہار کے ایک جانے پہچانے شاعر رہے ہیں۔

ان کی ابتدائی تعلیم آبائی وطن میں ہوئی۔ پھر والد محترم کے سائے سے دور ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے پہنچے اور وہاں سے ایل ایل بی آنرز اور ایم بی اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے ذوق و شوق کی تسکین کے لئے معین احسن جذبی جیسی شخصیت سے استفادہ حاصل کیا جنہوں نے رہنمائی اور ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ میں تقریباً دس سال قیام کے دوران وہاں کی انجمن آرائیوں میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ علی گڑھ سے تعلیم پوری کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں دو سال تک دہلی کی گلیوں کی خاک چھانی اور وقتی طور پر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے۔ ۱۹۸۳ء میں بغرض ملازمت بحرین گئے اور تب ہی سے وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اپنی شرکت اور سوز بیاں سے سامعین کو محظوظ کر رہے ہیں۔ ہند و پاک کے مقتدر جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے ان کا ایک شعری مجموعہ بھی جلد کتابی صورت میں ان کے مداحوں تک پہنچے گا۔

Mr. Mohammad Khursheed Alam,

P O Box 5042, Manama, Bahrain, Arabian Gulf

انتخابِ کلام

میں تو شاعر ہوں میرا کام محبت پیارے | تم کئے جاؤ عداوت پہ عداوت پیارے

ٹوٹا پھوٹا یہ میرا ساز غزل چیخ رہا ہے | آؤ بلبل تو نہ جائے گی اکارت پیارے

سازِ دل ٹوٹ گیا چھوٹ گیا خوب ہوا | ٹوٹ کر دے گا وہ نغموں کی بشارت پیارے

میں تو مقتل کو چلا سر جو کٹانا ٹھہرا | تم کرو شوق سے لاشوں کی تجارت پیارے

چند قطرے جو ہیں کاشانۂ دل میں خوں کے | ہوں گے وہ بھی کبھی نذرانۂ الفت پیارے

کیا یہ ممکن نہیں دوبارہ ہو الفت کا چلن

لے لے خورشید کے ہاتھوں سے امانت پیارے

◆

صنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ رہا سوال نثری غزل کا تو میری رائے میں ادب میں اس کا کوئی
مقام نہیں ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ فنی اعتبار سے نثری غزل جیسی کوئی چیز ہی نہیں۔

عزیز قریشی

عزیز قریشی

رسٹن، ورجینیا، امریکہ

مئی ۲۰۰۰ء میں محترم عزیز قریشی کو پہلی بار شکاگو کے مشاعرے میں سنا۔ ان کے اشعار میں فکر کی گہرائی نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو گزرا وقت ہے اس کو کب کوئی یاد رکھتا ہے ۔۔۔ یہ سب ہنگامہ سالِ رواں سال رواں تک ہے
کبھی ہم بے نیازِ خیر و شر ہو جائیں ایسا ہو ۔۔۔ ہماری سوچ بس اندازۂ سود و زیاں تک ہے

محمد حسین قریشی نومبر ۱۹۳۱ء میں حیدر آباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ ادبی نام عزیز قریشی اختیار کیا۔ صنف شاعری میں غزل کو پسند کرتے ہیں جب کہ نظم میں بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ نثری نظم کو ''بھرتی کی شے'' سمجھتے ہیں۔ نثری غزل کے لئے ان کا کہنا ہے کہ ادب میں اس کے لئے کوئی مقام نہیں بلکہ فنی اعتبار سے نثری غزل جیسی کسی شے کا ادب میں کبھی کوئی مقام پیدا ہی نہیں ہو سکا اور نہ ہوگا۔

عزیز قریشی کا تعلق حیدر آباد، دکن کے مشہور علمی گھرانے سے ہے۔ آپ کے نانا شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا مرحوم تھے جو فارسی اور عربی کے بہت اچھے شاعر تھے اور مشہور زمانہ ''آصف اللغات'' کے مرتب تھے۔ ان کے فرزند نواب دین یار جنگ تھے۔ جناب حسن الدین احمد آئی اے ایس

دین یار جنگ مرحوم کے فرزند ہیں۔ عزیز قریشی صاحب کے والد جناب محمد یوسف حسین مرحوم شعبہ علم وادب و تعلیم سے وابستہ تھے اور بحیثیت ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے۔ عزیز صاحب کی تعلیم حیدرآباد ہی میں مکمل ہوئی۔ چنچل گوڑہ ہائی اسکول سے انہوں نے میٹرک کیا۔ نظام کالج سے بی کام اور لا کالج سے ایل ایل بی اور ایل ایل کام کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہوئے جہاں لا کالج میں انیس (۱۹) سال تک قانونی مضامین کی تعلیم و تدریس میں حصہ لیا۔ قانون پر انہوں نے بہ زبان انگریزی دو کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ قانون میں ان کا خاص مضمون اصول قانون یعنی جیورس پروڈنس (juris prudence) رہا۔ ۱۹۷۹ء میں وہ کراچی سے ابوظہبی منتقل ہوئے جہاں یو آئی اے کی ایک فرم میں بحیثیت کمرشیل منیجر کارگزار رہے۔ بین الاقوامی خریداری کے سلسلے میں کمپنی کی طرف سے کئی ممالک کا دورہ کیا جن میں قابل ذکر انگلستان، امریکہ، فرانس، اٹلی ہانگ کانگ، چین تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، بحرین، سعودی عرب اور نائجیریا کے علاوہ خود ہندوستان اور پاکستان بھی شامل ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ اتنی ساری غیر شاعرانہ مصروفیات کے باوجود عزیز صاحب نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بڑی لگن کے ساتھ آبیاری کی۔ انہیں شعر و ادب کے مطالعے اور شعر کہنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے زبان وادب کے بجائے کامرس کے مضمون کا انتخاب کیا لیکن جو فطری اپج شعر کہنے کی ان کے اندر تھی وہ کسی طرح دب نہ سکی۔ اقبالؔ کے الفاظ میں وہ شاخ گل پر چہکنے کے ساتھ ساتھ اپنی خودی میں برابر آشیاں گزیں رہے۔ اگرچہ اس کا سلسلہ تو شاید رہا مگر شاعری کی دیوی کو انہوں نے یک قلم طلاق بائن نہیں دی اور جب بھی غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت پائی وہ اس سے رجوع ہوتے رہے۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "عکس خیال" ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ قریشی صاحب نے بتایا کہ ابوظہبی کے علمی اور ادبی ماحول کو اس کا کریڈٹ (credit سہرا) جاتا ہے کہ ان کی شعلۂ خاموشی میں روشنی اور حرارت پیدا ہوئی۔ ان کا دوسرا مجموعہ "ابھرتے نقش" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا اور تیسرا بعنوان "لب و لہجہ" ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔ چوتھا شعری مجموعہ "سوچ کے لمحات" ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اٹھاسی (۸۸) غزلیں اور گیارہ (۱۱) نظمیں شامل ہیں۔

اب جب کہ قریشی صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں اور مستقل سکونت ورجینیا میں اختیار کر لی ہے، ادبی حلقوں میں متعارف ہونے کے بعد وہاں کی ادبی مصروفیات میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے جن میں مشاعروں کا حصہ سب سے زیادہ ہے تاہم ان کی مصروفیات مشاعروں تک محدود نہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ علمی مذاکروں اور سیمیناروں میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ کینیڈا میں "جشن عالی" میں انہوں نے ۲۰۰۲ء میں شرکت کی۔ اسی سال شکاگو میں "جشن شبنم رومانی" میں بھی انہیں مدعو کیا گیا تھا۔ خود امریکہ کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں وہ حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن کے بین الاقوامی مشاعرے میں اور عثمانین ایسوسی ایشن کے

۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء کے مشاعروں میں حصہ لیا۔ یہ تینوں مشاعرے شکاگو ہی میں منعقد ہوئے۔ اسی سال اردو ٹرسٹ، لندن کی جانب سے "اردو کے مسائل اور مستقبل" پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں انہیں امریکہ سے مدعو کیا گیا تھا اور اس کے ایک سیشن کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ ایک بین الاقوامی سیمینار تھا جس میں برطانیہ کے دانشوروں کے علاوہ ہالینڈ، اٹلی اور ہندوستان اور پاکستان کے اسکالر (scholar حکمت یار) بھی مدعو کیئے گئے تھے۔ اس سیمینار میں انہوں نے "امریکہ میں اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کا مستقبل" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا تھا۔

گو عزیز قریشی صاحب ترسیلِ خیال کے لئے غزل کو ترجیح دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے نظم بھی کہتے ہیں۔ ان کے کہے ہوئے "سلام" کو رئیس امروہوی نے بے تکلف، سادہ، سہل، رواں اور دل نشیں بتایا ہے۔ فرمان فتح پوری انہیں کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر بتاتے ہوئے کہتے ہیں..."ان کے ہاں کلاسیکی لفظیات و اسلوب کے پردے میں جدید فکر و نظر کی پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں۔ روایت کو بغاوت سے ہم آمیز کرنے اور ان کے امتزاج سے نئی راہ نکال لینے کا عزیز قریشی میں ایک خاص سلیقہ ہے"۔

احمد ندیم قاسمی نے انہیں ایک قادر الکلام شاعر کہا ہے اور لکھتے ہیں..."انہیں شعر کے لئے مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہ دیر لگتی ہے نہ لغزش ہوتی ہے۔ ان کی شاعری پر قدیم کلاسیکل رنگِ سخن غالب ہے۔ اس کے باوجود عصری مسائل ان کے اشعار میں صاف طور پر جھلکتے ہیں"۔

گوپی چند نارنگ کے خیال میں..."خاص بات یہ ہے کہ اس وقت غزل کہنے کا جو رواج عام ہے، ہر شخص اس ریلے میں بہا جاتا ہے، عزیز قریشی نے اس سے دامن بچایا ہے اور ہر طرح کی نظمیں بھی کہی ہیں۔ انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے"۔

اب میں نے ان کی توجہ سوال نمبر چار کی طرف دلائی تو فرمانے لگے..."سوال چار کے جواب میں عرض کروں گا کہ اردو زبان و ادب کا مستقبل نہایت شاندار نہ سہی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ اردو زبان میں بذاتِ خود جو مخفی اہلیت ہے وہ اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اور ادب چونکہ زبان سے عبارت ہے اس لئے اس کی تخلیقی صلاحیت ختم نہیں ہو سکتی۔ اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔ اردو کو رومن میں لکھنے کے معنی زبان کی نہ صرف تسلیم شدہ اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے بلکہ زبان کے طویل تاریخی تواتر کو نادانستہ (یا دانستہ) قطع کر دینا بھی ہے۔ اس لئے میں رسم الخط کو جوں کا توں قائم رکھنے کا قائل ہوں"۔

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا..."جیسا کہ آپ کے علم میں بھی ہے نظم کسی ایک خیال یا کسی ایک مضمون کی، جو شاعر کے ذہن میں اُبھرے، ترجمانی کرتی ہے اور غزل کا میدان تو اتنا وسیع ہے کہ ہر شعر میں ایک کیفیت، ایک خیال اور ایک مضمون پوشیدہ رہتا ہے، یعنی کہ کوزے میں دریا بند۔ چونکہ میں ایک غزل گو شاعر ہوں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ غزل احساسات کی بہتر ترجمان

ہے۔ یقیناً آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے بلکہ یوں کہیے کہ ادب ہر دور میں ترجمان تھا، ہے اور رہے گا۔ رہی افادیت والی بات تو اس سوال کی کوئی افادیت نہیں پاتا"۔

انہوں نے کہا... "اساتذائے کرام میں ویسے تو میں نے کسی کو بھی اپنی شاعری کے لئے منتخب نہیں کیا اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کس سے متاثر ہوں۔ اگر چہ میں نے بالالتزام کسی کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا تاہم مجھے فانی بدایونی کا انداز پسند رہا ہے"۔

اپنی تخن ورانہ زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا... "نظام کالج میں جب میں بی کام کے آخری سال میں تھا، کالج کے مشاعرے میں اپنا مزاحیہ کلام سنا رہا تھا۔ کلام بے حد پسند کرنے پر سامعین اور بالخصوص طلبا کی طرف سے مزید کلام سنانے کے مطالبے نے زور پکڑا تو اس نوبت پر چونکہ میرے پاس مزاحیہ کلام کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا میں چپکے سے اسٹیج کے عقبی دروازے سے رفو چکر ہو گیا"۔

Mr. Aziz Qureshi,

2221 Wheelwright, Court, Reston, VA 20191, USA

انتخابِ کلام (اردو)

اتنی ہرجائی ہے پوچھو نہ کہاں ہے اردو — اس کے پروانے جہاں بھی ہیں وہاں ہے اردو
یہ زباں وہ ہے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی — سچ تو یہ ہے کہ بڑی خود نگراں ہے اردو
لوگ کہتے ہیں کہ ہے زورِ خطابت اس میں — یعنی اک طرح کا اندازِ بیاں ہے اردو
اس میں اک چاشنی ہے لوچ ہے اک نغمہ ہے — گھولتے جائیے رس، ایسی زباں ہے اردو
ایک بولی ہے کہ صدیوں سے چلی آئی ہے — اتنی دل کش ہے کہ اب تک بھی جواں ہے اردو
ہے کوئی ایسی زباں ایسا تخن ایسا چلن — کتنی آسانی سے ہر لب پہ رواں ہے اردو
یہ امیروں کی زباں ہے یہ غریبوں کی زباں — یہ عوامی ہے زباں اتنی عیاں ہے اردو
سوچ میں ڈھلتے رہے نت نئے الفاظ ترے — جانِ الفاظ ہے الفاظ کی جاں ہے اردو

ویسے ہیں اور زبانیں بھی بہت سی لیکن
سب زبانوں میں محبت کی زباں ہے اردو

باسم ربی

نمو کے عزمِ جاں سے بے خبر ہوں
میں لالۂ دشت بے شجر ہوں

عشرت آفریں
۲۰۰۴/۳/۵ موسم بہار

عشرت آفرین

ہیوسٹن، امریکہ

عشرت! ...میرے لہجے میں خفگی تھی۔

جی مہر باجی .... جواب میں وہ ہی مٹھاس بھری نرمی، وہ ہی پیار۔

اور مجھے برسوں پہلے کی عشرت یاد آ گئی جب وہ اَدھ کھلی کلی جیسا نرم و نازک لب و لہجہ رکھتی تھی اور جو آج بھی اس کی شخصیت کا ایک دل فریب حصہ ہے۔ کراچی پی آئی بی کالونی کے مکان کے باورچی خانے میں عشرت اور میں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میری ملازمہ غائب تھی۔ میں پریشان تھی۔ اور عشرت ایک چھوٹی بہن کی طرح میری پریشانیوں میں حصہ بٹا رہی تھی۔ وہ روٹیاں بیل رہی تھی۔ بغیر پرکار کے اس کے ہاتھ مجھ سے زیادہ مہارت سے گول روٹیاں اُتار رہے تھے۔ میں روٹیاں سینک رہی تھی۔ پھر نہ جانے کب وہ پاکستان چھوڑ کر چلی گئی۔ سنا کہ امریکہ گئی ہے۔ میں بھی امریکہ چلی گئی۔ پھر نیر جہاں سے عشرت کا فون نمبر لے کر اسے تلاش کیا اور ۲۰۰۲ء میں آپا بشیر النسا جعفری کی طرف سے منعقد مشاعرے میں عشرت سے میری ملاقات ہوئی۔ میں اُسے "سخن ور" کے لئے سوال نامہ بھجوا چکی تھی اور اسی کے متعلق استفسار تھا۔

"بس مہر باجی۔ مشاعرے کے بعد گھر چلتے ہیں اور... اور..."

میں چُپ ہو گئی۔

مشاعرے کے بعد میں، حمایت علی شاعر، زرین یٰسین اور جاوید زیدی، عشرت اور اس کے شریک حیات پرویز جعفری کے ساتھ ہو لیئے۔ پھر وہی باورچی خانہ تھا، وہی عشرت تھی اور میں۔

کھانے کے بعد اس نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام "کنج پیلے پھولوں کا" لا کر دیا۔ میں نے عشرت کا گھر دیکھا۔ اس کے بچوں کو دیکھا۔ اُسے پرویز سے باتیں کرتے دیکھا۔ اُسے اپنے رنگ برنگے پھولوں کے کنج میں محوخرام دیکھا تو میرے سامنے عشرت کی شاعری کا ایک شاہکار نقش اُبھر آیا جس کا عنوان عشرت نے رکھا تھا "ایک مشترکہ نظم"۔ ملاحظہ ہو۔

وہ نظم جو میں نے تم پہ لکھی
وہ شعر جو میں نے پلکوں سے دل کے کاغذ پر تحریر کیا
وہ نظم جو تم نے مجھ پہ لکھی جو بوند برابر رشتے سے
نم مٹی میں پروان چڑھی
وہ نظم ہماری بانہوں میں جب بانہیں ڈال کر ہنستی ہے
وہ شعر تمہارے قدموں سے جب قدم ملا کر چلتا ہے
میں سوچتی ہوں اس دھرتی پر
ہم دونوں جیسا شاعر کوئی اور نہیں

پھر اس نے مجھے خط لکھا... "میری پیاری مہر باجی! اس سے پہلے کہ آپ مجھے واقعی عاق کر دیں میں بتا دوں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا میرے لئے بڑا عذاب ناک کام ہے۔ بقول میری نانی کے۔

کی جو اپنی برائیوں پر نظر تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا

یہ بات اب میری فطرت کا حصہ بن گئی ہے اور جب بھی اپنی ذات سے متعلق کوئی اچھی بات تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا"۔

ایک دن میں اس کی کتاب کے ابتدائی صفحات پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ ۲۲/ مارچ ۱۹۸۵ء کی تاریخ کے ساتھ محترمہ ادا جعفری کا نام تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ "عشرت آفرین کے انداز بیان میں ایک خوب صورت نیا پن ہے، تازگی ہے لیکن اس کے موضوعات بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے سخن میں احساس کی چمک ہے۔ اس کے حروف میں کسک ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں دکھ کی آگ میں جھلسا دینے والا کرب نہیں، جھنجھلاہٹ اور تلخی نہیں۔ یہ شاعری ایک قطرۂ اشک، ایک حرف دعا سی لگتی ہے، پاکیزہ اور منزہ"۔

عشرت نے لکھا تھا... "مہر باجی! سرکاری کاغذات میں میرا نام عشرت جہاں ہے اور قلمی نام عشرت آفرین۔ تاریخ پیدائش ۲۵/ دسمبر ۱۹۵۶ء اور جائے پیدائش کراچی، پاکستان ہے۔ تعلیم اردو میں ایم اے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۸۲ء میں کیا۔ اب آگے کی روداد جو ہے، مہر باجی اس میں کٹوتی کیئے بغیر لکھی جائیے گا ورنہ حشر کے روز آپ کا دامن تھاموں گی"۔ پھر عشرت نے جو لکھا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

"خوش قسمتی سے میں نے ایک ایسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم و ادب کا چرچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری کو میرے خاندان میں بہت سراہا گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ماحول میں آنکھ کھولنے کی وجہ سے مجھے کسی ایسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو عموماً خواتین کی ترقی میں رُکاوٹ بنتی ہے۔

مجھے اپنا پہلا شعر یاد نہیں لیکن والد کے انتقال پر میں نے ان کی یاد میں ایک طویل نظم لکھی تھی۔ یہ میری پہلی نظم تھی جو کسی نے روزنامہ "جنگ" کراچی کو بھیج دی۔ ان دنوں بچوں اور خواتین کے صفحے کی انچارج آپ (سلطانہ مہر) تھیں۔ وہ نظم اگلے ہفتے ہی چھپ گئی۔ یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ میں ہائی اسکول میں تھی۔ لڑکیوں نے میری نظم "جنگ" میں دیکھی تو مجھ سے کہا کہ لگتا ہے تم نے کوئی بڑی سفارش لگوائی ہے۔ سفارش والی بات پر میرا ردِعمل یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ میں بہت خوش تھی اسکول اور محلے کی لڑکیاں جب یہ کہتیں کہ سلطانہ مہر ضرور تمہیں جانتی ہیں ورنہ "جنگ" میں کلام چھپنا کوئی آسان ہے؟ اور پھر اتنی طویل نظم؟ لگتا ہے اب تم بڑی شاعرہ بن جاؤ گی۔ اس پر واقعی میری گردن فخر سے تن جاتی اور کچھ دنوں کے لئے میں خود کو بڑی شاعرہ سمجھنے لگی۔ پھر محلے میں چرچا ہوا تو لوگ سب سے پہلے "سہرا" لکھوانے پہنچ گئے۔ پھر جب نعت، نوحے اور سلام لکھوانے والوں نے فرمائشیں کیں تو اسی میدان میں طبع آزمائی کی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ سادات گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے سماعتوں کی تربیت انیس کے مرثیوں نے کی تھی۔

پھر یاور بھائی نے مجھے "بچوں کی دنیا" کی ناز باجی (سیدہ ناز کاظمی) اور مس فاروق جہاں تیموری سے ملوادیا۔ ان دنوں میں ریڈیو اسٹیشن امی کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ ناز باجی کبھی مجھے کوئی اسکرپٹ لکھنے کے لئے دے دیتیں یا کبھی بچوں کے لئے کوئی نظم لکھوالیا کرتیں۔ پھر جنگ میں کلام چھپ جایا کرتا تھا۔ میں اکثر جنگ کے دفتر بھی جایا کرتی تھی۔ ایک دن مہر باجی نے مجھ سے بہت سنجیدگی سے کہا "سنو! تم اپنی چیزیں جنگ میں بخوشی چھپواؤ، لیکن میرا خیال ہے کہ تم اب اچھا خاصا لکھ لیتی ہو۔ اس لئے اپنی چیزیں ادبی رسالوں میں بھیجنا شروع کرو۔ میں نے بے اختیار سوال کیا کہ وہ کیا ہیں؟۔ مجھے ان کی وہ مسکراہٹ آج تک یاد ہے۔ بولیں ..." کوئی ادبی رسالہ پڑھتی ہو؟" میں ہونقوں کی طرح ان کی شکل تکنے لگی تو انہوں نے میرے سامنے ایک ضخیم رسالہ لاکر رکھ دیا۔ سرورق پر بنی کبوتر کی چونچ اور عورت کی ناک کے سوا، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ بولیں ..."یہ رسالہ سیپ ہے۔ بہت اچھا اور معیاری پرچہ ہے۔ مہر باجی کی بات کے احترام میں میں نے اپنی غزل سیپ کو بھیج دی تھی ورنہ کبوتر کی چونچ اور عورت کی ناک والے اُس سادہ سے سرورق نے مجھے ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس پرچے میں چھپنے کے بعد مجھے سیپ کے دفتر سے صہبا اختر کی کتاب 'سرکشیدہ' کی تقریب اجرا کا دعوت نامہ ملا۔ تو یوں میں پہلی بار کسی ایسی تقریب میں شریک ہوئی جہاں جیتی جاگتی لڑکی کو پتھر کی مورت بنا کر رونمائی کے لئے پیش کیا جا رہا تھا بلکہ کاغذ پر اُبھری ہوئی جامد لکیریں بغیر گہنے کے جگمگا رہی تھیں اور رنگ باتیں کررہے تھے۔ وائی ایم سی اے کے گراؤنڈ میں اس دھواں دھار تقریروں سے لبریز شام کے اختتام پر ادبی رسالے کا مطلب کچھ کچھ سمجھ میں آیا۔

والد کے انتقال کے بعد ہمارے گھر میں صرف خواتین کا آنا جانا رہتا تھا۔ لہٰذا آنکھ کھول کر اخبار جہاں، اخبار خواتین اور روزنامہ جنگ کے سوا کوئی پرچہ دیکھا ہی نہیں تھا یا پھر کورس (تعلیمی نصاب) کی کتابیں تھیں جن میں میر و غالب کو صرف امتحان کی ضرورت کی حد تک پڑھا تھا۔ گھر میں والد کی جو کتابیں تھیں وہ سب کی سب قانون کی تھیں یا پھر انگریزی ادب تھا، جو میری دسترس سے باہر تھا۔

پھر ہوا یوں کہ ہائی اسکول کرنے کے بعد اسکول میں ملازمت مل گئی اور ساتھ ہی کالج میں داخلہ مل گیا۔ یہ تقریباً سن ۷۳۔ ۷۴ کی بات ہے۔ پہلے سال کالج میگزین میں میری نظم چھپی، بیت بازی میں حصہ لیا۔ پہلی بار جوشؔ صاحب کو کالج کے مشاعرے میں ہی دیکھا۔ اچانک ان ہی دنوں امی سخت بیمار ہوگئیں۔ بہن بھائیوں میں بڑی میں ہی تھی۔ گھریلو ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ اس وجہ سے کالج کو خیر باد کہنا پڑا۔ یوں کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بڑی حد تک دور ہوگئی گو کہ بعد میں کالج میں دوبارہ داخلہ بھی لیا اور گریجویشن وہیں سے مکمل کیا لیکن ادبی سرگرمیوں کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا۔

پہلے مشاعرے کے بارے میں سوچتی ہوں تو یہ یاد آتا ہے۔ یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے اخبار میں پڑھا کہ عصمت چغتائی آئی ہوئی ہیں۔ اس وقت عصمت چغتائی سے ملنے ہی کا نہیں انہیں اپنا کلام بھی سنانے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے مہر باجی سے کہا۔ 'میں مشاعرے میں شریک ہونا چاہتی ہوں'۔ انہوں نے کہا۔ 'اگلے ہفتے گل رعنا کلب میں آجانا وہاں میں نظامت کر رہی ہوں اور کوشش کروں گی تمہیں پڑھوانے کی'۔ وہ جون ۱۹۷۶ء کی ایک بھری دوپہر تھی۔ میں رکشہ پکڑ کر امی کے ساتھ گل رعنا کلب پہنچی۔ وہاں ایک حشر کا میدان تھا۔ نیچے سے میں نے پرچی بھیج بھیج کر سلطانہ مہر کا ناک میں دم کر دیا۔ میں دم لیتی تو امی ٹھوکے دیتیں کہ جلدی پرچی بھیجو کہ تم آگئی ہو اور مہر باجی تمہیں پڑھوائیں۔ خیر کسی طرح باریابی نصیب ہوئی لیکن سب سے دلچسپ بات یہ کہ مجھے یہ کہہ کر بلایا گیا کہ میرا ترنم بہت اچھا ہے۔ میں اس تازہ افتاد پر بوکھلا گئی۔ میں نے تو کبھی شعر گنگنایا بھی نہ تھا مگر اب مہر باجی نے کہہ دیا تھا لہٰذا اس دن میں نے ترنم کے لئے جان لڑا دی۔ شدید گرمی میں گہرے کتھئی، نارنجی اور عنابی بروکیڈ کے جوڑے پہنے ہوئے لڑکیاں بلبلائی پھر رہی تھیں۔ خطبۂ صدارت میں عصمت چغتائی نے نہایت ناراضگی سے کہا... 'آج کی محفل، محفل مشاعرہ کم اور منگنی کی تقریب زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے آج کے مشاعرے میں شاعری کے سوا سب کچھ تھا۔ خواتین کو چاہئے کہ.... وغیرہ وغیرہ....' وہ کچھ آزادیٔ نسواں کا ذکر کر رہی تھیں مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں ابھی تک غزل گا رہی ہوں۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ یہ سب خدا جانے محض اتفاق تھا یا شعور کی کوئی ڈور لاشعور سے بھی بندھی ہوئی ہوتی ہے کہ ٹھیک نو برس بعد جب میں نے اپنی کتاب چھپوانے کا ارادہ کیا تو کتاب کے سرورق کے لئے اپنے مشفق و مہربان دوست اور بزرگ جناب محمد میاں کے ہم راہ ہم نے اسی در پر دستک دی جس کی منڈیر پر وہی مانوس فاختہ اپنی چونچ میں شاخ زیتون لیے استقبال کو موجود تھی اور اپریل ۱۹۸۵ء کی ویسی ہی تمتماتی ہوئی دوپہر میں عصمت چغتائی مسند صدارت پر موجود تھیں، آرٹس کونسل کراچی کا ہال تھا کتاب کا اجرا اور کتاب تھی .... کنج پیلے پھولوں کا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ 'صد آفرین، عشرت آفریں، میرے خوابوں کی تعبیر میری زندگی ہی میں تم

پیدا ہو گئیں۔ جسم سے نہیں دل و دماغ سے تم سے کچھ رشتہ ہے نا! کہ تمہارے شعروں میں بھی ویسی ہی کہانیاں ہیں، انہی انسانوں کی جنہیں میں نے بھی دیکھ کر خون تھوکا تھا۔ آج لگ بھگ تین دہائیوں کے فاصلے پر کھڑے ہو کر جب دیکھتی ہوں تو کتاب کے سرورق پر نقش عورت کے اعتماد سے تنی ہوئی گردن اور عصمت چغتائی کی آزادیٔ نسواں کے خواب کی تعبیر تک، یہ سفر پورے نو برسوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے(۱)۔

جون ۱۹۷۶ء سے اپریل ۱۹۸۵ء تک، نو برس کا یہ سفر میرے اندر کی شاعرہ کی بلوغت کا سفر تھا۔ 'سیپ' کے بعد جب 'افکار' میں میرا کلام چھپا تو صہبا لکھنوی صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ان کا دفتر تو اس شہر کے ادیبوں اور شاعروں کا مکہ تھا۔ 'افکار' کے دفتر میں میری ملاقات فاطمہ حسن سے ہوئی۔ وہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ماہنامہ 'اظہار' کی ایڈیٹر تھیں۔ ان کی رہائش ملیر میں تھی اور میری بھی۔ اس طرح مجھے ایک دوست شاعرہ کا ساتھ مل گیا۔ فاطمہ کے دفتر میں شاہدہ حسن سے لے کر سارے نئی نسل کے اہم شاعروں اور شاعرات سے ملاقات بہت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔

ان ہی دنوں الفلاح سوسائٹی میں بزم علم و دانش قائم ہوئی۔ فاطمہ کی رہائش بھی الفلاح سوسائٹی میں تھی۔ اس لئے فاطمہ کے ساتھ میں بزم کی نشستوں میں برابر شرکت کرنے لگی۔ بزم کے بانی منصف رضا صاحب مرحوم تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے۔ وہ پروگریسو سوچ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے اراکین میں اسمٰعیل یوسف صاحب، ملک اکبر صاحب اور بہت سے نام ہیں۔ علم و دانش کی نشستیں آٹھ سال تک جاری رہیں۔ جن میں تقریباً سارے ہی اہم شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ ہماری ان نشستوں میں خاص بات یہ تھی کہ سرائیکی، پنجابی، بلوچی، پشتو، سندھی اور گجراتی زبانوں کے لکھنے والے بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور ہر زبان کی تخلیقات وہاں پیش کی جاتی تھیں۔ ہماری بزم کے مستقل شرکا میں ہماری نسل کے نمائندہ شاعر نون میم دانش، توقیر چغتائی، بابا نجمی اور ایسے بے شمار شاعر ہیں جو بزم کے مستقل شرکا میں سے تھے۔ میری فکری نشوونما یہیں ہوئی۔ ان ہی نشستوں میں مجھے فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، محمد علی صدیقی، سبط حسن، علی سردار جعفری اور ایسے بے شمار ادیبوں اور دانشوروں سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان خالص تنقیدی نشستوں نے مجھے فکر و شعور کا ایک حیرت انگیز زاویہ عطا کیا۔

میں نے فہمیدہ ریاض کے رسالے 'آواز' میں بھی کام کیا۔ ایک دن انہوں نے پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی نظمیں دیں اور کہا... 'ابھی ترجمہ کرو کل پریس میں جانی ہیں'۔ میں نے کہا... 'میں نے تو یہ کام کبھی کیا ہی نہیں۔ کچھ وقت دیجیئے'۔ وہ بولیں... 'وقت کہاں ہے'۔ میں نے کہا... 'مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا'۔ فہمیدہ باجی ہنسنے لگیں۔ وہ اس وقت ہنستی ہوئی بہت ظالم لگیں اور جب تک میں کچھ سوچوں انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور یہ کہہ کر چلی گئیں... 'جیسے بھی ہو سکے کرو مگر ترجمہ تو کرنا ہی پڑے گا اور اچھی بچی تمہیں آج ہی کرنا ہے'۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس روز انہوں نے جو ترجمہ مجھ سے کروایا وہ مجھے اپنی ساری شاعری سے زیادہ عزیز ہے

۱۔ عشرت میں تمہیں یاد دلا دوں کہ عصمت آپا نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی تو یہی سمجھنا کہ پالنے سے پہلا پیر نکالا ہے۔ اے منزل نہ سمجھنا مگر تم خود سے بے نیازی کے دائرے در دائرے میں گھری ہوئی ہو۔ کب باہر نکلو گی (سلطانہ مہر)

اوران کی محبت بھری سزا کا احترام میرے دل میں ہمیشہ رہے گا۔

میں نے ایلیٹ پبلی شرز میں نوری نستعلیق کی لغت پر بھی مرزا جمیل کی زیرِنگرانی کام کیا۔ ریڈیو پر بزمِ طلبہ اور ورلڈ سروس میں بھی شرکت کرتی تھی۔ وہ بہت اچھے دن تھے۔ ریڈیو کا ماحول بالکل گھر کا سا تھا۔ پروڈیوسروں کا رویہ دوستانہ ہوتا تھا۔ ویسے اس معاملے میں میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے گرد ہمیشہ مہربان، مخلص اور دوست ہستیوں کا ایک حلقہ رہا۔ اور ازدواجی زندگی میں بھی شاید ان چند خوش نصیب شاعرات میں سے ہوں جسے ہم مزاج اور ہم مذاق شریک حیات قدرت نے عطا کیا۔

آپ کے سوال نامے کے توسط سے آج پھر ایک سوال اُٹھایا جا رہا ہے کہ کیا آپ اردو زبان و ادب کے مستقبل سے پُر امید ہیں؟ کل کے بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو زبان ہمارے خون میں رچی بسی ہے وہ تو ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ اس لئے آنے والے زمانوں میں ہم جس بھی شکل میں باقی رہیں گے اسی شکل میں ہماری زبان بھی باقی رہے گی۔ ویسے زبان کا کلیہ تو یہ ہے کہ ہر دور میں زبان اپنے زمانے کی ضرورتوں کے حساب سے اپنے سانچے بدلتی رہتی ہے۔ جو چودہ سو سال پہلے کی عربی تھی وہ آج نہیں ہے۔ جو سو سال پہلے اردو تھی وہ بھی نہیں ہے اور جو آج کی اردو ہے وہ یقیناً آنے والی صدی کی اردو نہیں ہوگی۔ وقت کے ساتھ اشیا کی شکست و ریخت کا عمل تو ایک ایسی آفاقی صداقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ پھر زبان جو ایک دریا کی طرح ہے اس کا رُخ کوئی کیسے متعین کر سکتا ہے۔ دریا اپنے راستے خود بناتا ہے اور جدھر سے گزرے گا ان کناروں کی خس و خاشاک بھی اپنے اندر شامل کرتا جائے گا اور نئے موتی بھی۔ یہی فطرت کا اصول ہے۔

ہاں رسم الخط زبان کا واحد جزو ہے جس پر وقت کی شکست و ریخت کا اثر مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے جب اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کی بات ہوتی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے ضرورت بحث کیوں چل رہی ہے۔ یہ میرے نزدیک اردو کو قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتی ہوں رسم الخط وہ زمین ہے جس پر زبان کی کاشت کی جاتی ہے۔ ہم اس رسم الخط میں لکھتے ہوئے شرم کیوں محسوس کرتے ہیں جس کا منبع عربی اور فارسی جیسی عظیم اور قدیم زبانیں ہیں۔ ایک ایسا رسم الخط جس کے پیچھے ہزار سالہ اسلامی تہذیب و معاشرت کے نقوش کے ساتھ ساتھ ہندی گرامر کا سجاؤ ہے، یہ کسی خاص خطے یا کسی خاص قبیلے کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان میں دو تہذیبوں کی آمیزش کا تحفہ ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری آنے والی نسلوں کو غالب کے خطوط یا میر کا دیوان ان کے اصل رسم الخط میں پڑھنے سے محروم کر دیا جائے اور ہمارا یہ عظیم ادبی سرمایہ صرف عجائب گھروں کی زینت بن کر رہ جائے۔

اگلا سوال نثری نظم کے متعلق ہے۔ نثری نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے تجربے ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ تجربہ ایجاد سے پہلے کا عمل ہے۔ اس لئے میں نثری نظم کو بطور ایک صنف تسلیم نہیں کرتی۔ ممکن ہے آنے والے وقت میں جب تجربے سے گزر کر ایجاد کے مرحلے میں آجائے تو خود کو منوانے میں کامیاب ہو جائے۔

میرے خیال میں عہدِ حاضر میں غزل کے معنی بدل چکے ہیں۔ میرے نزدیک غزل دو

مصرعوں میں نظم کیئے جانے والے ایسے لطیف پیرایہ اظہار کا نام ہے جو خیالات کی سطح سے بلند ہو کر احساسات کی شکل اختیار کرلے جب کہ نظم خیالات کی ترجمانی کا نام ہے۔ اب اگر غزل میں سیدھے سیدھے خیالات کی ترجمانی ملتی ہو تو آپ اسے کوئی بھی نام دے دیں لیکن وہ ہوگی صرف ایک نظم۔ جب کہ ایک نظم بھی بلاغت اور لطافت میں اگر اتنی ارفع ہو جائے کہ وہ احساس کی سطح کو چھو لے تو وہ غزل سے قریب ہوگی۔ یہ تو احساس اور خیال کے حوالے سے ایک بات تھی۔ لیکن نظم اپنے اندر جو گنجائش رکھتی ہے اس کی کوئی مثال ہی نہیں اور غزل جیسی سخت جان صنف کوئی دوسری ہے ہی نہیں۔

امیر خسرو کا شمار فارسی کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہیں فارسی، عربی، ترکی اور سنسکرت پر اہل زبان کا سا عبور تھا۔ ترکی ان کی پدری زبان تھی لیکن وہ خود فرماتے تھے ' ہندوی (جسے اب ہم اردو کہتے ہیں اور امیر خسرو کی مادری زبان تھی) سے بہت لگاؤ ہے بلکہ یہاں کے طیور بھی مجھ سے ہندوی میں گفتگو کرتے ہیں'۔ تو طے یہ پایا کہ جس زبان میں انسان نے خواب دیکھے ہوں اور لوری سنی ہو وہی اس کے لئے دنیا کی سب سے خوب صورت اور زندہ زبان ہوگی۔ اس میں نفع یا نقصان کا کیا سوال؟

آپ نے پوچھا ہے میری زندگی کا کوئی یادگار واقعہ، تو لیجیئے سنیئے۔ میں علامہ اقبال کالج کی طالبہ تھی۔ سرسید کالج میں شعری مقابلہ تھا۔ علامہ اقبال کالج سے دو لڑکیوں کو مقابلے میں شریک ہونا تھا۔ میں نے ایک طرحی غزل اور ایک نظم کہی تھی۔ نظم کا عنوان تھا 'تیسری دنیا'۔ ہماری پروفیسر نے نظم اور غزل، دونوں کو پسند کیا تھا لیکن ایک لڑکی دو مقابلوں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے جوش میں آ کر غزل اپنے لئے رکھ لی اور نظم کو یونہی سا سمجھ کر ایک دوسری لڑکی کو تھما دیا۔ لیکن وہ نظم پہلا انعام لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک خصوصی انعام کا اعلان ہوا۔ وہ مجھے غزل پر ملا۔ اس وقت بڑی کوفت ہوئی لیکن چند سال پہلے مجھے حیرت بھی ہوئی جب وہ خاتون مجھے ہیوسٹن میں مل گئیں۔ انہوں نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ سرسید کالج کے جس مقابلے میں آپ بھی شریک تھیں اس میں انہوں نے فرسٹ پرائز جیتا تھا شاعری میں''۔

عشرت آفرین اپنے دوسرے مجموعۂ کلام کی تیاری ایک طویل مدت سے کر رہی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام '' کنج پیلے پھولوں کا'' مکتبۂ دانیال، کراچی سے ۱۹۸۵ء میں اور مکتبۂ دین و ادب، لکھنؤ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ ان کے منتخب کلام کے تراجم '' دی سن فل ویمن (The Sinful Women)'' ویمنز پریس لندن اور '' بیانڈ بلیف (Beyond Belief)'' اے ایس آر پبلی کیشنز، لاہور نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیئے۔ کلام کا ترجمہ محترمہ رخسانہ احمد نے کیا۔ جاپانی پوئٹری میگزین '' ماڈرن پوئٹری'' اور '' لامیرا'' میں جو انتخاب شائع ہوا اس کا ترجمہ جناب چکا کوتہارا نے کیا۔

کنیڈا کے بزرگ محقق و ادیب جناب اکرام بریلوی نے عشرت آفرین کی شاعری پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا جو ۲۰۰۰ء میں کتابی صورت میں کراچی سے شائع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس، نئی دہلی ۱۹۸۷ء کے موقع پر نئی نسل کی نمائندہ شاعرہ کی حیثیت سے انہیں '' سجاد ظہیر ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ گزشتہ بیس سال سے پاکستان سے باہر کے ممالک میں مشاعروں اور

کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی، خاص طور پر ایشیا پوئٹری فیسٹیول، بھوپال ۱۹۸۸ء اور کنیڈین رائٹرز فورم سے ہونے والے "اقبال سیمینار ۱۹۸۸" کی تقریبات میں پاکستان سے ان کو مدعو کیا گیا۔ انہوں نے ناروے میں ہونے والے "استوانگا انٹرنیشنل فیسٹیول آف لٹریچر اینڈ فریڈم آف اسپیچ، کیپٹل ۱۹۹۹" میں شرکت کی۔

Mrs. Ishrat Afrin,
19214 Indian Stone Lane, Kitty, Texas 77449, USA

انتخابِ کلام

لڑکیاں ماؤں جیسے مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہیں

عورتیں اپنے دکھ کی وراثت کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں

وہ جو آپ ہی پوجی جانے کے لائق تھیں
چمپا سی پوروں میں پتھر کیوں رکھتی ہیں

وہ جو رہی ہیں خالی پیٹ اور ننگے پاؤں
بچا بچا کر سر کی چادر کیوں رکھتی ہیں

بند حویلی میں جو سانحے ہوجاتے ہیں
ان کی خبر دیواریں اکثر کیوں رکھتی ہیں

صبح وصال کی کرنیں ہم سے پوچھ رہی ہیں
راتیں اپنے ہاتھ میں خنجر کیوں رکھتی ہیں
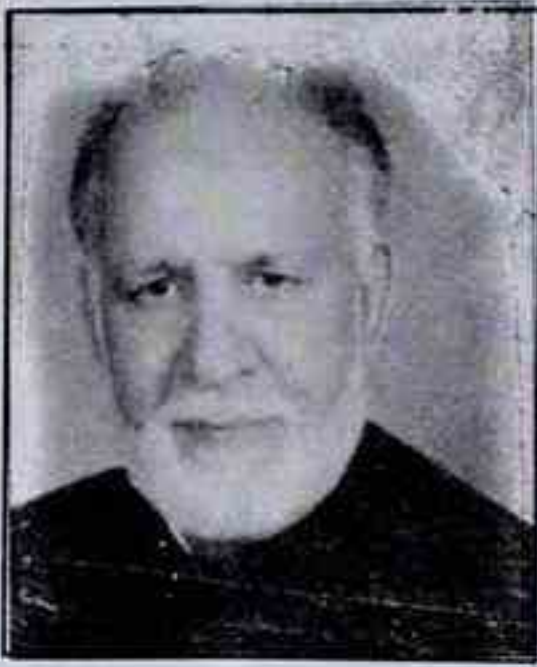
مسکائیے یہ الفت کا ادنیٰ سا کرشمہ
نظر میں میری ساری دنیا حسیں ہے
عطا جالندھری

سید عطا جالندھری (مرحوم)

سابق مقیم برمنگھم، برطانیہ

ایک شخص، ایک شاعر عطا جالندھری نے جب جنم لیا تو اس نے پنگوڑے میں شاعرانہ غوں غاں ضرور کی ہوگی جس کا مطلب بھی اس زبان کے سمجھنے والوں نے سمجھا ہوگا کہ اس کو پیدا کرنے والا اپنی اس تخلیق سے مایوس ہرگز نہیں ہوگا۔

چناں چہ وہ شاعر اپنے عالم شباب میں جب آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر اپنے نئے وطن پاکستان پہنچا تو اس یقین کے ساتھ، کہ وہ اپنے اُس نئے وطن، نئے ملک کو ایک جنت نظیر خطۂ زمین بنانے میں ساری صلاحیتیں صرف کر دے گا۔ اس کا یقین محکم تھا کہ اب اُس ملک میں طبقاتی، سماجی اور معاشی ناہمواری کی چکی میں اس جیسے معصوم انسان کی خواہشیں اور آرزوئیں نہیں پسیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ تقسیم ہند اور ہجرت کر کے پاکستان پہنچا تھا مگر ایک اور ہجرت اس کا مقدر تھی۔ چناں چہ شعور و آگہی سے مالا مال اس شاعر نے قلم کو تلوار اور اپنی فکر کو ڈھال بنا کر کہا۔

ہم ہیں منصور سر دار رہے ہیں برسوں
موت سے آنکھ ملانے کا بھرم رکھتے ہیں

یہ عطا جالندھری سے میں کبھی نہیں ملی مگر لوگوں سے ان کا ذکر سنا۔ ان کے شیدائیوں میں ان کے شاگرد رشید جناب جاوید اختر چودھری بھی ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے استاد، اپنے محسن سید عطا صاحب کو

یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوستوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ جانے کس کیفیت میں عطا صاحب نے کہا جو اُن کے دل کی آواز بن کر سنائی دی۔

رہ رسم وفا جس سے بڑھائی دیا اس نے ہی زخم آشنائی

ہر فن کار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس کے فن کی پزیرائی ہو۔ عطا صاحب کی بھی خواہش تھی تو غلط نہیں تھی۔ مگر پزیرائی تو دور انہیں ان کی تنہائیوں سے نکالنے والا بھی کوئی ایسا محب نہیں تھا کہ وہ اپنا دکھ درد بانٹ لیتے۔ سو وہ اس طرح شکوہ کناں ہوئے۔

حد سے بڑھ جائے گا پھر ہاتھ نہیں آئے گا اے طبیبو! مرے اس درد کا چارہ کرلو

عطا صاحب کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے، پہلا "چراغ جلنے دو" اکتوبر ۱۹۹۰ء میں؛ دوسرا "شب زدہ تنہائیاں" جولائی ۱۹۹۵ء میں اور تیسرا "رت جگوں کا عذاب" ۱۹۹۸ء میں۔

ان کی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں کئی معروف ادیبوں نے بڑے لطیف پیرائے میں اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ لندن میں مقیم حیدر طباطبائی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے... "عطا جالندھری سادات پنجاب کے اشراف میں سے ہیں۔ یہ تمام خانوادہ صوفی منش اور اللہ والے لوگوں سے تشکیل پاتا ہے اس لئے یہ میراث موصوف میں بھی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ ان سے شعر سننے کے بجائے دعائیں وہ بھی منظوم حاصل کیا کروں۔ عطا جالندھری کی سیرت اور شخصیت پر درویشی اور ان کی فکر پر علامہ اقبالؒ کی انمٹ چھاپ ہے"۔

اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار ان کی کتابوں میں محترم احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ڈاکٹر سعادت سعید، امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی اور جاوید اختر چودھری نے بھی اپنے اپنے مضامین میں کیا ہے۔

سید موصوف کا انتقال بھی اچانک ہی ہوا۔ جاوید اختر چودھری بتاتے ہیں... "سید عطا جالندھری عمرہ کے بعد پاکستان گئے۔ وہاں چند دن کے قیام کے بعد ۲۷/ جون ۱۹۹۸ء کی رات کو واپس برمنگھم پہنچے۔ قیام پاکستان کے دوران ڈاکٹر حسن رضوی نے ان کا انٹرویو روزنامہ جنگ کے لئے لیا تھا۔ وہ انہوں نے مجھے پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ انہوں نے دوران ملاقات مجھے یہ بھی بتایا کہ مرحوم اختر ضیائی نے اپنی زندگی میں اُن پر جو مضمون لکھا تھا وہ لاہور کے جناب اے۔جی جوش کے ماہنامہ "ادب دوست" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس ملاقات کے چند دن بعد برمنگھم کی نعت گو شاعرہ محترمہ طلعت سلیم کے مشاعرے میں سید عطا صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ خوش و خرم تھے لیکن چہرے سے کسل مندی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ مشاعرے میں انہوں نے اپنی عام روایت سے ہٹ کر اپنا کلام بیٹھ کر سنایا۔ انہوں نے اپنی تیسری کتاب "رت جگوں کا عذاب" کا ایک نسخہ مجھے دیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس کی تقریب تعارف اپنی ادبی تنظیم "سخنور" کے زیر اہتمام جلد سے جلد منعقد کروں۔ اس سلسلے میں ۱۰/ جولائی ۱۹۹۸ء کی شام میں ضروری امور طے کرنے کی غرض سے عطا صاحب سے ملا۔ اسی شام انہیں عید میلادالنبیؐ کے سلسلے میں ایک مشاعرے میں شرکت کرنی تھی۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا میں اس میں شریک ہوں گا؟ میں نے

اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر شرکتِ مشاعرے سے معذرت کرتے ہوئے ان سے کہا کہ میں ان کو مشاعرہ گاہ تک پہنچادوں گا کہ خواہ مخواہ وہ کہاں بسوں میں سفر کرتے پھریں گے۔ میری اس پیش کش پر انہوں نے مجھے دعائیں دی اور ساتھ ہی اپنی تازہ تصنیف پر کچھ لکھ کر مجھے دی کہ میں اسے محمود ہاشمی صاحب کو پہنچادوں۔ یہ ان کے ہاتھ کی آخری تحریر تھی جو انہوں نے ہاشمی صاحب کے لئے لکھی تھی۔ پھر وہ کپڑے تبدیل کرکے آگئے اور میری گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگے کہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے ان کی طبیعت مضمحل ہوگئی تھی لیکن انہوں نے اسپرے لے لیا ہے۔

کچھ دیر بعد جب گاڑی ٹریفک لائٹ کے قریب پہنچی تو انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اپنی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے اور میں انہیں سیدھا ہسپتال لے چلوں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھیں میچ لی تھیں اور سر سیٹ کی پشت پر ٹیک رکھا تھا۔ اس وقت مجھے کسی خاص خطرے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یوں آنکھیں موندتے ہوئے میں نے انہیں دو بار پہلے بھی دیکھا تھا، پہلی بار نزہت محمود کی کتاب کی تقریب اجرا کے موقع پر بریڈفورڈ جاتے ہوئے اور دوسری بار چند دن پہلے محترمہ طلعت سلیم کے مشاعرے میں۔ میں نے پوچھا شاہ جی کہڑے ہسپتال؟ بولے جتھے تیری مرضی۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے دو لمبے لمبے سانس لیئے اور ان کی گردن میری طرف لڑھک گئی۔ مجھے اب خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے ان کی گردن کو ہیڈ ریسٹ کے ساتھ لگا دیا اور سیٹ کو نیم دراز کردیا اور گاڑی کی ہیڈ لائیٹوں کو اور فلیشر لائیٹوں کو آن کیا اور گاڑی کا رُخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت دو ہسپتال میرے ذہن میں آئے، سٹی ہسپتال جو ڈڈلی روڈ پر ہے اور جہاں سید عطا صاحب چیک اپ کے لئے باقاعدہ جاتے رہے تھے، اور دوسرا ہارٹ لینڈ ہسپتال جو میرے گھر کے بالکل قریب ہے۔ میں نے گاڑی کا رُخ سٹی ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا حالات کی سنگینی کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ ذہن آگے پیچھے بھٹک رہا تھا۔ یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ شاید انہیں زندہ حالت میں ہسپتال نہ پہنچا سکوں۔ پھر پولیس کا خیال آیا اور جھنجھلاہٹ بڑھنے لگی کہ یوں تو کسی نہ کسی سڑک پر پولیس کار نظر آ ہی جاتی ہے پر اتنی دیر سے کار چلا رہا ہوں اور پولیس کا دور دور کوئی نام و نشان نہیں۔ جب میں نے سالٹلے وایاڈکٹ کا بڑا راؤنڈاباؤٹ پار کرلیا اور سید صاحب کی طرف دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ شاہ صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ میری اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ دفعتاً کار میں لگے ہوئے شیشے میں اپنے پیچھے پولیس کار نظر آئی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ باہر نکال کر اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور پل کے عین درمیان کار روک کر باہر نکلا۔ اس دوران پولیس آفیسر بھی اپنی کار سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھی کی حالت خطرے میں ہے۔ شاید انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ لیڈی پولیس آفیسر نے فوراً شاہ صاحب کا سیٹ بیلٹ کھولا۔ شاہ صاحب کی قمیص کے بٹن کھول کر سینے کو دبانے لگی۔ اس اثنا میں ایمبولینس آ پہنچی۔ اور ایمبولینس کے عملے نے عطا صاحب کو سنبھال لیا۔ لیڈی پولیس آفیسر نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر عطا صاحب اور میرے

بارے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ قصہ کوتاہ کچھ دیر بعد ایک اور ایمبولینس اور پولیس کار آئی۔ ہم ہسپتال پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم عطا، ان کی بیٹی شگفتہ اور بھانجی عندلیب بھی آ گئیں۔ کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر نے آ کر بتایا کی عطا صاحب ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ایمبولینس میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ سنتے ہی ہمارے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ان کی اس طرح اچانک جدائی نے کہرام ڈال دیا تھا۔ مگر اس سے زیادہ دکھ اس بات پر ہوا کہ ان کی تدفین پر بھی بہت کم لوگ آئے۔ ایسا لگتا تھا کہ متوفی کے پس ماندگان میں اگر کوئی فیض رساں شخصیت موجود ہو تو لوگ منہ دکھانے کے لئے تدفین کی کاروائی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ عطا صاحب اس دنیا سے گئے تو پس ماندگان میں کوئی ایسا نہ تھا کہ تعزیت کے لئے آنے والوں کی حاضری لیتا۔

عطا صاحب کے کئی شاگرد تھے لیکن ان میں سے بیشتر اعتراف کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر صفی حسن تھے کہ بقول عطا جالندھری جنہوں نے کھلے دل سے یہ اعتراف کیا ۔۔۔'میں عطا صاحب کی انگلی پکڑ کر چلا ہوں'۔ عطا صاحب اپنے ایک اور شاگرد، ضیا جالپوری کی معاملہ فہمی کے بھی بہت معترف تھے۔

سید عطا جالندھری کو اپنی زندگی میں وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ وہ میرے استاد تھے۔ ان کی طبیعت میں جلال تھا لیکن ان کا دل آئینہ کی طرح شفاف تھا۔ کسی سے خفا ہوتے تو دل میں گرہ نہیں باندھتے تھے۔ کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے۔ مگر ان کے ساتھ ان کے ہم عصروں کا سلوک بھی اچھا نہیں رہا۔ وہ جو شاعر، ادیب اور نقاد تھے اور وہ جو صرف سخن فہم تھے وہ سب ان کے لئے 'سخن نافہم' ثابت ہوئے۔

آج عطا جالندھری صاحب ہم سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن ایک اچھے شاعر اور ایک پیارے انسان کے ناطے ان کی محبتوں کے چراغ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں روشن رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس [illegible] عطا کرے۔ آمین"۔

عطا صاحب کے صاحبزا[illegible]ہے:

Dr. Syed Tahir Hussain,

197, Brantingham Road, Charlton, Manchester, M21 0TT, UK

انتخابِ کلام

اگر جو چاہو خطائے دل کا حساب رکھنا
تو ہاتھ میں پھر محاسبے کی کتاب رکھنا

◆

تمہارا منصب نہیں ہے نفرت کے بیج بونا
تم اپنے دامن میں چاہتوں کے گلاب رکھنا

◆

وہ لوگ جھوٹی انا کے گنبد میں ہیں مقید
جنہوں نے سیکھا ہے خود کو عزت مآب رکھنا

◆

تمہارے ہاتھوں میں قابلیت کا وہ ہنر ہے
کہ اک میں سورج تو ایک میں ماہ تاب رکھنا

◆

ہمارے لب پہ کبھی نہ آئے گا حرفِ باطل
ہمارے حصے میں تم جو چاہو عذاب رکھنا

◆

ہو جن کی تعریف کیف آور۔ حیات افزا
تم اپنی آنکھوں میں پیار کے ایسے خواب رکھنا

◆

سکونِ جاں کی نوید ہو حرف حرف جس کا
کتابِ دل میں محبتوں کا وہ باب رکھنا

◆

یقیں کی منزل عطاؔ ملے گی ضرور تم کو
جواں ارادوں کو ہر گھڑی ہم رکاب رکھنا

◆

جھوٹ بر بر ہمیں سب ہوتے ہیں
اور سچ ہمیں سنا نہیں جاتا

عظیم

۲۴ ستمبر ۲۰۰۱ء
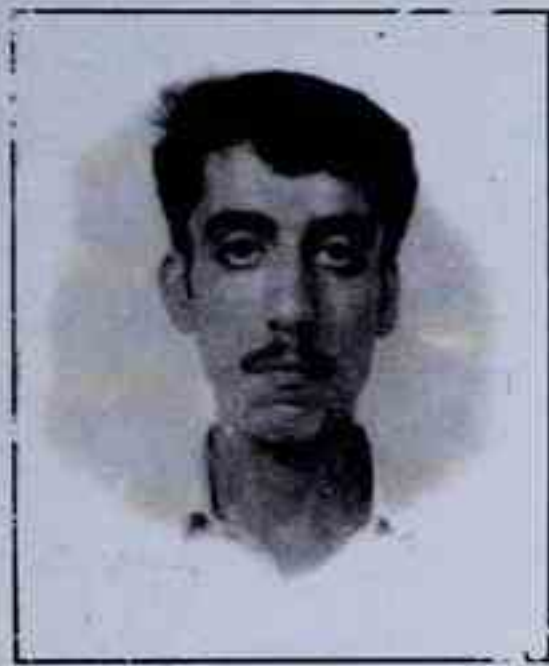
طاہر عظیم

سافرہ، بحرین، عربین گلف

محمد عظیم نے جب اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سنایا تو میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ اور مجھے ایک شاعر پروفیسر نورالحسن نور کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا۔

پھول کی پتی میں ہوتا ہے گلستاں پنہاں ذرۂ ریگ میں رہتا ہے بیاباں پنہاں

بلاشبہ ''الفاظ'' خود میں بڑی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ طاقت کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں وہ دنیا میں مسرتیں بانٹنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ورنہ الفاظ کے کانٹے چبھونا تو سب کو آتا ہے۔ ان سے کون کتنا زخمی ہوا یہ تو وہی جانتا ہے جس نے زخم کی اذیت اٹھائی ہو۔

ایسا ہی ایک واقعہ عظیم کی زندگی میں پیش آیا۔ وہ کہہ رہے تھے ... ''ایک دفعہ میں ایک مشاعرے میں کلام پڑھنے کی غرض سے گیا۔ میں نے انتظامیہ کے ایک صاحب سے کہا کہ میرا نام فہرست میں شامل کر لیجیے۔ انہوں نے دوسرے آدمی کے پاس بھیجا۔ میں نے ان کے پاس جا کر کہا کہ صاحب میں مشاعرے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بڑی بے زاری سے روکھے لہجے میں کہا ... 'جائیے، جائیے، آپ مشاعرہ نہیں پڑھ سکتے۔ جن کو دعوت دی ہے صرف وہی پڑھیں گے'۔ میں سوچتا رہ گیا کہ کاش وہ گُر نہ دیتے، گُر جیسی بات ہی کہہ دیتے (۱)''۔

ا۔ اس بات سے گُڑ والو لنے والے کوئی ہنر کی بات سیکھ لیں تو کیا کہنا۔ سلطانہ مہر

ان کا گھریلو نام محمد عظیم اور ادبی نام طاہر عظیم ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں پاکستان کے ضلع تربت، تحصیل مند مکران کے ایک گاؤں "گوبرد" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زمیندار تھے۔ زمیندار بھی ایسے جو زمینوں پر خود ہل چلاتے تھے۔ عظیم کی عمر جب آٹھ (۸) سال کی تھی تو وہ وفات پا گئے۔ اس دکھ بھرے احساس پر عظیم کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ان کا سایہ کیا اٹھا سر سے عظیم ۔۔۔ دھوپ ہر سو چھا گئی دہلیز پر

عظیم نے ابتدائی تعلیم وہیں اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ آگے تعلیم کے حصول کا موقع نہ ملا۔ ۱۹۹۴ء میں بحرین آئے اور ۱۹۹۷ء سے تاحال بحرین کی وزارت داخلہ سے منسلک ہیں۔

عظیم جس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اردو شاعری تو دور، اردو زبان ہی بولی نہیں جاتی۔ اور جن کو تھوڑی بہت اردو آتی ہے تو وہ مذکر، مونث، واحد، جمع کا تکلف کیئے بغیر اردو بولتے ہیں مثلاً آپ کسی سے احترام کے انداز میں بات کرنا چاہتے ہوں تو کہا جاتا ہے... "آپ کیسے ہو؟" ایک دفعہ وہ دو چار دوستوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی۔ انہوں نے دوستوں سے کہا کہ گاڑی آرہی ہے تو اس پر ایک صاحب کہنے لگے کہ گاڑی کوئی لڑکی ہے جو آرہی ہے۔ ایسے ماحول میں شاعری اور وہ بھی اردو شاعری کیسے کی جاسکتی ہے۔ البتہ عظیم کو شوق تھا کہ وہ بھی شعر کہہ سکیں۔ چنانچہ ان کی بھرپور ادبی زندگی کا آغاز بحرین آنے کے بعد ہوا اور رموز شاعری سے واقفیت جناب رخسار ناظم آبادی سے حاصل کی۔

عظیم کہہ رہے تھے... "میں نے صرف ایک آدھ نظم کہی ہے کیونکہ میں نے صنفِ غزل کو اپنایا ہے۔ صرف خیالات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا شاعری نہیں۔ یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ اچھی سوچ سب رکھتے ہیں لیکن بات عروضی بندشوں میں رہ کر کہنے کی ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل کوئی شاعری نہیں۔ یہ تجربے وہی لوگ کر رہے ہیں جو عروض کی بندشوں کے پابند نہیں رہ سکتے اور عروضی بندشوں کو ختم کرنے کے حامی ہیں"۔

عظیم اردو زبان اور ادب کے مستقبل سے پُر امید ہیں۔ اُن کا کہنا ہے... "یہ ممکن ہے کہ جس شکل میں اردو آج موجود ہے اس شکل میں نہ ہو لیکن اس کا مستقبل روشن ہے۔ رہی رسم الخط کی بات تو یہ رسم الخط ہی تو اس زبان کی پہچان ہے۔ لہٰذا اس کی تبدیلی کو سودمند نہیں سمجھتا"۔

عظیم کا خیال ہے... "غزل کے ہر شعر میں 'کوزے میں سمندر بند کرنے' والی بات ہوتی ہے اور نظم سمندر ہی سمندر۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دیتے"۔

انہوں نے یہ بھی کہا... "آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہی نہیں بلکہ مکمل ترجمان ہے۔ اردو زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ جس نے مجھ جیسے آدمی کو، جس کی مادری زبان کوئی اور ہے، اپنی طرف کھینچا۔ زبان خواہ کوئی بھی ہو اُسے اپنانے سے نقصان نہیں ہوتا اور اردو زبان کی تو بات ہی اور ہے۔

مجھے اردو سے بہت کچھ ملا۔ اردو کی بدولت ہی میں اس مقام پر پہنچا ہوں''۔

انہیں اردو زبان کے شعرا میں ناصر کاظمی، ساغر صدیقی اور سب سے زیادہ ساحر لدھیانوی کا کلام پسند ہے۔اب ان سے ان کی ایک نظم'' بنامِ وطن'' سنتے ہیں۔

جو میں پھول، خوشبو، چمن لکھ رہا ہوں ۔۔۔ تو سب یہ بنامِ وطن لکھ رہا ہوں

وہی ذرّہ ذرّہ نرالا ہے جس کا ۔۔۔ میں اپنا اُسے پیرہن لکھ رہا ہوں

وہ میرا وطن ہے، وہ تیرا وطن ہے ۔۔۔ گلوں کی جسے انجمن لکھ رہا ہوں

عقیدت کے سارے سخن پھول جیسے ۔۔۔ بہ اندازِ شعر و سخن لکھ رہا ہوں

مجھے بھی عظیم اپنے ارضِ وطن سے ۔۔۔ محبت ہے جس کو لگن لکھ رہا ہوں

Mr Tahir Azeem,
House No.542, Road 4411, BlockNo. 944, Safra, Bahrain. (AG)

انتخابِ کلام

زندگی میں جب کوئی اچھا لگا ۔۔۔ جنگلوں کی رسم کا خدشہ لگا

ہاں سفر کرنا عمومی بات تھی ۔۔۔ پُر خطر لیکن مجھے رستہ لگا

پھر نظر نے بھی عجب کھایا فریب ۔۔۔ وہ جو صحرا تھا وہی دریا لگا

ایک تحفہ زخم کا دے کر مجھے ۔۔۔ پوچھتے ہیں جس کے وہ کیسا لگا

تھا خلاؤں میں ابھی اُبھرا ہوا ۔۔۔ ایک چہرہ جو مجھے اُس کا لگا

زخم ایسا تھا کہ بھرنے میں اُسے ۔۔۔ ہاں عظیم اِک عمر کا عرصہ لگا
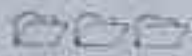
اب خیالوں سے نکلنا سیکھنا ۔۔۔ تم حقیقت سے گزرنا سیکھنا

جرم کرنا تم نے سیکھا ہے اگر ۔۔۔ تو سزا بھی اب بھگتنا سیکھنا

ایک خنجر وہ تھما کر ہاتھ میں ۔۔۔ کہہ گیا ہے قتل کرنا سیکھنا

عہدِ نو کا یہ سبق ہے دوستو ۔۔۔ گر تمہیں جینا ہے مرنا سیکھنا

شاعری تم بعد میں کرنا عظیم ۔۔۔ پہلے لفظوں کو برتنا سیکھنا

روشنی کا سراغ ملتا ہے
جب لہو کے چراغ جلتے ہیں

غوثیہ سلطانہ عنایت الدین
۱۵ جنوری ۲۰۰۰ء

غوثیہ سلطانہ

شکاگو، امریکہ

غوثیہ سلطانہ ایک خاتون کا نام نہیں ایک انجمن کا نام ہے۔ حیدرآباد، دکن (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے ایم اے کیا اور شکاگو، امریکہ سے ڈرافٹنگ اور کمپیوٹنگ (Drafting & Computing) میں ڈپلوما حاصل کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر اب تک علمی، تہذیبی اور ادبی پروگراموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتی رہی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد کے لئے سماجی مسائل کو ہدف طنز بناتے ہوئے تقریباً دوسو (۲۰۰) مونولاگس (monologues خود کلامی) خاکے لکھے اور لائق تحسین صداکاری کی کیونکہ غوثیہ کی آواز میں ایک منفرد ساز کی گنگناہٹ اور لے پنہچی ہے۔

حال ہی میں انہوں نے اپنے ایم اے کے مقالے کو کتابی شکل دی ہے۔ یہ مقالہ سلیمان اریب کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا ہے۔ مرحوم سلیمان اریب کی بیگم صفیہ اریب نے لکھا ہے کہ اریب کی شخصیت اور خدمات پر یوں تو کافی مضامین لکھے جا چکے ہیں اور اس دور کے شعرا اور ادیبوں نے ان پر بہت کچھ لکھا مگر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اریب کی خدمات کا تفصیلی جائزہ کسی نے لیا تو یہ پہلا اور (شاید) آخری کام غوثیہ سلطانہ کا ہے۔

غوثیہ مرنجان مرنج شخصیت کی مالک ہیں۔ دکھوں سے مسکراتے ہوئے جہاد کرتی ہیں۔ عورتوں کے مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''بیوی سے محبت'' مجھے یاد آرہی ہے...

بسترِ مرگ پر بیوی پڑی تھی

شوہر تھا بے چارہ۔ سوگوار اور دنگ

برداشت بھلا اس کو کیسے ہوتا کہ

ستر برس سے تھے دونوں سنگ سنگ

دیکھا جو عزرائیل کو

تو بول اٹھا بے چارہ

آیئے حضور

ادھر ہے مریضہ کا پلنگ

غوثیہ نے مجھے یہ نظم سنائی اور ساتھ ساتھ یہ لطیفہ نما واقعہ بھی۔ ''ہوا یوں کہ ایک بار ایک ڈاکو نے پستول تان کر خاتونِ خانہ سے کہا، 'اپنے سارے زیور میرے حوالے کردو ورنہ میں تمہارے شوہر کو ہلاک کردوں گا۔ جلدی بولو، کیا چاہیئے، زیور یا شوہر۔ 'ٹھہر جا کمبخت، ذرا دس پندرہ منٹ سوچ تو لینے دے'، خاتونِ خانہ نے زیورات کی الماری کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا''۔

غوثیہ شکاگو کے سماجی اور ادبی حلقوں میں ایک جانا پہچانا معتبر نام ہے۔ دو سال قبل ان کے شوہر غیاث الدین کا انتقال ہوگیا۔ غوثیہ کا اپنا بزنس (business کاروبار) ہے۔ وہ تنہا ہے لیکن تنہائی کے گھپ اندھیرے میں مرحوم شوہر اور بچوں کے پیار کی شمع جلائے کارگاہِ حیات پر رواں دواں ہے۔

طالب علمی کے زمانے سے لے کر اب تک غوثیہ اپنی سماجی و ادبی خدمات پر متعدد ایوارڈ لے چکی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے اپنا پہلا مضمون ''رہنمائے دکن'' کے لئے لکھا تھا۔ انہوں نے تین سو (۳۰۰) سے زائد دکھنی محاوروں کا مجموعہ بھی جمع کیا ہوا ہے جو اگر کتاب کی شکل اختیار کرلے تو اردو ادب میں اس سے ایک قابل قدر سرمائے کا اضافہ ہوجائے گا۔ غوثیہ نے ''زندہ دلانِ حیدرآباد'' کے جڑواں ادارے ''زندہ دلانِ شکاگو'' کو بھی جنم دیا جس کے تحت دلچسپ پروگرام پیش کیئے جاتے ہیں۔ مطالعہ ان کا شوق ہے۔ انگریزی شعرا میں شیلے، کیٹس، بائرن اور ورڈز ورتھ (Percy Bysshe Shelley, John Keats, Lord Byron and William Wordsworth) ضرور دُہراتی ہیں۔ اردو شعرا میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ اور ساحرؔ کی رسیا ہیں۔

''زندہ دلانِ حیدرآباد'' کے مشاعروں سے وابستگی تھی اور شاعری سے دلچسپی، لہٰذا ۱۹۷۴ء سے شعر کہنے کی ابتدا کی کیونکہ نثر کی نسبت نظم اور غزل میں اپنے خیال و فکر کے اظہار کو زیادہ بہتر طور پر ادا کرسکتی ہیں۔

غوثیہ کا کہنا ہے... ''زندگی اجالوں کا شہر ہے۔ انسانی آنکھ میں دیکھنے کے ساتھ گہرائی تک

جانے کی صلاحیت ہو تو کائنات میں ہر طرف قوسِ قزح کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ ایک سچا فن کار اپنے اطراف کے دکھ اور مسائل کو ان رنگوں سے آراستہ کرتا ہے"۔ غوثیہ نظریاتی ادب و شاعری کی قائل نہیں، کہتی ہیں... "شاعر تو خود خالق ہے وہ اپنی دنیا آپ تخلیق کرتا ہے۔ شاعری میں وجدان ضروری ہے۔ اقبالؔ سے متاثر ہوں جن کی شاعری قدیم و جدید رنگ لیئے ہوئے ہے۔ عشق اقبالؔ کے شاعرانہ خیال میں محکم حقائق ذریعۂ عقل نہیں بلکہ وجدان ہے جو طاقتِ عشق کی بدولت انسان میں پیدا ہوتا ہے اور کہلواتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہی وجدان ہے جو بڑی شاعری کو جنم دیتا ہے۔ یہی وجدان غالب کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ غالب جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں"۔

غوثیہ اس خیال سے متفق ہیں کہ ادب اظہار ذات اور کائنات، دونوں ہے۔ فن ادب فنکار کا کل حیاتی ردعمل ہوتا ہے جو کئی حیثیتوں میں ایک ادیب کی ذات میں یک جا ہو جاتا ہے۔ ادیب کے تحت الشعور میں ایک ذاتی کیفیت اظہار کی راہ پاتی ہے۔ جیسے ورڈز ورتھ کی شاعری ہے جس کی فکر کی تڑپ اور کیفیت اس کی اپنی ذات سے نکل کر کائنات پر چھا جاتی ہے۔ ایسی شاعری ہی آفاقی شاعری کا درجہ پاتی ہے۔

غوثیہ گروہ بندی سے دور بے لاگ تنقید کو فن کا نکھار سمجھتی ہیں۔ ابلاغ کے لئے آسان زبان کا استعمال ضروری سمجھتی ہیں۔ اردو کے مستقبل سے پر امید نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے... "آج کے اردو بولنے والے ادیبوں اور شاعروں پر بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس زبان کی بقا کے لئے عملی قدم اٹھائیں۔ اپنے بچوں تک اپنا ورثہ منتقل کریں۔ صرف ادبی رسائل کی اشاعت سے کچھ نہ ہوگا۔ علمی و ادبی محفلوں کا زیادہ سے زیادہ انعقاد کریں۔ اردو ڈراموں کو مقبولیت دیں۔ آج کی نئی پود جس نے انگریزی زبان ابتدا سے سیکھی ہے وہ بھی اردو فلمی گانوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

چونکہ آج کے مشاعرے کمرشیل (commercial تجارتی کاروبار) ہو گئے ہیں لہٰذا بچوں کے لئے گھریلو شعری نشستیں منعقد کرنا چاہیئیں جن میں وہ خود حصہ لیں اور ان کے ذوق کی چیزیں انہیں ملیں۔ انہیں بیت بازی سکھائی جائے تا کہ ان کا شعری ذوق نکھرے"۔ (۱)

اس ضمن میں غوثیہ چینی (Chinese) اور کوریائی (Korean) مہاجرین کی، جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھانا لازمی سمجھتے ہیں، مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں... "ہمیں بھی زبان و

(۱) اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے ان دو پتوں میں سے کسی ایک پتے پر رجوع کیا جا سکتا ہے:

National Library of Poetry, PO Box 11419, Gauridge Dr., Olonings Mills, M 'D 21117, USA/ Poet Guide, PO Box 10900 E, Baltimore, M D 21234, USA

ادب کے لئے خلوص دل سے کام کرنا ہوگا۔ محض اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر دامن چھڑا لینے سے تو یقیناً ہم اپنی زبان کے تناور درخت کی جڑیں اپنے ہاتھ سے کاٹ دیں گے"۔

ادیب وشاعر کی تخلیقات اس کے عہد کی نمائندہ ہوتی ہیں، کے جواب میں انہوں نے فیضؔ کا ایک شعر سنایا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر   وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیضؔ کا یہ شعر اپنے اس دور کا نمائندہ ہے جب آزادی ملی لیکن دولت پھر بھی چند ہاتھوں میں سمٹی رہی۔ بندۂ مزدور کی اوقات نہیں بدلی۔ آج بھی بہت سے شعرا کا کلام اپنے دور کا نمائندہ ہے۔

طنز ومزاح کے سلسلے میں غوثیہ کہتی ہیں..."مزاح نگار میں بلا کی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کی ضرورت ہے۔ دراصل دانش کی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے کہہ جانا اعلیٰ وعمدہ مذاق ہے۔ طنز ومزاح ادب کی سب سے پیاری صنف سخن ہے۔ ایک مسکراہٹ سے سینتیس (۳۷) اور ایک قہقہے سے جسم کے اسی (۸۰) عضلات متاثر ہوتے ہیں۔ کسی فزیالوجسٹ (Physiologist ماہرِ علم الحیات) کے بقول قہقہہ سے جسم میں ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو جسم کی کارکردگی کو توانائی بخشتا ہے۔ اس لئے مسائل سے قہقہوں اور ہنسی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہی بڑائی کی دلیل ہے۔ اور اسی لحاظ سے طنز ومزاح نگار تو قاری کا مسیحا ہے اور اس فن میں دسترس حاصل کرنا آسان نہیں"۔ طنز ومزاح کے شہنشاہ، مشہور کالم نویس و ادیب سید ضمیر جعفری مرحوم نے انہیں "اردو ادب کی چاندنی بی" کے خطاب سے نوازا ہے۔

غوثیہ کا کلام شمع دہلی، بیسویں صدی دہلی، نوائے ادب، جھلکیاں، اردو دنیا، رہنمائے دکن، دکن کرانیکل اور نارچ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اخبارات میں کالم لکھ کر اپنی آواز ایوانِ اقتدار تک پہنچانے میں سرگرم رہتی ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "سخنور، اول" میں جناب جوشؔ ملیح آبادی کے تعارف میں لکھا تھا کہ جوشؔ صاحب کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر حکومتِ پاکستان نے ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کیئے ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے غوثیہ نے کہیں لکھا ہے..."امریکی محکمۂ ڈاک کا تاریخ میں حوالہ آئے گا کہ پہلی بار حکومت امریکہ نے مسلمانوں کے لئے عید الفطر کے موقع پر ۲۰۰۲ء میں ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کیئے ہیں۔ اس کا ڈیزائن ایک ماہر اسلامی خطاط محمد زکریا نے تیار کیا ہے۔ اس پر عربی رسم الخط میں 'عید مبارک' تحریر ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ دیا ہے۔ گہرے نیلگوں رنگ کی زمین پر سنہرے رنگ میں عید مبارک اور چاندی کے رنگ میں عید مبارک کا انگریزی ترجمہ موجود ہے"۔

غوثیہ اردو زبان کا رسم الخط بدلنے کی حامی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو کا رسم الخط بدلا تو اردو کی شناخت مٹ جائے گی۔ غوثیہ کی لکھی ہوئی ایک دعا اور ایک نظم قارئین کی خدمت میں پیش ہے

اے رب دیکھوں تو

ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟

مسجد دامن کھینچے ہے
مندر پاس بلاتا ہے
ہر اک اپنی اپنی ہی ہم کو راہ دکھاتا ہے
اک دوراہے پہ کھڑی
سوچ رہی ہوں یارب
انسانوں کا جنگل ہے
بھانت بھانت کی بولی ہے
الگ الگ ہر ٹولی ہے
آپس میں کھٹا پٹی ہے
کشمکش اور کھینچا تانی ہے

☆☆☆

وحشت کے سونے جنگل میں دور دور تک کوئی نہیں
بس میں اور میری تنہائی تھی
ایک شام آسمان سے لہو ٹپکا
اور میری تنہائی کے اس سونے جنگل میں
اک نام دے گیا
جسے زندگی کہتے ہیں

Mrs. Ghousia Sultana,
1182, Narraganset Drive, Carol Stream, ILL. 60188, USA

انتخابِ کلام

رنگ اب لوگ یوں بدلتے ہیں
جیسے چیونٹی کے پر نکلتے ہیں

◆

بے ثباتی کا اپنی یہ ہے ثبوت
چھاؤں کی طرح ہم بھی ڈھلتے ہیں

◆

ساتھ دیتا ہے کون منزل تک
دو قدم لوگ ساتھ چلتے ہیں

◆

دوستی کا نہ پوچھیے مفہوم
آستینوں میں سانپ پلتے ہیں

◆

آشنا سوزِ عشق سے جو ہیں
جانے کس آگ میں وہ جلتے ہیں

◆

جانے کیوں دل میں اتنے لوگوں کے
شاخسانوں کے شاخ پھلتے ہیں

◆

روشنی کا سراغ ملتا ہے
جب لہو کے چراغ جلتے ہیں

◆

عمر بھر بیساکھیوں سے دُور رہ کر بھی فراغ
سوچتا ہوں شہرِ فن میں قد مرا کیسے بڑھا

فراغ روہوی
19.5.1999

فراغ روہوی

کولکتہ، ہندوستان

آیئے! پہلے فراغ روہوی سے ان کی نظم "امتیاز" سُنیں۔

مجھے اس نے نوازا ہے
نہ سونے سے نہ چاندی سے
نہ ہیرے سے نہ موتی سے
نہ مال وزر نہ دولت سے
مگر پھر بھی میں شاکر ہوں
کہ اس نے مجھ سے ناداں کو
فقط لوح و قلم دے کر وہ رتبہ آج بخشا ہے
جو دنیا بھر کی دولت سے کبھی حاصل نہیں ہوتا
یہی احساس اوروں سے مجھے ممتاز کرتا ہے

فراغ روہوی افسانہ نگار تھے۔ پھر شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ بقول قیصر شمیم (مہمان لکچرر، شعبۂ اردو، کولکتہ یونیورسٹی) فراغ نے چودہ پندرہ سال کے قلیل عرصے میں اتنا کچھ کہا ہے کہ وہ

چاہیں تو اپنے کلام کے دو تین مجموعے شائع کرا سکتے ہیں۔ مگر فراغ نے اپنی تنخواہ کے روپے اس مد میں استعمال کرنا کبھی بھی مناسب نہ سمجھا اور اپنی بیوی بچوں کی ذمہ داری کے علاوہ مشترکہ خاندان کی وجہ سے دیگر بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتے ہیں اور ریڈیو، ٹی وی، رسائل اور ریکارڈنگ کمپنیوں سے حاصل ہونے والی رائلٹی (Royalty) کی رقم سے اپنا یہ شوق پورا کرتے ہیں۔ ایم ایچ وی (MHV) سے انہیں ایک بڑی رقم رائلٹی کے طور پر ملتی ہے۔ ان کے گیت لتا منگیشکر کے علاوہ جگجیت سنگھ، چترا سنگھ اور دیگر گلوکاروں نے گائے ہیں اور ''ہوپ (Hope)'' نامی کیسٹ میں ندا فاضلی، بشیر بدر، شہریار اور ظفر گورکھپوری کی غزلوں کے ساتھ ان کی بھی ایک غزل موجود ہے۔

ان کی غزلوں کا ایک ضخیم مجموعہ'' ذرا انتظار کر'' ۲۰۰۰ء میں تیار تھا اور غالباً اب تک شائع بھی ہو گیا ہوگا۔ مگر ان کا پہلا مجموعہ ماہیوں کا ہے جس کا نام ہے''چھیاں چھیاں''۔ ماہیے کہنے کے شوق نے ان سے کولکتہ میں ماہیا نگاروں کا مشاعرہ بھی کرا ڈالا جس میں ماہیا نگاری میں ہندوستان کے قائد مناظر عاشق ہرگانوی بھی شریک تھے۔ فراغ کا لکھا بچوں کے لئے ایک ماہیا ملاحظہ ہو:

سن میری دعا یارب
باغ میں نانی کا
ایک پیڑ لگا یارب

فراغ نے رباعیاں بھی بڑی شان سے کہی ہیں۔ دیکھئے۔

بے وقت کی برسات بری لگتی ہے ۔۔۔ بے کار کی ہر بات بری لگتی ہے
جو فیض نہ پہنچائے کسی کو یارو ۔۔۔ وہ جیسی بھی ہو ذات بُری لگتی ہے

فراغ نے ۱۹۸۰ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا ہے۔ کچھ عرصہ ادبی صحافت کے مزے خوب لوٹے۔ ۱۹۸۳ء سے ماہنامہ'' کلید خزانہ، کولکتہ'' سے وابستہ رہے جس کے سولہ (۱۶) شمارے پابندی سے شائع ہوئے۔ بنگالی فلم'' تنہائی'' کے لئے چھ (۶) گیت لکھے جن میں سے تین گلوکار محمد عزیز نے گائے۔ بنگالی فلم'' سمجھوتہ'' میں دو نغمے لکھے جو محمد عزیز اور روحی خانم نے گائے۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ فراغ ۱۶ / اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اپنے آبائی وطن روہ، ضلع نوادہ، صوبہ بہار، انڈیا میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام محمد علی صدیقی منتخب کیا لیکن جب شاعری نے گلے لگایا تو انہوں نے اپنا قلمی نام فراغ روہوی رکھ لیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت آبائی وطن میں ہوئی۔ مزید کسب علم کی آرزو میں ۱۹۶۵ء میں شہر نگور، کولکتہ آگئے کیونکہ ان کے والد محترم محمد انعام الحق صدیقی وہیں بسلسلہ تجارت (کتب فروشی) مقیم تھے۔ یہیں سے محمد جان ہائر سیکنڈری اسکول سے ۱۹۷۵ء میں ہائر سیکنڈری امتحان پاس کر کے کولکتہ کے اُمیش چندر کالج میں بی کام (B Com) کے طالب علم ہو گئے۔ لیکن پارٹ ون (part I) کے امتحان سے کچھ پہلے بعض دشواریوں کے باعث ان کا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ اس کا ملال انہیں آج بھی ہے۔ لیکن فراغ کے ذوق مطالعہ نے انہیں

بڑا اسہارا دیا۔ اب وہ ایک پرائیوٹ فرم (ٹرانسپورٹ کمپنی) میں کیشیر (cashier) کے عہدے پر فائز ہیں۔

فراغ کہہ رہے تھے... ''خدا کا شکر ہے کہ میری شاعری کسی مکتبہ فکر سے کبھی متاثر نہیں رہی ہے۔ میرے ہاں روایات کی پاسداری ہے اور جدید اسلوب کا رچاؤ بھی نظر آئے گا یعنی جیسا موڈ ہوا کرتا ہے ویسی ہی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ بنیادی طور پر میں غزل کا شاعر ہوں لیکن ماہیوں پر مشتمل میرا اولین مجموعۂ کلام 'چھیاں چھیاں' ٹھہرا، جو ماہ جون ۱۹۹۹ء میں اشاعت کے مرحلے سے گزر کر جولائی ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا اور جسے اہل نظر حضرات نے بے حد سراہا ہے۔ میری تخلیقات جن اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ پھر بھی کچھ ادبی رسالوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

بیرون ممالک میں... 'تشکیل' پاکستان؛ 'سحور' پاکستان؛ 'جدید ادب' جرمنی؛ 'بازگشت' ناروے؛ 'پاکستان لنک' امریکہ؛ اور ہندوستان میں 'ایوان اردو'؛ 'آج کل'؛ 'شاعر'؛ 'نیا دور'؛ 'نخلستان'؛ 'زبان و ادب'؛ 'اثبات و نفی'؛ 'دستک'؛ 'مژگان'؛ 'انشا'؛ 'روح ادب'، 'آبشار'؛ 'شہود'، 'دستخط'؛ 'کوہسار'؛ 'اسباق'؛ 'گلبن'؛ 'انتساب'؛ 'تکمیل'؛ 'رنگ'؛ 'خرام'؛ 'سب رس'؛ 'تعمیر'؛ 'بزم فکر و فن'؛ 'فروغ ادب'، 'شاداب'، 'ادبی اردو چینل'؛ 'اردو مورچہ'؛ 'سہیل'؛ 'شیشم'؛ 'تکلم'؛ 'شمس و قمر'؛ 'علم و دانش'؛ 'یوجنا'؛ 'سینک ساچار'؛ 'راشٹریہ سہارا'؛ 'ان و نثر'؛ 'پرواز ادب'؛ 'روشن ادب'؛ 'شمع'؛ 'بانو'؛ 'بیسویں صدی'؛ 'افکار'؛ 'انوار جہاں'؛ 'روبی'؛ 'فلمی ستارے'؛ 'باتیں'؛ 'امنگ'؛ 'بچوں کی دنیا'؛ 'طالب علم'؛ 'حسن اخلاق'؛ 'آزاد ہند'؛ 'اخبار مشرق' اور وغیرہ وغیرہ۔(۱)

مجھے شعر و ادب، مذہب، سماجیات، نفسیات، سفرنامہ، سوانح حیات و تذکرہ، طنز و مزاح اور سیاست سے خاصی دلچسپی ہے۔

جناب میری زندگی کوئی غیر معمولی نہیں گزری ہے۔ نہ ہی کوئی دلچسپ واقعہ رونما ہوا ہے جسے میں بیان کرسکوں۔ ہاں یہ شعر سنا سکتا ہوں۔

دن رات جہاں آنکھ دکھاتے ہیں مسائل　　　وہ دنیا تو بچپن میں دکھادی گئی مجھ کو

فراغ کہہ رہے تھے کہ وہ اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں ہیں۔ کیوں کہ جس زبان کا جنم ہندوستان میں ہوا وہ زبان آج عالمی سطح پر فروغ پا رہی ہے۔ اردو زبان بڑی مستحکم زبان ہے بھلا جس زبان کے وجود میں کئی زبانوں کا خمیر شامل ہو، اسے کون مٹا سکتا ہے۔

فراغ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، رباعیاں، دوہے، ماہیے اور کہہ مکرنیاں بھی۔ لیکن اظہار خیال کے لئے وہ غزل کے مقابلے میں کسی بھی دوسری صنف کو موثر ذریعہ نہیں سمجھتے۔ بقول ان کے... ''ایک شعر کے صرف دو مصرعوں میں کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے''۔ جہاں تک تجربے کا سوال ہے تو وہ اسے برا نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے... ''تجربہ بغاوت کا نام نہیں، نئے پن کی تلاش کا دوسرا نام ہے''۔ لیکن وہ شاعری کے نام پر کسی بھی نثری صنف کو شاعری کے زمرے میں شامل نہیں کرتے خواہ

(۱) قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ گو یہ فہرست کسی حال میں بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی پھر بھی کتنی بڑی تعداد میں اردو ادب کے معیاری جرائد صرف ہندو پاک سے ہی شائع ہو رہے ہیں۔ سلطانہ مہر

وہ نثری نظم ہو یا نثری غزل۔

ان کے خیال میں ادب کی تخلیق میں تنقیدی نشستیں ہی اہم رول (role) ادا کر رہی ہیں۔ کیوں کہ آج کے مشاعرے ادب سے کوسوں دور ہیں۔ آج کل مشاعروں میں صرف اداکاری اور آواز کا جادو چل رہا ہے جو ادب کے لئے نقصان دہ ہے۔

فراغ کا کہنا ہے... "یہ درست ہے کہ الکٹرونک میڈیا (electronic media) کے باعث پرنٹ میڈیا (print media) سے قارئین کی دلچسپی میں خاصی کمی آئی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قارئین کے فقدان کے باوجود عالمی طور پر ہر سال بے شمار کتابیں چھپ رہی ہیں۔ ہر ماہ کسی نہ کسی رسالے کا اجرا ہو رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر رسالے دم توڑ دیا کرتے ہیں۔ البتہ ہمارے سامنے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم قاری کہاں سے لائیں۔ تو اس مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ دوسروں کو کتابیں خرید کر پڑھنے کی تلقین کرنے سے پیشتر ہمیں خود کتابیں خرید کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہی پرنٹ میڈیا کی بقا ممکن ہے"۔

ادب کی ترقی اور فروغ کے لئے فراغ روہوی تنقید کو ضروری سمجھتے ہیں کہ تنقید سے نئی راہیں کھلتی ہیں اور کئی ایسے منظر نامے ابھر کر سامنے آتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں بشرطیکہ تنقید برائے تضحیک نہ ہو۔

Mr. Faragh Rohvi,
67, Maulana Shaukat Ali Street, Kolkata, 700 073, India

انتخابِ کلام:

بس میں کہاں تک دل ہے سائیں — یہ کہنا مشکل ہے سائیں
عمر مری گزرے گی سفر میں — تلوے میں ایک تل ہے سائیں
بے شک میری پروازوں میں — ماں کی دعا شامل ہے سائیں
ہر آہٹ پر ڈر جاتا ہوں — کون سی یہ منزل ہے سائیں
بات کروں کیا اونچے سُر میں — بندہ کس قابل ہے سائیں
شہرِ انا کا اک اک شہری — خود اپنا قاتل ہے سائیں
لوگ جہاں آسودہ بہت ہیں — ریت کا وہ ساحل ہے سائیں
وقت بہت نازک ہے، لیکن — ہر بندہ غافل ہے سائیں
کام فراغ آیا تو جانا — وہ بھی دریا دل ہے سائیں

سفر تمام ہوا ہے ہمیں کبھی تنہا
کہ مکمل ہو گئے تھے سفر کے سراب آنکھوں میں

5th of Feb 2003

فرخ عباس

لاس اینجلس، امریکہ

ہمارے لاس اینجلس، امریکہ کی سخن نواز نگہت اعجاز کے گھر پر ایک شعری محفل جمی تھی۔ سارے چنیدہ شعرا و شاعرات جمع تھے۔ نگہت اور اعجاز بھائی نے مل کر نہاری، حلیم، پلاؤ، کباب اور بہت کچھ پکا رکھا تھا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ شہر میں کوئی بیرونِ شہر سے مہمان آئے، پاکستان سے نگہت کے میکے سے امی، بھائی بھاوج آئیں یا پھر شکاگو سے اعجاز بھائی کے گھر سے امی یا کوئی اور تشریف لے آئے، نگہت اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے شعری محفل سجا لیتی ہیں۔ اور پھر اپنے خوب صورت اور دل آویز ترنم سے نعت سنا کر محفل کا آغاز کرتی ہیں۔ غالباً اسی لئے خالد خواجہ نے انہیں احتراماً اور پیار سے ''روشن چہرے والی'' کا خطاب دے رکھا ہے۔ اور اب آدھا شہر نگہت کو اسی نام سے جانتا ہے معہ اعجاز بھائی کے، جن کا گھر نگہت کی محبت اور سلیقے سے روشن ہے۔

اسی محفل میں پہلی بار میں نے ایک نوجوان شاعر کو دیکھا جس کے چہرے پر عمر سے زیادہ تجربات اور محنت کشی کے دل کش نقوش روشن تھے۔ وہ شعر سنا رہا تھا۔

ہماری خشک مزاجی پہ طعنہ زن لوگو
ہماری طرح سے شعلوں پہ چل کے دیکھو تو

یہ عمر بوجھ نہ بن جائے راستے کا کہیں
تم اپنے وقت سے آگے نکل کے دیکھو تو

تب میں نے فرخ سے پوچھا کہ وہ کب سے شعر کہہ رہے ہیں؟

فرخ نے بتایا "بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ باقاعدہ شعری سفر کا آغاز تو میں نے ۱۹۹۷ء میں اپنی انجینیئرنگ گریجویشن (Engineering Graduation) کے بعد کیا۔ دراصل پڑھائی کے دوران جگجیت سنگھ کو سنا کرتا تھا اور ساتھ ہی اپنی طرف سے ایک آدھ مصرعہ لگا کر گنگنا لیتا تھا۔ پھر ان ہی مصرعوں کو جوڑ کر شعر کہنے شروع کر دیئے۔ میرا پہلا شعر تھا

دل ہے ٹوٹا ہوا، سہما ہوا اک جزوِ بدن ہونٹ ایسے کہ تبسم سے کنارہ نہ کریں

پھر ۱۹۹۸ء میں عرفان مرتضیٰ صاحب نے انٹرنٹ (internet) پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا، جس میں پاکستان، انڈیا، سعودی عرب، انگلستان اور امریکہ کے شعرا نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں میں نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ اسی مشاعرے سے عرفان مرتضیٰ صاحب سے دوستی ہوئی۔ اور انہوں نے مجھے یہاں لاس اینجلس کی ادبی محافل سے متعارف کروایا۔ میرا کلام یہاں کے اخبارات مثلاً اردو ٹائمز، پاکستان لنک وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے لیکن ابھی کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کرایا۔ امید ہے کہ ایک دو سال میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے قارئین کی خدمت میں اپنا مجموعۂ کلام پیش کر سکوں"۔

میں نے کہا۔ "فرخ اپنے بارے میں بتاؤ، عملی زندگی کے دھارے میں تم کراچی سے امریکہ کب اور کیسے آئے؟

فرخ نے اپنی جدوجہد کی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ "میں جنوری ۱۹۷۱ء کے دن کراچی میں پیدا ہوا۔ میرا پورا نام فرخ عباس ہے۔ کراچی ہی میں ۱۹۸۷ء میں میٹرک کیا۔ ۱۹۸۹ء انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اسی سال لاس اینجلس، امریکہ آ گیا۔ یہاں مختلف جاب (jobs کام) کرتے ہوئے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۹۳ء میں فیڈرل ایوی ایشن ایڈمیسٹریشن (Federal Aviation Administration) سے ائرکرافٹ ٹیکنیشین (Aircraft Technician) لائسنس، دونوں پاور پلانٹ (Powerplant) اور ائرفریم (Airframe) کی ریٹنگ (ratings) میں حاصل کیا۔ پھر ۱۹۹۷ء میں ایروناٹیکل انجینیئرنگ (Aeronautical Engineering) کی۔ ۱۹۹۷ء میں اوی اونکس ٹیکنیشن (Avionics Technician) کا سرٹیفکیشن (certification) کیا۔ ۲۰۰۱ء میں یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسپورٹیشن (US Department of Transportation) ائرکرافٹ انسپکشن اتھارائزیشن (Aircraft Inspection Authorization) حاصل کیا۔ حال ہی میں یعنی ۲۰۰۳ء کے شروع میں ایم ایس ائروناٹکس (MS Aeronautics) مکمل کیا ہے۔ اور انشااللہ اگست ۲۰۰۳ء میں ایم بی اے (MBA) بھی مکمل کر لوں گا۔ اس کے علاوہ پرائیوٹ پائلٹ (Private Pilot) کا لائسنس حاصل کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ آج کل ۱۹۹۷ء سے ایک ہیلی کوپٹر مینوفیکچرنگ کمپنی (Helicopter Manufacturing Company) میں بحیثیت ائرورتھنس انسپکٹر (Airworthiness Inspector) فرائض انجام دے رہا ہوں۔

''شاعری کی کونسی صنف تمہیں پسند ہے اور نثری نظم وغزل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے''؟ میں نے بات آگے بڑھائی۔ فرخ نے مسکرا کر جواب دیا... ''میں نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ غزل کہنے کے بعد سکون اور راحت کا عجیب سا احساس ہوتا ہے اور مزا بھی زیادہ آتا ہے۔ نظمیں بھی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جہاں تک نثری نظموں اور نثری غزلوں کا تعلق ہے تو نثری نظموں تک تو ٹھیک ہے کہ اس سے پہلے بھی نظموں کے تجربات سے بہت خوبصورت نتائج برآمد ہوئے ہیں اور ان نتائج نے اردو کے ادبی منظر میں بہت خوب صورت رنگ بھرے ہیں۔ لیکن نثری غزل کی بات حلق سے نہیں اترتی۔ اس سے آہنگ پر ضرب پڑتی ہے۔ غزل اردو شاعری کا ایک بہت طاقتور میڈیم ہے اور اس کی قواعد وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے بھی ایک شاعر اپنے احساسات کی بہترین ترجمانی کرسکتا ہے۔ نثری غزل ایسی ہے جیسے کوئل کی کوک کے مقابلے میں مینڈک کی ٹرٹر۔ یہ مانا کہ وہی گھسی پٹی زمینوں اور ردیفوں کی لکیر پیٹتے ہوئے آپ اردو سخن کی نیّا پار نہیں لگا سکتے لیکن پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ ایک اچھا اور باہنر شاعر غزل کے پرانے کینوس پر نئے نئے بیل بوٹے بھی بنا سکتا ہے یا کسی ایک رنگ کے مضمون کو نت نئے رنگوں کے امتزاج سے مرصع بھی کرسکتا ہے۔ اور اگر آپ مطالعہ کریں تو آج کے عہد کے شعرا اپنی ان ہی کاوشوں سے ایک خوب صورت اور مرصع ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ جیسا کہ فیض احمد فیض نے کہا کہ ڈیڑھ اینٹ سے کوئی مسجد نہیں بنتی اسی طرح کسی ڈیڑھ ادیب سے کوئی تحریک بھی نہیں چلتی، جس شاعر کا کلام وہ خود یا ان کے دو چار احباب سمجھیں یا جو ادب کے عام شائقین سے خطاب کرنے کے بجائے اپنی اپنی ٹولی میں 'من ترا حاجی بگویم' کی گردان کرتے رہیں ان سے کس کو فیض پہنچ سکتا ہے۔ جنگل میں کتنے ہی مور ناچا کریں، ناچ نہ دیکھنے والوں کو اس سے کیا مطلب۔ میری رائے میں ہم کسی لے، کسی آہنگ، کسی وزن کے بغیر شاعری کیسے تخلیق کر سکتے ہیں۔ نثری غزل کے تجربات کرنے کے بجائے چاہیئے یہ کہ آپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ لیں۔ ویسے کہانی تو غزل کے ایک شعر میں بھی لکھی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو''۔ اور اس نے اپنے دو دلکش شعر سنائے۔

میں چپ رہا تو قبیلے میں ہوگیا بدنام　　　جو کچھ کہا تو سب کو ہوا میری بات کا دُکھ

جو ممکنات میں شامل نہیں تو کیا لکھتا　　　غزل میں شام وسحر و چاند رات کا دُکھ

لیکن کیا غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہترین ترجمان نہیں؟ تب فرخ نے برجستہ کہا... ''میرے خیال میں یہ بات درست ہے کہ نظم غزل کے مقابلے میں احساسات کی بہتر ترجمان ہوتی ہے۔ آپ اپنے جذبات کو لے میں ڈھال کر آسانی سے نظم کر سکتے ہیں اور اپنے قاری تک اپنے تمام احساسات بہتر طور پر پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس غزل میں تمام قواعد وضوابط مثلاً لے، آہنگ، قافیے اور ردیف کا خیال رکھنا ہوتا ہے اور اپنے جذبات کو کسی حد تک دبانا پڑتا ہے تاکہ غزل کی پوری خوب صورتی اور ردھم (rhythm) برقرار رہے۔ اور پھر غزل کے ایک شعر میں آپ کو پوری ایک بات کہنا ہے جب کہ نظم میں اس کی قید نہیں۔ لیکن غزل کی بوقلمونی پھر بھی اپنی جگہ دل نواز ہے''۔

اگلے سوال کے جواب میں فرخ کہہ رہے تھے ... ''میری رائے میں آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے۔ بلکہ اگر میں یہاں تک کہوں کہ آج کا ادیب اپنے ادبی پرکھوں کے مقابلے میں اپنے عہد کی زیادہ بہتر ترجمانی کر رہے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کراچی، کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور جہاں جہاں انسانیت پر ظلم ہو رہا ہے، آج کا ادیب اپنے قلم سے جہاد میں مصروف نظر آتا ہے۔ اور یہ قلمی جہاد تلواروں اور بموں سے زیادہ مؤثر ہے''۔

اب میرے سوال کے جواب میں فرخ اردو زبان و ادب کے مستقبل اور اردو کے رسم الخط پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے ... ''میں یقینی طور پر اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید ہوں۔ اگر آپ انٹرنٹ پر تلاش کریں تو آپ کو اردو کی بہت سے سائٹ (sites) ملیں گے۔ ان سائٹوں پر بہت سے شعرا کا کلام بھی نظر آئے گا جو دنیا کے گوشے گوشے سے اپنی کاوشوں کو ان پر پوسٹ (post چسپاں) کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اردو کا مستقبل 'آج' میں محدود رہتے ہوئے نہیں جانچ سکتے لیکن جب 'کل' کا کوئی مورخ ہمارے عہد کے بارے میں لکھے گا تو اس کو بہت سے بڑے بڑے نام نظر آئیں گے۔ یوں اردو کا قافلہ رواں دواں رہے گا انشاللہ۔ جہاں تک اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کا سوال ہے تو میں اس کے حق میں ہرگز نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے موجودہ اردو ادب کے خزانے کو اردو کے موجودہ رسم الخط میں ہی محفوظ کریں جیسا کہ ہمارے پاس گزرے ہوئے عہد کا ادبی خزانہ موجود ہے۔ اردو بہت خوب صورت اور بھرپور زبان ہے اور اس کے رسم الخط کو تبدیل کرنا تو گویا ایسا ہی ہوا کہ ہم نے اردو کی پلاسٹک سرجری کر لی۔ اس کے تحفظ کے لئے ہمیں ہر قسم کی مہم چلانی پڑے گی اور بہت سنجیدگی سے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں اور اردو ادب پر کچھ لوگوں کی اجارہ داری کو ختم کریں''۔

فرخ بتا رہے تھے کہ انہیں احمد فراز اور محسن نقوی کی شاعری متاثر کرتی ہے اور ان کو پڑھ کر ان کی طبیعت خود بخود کچھ نہ کچھ لکھنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ گزری صدی نے بہت سے قد آور شعرا کی ادبی حیثیت اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ کر دی ہے۔ اُن سب کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے۔ لیکن احمد فراز، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، میرا جی، پروین شاکر، ساحر لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی یقینی طور پر بیسویں صدی کے بڑے نام ہیں۔

فرخ کی زندگی کے اس اہم واقعے سے ایک بڑی خوب صورت کہانی ملتی ہے۔ فرخ نے بتایا ... ''زندگی بہر حال اچھے برے واقعات سے بھرپور ہوا کرتی ہے، مگر اُن میں کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ہماری زندگی کے مقصد کا تعین کرنے میں ہمارے کام آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ جو مجھے پیش آیا آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں جب میں یہاں لاس اینجلس آیا تو ایک اسٹور پر ملازمت شروع کی جو میری رہائش گاہ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ یہ بتاتا چلوں کہ لاس اینجلس ایک وسیع و عریض شہر ہے جس کے ایک حصے میں اگر دھوپ ہو تو دوسرے علاقے میں بارش بھی ہو رہی ہوتی ہے۔

میرا کام صبح چھ بجے شروع ہوا کرتا تھا جس کے لئے مجھے پہلی بس صبح تین بجے لینا پڑتی تھی۔ ایسی ہی ایک صبح میں اپنے سفر پر روانہ ہوا تو تارے آسمان پر جگمگا رہے تھے اور موسم خوش گوار تھا۔ میں حسب معمول اپنے بس اسٹاپ پر پہنچا اور بس لے کر اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے جب اپنے اسٹاپ پر اُترا تو دھواں دار بارش ہو رہی تھی اور میرے پاس چھتری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں سے اسٹور تک پہنچنے کے لئے مجھے بیس منٹ کی چہل قدمی درکار تھی۔ بھیگتے بھیگتے آگے بڑھتا رہا اور میرے واک مین (walkman) پر عابدہ پروین کی آواز میں حکیم ناصر کی وہ غزل میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی جس کا مقطع ہے۔

پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصرؔ غم کے سہنے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے

سلطانہ باجی دیکھیئے ! شاعر کے کلام، گلوکار کی آواز اور موسیقی کی لے میں کتنی بڑی طاقت چھپی ہے کہ پھر اُس دن کے بعد سے میں نے شدید محنت کی تاکہ آئندہ موسموں کی سختیاں جھیلنے کے قابل ہو جاؤں اور اللہ کا کرم ہے کہ آج اس نے مجھے بہت نوازا ہے۔ سچ ہے محنت رائیگاں نہیں جاتی''۔

Mr. Farrukh Abbas,

20405 Anza Avenue New, # 36 Torrance, CA 90503, USA

انتخابِ کلام (گرد)

گرد اُڑتی رہتی ہے/ دل کے ریگ زاروں میں،
کوئی بھی نہیں آتا/ اس طرف کو بھولے سے،
شام کی اداسی ہے/ دل کے کونے کونے میں،
موسم خزاں جیسے/ آ کے جا نہیں پایا،
دل میں اپنے ہر لمحے/ ہُو کے جیسا عالم ہے،
گرد ہے یہاں موجود/ ہر جوان خواہش پر،
وحشتوں کے سائے ہیں/ گرد کی طنابوں میں،
ہجر کے لمحوں جیسی/ ہر گھڑی پریشاں ہے،
گردشوں کا مارا دل/ گرد سے ہراساں ہے،
گرد اُڑتی رہتی ہے/ دل کے ریگ زاروں میں...

روح میں ڈھلے تو مشکبار نسیم - جسم میں پلے تو ثمر بار نسیم
حسنِ گل ہو یا کہ ہو اپنا آنگن - نسیم، نسیم ہے جانِ بہار نسیم

بروز جمعہ 8 مارچ 2003ء [illegible]
ملک فضل حسین

ملک فضل حسین

برمنگھم، برطانیہ

انہیں ہونا تو چاہیئے تھا ملک الشعرا مگر مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑھتے کڑھتے صرف "مجاہد" ہو کر رہ گئے۔ ان کے مجموعہ کلام "کلیات امجد" کی ایک نظم "اے نوجوان مجاہدو! کشمیر چلو، کشمیر چلو" پڑھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ ملک صاحب خود بھی کشمیر کے محاذ پر گئے ہوں گے اور پھر شاید حالات سازگار نہ دیکھ کر پلٹ آئے۔

اچھا نہیں ہے دہر میں ایسا کوئی نشاں ——— محکوم مسلماں ہوں، ہندو ہو حکمراں
اے وارثانِ قاسم و محمود و شہ جہاں ——— کشمیر بھی تمہارا ہے اور سارا ہندوستاں
اٹھو اور اپنی چھین لو جاگیر چلو ——— گونجے فضا میں نعرۂ تکبیر چلو کشمیر چلو

اس ولولہ انگیز نظم کو پڑھ کر ہمیں مجاہدہ فلم اسٹار شمیم آرا کا وہ نعرہ بھی یاد آ گیا جب انہوں قوم کے نوجوانوں کو یہ کہہ کر للکارا تھا کہ جو مرد مجاہد لال قلعہ پر پاکستانی جھنڈا لہرائے گا وہ اس سے شادی کریں گی۔ ویسے تو ان پر جان نثار کرنے والے بے شمار تھے مگر کمزور دل کے ہوں گے کہ لال قلعہ تک پہنچ نہ سکے اور پھر شمیم آرا کو کسی ایسے بندے کے ساتھ گھر بسانا پڑا ہو گا جس نے تاریخ پڑھ رکھی ہو گی اور وہ امن پسند بھی رہا ہو گا۔

آمدم بر سرِ مطلب، اب لال قلعہ اور ہندوستان فتح کرنے کے خواب دیکھنا چھوڑ کر ہمیں دیگر حقائق کی طرف نظر رکھنی چاہیئے تاکہ ہمارے معاشی اور سماجی مسائل حل ہوں اور ہم دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اقوام کی صف تک

پہنچنے کے لئے رینگتے ہوئے نہ چلیں۔ اور ملک صاحب کی ہی ایک اور نظم کے مطلع و مقطع سے استفادہ کریں۔

مشقِ جفا تھی، رسمِ وفا تھی دل تھا ہم نادانوں کا بھولا بسرا قصہ ہے یہ گزرے ہوئے زمانے کا

تعبیروں سے خالی سارے خواب تھے ہم انجانوں کے اُلٹے پلٹے قصے ہیں کچھ سادہ سے انسانوں کے

ملک فضل حسین ۱۵/جنوری ۱۹۳۵ء کے دن پاکستان کے ضلع چکوال کے ایک خوب صورت گاؤں ''لنگاہ'' میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش اور تربیت صالح والدین کے زیرِ سایہ ہوئی۔ والدِ بزرگوار ملک سکندر خان بڑے ہی ذہین وفطین اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ تہجد گزار بھی تھے اور یہی حال والدہ محترمہ کا تھا۔ ان کی اسی تربیت کا فیض رہا کہ بقول ملک فضل حسین... ''آج تک کوئی صبح ایسی نہیں ہوئی کہ میری آنکھ نمازِ صبح کے لئے گھڑی کے الارم (alarm) سے پہلے نہ کھلی ہو اور نمازِ فجر چھوٹ گئی ہو''۔ ان کے والد بچوں کی تعلیم پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے گھرانے میں وکیل، ڈاکٹر، انجینیئر اور پروفیسر ہوئے ہیں۔ خود ملک فضل حسین نے بھی والدِ محترم کے زیرِ سایہ بی اے ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اپنایا۔ راولپنڈی کی ضلع کچہری میں چند سال قانونی پریکٹس (practice) کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں برطانیہ تشریف لائے۔ والدین نے ان کی شادی بھی ایک سرکردہ نمبردار خاندان میں کی تھی۔ رفیقۂ حیات ان کی ہم مزاج، ہم نوالہ وہم پیالہ ہیں۔ چار بچے، دو لڑکے اور دو لڑکیاں، اپنے اپنے گھروں میں آباد وخوش حال ہیں۔

برمنگھم برطانیہ آنے کے بعد انہیں فوراً ہی ملازمت مل گئی تھی۔ دو سال بعد لارڈ چانسلر (Lord Chancellor) کے محکمے میں ایک ایگزیکٹو آفیسر (executive officer) کی ملازمت ملی اور برمنگھم کورٹس (Birmingham Courts) میں ان کی تعیناتی ہوئی۔ اٹھائیس (۲۸) سال کی ملازمت کے بعد اب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ دورانِ ملازمت لارڈ چانسلر اور دنیا کے لائق ترین جج، لارڈ ڈیننگ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ یونیورسٹی سے ایم فل (M Phil) کے دوران ''مسلم فیملی لاء ان یو کے'' پر ریسرچ کی جو بعد میں اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ ہماری نوجوان نسل کے لئے یہ ایک بڑی مفید کتاب ہے۔

ملک صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز برمنگھم، برطانیہ میں آنے کے بعد ۱۹۶۰ کی دہائی میں شروع ہوا۔ اُس زمانے میں جناب ڈاکٹر عنایت حُسین شاداں، جناب عطا جالندھری مرحوم، جناب ڈاکٹر محمد یوسف قمر، جناب لطیف کلیم، جناب صداقت حسین سوز، جناب حکیم منیر احمد قریشی کے گھر شعری محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس گروپ میں ملک صاحب زیادہ مستعد تھے۔ چنانچہ انتظامات کے سلسلے میں بہت سے کام ان کے ذمہ تھے۔ ان سب حضرات کے تعاون سے ۱۹۶۶ء میں برمنگھم کی پہلی اردو ادبی تنظیم ''رائٹرز گلڈ'' کے نام سے قائم کی گئی۔

۱۹۷۲ء میں راجہ آف محمود آباد جناب امیر محمد خان اور میاں صاحب فرنگی محلی برمنگھم تشریف لائے تھے۔ راجہ صاحب اُن دنوں پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے صدر نشین تھے۔ ان کی ایما پر برمنگھم میں''

انجمن ترقی اردو، برمنگھم" کی داغ بیل ڈالی گئی تو اُس کی مجلس عاملہ میں جناب راجہ لطیف کلیم، جناب محمد بشیر اعوان اور جناب فضل حسین بھی شامل تھے۔ ملک صاحب نے بتایا... "میں چونکہ نوجوان اور سرگرم رکن تھا لہٰذا مجھے پہلے سال اس انجمن کا صدر بنادیا گیا تھا۔ اس کے بعد مسلسل پانچ سال تک انجمن کے معتمدِ عمومی کی ذمہ داریاں میرے سپرد رہیں۔ اُس دوران انجمن کے اسٹیج سے میری نظامت میں ابوالاثر جناب حفیظ جالندھری مرحوم، جناب فیض احمد فیض مرحوم، جناب ماہر القادری مرحوم، جناب قتیل شفائی مرحوم اور جناب جمیل الدین عالی وغیرہ نے مشاعرے پڑھے۔ ابوالاثر جناب حفیظ جالندھری مرحوم کو پہلی بار میں ہی برمنگھم لایا تھا۔ اس طرح انجمن ترقی اردو برمنگھم کی شہرت برطانیہ سے نکل کر برصغیر ہند تک پہنچی تو ہمارے چند طالع آزما دوستوں نے اس پر شب خون مارا۔ جس سے دل آزردہ ہوگیا اور میں نے ۱۹۷۹ء میں 'اردو فورم (یو کے) برمنگھم' تشکیل دی اور اپنے آپ کو حفظِ ماتقدم اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ اور اسی حیثیت سے آج تک اردو زبان و ادب کی خدمت سرانجام دیتا چلا آرہا ہوں۔ اردو فورم (یو کے) برمنگھم کے زیر اہتمام باقاعدگی سے مقامی، کل برطانوی اور بین الاقوامی سطح کے مشاعرے اور ادبی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ اور گزشتہ پانچ سالوں سے یہ فورم ہر سال ایک سالانہ ایوارڈ زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں کو دیتا ہے۔ اب تک یہ ایوارڈ جناب ڈاکٹر عنایت حسین شاداں مرحوم، جناب حکیم منیر احمد قریشی (مقیم برمنگھم، برطانیہ)، جناب محمد یوسف مرزا رہبر (مقیم جدہ، سعودی عرب) جناب پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی (مقیم کراچی، پاکستان) اور جناب شریف بقا (مقیم لندن، برطانیہ) کو دیا جاچکا ہے"۔

ملک صاحب نے بتایا... "میرا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۸۱ء میں بعنوان "ابیاتِ ابجد" چھپا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہرچند کہ میں ادبی خدمات میں پیش پیش تھا، مگر اردو زبان بولنا نہیں آتی تھی اور نہ ہی کبھی پڑھی تھی۔ دسویں جماعت تک گاؤں میں زیادہ تر پنجابی پٹھواری زبان بولتا تھا۔ بعد میں جب ایڈورڈ کالج پشاور میں داخل ہوا تو وہاں کالج کے پرنسپل کینن ہاکس کی ہدایت پر انگریزی بولنا لازمی تھا۔ ایس ایم لاء کالج، کراچی میں اور بعد وکالت کے دوران بھی زیادہ تر انگریزی زبان ہی لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں استعمال ہوئی۔ لہٰذا اردو بولنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ ادھر جبڑے کی ساخت بھی پنجابی تھی۔ جب اردو بولتا تو کچھ دوست حسد اور چند احباب مذاقاً ہنسی اُڑاتے۔ لہٰذا میں نے اس روزمرہ کی خفت سے جان چھڑانے کے لئے اور ساتھ ہی اپنی جمع شدہ تک بندی کو محفوظ کرنے کی نیت سے یہ کلام چھپوادیا۔ کلام کی پزیرائی ہوئی۔ اب جو چسکا پڑا تو ۱۹۹۴ء میں دوسرا مجموعۂ کلام "کلیاتِ ابجد" کے نام سے شائع کیا۔ اس میں ہر صنفِ سخن کے اشعار شامل ہیں۔ بنیادی طور پر فطری رجحان دین کی طرف ہے۔ اس کے بعد اب غزل لکھی ہی نہیں جاتی۔ میلانِ طبع نے مکمل طور پر حمد و نعت کی جانب راغب کردیا ہے اور درسِ دین بھی یہی ہے۔ اس لئے کلیاتِ ابجد میں حمدیہ اور نعتیہ کلام زیادہ ہے۔

جہاں تک نثری تصانیف کا تعلق ہے، میں نے ایک ماہنامہ 'نظامِ اسلام' کے نام سے جاری کیا تھا مگر بسبب ذاتی وسائل کی کمی وہ مجلّہ زیادہ تک جاری نہ رکھ سکا۔ البتہ میرے مضامین کو برطانیہ کے سب ہی اخبارات نے بڑے پیار سے ہمیشہ جگہ دی ہے۔ ان کے علاوہ روزنامہ جنگ انٹرنیشنل کراچی، روزنامہ

نوائے وقت پاکستان لاہور، اور ہفت روزہ اردو نیوز جدہ میں بھی میرے مضامین اور رپورٹیں مسلسل چھپتی رہتی ہیں۔ روزنامہ جنگ لندن میں باقاعدہ پانچ سال مڈلینڈز (Midlands) کی نمائندگی کی۔ اور برطانیہ کے ایک بہت بڑے اخبار 'ایوننگ میل برمنگھم' میں پانچ سال تک ہر سنیچر (saturday) کو اردو میں میرا ایک کالم چھپتا رہا۔ برطانوی اخبارت میں یہ واحد انگریزی اخبار ہے جس نے یہ سروس اردو زبان بولنے والوں کو فراہم کی تھی اور جس کے لئے میری خدمت بکار آئی تھی (۱)"۔

ملک صاحب نے کہا..." میرے پسندیدہ شعرا میں علامہ اقبالؔ سر فہرست ہیں۔ ان کے اشعار میں جو اسلامی نوع کا پندار ملتا ہے وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔

۱۹۸۷ء میں برمنگھم سٹی کونسل نے وطن عزیز پاکستان کی چالیسویں سالگرہ کے موقعہ پر ایک فیسٹیول (festival) کا اہتمام کیا تھا، جس کے مختلف پروگرام ایک سال تک چلتے رہے۔ مجھے اس فیسٹیول کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اس فیسٹیول کے اختتام پر میں نے ایک کتابچہ تیار کیا تھا۔ اس کی اے فور (A-4) سائز میں ملٹی کلر (multi-colour) دس ہزار کاپیاں کونسل نے چھپوا کر تقسیم کی تھیں۔ یہ کتابچہ پاکستانی کلچر اینڈ ہیریٹیج (culture and heritage) پر ایک مستند دستاویز ہے جسے آئندہ کے مورخین اپنے کاموں میں بطور حوالہ استعمال کریں گے۔

۱۹۸۲ء میں برمنگھم کے مقامی اسکولوں میں مسلمان طلبا و طالبات کے مسائل کے حل کے لئے ایک چھاتہ تنظیم "مسلم لیزان کمیٹی" کے نام سے بنائی گئی تھی۔ جس میں مساجد اور دگر ستر (۷۰) مسلم تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ یہ اب برمنگھم کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور ایجوکیشن اتھاریٹی (Eduaction Authority) کی تسلیم کردہ کمیٹی ہے۔ اس کمیٹی نے ایک طویل جدوجہد کے بعد ایجوکیشن اتھاریٹی سے کچھ رہنما اصول منظور کرائے ہیں جو ایک کتابچے کی صورت میں (اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں) خود ایجوکیشن اتھاریٹی نے چھپوائے ہیں اور تمام اسکولوں کو اس پر عمل درآمد کی ہدایت کے ساتھ بھیجے ہیں۔ سال ہا سال سے اس کمیٹی کا کلیدی عہدہ، سیکرٹری شپ، میرے پاس ہے۔ اس کمیٹی نے انگریزی زبان میں چونتیس (۳۴) صفحات کا ایک کتابچہ مقامی اسکولوں میں دین اسلام کی تعلیم اور غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی غرض سے چھاپا ہے۔ اس کی تالیف و تدوین بھی میرے ہاتھوں ہی میں تھی۔

یوں تو سود و زیاں کے متعلق میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے کر گزرتا ہوں اور کرنے کے بعد پچھتانا لا حاصل سمجھتا ہوں۔ مگر کراچی کے پروفیسر ڈاکٹر ابوالفہیم خورشید خاور امروہوی نے دو مرتبہ میرے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے..'ملک فضل حسین ایک اچھا انسان ہے'۔ جناب حکیم منیر احمد قریشی، جناب شیر افضل بریکوٹی، جناب ممتاز احمد، جناب ساحر شیوی، جناب ضیا جلال پوری اور جناب

ا۔ شاید یہ دعویٰ برمنگھم اور اس کے نواح میں شائع ہونے والے روزناموں اور جرائد کی حد تک صحیح ہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں بریڈفورڈ کے ٹیلی گراف اینڈ آرگس نے جناب فیض ناصر کے اردو کالم چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن یہ سلسلہ بریڈفورڈ کے کربلستان میں اور دوسری اچھی مجاہد تحریکوں کی طرح شہید ہوگیا۔ مرتب

عبدالرب ثاقب نے اس فقیر کی شان میں منظوم قصائد کہے ہیں اور لکھا ہے... "جناب ملک فضل حُسین علم دوست، ادب پرور اور انسان صفت دوست ہیں"۔ لندن برطانیہ سے شائع ہونے والا ایک پُر وقار ماہنامہ 'پرواز' نے ماہ نومبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں میرا ایک باقاعدہ گوشہ شامل کیا ہے"۔

ملک صاحب اردو زبان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے..."میں ادبی گروہ بندیوں سے ہمیشہ دور رہا ہوں۔ میری رائے میں ادیب ایک بھی ہو تو وہ ادب کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ مخلص ادیبوں سے زبان و ادب اور معاشرے کو بجز فیض کسی اور چیز کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے ماضی کے ادیبوں میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ رشک آمیز اور مستحسن رہا ہے۔ مگر دور حاضرہ کی گروہ بندی ادبی بلندیوں سے حسد و رقابت کی وجہ سے گرتی جا رہی ہے۔ اور کچھ لوگ لندن سے لے کر جرمنی تک اور جرمنی سے لے کر برمنگھم تک گمنام خطوط کے ذریعہ دوسروں کی کردار کشی کی مذموم حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں اور ماں بہن بیٹی کی فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ایسی مغلظات بکنے والوں کو ادیب کہنا سُوءِ ادب اور ننگ انسانیت ہے۔ بعض شریف الطبع اُدبا اور شعرا نے بھی ریل گاڑی کے درجات کی طرح ادبی درجہ بندی کر رکھی ہے۔ اور دوئم سوم درجے کے لوگوں کو مزید نیچے والے درجے کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں۔ نو وارد اپنی جگہ بنانے کی کوشش میں دھکم پیل کرتے ہیں۔ حالانکہ ادب کے داعیوں کو ہر حال میں مؤدّب و مؤدِّب بنا چاہیئے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں منہمک رہنا چاہیئے تاکہ اردو کا مستقبل تابناک رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ماضی میں اردو زبان نے اپنی راہ میں متعدد رکاوٹوں کے باوجود اپنا راستہ بنایا ہے، آئندہ بھی اپنی بقا کی راہیں تلاش کرتی رہے گی۔

رہی بات اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی، تو میں اس کی حمایت نہیں کرتا۔ اردو کے کچھ بدخواہوں نے پہلے بھی یہ آواز اُٹھائی تھی۔ وہ اسے رومن رسم الخط دینا چاہتے تھے۔ اُس وقت پاکستان کے مایہ ناز قانون دان، چیف جسٹس ایم آر کیانی نے نیاز فتحپوری کے الفاظ دُہراتے ہوئے کہا تھا: 'اگر ملک آزاد ہو قوم زندہ و بیدار ہو تو پھر دوسرے بھی ان کی زبان سیکھتے ہیں اور اس کے ہجوں کے نخرے بھی اُٹھاتے ہیں'۔ جب ہندوستان سونے کی چڑیا تھا تو اس کو قابو کرنے کے لئے انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں نے اردو سیکھی اور اس کے ایک محبوبہ کے سے نخرے اُٹھائے تھے اور آج جب کہ ہم دوبارہ آزاد ہو چکے ہیں اس کے رسم الخط کو بدلنے کی بات کی جا رہی ہے۔ عربی اور فارسی کے ساتھ اس رسم الخط کا قریبی رشتہ ہے جس کی وجہ سے اس کا دین اسلام کے ساتھ بھی ایک اٹوٹ رشتہ بن گیا ہے جسے متعصب لوگ توڑنا چاہتے ہیں۔

اردو زبان دنیا کی سب سے بڑی زبان انگریزی زبان کی طرح مکمل طور پر کمپیوٹرائیزڈ (computerized) ہو چکی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یہ دنیا کی بیشتر زبانوں کو کوسوں پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان نے اسے قومی زبان کا درجہ دیا ہے۔ کل کو جب یہ ملک پوری طرح مضبوط اور توانا ہو گا تو اس کا مذہبی، سائنسی اور ٹیکنالوجی کا سارا علم اردو زبان میں رقم کیا جائے گا۔ اردو زبان کا مستقبل جتنا درخشاں ہے اس کا اندازہ ایک دیدہ ور شخص کو ہی ہو سکتا ہے"۔

"میری زندگی کا ایک واقعہ میرے لئے یادگار سا ہے"، ملک صاحب نے بتایا۔ "یہ ۱۹۹۰ء کی بات ہے جب دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کا واقعہ سامنے آیا تھا، وہ مرتد وملعون سلمان رشدی کی کتاب سیٹانک ورسز تھی۔ برملا اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے احتجاجاً لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ میں نے جمعیت نظام اسلام کے اسٹیج سے ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا تھا۔ سب سے پہلے اس منحوس کتاب کے جواب میں انگریزی زبان میں ایک چونتیس (۳۴) صفحات کا کتابچہ دس ہزار کی تعداد میں پرنٹ کر کے تمام ممبرانِ پارلیمنٹ، برطانیہ میں مقیم تمام ممالک کے سفرا، دیگر مذہبی اداروں اور تنظیموں کو پوسٹ کیا تھا۔ کتاب کو ممنوع قرار دلوانے کے لئے برمنگھم میں آسٹن یونیورسٹی کے ڈیبیٹنگ ہال میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا، جس میں یہ طے پایا کہ ایک اور بڑی کانفرنس طلب کی جائے اور اس میں مقامی زعما اور برطانیہ میں مقیم تمام مسلم ممالک کے سفارت کاروں کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ میں نے اس کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ تقریباً پانچ سو (۵۰۰) افراد کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ حفاظتی انتظامات کے لئے مقامی پولیس کی امداد کا بندوبست کیا۔ مگر اس کانفرنس میں صرف پچاس ساٹھ افراد شرکت کے لئے تشریف لائے۔ نہ کوئی سفیر آیا نہ کوئی وزیر۔ کسی نے کانفرنس ہال میں مجھے بتایا کہ اس دن برمنگھم میں ایک کبڈی کا میلہ ہے جس میں ہزاروں لوگ ڈھول ڈھمکے کے ساتھ شریک ہیں۔ لوگوں کی اس بے حسی نے میرا دل توڑ کر رکھ دیا۔ رات کو دیر تک بستر میں کروٹیں بدلتا رہا کہ اچانک آنکھ لگ گئی اور خواب میں ہمارے پیارے رسولؐ کے خلیفہ اول جناب ابوبکر صدیق تشریف لائے اور مجھے مخاطب کیا۔ "جو کچھ تم نے کیا اس سے ہم سب خوش ہیں۔ تم کیوں آزردہ ہوتے ہو۔" میں اُٹھ بیٹھا اور محسوس کیا کہ میری خواب گاہ ایک اجنبی سی خوش بو سے معطر ہے۔ میں اٹھا، وضو کی اور اللہ رب العزت کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے دو رکعت نفل پڑھے اور پھر سو گیا تو ایسی میٹھی نیند آئی کہ جب نمازِ فجر کے لئے اُٹھا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی اور قلب امن وسکون سے لبریز تھا۔

Mr. Malak Fazl Hussain,
503 Yardley Green Road, Stechford, Birmingham, B33 8TG UK

انتخابِ کلام (یادِ رفتگاں)

چمن باقی رہے گا پھر نہ کوئی آشیاں باقی
قضا کے ہاتھ میں جب تک ہے مرگِ ناگہاں باقی

گُلوں کے ساتھ گلچیں بھی فنا ہو جائے گا آخر
چمن والو! رہے گی کب ہماری داستاں باقی

فنا برحق، زمیں ہو، آسماں ہو چاند تارے ہوں
رہے گا کب نشانِ دشت و بحرِ بیکراں باقی

جہاں کی بے ثباتی کے کئی منظر ابھرتے ہیں
قضا کے بعد بھی رہتی ہے یادِ رفتگاں باقی

فنا جب ذاتِ برحق کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑے گی
کسی کی موت پر کب ہوگا کوئی نوحہ خواں باقی

جو اُس سے ماسوا ہے فضلؔ سب اک دن فنا ہوگا
ازل سے تا ابد اک مالکِ کون ومکاں باقی

درِ رُ سنے اپنے فیض کے بند کر لئے فرید
اب وہ بن کیا کرے کوئی سائل نہیں رہا

۲۴|۱۱|۰۰

غلام فرید بھٹہ

غلام فرید بھٹہ

ریاض، سعودی عرب

غلام فرید بھٹہ کی شاعری ہی دل موہ لینے والی نہیں بلکہ ان کی نثر میں بھی بابا فرید گنج شکرؒ کی سی شیرینی کے ساتھ ساتھ کھٹا میٹھا سا چٹخارا بھی ہے اور یہ اس لئے کہ ان کے نام کے ساتھ بابا فریدؒ کے نام کا ایک ٹکڑا منتھی ہے اور یہ خود کو بابا فریدؒ کا غلام کہتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو اُنہوں نے ہمارے سوال نامے کے جواب میں جو خط ہمیں لکھا ہے سوالوں کے پورے پورے جوابوں کے ساتھ، وہی ملاحظہ کریں اور آخر میں ان کی پنجابی نظم جو سیدھی سیدھی ہمارے دل میں اور پھر دل کے نہاں خانوں میں اُترتی چلی گئی اور بے ساختہ ہم نے کوشش کی کہ ہم بھی ان کی ہی بانی میں ایک شعر کہہ دیں۔ تو جو شعر کہا گیا وہ یوں ہے۔

اسیں فقیر تو ہیں بجناں پر تیرے وی در کے فقیر
تیرے در کی مٹی پا کے اسیں تو سوہنے لگدے ہیں

یہ شعر اتنا خوب صورت تو نہیں لیکن پنجابی میں کہا گیا یہ میرا پہلا شعر ہے اس لئے غلطی معافی کے قابل ہے۔

تو اب آتے ہیں بھٹہ صاحب کے اس دل موہ لینے والی تحریر کی طرف جو انہوں نے خط کی صورت میں لکھی ہے۔ ان کی نثر بھی بڑی دل آویز ہے۔ میں نے ان کا چست فقروں سے مزین انشائیہ ''بگلا کہیں کا'' پڑھا اور بے ساختہ داد دی۔ اتنی موثر نثر شاذ ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔ میں شکر گزار

ہوں کہ انہوں نے بلا تامل سوالات کے جواب بڑے سلیقے اور مدلل انداز میں دیئے۔ لکھتے ہیں:

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ،

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

لیجئے حاضر ہوں اپنے تعارف اور آپ کے سوالوں کے جوابات کے ساتھ۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ شکریہ ادا کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ کلمات کچھ اس قدر پامال ہو گئے ہیں کہ بعض اوقات تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے خاص جذبات و احساسات کو مختلف نام دے دیئے ہیں، حالانکہ اگر انہیں کوئی نام نہ بھی دیا جائے تو ان کی ضوفشانیوں میں فرق نہیں آتا۔ انہیں الفاظ و آواز کے جاموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی ہم تکلفاً یہ الفاظ دُہراتے چلے آرہے ہیں اور دُہراتے رہیں گے نہ جانے کب تک۔ میں بھی مجبوراً یہ رسم ادا کر رہا ہوں حالانکہ نہ آپ کو سننے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے کہنے کی۔

میں اردو ادب کے لئے آپ کی گراں مایہ خدمات کا معترف ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ کی شخصیت ہم جیسے طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہے، ایک ایسے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی طرح جہاں سے پیاسے اپنی پیاس بجھا سکیں، ایک ایسے چھتنار درخت کی طرح جس کے گھنے سائے میں تھکن سے چور اور گرد راہ سے اٹے مسافر چند ساعتوں کے لئے اپنی تھکن اتار لیں اور تازہ دم ہو کر اپنی منزل کا تعین کر سکیں۔ اردو ادب اور ہم جیسے رہ نوردانِ شوق پر یقیناً آپ کے بہت احسانات ہیں۔ میں آپ کی عظمتوں کو سلام کرنا اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

آپ نے مجھ ناچیز کو یاد کیا یہ آپ کی بڑائی ہے۔ آپ کا گراں قدر تحفہ میرے لئے باعثِ فخر و انبساط ہے۔ اس کے لئے "شکریہ" یقیناً بہت چھوٹا لفظ ہے، لیکن اس کا متبادل کوئی نہیں اور پھر رسم نبھانا بھی ضروری ٹھہرا۔ میں عقیدت واحترام کے تمام تر جذبات واحساسات کے ساتھ یہ رسم پوری کر رہا ہوں۔

میرا پیدائشی نام غلام فرید ہے۔ بھٹہ فیملی سے تعلق ہے۔ ادبی حلقوں نے غلام حذف کر دیا۔ لکھتے وقت ہم بھٹہ حذف کر دیتے ہیں۔ باقی جو کچھ بچتا ہے وہی تخلص ہے۔

دریائے ستلج کے کنارے آباد قصبہ نما شہر "پاک پتن"، جو ایک بزرگ بابا فرید گنج شکرؒ کے حوالے سے مشہور ہے، ہماری جائے پیدائش ہے۔ سال ۱۹۴۷ء تھا اور جولائی کی ۱۴/ تاریخ، چودھویں کا چاند بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن تھا اور اپنی نورانی کرنوں سے زمین کو منور کر رہا تھا کہ ہم نے اس عالم رنگ وبو میں آنکھ کھولی۔ کافی برسوں تک اکلوتے رہے اس لئے ماں باپ کا سارا پیار اور تمام غصہ ہمارے لئے ہی تھا بعد میں غصہ ہمارے لئے رہ گیا اور پیار تقسیم ہوتا چلا گیا۔

گورنمنٹ پرائمری اسکول پاک پتن سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پتن سے مڈل کیا اور پھر دریائے ستلج کے کنارے آباد ایک دوسرے چھوٹے شہر "بورے والا" ہجرت کر گئے، جہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران ہم پرواز کے قابل بھی ہو چکے تھے۔ لہٰذا پہلے تجرباتی اُڑانیں بھرتے رہے پھر لمبی اُڑانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا بسلسلۂ روزگار کبھی ادھر تو کبھی اُدھر۔ اسی

دوران الیکٹرک میں ڈپلوما حاصل کیا۔ پشاور تا کراچی زقند بھرتے بھرتے آج کے بنگلہ دیش اور تب کے مشرقی پاکستان جا پہنچے۔ وہاں کی خوب صورتی اور غربت کے نقوش ذہن و دل پر آج بھی تازہ ہیں۔ بہت اچھے لوگ تھے، ہم سے ہی کچھ بھول ہوئی۔

پھر تلاش معاش میں یہاں ریاض پہنچے۔ یہ حادثہ ۱۹۷۷ء میں ہوا اور اب تک ریاض، سعودی عرب میں ہی مقیم ہوں۔

ادبی زندگی کا آغاز اگر سوچا جائے تو زمانہ طالب علمی سے ہی ہو گیا تھا۔ شعر و شاعری پڑھنے کا شوق تھا۔ خصوصاً علامہ اقبالؒ کے بہت سے اشعار ہمیں زبانی یاد تھے۔ بانگِ درا، ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز اور نثر میں نسیم حجازی کے ناول داستان مجاہد اور تلوار ٹوٹ گئی غرضیکہ تمام کتابیں پڑھیں اور اپنے جیب خرچ سے خریدیں لیکن انہیں بزرگوں کی دستبرد سے نہ بچا سکے۔ مجھے شروع سے ہی نثر لکھنے کا شوق تھا۔ احباب کو طویل خطوط لکھے جاتے تھے۔ افسوس جنہیں لکھے جاتے رہے انہوں نے سنبھال کر نہیں رکھے ورنہ ہمارے خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہو سکتا تھا۔ شاید ان کو یہ امید ہی نہ رہی ہو کہ ہم بھی کبھی ادیب یا شاعر بن سکیں گے۔ اس لئے بھی انہوں نے سنبھالنا ضروری نہ سمجھا ہو۔ اور پھر ہمیں مناسب ماحول بھی نہ مل سکا اس لئے بھی ہمارا ادبی قد نہ بڑھا۔ گھریلو ماحول میں فنونِ لطیفہ کا بالکل کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ سوائے درسی کتب کے باقی ہر چیز کو لغویات تصور کیا جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کون ماں باپ اپنی اولاد کو لغویات کی طرف مائل ہوتا دیکھ سکتے ہیں اور پھر ایک قصبہ نما شہر میں باہر کا ماحول بھی خزاں رسیدہ تھا، چند ایک کے علاوہ تمام اساتذہ بھی کولھو کے بیل کی طرح کے تھے اور وہ بھی مرکھنا بیل۔ یہ تھے وہ عوامل جنہوں نے ہمارے شوق کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اس بے رحم ماحول میں ہمارا شوق مر تو نہ سکا بس طویل عرصے کے لئے پژمردہ ہو گیا۔ اور پھر یہ دورانیہ غم روزگار نے اور بھی طویل کر دیا۔ ہماری آنکھوں پر "کھوپے" چڑھا کر ہمیں اُسی دائرے میں گھومنے پر مجبور کر دیا گیا[1]۔

یہاں کچھ ادبی ماحول میسر آیا تو ہمارے شوق نے بھی انگڑائی لی اور آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے شروع ہوئے۔ گو ابھی صدمے کا اثر باقی ہے، حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے۔ ابھی ایک حکیم حاذق کے زیر علاج ہیں جو ہمارے حواس کی بحالی کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ہماری سوانح ہے۔ جو ابھی جاری و ساری ہے۔

اپنے اشعار ہمیں کبھی زبانی یاد نہیں رہتے۔ کسی اچھے شاعر کا اچھا شعر جو ہمیں بہت پسند ہو یاد رہ جاتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہمیں خود بھی اپنی شاعری پسند نہیں جو یاد نہیں رہتی۔

یوں تو ہم نے یہاں سے کئی رسائل کے لئے رپورٹنگ کی ہے جس میں "یارانِ وطن" سرفہرست ہے لیکن ہمارا کلام زیادہ تر ماہانہ "لہراں (پنجابی)، لاہور" اور کچھ "جینیئس، کراچی" میں چھپتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنا کلام کسی کو ارسال نہیں کیا تو شائع کیسے ہوتا۔ مشاعروں کے

۱۔ غلام فرید صاحب میری رائے مانیں تو آپ نثر میں طبع آزمائی کریں۔ اس میدان میں آپ کی نثری تحریروں کی بڑی ضرورت ہے۔ سلطانہ مہر

حوالے سے جو رپورٹیں ہوتی ہیں ان میں ہمارے اکادکا اشعار البتہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارا نہیں رپورٹنگ کرنے والوں کا قصور ہے۔

پنجابی زمانے سے سیکھی جب کہ اردو اپنے محترم استاد مولانا جان محمد صاحب سے، جنہوں نے بڑی شفقت اور شوق سے ہمیں یہ تعلیم دی۔ یہ انہی کی محبتوں کا فیضان ہے۔

اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھائی اور پڑھائی ہوتی ہے اور دونوں زبانیں بولی بھی جاتی ہیں۔ غزل، نظم اور توفیقِ ایزدی ہو تو نعت بھی کہہ لیتے ہیں۔ شاعری زیادہ تر پنجابی میں اور نثر زیادہ تر اردو میں لکھتے ہیں۔ خاکے، انشایئے ہمیں پسند ہیں۔ ایک آدھ افسانہ بھی لکھا لیکن گھبرا کے چھوڑ دیا کہ از اول تا آخر من گھڑت باتیں لکھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ مجموعے اور لوگوں کے شائع ہوتے دیکھے بھی اور پڑھے بھی ہیں، احباب نے تحفتاً بھی دیئے اور یہی ہماری کل کائنات بھی ہے۔ پھر ابھی تو ہم طفلِ مکتب ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی دو وجوہات اور ہیں۔ اول تو ہم نے ادبی قافلے میں شامل ہونے میں کافی دیر کردی۔ دوئم، ہم بسیار نویس نہیں۔ ہمارے لکھنے کی رفتار خاصی غیر تسلی بخش ہے۔ اس لئے مجموعے کی تکمیل ممکن نہ ہوسکی۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں پُر امید ہونا اگر کہا جائے تو اس میں شک کی آمیزش محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ فروغِ اردو کے لئے اجتماعی اور انفرادی حیثیتوں میں بہت سے لوگ یہ کام لگن اور شوق سے کررہے ہیں۔ بہت اچھا لکھنے والے آگے آرہے ہیں۔ نئی جہتوں کی طرف سفر جاری ہے۔ گو رفتار کچھ سست ہے مگر مناسب ہے۔ مسلسل خوب صورت تحریروں کا اضافہ اردو کے حسن کو نکھار رہا ہے۔

اردو وسیع زبان ہے۔ اس میں جذب کرنے کی قوت بہت زیادہ ہے۔ اس کے لہجے کی مٹھاس اور اس کا بانکپن اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ اس کی زرخیزی اور شادابی کا مقابلہ ممکن ہی نہیں۔ جس طرح مختلف انواع کے پھلوں کو پیوندکاری سے زیادہ لذیذ اور زیادہ خوش نما بنایا جاتا ہے اسی طرح دیگر زبانوں کے الفاظ کی پیوندکاری اردو کے حسن کو ماند نہیں کرتی بلکہ اور نکھارتی ہے اور اسی لئے اس کے دامن میں الفاظ کا وسیع ذخیرہ ہے۔ دوسری زبانوں کے کھردرے الفاظ بھی اردو کے لہجے میں ڈھل کر مترنم ہوجاتے ہیں۔ اردو ادب کے خزانے تراجم سے بھرے پڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی دوسری زبانوں کا ادب اردو میں ترجمہ ہوا اس کی ضخامت کم ہوگئی اور اس کا حسن بھی دوبالا ہوگیا جب کہ اردو کی چھوٹی سی کتاب بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوکر ضخیم ہوجاتی ہے۔ اس کی شیرینی، لچک اور بانکپن کے نہ صرف اپنے ہی شیدا ہیں بلکہ یہ بے گانوں کو بھی اسیر کرلیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں ایسے درخشندہ نام بھی ہیں جو اس کے سحر میں گرفتار ہوئے تو اسی کے ہوکر رہ گئے حالانکہ اردو ان کے لئے کبھی اجنبی زبان تھی۔ اردو زندہ رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے اور اس میں زندگی کی حرارت اتنی شدید ہے کہ دوسری کئی زبانیں اس سے بھیک مانگتی نظر آتی ہیں۔ اس کی جڑیں معاشرے میں اور افراد کے ذہنوں میں اس قدر گہری ہیں کہ اس کی نمو کو روکنا بمصداق "ایں خیال است و محال است و جنوں" ہے، جیسے کھجور کا درخت، جس کی جڑیں زمین کی تہوں سے اپنے لئے خوراک تلاش کرلیتی ہیں اور مدتوں دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود لق و دق صحرا میں بھی سرسبز و شاداب سربلند نہ صرف اپنی

بہاریں دکھلاتا ہے بلکہ چار سمت پھیلی ہوئی اس کی جڑیں آنے والے زمانوں کے لئے تناور درختوں کو مسلسل جنم دیتی رہتی ہیں۔

اردو کی ترویج و ترقی کے لئے میرا مشورہ صرف یہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے جب کہ فی الوقت حوصلہ شکنی کی روش ہے۔ اپنی محنت، لگن، شوق اور قوت بازو سے کوئی سربلند ہو جائے تو ہو جائے کسی طرف سے کوئی مدد اور توجہ نہیں ملتی (یہ میں عام روش کی بات کر رہا ہوں)۔ اسے میرا مشاہدہ کہا جا سکتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ اس سے ذرا مختلف ہے کہ تلاش بسیار کے بعد ہی سہی مجھے توجہ بھی ملی اور مدد بھی۔ کچھ مخلص لوگ ہیں جو چراغ سے چراغ جلانے کی رسم نباہ رہے ہیں۔ یہ اُجالا انہی کے دم قدم سے ہے۔ میں آج جو بھی ہوں وہ میرے محترم استاد پروفیسر اقبال اعجاز بیگ کا فیضان ہے۔ اور ہر دور میں ایسی شفیق اور مخلص ہستیاں موجود رہی ہیں جنہوں نے بڑی توجہ اور لگن سے ننھے پودوں کی آبیاری کو عبادت کا درجہ دیا۔ کچھ نام نہاد اور خود ساختہ ادیب، ادب پرور، ادب شناس اور ادب نواز بے ادب لوگ ادبی صفوں میں در آئے ہیں جن کا حقیقتاً ادب سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ نام و نمود کی تمنا اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سب کچھ کرتے ہیں جو یقیناً تباہ کن روش ہے۔ ایسے لوگوں کا اخراج وقت کی ضرورت بھی ہے اور اردو ادب کی ترویج و ترقی کے لئے انتہائی ضروری بھی۔ یہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ روش قطعاً قابل قبول نہیں کیونکہ اردو کسی جاگیردار کی جاگیر یا سرمایہ دار کی فیکٹری کا نام نہیں۔

آج کے اردو ادب کی جڑیں اس کی زمین میں بہت مضبوطی سے پیوست ہیں۔ آج کا ادیب کنویں کا مینڈک نہیں۔ مشاہدے اور مطالعے کے وافر مواقع میسر ہیں۔ بے شمار وسائل موجود ہیں۔ اس لئے آج کا ادیب زندگی کو بہت قریب سے دیکھتا ہے اور حقیقت کے قریب لکھتا ہے۔ الف لیلوی ادب کا دور ختم ہو چکا۔ رنگ آمیزی ضروری حد تک باقی ہے۔ دورِ حاضر کا ادیب اپنے عہد کے مسائل سے آگاہ ہے اور اس کے تقاضوں کو سمجھتا ہے۔ اب ادیب کوئی الگ تھلگ کوئی عجوبہ یا مافوق الفطرت چیز نہیں بلکہ معاشرے کا حصہ ہے۔ عام لوگوں کا ترجمان ہے۔

جو ادب حقیقت کے جس قدر قریب ہوگا وہ اسی قدر پُر اثر ہوگا۔ جس قدر پُر اثر ہوگا اسی قدر اُس کی جڑیں گہری اور پھیلی ہوئی ہوں گی اور یہی زندگی کی ضمانت ہے۔ یقیناً آج ہمارا ادب ہمارے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔

دیگر اصناف سخن کی طرح نثری نظم بھی ایک صنف ہے جو خاصی شاداب ہے اور اس میں بارآوری کے تمام آثار موجود ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ ایک دفعہ پھر ہمیں کھجور یاد آ رہی ہے (یہ شاید سرزمین سعودی عرب کا اعجاز ہے) لیکن اس دفعہ تناور درخت کی نہیں بلکہ ننھے پودے کی مثال کہ جو انتہائی سست روی سے پروان چڑھتا ہے۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی نمو رک چکی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ ننھا پودا بلندیوں کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ صنف بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ ابھی تک اس پر جمود طاری نہیں ہوا۔ آزاد نظم پر بہت عرصے سے کام ہو رہا ہے۔ اب تو نہ صرف نئے لکھنے والوں کا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اساتذہ بھی اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور یہی اس کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

حالانکہ ہم نے ابھی تک اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ زمانہ طالب علمی ہے۔ ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے، جب بھی کچھ لکھا آپ کو ضرور بھیج دیں گے۔

ہمارا یہ شوق بھی ہماری زندگی کا اہم واقعہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو زندگی اہم اور دلچسپ و عجیب واقعات وحوادث کے مجموعے کا نام ہی تو ہے۔ کیا کیا لکھیں۔ کبھی کبھی یہی واقعات صفحۂ قرطاس کی زینت بن جاتے ہیں۔ قلم کی بے ساختگی، سنجیدگی، شگفتگی، چبھن، مٹھاس، کرواہٹ یہ سب انہی واقعات کا پَرتو ہی تو ہیں۔ آپ کا خیر اندیش، غلام فرید بھٹہ

غلام فرید بھٹہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی خوب صورت نظم ملاحظہ ہو:

تیرے قدموں کی.. آہٹ
اور میرے دل کی... دھڑکن
دونوں ہم آہنگ ہیں
اتنے سارے/ پیار کے رنگ ہیں اس جیون میں
اور جیون کیا ہے
صبح وشام/ تیرے ہی قدموں کی آہٹ سُننے کا نام

Mr. G. Fareed Bhutta.
C/O, Hoshan Co. Ltd., P O Box 59270, Riyadh. 11525 (KSA)

انتخابِ کلام

تیرے مکھ تے نچدے بجناں ہاسے سوہنے لگدے نیں
تو ہسیں تے ساہنوں سارے پاسے سوہنے لگدے نیں
نکھر جاندے رنگ پھلاں دے اک واری جے ویکھیں
ترے نال تے تردے کو جھے خاصے سوہنے لگدے نیں
اسیں کوئی فقیر وی نیں جے در در منگدے پھریئے
بس تیرے در تے آکے ہتھ وچ کاسے سوہنے لگدے نیں
طمع، تکبر، جھوٹ، کرودھ، فریب بھری اس دنیا وچ
ساڈے ورگے لوگ فریدا پاسے سوہنے لگدے نیں

باسمہ تعالیٰ
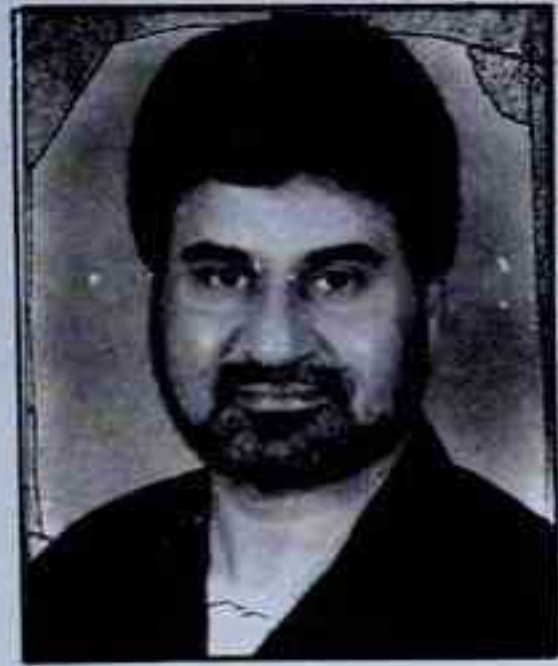
سید قمر حیدر قمرؔ

جدّہ، سعودی عرب

قمر حیدر کی شخصیت بڑی تیکھی اور دلچسپ ہے۔ ''سخنور پنجم'' کے لئے ہم نے گفتگو شروع کی تو قمرؔ نے ہنستے ہوئے کہا ... ''آپ نے ابھی پوچھا تھا کہ کوئی یادگار واقعہ سناؤں تو میں شاعری کے حوالے سے دو بڑے مزے کے واقعات سناتا ہوں''۔

میں نے کہا... ''بسم اللہ، شروع ہو جاؤ''۔

قمر بولے ... ''یہ کوئی لطیفہ نہیں۔ میں آپ کو ایک سچا واقعہ سنا رہا ہوں۔ ایک مشاعرے میں ایک صاحب نے اپنا کلام سناتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا

اے کہ تیرے چَپوں (۱) سے دلبری نمایاں ہے

تو سامعین میں سے ایک صاحب، جو استاد شاعر تھے اور غالباً پڑھنے والے کے بھی استاد رہے ہوں گے اور شاید انہوں نے ہی شاگرد کو غزل لکھ کر دی ہوگی، مصرعہ کو دھیمی آواز میں درست کرتے ہوئے کہنے لگے... ہاں! صاحب زادے یوں پڑھو

اے کہ تیرے چِتون (۲) سے دلبری نمایاں ہے

---

(۱) چ پ و ن (۲) چ ت و ن

پر شاگرد نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر اپنے مصرعہ کو پہلی والی صورت میں پڑھا۔ اے کہ تیرے چتوں سے دلبری نمایاں ہے،۔ اس پر استاد نے دوبارہ ذرا تیز انداز میں مصرعہ یوں دُہرایا۔ اے کہ تیرے چتون سے دلبری نمایاں ہے۔ تو اب شاگرد سے نہ رہا گیا اور وہ اُن صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ...حضرت ! ہوتو 'چتون' بھی سکتا ہے مگر یہاں 'چتوں' ہی مزہ دے رہا ہے[(۱)]"۔

دوسرا واقعہ ہمارے ایک بہت عزیز اور سینئر (senior) دوست نے سُنایا۔ کسی کے گھر میں شعری نشست منعقد ہوئی تھی۔ صاحب خانہ خود بھی بہت نفیس شاعر تھے۔ کچھ شعرا کو پڑھوانے کے بعد جب صاحبِ خانہ کو دعوتِ کلام دی گئی تو اُنہوں نے پڑھنے سے معذرت چاہی۔ ناظم نے دوبارہ اصرار کیا۔ اُنہوں نے پھر معذرت کی۔ اب کے ناظمِ محفل کے ساتھ ساتھ کچھ اور احباب نے بھی اصرار اور فرمائش کی... حضور آپ کے کلام کے بغیر کیسے ممکن ہے کہ مشاعرے کو آگے بڑھایا جائے'۔ تو پھر اُنہوں نے معذرت کی اور کہا...'معاف کیجیے گا حضرات۔ میں اپنا کلام ضرور سناتا لیکن کیا کروں مجبوری ہے'۔ لوگوں نے پوچھا...'حضور مجبوری کیا ہے جو آپ اپنے کلام سے محروم رکھ رہے ہیں' ؟ تو اس پر بڑا معصوم سا اور معذرت خواہانہ سا چہرہ بنا کر فرمانے لگے...'میں دراصل اس وقت حالتِ شعر میں نہیں ہوں'''۔

ان واقعات کو سن کر ہمارے لئے ہنسی کو روکنا محال تھا۔ جب خوب ہنس چکے تو پھر قمر کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا پیدائشی نام اور ادبی نام سید قمر حیدر اور تخلص قمر ہے۔ ۱۸/مئی ۱۹۵۰ء کو خیر پور میرس، سندھ، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اردو لٹریچر میں کیا اور ڈی آئی بی پی (بنکنگ) میں۔ ۱۹۷۳ء سے بنکنگ سے وابستہ ہیں۔ کراچی میں نو (۹) برس الائیڈ بنک سے تعلق رہا۔ پھر ۱۹۸۲ء سے ریاض، سعودی عرب آ کر سعودی ہولنڈی بنک میں خدمات انجام دیں اور اب کوئی چھ (۶) برس سے بنک الجزیرہ جدہ سے وابستہ ہیں۔

قمر کہہ رہے تھے ..."میرے مہربان خدا نے مجھے ایک علمی و ادبی گھرانے میں اُتارا۔ میرے دادا حضرت سید محمد جعفری مرحوم بھی اپنے وقت کے جید عالم اور شاعر و ادیب تھے۔ یہی صفات میرے والدِ گرامی حضرت نثار بیانوی میں آئیں۔ وہ علم عروض میں ماہرِ فن اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اُنہوں نے ہر صنفِ سخن میں لکھا۔ اُن کا انتقال حیدر آباد، سندھ میں فروری ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ وہ حیدر آباد، سندھ کے علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ابھی دسمبر ۱۹۹۹ء میں، میں نے اُن کی منتخب غزلوں اور نظموں پر مشتمل مجموعہ سخن 'دل کی رعنائی بھی دیکھ' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

میں خود ۱۹۶۶ء سے باقاعدہ لکھ رہا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں 'روزنامہ جنگ، حریت، مشرق، جسارت وغیرہ میں باقاعدہ طور پر میری تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ میں نے ابتدا میں کچھ عرصے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ میں نے سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد سے ایم اے کیا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک

(۱) اگر 'چتون' [چ ت ون] کو خط شکستہ میں لکھا جائے تو احتمال ہے کہ اسے 'چپ ون' [چ پ ون] پڑھ لیا جائے۔ لہٰذا اساتذہ سے التماس ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کو خوش خط لکھ کر غزلیں مرحمت کیا کریں۔ قمر حیدر قمر

ریڈیو پاکستان، حیدرآباد میں بھی خاصا فعال رہا، جس میں مختلف پروگراموں میں غزلیں، نظمیں، نعتیں، قومی نغمے اور کچھ نثری چیزیں بھی نشر ہوتی رہیں۔ بچوں کے پروگرام 'پھلواری' کے لئے میرا لکھا ہوا فیچر 'موسموں کا مشاعرہ' خاصا مقبول ہوا تھا اور جسے عوامی فرمائش پر کئی بار نشر کیا گیا۔ حیدرآباد میں اُس وقت میرے ہمعصروں میں سید کاظم رضا، احمد ضیا، صابر وسیم اور خلش مظفر شامل تھے۔

کراچی میں نو (۹) برس قیام کے دوران شدید دفتری ذمہ داریوں کے سبب میں ادبی پلیٹ فارم پر بالکل فعال نہ رہ سکا۔ گو کہ لکھتا رہا اور کبھی کبھی کہیں چھپ بھی جاتا تھا۔ روزنامہ جنگ، آہنگ، اخبار جہاں وغیرہ میں کچھ بھیج دیا کرتا تھا جو شائع ہو جاتا تھا۔ مگر وا قعتاً ۱۹۸۲ء میں ریاض، سعودی عرب آکر کچھ اطمینان حاصل کرنے کے بعد ۱۹۸۴ء سے دوبارہ ادبی منظر پر طلوع ہوا، خوب لکھا۔ مثنوی اور مرثیے کے علاوہ تقریباً ہر صنفِ سخن میں لکھا۔ اگست ۱۹۹۱ء میں، میں نے نظم میں ایک فارمیٹ (format) کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس نئے فارمیٹ کو 'پنج مصرعی' کا نام دیا ہے۔ یہ فارمیٹ 'خمس' سے مختلف چیز ہے۔ یہ نظم کل پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ ہی اختتامی مصرعے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور پوری نظم کو کن کلوڈ (conclude غرض مطلب، حاصلِ انجام یا تمیم) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پہلے مصرعے کا پہلا لفظ قافیئے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ نظم کے دوسرے اور چوتھے مصرعے کو ہم وزن اور ہم قافیہ و ردیف رکھا جاتا ہے۔ تیسرا مصرعہ آزاد ہوتا ہے یعنی قافیے اور ردیف کا پابند نہیں ہوتا۔

جہاں تک مصرعوں کے اوزان کا تعلق ہے، یہ بڑا اچھا تُلا عنصر ہے جو نظم کی خوب صورتی اور ردہم (rhythm ترنم و لحن) میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ اوزان کی شکل یہ ہوتی ہے۔

پہلا مصرعہ...... فعول فعلن

دوسرا مصرعہ...... فعول فعلن فعول فعلن

تیسرا مصرعہ...... فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن

چوتھا مصرعہ..... فعول فعلن فعول فعلن

پانچواں مصرعہ..... فعول فعلن

اب مثال میں میری نظمیں دیکھیے

سحاب آئے
جھلستی دھرتی کے خواب آئے
جو دشت موسم کے گھاؤ کھاتے رہے ہمیشہ
وہیں خنک انقلاب آئے
سحاب آئے

ایک اور 'پنج مصرعی' ملاحظہ کیجیے

ستارہ چمکا
نجات کا استعارہ چمکا

جہاں کراں تا کراں سمندر کی مملکت تھی
وہیں کہیں اک کنارہ چمکا
ستارہ چمکا

شاعری کے علاوہ قمر کے نثری کام میں دوسرے شعرا کے کلام پر ریویو (review تبصرہ)، تجزیاتی مطالعے اور تنقید شامل ہے۔ نثر میں ان کا پسندیدہ موضوع "لفظیات" ہے۔ گزشتہ برسوں میں انہوں نے "اردو شاعری میں تلفظِ الفاظ" کے عنوان سے ایک طویل تحقیقی مضمون لکھنا شروع کیا جس کی دو قسطیں نقوش نقوی صاحب کے ماہنامہ "سخنور" میں شائع ہو چکی ہیں۔

قمر حیدر قمر غالب کو اپنا ذہنی استاد مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی فکر حضرت میر انیس کے طرزِ سخن کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ قمر کا کہنا ہے... "میرے دستاویزی نوعیت کے کاموں میں مشرقِ وسطیٰ کے منظر پر میری اپنے تین اور دوستوں کے ساتھ مرتب کردہ کتاب 'مشرقِ وسطیٰ میں اردو' ہے جسے ۱۹۹۳ء میں جاوداں پبلی کیشنز، کراچی نے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب خلیجی ریاستوں سے متعلق ایک سو دس (۱۱۰) شعرا و اُدبا کی منتخب تخلیقات، مختصر تعارف اور تصاویر پر مشتمل ہے اور چار سو تہتر (۴۷۳) صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ میں اپنی نوعیت کی پہلی باقاعدہ تعارفی دستاویزی کتاب ہے۔

ستمبر ۱۹۹۹ء میں میرا پہلا مجموعۂ سخن 'چراغ سا آدمی' شائع ہوا ہے۔ اس کا سرورق کراچی کے معروف شاعر و خطاط احمد نوید نے بنایا۔ اس میں سترہ (۱۷) سال کی منتخب تخلیقات شامل ہیں۔ شعر و سخن سے متعلق نقد و نظر پر مشتمل کتابیں میری دلچسپی کا مرکز بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں نثر میں طنز و مزاح بھی میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں سے ماورا، ان دنوں میرے مطالعے میں امیر المومنین باب العلم حضرت علیؑ کے خطبات واحکام، مکتوبات، رسائل اور پند و نصائح پر مشتمل حضرت علامہ شریف رضیؒ کی شہرہ آفاق تالیف 'نہج البلاغہ' ہے۔ جو علوم و معارف کا خزانہ اور فصاحت و بلاغت کا بحرِ بیکراں ہے"۔

قمر اپنے بڑوں اور بزرگوں کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا... "اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ٹنڈو محمد خان کے فوجی شوگر مل (sugar mill) میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کراچی اور سندھ کے نواحی علاقوں سے اردو شعرا کی ایک بڑی تعداد نے حصہ لیا۔ کراچی سے جناب قمر بدایونی نے شرکت کی اور اُن ہی نے مشاعرے کی صدارت کی۔ میں حیدرآباد، سندھ کے طلبا کی نمائندگی کرتے ہوئے شریک مشاعرہ تھا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ انیس کے اردگرد تھی۔ میں نے غزل پڑھی قسمت نے یاوری کی اور خدائے کریم کے کرم سے غزل کا ہر شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ صاحب صدر جناب قمر بدایونی صاحب میرے پاس سرک آئے اور انہوں نے اپنا دستِ شفقت میرے شانوں پر رکھ دیا۔ اور جب غزل ختم کرکے میں اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف جانے لگا تو قمر بدایونی صاحب نے مجھے درمیان میں روک کر فرمایا.. 'صاحبزادے! آپ کے لئے ایک مشورہ ہے، اگر مان گئے تو فائدے میں رہیں گے'۔ میں نے عرض کیا... 'حضور! ارشاد فرمائیے'۔ کہنے لگے... 'آپ مشاعروں میں آکر اپنا کلام نہ پڑھا کریں،

مبادا نظر لگ جائے۔ ہاں اپنا کلام رسالوں میں چھپوالیا کیجیے جس سے ابلاغ بڑھتا ہے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا اور شکریہ ادا کرتا ہوا اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ واپس حیدرآباد آ کر یہ واقعہ والد صاحب کو سنایا۔ انہوں نے اس کی تائید کی اور پھر میں نے عرصۂ دراز تک مشاعروں میں اپنا کلام پیش نہیں کیا۔ مگر اس سے یہ ضرور ہوا کہ ان دنوں میں بہت شائع ہوا"۔

اردو زبان کے مستقبل کی بات چلی تو قمر نے کہا... "اردو دنیا کی یقیناً تیسری بڑی اور اہم زبان ہے اور میں اس کے مستقبل سے پورے طور پر پُر امید اور مطمئن ہوں۔ عہد بہ عہد اس کے بولنے والوں، سمجھنے والوں اور اس سے حظ اُٹھانے والوں، اس زبان میں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اردو کے مراکز کا عالمی بنیادوں اور سطحوں پر تبدیل ہو جانا اس دعویٰ کا بین ثبوت ہے۔ اردو میں علمی و ادبی کتابوں کی سال بہ سال بڑھتی ہوئی اشاعت اس دعویٰ کا دوسرا ثبوت ہے"۔

شاعری میں غزل اور نظم قمر کے پسندیدہ پیرایۂ اظہار ہیں۔ اور جب بات حضرت رسولؐ اور ان کے آل کی مدح کی آئے تو نعت و سلام میں اپنی عقیدتیں اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ نثری غزل' نثری نظم کے ہی نوزائیدہ بچے کا نام ہے اور اپنی 'ماں' کی طرح ہی غیر معتبر ہے۔ 'عہد بے ہنراں' میں ایسے ہی ہنر سامنے آتے ہیں۔ ادب میں بات صرف 'فارم' (form) یا 'فارمیٹ' (format) تک محدود نہیں ہے۔ جس دن اس فارم میں بھی کوئی عظیم تخلیق معرضِ تحریر میں آ گئی، یہ صنف بھی اعتبار حاصل کر لے گی۔ لیکن یہ الگ بات ہے کہ ۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔

"بلاشبہ کتابیں ہمیں خرید کر پڑھنا چاہئیں" قمر نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ "الیکٹرونک میڈیا (electronic media) کی وجہ سے کتابوں کے مطالعے میں کمی آئی ہے، اشاعت میں نہیں۔ کتابیں شائع تو برابر ہو رہی ہیں لیکن بک نہیں رہی ہیں۔ بعض کتابوں کی مارکٹنگ (marketing) کا گراف (graph) نیچے ہی کی طرف جاتا نظر آتا ہے، جو ازحد تشویش ناک صورت حال ہے۔ یقیناً پرنٹ میڈیا (print media) زیادہ اہم اور دیرپا ہے۔ اور اس میڈیا کی بقا کے لئے بہت سے اقدامات کیئے جا سکتے ہیں۔ اگر کتابوں اور جرائد کی قیمت کو خریدار کے لئے پُرکشش بنایا جائے تو اس سے بھی پھیلاؤ میں مدد مل سکتی ہے۔ کتابوں کے موضوعات کا تنوع اور فی زمانہ رواں مسائل و معاملات پر کتابوں کی اشاعت زیادہ سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ خالص ادب کو پڑھنے والے تو اکثر مل جاتے ہیں مگر خالص ادب کو خرید کر پڑھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ مفت کی عادت اب مفت بَری تک بڑھ گئی ہے۔ ذاتی و شخصی بنیادوں سے آگے حکومتی اور اداراتی بنیادوں پر بھی کتابوں کی پزیرائی و سرپرستی ہونی چاہیئے جو نہیں ہو رہی ہے"۔

تنقید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے... "دورِ حاضر میں تنقید کا برائے نام رہ جانا ہی 'عہد بے ہنراں' کا انعام ہے۔ بڑے بڑے ادیب اب فرمائشی تنقید، جو تحسین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، لکھ رہے ہیں۔ تنقید کے لئے جس 'نظر' اور جس 'خبر' کی ضرورت پڑتی ہے وہ کمیاب ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ سہل پسند ہو گئے ہیں۔ زندگی کی سختی نے فارغ البالی اور ذہنی سکون ناپید کر دیا ہے۔ زمانے کے ساتھ ذہن بھی تیز رفتار

اور مضطرب ہو گئے ہیں یہ صبر و تحمل، توقف، تفکر اور تدبر میں واضح کمی آ گئی ہے۔ تنقید لکھنے کے لئے ہمہ جہت مطالعے، بصیرت، تحقیق، تحمل، تخلیقیت اور جداگانہ طرز بیان کی ضرورت پڑتی ہے جوان دنوں نایاب ہے۔ تاہم جہاں اور جس شخص میں بھی یہ عوامل موجود ہیں وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے اور اسی کام کا معتبر ٹھہرتا ہے"۔

اب ان کی ایک نظم بعنوان 'جدہ۔۔ایک عظیم اور بے مثل شہر' پیش ہے۔

ٹریفک چل رہا ہے
چلتا آیا ہے
یونہی چلتا رہے گا
یہ سڑکیں ایسے ہی پُر شور تھیں
پُر شور ہیں
اور رات دن
ایسے ہی پُر شور و پُر رونق رہیں گی

یہ شہر زندہ روز و شب
یونہی زندہ رہے گا
کوئی اس کی دمادم زندگی
اور جاں فزا تابندگی کو
ماند کر سکتا نہیں
کہ یہ وہ شہر ہے جو زندگی اور روشنی کو
خلق کرنے والے
اِک باقی و لافانی خدا کے
مہمانوں کی پزیرائی کی خاطر
جاگتا ہے!!

Mr. Syed Qamar Haider Qamar,
P.O Box 6277, Jeddah, 21442, Saudi Arabia

انتخابِ کلام

کل اس کی گفتگو میں سلیقہ لگا مجھے — وہ شخص پہلی بار توانا لگا مجھے
اس شکل کے سراب بھی ہوتے ہیں دوستو — یوں بھی ہوا کہ بحر بھی صحرا لگا مجھے
وہ سامنے کھڑا تھا مکمل حجاب میں — خوشبوئے پیرہن سے شناسا لگا مجھے
شاید طلسمِ بزم بھی شامل کشش میں تھا — محفل میں وہ حسین زیادہ لگا مجھے
طرزِ نظر میں ہوتے ہیں منظر کے خال و خد — کل تو مرا حریف بھی اچھا لگا مجھے
چہرے پہ میرے اب بھی بشاشت کے رنگ ہیں — ایک زخم اور اے غمِ دنیا لگا مجھے
پربت سے کم نہیں تھا قمر فکر و فن میں جو
برتا تو کچھ نہ پوچھ کہ کیسا لگا مجھے

+++

اِلقاء خود سے نہ دیکھو مجھے
کھلا پڑا ہے جانے کا مجھ میں

کیفی
بنجارا
۲۹-۶-۲۰۰۳
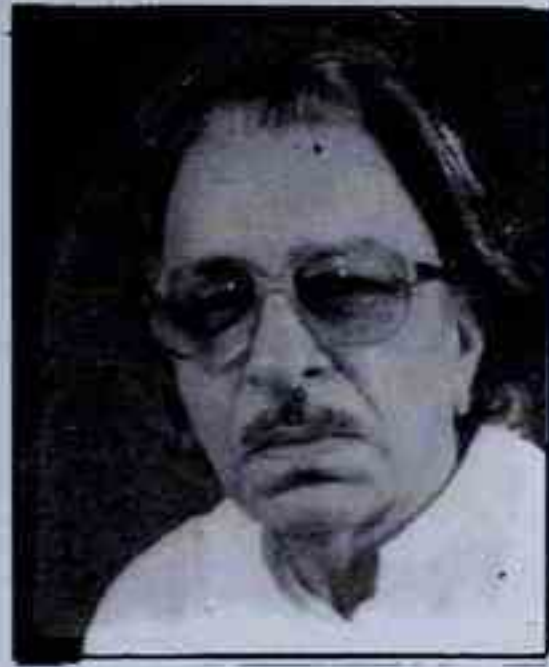
سعید قیس

بحرین، عربین گلف

''سعید قیس صاحب....''

''جی!'' وہ مدھم لہجے میں بولے۔

''میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا''۔

''ہاں۔ آپ کا خط ملا تھا۔ بہت اچھا لگا۔ روشنی ہمیشہ اچھی ہوتی ہے''۔

''قیس صاحب۔ میں نے ایک سوال نامہ بھی بھیجا تھا''۔

''ہوں'' وہ مسکرائے۔ ''آپ نے اس دور افتادہ کو ابھی فراموش نہیں کیا۔ 'سخنور پنجم' پر کام کر رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ ابھی تھکی نہیں۔ میں تو بالکل تھس ہو کر رہ گیا ہوں۔ عمر نے بڑے راستے روک دیئے ہیں اور لوگ منافقت کی مسافتیں طے کرتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے نکل گئے ہیں۔ ایک دو چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں سُنیں گی''؟

''ضرور سنوں گی''۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔

لاحاصل

اک گندم کا دانہ ...ایک شجر بن جائے
کچھ بھی ہاتھ نہ آئے

ایک سوال

سوچ رہے ہو، کیا سوچا ہے؟
اپنی عمر کے کتنے سال گنوا بیٹھے ہو!
چین سے جینا کب سیکھو گے!

مشورہ

اک دن تم ایسا ہی کرنا
اپنے دکھ کے سارے کنکر
میری آنکھوں میں بھر دینا
پھر میری بینائی واپس آجائے گی

''قیس صاحب۔ آپ نے کچھ قطعات بھی کہے ہیں۔ سنائیں گے''؟
''چلئے قطعات بھی سن لیجیے۔ ان میں زندگی کے اہم واقعات چھپے ہیں۔ آپ نے زندگی کا کوئی یادگار واقعہ پوچھا ہے۔ یہاں کئی ہیں۔ سنیئے''۔

پستیوں میں اتر بھی سکتا ہے — اپنی حد سے گزر بھی سکتا ہے
ہم متاعِ عزیز بھی تو نہیں — وہ ہمیں خرچ کر بھی سکتا ہے

٭

اک مُسلّم وجود ہے اپنا — ہم کسی شے میں ضم نہیں ہوتے
ٹوٹنے کے لئے بنے ہیں قیس — ہم فقیروں میں خم نہیں ہوتے

٭

بہت کچھ جاننے کو رہ گیا تھا — بہت کچھ سوچنے کو رہ گیا تھا
نہ جانے کیا سے کیا ہو جائیں گے ہم — یہی دن دیکھنے کو رہ گیا تھا

٭

کس کو دستِ رسا نہیں ملتا — آرزو ہو تو کیا نہیں ملتا
روشنی کو سنبھال کر رکھیئے — ہر کسی کو دیا نہیں ملتا

شاعر ہر کیفیت سے گزرتا ہے۔ اُن کیفیات سے بھی جو عام آدمی پر گزریں تو اُسے احساس بھی نہ ہو۔ مگر سعید قیس وہ شاعر ہیں کہ احساس کی اوجلا کر کہتے ہیں۔

لکھنے والے جو بھی لکھنا نام ہوا کے لکھنا — یہی باتیں اپنی ذات سے باہر آ کر لکھنا

بحرین میں ایک طویل عرصے میرا ان کا ساتھ رہا۔ میری کتاب ''سخنورِ اول'' کی تعارفی تقریب کے لئے سعید قیس اور خالد بٹ مرحوم نے بڑی محنت کی۔ مجتبیٰ صاحب کے گھر لوگ جمع ہوئے اور بحرین کے استاد الشعراء ابراہیم العریض کی صدارت میں ایک خوب صورت محفل سجی تھی۔

سعید قیس کی شخصیت محبت کے خمیر سے گندھ کر سچ کے پانی میں نتھر کر نکھری ہے۔ وہ دوستوں کے لئے ہمیشہ چپ چاپ کام کئے گئے۔ انہیں شکوے شکایتیں اور موہ مایا کے دام سے دور اپنے حالات میں مگن دیکھا۔ جو گزری اسے شعر میں ڈھال دیا۔

قیس جن کو کھا گیا قد کا ملال　　ان درختوں پر ثمر کیا دیکھتے

سعید قیس کی شاعری روایاتی اسلوب کی پابند نہیں رہی۔ ان کی شاعری ان کے جذبوں کی شکل اختیار کر کے جدید لہجے اور جدید طرز احساس سے مربوط ہو کر جداگانہ راہ اختیار کرتی ہے۔

میں بھی بنجر دھرتی ہوں، پر پیاسا رہتا ہوں　　وہ بھی پتھر ہے پر اس میں جھرنے کتنے ہیں

اور

پتھر سارے شہر پہ برسے تھے لیکن　　کانچ کے برتن صرف ہمارے ٹوٹے ہیں

اور احساس تنہائی اور رشتوں کی بے ثباتی کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے۔

پھر میرے تعاقب میں، اک اداس سا چہرہ
زخم زخم یادوں کے جبر کی ردا اوڑھے
ہجر کی تمازت میں، وصل کی مسافت میں
بے ثمر محبت کی بے نشان گلیوں میں
ننگے پاؤں پھرتا ہے

ان کا ایک شعر مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ یہ ان کی ابتدائی غزلوں میں سے ایک غزل کا ہے۔

ایک جیسے اُجاڑ ہیں دونوں　　دل کو دیکھوں کہ اپنا گھر دیکھوں

لیکن مجلسوں اور محفلوں میں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں۔ "سخنور" کے لئے میں نے ان سے تعارف مانگا تو جواب میں انہوں نے لکھا کہ ان کا نام سعید احمد ہے۔ والد محترم کا نام حاجی معراج الدین کاشمیری ہے۔ قیس صاحب نے ۵ / مئی ۱۹۲۷ء کو موچی دروازہ، لاہور، پاکستان کی سرزمین پر جنم لیا۔ تعلیم انٹر تک حاصل کی۔ شعر گوئی کا آغاز طالب علمی کے دور سے ہو گیا تھا۔ باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوا۔ اٹھارہ (۱۸) سال تک آرامکو، سعودی عرب میں ملازمت کی۔ بارہ سال تک بحرین کی ورک شاپ اینڈ کمپنی میں ملازمت کی اور اب ریٹائرڈ (retired) ہیں۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور ابھی تک اپنی شاعری سے مطمئن نہیں۔ انہیں دکھ ہے کہ اچھا شعر کہنا انہیں اب تک نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ شعر کہنے کی تحریک کسی اچھے شعر سے ملتی ہے۔ ویسے شاعری کو الہام بھی کہا جاتا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ الہامی کیفیت ان پر ہفتوں بلکہ مہینوں طاری رہتی ہے۔ اس کے باوجود وہ زود گو شاعر نہیں نہ بسیار گو ہیں۔ نہ کسی مکتبہ فکر سے وابستہ ہیں۔ ہاں عصر حاضر کے کچھ شعراء سے متاثر ضرور ہیں۔ ان میں محترم احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، منیر نیازی اور قتیل شفائی کے نام شامل ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے طرز سخن پر کسی اور کے رنگ کو حاوی نہیں ہونے دیا۔

سعید قیس کے خیال میں نظریاتی شاعری کرنا خود کو پابہ زنجیر کر لینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ سوچ کو آزاد رکھ کر شعر کہنے کے حامی ہیں۔ ان کا کلام پاکستان کے جرائد تخلیق، معاصر، فنون اور خیال و فن میں شائع ہوتا رہا ہے۔ موڈی آدمی ہیں۔ کبھی موج میں آئے تو ان ادبی جرائد میں کلام بھجوایا ورنہ مدتوں خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۱۹۸۰ء میں "ہجر کے موسم" اور ۱۹۹۵ء میں "دیوار و در" اور تیسرا شعری مجموعہ "محبت روشنی ہے" ۱۹۹۱ء میں اور چوتھا مجموعہ "عکس پڑتا ہے چاند کا" زیر طبع ہے۔

کسی بھی تخلیق فن کے لئے ابلاغ کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے آسان زبان و اسلوب کو پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تنقیدی محفلیں شاعر و ادیب کے لئے نئی راہوں کے تعین میں رہنما ثابت ہوتی ہیں ورنہ رہنمائی کے بغیر تمام عمر شاعر تک بندی کرے گا یا ہوا میں شاعری کرے گا۔

سعید قیس آج کے تخلیقی ادب سے مایوس نہیں۔ کہتے ہیں... "آج کے ادب میں زندگی سے بھرپور شاعری کی جا رہی ہے اور اس کی پزیرائی بھی ہو رہی ہے۔ ادبی جرائد اور رسائل جو معیاری ادب پیش کر رہے ہیں وہ قابل داد ہیں۔ اس ضمن میں "فنون، لاہور"، "معیار، کراچی" اور "تخلیق، لاہور" کے علاوہ اور بھی کئی جرائد ایسے ہیں جو قابل تعریف کام انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے مستقبل سے سعید قیس قطعی مایوس نہیں۔ کہتے ہیں..." اردو زبان تو آج برصغیر کی سرحدوں کو پار کر کے مشرق وسطی، یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی ہے اور اب وہاں بھی معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ شاندار مشاعرے (چاہے وہ کمرشل ہوں لیکن ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا)، ادبی محفلیں اور موسیقی کی تقریبات یہ سب اردو شاعری اور ادب کو حیات جاوداں عطا کرتی ہیں۔ زندگی سے بھرپور شاعری جتنی اس دور میں ہو رہی ہے وہ اتنی توانا پہلے کبھی نہ تھی۔ ماضی میں شاعری گل و بلبل، شمع پروانہ یا رقیب روسیاہ کے دائرے سے باہر نہیں آ سکی تھی۔ آج کے لکھنے والے ہی دراصل وہ شاعری کر رہے ہیں جس کی جڑیں دور تک ہماری زمین میں پیوست ہیں"۔

سعید قیس نے ہائیکو بھی کہے ہیں اور بڑے لطیف انداز میں بات کہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

لوگ افسانے ہیں
دور سے بجنے والے سب
ڈھول سہانے ہیں

☆☆☆

قرضہ مانگا ہے
ہم نے آج سمندر سے
قطرہ مانگا ہے

☆☆☆

لگ جا سینے سے
دشمن اچھا ہوتا ہے
یار کمینے سے

☆☆☆

کب پڑتا ہے ماند
خاک تو اڑتی رہتی ہے
پھر وہ چاند کا چاند

☆☆☆

تڑکے تڑکے جا
اس مالن سے تھوڑی سی
سندرتا لے آ

آئیے اب ان سے ایک مناجات سنتے ہیں۔

دل کہاں تک دہائی دے
میرے مولا! مجھے سنائی دے

میں بھی اک روز لہلہا اٹھوں
میری دیوار کو بھی کائی دے

ہو سکے تو کبھی ان آنکھوں سے — کسی حیرت کو بھی زبانی دے
حسن کو دولتِ کرم سے نواز — عشق کو دردِ آشنائی دے
حرف مجھ پر اتارنے والے — میرے حرفوں کو روشنائی دے
میری آنکھیں بھی خوب صورت ہیں — مجھ کو بھی ایک دن دکھائی دے
میں ترا قرض ہوں، اتار مجھے — میرے حصے کی پائی پائی دے
ہر منافق سے میں جہاد کروں — طاقت زور آزمائی دے
قیس کو بھی پناہِ خاص میں رکھ — اس کو بھی عزمِ کربلائی دے

یہ مناجات کہنے والے قیس کی زندگی کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ وہ کہہ رہے تھے ... "گھر میں ایک دن فاقہ تھا۔ ماں نے ہم بچوں سے چوری چوری تانبے کا پتیلا بیچ کر ہم تین بہن بھائیوں کے کھانے کا انتظام کیا۔ مجھے اس بات کا پتا چل گیا اور میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر سے بھاگ نکلا۔ اور پھر ...ماں نے کبھی فاقہ نہیں دیکھا"۔

Mr. Saeed Qais,
P O Box No. 26917, Bahrain, Arabian Gulf

انتخابِ کلام

خیال و خواب کی دنیا کہاں ہے — تری آنکھیں ترا چہرا کہاں ہے
ہم اپنے شوق میں ڈوبے ہوئے ہیں — ہمارے شہر میں دریا کہاں ہے
تو ساری جستجو ہی رائگاں تھی! — وہ اک لمحہ رفاقت کا کہاں ہے
ہر ایک تارے سے جا کر پوچھتا ہوں — یہ سورج رات کو جاتا کہاں ہے
یہ کیسا شور ہے دیوار و در پر — ہمارے گھر میں وہ رہتا کہاں ہے
ابھی رسوائیاں تو اور ہوں گی — ابھی ہم نے اسے سوچا کہاں ہے
اگر ہم ریت کی دیوار تھے تو — ہمارے جسم کا ملبہ کہاں ہے
طلب کے راستے پر آ گیا ہوں — بتاؤ اب مجھے جانا کہاں ہے
محلے دار سب آرام سے ہیں — مرے ہمسائے کا کتا کہاں ہے
یہ ہم جو قیس ہیں بس نام کے ہیں
ہمارے سر میں وہ سودا کہاں ہے
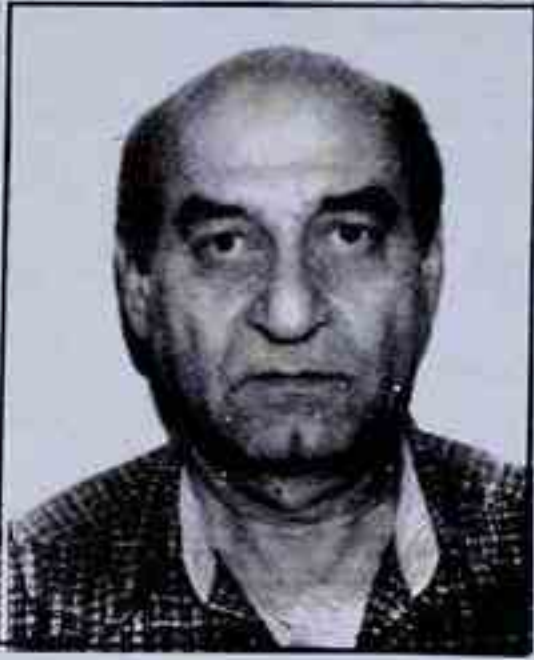
چرا لئے ہیں کرامت جو اُن کی آنکھوں نے
ہمیں عزیز تھے اپنے وہ رتجگے کتنے

کرامت گردیزی

کرامت گردیزی

ڈیلاس، ٹیکساس، امریکہ

لکھ جاؤں گا ایک ایسا مقالہ غمِ دل پر
صدیوں جو محبت کے نصابوں میں رہے گا

کرامت کے اس شعر سے ابتدا کرتے ہوئے ہمارے ایک نامور اور معتبر شاعر جناب عاصی کرنالی لکھتے ہیں ... '' دیکھا جائے تو کرامت گردیزی کی شاعری شروع سے آخر تک غمِ دل کی ترجمانی ہے۔ انہوں نے اپنے شعری مجموعے میں غمِ دل کو موضوع بنا کر ایک منظوم مقالہ لکھا ہے۔ غمِ دل کو موضوع بنا لینا اصل میں سوچ کے ایک منفرد رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس رویے کو اختیار کرتے ہوئے شاعر اس بات کا اعلان کر دیتا ہے کہ خوشیاں، مسرتیں، شادمانیاں کائناتِ انسانی میں موجود نہیں ہیں یا لمحۂ موجود میں ان کا کھوج نہیں ملتا یا ہجوم غم کی ظلمتوں میں وہ بجھائی نہیں دیتیں۔ اسے ذہن کی قنوطیت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ شاعر اگر اپنی ذات کو نفی میں گم کر دے تو پھر اس کی خلاقانہ ذہانت کا کوئی فائدہ نہیں جب کہ تخلیق کا اضطراب جمود کی کوکھ سے انقلاب کو وجود بخشتا ہے۔ ظلمت سے روشنی، شب سے سحر، حبس سے ہوائے تازہ، یاس سے امید اور غم سے مسرت کو تخلیق کرتا ہے اور اس طرح ذات اور کائنات کو 'عالم خوف' میں یقین و امید کو آئندہ بشارتوں کے اجالے تقسیم کرتا ہے اور آخر کار وہ شبستان جبر و نفرت سے ایک ایسی

سحر گاہ محبت کی تشکیل کرتا ہے۔ جس میں دکھی انسانیت کے دلوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے چہروں پر راحت، آسودگی، امن و محبت کی کرنیں جگمگانے لگتی ہیں''۔

محترم عاصی کرنالی کے اس اظہارِ خیال کا آئینہ کرامت گردیزی کے یہ اشعار ہیں:

اک ماں کے خوابِ رنگ کی تعبیر بن کے میں
خوش بو کی شاخ پر ہوں گلِ تر کھلا ہوا

جوہر شناس آنکھوں نے رسوا کیا مجھے
قیدِ صدف میں مثلِ دُرِ بے بہا تھا میں
ہاتھوں پہ لے کے جلتا ہوا ظرفِ آفتاب
زینہ بہ زینہ گنبدِ شب تک گیا تھا میں

مرے لہو کی تمازت کی خیر مانگ اے حُسن
چراغ تیری محفل میں جلا دیے کتنے
سنگارِ صبح کی آمد تھی یا کہ ماتمِ شب
شعاع کے لواول پہ جلتے رہے دیے کتنے

کرامت گردیزی کو سہلِ ممتنع میں غزل کہنے کا کمال بھی حاصل ہے۔ انہوں نے ایک عمر اس دشت کی سیاحی میں گزاری ہے تب اس ہنر کو قابو کیا ہے۔ مختصر بحر میں ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو پھر ان سے گفتگو کرتے ہیں۔

حاصل سفر
گرد رہ گزر
جی سکے تو جی
مر سکے تو مر
میں ہوں گم کہاں
کچھ میری خبر
رتجگے خرید
خواب بیچ کر
کام ہیں طویل
عمر مختصر

کشتیِ ہوا
سطحِ آب پر
گرمیِ حیات
رقصِ یک شرر
کب سے ہے محیط
شام بے سحر
نقش ناتمام
وہ بھی خاک پر
سیر گاہ دل
دشت پُرخطر

سو گئے چراغ
جاگ اٹھی سحر
آدمی کو ہے
آدمی کا ڈر
کیا ترا فسوں
کیا تری نظر
کیا کروں فضا
بال ہیں نہ پر
ہیں کرامت آپ
روشنی کا ڈر

سید کرامت حسین گردیزی نے ولیوں کی سرزمین، ملتان، پاکستان کی خاک سے ۱۲/ جون ۱۹۴۴ء کو جنم لیا۔ ایمرسن کالج، لاہور سے گریجویشن کیا اور جب شاعری شروع کی تو اپنے نام کے ایک حصے "کرامت" کو تخلص کے طور پر اپنایا۔ اب تک کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پہلا "مدار" ۱۹۸۶ء میں، دوسرا "آگہی کے شجر" ۱۹۹۱ء میں اور تیسرا "حصار گل" ۱۹۹۷ء میں۔

نثری نظم کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا... "دو طرح کی نظمیں سامنے آرہی ہیں، "آزاد" اور "نثری"۔ آزاد نظم میں کم از کم ترنم موجود ہے لیکن نثری نظم تو ترنم سے محروم نظر آتی ہے یا یوں کہیئے کہ موسیقی اسے اپنے احاطۂ فکر میں نہیں لا سکی۔ ہر قسم کی حدود و قیود سے مبرا ہے۔ علم عروض کسی صورت سے اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لہٰذا فیصلہ عوام پر چھوڑا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے غزل، نظم، منقبت، سلام، قطعات اور رباعی میں فکر پرونے کی کوشش کی ہے"۔

کرامت کہتے ہیں..."اردو زبان کی ترویج سے پُر امید تو نہیں ہوں لیکن اردو ادب سے توقعات ضرور ہیں جو شاید آنے والی نسلوں تک اردو کی ثقافتی میراث پہنچا سکے۔ باقی رہی ادبِ قدیم اور ادبِ جدید کی بات، دیکھنا یہ ہے کہ ادبِ قدیم کسے کہا جاتا ہے۔ کیا ادبِ قدیم اردو زبان میں تخلیق نہیں ہوا یا اس زمانے میں تشبیہات و استعارے وہ نہیں تھے جو آج کے دور میں موجود ہیں۔ بس فرق اتنا سا ہے کہ عروض کی حدود اور قیود سے باہر نکلنے کی سعی ہو رہی ہے۔ دنیا بھی وہی ہے لوگ بھی وہی، آسمان و زمین، دشت و جبل، آبِ رواں، رستے، سمندر، بحران، سائے، دھوپ، سورج، چاند، ستارے، آوازیں، عکس اور آئینے، حجاب و حیا سب کچھ تو وہی ہے نیا کیا ہے۔ پھر بھی اگر نئے معنی تلاش کر کے آگے بڑھنا ہے تو روایت اور قدامت کو ضرب یوں پہنچائی جائے"۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا... "علامہ اقبال کی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" بڑی معروف ہیں۔ بلا اشکال دونوں نظموں کا جواب نہیں۔ غالب کا ایک شعر اسی ضمن میں پیش کر رہا ہوں۔

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

میں نے صرف مثال دی ہے اس سے کوئی اور مطلب نہ لیا جائے"۔

ان کے پسندیدہ شعراء انیس، غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض ہیں۔

سید کرامت گردیزی نے اپنی زندگی کا ایک یادگار مگر بڑا ہی عجیب و عبرتناک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے..."ایک شخص جمیل نامی روزنامہ "امروز" ملتان میں ادبی حصے کا انچارج تھا۔ ایک شام میرے گھر آیا اور اخبار کے لئے غزلیں مانگیں۔ میں نے دو غزلیں، جو کچھ دن پہلے مشاعرے میں پڑھی تھیں، ان کو دیدیں۔ تقریباً تین دن بعد میرے پاس اقبال ارشد کا، جو خود بھی ادیب اور خوب صورت شاعر ہیں، فون آیا۔ کہنے لگے...'بھائی کرامت! تمہاری غزلیں اخبار میں چھپی ہوئی ہیں اور وہ بھی جمیل کے نام سے، سالے نے تصویر بھی اپنی لگا رکھی ہے'۔ یہ سن کر میں نے بھی اخبار منگوایا اور دیکھا کہ واقعی ایسا ہی تھا۔ حیران رہ گیا۔ شہر بھر کے ادیبوں نے ریزیڈنٹ ایڈیٹر سید سلطان احمد سے شکایت کی۔ وہ

غزلیں دوبارہ شائع ہوئیں اور جمیل نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ بے چارے نے شہر بھی چھوڑ دیا''۔

Mr. Karamat Gardezi,

230 S, MacArthur Blvd., # 411, Coppell, TX 75019, USA

انتخابِ کلام

زندگی جب تک ہے تم پر مہرباں لکھتے رہو
سانس کوئی بھی نہ جائے رائیگاں لکھتے رہو
حُسن خود بیں بے تماشائی تو اَے عشقِ تمام
اپنی پلکوں پر لہو سے کربِ جاں لکھتے رہو
پڑھ ہی لے گی ایک دن دنیا کی دھندلائی نظر
تم کسی عنواں محبت کی زباں لکھتے رہو
منصفی ہو یا نہ ہو پھر بھی سوادِ شہر پے
اپنے خونِ گرم سے حق داستاں لکھتے رہو
بجلیوں کا زور جب تک ہے سرِ دوشِ ہوا
جلتی بجھتی ٹہنیوں پر آشیاں لکھتے رہو
دھوپ کے لانبے سفر میں ہوش بس اتنا رہے
زلف کی خوش بو کو اپنا سائباں لکھتے رہو
اب پرانے ہو چکے ہیں آفتاب و ماہتاب
ان سے آگے جو حقیقت ہو عیاں لکھتے رہو
مصلحت کا یہ تقاضا ہے تو پھر یونہی سہی
رہزنوں کو تم بھی رہنما پاسباں لکھتے رہو
آج تو شاید نہیں لیکن کرامت ایک دن
شعر ہو جائے گا کوئی جاوداں لکھتے رہو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نغمانہ کنول

اولڈہم، برطانیہ

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آدم سوئے تو ان کی پسلی سے حوا اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد آدم کو کبھی چین کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ اور یہ بھی کہ اماں حوا کا دیا ہوا سیب تو کھایا باوا جان نے لیکن دانت ابھی تک ان کی اولاد یعنی ابنِ آدم کے دکھتے ہیں۔ مگر بنتِ حوا کی شاعری تو کچھ اور ہی کہتی نظر آتی ہے۔ آیئے شاعری کے آیئنے میں کچھ عکس دیکھتے ہیں۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں۔

رات یہ میں نے خواب میں دیکھا تم تنہا ہو
سارا دن میں بھیڑ میں تھی اور رہی اکیلی

اور یہ عابدہ کرامت ہیں۔

ہم فریب کھاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں
بھولنا ہی پڑتا ہے حیثیت ہی ایسی ہے

نوشی گیلانی نے کہا۔

ایسا دریا جو کسی اور سمندر میں گرے
اس سے بہتر ہے مرا صحرا لادے

اور یہ پروین شاکر کی چھوٹی سی نظم ہے "استادھیان میں رکھنا"

اُجلے آج کی سچائی کو... میلی کل کی دھندلاہٹ میں
کیا اوروں کی صورت تم بھی پرکھوگے!
خیر تمہاری مرضی
لیکن اتنا دھیان میں رکھنا
سورج پر بھی رات کی ہم آغوشی کا الزام رہا ہے

یہ سب معتبر شاعرات ہیں اور اپنی حیثیت منوا چکی ہیں۔ ان ہی میں ایک نام نغمانہ کنول کا بھی ہے۔ نغمانہ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

لے لو ہم سے مانگ کر مہر و وفا کی روشنی
زیست کے گہرے اندھیرے راس آئیں گے نہیں

یہ ایک باوفا ہم سفر ہی اپنے شریک سفر سے کہہ سکتی ہے۔ اور یہ ہی ایک شعر نہیں، نغمانہ کنول کے شعری مجموعے "لذت آشنائی" میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں دکھوں سے آشنائی پا کر وہ حوصلہ نہیں ہارتیں اور ایک نئی امنگ سے جدو جہد کی شمع روشن کی ہے۔ اس مجموعے میں ان کی ایک نظم "میرے اداس ساجن" نہ صرف ان کی پوری زندگی کی بلکہ ان کی فکر کی اور ان کے ادبی جہت کی عکاسی ہے۔ نغمانہ نے کئی ہجرتیں دیکھی ہیں۔ پاکستان سے وہ بحرین جا بسی تھیں اور پھر بحرین سے ایک اور پردیس، برطانیہ کو اپنا دیس بنا لیا۔ اپنی جڑیں دساور میں گاڑیں اور چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں بھی اپنا ایک مقام بنایا۔ میری نظر میں ان کی یہ ایک ہی نظم ان کے پورے کلام کے زروجواہر میں کندن کی طرح نغمانہ کی شاعری کی پہچان کراتی ہے۔

میں نے نغمانہ سے پوچھا.. تمہارا یہ خوب صورت نام کس نے رکھا؟ نغمانہ نے کہا... "یہ نام میری ماں نے رکھا تھا۔ میں نے اس میں سے کنول تخلص چن لیا۔ میری جائے پیدائش پنجاب کا شہر گجرات ہے جب کہ میری پرورش سیالکوٹ اور لاہور میں ہوئی۔ میں نے بی اے تک تعلیم بھی پاکستان میں ہی حاصل کی۔ پھر شادی کے بعد دس (۱۰) سال بحرین میں گزارے۔ وہیں اللہ تعالیٰ نے تین (۳) بچوں سے نوازا۔ بحرین میں "بزم اردو" کی ابتدا کرنے والوں میں میرا نام سرفہرست رہا۔ اس کے بعد برطانیہ میں آکر 'اے۔لیول' کیا اور چھوٹے چھوٹے کئی کورس بھی کیئے۔ یہاں تک کہ بے شمار کورس کرنے کے باعث ایک بہت مشہور تعلیمی ادارے نے رول ماڈل (role model مثالی کردار) کے طور پر مجھے چنا اور میرے ہاتھ سے اپنے پانچ سالہ جشن پر کیک بھی کٹوایا۔ میں نے اس تقریب کی ترجمانی (انٹر پریٹنگ interpreting) بھی کی۔ اس موقعہ پر میری لی گئی فلم یہاں کے بڑے بڑے شاپنگ سنٹر 'اسپنڈل' (shopping centre "Spinlde") میں چھتیس (۳۶) انچ اسکرین پر سات (۷) دن تک بطور محرک (انس پریشن inspiration) دکھائی گئی۔ ۱۹۹۸ء سے

ریڈیو کے مذہبی پروگراموں سے بھی منسلک ہوں۔ اولڈہم میں مشعل ریڈیو ۲۰۰۱ء میں شروع ہوا تو وہاں پر بھی پیش کنندہ (پریزنٹر Presenter) کی خدمات انجام دینا شروع کیں اور ومزلو (Wilmslow) ریڈیو پر بھی بطور پیش کنندہ خدمات انجام دی ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سال سے کونسلر کی حیثیت سے خواتین گروپ کی معاونت کے لئے حکومت کے ایک ادارے اوسی ای ڈی اے (OCEDA) نے مجھے چیر پرسن (chair person) چن رکھا ہے۔ ان کے لئے ریسرچ (research تحقیق)، انٹرویو (interview مصاحبہ)، ترجمانی (انٹر پریٹنگ) اور کونسلنگ (counselling مشاورت) کررہی ہوں۔ ایک مقامی اخبار کے صفحۂ خواتین کو بھی ترتیب دیتی ہوں۔ ویڈیو، ٹی وی اور ریڈیو کے لئے فیچر لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے انٹرویو بھی کرتی ہوں۔ یہ کام لائبریری، اسپتال اور ائر لائن وغیرہ کے لئے کیا ہے۔ اس کام کا انگریزی سے اردو اور پنجابی اور اردو/ پنجابی سے انگریزی میں ترجمے بھی کرتی ہوں۔ میں نے مانچسٹر کالج آف آرٹس میں پڑھایا بھی ہے''۔

نغمانہ نے بتایا ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی گیارہ بارہ سال کی عمر سے ہوا تھا۔ بس ایک خداداد صلاحیت تھی۔ ان کی حساس اور حد سے زیادہ جذباتی طبیعت نے ان سے جو پہلے دو شعر کہلوائے وہ یہ ہیں۔

کوئی حسرت کوئی ارمان باقی نہ رہا
یوں زمانے کی جفاکاری نے دل توڑ دیا
بے رخی دیکھ کے ساحل پہ کھڑے اپنوں کی
میں نے رُخ ناؤ کا طوفاں کی طرف موڑ دیا

اس دور میں پاکستان کے بڑے اخباروں اور رسالوں میں ان کا کلام شائع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ نغمانہ نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے ان کا مجموعۂ کلام ''شیشہ گر'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع کروا کے دیا تھا۔ نغمانہ اس زمانے میں بحرین میں مقیم تھیں۔ دوسرا مجموعۂ کلام ''سانجھے دکھ'' ۱۹۹۰ء میں سیالکوٹ سے اور تیسرا ''اداسیاں بے ثمر نہیں'' الحمد پبلی کیشنز، لاہور سے اور چوتھا ''زخمی اُڑانوں کی داستان'' ۲۰۰۰ء میں لانگ سائٹ لائبریری کے محترم رضا خان کے تعاون سے مانچسٹر لائبریریز نے بطور 'بک آف دا ایئر (Book of the Year) شائع کرایا۔ پانچواں مجموعہ ''لذت آشنائی'' ۲۰۰۱ء میں اسلام آباد سے ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب کے تعاون سے منظرِ عام پر آیا۔ اور چھٹا مجموعہ ''دردِ آشنائی'' زیرِ طبع ہے۔

اب تک ان اولڈہم کی قابلِ فخر خاتون کے مجموعاتِ کلام پر تین (۳) ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ حال ہی میں ان کو کمیونٹی کی خدمات اور ادبی خدمات کے سلسلے میں پرائڈ ان اولڈہم (Pride in Oldham) کے ایوارڈ کے لئے بھی چنا گیا ہے۔

نغمانہ کہتی ہیں انہوں نے شاعری کی جن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں نظم،

غزل، رباعی، قطعہ، دوہے، نثری نظم اور آزاد نظم شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے بعض اوقات قافیہ ردیف کی بندش بہت سے خیالات و جذبات کی روانی میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں نثری نظم کہہ لینے میں سہولت ہوتی ہے۔ تاہم ان کے خیال میں 'نثری غزل' کی اصطلاح سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ غزل ایک مخصوص ادبی ڈھنگ سے ہی کہی جا سکتی ہے۔

کنول کی رائے میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ وہ خود اولڈہم میں اردو پڑھاتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل میں اردو سیکھنے کا ذوق وشوق موجود ہے بشرطیکہ انہیں صحیح رہنمائی (اور راہ نما بھی) میسر ہو۔ اردو جیسی میٹھی زبان کو اپنانا کسی طرح بھی گھاٹے کا سودا نہیں۔

سوال نمبر چھ (۶) کے جواب میں نغمانہ کنول گویا ہوئیں... ''میں بچپن سے ہی فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کے کلام سے متاثر رہی۔ ان ہی کی تحریریوں کے مطالعے نے میرے اندر کی شاعرہ کو لکھنے پر اُکسایا۔ اور اب میں ہر اچھے اور موثر شعر سے متاثر ضرور ہوتی ہوں چاہے وہ کسی بھی شاعر یا شاعرہ کا ہو''۔

میری زندگی یادگار واقعات سے بھرپور ہے۔ کیا بتاؤں کیا نہ بتاؤں۔ اتنے خوب صورت حادثات اور اتنے دل دوز واقعات ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ لیکن میری یاد میں جو سب سے خوب صورت واقعہ اور تجربہ، اور شاید ہر عورت کے لئے، ماں بننے کا وہ لمحہ ہے جو صدیوں پر محیط رہتا ہے۔ اور دوسرا واقعہ ہے جب میں نے پہلی بار دو ننھے بچوں کی انگلی تھام کر اور تیسرے کو کوکھ میں لے کر اپنے ہم سفر کے ساتھ روضۂ رسول پر حاضری دی اور طواف کعبہ کیا اور خود اپنی تقدیر پر رشک کیا۔ وہ خوب صورت لمحات، وہ انوکھا اور اچھوتا تجربہ میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا اور میں آنکھیں بند کر کے اکثر تنہائیوں میں خود کو وہیں کھڑا پاتی ہوں۔

Mrs. Naghmana Kanwal
20 Eton Avenue, Coppice, Oldham, OL8 2AR

انتخابِ کلام (میرے اُداس ساجن)

دو آنسوؤں کا مرہم
آئے ہیں آپ لے کر
اس شہرِ نارسا میں
اس دشتِ ابتلا میں
اس بات پر مصر ہیں
ہم بخت آزمائیں
ہم بخت کو جگائیں
پھر اس کا کیا کریں گے
سر پہ شجر نہ کوئی
سو، سورجوں کے نیزے
سر پر تنے ہوئے ہیں
ہر راہِ جستجو میں
پتھر پڑے ہوئے ہیں
ہم غم کے پیرہن کو
وارفتگی میں گرچہ
سو بار بھی اتاریں
مشعل بدستِ خواہش
پھر سوختہ کرے گی

☆☆

تری مری وفائیں
کچھ بے خمار نیندیں
پھر وقت لوٹ لے گا
میرے اداس ساجن

☆☆☆

دکھ سکھ کے تانے بانے
بُنتے ہوئے حیاتی
کٹ تو رہی ہے لیکن
تیری ردا، نہ سالم
تن پر نہ میرے چادر
زخموں کی برچھیوں نے
سو چھید کر دیئے ہیں
ہم راندۂ جہاں ہیں
مدت سے بے نشاں ہیں
ہم بخت آزمائیں
اس شہرِ نارسا میں
اس دشتِ ابتلا میں
کس طور سے بھی آخر
میرے اداس ساجن
میرے اداس ساجن

☆☆☆

سرسری تم جہان سے گزرے ؛
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا ۔
احمد مسعود
۹ جون ۲۰۰۳ء
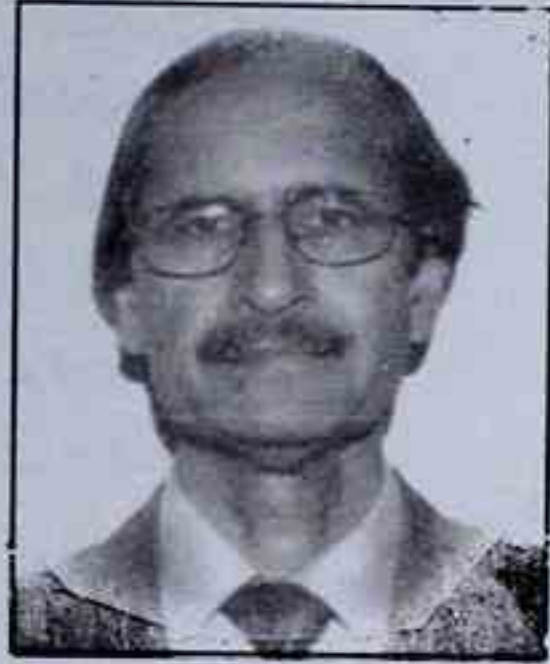
احمد مسعود

نوٹنگھم، برطانیہ

جناب احمد مسعود کے کلام کا پہلا مجموعہ ''سسکیاں سنائی دیں'' کی تعارفی تقریب کی خبر پڑھی تھی۔ پھر ان سے رابطہ ہوا تو انہوں نے از راہ خلوص و عنایت اپنا مجموعۂ کلام ارسال کیا۔ میری گزارش پر انہوں نے اپنا تعارف بھی ہم راہ کر دیا جس میں ان کی زندگی کا یادگار واقعہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انہیں بچپن میں بھی غم زدہ بھائی کی سسکیاں سننے کو ملی ہوں گی اور کیا عجب کہ دردمند دل رکھنے کے ناطے انہیں گرد و پیش کے ماحول میں ''سسکیوں'' سے زیادہ واسطہ پڑا ہو کہ انہوں نے اپنے مجموعے کے نام میں بھی اس لفظ کو شامل کر لیا۔ احمد مسعود بتا رہے تھے ... ''ظہورِ پاکستان کے بعد کشمیر میں بھی فسادات اور جنگ کے خطرے کے پیش نظر ہمارے گھر کے افراد عارضی طور پر پاکستان میں پونچھی میرانز دسرائے عالم گیر اپنے عزیزوں کے یہاں چلے گئے۔ ہمیں تعلیم کے لئے قریبی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ میں پہلی اور بھائی دوسری یا تیسری جماعت میں تھے۔ ہم آمنے سامنے ہی بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک دن حساب کے کسی سوال کی وجہ سے ماسٹر صاحب نے دوسرے طلبا کے ساتھ میرے بھائی کو بھی طمانچہ رسید کر دیا۔ تب ایک ہم جماعت بول اٹھا، ماسٹر جی یہ تو مہاجر ہے۔ ماسٹر صاحب کو یہ جان کر دلی صدمہ ہوا۔ جیب سے دوئی نکال کر بھیا کو دی۔ دستِ شفقت سر پر رکھا اور احوال پوچھا''۔ مسعود تو یہ احوال سنا کر چپ ہو گئے۔

میں بھی چُپ تھی مگر کچھ دیر پہلے روزنامہ ''جنگ ،لندن'' میں پڑھے ہوئے ایک تنقیدی کالم کے زیر اثر تھی اور سوچ رہی تھی کہ پہلے کے عالم ماسٹر صاحبان طالب علم کی کسی بھول چوک پر جس طرح ظالمانہ انداز میں طمانچے رسید کرتے تھے بعینہ آج کل ہمارے بعض نوجوان دانشور اپنے سینئیر ادیبوں کے لئے تکلیف دہ اور آزار پہنچانے والے جملے اور لب ولہجہ استعمال کر کے ویسا ہی ظالمانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ کاش ایسے دانشور صرف اتنا ہی سمجھ سکیں کہ تنقید کو تنقید ہی رہنا چاہئے ،گالی کا روپ دے دینے سے کبھی کبھی مخالف ہوا کے بہاؤ پر وہ لکھنے والے کی ذات کو بھی لیر الیر اور تار تار کر دیتی ہے۔

میں نے کافی کی پیالی اُٹھائی اور اس کی تلخی کو اپنی سوچ کے ذائقے پر حاوی کرتے ہوئے احمد مسعود سے سوال کیا...کیا ہمیں اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی حمایت کرنی چاہیئے؟ اور کیا آپ بدیس (برصغیر پاک وہند سے باہر) میں اردو کی (ترویج و) بقا کے لئے کوئی مشورہ تجویز کریں گے؟

احمد مسعود کا جواب بڑا نپا تلا اور جامع تھا۔ انہوں نے کہا...'' نا اُمیدی راستہ روکتی ہے۔لہٰذا نا اُمیدی سے ہمیں دامن بچائے رکھنا چاہیئے۔ اردو زبان اب برصغیر پاک وہند کے ساتھ ساتھ کئی نئی بستیوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کے ساتھ اردو میں گفتگو کریں اور انہیں اردو کی تعلیم بچپن سے دیں۔ لکھنا پڑھنا ضرور سکھائیں۔ موجودہ رسم الخط اس کی پہچان ہے۔ یہ ضرور باقی رہنا چاہیئے۔ تاہم ایسے لوگ جو موجودہ رسم الخط میں اردو پڑھنا نہیں سیکھنا چاہتے ان کے لئے کسی بھی دوسرے مناسب رسم الخط میں یہ سہولت فراہم کرنا بھی اردو کی خدمت ہی ہوگی''۔

احمد مسعود اصناف شاعری میں غزل اور نظم ، دونوں کے مداح ہیں۔ ان کی رائے میں ولیم ورڈزورتھ (William Wordsworth) جب سیر کو نکلتا اور ونڈر میئر جھیل (Lake of Windermere) کے کنارے آبی نرگس کے پھولوں کی بہار سے لطف اندوز ہوتا ہے تب وہ لافانی اور خوب صورت نظم ڈیفوڈلز (Daffodils) تخلیق کرتا ہے یا میر غزل کی زبان میں کہتا ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گُل کو ثبات   کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

اقبالؔ بصد شوق اسپین جاتا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یادگار مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہے اور شاہکار نظم تخلیق کرتا ہے۔ چناں چہ صنف غزل یا نظم کا انتخاب تو شاعر کی اپنی استعداد اور رجحان پر منحصر ہے۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا...'' آج کا ادب موجودہ عہد کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور آنے والے دور کی جھلک بھی اس میں دکھائی دیتی ہے۔ میں بصد ادب وانکسار عرض کروں گا کہ راقم الحرف کے شعری مجموعے (سسکیاں سنائی دیں) کا عنوان ہی اس عہد کے کرب کی غمازی کرتا ہے۔ اردو زبان نے مجھے قلبی وروحانی مسرتوں سے مالا مال کیا ہے اور اردو شاعری سے مجھے عزت ملی ہے''۔

وہ کہہ رہے تھے ...'' اچھا شعر کسی کا بھی ہو مجھے متاثر کرتا ہے غالبؔ کو شوق سے پڑھتا ہوں مگر میرؔ کو خدائے سخن سمجھتا ہوں۔ اقبالؔ سے عقیدت ہے۔ ناصر کاظمی، فیضؔ اور ندیمؔ بھی میری پسند کے شعرا ہیں۔ میں فانیؔ بدایونی ، فراقؔ گورکھپوری ، جوشؔ ملیح آبادی ، سیماب اکبر آبادی ، اقبالؔ ، فیضؔ ، سردار

جعفری کو گزشتہ صدی کے قد آور شعرا میں شمار کرتا ہوں۔ اور احمد ندیم قاسمی کا شمار تو بیسویں اور اکیسویں، دونوں صدیوں کے قد آور شعرا میں ہوگا"۔

کچھ اپنے بارے میں بتائیے تا کہ "سخنور پنجم" کے قارئین جان سکیں کہ آپ کا ذاتی سفر کہاں سے شروع ہوا اور شاعری کہاں سے آپ کے ہم قدم ہوئی۔

احمد مسعود کہنے لگے ..."میرا پیدائشی نام مسعود احمد ہے۔ اور اسی نام اور تخلص سے مختلف جرائد ورسائل میں میری تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ مگر حال ہی میں میرے علم میں آیا کہ کوئی اور میرے ہم نام، جواوکارہ، پاکستان میں رہائش پذیر ہیں، بالکل اسی نام اور تخلص سے اپنی نگارشات طبع کرا رہے ہیں۔ چناں چہ میں اپنے مہربان محترم محمود ہاشمی (برمنگھم) اور محترم عاصی کاشمیری (میرپور) کے مشورے سے اپنے نام کی ترتیب بدل کر اب احمد مسعود بطور ادبی نام اختیار کیا ہے۔

میں ۱۷/ جولائی ۱۹۴۲ء کے دن گوڑہ کنجال بھمبھر آزاد کشمیر، پاکستان میں پیدا ہوا۔ کراچی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد لیں۔ میرے ابوجی اسکول ٹیچر تھے۔ مرحوم روشن خیال اور سوشل ریفارمر (Social Reformer) بھی تھے۔ میرا بچپن گاؤں میں گزرا۔ جاگیرداری نظام کا جبر اور ابن آدم کے سامنے انسان کو مجبور و بے کس بھی دیکھا۔ سن ۱۹۶۱ سے ۱۹۶۶ تک میرا قیام کراچی میں رہا۔ کمپٹرولر آفس (Office of the Comptroller) میں ملازمت کے ساتھ ساتھ میں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ وہاں پر سیاسی، ادبی اور مذہبی قد آور شخصیات کو سننے اور بالمشافہ ملاقات کا بھی موقعہ ملا۔ بابائے اردو کے جنازے کو کندھا دینا بھی مجھے نصیب ہوا۔ ۱۹۶۶ء سے نیشنل بنک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ میں کوٹلی، آزاد کشمیر میں ایریا منیجر (Area Manager) رہا۔ ۱۹۷۸ء میں میرا تبادلہ برطانیہ میں ہوا۔ آج کل نوٹنگھم سٹی کونسل میں ٹیم مینیجر (Team Manager) ہوں۔ شادی تیس برس قبل ہوئی تھی۔ میری بیگم صوفیہ بانو کے والد محترم چودھری صحبت علی آزاد کشمیر کی جانی مانی سیاسی شخصیت ہیں۔ آپ آزاد کشمیر میں سینئر وزیر بھی رہے ہیں۔ چھوٹے بھائی چودھری خورشید احمد آج کل کمشنر مظفر آباد ہیں۔ والدہ بحمد اللہ حیات ہیں۔ میری چار بیٹیاں ہیں، دو گریجویٹ ہیں، ایک یونیورسٹی میں ہے اور ایک ابھی اسکول میں ہے۔ بیٹا گریجویشن کر چکا ہے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز گورنمنٹ کالج میرپور میں تعلیم کے دوران ہوا۔ پہلا مضمون باقاعدہ ریسرچ (research تحقیق) کے بعد لکھا۔ میں نے شعر کہنا تو ۱۹۶۱ء میں شروع کیا مگر مشاعروں میں خاصی مدت کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ کراچی کے قیام کے دوران ممتاز اردو شعرا کو سنا جیسے جوش ملیح آبادی، استاد قمر جلالوی، ارم لکھنوی، زیڈ اے بخاری، رئیس امروہوی، ماہر القادری، فیض، ندیم اور ساقی فاروقی کو بھی۔ میرا پہلا مجموعۂ کلام "سسکیاں سنائی دیں" امسال شائع ہوا ہے۔ میں نے ابتدا میں چند نظمیں بھی لکھیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے حوالے سے بھی نظمیں کہیں۔ اب ایک مدت سے غزل

کہتا ہوں اور کبھی کبھی قطعہ بھی۔

نثری نظم یا نثری غزل کے متعلق میں غالب کے مصرعے میں الفاظ کی تھوڑی سی ردو بدل سے یہ کہوں گا۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ شغل اچھا ہے،،(۱)۔

Mr. Ahmad Masud,
49 Milford Drive, Bakersfield, Nottingham, NG3 7HE

انتخابِ کلام

یوں بیاں ہم داستانِ آرزو کرتے رہے
بس غزل کہتے رہے، دل کو لہو کرتے رہے

ساتھ بس سایہ رہا یہ شام کو ہم پر کھلا
خود سے گویا ہم سفر میں گفتگو کرتے رہے

حج ہمارے کیا ہوئے، عمرے ہمارے کیا ہوئے
بس بتوں کو کعبہ کے ہم روبرو کرتے رہے

دل میں رکھیں نفرتیں، دل کی صفائی کی نہیں
ہم رہے پڑھتے نمازیں اور وضو کرتے رہے

کام کیا اچھا کیا، دنیا کو ہم نے کیا دیا
ہم سدا اچھے دنوں کی آرزو کرتے رہے

ظلم نے کی حکمرانی ہم نہ کچھ بھی کر سکے
ہم سے وہ بہتر رہے، جو ہاؤ ہُو کرتے رہے

وہ رہا مسعودؔ بیٹھا من جھروکے میں سدا
جستجو نادان جس کی کُو بکُو کرتے رہے

⁂

کیا خزاں، کیا بہار میں رہنا
پیار رت کے خمار میں رہنا

سو میں رہنا، ہزار میں رہنا
تم کسی تو شمار میں رہنا

دل ہو بے کل تو پھر برابر ہے
گھر میں یا رہ گزر میں رہنا

میں نے سیکھا نبیؐ کی سیرت سے
صاحبو! انکسار میں رہنا

قید سے یہ بھی کم نہیں مسعودؔ
محسنوں کے حصار میں رہنا

۱۔ غالب کا شعر نسخہ حمیدیہ (صفحہ ۲۰۹، مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال) میں یوں ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

باسم زیدی

ہم تو زر دل بنا کر رہیں
سامعیں ہیں کہ واہ واہ کر رہیں
مسعود قاضی

مسعود محی الدّین قاضی

ڈیلاس، ٹیکساس، امریکہ

غالباً ۱۹۹۶ء کے آخری مہینوں میں یا ۱۹۹۷ء کے شروع میں ڈیلاس میں میری ملاقات جناب مسعود محی الدین قاضی سے ہوئی تھی۔ پھر ان کا کلام ہفت روزہ "پاکستان لنک، لاس اینجلس" میں پڑھتی رہی۔ یہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے "سخنور، چہارم" کے سوال نامے کا جواب نہ دے سکے جس کا انہیں بے حد افسوس رہا۔ ان کی انکساری کا یہ عالم ہے کہ فون پر دوران گفتگو انہوں نے مجھ سے کہا... "آپ کا یہ احسان نہ صرف اردو زبان پر ہے بلکہ ہم جیسے شعرا پر بھی ہے کہ آپ غیر معروف شعرا کو معروف شعرا کے درمیان سما جانے کا موقعہ فراہم کرتی ہیں جیسے چاند کے جلو میں ستارے ٹانک دیئے ہوں۔ ان نامور شعرا کے ساتھ لوگ ہمارا نام بھی پڑھ لیتے ہیں اور یوں ہمیں جان جاتے ہیں۔ ہم سے متعارف ہو جاتے ہیں"۔

میں نے مسعود قاضی صاحب کے ان جذباتِ تشکر کی تحریر دوسرے شعرا اور اُدبا کی آنکھوں میں بھی پڑھی ہے اور جب میں نے معروف شعرا کا یہ اعتراض سُنا... "آپ نے سب کو ایک ہی گلدان میں سجا دیا ہے"[1]، تو میں نے اس تعرض کا جواب نہیں دیا کہ یہ مستقبل کے ناقد کا کام ہے اور بقول

(۱)۔ یہ نرم الفاظ میرے ہیں ورنہ اصطبل، طویلہ، گدھے اور گھوڑے جیسے الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ سلطانہ مہر

جناب محشر بدایونی مرحوم

؎ جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

مسعود قاضی کا تعلق حیدر آباد، دکن سے ہے۔ چنانچہ دوران گفتگو انہوں نے دکنی الفاظ بھی جگہ جگہ استعمال کیئے ہیں اور وہ مجھے بڑے میٹھے اور بھلے لگے ہیں۔ آپ بھی ان کی زبان کا لطف اٹھایئے۔

''میں مسعود محی الدین قاضی ۲۸ / نومبر ۱۹۴۶ء کو سابقہ ریاست حیدر آباد کے ایک شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میں میکینکل انجینئر (mechanical engineer) ہوں۔ امریکہ میں گیارہ (۱۱) سال ائیر کرافٹ انجینئر (aircraft engineer) کی حیثیت سے کام کر کے آج کل کوئی پندرہ (۱۵) سال سے اپنا ذاتی کاروبار کر رہا ہوں۔

سلطانہ صاحبہ! میری سوانح نہایت غیر دلچسپ ہے۔ عام سا آدمی ہوں۔ عام حالات سے گزرا ہوں۔ عام سی زندگی گزار رہا ہوں۔ ویسے پانچ سال کی عمر میں کراچی لے جایا گیا تھا۔ پچیس (۲۵) سال کی عمر میں ترک وطن کر کے ڈیلاس، ٹیکساس میں مقیم ہوں۔ فی الحال تا حیات یہیں رہنے کا ارادہ ہے ویسے اللہ عالم الغیب ہے۔

کراچی کے جس محلّے میں بچپن گزرا وہاں بقول ہمارے گھرانے کے محلّے کے تمام خراب پوٹے (بچے) رہتے تھے جن کے ساتھ کھیل کر میرا بھی 'اُکوٹ' (بگڑنے) ہو جانے کا خدشہ تھا۔ لہٰذا اسکول کے بعد گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑتی تھی۔ ٹیلی ویژن کا زمانہ تو تھا نہیں اور ریڈیو کے اوقات کار بھی بندھے ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا خالی وقت میں اخبار اور رسالوں کے ذریعے وقت گزاری کا سامان ڈھونڈا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں میرے بڑے بھائی صاحب، منظور قاضی (حالیہ مقیم جرمنی) کے منگائے ہوئے ادبی جرائد مثلاً نقوش، ادب لطیف، ساقی، ارمان، بیسویں صدی وغیرہ پرائمری اسکول کے زمانے سے ہی نظر سے گزرنے لگے تھے۔ والد صاحب مرحوم فارسی کے عالم تھے۔ تمام دن گلستان بوستان کا ورد کرتے رہتے تھے۔ میں نے بھی اسکول میں فارسی کی شُد بُد حاصل کرنے کے لئے فارسی کو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھا تھا۔ ویسے ہمارے برادر محترم منظور قاضی شاعری فرماتے تھے اور جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر جیسے شعرا کی صحبت میں ادبی محفلوں سے منسلک تھے۔ اُن کی ہمت افزائی پر شاعری سمجھنے، پڑھنے اور اس پر طبع آزمائی کرنے کا شوق ہوا۔ بچپن میں فلمی گانے سب ہی شوق سے سنتے تھے تو میں بھی فلمی شاعری سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ اور شکیل بدایونی صاحب اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کو پسند کرنے لگا تھا اور متاثر بھی تھا۔ بچپن میں نظمیں پسند تھیں کیونکہ ان میں غنائیت اور نغمگی گیتوں کی طرح ہوتی تھی۔ اسکول کے پہلے پیریڈ (period) میں

'لب پہ آتی ہے دعا...'

لہک لہک کر گایا جاتا تھا۔ میری آواز اچھی تھی اور گا بھی لیتا تھا۔ اکثر اساتذہ مجھے لیڈ (lead) کرنے کا موقعہ عطا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نعتیں بھی مولود کی محافل میں پڑھ لیتا تھا۔ چنانچہ ان اصناف سخن

سے رغبت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۵۵ء میں ایک سانحہ ہوا۔ کراچی کے 'بوہری بازار' میں ہولناک آتش زدگی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے متاثر ہو کر اس پر ایک منظوم احوال نامہ لکھا جو پورے محلے میں بہت مشہور ہوا، حتیٰ کہ اسکول میں ٹیچروں کی فرمائش پر کئی بار سُنانا پڑا۔ یوں ہمت افزائی ہوئی تو اپنا کلام بچوں کے رسالوں یعنی کلیم، پھلواری، بچوں کی دنیا اور جنگ کے بچوں کے صفحے میں بھیجا۔ چند مرتبہ شائع بھی ہوا۔ بہر کیف نام تو 'نا قابلِ اشاعت' کی فہرست میں بھی بار ہا آیا۔ پھر میں نے جناب ابن صفی مرحوم کے جاسوسی ناولوں کو پڑھ پڑھ کر جاسوسی ادب اور پُر اسرار مضامین لکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کئی جاسوسی اور محیر العقول واقعات پر مشتمل افسانے لکھے جو 'سب رنگ' اور دیگر ڈائجسٹوں میں اشاعت کے لئے بھیجے۔ ریڈیو پاکستان میں 'دھنک' اور 'کہکشاں' کے لئے خاکے لکھے۔ مگر ریڈیو پاکستان میں مستقل لکھنے والوں کے سامنے دال نہ گلی کیوں کہ وہاں 'قلمی برادری' میں شمولیت کے لئے جن جن سفارشات سے گزرنا پڑتا تھا وہ میرے بس سے باہر تھا۔ ریڈیو پاکستان میں شوقیہ آواز بندی بھی کی۔ اس سلسلے میں وہاں کے شاعر کرّار نوری صاحب مرحوم کی صحبت میسر ہوئی اور تھوڑا بہت سیکھنے کا موقع ملا۔ پھر امریکہ میں 'پاکستان لنک' میں کلام بھیجا تو چھپنے لگا۔ ویسے آج تک کوئی مجموعہ شائع نہ کرا سکا کہ میں ابھی تک خود کو اس لائق نہیں سمجھتا ہوں۔ دس سال کی عمر میں میری زندگی کا پہلا شعر ایک حمد یہ شعر تھا۔

تجلّی نور کی سینوں میں بھر دے ۔۔۔ میں مشتِ خاک ہوں گلزار کر دے

میں اردو کے مستقبل سے پُر امید اس لئے ہوں کہ اس زبان میں ارتقا کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ مگر اردو کی موجودہ شکل وصورت کی بقا کی طرف سے فکر مند ہوں۔ میرا مطلب رسم الخط سے ہے۔ میں اردو کے رسم الخط کے بدل جانے کے حق میں اس لئے نہیں ہوں کہ اس کے فوائد نقائص سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ مثلاً ترکی زبان کے حروف تہجی کے رومن رسم الخط میں بدل جانے کے بعد جس طرح وہاں کی نئی نسل ایک زرخیز ادبی سرمایے سے استفادہ کرنے سے محروم ہوگئی اسی طرح اردو رسم الخط بدلنے سے تمام اساتذہ کے قدیم ادبی خزانوں کی نئی نسل تک ترسیل بند ہو جائے گی۔ رہی نئی نسل کے اردو سمجھنے کے شوق کی بات تو یہ نسل حروف تہجی بدلنے سے بھی اردو کی طرف راغب نہ ہوگی چونکہ یہ سوائے انگلش کے کسی اور زبان سے متاثر نہیں۔ مزید نقصان یہ ہوگا کہ قرآن شریف، جس کے حروف تہجی اردو کے مماثل ہیں، رومن رسم الخط پڑھنے اور لکھنے والوں کے لئے نا قابلِ قرأت ہو جائے گا۔ اس طرح مذہبی اعتبار سے بھی صرف نقصان کے علاوہ کچھ نہیں۔

میری رائے میں اردو ادب کی جڑیں ٹرانس پلانٹ (transplant انتقال پزیر) ہو کر ان زمینوں میں پھیل تو رہی ہیں جہاں اردو ادب کے شائقین ترکِ وطن کر کے پہنچ گئے ہیں، مگر جس زمین سے اس کا آغاز ہوا وہاں اس کی بیخ کنی ہو رہی ہے۔ ہر ادب چاہے وہ اردو زبان کا ہو یا کسی اور زبان کا، ہمیشہ اپنے عہد ہی کا ترجمان ہوتا ہے۔ آج کل کا اردو ادیب اور شاعر پرانے مضامین اور خیالات کو اپنے انداز میں نئے رنگ و روپ کی شکل دے رہے ہیں۔ نئی اصناف ایجاد کرنے کی کوششیں ہو رہی

ہیں۔ جیسے لکھنے والے ویسے ہی پڑھنے والے۔ لکھے عیسٰی پڑھے موسٰی۔

میں نثری نظم نہ پڑھتا ہوں نہ لکھتا ہوں۔ یہ مجھے اردو ادب میں ایک مخنث قسم کی چیز لگتی ہے جس سے میں فطری طور پر الرجک (allergic زود الحس مخرّش) ہوں۔

آپ نے مجھ سے ایک یادگار واقعہ پوچھا ہے۔ یہ واقعہ ڈیلاس میں ایک مشاعرے میں شمولیت کے دوران پیش آیا۔ آپ کو یاد ہوگا آپ کی کتاب 'سخنور دوم' کی تعارفی تقریب ڈلس میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا جس میں ہندوستان کے شاعر جناب منظر بھوپالی بھی موجود تھے، جن کا یہ شعر بزعم خود کافی مقبول ہوا تھا۔

کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں — وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

اس پر میں نے ان کے جواب میں اسی مشاعرے میں اپنے یہ شعر پڑھ کر داد لی تھی۔

وہ شاعر ہو نہیں سکتا یہاں پہ — نہ اُترے گر جو پورا امتحاں پہ

زمیں تو لے گئے سب میر و غالب — کریں کیا شاعری ہم آسماں پہ!

Mr.Masood M Qazi

P O Box 831752, Richardson, TX 75083 - 1752, USA

Fax: 918 9527 e-mail FRESHCABROTO@AOL.COM

انتخاب کلام

خوشی نہیں نہ سہی، غم پہ غم نہیں ملتے — تو اپنے حال میں خوش ہم بھی کم نہیں ملتے

انہیں نہیں ملال مفارقت نہ سہی — کہ اُن سے ہم بھی بہ مژگانِ نم نہیں ملتے

دو آنگنوں کے درختوں کی طرح ہیں ہم لوگ — ہمارے سائے تو ملتے ہیں ہم نہیں ملتے

نہ ہوتا ہجر میں اندازۂ زیاں اتنا — وہ کاش ہم سے بہ لطف و کرم نہیں ملتے

نہ ہم ادھر کے رہے اور نہ وہ اُدھر کے رہے — بھلا ہی ہوتا جو ہم اس جنم نہیں ملتے

ہیں جن کتابوں میں کچے گھڑوں کے افسانے

ہمارے واقعے اُن میں رقم نہیں ملتے

شہر میں کیوں ہے دھواں سا مشتاق
یہ تو بمبئی، ایودھیا بھی نہیں !

مشتاق
29 جولائی 2002ء

مشتاق سنگھ

ہیز، مڈل سیکس، برطانیہ

میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ لے کر جب گھر جاؤں گا
لب کھولے تو قتل کریں گے نہ بولا تو مر جاؤں گا

اور

دیواریں ٹوٹ گریں چاہے، زنجیریں بکھری ہوں چاہے
پھر بھی وہ عالم قائم ہے اب بھی وہ سبھی جھیلے ہیں

یہ مشتاق سنگھ ہیں جنہیں اردو زبان اور اردو شاعری سے اٹوٹ پیار ہے۔ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو یقین نہ آیا کہ مشتاق سنگھ اردو میں شعر کہتے ہوں گے۔ میری ان سے ملاقات بریڈفورڈ (برطانیہ) کی ایک ادب دوست شخصیت ڈاکٹر صفات علوی کے دولت کدے پر منعقد ایک ادبی نشست میں ہوئی۔ وہ اپنے دل نواز ترنم کے ساتھ پُر درد آواز میں غزل خواں ہوئے تو پوری محفل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک تو آواز کا جادو، دوسری طرف غزل کے ایسے خوب صورت اشعار کہ ان کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

یہ سردار صاحب تھے مشتاق سنگھ۔ غزل کا مطلع تھا۔

تیری نگری میں لوگوں نے جب بھی ہیں برسائے پتھر
تیرا نام لکھا دیکھا ہے، جب پتھر پر آئے پتھر

خاص طور سے اس شعر نے مجھے بہت متاثر کیا ـ

کتنے ہم نے ہونٹ سیے اور کتنے درد چھپائے تھے
پھر بھی آنسو بہہ نکلے جب تیری طرف سے آئے پتھر

مشتاق سنگھ کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو غیر منقسم ہندوستان کے شہر عارف والا میں ہوئی۔ اب یہ شہر پاکستان میں ہے۔ وہ نو سال کے تھے کہ اُن کے خاندان کو ترک وطن کر کے ضلع جالندھر کے گاؤں منڈھا نوال میں بس جانا پڑا۔ گھر میں اردو فارسی کا ماحول تھا۔ اُن کے والد سردار سندر سنگھ ضلع دار فارسی اردو کے عالم تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ اس ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ میٹرک تک اُن کی تعلیم خنگل انبیا نامی اسکول میں ہوئی۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں "نکاتِ فن" کے مصنف آغا صادق درس و تدریس سے وابستہ رہے تھے۔ دلّی سے انہوں نے سول انجینیئرنگ کا ڈپلوما حاصل کیا اور قسمت انہیں بھوپال لے آئی جہاں وہ بھارت ہیوی الیکٹریکلز میں برسرِ کار ہوئے۔ بھوپال میں اُن کی افتادِ طبع نے مزید تعلیم کے لئے اُکسایا اور انہوں نے سیفیہ کالج سے بی اے کیا اور پھر انگریزی ادبیات میں گورنمنٹ حمیدیہ کالج سے ایم اے کیا۔ بھوپال کے ادبی و شعری ماحول میں رہنے کے بعد اگر وہ شاعری نہ کرتے تو بڑی انہونی بات ہوتی۔ وہاں کی ادبی محفلوں میں وہ گھل مل گئے اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔

مشتاق سنگھ کو ایک جگہ کا ہو کر رہنا آتا ہی نہیں۔ ۱۷/اپریل ۱۹۶۷ء کو وہ لندن آگئے۔ یہاں ان کی شادی ہوگئی اور ان کی بیگم امرت کور کی رفاقت میں اُن کی شاعری کو اور جلا ملی لیکن یہ ساتھ صرف بارہ (۱۲) سال رہا کہ بی بی امرت کور ایک کار کے حادثے میں انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ بی بی امرت کور کو فنونِ لطیفہ، خاص طور سے رقص سے بے حد دلچسپی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد مشتاق سنگھ نے پھر کوئی شادی نہیں کی اور اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کو اپنی زندگی کا مرکز بنالیا۔ اُن کی یہ محنت بارآور ہوئی۔ بڑا بیٹا نوجوت سنگھ ڈاکٹر ہے جب کہ چھوٹا بیٹا نو بھارت سنگھ کا تعلق کمپنی مینجمنٹ سے ہے۔

مشتاق سنگھ یہاں اپنی چھبیس (۲۶) سالہ ملازمت میں کئی محکموں سے وابستہ رہے۔ بالآخر ۱۹۹۳ء میں قبل از وقت وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوشی حاصل کی۔

مشتاق سنگھ سے جب میں نے یہ پوچھا کہ انہوں نے کبھی سیاست سے بھی دل چسپی لی ہے تو انہوں نے بتایا کہ جب وہ بھوپال میں تھے تب انہوں نے بائیں بازو کی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اس موقع پر اُن کے شعری مجموعے "خوابوں کی دھنک" کا دیباچہ یاد آیا جس میں پروفیسر آفاق احمد نے لکھا تھا ... "انہوں نے اپنا رشتہ بائیں بازو کی محنت کش تحریک سے جوڑ لیا اور

ملازمت، تعلیم، تحریک تینوں کام ایک ساتھ کرتے رہے"۔ اگر یہاں پروفیسر صاحب "شاعری" اور بڑھا دیتے تو بات مکمل ہو جاتی!

لندن آکر بھی وہ اپنے اصولوں سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے ٹریڈ یونین تعلق کے سلسلے کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ مختلف تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اسی کے ساتھ وہ شعر و سخن سے بھی اپنا ناتا جوڑے رہے۔ اب وہ اردو شاعری کے ساتھ پنجابی شاعری بھی کرنے لگے تھے۔ پنجابی میں انہیں جو مقبولیت ملی وہ قابل رشک ہے۔ پنجابی میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ٹر دے جاون پیر" (پاؤں چلتے رہتے ہیں) ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ ابھی تک آٹھ (۸) شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دو کہانیوں کے مجموعے بھی ہیں۔ لیکن اس درمیان میں انہوں نے اردو کو فراموش نہیں کیا اور اپنے منفرد ترنم کے ساتھ مشاعروں کی جان بنے رہے۔ دوستوں کے اصرار پر اُن کا پہلا اردو کا شعری مجموعہ یکم مئی (محنت کشوں کی فتح کا دن) ۲۰۰۱ء کو "خوابوں کی دھنک" کے نام سے حلقۂ ارباب ادب" بھوپال نے اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع کیا جس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے۔

درد کی شبنم، وفا کے پھول، خوابوں کی دھنک　　　جب ملے کُنجِ چمن میں نور بکھرانے لگے

مشتاق سنگھ نے "خوابوں کی دھنک" میں لکھا ہے... "اردو میرا پہلا عشق ہے"۔ گویا انہوں نے اردو کو چاہنے والوں کی طرح چاہا ہے اور اُس سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں مشتاق سنگھ نے کہا... "اردو کے مستقبل سے جو لوگ مایوس ہیں وہ دراصل اردو کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا عرفان ہی نہیں رکھتے ہیں۔ اُس کا ماضی بھی شاندار تھا، وہ حال میں بھی بے حال نہیں اور اُس کا مستقبل اردو کے اُن کروڑوں لوگوں کے مضبوط ہاتھوں میں محفوظ ہے جو صرف ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں"۔

رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں مشتاق سنگھ سے جب پوچھا گیا تو وہ جذباتی ہو گئے۔ اور انہوں نے اُلٹا سوال کیا... "ہمارے صدیوں کے گراں قدر ادبی و شعری سرمایہ کو کیا کسی دوسرے رسم الخط میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟ خواہ وہ رومن ہو یا دیوناگری"! اسی کے ساتھ انہوں نے اُن لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا جو اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی باتیں کرتے ہیں۔

مشتاق سنگھ نے بتایا کہ میر، غالب، اقبال، فیض اور ساحر کو انہوں نے ہمیشہ اپنے دل کے قریب پایا ہے۔ اور وہ اُن کے محبوب شاعر رہے ہیں۔ حبیب جالب سے نظریاتی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔

"میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ...بلکہ سانحہ کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا ...وہ لمحہ ہے جب میری امرت کور ایک کار حادثے میں مجھے داغ مفارقت دے گئی۔ میری زندگی تو اُس کے جینے سے عبارت تھی۔ وہ لمحہ میں کبھی نہیں بھولتا، جب بھی وہ لمحہ یاد آتا ہے دل کو تڑپا جاتا ہے"۔

اردو کو اپنانے کے سلسلے میں انہوں نے کہا ... "میں نے اردو سے سود و زیاں سے بالاتر ہو کر

عشق کیا ہے۔ اور عاشق کب شہرت اور مالی خسارے کی پروا کرتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ اردو کو اپنا کر میں ہمیشہ ہی فائدے میں رہا ہوں کہ جسے اردو کا قرب مل جائے اُسے اور کیا چاہیے''۔

مشتاق سنگھ سے بات چیت کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ اردو سے ان کی محبت اور عشق دیکھ کر میں محسوس کر رہی تھی کہ جب تک اُن جیسے اردو کے چاہنے والے موجود ہیں اردو کو کون ختم کر سکتا ہے۔ واقعی اردو کو اُن جیسے عاشقوں کی ہی ضرورت ہے۔

Mr. Mushtaq Singh,
25 Findhorn Avenue, Hays, Middlesex, UB4 0DG, UK

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

سچ کہنے سے جو کاٹ گیا میری زباں کو
انگلی بھی مجھے خوں میں بھگونے نہیں دیتا
جسے میں ڈھونڈ کے بھی خوش نہیں تھا
اُسے میں کھو کے پچھتایا بہت ہوں
ہمارے دل میں تمنائیں ایسے دفن ہوئیں
ہو جیسے وقتِ سحر سلسلہ ستاروں کا
جنہوں نے بیچ دی روحِ چمن غیروں کے ہاتھوں میں
وہ ننگِ چمن ہیں آج کل مسند نشینوں میں
جن گھروں میں رونقِ قرآن یا گیتا رہی
اب وہاں ترشول یا تلوار ہے سردار جی
یوسف ہو تو بک جاؤ گے تم اپنے ہی گھر میں
گر دل میں تمنا ہے تو بازار بڑے ہیں
مانگتے کب ہیں محبت کا صلہ ہم مشتاق
یہ عبادت ہے، نہیں کوئی تجارت جاناں

◆

حسین مشیر علوی

لندن، برطانیہ

برطانیہ کے دیگر شہروں کا تو پتا نہیں مگر برمنگھم اور لندن کا حال مجھے معلوم ہے۔ یہاں صبح کی سفیدی تو دیکھنے مل جاتی ہے لیکن سنہری دھوپ دعا مانگنے سے ملتی ہے یا پھر کسی ساحرانہ شخصیت سے معجزائی ملاقات کے فیض سے یہ بخشش عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ ۲ / مارچ ۲۰۰۳ء اتوار کا وہ خوب صورت اور حرارت بخش دن جناب حسین مشیر علوی سے ملاقات کا دن ٹھہرا تو سورج نے بھی مہر ومحبت کا مظاہرہ کیا، قیصر وسلطان (قیصر تمکین اور سلطانہ مہر) کے استقبال کو آیا اور اس شان سے جلوہ گر ہوا کہ اس ملاقات کو زندہ جاوید (جاوید اختر چودہری) بنا گیا۔

ہم تین صاحبان ان کے لندن کے صاف ستھرے ایک کمرے کے فلیٹ میں پہنچے۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ درمیانہ قد کے دبلے پتلے منحنی سے حسین مشیر علوی کا چہرہ ان کی اندرونی اور ایک ایسی روحانی تسکین سے روشناس تھا جس کا پرتو ان کے ملاقاتیوں کے قلب کو بھی تابندگی بخشتا ہے۔ ان کے چہرے پر جو تمکنت تھی اس کی جھلک ان کے برادر خورد جناب قیصر تمکین کے چہرے پر بھی اکثر نظر آتی ہے۔

حسین مشیر علوی لندن جیسے معروف اور ہنگامہ پرور شہر میں بڑی خاموشی سے اور بظاہر گم نام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر ان کی شاعری کی آواز نصف صدی سے برصغیر سے لے کر یورپ اور

امریکہ تک ادب کے ایوانوں میں گونج رہی ہے گو حسین مشیر پھر بھی اپنے آپ کو شاعر کہلوانے پر تیار نہیں۔ بہت پہلے ہی انہوں نے کہہ دیا تھا...

مجھے شعر کہنے کی عادت نہیں/ حدیثِ غمِ دیگراں سے
کسی رشکِ لیلائے پرویں جبیں سے
پسِ پشت بل کھاتی زلفِ رسا سے/ مجھے کوئی رغبت نہیں ہے
مرے قلبِ سوزاں کی گہرائیوں میں/ فروغِ تجلیِ بادہ نہیں ہے
سفر یہ بقیدِ ارادہ نہیں ہے/ اور...../ شب و روز ریشم کے کیڑے کی مانند
اپنی ہی تارِ رگِ جاں سے اپنا کفن بُن رہا ہوں/ میں شاعر نہیں ہوں

مگر حسین مشیر کو اس کا بھی اعتراف ہے۔

سلام کر مجھے اے روحِ دانشِ حاضر میں اپنے دور کا گم نام ابنِ مریم ہوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شاعری پیغمبری کا درجہ رکھتی ہے بشرطیکہ اسے میر، غالب، اقبالؒ، فیض اور حسین مشیر علوی جیسا لہجہ اور بے لوث سچائی مل جائے۔ وہی شاعری آفاقیت کا درجہ پاتی ہے جس کا خالق پرورشِ لوح و قلم کا جذبہ رکھتا ہو، قلمی جہاد کی آبرو کا محافظ ہو اور اس شاعری کے رموز و اسرار تک پہنچنے کے لئے ان کا شریکِ سفر بھی بنے۔ وہ سفر جو ان شاعروں نے جب طے کیا تو خارزار اور اندھیری راہوں پر سَروں کے چراغ روشن کرتے چلے۔

حسین مشیر علوی نے بھی اپنے مقدر کی تحریر خود لکھی اور دکھوں سے چھلنی جسم کے باوجود اپنے نفس کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ اور اپنے حصے کا چراغ بالآخر جلا ہی دیا کہ ان کے بعد آنے والوں کی راہیں روشن رہیں اور اپنی منزلوں کا سراغ پالیں۔

ان سے ملنے کے بعد جی چاہا ان سے گھنٹوں باتیں کی جائیں کہ اب ان سے گفتگو تبرک کا درجہ رکھتی ہے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ لکھنؤ کی شاعرانہ مٹی سے انہوں نے ۱۴/ جولائی ۱۹۳۰ء کے روشن اور تابناک دن جنم لیا۔ انٹرمیجیٹ تک تعلیم لکھنؤ اور الہ آباد سے حاصل کی۔ بی اے کا امتحان لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل سے دیا مگر باقاعدہ ڈگری پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے دہلی سے لی۔ زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں یوں گزرا کہ زمانہ طالب علمی میں ہی کمیونسٹ پارٹی سے لو لگالی۔ اور یہ ان کے مزاج کی خاصیت ہے کہ جس سے لو لگی اسی کے ہو رہے۔ مگر وقت نے سیاسی پیچ و خم کے کچھ داؤ دکھائے۔ انہیں اندازہ ہوا کہ 'یس مین (yes man)' کی حیثیت سے سب کی ہاں میں ہاں ملانے سے وہ چین و امن سے رہ سکتے ہیں ورنہ انہیں اپنی راہ الگ ہی چننی پڑے گی اور بہت قریبی دوست بھی مبادا ساتھ چھوڑ جائیں۔ یک طرفہ سیکولرزم سے ہٹ کر کچھ کہنے کے نتیجے میں انہیں ''فرقہ پرست'' اور ''تنگ نظر'' کے خطابوں سے نوازا جاتا۔ تب ان کے اندر کے شاعر نے ان سے کئی نظمیں کہلوائیں۔ مثلاً

میں اک مرتی ہوئی تہذیب کا ناکارہ شاعر ہوں

جو اپنے ہی وطن میں رہ رہا ہے اجنبی بن کر/ جسے خود باغباں نے سبزۂ بے گانہ ٹھہرایا
نہ ہو جس کا کوئی بھی حق چمن کی ان بہاروں میں
میرا ہر دوست مجھ کو اب یہی تلقین کرتا ہے/ دیارِ غیر میں کوشش کرو قسمت جگانے کی
ذرا آنکھیں تو کھولو وقت کے تیور تو پہچانو/ بدلنی ہیں تمہیں بھی سرخیاں اپنے فسانے کی

دہلی کے دانشوروں نے ان کا کرب محسوس کیا۔ ان کی نظموں کی ہر جگہ پزیرائی ہوئی۔ حسین مشیر علوی اپنے دہلی کے زمانۂ قیام میں سماجی وسیاسی پس ماندگی کے مضمرات پر مضطرب رہتے۔ وہ ایک کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان ہی دنوں دلی کی ادبی وتہذیبی محفلوں میں ان کی ملاقات ایک مہربان خاتون سے ہوئی۔ حسین مشیر کے جذبے بھی ان خاتون کی محبتوں کے اسیر ہوئے مگر اپنی ہی بے بضاعتی کا خیال ان کے قدموں کی زنجیر بنا رہا۔ گو وہ سن بچاس (۵۰) کی دہائی کے اواخر اور ۶۰ء کے شروع کے برسوں میں دہلی کے کافی ہاؤس، پارلیمنٹ اسٹریٹ اور کناٹ پیلس کے علاقے میں اپنی خوب روئی اور سحر انگیز شاعری کی وجہ سے ایسے مقبول تھے جیسے مجاز لکھنؤ کے حلقے میں تھے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ کے ع۔ واحد صاحب نے ایک دلچسپ مضمون سال نامہ ''اردو ادب، لندن'' میں لکھا تھا۔ حسین مشیر علوی کی نظم ''کافی ہاؤس'' نے دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور ممبئی کے ادبی حلقوں میں خوب دھوم مچائی۔ اس نظم میں جواں سال حسین مشیر علوی کے تیور دیکھیے، ان کا کرب دیکھیے، وہ کرب جو مجاز کو کھا گیا مگر اس کی فکر کو زندہ جاوید بنا گیا۔ اسی کرب نے ایک دوسرے انداز سے حسین مشیر علوی کو بھی بے وطن کیا اور پردیس کے در و دیوار پر دستک دینے کے لئے مجبور کیا۔

نرم رو سانولی کافی کی دل آویز مہک/ مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہے یہ چپکے چپکے
آج کے دور میں شاعری کی ضرورت ہی نہیں/ زندہ رہنے کے لئے سیکھو کوئی اور ہنر
تم نے دیکھی نہیں حالات کے ماتھے پہ شکن/ وقت کی گرد نے دھندلا دیا ہر نقشِ خیال
چاند نیکا ہے گو رقاصۂ شب کا لیکن/ چاند دریوزہ گرِ مہرِ جہاں تاب بھی ہے
زندگی رنج میں ڈوبی ہوئی ہے تا بہ کمر/ کشتۂ ناز میں باقی ہے وہی شوقِ وصال
خون میں ڈوب کے نکھرا ہے جمالِ تخلیق/ تب کہیں جا کے ملی رفعتِ افکار اسے
شاعری باعثِ عزت جو نہیں ہے تو نہ ہو/ مری دنیا، مری عقبیٰ مری جنت ہے یہی
شلدِ زیست کے رخسار کا غازہ ہے یہی/ میرے فتراکِ تخیل میں ہر اک شے ہے اسیر
جب بھی چاہوں نئی دنیا میں بسا لیتا ہوں/ ہر نئی میز پہ اک چاند اگا لیتا ہوں

حسین مشیر علوی نے ایسی آبرومندانہ نظمیں کہی ہیں کہ وہ شاعری کے ماتھے کا جھومر بن گئی ہیں۔ اکثر نظموں میں ان کی شاعری کے سُر تال فیض کی شاعری کے ہم سفر بن جاتے ہیں۔ کچھ نظمیں مجاز کی نظموں کا آہنگ رکھتی ہیں۔ مگر من جملہ ان کی شاعری میں ان کے اپنے مزاج کا میلان ہے۔ یہ بھی ان کے مزاج کا ایک رُخ ہے کہ وہ مشاعروں کو اپنی شہرت کی معراج نہیں سمجھتے نہ ہی وہ ادبی حلقوں میں

خصوصی مزاج کے ساتھ جام و مینا ٹکراتے ہیں۔ نہ ہی انہوں نے اپنی پہچان کے لئے تعلقات عامہ کے گر سیکھے ہیں۔ وہ چپ چاپ اپنے گوشۂ تنہائی میں اپنی فکر کے گہر پاروں کی مالا پروتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اس شعر پر کار بند نظر آتے ہیں۔

مجھ کو جینے کا سلیقہ جو نہیں ہے تو نہ ہو　　　مجھ کو تم میرے ہی انداز میں جی لینے دو

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۵ء میں ان کے احباب نے چندہ جمع کر کے چھپوایا۔ نام ''کوہ ندا'' رکھا گیا[1]۔ اس مجموعے میں وہ نظمیں تھیں جو مختلف احباب کے پاس محفوظ تھیں۔ ان کی کئی نظمیں بعض بلند پایہ گلوکاروں نے گائیں۔ ان کی ایک نظم کا ریکارڈ کے ایل سہگل کے داماد نے تیار کیا جو بہت کامیاب رہا۔ وہ نظم تھی ''آج کی رات غمِ دوست میں شدت ہے بہت''۔ کئی بار یہ ریکارڈ آل انڈیا ریڈیو کی سمندر پار سروس میں نشر کیا گیا۔ علوی صاحب کو نہ اس کا معاوضہ ملا اور نہ ہی یہ ریکارڈ ان کے پاس محفوظ ہے۔ اُس نظم کے چند اشعار میں ضرور یہاں درج کرنا چاہوں گی۔

آج کی رات غمِ دوست میں شدت ہے بہت
جن سے الفت ہے، بہت ان سے شکایت ہے بہت
کتنی یادیں چلی آتی ہیں کمزور و نڈھال / غمِ جاناں کی کشاکش غمِ دوراں کے سوال
چاند کو چھونے کی خواہش اُسے پانے کا خیال / گرسنہ آرزوئیں حسرت و ارمان وصال
عمر اپنی اُنہی بے کار خیالوں میں کٹی / چھا گیا پھر اُنہی خوابیدہ نگاہوں کا فسوں
ذہن میں کھلنے لگے پھر تری یادوں کے کنول / آج پھر ہونٹ تصور میں ترے چوم لئے
جذبۂ شوق سے ہونے لگیں پلکیں بوجھل / ہائے ٹوٹی ہے کہاں جا کے خیالوں کی کمند
اب بھی کچھ ہوش ہے باقی ترے دیوانے میں / بابِ زنداں پہ کھٹکتی ہے وہ زنجیر ابھی
اب بھی کچھ نالہ و شیون کی صدا آتی ہے / دل میں پیوست ہے اک زہر بجھا تیر ابھی

بے اماں دورِ تنہائی اور پردیس کی خاک چھانتے ہوئے انہوں نے ایسی کئی نظمیں تخلیق کیں۔ ایک نظم ''غمِ منزل'' ان کے انتخابِ کلام میں مطالعے کے لائق ہے۔

دہلی میں گیارہ برس بے کاری اور گاہے گاہے روزگار کے حصول اور سیاسی حالات سے نبرد آزما رہنے کے بعد سن پچاس (۵۰) کی دہائی کے آخر میں وہ کشمیر میں تھے۔ دسمبر ۱۹۶۵ء سے فروری ۱۹۶۶ء تک مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ممالک میں گھومتے رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح لندن پہنچ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے لندن پہنچنے کے لئے پیدل سفر شروع کیا۔ دبئی تک تو جہاز میں پہنچے اور پھر وہاں سے پیدل ایران، عراق، ترکی، بلغاریہ، البانیہ، چیکوسلواکیہ، فرانس اور جرمنی ہوتے ہوئے ڈیڑھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں لندن پہنچے۔ ان کے پاس قانونی کاغذات نہیں تھے، لہٰذا دسمبر ۱۹۹۰ء تک کا زمانہ انہوں نے بند کمرے میں گزارا۔ بائیس (۲۲) سال تک بند کمروں میں مقید رہنے والے اس

۱۔ بعد میں مصطفیٰ زیدی نے بھی اپنے مجموعے کا نام 'کوہ ندا' رکھا۔ اور کسی اور شاعر نے بھی اس نام کو استعمال کیا۔

شاعر نے یہ مدت اپنی شاعری کے سہارے گزاری۔ حالات ہموار نہ تھے۔ اس زمانے میں احباب کے تعاون سے ان کا کلام افکار، فنون، اقدار اور عصری ادب میں شائع ہوتا رہا۔ پھر ایک پارلیمنٹ ممبر کے تعاون سے انہیں انگلستان میں مستقل رہنے کی اجازت مل گئی مگر شرط یہ رہی کہ وہ کہیں ملازمت نہیں کریں گے نہ کسی اور سے امداد کے طالب ہوں گے۔ اب حال یہ تھا کہ ماضی کے ذہنی انتشار، بے روزگاری کے عذاب اور احباب کے جوڑ توڑ نے ان کے اعصاب توڑ دیئے مگر پھر بھی انہوں نے اپنا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ آج ان کی انگلیاں مڑ گئی ہیں اور اب یہ فن کار شاعر لکھنے سے معذور ہے۔
۱۹۹۵ء میں ''کوہ ندا'' کی طبع ثانی قیصر تمکین صاحب نے کرادی تھی اور اب وہ ان کے مزید کلام کو جمع کر کے ''کوہ ندا'' ہی کے نام سے ایک مجموعہ تیار کر رہے ہیں تاکہ کتابی شکل اختیار کر کے ان کے مداحوں تک پہنچے۔ اب جب بھی حسین مشیر علوی کچھ کہتے ہیں قیصر تمکین اسے محفوظ کر لیتے ہیں۔

میں نے ان سے اردو کے رسم الخط بدلنے کے سلسلے میں رائے مانگی۔ انہوں نے فرمایا... ''ہم بدنصیب قوم ہیں کہ ہم اپنی زبان کی حفاظت کے لئے کوئی وسائل پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ دوسری اقوام کی طرف دیکھیئے۔ چینی ہیں، جاپانی ہیں، کوریائی ہیں۔ کیا انہوں نے اپنے زبان کا رسم الخط بدلا؟ یہودیوں نے تو اپنی قدیم آبائی مردہ زبان عبرانی کو اس کے اصل رسم الخط کے ساتھ دوبارہ رواج دیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کل کلاں کوئی کہے حسین مشیر علوی تم اپنا نام ہری لال رکھ لو، پھر کہے کہ تم اپنی ذات بدل لو۔ تو صاحب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے کیا کریں۔ اس کا فیصلہ من حیثیت القوم ہمیں ہی کرنا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کی بقا کا مسئلہ ہے اس کے لئے بھی ہمیں ہی کوشش کرنا ہے۔ دیکھیئے ہندوستان نے ''یوگا'' کا انگریزوں (مغرب) میں تعارف کرادیا۔ ہم نے اپنے کھانوں کا انہیں شیدائی بنادیا۔ کیا ہم اپنی اس میٹھی زبان کو عالمی طور پر مقبول نہیں بنا سکتے؟

حسین مشیر علوی صاحب کی زندگی بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اردو زبان کے اس شیدائی نے بتایا کہ وہ پیرس میں چھ (٦) ماہ تک اردو کا نہ تو ایک لفظ کسی سے بول سکے نہ سن سکے۔ وہ مجاز کے ساتھ رہے۔ اردو کے اس منفرد لب و لہجے کے شاعر کی بے وقت موت نے بھی انہیں مدتوں دکھی رکھا۔ وہ کہہ رہے تھے... ''مجاز اتنی جلد نہ مرتا اگر ان کے دوست ان پر مہربان نہ ہوتے۔ انہوں نے مجاز کو شراب پلا پلا کر مارا۔ میں نے ایک مدت اپنے دوستوں کے ساتھ کوکا کولا پی کر گزاری جب کہ وہ شراب پیتے رہے۔ میں نے خود کو ان کے رنگ میں رنگ جانے سے بچائے رکھا کیونکہ ہندوستان افلاس کا شکار تھا۔ ہندوستان جس کے بیشتر حصوں میں لوگوں کو اناج کا دانہ نصیب نہ تھا اور لوگ گھوڑے سے اپنی غذا چنتے تھے اور آج بھی اسی طرح چنتے ہیں وہاں مجھ جیسا کوئی حساس انسان شراب میں پیسے کیسے ضائع کر سکتا تھا؟ میں نے افلاس کے عذاب کی ایسی ایسی شکلیں دیکھی ہیں کہ ان کا ذکر بھی کروں تو ہمیں انسانیت پر شرم آنے لگے''۔

حسین مشیر علوی نے برسوں کی ریاضت کے بعد خود کو دریافت کیا۔ یہ ان کا حق بھی تھا۔
چنانچہ انہوں نے بڑے اعتماد سے اپنی نظم ''پچھمن ریکھا'' میں کہا۔

مرا قد ان بونوں سے نہ ناپو/ میں آنے والے کل کا شاعر ہوں
یہ لوگ۔۔ مرا استھان ابھی کیا جانیں/ گر آج میری رچناؤں کے ننگے بالک
گم نامی کی کنج گلی میں ماٹی چاٹ رہے ہیں/ دکھ سنکوچ کی کوئی بات نہیں ہے
میں نے ستی مہما کی اُترن نہ تو کل ان کو پہنائی تھی/ نا جیون بھر پہناؤں گا
بیتے یگ کے روگی شاعر، کیوں مجھ کو اپنائیں
میری رچنا کی باتوں سے ان کے گیتوں کی لنکا جل جاتی ہے
یا ان سب کو جیون وردان میں دوں گا/ یا خود پتھر بن جاؤں گا
شبدوں کی پچھمن ریکھا میں نے اپنے ہاتھوں سے کھینچی ہے

حسین مشیر علوی سے گفتگو کے بعد ایک سوال بار بار میرے سامنے آتا ہے۔ کیا ہم پر اس شاعر کا قرض واجب نہیں؟ اگر ہے تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ ہم کب تک مقروض رہیں گے؟

Mr. Hussain Masheer Alvi,
Edna House, Flat No. 6, Norfolk Square, Paddington, London, West 8 WZ, UK

انتخابِ کلام (غمِ منزل)

اجنبی شہر میں یہ رات گراں ہے کتنی، اجنبی شہر میں یہ رات گزاروں کیسے

اپنے ہی سائے سے سہما ہوا گھبرایا ہوا
دو قدم چل کے میں رُکتا ہوں ٹھٹھک جاتا ہوں
اجنبی خوف نئے وہم نئے اندیشے
مجھ کو ہر موڑ پہ استادہ نظر آتے ہیں
چھا رہا ہے وہ ہر اک شے پہ المناک سکوت
رات کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے دن کا تابوت

قعرِ ظلمت میں یہ دھنستے ہوئے برقی فانوس
اُف یہ شب تار اندھیرے یہ بلاؤں کا نزول
آج کیا گردشِ افلاک نے دم سادھ لیا
رات کٹتی ہی نہیں وقت گزرتا ہی نہیں
برقِ الہام یہی میرے یقیں کی مشعل
کاش کچھ دیر تو لہرا کے اجالا کرتی
کوئی بھولا ہوا جذبہ کوئی موہوم خیال
مرے وارفتہ عزائم کا سہارا بن کر، مجھ کو کچھ دیر تو پیکار پہ مائل کرتا
اک نئی صبحِ مسرت کی بشارت دیتا

یوں تو بازاروں میں ہر سُو ہے رواں جمِ غفیر
یوں تو ہر سمت نظر آتا ہے انبوہ کثیر
دلِ افسردہ کی ویرانی کا عالم مت پوچھ
دل کے غم خانے میں طاری ہے وہ ہُو کا عالم
جیسے نکلا ہو بھرے گھر سے جنازہ کوئی

کتنے چہرے ہیں پر ایسا کوئی چہرہ ہی نہیں
پونچھ ڈالے رخِ افکار سے جو گردِ سفر

دستِ الفت میری پیشانی پہ یہ رکھ کر یہ کہے
کن خیالوں میں ہو غلطاں مرے پاگل شاعر
سو بھی جاؤ کہ اب رات بہت بھیگ چلی

اجنبی شہر میں یہ رات گراں ہے کتنی، اجنبی شہر میں یہ رات گزاروں کیسے

میں اپنے آپ ہی لیے سمٹا رہا
مرے خوں میں تھے سیمابی شرارے

مشیر طالب

مشیر طالب

نیویارک، امریکہ

آج اگست کی آٹھ (۸) تاریخ ہے اور سن ۲۰۰۲ عیسوی۔ میں ٹورنٹو، کینیڈا میں بیٹھی ہوں۔ عادت کے مطابق اپنے لکھنے کا پٹارا ایک بیگ میں رکھ لائی تھی کہ جب موقع ملے گا اس کتاب کے کام سے منسلک رہوں گی۔ پچھلا ایک ہفتہ تو خاصی مصروفیت میں گزرا۔ جولائی کے اواخر میں یہاں میر انیس کی سو سالہ سالگرہ کا جشن ایک سیمینار اور مشاعرے کی صورت میں منایا گیا۔ سیمینار میں ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)، ڈاکٹر اشفاق انیس (لکھنؤ)، ڈاکٹر اکبر حیدری (کشمیر)، لندن سے ڈاکٹر میتھیوز اور ان کی بیگم، پروفیسر مشکور حسین یاد لاہور سے اور ڈاکٹر ہلال نقوی کراچی سے تشریف لائے تھے۔ مانٹریال سے ڈاکٹر محترم شان الحق حقی، کیلیفورنیا امریکہ سے سلطانہ مہر یعنی 'ہم' اور نیویارک، نیوجرسی اور میری لینڈ سے جناب باقر زیدی، عبدالرحمن صدیقی، سلیم فروغ، ڈاکٹر جمال قادری اور ڈاکٹر عبدالرحمن عبد شریک ہوئے تھے۔ بڑا شاندار سیمینار رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے پاس انیس کے نوادرات موجود ہیں ان کی نمائش ہوئی اور ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''تجزیۂ انیس'' کی تعارفی تقریب اور مشاعرہ بھی ہوا۔

اس سلسلے کی دیگر تقریبات سے فراغت ہوئی تو میں نے اپنے دستاتی موڈ کو حاضر کیا۔ تین دن کے عمل

کے بعد آج "موڈ" مائل ہوا۔ تب میں نے تعارف کی فائل اٹھائی تو جناب مشیر طالب صاحب سامنے آئے۔

مشیر طالب صاحب ۵ / جولائی ۱۹۴۴ء کو لکھنؤ، یو پی، ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں۔ اٹھاون سال تو بیت گئے لیکن ان کی طبیعت میں لکھنؤ والا تکلف اب بھی موجود ہے۔ ان کا پورا تعارف معہ سوالوں کے جوابات کاپی سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہے اور وہ بھی سطر چھوڑ کر۔ مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو کہیں پڑھا تھا۔ وہ یوں ہے کہ افلاطون سچائی کی فضیلت بیان کررہا تھا۔ اس نے کہا "سچائی اور سچ کی عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ایک سچی بات یہ بھی ہے جس سے انسان کو بچنا چاہیئے"۔ ایک شاگرد نے سوال کیا "سچی بات سے پرہیز کیا معنی"؟ افلاطون نے کہا "وہ سچی بات ہی لائق پرہیز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی تعریف اور ستائش نہ کرو گرچہ تم میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود کیوں نہ ہوں جس کا تم اظہار کررہے ہو"۔

ہمارے مشیر طالب صاحب نے بھی یہ مشورہ کہیں پڑھ رکھا ہوگا لہٰذا انہوں نے اپنے بارے میں اتنا ہی لکھا کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز سکھر، پاکستان میں ہائی اسکول کے زمانے میں ہوا جب ان کے ایک سینئر ساتھی صدیق پیامی نے ایک صفحے کے ہفت روزہ "نمود سحر" کا اجرا کیا۔ ایک اور ساتھی کی ایما پر انہوں نے "طالب" تخلص اختیار کیا۔ پہلی نظم میٹرک کے طلبا کی الوداعی پارٹی میں ۱۹۶۱ء میں پڑھی۔ بقول ان کے شاعری میں کبھی سنجیدگی اختیار نہ کی اس لئے جو کہا محفوظ نہ کیا۔ گھر کی جانب سے بھی پابندیاں رہیں۔ عشأ کی نماز کے بعد باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا مشاعروں میں شرکت انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے اسکول کے استادوں جناب نکہت بریلوی اور جناب مظہر جمیل سے خاصا استفادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ کالج میں خصوصی طور پر اپنے پروفیسر جناب آفاق صدیقی سے فیض حاصل کیا۔ کالج کی اردو سوسائٹی میں پروپیگنڈا سکریٹری بھی رہے۔ تسنیم احمد جنرل سکریٹری ہوتے تھے جو بعد میں کوئٹہ میں کلکٹر بن کر سکھر چھوڑ گئے۔ مشیر طالب صاحب ۱۹۶۴ء میں کراچی منتقل ہوئے۔ ملیر میں جامعۂ ملیہ سے فارغ ہوکر کراچی یونیورسٹی میں کے شب و روز جناب شریف المجاہد کے شعبۂ صحافت میں مستفید ہوتے رہے۔ عملی زندگی کا آغاز کراچی ٹی وی سینٹر سے کیا۔ ریڈیو میں سلیم گیلانی کے ساتھ رہے۔

نظم، غزل اور قطعات میں طبع آزمائی کی۔ اگلے سوال کی جواب میں فرمایا..."آپ نے اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں پوچھا ہے تو ہمیں یہ کہنے دیجیئے یہ ایک رسمی سا سوال ہے۔ ویسے اس سوال کے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ انگلینڈ، امریکہ اور جرمنی میں اردو کے شعبے قائم ہیں اور اردو پر بہت کام ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ بارنس اور نوبل (Barnes and Noble) نے فیض احمد فیض کے کلام کو اپنی اشتہاری مہم میں استعمال کیا ہے۔ یہاں نیویارک کے سب وے (subway) ٹرین کی پوئیٹری ان موشن (Poetry in Motion) میں فیض احمد فیض کے کلام کا انگلش ترجمہ لاکھوں افراد نے پڑھا ہوگا۔ ان سب

حقائق کی روشنی میں اردو کے مستقبل کا سوال بالکل لایعنی ہے بلکہ اس سوال کا پوچھا جانا دانشمندی نہیں ہوگی۔ اب یہ روایتی لہجہ ترک کردینا بہتر ہے۔ اردو کا تابناک سورج مشرق و مغرب کو منور کیئے ہوئے ہے''۔

نثری نظم کے بارے میں ان کی رائے ہے... ''یہ ایک عجیب ترکیب لفظی ہے۔ نہ ہی یہ نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور نہ ہی نثر پر یہ منطبق ہوتی ہے۔ درمیانی چیز کو چاہے جو نام دے لیجیے۔ یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں کوئی الٹا سیدھا۔ جس طرح ریگے (Reggae) آج تک میوزک کا باقاعدہ حصہ نہ بن پایا اور آج تک عالم موسیقار اسے ''خلل ہے دماغ کا'' کہتے ہیں۔ نثری نظم کو اردو ادب میں کہاں موزوں (fit) کریں گی؟ سوائے دیوانے کی بڑ کے۔ اس کا باوا آدم یقیناً ایسا شخص رہا ہوگا جو نہ تو شاعری ہی کرسکتا ہوگا اور نہ ہی اچھی نثر لکھنے پر دسترس رکھتا ہوگا۔ بھیڑ چال ہے۔ لوگ اپنا رہے ہیں۔ اچھے اچھے لوگ فیشن گزیدہ ہیں''۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا... ''اردو کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں۔ اب اسے اکھاڑ پھینکنا یا مٹا دینا ناممکن ہے۔ یہ اپنی جغرافیائی حدبندیوں سے بہت دور نکل چکی ہے۔ اب یہ سمٹ کر قید نہیں ہو سکتی۔ اس کے ملیح لب و لہجے کے سحر میں لوگ ڈوب چکے ہیں اور غیر محسوس طریقے پر اس کی ترویج میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ یقیناً ہر دور کا ادب اس دور کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگر ادب اپنے دور کا ترجمان نہ ہو تو ادب کا نام دنیا سے اٹھ جائے۔ اور تہذیب و زبان سمٹ کر بالآخر ناپید ہو جائے۔ اردو کی نشو و نما اور عالمگیری اس بات کی شاہد ہے کہ اردو ادب نے ہر دور میں اپنے دور کی ترجمانی کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر اچھا شاعر ہمیں متاثر کرسکتا ہے۔ اور ایک نہیں بہت سے نام گنوائے جاسکتے ہیں''۔

اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا... ''زندگی کے اس دلچسپ واقعہ کا تعلق کراچی ٹی وی سے ہے۔ عبیداللہ علیم مرحوم ہمارے بہترین دوست تھے۔ ان کی ایک غزل

'عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی بہل جائے'

کی دھن ہمارے پی آئی اے آرٹس کونسل کے دوست غفور (مینڈولین نواز) نے کمپوز کی اور چاہتے تھے کہ ریکارڈ ہو جائے۔ عبیداللہ علیم مرحوم سے اجازت درکار تھی۔ کئی روز تک علیم مرحوم کو ہم مناتے رہے مگر وہ نہ مانے۔ بالآخر ہم نے انہیں دھمکی دے دی کہ اگر وہ نہ مانے تو ہم اسی زمین میں غزل کہہ دیں گے۔ وہ غزل تھی:

وہ درد دے کہ مری جان ہی نکل جائے　　　خدا کرے کہ ترا دل یونہی بہل جائے

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سائے میں رکھے۔ آمین۔ یوں ہم نے عبیداللہ علیم مرحوم کی اسی غزل کو کراچی ٹی وی پر رونا لیلیٰ کی آواز میں بہت خوب صورت ریکارڈ کیا تھا''۔

Mr. Musheer Talib,

150-68, 86th Ave., Briarwood, NY 11432, USA

انتخابِ کلام (متفرق اشعار)

ٹھہرے ہوئے پانی میں وہ اُترا تو کئی بار
داغ اپنا کبھی چاند مگر دھو نہیں پایا

میں نے سجدے کے لئے جب کوئی پتھر مانگا
طاعتِ رب نے وہیں مجھ سے مرا سر مانگا

میں نے کب چاہا تو ہمراز ثریا کردے
میں نے کب درجۂ اوتار و پیمبر مانگا

حسن بے پردہ، ترا کوئی تمنائی نہیں
جلوۂ بے باک میں اب کوئی رعنائی نہیں

لگی ہے دل میں تو منزل پہ جا کے دم لیں گے
کوئی نہ دے مری کشتی کو بادباں، نہ دے

محیط مجھ میں رہا دَور اک قیامت کا
جگر کے خون سے اشکوں نے اکتساب کیا

بدل سکی نہ مری فطرتِ جبیں سائی
مرے بتوں نے بڑا مجھ سے اجتناب کیا

خوشبوؤں نے گھر کو مہکایا بہت
وہ یہاں سے جا کے یاد آیا بہت
ہر خوشی میری اور میرے غم میں شریک
یاد وہ آیا ایک ہمسایا بہت

مغموم کلکتوی
۲۴ جولائی ۲۰۰۵ء

مغموم کلکتوی

کولکتا، ہندوستان

نام تو ان کا محمد باعشن ہے۔ اس کے باجود کہ ان کی زندگی خوش حالی میں گزری مگر اپنا تخلص مغموم کرتے ہیں۔ ان کے والد صالح بن عبدالرحمٰن باعشن اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضر موت سے ہجرت کر کے ہندوستان آ بسے تھے۔ ان کی والدہ کی پیدائش سعودی عرب کے شہر مکہ میں ہوئی تھی۔ ان کے نانا بھی ہندوستان آ کر بس گئے تھے۔ مغموم کی پیدائش ۲۱/ جنوری ۱۹۴۳ء کو شہر کلکتہ میں ہوئی۔ تعلیم بھی کلکتہ میں حاصل کی۔ آئی اے مولانا آزاد کالج سے ۱۹۶۱ء میں اور بی اے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے رسمی تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔ فی الحال کلکتہ کی ایک انگریزی فرم میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے ملازم ہیں۔

یہ سب بتاتے ہوئے مغموم نے کہا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے بھی زندگی کی اس ستم ظریفی پر ہنسی آتی ہے مگر حقیقتوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح سورگ باشی نریش کمار شاد نے کلرکی کی، زندگی بھر مضطرب رہا اور پھر خود کو دریائے جمنا کے سپرد کر دیا۔ میرے اندر کا شاعر بھی اکثر اسٹینوگرافر محمد باعشن سے بغاوت کر بیٹھتا ہے لیکن میری ایک تیسری حیثیت نے ان دو شخصیتوں میں ہمیشہ صلح و مفاہمت کرائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرا شعری مجموعہ 'آوارہ جبیں' ۱۹۷۱ء میں مجھے ایک شاعرانہ سند

دینے کے لئے منظر عام پر آیا۔ اس کے باوجود کہ میں پھر بھی گم نام ہی رہا ہوں کیوں کہ مجھے 'تعلقات عامہ' کا ہنر کبھی نہیں آیا''۔

معصوم نے اپنے اس مجموعے کو ان فن کاروں کے نام منسوب کیا ہے جو زندگی بھر گم نامی کے غاروں میں پڑے سسکتے ہیں اور جن کے فن پارے وقت اور حالات کی بے انصافی کا شکار ہو گئے اور آج بھی جن کے مزاروں پر نہ عقیدت کا کوئی پھول چڑھاتا ہے اور نہ ہی کوئی شمع روشن کرتا ہے۔

معصوم سے جب میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی اہم اور یادگار واقعہ سنائیں تو کہنے لگے ... ''زندگی میں مجھے دو بار عشق ہوا۔ اور یہ دونوں عشق آج بھی قائم ہیں۔ پہلا عشق مجھے اردو زبان سے ہوا تھا جب میں اسکول کا طالب علم تھا حالانکہ اس وقت مجھے اردو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ مگر ہر قسم کی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا۔ دوسرا عشق مجھے اردو شاعری سے ہوا۔ اس کی ابتدا کالج میں داخل ہونے کے بعد ہوئی، یعنی ۱۹۵۹ء میں۔ میرے منجھلے بھائی سعید باعشن نادان کالج کے مشاعروں میں کلام سناتے تھے۔ انہیں پڑھتے دیکھ کر میرے اندر بھی تحریک پیدا ہوئی۔ بھائی تو سعودی عرب چلے گئے اور حصول روزگار میں پڑ کر شاعری چھوڑ بیٹھے مگر میں نے سلسلہ یوں بھی جاری رکھا کہ میرے عزیز دوست نعیم الدین شارق جے پوری (مصنف ذکرِ ہم صفیران) اپنی بزم 'خم خانہ مست' کے تحت ہونے والی محفلوں کا حال مجھے سناتے اور اپنا کلام بھی جس وجہ سے میں ٹوٹا پھوٹا کلام کہہ لیا کرتا تھا۔ پھر میں مولانا آزاد کالج کے ہر دل عزیز پروفیسر عباس علی خان بیخود صاحب سے اصلاح لینے لگا۔ ان ہی کی محبتوں اور شفقتوں کا فیض رہا کہ مجھ میں ایک زبردست خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ میرے یہ اشعار اسی خود اعتمادی کا آئینہ ہیں۔

تجھ کو کم ظرفیِ ساقی سے گلہ ہے ناحق	تو نے خود بڑھ کے کبھی جام اُٹھایا ہی نہیں
میں کہ جذباتِ محبت کا پرستار ہوں اک	مجھ کو ایوانِ ہوس آپ کا بھایا ہی نہیں
میں تو خاموش تھا دستور سمجھ کر لیکن	دستِ ساقی نے کوئی جام بڑھایا ہی نہیں
مجھ سے ناراض بھی ہو کر ہیں نگاہیں مجھ پر	روٹھنے کا تجھے انداز تو آیا ہی نہیں
ہم تو بیٹھے تھے دل و جان سرِ راہ لئے	آپ نے پیار سے محفل میں بلایا ہی نہیں

اردو زبان سے ان کے عشق کے حوالے سے میں نے پوچھا کہ اردو زبان کا مستقبل آپ کے خیال میں روشن ہے؟ معصوم کہنے لگے... ''اردو صرف ہندوستان یا پاکستان کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک عالمگیر زبان ہے جس کی پذیرائی اس کے شیدائی عرب و عجم میں پورے خلوص سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل اگر بہت زیادہ روشن نہیں ہے تو اس کی وجہ حکومت سے زیادہ خود ہندوستان کا اردو داں طبقہ ہے۔ اردو زبان پر قدرت اور مہارت رکھنے والوں کو جب تک روٹی روزی یا ملازمت کی سہولت مہیا نہ ہو اس زبان کی ترقی اور ترویج پر کام کرنے والوں کی کمی کا احساس برابر ہوتا رہے گا۔ ماہرین اردو کی حوصلہ افزائی دراصل زبان کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے۔ سب سے زیادہ

شرمناک اور افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ آج کا اردو داں طبقہ خود اردو زبان کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اردو گھرانوں میں خاص کر صاحب ثروت گھرانوں میں آپ کو انگریزی کے اخبارات اور رسائل نظر آجائیں گے مگر اردو زبان کا کوئی اخبار یا رسالہ مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ ان کے بچے نہ تو اردو لکھنا جانتے ہیں اور نہ پڑھنا۔ ہمیں وقت نکال کر اپنے بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھانا ہوگا اور ہر مہینہ آمدنی کا ایک مقررہ حصہ اردو زبان کے اخبارات ورسائل کی خرید کے لئے وقف کرنا ہوگا۔ ہمارے مالی تعاون سے اردو میں چھپنے والے اخبارات اور رسائل لمبی زندگی پائیں گے اور چند سانسیں لے کر دم توڑنے سے بچ جائیں گے۔ اردو داں طبقوں کو خود ہی کوشش کر کے اپنی زبان کو جگائے رکھنا ہوگا۔ حکومت سے یہ امید نہ رکھیں کہ وہ انہیں سونے چاندی کی تھال میں پروس کر اردو کا روشن مستقبل پیش کرے گی۔ اس سلسلے میری غزل کے دو شعر ہیں۔

ظلمت کو اجالے کی کرن کون کہے گا　　ویرانے کو شاداب چمن کون کہے گا

جس ملک میں انصاف سے محروم ہو اردو　　اس ملک کو غالب کا وطن کون کہے گا

گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو تنقید کے حوالے سے مغموم کہنے لگے ..." زبان ہو کہ ادب، شاعری ہو یا کوئی بھی اور فن، تنقید تو سب کے لئے تلوار ہے جو صرف سر کاٹتی ہے۔ نقاد تو فن کار سے معجزے کی توقع رکھتا ہے اور بالفرض محال اگر معجزہ ہو بھی جائے تو نقاد یہی کہے گا کہ یہ معجزہ اور بہتر طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں تنقید سے زیادہ تبصرے پر یقین رکھتا ہوں کہ تنقید صرف تنقیص کے پہلو کو اُجاگر کرتی ہے اور توصیف کو قطعی نظر انداز۔ جب کہ تبصرہ نگار تنقیص و توصیف، دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

مرحوم جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض اور قتیل شفائی ایسے شعرا تھے جو اردو شاعری کو مالا مال کر گئے۔ اور آج بھی دنیا میں اردو کے ایسے شعرا موجود ہیں جو اردو شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں شعری اور ادبی نشستیں زبان وادب کے فروغ کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ان نشستوں سے خصوصاً نوجوان اور نئی نسل کو بڑی تحریک ملتی ہے اور یہ ان کے اندر تخلیقی جذبہ بیدار کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ ہندو پاک کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک میں جہاں جہاں بھی اردو داں ادب سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں ان کی پزیرائی بھی ہونی چاہیئے"۔

آزاد شاعری اور نثری نظم کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مغموم نے کہا ..." ہماری اردو زبان کا دامن اتنا وسیع ہے کہ شاعر اپنا مفہوم شعری پابندیوں کے باوجود بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ 'آزادی' کا سہارا لینے کی ضرورت بہت کم ہے۔ اس لئے میں شاعری کو شاعری کے روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ آزاد شاعری میرے نزدیک ضابطوں اور پابندیوں سے فرار کا ایک آسان راستہ ہے۔ ہاں بہت گہرے خیالات، فلسفے اور تصوف، جو مروجہ شعری اوزان، بحر اور قافیہ و ردیف کی

پابندیوں میں رہ کر نہیں کیئے جاسکتے اُس وقت اور صرف اُس وقت آزاد شاعری کا سہارا لینا گوارا کیا جاسکتا ہے۔ آج کل تو آزادی کے ساتھ آزاد شاعری کر کے خواہ مخواہ اردو زبان پر تنگ دامنی کا لیبل چپکا یا جارہا ہے"۔

ان کا کلام "صبح نور (پٹنہ)، ماہنامہ پیکر، سب رس (حیدرآباد) اور روبی اور چترا ویکلی (دہلی) میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اصناف سخن میں غزل پر طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ مغموم نے بڑی دل پذیر نظمیں بھی کہی ہیں جن میں "آوارہ شاعر" کافی مقبول ہوئی۔ ہندوستان کے جانباز سپاہی، عبدالحمید پر بھی انہوں نے ایک نظم کہی ہے۔ قطعات بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

جنگلوں میں ریاضتیں کیسی ترکِ دنیا نہ کیجیئے لِلّٰہ
اہل دنیا کے درمیاں رہ کر ڈھونڈ لیجیئے سلامتی کی راہ

Mr. Maghmoom Culcutvi,
Princip Street, Kolkata, 72, India

انتخابِ کلام

ویرانے کو شاداب چمن کون کہے گا ظلمت کو اُجالے کی کرن کون کہے گا
جس ملک میں انصاف سے محروم ہو اردو اُس ملک کو غالبؔ کا وطن کون کہے گا
کیوں پھول سے خالی ہے چمن کون کہے گا گلچیں سا ہے مالی کا چلن کون کہے گا
مرہم کو ترستے ہیں جہاں زخم ہمیشہ اس وادیٔ غربت کو وطن کون کہے گا
جب سینکڑوں قطروں سے بھی قلزم نہیں بنتا دو چار گلابوں کو چمن کون کہے گا
مدت ہوئی آنکھوں سے مری نیند خفا ہے اب راتوں کو خوابوں کا وطن کون کہے گا
تصویر سے کیا ہوگی مرے دل کی تسلی کاغذ کو مری جان، بدن کون کہے گا
مرغانِ گرفتار چلے سوئے قفس آج افسانۂ گلہائے چمن کون کہے گا

جس شہر میں مرہم نہ رکھے زخم پہ کوئی
اُس شہر کو مغمومؔ وطن کون کہے گا

دل جو، ہمیشہ میں گرفتار نہیں ہے
اس شخص کو جینے کا ادھیکار نہیں ہے
منور کانپوری

منور کانپوری

خالدیہ، کویت

محترم مرحوم محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں ایک جگہ لکھا ہے..... ''اعلیٰ ذات کا ہندو طبقہ شروع سے ہی مسلمانوں اور ان کی روایات کے خلاف تھا۔ اس طبقہ کو جب بھی موقعہ ملتا وہ اپنی مسلم دشمنی اور مذہبی تعصب سے کام لے کر مسلمانوں کے استحصال کو کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ پھر فورٹ ولیم کالج کے چند اکابر نے ہندو منشیوں کو اُکسایا کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی ادبی زبانوں یعنی سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط میں تحریر کریں کیونکہ فارسی رسم الخط ان کے نزدیک بدیسی ہے۔ انہوں نے ورغلایا کہ جس طرح ہندو مسلم جداگانہ طرز معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں اسی طرح ان کا رسم الخط بھی جدا ہو''۔

منور کانپوری بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط بدلنے سے اردو زبان اور اس سے وابستہ افراد کی شناخت بدل جائے گی۔

منور کا پورا نام منور حسین تمر اور قلمی نام منور کانپوری ہے۔ ۱۹۵۰ء میں کانپور، یوپی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ خلیلیہ، کویت میں مقیم ہیں۔ ''سخنور پنجم'' کے لئے چند سوالات میں نے ان کے سامنے رکھے اور پوچھا ''آپ کو کون سی شعری اصناف پسند ہیں''؟ منور بولے... ''یوں تو شعری

اصناف کی ہر قسم میں تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا ہوں لیکن میرا فطری میلان غزل اور پھر نظم کی جانب ہے کیونکہ غزل کا اختصار اور نظم کی وضاحت طلبی مجھے دونوں ہی تسکین دیتے ہیں۔ اب رہی بات نثری نظم اور نثری غزل کی، تو میری نظر میں یہ اُن لوگوں کی اختراع ہے جو فطری طور پر شاعر نہیں مگر شعری حوالے سے اپنی پہچان کرانا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس مہمل اصطلاح کا سہارا لے کر شعری فضا کو خراب کرنے کی ٹھانی ہے"۔

منور اردو زبان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ کہنے لگے... "میں بالکل پُر امید ہوں کیونکہ کسی بھی ہمہ گیر زبان کا وصف اُس کا علاقائی حدود سے بلند تر ہونا ہوتا ہے۔ اور یہ خوبی اردو زبان میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر موجود ہے۔ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں، جہاں بھانت بھانت کی بولیاں، زبانیں اور رسم الخط رائج ہیں، یہی ایک زبان رابطے کا ذریعہ ہے کیونکہ دیگر مذہب و اقوام کے لوگوں کے لئے جہاں یہ زبان اپنی شیرینی و روانی کی بنا پر پسند کا سبب ہے وہیں یہ زبان دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے آشنائی کا ایک پہلو اپنے رسم الخط کی بنا پر رکھتی ہے۔ اس زبان کی تحریر خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے دنیا کا ہر مسلمان پڑھ سکتا ہے کیونکہ ہر مسلمان بچہ بوڑھا جوان عورت مرد قرآن شریف کی تعلیم سے ضرور بہرہ ور ہوتا ہے اور اس لئے اُس کے واسطے اردو رسم الخط اجنبی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اردو رسم الخط بدلنے کا بھی حامی نہیں کہ ہر ایک زبان کی طاقت و توانائی کا مخرج اُس کے رسم الخط میں ہی پنہاں ہے۔ جو بات تحریر میں نہ آسکے ایسی بات کبھی انسان سوچ ہی نہیں سکتا۔ خرد کے احساسات و جذبات فکر و خیالات تحریر کی راہ سے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اور تحریر کے لئے رسم الخط ایک اہم عنصر ہے۔ یہ جو برصغیر کا ہر ایک فرد، بلکہ میں تو کہوں گا کہ عالم اسلام کا ہر فرد، اردو زبان سے جو اپنائیت یا آشنائی رکھتا ہے اس کا سبب یہی رسم الخط ہی تو ہے کہ اس میں جہاں برج بھاشا، پراکرت، مگدھی اور ان بنیادی زبانوں سے تعلق رکھنے والی بنگالی، گجراتی، راجستھانی، پنجابی، سندھی وغیرہ بولیوں کے جملے فقرے مل جاتے ہیں بلکہ اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں جس کا سبب یقیناً یہ "گھ، کھ، بھ، پھ" ہیں۔ اسی طرح اس زبان میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا حسن بھی "ق، غ، ث" وغیرہ حروف کی بدولت ہی جگمگا رہا ہے۔ جب یہ امتیاز ہی مٹ جائے گا کسی اور رسم الخط کی وجہ سے تو میں سمجھتا ہوں یہ زبان اپنی قدر و قیمت کھو دے گی۔ اس لئے اس کا رسم الخط ہرگز نہیں بدلنا چاہیئے"۔

اتنے خوب صورت اور وقیع جواب کے بعد میں نے کہا... "کیا یہ درست ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے؟ کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے؟ کیا اردو زبان کو اپنا کر آپ گھاٹے میں رہے ہیں"؟

میرا سوال سن کر مسکرائے اور کہنے لگے... "جناب محترمہ اس ایک سوال میں آپ نے متعدد سوال سمو دیئے ہیں۔ ان کا علیحدہ علیحدہ جواب دینے کی اجازت چاہوں گا"۔ میں نے کہا... "ضرور۔ اجازت ہے"۔ منور کہنے لگے... "غزل کے مقابلے میں احساسات کی ترجمانی کے لئے نظم افضل یا کمتر ثابت کرنے کی دراصل کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے مقام پر اہم ہیں۔ اس لئے کہ یہ دونوں شعبے الگ الگ کیفیات سے جڑے ہیں۔ کبھی انسان بات کو نہایت اختصار سے، بلکہ نہ کہنے کے رنگ میں کہنے کی طرف

مائل ہوتا ہے یا پھر یوں کہہ لیں جب ایک بات میں بہت سی باتوں کو بیان کرنے کی تمنا ہو تو اس وقت ابہام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شاعری میں ابہام کے حسن کو جامعیت کے ساتھ سمونے کی خاصیت صرف اور صرف غزل کا حصہ ہے، جب کہ موضوع کو ٹھیک ٹھیک اور کسی ایک رخ کے ساتھ بیان کرنا نظم کا فعل ہے۔ اس لئے میری نظر میں ان دونوں کا اپنا اپنا اعلیٰ مقام ہے۔

رہی بات آج کے ادب کو اپنے عہد کے ترجمان ہونے کی، تو حضرت یہ مرحلہ تو گزشتہ صدی کی تیس (۳۰) کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کے ذریعے طے ہو گیا۔ اُس دور کے بعد اردو تو اردو بلکہ برصغیر کی ہر ایک زبان (کا ادب) اپنے آپ کو اپنے عہد کی ترجمانی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہے۔

اب رہا نفع نقصان کی بات تو جناب اردو زبان کو اپنا کر گھاٹے میں رہنا کیا معنی! میں تو اپنی یہ خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس زبان کے حوالے سے میں گجراتیوں، راجستھانیوں، بنگالیوں، سندھیوں تک بھی اپنی بات پہنچا سکتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بابائے اردو مولوی عبدالحق سے کسی صحافی نے اردو کے حوالے سے سوال کیا تھا کہ ہندوستان میں اردو کی سب سے زیادہ خدمت کون کر رہا ہے تو اُس مستقبل بین شخصیت نے کیا خوب اور مزے کی بات کی۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کی خدمت سب سے زیادہ گلوکارہ لتا منگیشکر کر رہی ہیں۔ کیونکہ بابائے اردو دیکھ رہے تھے کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں اردو کے ساتھ جو رویہ اپنایا گیا اُس میں لتا منگیشکر کا دم غنیمت ہے کہ اردو ان کے ذریعے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ رہی ہے۔ لہٰذا میں تو اردو کو اپنا کر بہت خوش ہوں"۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں منور بتا رہے تھے کہ ان کی ادبی زندگی سے وابستگی یا اس شعبے کو اپنانا کسی قسم کی منصوبہ بندی سے تو عمل میں نہیں آیا، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ماضی میں جہاں تک نظر جاتی ہے وہ اپنے آپ کو شاعری سے جڑا ہوا ہی پاتے ہیں، کہیں تک بندی کرتے ہوئے تو کہیں پیروڈی (Parody مزاحیہ تضمین) کرتے ہوئے۔ ہاں باقاعدہ شاعری، جسے شاعری کہہ سکتے ہیں، وہ گزشتہ صدی کی اسی (۸۰) والی دہائی میں کویت میں شروع ہوئی تھی۔

منور کا پہلا مجموعہ کلام بنام "محبت کم نہ ہوگی" جلد شائع ہوگا۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ "بازیچۂ اطفال" کے عنوان سے چھپ کر (منظر عام پر) آ گیا ہے۔

منور نے قدیم و جدید شعرا کا بیشتر کلام پڑھا ہے اور کہتے ہیں..."ہر ایک ذرہ اپنے اپنے مقام پر آفتاب نظر آیا ہے۔ گزشتہ صدی کے شعرا میں انہیں حضرت امیر مینائی، داغ دہلوی، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، شکیل بدایونی اور فیض احمد فیض بہت پسند رہے۔ ہر اچھے شاعر کے کلام سے استفادہ کیا ہے اور کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ مگر جب خود کہا تو اپنے انداز میں بات کہنے کی کوشش کی ہے"۔

میں نے منور سے کہا..."اپنی زندگی کا کوئی اہم یادگار واقعہ بتائیے"۔ وہ بڑے حزن و ملال سے بولے ..."محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ یوں تو انسان کے دنیا میں آنے سے زیادہ یادگار واقعہ کوئی نہیں ہو سکتا مگر اس جہان فانی میں کچھ لمحے ایسے ضرور آتے ہیں جو کبھی غم اور کبھی خوشی دے جاتے ہیں۔ میری زندگی کا ایک حیرت انگیز

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں علی سردار جعفری صاحب دوردرشن ٹی وی کے لئے ماضی کے مختلف شاعروں کی زندگی کے حالات پر مبنی سیریل بنارہے تھے جس میں مجھے ایک بہت مناسب کردار ملا۔ اس ''کہکشاں'' سیریل کے کرتا دھرتا مصروف اسٹیج ہدایت کار نادرہ ببر اور جلال آغا تھے۔ مگر کویت کو عراق سے آزادی کے بعد معاشی مسائل کے حل کے لئے مجھے پھر کویت آنا پڑا اور وہ خواہش جو میرے دل میں بچپن سے پل رہی تھی اس کی تکمیل کا موقعہ ملا بھی تو میں محروم رہ گیا''۔

Munawar Kanpuri,

Kuwait University, POBox 17140, Khaldiah, Code No. 72452, Kuwait

انتخابِ کلام (نعت)

قاب قوسین کی عطا کیا ہے ۔۔۔ دیکھ احمدؐ کا مرتبہ کیا ہے

کھول دے زر کی تھیلیاں اپنی ۔۔۔ دان ہیں صدقے کے سوچتا کیا ہے

خوف ہوتا نہ گر جو دوزخ کا ۔۔۔ لوگ کہتے کہ پھر خدا کیا ہے

خود کو کہتے ہو اک قبیلے کے ۔۔۔ پھر دلوں میں یہ فاصلہ کیا ہے

تشنگی کی تُو بات کرتا ہے ۔۔۔ پوچھ ہم سے کہ کربلا کیا ہے

لذتیں کیا بتاؤں ان سب کی ۔۔۔ روزہ و مسجد وصلوٰۃ کیا ہے

اے منور بتا ہمیں، تو نے ۔۔۔ صرف سونے کے اور کیا کیا ہے

متفرق اشعار

آتشِ غم کا دھواں آج بھی ہے ۔۔۔ درد سینے میں جواں آج بھی ہے

نہ وہ منزل نہ اب وہ رہ گزر ہے ۔۔۔ سفر تو ہے مگر کیسا سفر ہے

ایسے تمہاری یاد کے مدہم ہوئے چراغ ۔۔۔ آنکھوں میں اشک آئے تو پرنم ہوئے چراغ

آنکھ نے دیکھا نہیں ہے، کیا کہیں ۔۔۔ آسمان ہے، یا نہیں ہے کیا کیا ہے
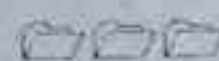
راہوں میں بچھڑ جانے کا ارادہ تو نہیں تھا ۔۔۔ قسمت پہ مگر زور زیادہ تو نہیں تھا
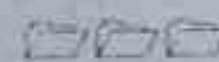
یہی ہے شاعر آوارہ کی سزا شاید
کہ سیر عیش کی شاموں کی رہگذر میں ہے

منیب الرحمٰن

۳۰/۸/۲۰۰۲

ڈاکٹر منیب الرحمٰن

مشی گن، امریکہ

یہ گئے دنوں کی بات ہے مگر غلط نہیں اور سو ٹکے سونے کی طرح کھری ہے جب ہندوستان کے سانولے سلونے لڑکے جن کے کالے بالوں اور گندمی رنگت پر گوری میمیں سو جان سے فدا ہو کر انہیں کرشن کنہیا کی طرح اپنے من مندر میں بسا لیتی تھیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۴۹ء کے بہار کے موسم میں ہوا جب سوئٹزر لینڈ کی ایک لڑکی ایلزبتھ مور (Elizebath Moor) نے ایک شاعر کو دیکھا۔ وہ اپنی سہیلی سیسیلیا میکڈونلڈ (Cecilia McDonald) سے اس کے بارے میں سنا کرتی تھی۔ اس کی شاعری کے بارے میں گفتگو کرتی تھی۔ اسے بھی ادب سے دل چسپی تھی۔ وہ لندن میں فرانسیسی اور جرمنی زبانیں پڑھاتی تھی۔ مگر جس شاعر کی وہ باتیں سنا کرتی تھی، اُس طرحدار نوجوان نے مغرب کے حسن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اور ایلزبتھ مور کو دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔ وہ اپنے دکھ کو اپنے محبوب کی امانت کے طور پر دل میں بسائے پیرس لوٹ گئی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ازدواجی رشتوں کی ڈور آسمانوں پر بندھتی ہے، سو ان دونوں کے رشتوں کا مضبوط بندھن فرشتوں نے آسمانوں میں باندھ دیا تھا اور ان کے ملاپ کے لئے ایک حادثے کو بھی جنم لینا تھا۔

وہ حادثہ تھا فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کا راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہونا۔ یہ ۱۹۵۱ء کی

بات ہے۔ شاعر منیب الرحمٰن کا ان دونوں سے ذہنی رشتہ تھا۔ ایک ہی تحریک کی لڑی میں پروئے ہوئے یہ موتی بکھر گئے تھے۔ منیب الرحمن نے آزادی کے ان متوالوں کی حمایت میں انگلستان کے سیاست دانوں اور دانش وروں کو متاثر کرنے کی مہم چلائی۔ منیب اور ان کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اس حمایت کی تحریک کو اقوام متحدہ تک، جس کا قیام اس زمانے میں پیرس میں تھا، لے جایا جائے۔ منیب الرحمٰن نے اپنے کرب کے لہو میں ڈبو کر ایک نظم "شہر آشوب جدید" لکھی، جس کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

کبھی دیکھے ہیں اہل علم رسوا	دکھاؤں آ تجھے یہ تلخ منظر
اسے کہتے ہیں قدرِ فضل و دانش	ظہیر و فیض ہیں زنداں کے اندر
پڑا روتا ہے پا بستہ تخیل	لگے ہیں آج بھی پہرے زباں پر
اُڑایا جائے گا سر اس ادب کا	نہیں جو حاکموں کا مدح گستر

یہ منصوبے ہیں جلادِ تخن کے

منیب الرحمٰن پیرس روانگی کے لئے آمادۂ سفر ہوئے تو ان کے دوست صدیق احمد صدیقی نے، جو ایلزبتھ مور کو جانتے تھے، ایک خط ایلزبتھ کو لکھا کہ وہ پیرس میں منیب کی میزبان ہوں گی۔ ایلزبتھ منیب کی بے اعتنائی سے دل برداشتہ تھی لیکن وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ عام عورتوں سے اس کی سوچ مختلف تھی۔ وہ بھی اس نگی میں شامل ہونا چاہتی تھی جس کے لئے اس کا کنہیا، اس کا من موہن پیرس آرہا تھا۔ ۲/دسمبر ۱۹۵۱ء کا وہ خنک خنک ساون محبتوں کی ایسی پھوار لایا کہ ایلزبتھ کے رانجھے نے ایک ہفتے بعد اُسے شادی کا پیغام دیا اور اپنی ہیر بنا کر اپنی کٹیا میں لے گیا۔ اب ایلزبتھ مور منیب الرحمٰن کی زیبا تھی۔ ۵/فروری ۱۹۵۲ء کے دن یہ عہد و پیماں پیرس میں قانونی بندھن میں تبدیل ہوئے۔ رفاقت کا پودا پینتالیس (۴۵) سال میں تناور درخت بنا جس نے ان کی پُر بہار زندگی میں چار پھول بھی کھلائے۔ یہ آصف، آزاد، ثمینہ اور سالک ہیں۔ ثمینہ اناری ہیں اور ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے شہر ہی میں رہتی ہیں جب کہ آصف ورجینا میں، آزاد سیاٹل میں اور سالک لاس اینجلس میں رہتے ہیں۔ چاروں بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ وہ اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں۔ شاعر منیب الرحمٰن خوش ہیں۔ بقول خود۔

آؤ چپ چاپ نکل جائیں بھری محفل سے	حسرتِ دیدۂ بیدار کو رسوا نہ کریں
چاند بن کر پسِ اشجار نہاں ہو جائیں	روح کی عزلتِ شب تاب کا چرچا نہ کریں

اس شاعر کی کھوج میں، میں بھی مدتوں رہی کیونکہ یہ معمولی شاعر نہیں۔ ایک زندگی اس نے علم و ادب کی نذر کی ہے۔ منیب الرحمن ۱۸/جولائی ۱۹۲۴ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ سال رواں ۲۰۰۳ ہے۔ اگلے سال منیب صاحب اسی (۸۰) برس کے ہو جائیں گے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے اتنی استطاعت دے کہ میں دنیائے اردو کے اس پیارے اور عظیم شاعر کی خدمت میں ان کے شایانِ شان خراج تحسین پیش کر سکوں۔

منیب الرحمٰن کی ابتدائی تعلیم الہٰ آباد کے ایک رومن کیتھولک اسکول میں ہوئی۔ ان کے والد

اکرام حسین صاحب ایک پولیس مین تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ منیب انگریزی تو خوب سیکھ رہے تھے مگر اندیشہ تھا کہ وہ اپنی مادری زبان بھول جاتے تب انہوں نے بیٹے کو ایک دیسی اسکول کی چھٹی جماعت میں داخل کر دیا۔ دو سال بعد والد کا تبادلہ آگرہ ہوا تو منیب وہاں کے شعیب محمدیہ اسکول میں داخل کیئے گئے۔ اب پھر اکرام صاحب کا تبادلہ ہوا تو منیب اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے آبائی شہر ''ڈبائی'' بھیجے گئے، جہاں ۱۹۳۶ء میں انہوں نے میٹرک کیا۔ پھر میرٹھ کالج سے انٹر کر کے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے بی اے کے بعد ایم اے (تاریخ) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ اور فارسی میں بھی ایم اے کیا۔

اب روزگار کے حصول کی جدوجہد کا زمانہ آیا۔ منیب الرحمٰن نے رام پور میں ایک مشین فیکٹری کے انگریز ڈائرکٹر کے لئے بحیثیت پرسنل اسسٹنٹ کام کیا مگر اس کام میں جی نہ لگا۔ ان ہی دنوں رام پور کے محکمۂ تعلیم کے سکریٹری جناب غلام السیدین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ لندن کے اسکول آف افریقن اینڈ اورینٹل اسٹڈیز میں داخلے کی کوشش کریں۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا۔ اجازت نامہ ملنا آسان نہ تھا۔ خواجہ صاحب ہی نے، جب وہ کسی کام سے لندن گئے تھے، ان کا داخلہ کرا دیا۔ ڈاکٹر بیدار بخت لکھتے ہیں...یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو منیب الرحمٰن فوجیوں کے جہاز سے انگلستان پہنچے۔ جنگ کے اثرات باقی تھے۔ لندن بمباری سے مسمار تھا۔ ضروری اشیا پر راشن تھا لیکن منیب الرحمٰن کو وہاں کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے میں بہت دقت محسوس نہیں ہوئی۔ فارسی میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے نامساعد حالات کی وجہ سے وہ ان برسوں میں فارسی میں پی ایچ ڈی نہ کر سکے۔ تاہم منیب الرحمٰن نے ادب سے اپنا ناتا نہیں توڑا۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے اردو ترجمے بی بی سی کے لئے کیئے۔ ان میں سے انتھونی اینڈ کلوپٹرا (Anthony & Cleopatra) کا ترجمہ ۱۹۷۹ء میں مکتبۂ جامعہ نئی دہلی نے اور جولیس سیزر (Julius Ceaser) کا ترجمہ ۱۹۸۸ء میں ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا۔

۱۹۵۳ء میں انہیں جدید فارسی ادب پر کام کرنے کے لئے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اس مقالے کو کتابی شکل میں ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ نے ۱۹۵۵ء میں بعنوان پوسٹ ریوولوشن ورس (Post Revolution Verse) شائع کیا۔ انہوں نے جدید فارسی شعرا کا انتخاب بھی مرتب کیا جو ۱۹۵۸ء میں بار اول اور ۱۹۶۳ء میں بار دوم شائع ہوا۔ ان کی ایک اہم کتاب ''جدید فارسی شاعری'' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے توسط سے ایران کی نوجوان نامور شاعرہ فروغ فرخ زاد کا ذکر پہلی بار ایران سے باہر ہوا۔ اس وقت تک بقول ڈاکٹر بیدار بخت فروغ فرخ زاد کے تین مجموعے، ''اسیر''، ''دیوار'' اور ''عصیاں'' شائع تو ہو چکے تھے مگر اس کا نام ایران سے باہر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ منیب الرحمٰن کا اس سلسلے کا انگریزی مضمون سند اول کا درجہ رکھتا ہے اور اکثر مضامین میں اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ ایران کے موقر رسالے ''سخن'' نے اپنے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ منیب الرحمٰن نے درجنوں ایرانی نظموں کے ترجمے کیئے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔

انگلستان کی زندگی سے منیب الرحمٰن ۱۹۵۳ء میں باہر نکلے تھے۔ علی گڑھ میں اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ڈاکٹر ہادی حسن شعبۂ فارسی کے صدر۔ مگر چند دیگر حالات کی وجہ سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن کو وہاں ملازمت نہ ملی اور یہ ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے شامل ہوئے اور پھر وہاں کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ زیبا رحمٰن یونیورسٹی میں فرانسیسی اور جرمن پڑھانے لگیں۔ یونیورسٹی کا ڈرامہ کلب بھی ان کی زیرِ سرپرستی پروان چڑھا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر منیب نے اپنا ذاتی مکان ''گلِ رعنا'' خریدا جس کا گوشہ گوشہ زیبا کی محبت بھری آرائش سے غزل خواں تھا۔

انگلستان میں رہنے کے باوجود منیب الرحمٰن کا نام جدید اردو شاعری میں فروغ پاتا رہا۔ ان کا کلام ان کی غیر موجودگی میں بھی ہندوستان اور پاکستان کے جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ معروف نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب ''اردو میں ترقی پسند تحریک'' میں لکھا ہے کہ لندن جانے سے قبل منیب الرحمٰن کا نام میرا جی، ن م راشد، مختار صدیقی اور قیوم نظر کے ساتھ لیا جاتا تھا''۔ خود منیب صاحب کا کہنا بھی ہے کہ انہیں جدید شاعری کی تحریک ن م راشد اور فیض احمد فیض سے ملی۔ ڈاکٹر منیب کے مدھم لہجے کی وجہ سے انہیں حلقۂ اربابِ ذوق گروہ سے بھی وابستہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے کلام کا پہلا مجموعہ ''بازدید'' کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ پبلشر کی جانب سے صفحات کی قید تھی۔ لہٰذا اسّی (۸۰) صفحات کے اس مجموعے میں چھوٹی چھوٹی انچاس (۴۹) نظمیں شائع ہوئیں جو شاعری کی بائیس (۲۲) سال کی کاوش کا نتیجہ تھیں۔ تیئس (۲۳) سال بعد ۱۹۸۸ء میں ''بازدید'' کا دوسرا مکمل ایڈیشن امریکہ کی اوک لینڈ یونیورسٹی سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک کا سارا کلام شامل ہے۔ ان میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن پر ترقی پسندی کا لیبل لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ن م راشد کے بعد ڈاکٹر منیب الرحمٰن وہ واحد شاعر ہیں جو بیک وقت اردو، فارسی اور انگریزی میں سوچتے ہیں۔ ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے ان تینوں زبانوں کی قدیم اور جدید شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔

ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ''شہرِ گم نام'' ہے اور تیسرا ''نقطۂ موہوم'' جسے ڈاکٹر بیدار بخت نے شائع کیا ہے۔ اس میں بیدار بخت نے بہت تفصیل سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے بارے میں ستائیس (۲۷) صفحات کا دیباچہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن سے میں کس طرح متعارف ہوئی یہ بھی ایک دل چسپ کہانی ہے اور میری جدوجہد سے عبارت۔ میں نے ان کا مجموعہ کلام ٹورنٹو کے شاہد ہاشمی سے لے کر پڑھا۔ ان کا عکسِ تحریر اور تصویر ولی عالم شاہین نے مہیا کیں اور خود ڈاکٹر منیب تعاون نہ کرتے تو میں ان کا تعارف نہ لکھ پاتی۔ انہوں نے ''بازدید'' اپنے دستخط کے ہمراہ ۱۷/ اگست ۲۰۰۳ء کے دن مجھے ڈاک سے بھجوائی۔ اب میں اکثر ان سے فون پر بات کرتی ہوں۔ پہلے میں ڈرتی تھی کہ بدمزاج نہ ہوں۔ مگر ولی عالم شاہین

نے حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ بہت نرم خو ہیں۔ مجھے یقین تب آیا جب میں نے ان کی نظم ''پھولوں کی بات'' ان کی زبانی سُنی ، جس کی وڈیو کیسٹ مجھے میرے چھوٹے بھائی عدیل زیدی نے مشی گن سے بھیجی تھی۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

جب کہرام مچا ہو/تم پھولوں کی بات کہو
نقاروں کا شور بپا ہو/تم پھولوں کی بات کہو
آئے جھونکے دہکے دہکے/کوئل کوکی، پنچھی چہکے
گیندا، بیلا، جوہی مہکے/تم پھولوں کی بات کہو
میں نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی/نیم پہ اب پکّی تھی نبولی
پیڑ پہ بیٹھی مینا بولی/تم پھولوں کی بات کہو
کوئی چلائے برچھی بھالا/کوئی بُنے مکڑی کا جالا
کوئی گورا کوئی کالا/تم پھولوں کی بات کہو
کون برا ہے کون اچھا ہے/کیا جھوٹا ہے کیا سچا ہے
دنیا ایک گورکھ دھندا ہے/تم پھولوں کی بات کہو
چاہے شور و غل ہو بھاری/بہرے ہوں یہ سب نرناری
دب جائے آواز تمہاری/تم پھولوں کی بات کہو

ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی شاعری میں اچھوتا پن ہے، اپنائیت ہے، مانوس لہجہ ہے اور آہنگ ایسا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

ڈاکٹر بیدار بخت نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا... ''منیب الرحمٰن کی شاعری مجھے خاص طور سے اس لئے پسند ہے کہ وہ مجھے آوردہ یا غیر فطری نہیں لگتی۔ شاعری کا خام مواد جو انہیں انگلستان میں ملا اسے اپنے شعروں میں ڈھالنے کے لئے انہیں عجمی استعاروں کی ضرورت نہیں پڑی۔ مثلاً ۱۹۴۶ء میں لکھی ہوئی نظم ''اظہار'' دیکھئے۔

اب تیرے جسم سے اُٹھتی ہوئی خوش بو کی لپٹ/مرے احساس پہ آویزاں ہے
گرم ہے کمرے کی خاموش فضا/تیرے عارض پہ پسینے کی نمی
ذہن میں لاتی ہے برسات کی پہلی راتیں/نیم سگریٹ تیرے پوروں میں دبی
سرخیِ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے، جس پر
کہہ رہی ہے کہ حقیقت ہے فقط دور رواں
تو بھی خاموش ہے، میں بھی چپ ہوں
اور ہم دونوں یہی سوچ رہے ہیں دل میں/کاش منت کش اظہار نہ ہونا پڑتا

نیم سگریٹ تیرے پوروں میں دبی/سرخیِ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے، جس پر، یہ مصرعے نظم کی روانی میں

ایسے بجے جاتے ہیں کہ خیال بھی نہیں آتا کہ لپ اسٹک کے دھبوں سے پراگندہ ادھ جلی سگریٹ اردو شاعری کے لئے غیر مانوس ہے۔

آج کے 'جدید شاعر' جب اپنے کلام میں غیر مانوس الفاظ کے استعمال کی داد چاہتے ہیں تو میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ جدّت تو اب کوئی پچاس سال پرانی ہوگئی"۔

شاعر منیب الرحمٰن کے ساتھ زندگی کا ایک المناک حادثہ ۱۹۹۸ء میں ہوا جب ان کی بینائی ضائع ہوگئی۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ اندوہناک حادثہ ۶/جنوری ۲۰۰۲ء کے دن ہوا جب ان کی رفیقۂ حیات زیبا ایک بیماری کا شکار ہوکر ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئیں۔

ڈاکٹر منیب اب بھی تنہا نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی پیاری دوست زیبا کی یادیں ہیں۔ وہ اُداس ہوں یا خوش، زیبا سے شاعری میں گفتگو کرتے ہیں۔ اب وہ اس شاعری کو کتابی شکل دینا چاہتے ہیں۔ اپنی شب و روز کی مصروفیت کے متعلق انہوں نے مجھے بتایا..." میں اپنا کھانا خود تیار کرتا ہوں۔ مغربی ادب کے کیسٹ انگریزی میں ملتے ہیں، وہ سنتا ہوں۔ اپنی نظمیں ریکارڈ کرتا ہوں۔ میری لائبریری کی کتب سے استفادہ کرنے والے دو ایک نوجوان آجاتے ہیں جو مجھے اردو ادب کی کتب پڑھ کر سناتے ہیں چونکہ انہیں بھی مطالعے کا شوق ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ سنا ہے اس سے رائے قائم کی ہے کہ ہمارا موجودہ ادب ہمارے دور کی نمائندگی کرتا ہے"۔

اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں ان کا کہنا ہے..." ہر زبان کے رسم الخط کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ جب تک لوگ اس اہمیت کو محسوس کریں گے رسم الخط باقی رہے گا ورنہ نہ تو زبان رہے گی نہ رسم الخط۔ اب یہی دیکھئے کہ ہم جیسے نابینا لوگوں کے لئے اردو زبان کے ادب کا کوئی کیسٹ مہیا نہیں کہ ہم سن کر اپنی علمی معلومات میں اضافہ کریں۔ آپ مہم چلائیں۔ ہمارے ڈراموں، کہانیوں، ناولوں اور شاعری کے لانگ پلے کیسٹ خصوصاً جدید لوگوں کی تحریروں کو اس طرح محفوظ کرنا چاہیئے۔ چھ گھنٹے کا ایک لانگ پلے کیسٹ جس کا تلفظ اتنا صاف ہو کہ لفظ گڈمڈ نہ ہوں۔ میں نے قرآن کے ترجمے کا کیسٹ منگوایا۔ بڑی خوب صورت ادائیگی ہے۔ جلال الدین رومیؒ کی نظموں کے انگریزی ترجمے کا کیسٹ منگوایا جو کول مین بارکس (Coleman Barks) نے رچرڈ بلائی (Richard Bly) کی ایما پر کیا ہے۔ پوری جلد کا آزاد منظوم انگریزی ترجمہ چار عدد کیسٹ میں 'اسینشل رومی (Esential Romi)' کے نام سے ہے۔

ڈاکٹر منیب سے رخصت ہونے سے پہلے میں ان کی ایک نظم "تسلّی" ان ہی کی آواز میں آپ کو سناتی چلوں۔ محسوس کیجیئے کہ یہ لہجہ کتنا مدھم، کتنا شیریں، دل نواز اور حیات کی مسرتوں سے لبریز ہے۔ یہ ان کی زیبا کی نذر ہے اور ہم سب کی بھی۔

مایوس نہ ہو وقت سے اے تشنۂ دیدار
شاید کبھی بچھڑے ہوئے پھر آن ملیں گے

پھر آئیں گی بھولے ہوئے موسم کی ہوائیں
پھر مہر و وفا کے گل و گلزار کھلیں گے
مشکل نہیں اعجاز محبت کے اثر سے
اک دن دلِ صد چاک کے یہ زخم سلیں گے

Dr. Munib-ur-Rahman,
3, Westburry Court, Ann Arbor, Michigan, 48105, USA

انتخابِ کلام

علاج اس کا کہیں بھی نہ بحر و بر میں ہے
یہ آگ کیسے بجھے گی جو میرے سر میں ہے

⧗•⧗

ملی ہے مجھ کو زمانے کی گریہ و زاری
جہاں کا درد والم میری چشمِ تر میں ہے

⧗•⧗

جلا وطن ہوں، غریب الدیار ہوں ہر جا
سکونِ قلب یہاں ہے نہ اپنے گھر میں ہے

⧗•⧗

یہی ہے شاعرِ آوارہ کی سزا شاید
کہ سیر جس کی ستاروں کی رہ گزر میں ہے

⧗•⧗
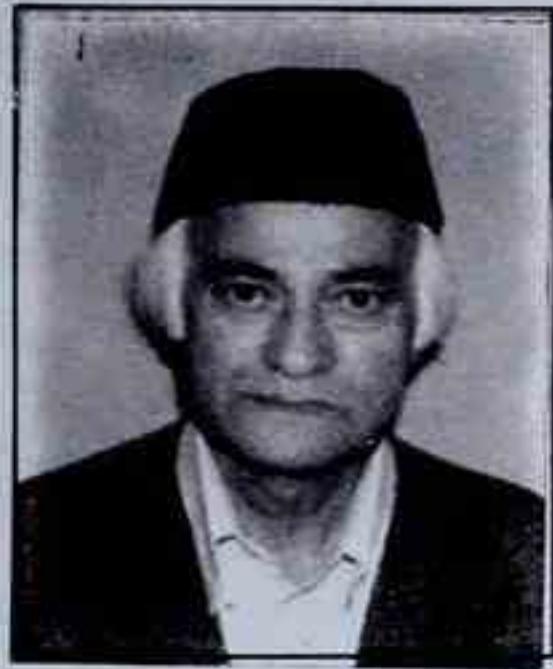
موج رام پوری

دہلی، ہندوستان

لاس اینجلس کی ادب دوست اور من موہنی جوڑی نیلوفر کرمانی اور ان کے صاحب بہادر تنویر کرمانی کے گھر شعری محفل جمی تھی۔ خاصے شعرا اور شاعرات مدعو تھے۔ دلی سے آنے والے موج رامپوری مہمانِ خصوصی تھے۔ وہ نیلوفر اور تنویر کے گھر مقیم تھے اس لئے کہ تنویر کرمانی اور موج رام پوری اردو زبان کے "لنگوٹیا یار" ہیں۔

مقامی شعرا و شاعرات "اپنا شعری بوجھ" اُتار چکے تو مہمانِ خصوصی کی باری آئی اور جب موج صاحب رواں ہوئے تو بقول محشر بدایونی ؎ "جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا"، سارے چراغ ٹمٹمانے لگے اور ایک دیا اپنی پوری توانائی کے ساتھ روشنی دینے لگا۔ موج سہلِ ممتنع میں گویا تھے

آپ تو رات سو لیئے صاحب   ہم نے تکیئے بھگو لیئے صاحب
تلخیوں کا مزاج بدلے گا   زہر میں قند گھولیئے صاحب
اس کے دامن کو چھو کے آئے ہیں،   ہم کو پھولوں میں تولیئے صاحب
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں   اتنا اونچا نہ بولیئے صاحب

میں موج کا کلام نوٹ کر رہی تھی۔ میں بہت تیز رفتاری سے لکھ لیتی ہوں۔ اس خوبی سے اللہ نے مجھے

نوازا ہے۔ موجؔ دوسری غزل سنا رہے تھے۔ ان کے ترنم میں دل موہ لینے والی غنائیت ہے۔

کبھی تو ہمیں ہوں وہ راتیں نصیب	ہمیں لوریاں دے سلائے ہوا
ابھی چل رہی تھی ابھی رک گئی	بتاؤ یہ کیا ہے ادائے ہوا
اڑانیں کہاں میری محدود ہیں	مرا ساتھ کیسے نبھائے ہوا
کسی روز ایسا کرشمہ بھی ہو	دیوں کی حفاظت کو آئے ہوا

محفل میں ایک دل آویز سکوت تھا، دل گداز سناٹا تھا اور ایک دل ربا شاعری گونج رہی تھی۔ اشعار کی سادگی و پُرکاری روح کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے ناگفتہ حقیقتوں کا اظہار کر رہی تھی۔

جنگ میں قتل سپاہی ہوں گے	سرخ رُو ظلِ الٰہی ہوں گے

ان کے بارے میں محمود ہاشمی (دلّی والے صاحبِ قلم نثر نگار و ناقد) نے لکھا ہے کہ موجؔ نے اپنے اظہار کو، اپنی شاعری کو، اپنے عہد، اپنے عہد کے انسان اور اپنی تہذیب کو اس طرح ہم آہنگ کر لیا ہے کہ موجؔ کا ہر شعر سننے اور پڑھنے والے کی دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ یہ ایک افسوں بھی ہے اور اظہار کا ایک مختلف اسلوب بھی جو ہمارے عہد کی شاعری کو تازہ کار اور موثر بنا رہا ہے۔

۱۲/ دسمبر ۱۹۴۶ء کے دن ایک خوش شکل و خوش مزاج و خوش دل بچے نے رام پور میں جنم لیا۔ نام سید محمد علی رکھا گیا۔ سارے بچے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں، شور مچاتے ہیں کہ ہم کیوں اس بے مروت دنیا میں بغیر اپنی مرضی کے وارد کر دیئے گئے۔ محمد علی بھی روئے ہوں گے لیکن شاعرانہ ادا کے ساتھ۔ ماں کی گود میں ہوں گے اور اگر بول سکتے تو اسی وقت ماں کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اور اپنی علمیت کا رعب پالنے میں جانے سے پہلے ہی جھاڑتے ہوئے کہتے ۔

کیا نقش اُبھرتے ہیں لفظوں کے تاثر سے	میں شعر سناتا ہوں لوگ آپ کو تکتے ہیں

یقیناً لوگ اماں کو تکتے اور ان کے شاعرانہ انداز میں رونے پر کچھ نے ماں سے پوچھا بھی ہو، کیا پتا؟ موجؔ میں پیدائشی خوبیاں ہیں، انکسار ہے، عجز ہے اور صداقت ہے۔ گفتار میں خلوص اور اپنائیت ہمیشہ سے ہے۔

شاعری کی ابتدا نو عمری سے ہی ہو گئی مگر یہ اپنے استاد حضرت خیال رام پوری کے حوالے ۱۹۵۸ء میں ہوئے۔ موجی آدمی ہیں لہٰذا موجؔ تخلص اپنایا۔ شاعری کے علاوہ نثر میں ریڈیو ڈرامے، فیچر اور چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے۔ فارسی اور اردو کے شعر و شاعری کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انہیں عروضیات پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ اس کے علاوہ سیرت اور تاریخِ اسلام سے بھی بہت دل چسپی ہے۔

وہ کہہ رہے تھے... ''بنیادی طور پر میں غزل کا شاعر ہوں۔ غزل کو اردو کی سب سے طاقتور صنف مانتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں اقبالؔ اور انیسؔ جیسے شعرا کو سرد ست مسترد کر رہا ہوں۔ میں نے خود ایک طویل مثنوی لکھی ہے اور کچھ آزاد اور پابند نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں بس ہو گئی ہیں، میں نے خود لکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی شعری خیال ہو وہ اپنا فارمیٹ (format سانچہ) خود لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مگر میں نے غزل ہی کو اظہار

خیال کا وسیلہ بنایا ہے"۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے بات ہوئی تو خفگی سے بولے..."اردو والوں کو اردو کے مستقبل کی فکر کیوں ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے کہ یہ زبان کسی ایک ملک یا کسی ایک جغرافیے میں مقید نہیں ہے۔ اس کے بولنے، پڑھنے اور سمجھنے والے دنیا کے ہر ہر گوشے میں موجود ہیں اور کسی نہ کسی وسیلے سے اردو کی ترویج وترقی کے لئے ہی کام کر رہے ہیں"۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا..."دنیا کی ہر زبان مسلسل تجرباتی عمل سے گزرتی رہی ہے اور گزرتی رہے گی۔ اردو کے ساتھ بھی یہ معاملہ فطری ہے۔ اب رہا نثری غزل یا نثری نظم کا سوال تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ لوگ جو پابند غزل یا نظم نہیں کہہ سکتے یا پھر ادب میں کسی طور پر اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں، انہوں نے نثری غزل اور نثری نظم کے تجربے کیئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان نام نہاد اصناف کو قبول عام کا درجہ حاصل نہیں ہوا ہے۔ ویسے بھی نثر کو نثر اور نظم کو نظم ہی کہا جاتا رہا ہے تو پھر یہ نثری نظم کیا معنی۔ اگر ہم اسے 'نثر پارہ' کہیں تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے"۔

مشاعروں کا اردو زبان وادب کی ترویج میں کیا کردار ہے؟ اس سوال کے جواب میں موج نے کہا..."جہاں تک مشاعروں کا معاملہ ہے تو اس ادارے نے اردو شعر وادب کو بے حد مقبول بنایا ہے۔ وہ لوگ بھی جو اردو سے ناواقف ہیں یا اسے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر 'اچھوت' سمجھتے ہیں، مشاعروں میں سن کر یا رٹ کر اپنی نجی محفلوں میں اور عوامی جلسوں میں شعر سنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام کس سطح کا ہوتا ہے۔ لیکن اردو دنیا کی پہلی زبان ہے جس کا شعری ادب عوام وخواص میں کہاوتوں کی طرح مثال کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ صرف مشاعروں کی دین ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعری نشستیں تخلیق کار کے ذہن کو جلا دینے میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ دراصل تخلیق کار کا عیب جو مشاعروں اور عوامی جلسوں میں اس کی پرفارمنس (performance کرتب/ جادوگری) کی وجہ سے کبھی کبھی چھپ جاتا ہے، نشستیں اُس کو نمایاں کرنے اور اس کی اصلاح میں معاون ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ دونوں اداروں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے"۔

وہ کہہ رہے تھے ..."اس میں دو رائے نہیں کہ یہ دور الکٹرانک میڈیا (electronic media برقیاتی ابلاغ وترسیل) کا دور ہے اور اس دور میں لکھے اور چھپے ہوئے لفظ کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ لکھا ہوا لفظ اس کی بنیاد بھی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ آج نہیں تو کل لکھے ہوئے لفظ کی بازیافت ضرور ہوگی۔ اس لئے ہمیں کتاب کے تحفظ اور اشاعت کے لئے کوشاں رہنا چاہئے"۔

تنقید کے حوالے سے گفتگو آگے بڑھی تو انہوں نے کہا..."جن زبانوں میں تنقید کے ذریعے ادب کی صحیح راہیں متعین کرنے کا کام ہوا ہے، ان زبانوں میں اعلیٰ ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں

کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن اردو کے ساتھ حالی اور محمد حسین آزاد کے زمانے ہی سے چشمک شروع ہوگئی تھی۔ ہمارے عہد تک آتے آتے تو عالم یہ ہے۔ ''من ترا شوہر بہ گویم تو مرا زوجہ بگو''۔ پہلے لوگ جدّت اور قدامت کے چکر میں ایک دوسرے کو رد کر رہے تھے۔ اب جدید اور مابعد جدید یا جدید تر کا علم اُٹھائے پھر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدوں کو ادب کی نئی سمتیں تلاش کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اور تنقید پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے بجائے کمی آرہی ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں سے اردو کا شعری اور نثری ادب یکسانیت کا شکار ہے اور چونکا دینے والی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہے''۔

موج رام پوری نے اپنی منصبی زندگی کا آغاز آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر کی حیثیت سے کیا تھا۔ انہوں نے براڈ کاسٹنگ کی ایک نسل کی تربیت کی ہے۔ آج بھی وہ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ انہوں نے تفصیل سے یوں بتایا... ''یہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ میں دفتر جانے کے لئے اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ ایک بڑی سی سیاہ کار میں سے میرے دوست، سردار جاوید خان ایڈوکیٹ برآمد ہوئے اور تقریباً دوڑتے ہوئے آکر مجھ سے کہنے لگے ...'مظفر صاحب، اُمراؤ جان ادا کے شہرت یافتہ ہدایت کار آئے ہیں۔ تم سے اپنی ایک ٹیلی فلم کا اسکرپٹ (script مسودہ) لکھوانا چاہتے ہیں۔ تم بغیر کچھ سوچے ہاں کر دینا۔ باقی باتیں میں تمہیں بعد میں سمجھادوں گا'۔ اتنے میں مظفر بھائی قریب آگئے اور انہوں نے اس بات کا اظہار کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اُن کے ساتھ اپنے دفتر آگیا اور پھر تفصیل سے گفتگو ہوئی۔

دراصل مظفر علی صاحب کو دہلی دوردرشن کی جانب سے 'خواجہ غریب نوازؒ کی حیات والا صفات' پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا آفر (offer پیش کش) ملا تھا۔ انہوں نے اسکرپٹ لکھنے کے لئے میرا انتخاب کیا کیونکہ جاوید صاحب نے ان سے خانقاہی تعلق کی بنا پر میری تعریف کر دی تھی۔ مظفر صاحب نے ایک دو انگریزی اور اردو کی کتابیں بھی مہیا کیں جن سے مجھے بہت مدد ملی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ تاکید بھی کی کہ مجوزہ اسکرپٹ منظوم اور مثنوی کے فارمیٹ میں ہونا چاہیئے۔ میں نے اردو کی مشہور مثنویاں 'زہر عشق' اور 'گلزار نسیم' بار بار پڑھیں تھیں مگر اس صنف میں کبھی کچھ کہنا تو درکنار، سوچا بھی نہیں تھا۔ فکر کرتے کئی روز گزر گئے لیکن ایک شعر بھی نہ ہوا۔ اُدھر مظفر صاحب اور جاوید صاحب کے تقاضے برابر جاری تھے۔ ایک رات سونے سے پہلے کچھ کہنے کی کوشش کی کہ اچانک کئی شعر ہوگئے۔ اور یہ سلسلہ ایسا چلا کہ سحر ہونے تک ستر بہتر شعر کہہ لیئے، جاوید خان بھی رات بھر سو نہ سکے۔ وہ میرے

نوٹ: موج رام پوری کی مثنوی'' مناقب خواجہ'' ہے جو انہوں نے خواجہ غریب نوازؒ کی حیات پر لکھی اور جس کی دستاویزی فلم بنی ہے۔ اور یہ مثنوی پھر کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق واقعات کا سلسلہ جن کے نتیجہ میں یہ مثنوی شہود میں آئی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے (سلطانہ مہر)

گھر پر ہی رکے ہوئے تھے۔ صبح بغیر ناشتہ کیئے، اشعار کی کاپی لے کر سیدھے مظفر صاحب کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اشعار پسند کیئے اور جلد ہی پوری اسکرپٹ کا مطالبہ کیا۔ دن بھر میں خدا نے بقیہ اشعار بھی مرحمت فرمادیئے۔ میرا یقین کامل ہے کہ نعت ومناقب کے شعر شاعر خودنہیں کہہ سکتا۔ وہ ان درباروں اور خانقاہوں سے ودیعت ہوتے ہیں جن سے اُن کی وابستگی ہو؛ ارادت وعقیدت سے دل سرشار ہو۔

مظفر صاحب نے فلم بنائی، جس میں ان کی انفرادی فن کارانہ صلاحیتوں کی جھلک نمایاں تھی۔ اُنہوں نے اس فلم کا نام 'سینہ بہ سینہ' رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اجمیر شریف میں غریب نوازؒ کے عرس کی تقریبات جاری تھیں۔ ۲۴ اور ۲۵/ جنوری کی درمیانی رات میں پہلی بار مذکور فلم کو دوردرشن نے ٹیلی کاسٹ کیا۔ جاوید خان کا مرکزی رول تھا۔ انہوں نے اس فلم میں ایک قلندر کا کردار نبھایا تھا۔ پورے اسکرپٹ کو اپنی سریلی آواز میں گا کر سنایا تھا۔ جاوید صاحب کے اس رول کو ناظرین اور ٹی وی کے ذمہ داروں نے بہت سراہا اور مظفر علی کو اُن کے انتخاب کی داد دی۔ یہ ہی وہ مختصر روداد ہے جو 'مثنوی مناقبِ خواجہؒ' کی تخلیق کا سبب بنی۔

مذکورہ مثنوی پر مبنی فلم کی تکمیل کے دوران ہی میرے کچھ دوستوں نے خاص طور پر جاوید خان، شکیل غوث، ضیا عنایتی اور شمیم امروہوی، اس کی اشاعت کے بارے میں اصرار بھی کیا تھا اور مفید مشوروں سے بھی نوازا تھا۔ ۱۹۹۲ء سے اب تک ایک لمبا عرصہ گزر گیا۔ کبھی اپنے ٹرانسفر کی الجھنیں، کبھی گھریلو مسائل اور کبھی بیرون ملک کے مشاعروں میں شرکت کی مصروفیات کے سبب میں اُسے وقت پر چھپوانے میں ناکام رہا۔ اب یہ چھوٹی سی کتاب مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ سارا معاملہ عقیدت کا ہے۔ جہاں تک میری محدود معلومات ہیں، اردو میں یہ تخلیق پہلی منظوم کوشش ہے''۔

موج کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''شہرِ وصال'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔

Mr. Syed Mohammad Ali Mauj,
963 B K S Marg., New Delhi, 110001, India

انتخابِ کلام

یہ جو ماحول اتنا بھاری ہے — سب سیاست کی سحر کاری ہے
صرف آزاد ہوگئے ہیں ہم — کوئی حق ہے نہ ذمہ داری ہے
میں چراغوں کی لو بڑھاتا ہوں — اب اندھیرو! تمہاری باری ہے
چہرگی چپ ہے، خط و خال خموش — آئینوں پر سکوت طاری ہے
ایک تقریر تھی کہ ختم ہوئی — خاموشی کا بیان جاری ہے
موج شعر و ادب کی دنیا میں — صرف غالب کی شہریاری ہے

صدا جب لوٹ کے آئی تو جانا
ہمارے درمیاں دیوار بھی ہے
مونا شہاب
۸/۱/۲۰۰۱

مونا شہاب

بالٹی مور، میری لینڈ، امریکہ

کمپیوٹر کی ایجاد نے تو کمال دکھایا ہی دکھایا، مگر کمال تو انہوں نے بھی دکھایا جنہوں نے ویب سائٹ (web site) کے ذریعے اردو زبان کے متعلق نہ صرف معلومات عام لوگوں تک پہنچائیں بلکہ ''اردو ڈکشنری'' بھی مہیا کردی۔ اور جس کا ویب سائٹ ہے http://www.urduseek.com
مونا شہاب کو آپ سے متعارف کرانے سے قبل یہ لکھنا یوں ضروری تھا کہ دیارِ غیر میں رہ کر مونا بھی اردو کی ترویج کے لئے بہت کام کر رہی ہیں۔ مونا کے ہمسفر اور شریک حیات شہاب قرنی مونا کے ساتھ ساتھ تعاون کرتے ہوئے بیوی کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے بلکہ مشورے بھی دیتے ہیں اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے انہیں سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مونا نے ۱۹۹۸ء میں واشنگٹن میں ایک ادبی تنظیم ''اقبال فاؤنڈیشن'' کی بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام مشاعروں کے علاوہ ادب کی عظیم شخصیات اقبالؒ، غالب اور حضرت امیر خسروؒ پر بھرپور پروگرام پیش کیئے۔ ۲۰۰۰ء میں مونا نے ''جشنِ امیر خسروؒ'' ڈرامائی شکل میں پیش کیا۔ اس میں تقریباً پینتیس (۳۵) آرٹسٹوں نے حصہ لیا۔ جن میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے امیر خسروؒ کی شاعری پر مبنی ڈرامائی تشکیل کے ذریعے اس دور کی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بھی پیش کیں۔ اب ان کا اگلا پروگرام

''جشنِ عمر خیام'' ہے جو موسیقی پر مبنی ڈرامہ ہوگا۔

امریکہ کی ریاست میری لینڈ میں رہنے والی مونا ۳۱/دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ جامعہ کراچی سے اسلامک ہسٹری میں ایم اے کیا۔ پانچ (۵) سال تک اس شعبے سے وابستہ رہیں اور اب شاعری کرتی ہیں۔ نیویارک کے اخبار ''عوام'' اور ''پاکستان پوسٹ'' کے لئے کالم، مضامین اور تقریبات کی رپورٹیں لکھتی ہیں۔ افسانے لکھتی ہیں۔ کئی معیاری ماہناموں میں ان کا کلام اور افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ میاں کی ملازمت کی وجہ سے دبئی اور ہانگ کانگ میں بھی خاصا وقت گزار چکی ہیں۔

مونا کے والد صحافی تھے اور شاعر بھی۔ والدہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھیں۔ گھر کا ماحول ادبی تھا لہٰذا ان کا کا رجحان بھی شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف بچپن سے ہی تھا۔ مگر انہوں نے کسی خاص مکتبۂ فکر سے استفادہ نہیں کیا۔ مونا کا یقین ہے کہ سب سے بڑا مکتبۂ فکر انسانیت ہے اور ''نظریہ حقوقِ انسانی''۔ اقبالؔ کی شاعری سے متاثر ہیں۔ مونا کہتی ہیں... ''سچا شعر جب ہی وارد ہوتا ہے جب قلم کار اپنی ذات کے حصار سے باہر نکلے اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دکھوں کو محسوس کرے، جیسے مونا نے محنت کش بچوں کے دکھ کو محسوس کیا اور 'ڈھول کے پھول' کے عنوان سے نظم تخلیق کی''۔ یہاں مونا کی مختصر مگر پُر اثر دو نظمیں ملاحظہ کیجئے۔ اظہارِ خیال کی قدرت ایسی ہے کہ اس آئینہ خانے میں اپنا آپ مختلف زاویوں میں ڈھلتا نظر آئے۔

میرا چہرہ

میرے چہرے میں رکھا ہی کیا ہے
نہ گلابی رنگت، نہ غزالی آنکھیں، نہ گھنیری پلکیں
پھر بھی آئینے میں اتنا پیار/ جانے کیوں مجھ کو لگا کرتا ہے
میرا سادہ سا یہ چہرہ جو میری/ میری ماں کے چہرے سے بہت ملتا ہے

دہلیز

میں اس دہلیز سے آگے/ اگر جاؤں بھی تو کیسے/ کہ میرا راستہ روکے
گلابی، کاسنی اور چمپئی/ پھولوں کا جھرمٹ ہے/ میں اس دہلیز سے باہر
اگر دیکھوں بھی تو اکثر/ مجھے راستہ نہیں ملتا

مونا کا کہنا ہے... ''ایک اچھے شعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ آسان فہم ہو اور شعر اس طرح دل میں اتر جائے کہ جیسے شاعر نے پڑھنے والے ہی کے لئے کہا ہو۔ آج کل بعض شعراء جدت کے چکر میں پڑ کر اچھے خاصے شعر کو مبہم کر دیتے ہیں اور بعض مشکل گوئی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ شعر سمجھنے کے لئے 'فرہنگِ آصفیہ' ساتھ رکھنا ضروری ہو جائے۔ بلاشبہ نئی اصطلاحات کا استعمال صحت مندانہ ہے لیکن وہ عام فہم بھی ہوں''۔

مونا آج کل اپنے شعری مجموعے کی تیاری میں مصروف ہیں جس کا نام ہے ''صدا جب لوٹ کر آئی''۔ انہوں نے بتایا کہ یہ نام اردو ادب کے ممتاز شاعر رضی اختر شوق مرحوم کا تجویز کردہ ہے۔ انہوں نے نیویارک کے ایک مشاعرے میں مونا کی غزل کا یہ شعر جب سنا

صدا جب لوٹ کر آئی تو جانا ہمارے درمیاں دیوار بھی ہے

تو کہنے لگے... "مونا بی بی! آپ کی کتاب کا نام تو آپ کے مصرعے میں موجود ہے"۔ اس کے چند ماہ بعد مونا کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے ان کے فرمان کے احترام میں اپنی کتاب کے لئے یہی نام اپنالیا۔

اپنے بارے میں وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کے والد صاحب اخبار "امروز" اور رسالہ "نقاد" سے وابستہ تھے۔ یوپی، انڈیا کے ایک علمی گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ مولانا احمد سعید، جن کو ہندوستان کی حکومت نے "عالمِ دین" کا خطاب دیا تھا، مونا کے والد کے سگے تایازاد تھے۔ مشہور صحافی انیس ہاشمی مونا کے پھوپا تھے۔ دہلی کے مشہور شاعر نسیم دہلوی ان کی والدہ کے سگے ماموں تھے اور والد فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ اکثر فارسی میں اشعار کہا کرتے تھے۔ اس ماحول میں مونا نے ہوش سنبھالا۔ دس (۱۰) سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ کالج کے زمانے میں باقاعدہ شاعری شروع کی۔ گورنمنٹ ویمن کالج، کراچی میں جب ایڈوانس اردو کا مضمون لیا تو انہیں سلمیٰ حقی (بیگم شان الحق حقی) اور وحیدہ نسیم جیسی اساتذہ میسر آئیں۔ کالج کی طرف سے کئی دوسرے کالجوں میں شاعری کے مقابلوں میں حصہ لیا اور انعامات بھی جیتے۔ ایک طرحی مشاعرے میں حمایت علی شاعر کے ہاتھوں بھی انعام لیا۔

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ ان کے خالو معروف صحافی اسد جعفری نے اپنا ذاتی ماہنامہ "سوسائٹی اور اسکرین" شائع کرنا شروع کیا تھا۔ مونا بڑے فخر سے کہتی ہیں... "میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، پروف ریڈنگ (proof reading) سے لے کر پیسٹنگ (pasting) تک۔ سات (۷) سال تک انہوں نے میری ٹریننگ (training) کی۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے صحافت سے دلچسپی ہے۔ وہاں میری ملاقات کئی معروف لکھنے والوں سے ہوئی۔ جن میں اے آر ممتاز، عارف شفیق، رعنا فاروقی، سلطانہ مہر، سلطانہ فخر، مسرت جبیں، صفیہ ملک، ساجدہ معراج وغیرہ شامل تھے۔ شعرا میں حمایت علی شاعر اور احمد فراز اکثر ان کے آفس ان سے ملنے آجاتے تھے۔ میری نوعمری کا زمانہ اس ماحول میں گزرا۔ صحافت سے دلچسپی تھی لیکن شاعری تو گویا زندگی تھی۔ ادبی رسالوں میں شاعری چھپتی رہی۔ ۱۹۷۷ء میں شادی کے بعد چند سال تک یہ سلسلہ التوا میں پڑا رہا۔ لیکن امریکہ آکر میں نے باقاعدہ مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا"۔

پھر بات غزل کی چلی تو مونا نے کہا... "میرا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن اچھے موضوعات مل جائیں تو نظمیں بھی کہہ لیتی ہوں"۔

مونا اردو رسم الخط کو برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ ادبی رسائل و کتب کی عدم مقبولیت کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا... "اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ ہاتھوں سے قلم اور کتاب چھین کر ہتھیار تھما دیئے گئے ہیں۔ آج ہم بچوں کو تحفے میں اچھی کتابیں کم اور پستول اور گن (gun) زیادہ دیتے ہیں۔ بقیہ ذہنی تھیراپی (therapy) کا کام ٹی وی اور فلمیں پورا کر رہی ہیں۔ اور اس زہر کا تریاق انہی ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ادیب و شاعر حضرات بھی گروہ بندی میں بٹنے کے بجائے اپنا اپنا کردار

ادا کریں تو حالات تبدیل ہو سکتے ہیں"۔

مونا اس بات سے بھی متفق ہیں ... "ادب اور شاعری اس کے خالق کے وجود اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہے۔ اور آج کی اور پاکستان کے حوالے سے جو شاعری ہو رہی ہے وہ انسانی حقوق کا پرچار کر رہی ہے لیکن بڑی شاعری کے لئے تحریک ضروری ہے۔ تحریک دینے کا عمل ابھی شروع نہیں ہوا۔ کچھ شعر و ادب کے کاروبار نے بھی شاعر کو صرف اسٹیج کا ڈرامائی کردار بنا دیا ہے۔ سب نہیں لیکن اکثر شعرا کا رویہ یہ ہے کہ اسٹیج پر اپنی شاعری سے عوام کو بے حسی کی نیند سے جگا تو دیتے ہیں لیکن اسٹیج سے اتر کر معاوضے کا لفافہ وصول کر کے کسی اور اسٹیج کی رونق بن جاتے ہیں، بالکل اسی فلمی ہیرو کی طرح جو ایک لوکیشن (location) سے دوسرے لوکیشن کے درمیان بھاگتا ہے۔ یوں دُہرا کردار اس کی شاعری کے امیج (image) کو برقرار نہیں رکھ پاتا۔ پھر بھی میں کہوں گی کہ صورت حال مایوس کن نہیں۔ امجد اسلام امجد، جون ایلیا، جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حمایت صاحب کی کتاب ہارون کی آواز ایک برقی لہر کے مانند ہے۔ کینیڈا اور امریکہ میں بھی اچھے شاعر ہیں جیسے عابد جعفری، تسنیم سید اور ڈاکٹر صبیحہ صبا۔ ان کی شاعری توانا ہے"۔

کچھ دیر مونا نے توقف کیا پھر بولیں... "یہ کہنا ادب کے ساتھ ناانصافی ہے کہ وہ آج بے معنی ہو گیا ہے اور لفظ سچ نہیں بولتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا ادیب اور شاعر اپنے قلم میں سیاہی کی جگہ خون استعمال کر رہا ہے۔ اپنے اردگرد پھیلا ہوا ہر منظر اُسے خون میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تقاضا وقت کا یہ تھا کہ رنگ داستاں بدلے	سیاہی سے نہیں خونِ جگر سے آج لکھی ہے

البتہ کہیں کہیں یہ بھی ہوا ہے:

یہ سچ ہے کہ سہتے رہے ہر جور و ستم بھی	یہ سچ ہے کہ سچائی کو اُٹھے ہیں عَلَم بھی
تو بیچ دیئے حرص کے ماروں نے قلم بھی	لیکن کبھی بازار میں جب دام بڑھے ہیں

"اس سے انکار نہیں کہ بڑی شاعری کے لئے وسیع تجربات اور مثبت فکر اور مکالمہ بہت ضروری ہے"، مونا نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے مزید کہا، "جس معاشرے میں ادب اور شاعر کی قیمت طے کی جائے تو وہاں ادب نہیں رہتا۔ لفظ کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں چند ادیب اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے یقیناً کام کر رہے ہیں اور شعرا بھی جیسے احمد فراز، افتخار عارف، پیرزادہ قاسم اور شان الحق حقی"۔

اردو زبان کی بقا کے لئے مونا کی تجویز ہے... "والدین احساسِ کمتری کی زنجیروں کے حلقے سے نکلیں۔ یہ عذاب صرف ہم برصغیر کے لوگوں پر آیا ہے کہ اپنی زبان بولتے ہوئے احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں ورنہ آپ دوسری اقوام کو دیکھیں وہ کیسے اپنی زبان کے ورثے کی حفاظت کرتے ہیں اس کے باوجود کہ دوسرے کی سرزمین پر بستے ہیں مگر انگریزی کے رعب سے آزاد ہیں"۔

مونا نے کچھ مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ایک بعنوان "جدید غزل اور نظم کا مکالمہ" اور دوسرا "بلقیس بانو عرف مس نیلی" بالترتیب ٹیلی کاسٹ ہوا اور اسٹیج پر کھیلا گیا۔ ان کا کہنا ہے ... "اپنا مذاق

ذرا نا ہموار ی کا کام ہے اور مزاح کی دنیا میں ایسے بڑی داروں کی کمی نہیں جن میں شوکت تھانوی اور شفیق الرحمن کا نام سرفہرست ہے“۔

Mrs. Mona Shahab,

3723 Fox Ford Stream Road, Nottingham, MD21236, USA

انتخابِ کلام

مجھے تن سے زیادہ اس کا من اچھا لگا تھا
کہ اس کی شخصیت کا بانکپن اچھا لگا تھا

وہ کیسا دیکھنے میں تھا برا تھا یا بھلا تھا
مجھے تو صرف اندازِ سخن اچھا لگا تھا

وہ سیدھی بات بھی کرتا تھا اکثر شاعری میں
مجھے اس کا یہی دیوانہ پن اچھا لگا تھا

زمانہ اس کے بارے میں فسانے کہہ رہا تھا
مگر مجھ کو تو اس کا ہر چلن اچھا لگا تھا

دھنک کے رنگ ہی بھاتے ہیں اکثر لڑکیوں کو
مجھے تو ایک سادہ پیرہن اچھا لگا تھا

بنے الفاظ انگارے تو اب حیران ہوں میں
کہ اس کے لہجے کا مجھ کو دھیما پن اچھا لگا تھا

میرے بالوں کی چاندی سے گریزاں آج ہے وہ
جسے کل میرا چاندی سا بدن اچھا لگا تھا

پرندہ لوٹ کے واپس قفس میں آ گیا ہے
جسے پھیلا ہوا نیلا گگن اچھا لگا تھا

٭٭٭

نیند جانے کس گلی میں کھو گئی
زندگی تھی رات، ہم نے کاٹ لی
ناصر خان ناصر 5/3/01

ناصرؔ خان ناصرؔ

نیواورلینز، لوزیانہ، امریکہ

ناصرؔ ادبی دنیا میں تو نووارد نہیں لیکن پی آر (پبلک ریلیشنز public relations تعلقات عامہ) کے گروں سے واقف نہیں۔ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ جسے دوست بنالیں اُسے بھرپور پیار اور تعاون دیتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور کالم نگار بھی۔ نیویارک کے اخبار ''پاکستان ایکسپریس'' میں باقاعدگی سے کالم لکھتے ہیں اور جب فرصت ملے دوسرے اخبارات میں بھی کالم اور مضامین لکھتے ہیں۔ ایک لڑکی نے ان کی ایک غزل لاس اینجلس کے ہفت روزہ ''پاکستان لنک'' میں پڑھی اور مجھ سے پوچھا کہ یہ شاعر کہاں ملیں گے؟ ناصرؔ اُس لڑکی سے ملے یا وہ لڑکی ناصرؔ سے ملی یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں مگر اُس غزل کے چند اشعار حاضر ہیں جنہیں پڑھ کر وہ لڑکی ناصرؔ کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جان جو نقد تجھ پہ دیتا ہے — وہ دلوں کا ادھار، کیا جانے
دل زمانہ شناس تھا لیکن — کیوں کیا اعتبار، کیا جانے
جو نہیں درد آشنا ناصرؔ — وہ مرا انتظار، کیا جانے

ناصرؔ کو میں نے پڑھا تھا۔ مگر ملاقات فروری ۲۰۰۱ء میں لاس اینجلس میں ہوئی جب وہ ایک تقریب میں

آئے تھے۔ ایک خوش شکل نوجوان جس کی مسکراہٹیں پھول کھلاتی تھیں، نہایت انکساری سے مجھ سے ملا اور بڑے پیار سے پنجابی لہجہ میں بولا۔ ''جی میں ناصر ہوں۔ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا''۔ گفتگو ہوتی رہی اور ناصر سے مل کر محسوس ہوا کہ اجنبی لوگوں کو بھی اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ صرف ناصر کے خلوص کا کرشمہ ہے۔

پھر ہم ''سخن ور پنجم'' کے لئے ناصر سے گفتگو کرنے بیٹھے تو بیٹھے ہی رہے۔ اس نے جب بھی مخاطب کیا بڑے ادب سے ''سلطانہ جی'' کہا، لہجہ پنجابی مگر خالص لکھنوی ادائیگی۔ کیونکہ ناصر کو حسرت رہی کہ کاش وہ دلّی یا لکھنؤ میں رہتے تو اُسی اندازِ گفتگو کو اپناتے۔ اس کے باوجود کہ گفتگو کرتے ہوئے ناصر کو قطعی احساسِ کمتری نہیں ہوتا۔ اُسے معلوم ہے کہ اردو بولنے والوں کا لہجہ جغرافیائی حالات کے تحت پرورش پاتا ہے۔ اور یہ صرف اردو کا مسئلہ نہیں۔ پیرس میں رہنے والوں کا تلفظ دساور کے رہنے والوں سے مختلف ہے۔ سوئٹ زرلینڈ، بلجیم یا کنیڈا کے رہنے والے دوسرے تلفظ سے بولتے ہیں گو کہ سب کی زبان ایک ہی ہے یعنی کہ فرانسیسی۔

جس دن ہم ناصر خان کو لے کر گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں تو وقت گزرتا چلا گیا۔ ناصر بتا رہے تھے کہ وہ ۱۵/ اگست ۱۹۵۶ء کے دن بھاولپور، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ناصر تخلص کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام آباد کی قائد اعظم یونیورسٹی سے بیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور بھاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیمسٹری کا دوسرا سال نامکمل چھوڑ دیا اور امریکہ آگئے۔ یہاں مسس سی پی اسٹیٹ (Mississippi State) یونیورسٹی سے پٹرولیم انجینیئر نگ کی ڈگری لی۔ پھر نیو اورلینز (New Orleans) کی ٹولین (Tulane) یونیورسٹی سے مزید ڈگریاں لیں۔ پڑھنے کا شوق اور طالب علم بنے رہنے کے جنون میں لوکل (local) اداروں سے کئی کورس مکمل کیئے۔ جیسے میکسم گورکی نے کہا ''ساری دنیا میری یونیورسٹی ہے'' ویسے ہی ناصر نے بھی پڑھنے کے ساتھ مقامی اسکولوں کے گفٹڈ (gifted) بچوں یعنی ذہنی اعتبار سے برتر بچوں کو سینئر لیول تک حساب پڑھایا گو خود دوستی اور محبتوں میں حساب کتاب کے قائل نہیں۔

باتیں کرتے ہوئے ناصر لمحے بھر کو رُکے اور مینا کماری کا ایک شعر سنایا۔

تم کیا کرو گے مجھ سے سُن کے مری کہانی   بے لطف زندگی کے حصے ہیں پھیکے پھیکے

ناصر کہہ رہے تھے، ''زندگی نے ہمیں بے طرح برتا اور بتایا اور پھر سیدھا چلنے کی کوئی راہ نہ بتائی۔ ہم نے مجسمے بھی بنائے، تصویریں پینٹ کیں، ماسکس (masks) بنائے، آرٹ کا کونسا میدان ہے جسے ہم نے اپنانے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ بھونڈی آواز میں گایا بھی۔ اب ادب کے میدان میں بری طرح کودے ہیں۔ دیکھیئے تقدیر کہاں لے جاتی ہے''؟

ناصر کی ادبی زندگی کا آغاز لڑکپن سے ہوا۔ بتاتے ہیں... ''کچی عمر سے ہی خالص ادبی

کتابیں پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ بچوں کی کہانیوں کی کتابیں زہر لگتی تھیں۔ ابا کی لائبریری سے نکال کر چوری چھپے ٹیگور کے افسانے، کرشن چندر، غالب، منٹو، حتیٰ کہ عصمت تک کو پڑھتے رہے۔ پہلا مجسمہ بارہ برس کی عمر میں گھر کے آنگن کی دیوار کے ایک طاق میں بنایا اور شعر بھی غالباً اسی عمر میں کہا۔ شعر تو یاد نہیں البتہ امی کی مار ابھی تک نہیں بھولے۔ مجسمے کا حشر بھی وہی ہوا جو ہماری اولین غزلوں کا، اور بعد میں جا کر خود ہماری زندگی کا۔ توڑ پھوڑ سے کچھ بھی نہ بچ سکا چونکہ ہماری طبیعت میں ٹھہراؤ ہے ہی نہیں۔ بلا کے ضدی، خود سے اپنے آپ کو منوانے کے لئے لکھنا اور کہنا شروع کیا۔ افسانے، انشائیے، کالم، غزلیں، نظمیں، ہائیکو، ماہیے، آزاد نظمیں سب اصناف میں طبع آزمائی کر ڈالی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے سب ہی اچھے معتبر رسالوں میں کلام شائع ہوتا رہا۔ یہاں ہجرت کی تو سب ہی کچھ وہیں رہ گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

خالی ہاتھ بیس (۲۰) ڈالر لے کر سفر شروع کیا تھا۔ اس جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے نظمیں، غزلیں اور افسانے تو کیا اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔ جان توڑ محنت کی۔ ہر طرح کے پاپڑ بیلے۔ تین تین ملازمتیں کر کے یونیورسٹی کے اخراجات پورے کیے۔ زندگی کو ہر طرح کا تاوان ادا کر کے اب کسی قابل ہوئے ہیں تو خواہش ادب نے 'پرانی یادیں اور قدیمی درد' دونوں کو جگا دیا۔ پندرہ برس کے وقفے کے بعد پھر سے لکھنا شروع کیا ہے۔ مگر اب نسیاں کا یہ عالم ہے کہ غریب ناصر کاظمی اور ناصر زیدی کی کہی سب ہی غزلیں اپنی لگتی ہیں مگر اپنی کہی غزل اپنی نہیں لگتی ہے۔ کوئی مجموعۂ کلام یا کتاب نہیں چھپوائی۔ گو کافی مواد موجود ہے مگر تساہل کہیئے یا خود سے بے اعتنائی یا مصروفیت، زیادہ تر خود اپنی تسلی کے لئے لکھتے ہیں، ناموری یا چھپوانے کا شوق غالب نہیں آیا"۔

ناصر کہتے ہیں..."یوں تو ہم نے غالب سے لے کر فیض صاحب، سب کو پڑھا مگر دل کی پوچھیئے تو جوش صاحب کی پُر جوش شاعری ہی من پسند رہی۔ ہم نے شان الحق حقی صاحب کو محض اس لئے پڑھنا گوارہ نہ کیا کہ انہوں نے ہمارے روحانی استادِ محترم سے کچھ اچھا سلوک روا نہ رکھا تھا۔ موجودہ شاعروں میں احمد فراز صاحب بلاشبہ ٹاپ (top) پر ہیں۔ امریکن شاعروں میں اپنے اساتذہ جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب، جناب ڈاکٹر جمال الدین جمال صاحب اور محترم خالد خواجہ صاحب پر جان دیتے ہیں۔ اگر سجدہ تعظیم کسی کو کرنا جائز ہوتا تو ہم اپنے اساتذہ کو ضرور سجدہ کرتے۔ افضال فردوس صاحب بھی ہمارے جگری دوست اور پسندیدہ شاعر ہیں۔ یہاں پنجابی زبان کی عظیم شاعرہ امرتا پریتم کا ذکر بہت ضروری ہے۔ ان کی زبان اور قلم سے نکلے ہر لفظ کی عزت الہامی کتابوں کی طرح کرتے ہیں۔

نثر میں قرۃ العین صاحبہ سے بڑا قلم کار کسی کو نہیں سمجھتے۔ ویسے عصمت چغتائی، کرشن چندر، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو اور منٹو بھی بہت پسند ہیں۔ عالمی اور روسی ادب میں دستوفسکی، ٹالسٹائی، ترگنیف، ٹیگور اور شرت چندر چٹرجی کو کافی پڑھا ہے"۔

اپنی ادبی زندگی سے متعلق دو دلچسپ واقعات ناصر خان نے سنائے۔ کہنے لگے ''پہلا واقعہ میری نوعمری کا ہے۔ ابھی میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنی بہنوں کو، جو بھاولپور کے مقامی کالج میں پڑھتی تھیں، ان کے کالج کے سالانہ شمارے 'خامۂ صحرا' کے لئے غزلیں اور نظمیں لکھ کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار آپا نے مٹھائی کا لالچ دے کر اسی شمارے کے لئے افسانہ لکھنے کے لئے مجبور کیا۔ ہم نے تازہ تازہ منٹو اور عصمت کو پڑھا تھا۔ لہٰذا ان ہی کی سی پھڑکتی زبان میں ادبی اور محترم گالیوں سے لبریز بالغ نظری سے مرصع نہایت رومانی قسم کا افسانہ لکھ مارا جس کا صحیح مفہوم غالباً خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ آپا بیچاری معصوم تھیں۔ انہوں نے پڑھے بنا اسے اپنے نام سے موسوم کر کے اپنی پروفیسر کو دے دیا جو ہماری بچپن کی بالغ نظری کی کسی طرح بھی متحمل نہ تھیں۔ انہیں ہمارا انداز بیان کسی پہلو خوش نہ آیا۔ انہوں نے آپا کو بھری کلاس میں کھڑا کر کے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے۔ گھر آ کر ان کا سارا نزلہ جو ہم پر گرا وہ ہم کبھی بھول ہی نہیں سکتے۔

دوسرا واقعہ ہمارے اسلام آباد ایف۔جی (F G) کالج کے زمانے کا ہے۔ اُن دنوں پاکستان نیشنل آرٹس کونسل کے فی البدیہہ افسانہ نگاری کا پہلا انعام جیتنے کے بعد آرٹس کونسل ہی کے مشاعرے کے انعامی مقابلے میں شرکت کو بھی جی چاہا۔ مگر مائیک پر آ کر اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے پڑھنے کی ہماری ہمت نہ تھی۔ بچپن ہی سے لکھتے ضرور تھے مگر پڑھتے نہیں تھے (ابھی تک اچھی طرح نہیں پڑھ پاتے، اسی لئے کبھی اپنا شمار پڑھے لکھوں میں نہیں کیا)۔ اس کا علاج یہ سوچا کہ اپنے نہایت جگری دوست امجد علی کو تیار کیا کہ وہ ناصر خان کے نام سے جا کر ہماری غزل پڑھ دے۔ اب امجد علی بھی بڑے کائیاں، وہاں آرٹس کونسل کے ہال (hall) میں جا کر بولے ...'یہاں تو میرے کئی جاننے والے بیٹھے ہیں تمہارے نام سے کیسے پڑھ سکتا ہوں'۔ قصہ مختصر، انہیں بڑی مشکل سے منایا کہ چلیں بے شک اپنے نام سے پڑھ دیں مگر کوئی انعام وغیرہ ملا تو ہمارا ہوگا۔

خیر منتظمین سے بھی کہہ دیا کہ ایف۔جی کالج کی طرف سے ناصر خان تو نہیں آ سکے البتہ امجد علی تشریف لے آئے ہیں۔ ادھر آرٹس کونسل کے بڑے سارے ہال کو بھرتا دیکھ کر امجد میاں کی سٹی بھی گم ہونا شروع ہوئی۔ عین اس وقت جب ان کا نام پکارا گیا تو صاف مکر گئے کہ بھئی میں تو نہیں جاتا کوئی غزل وزل پڑھنے۔ مجبوراً کرتا کیا نہ کرتا، خاکسار کو ہی جانا پڑا۔ کانپتی ٹانگوں اور لرزتی آواز کے ساتھ بے سری آواز میں غزل پڑھی۔ غزل چونکہ اچھی تھی، پہلا انعام مل ہی گیا۔ 'امجد علی' کے نام لکھا ہوا یہ پہلا انعام 'شاعری کی پہلی کتاب' ابھی تک میری لائبریری میں موجود ہے، کبھی بھولے سے کھول لوں تو بڑی ہنسی آتی ہے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جو امجد علی کے نام سے پڑھا تھا اور انعام جیتا تھا''۔

Mr. Nasir Khan Nasir,
536 Fair Field Ave., Gretna, L A 70056, USA

انتخابِ کلام

جنھیں زندگی کا بدل کہہ رہے تھے
وہی ہم کو لیکن اجل کہہ رہے تھے
وہی ہم سے نظریں ملاتے نہیں تھے
جنھیں دیکھ کر ہم غزل کہہ رہے تھے
کسی جھیل جیسی غزالی تھی آنکھیں
جنھیں لوگ سارے کنول کہہ رہے تھے
کٹا عمر بھر میں جدائی کا موسم
جسے کہنے والے تو پل کہہ رہے تھے
بہت آج چرچے ہوئے جس کے ناصر
یہی بات ہم بھی تو کل کہہ رہے تھے

٭

دل دریا ہو جاتا ہے
غم اتنا ہو جاتا ہے
تجھ سے باتیں کرتے کرتے
مجھ کو کیا ہو جاتا ہے
غم کی رات کے پھیلاؤ سے
دن چھوٹا ہو جاتا ہے
جس سے اس کی بات کروں
وہ اس کا ہو جاتا ہے
گاؤں چھوٹا ہوجائے تو
شہر بڑا ہو جاتا ہے
جب اس کی تعریف کروں
یار خدا ہو جاتا ہے
محفل جم جائے تو ناصر
تو تنہا ہو جاتا ہے

ہم بغیر تم کے مرے مگر ملے ہیں عمر گزرتی رہی
تم کیسے جیتے رہے اور میں کیسی مرتی رہی

نسیم اختر
28/11/003

نسیم اختر نسیم

برمنگھم، برطانیہ

ایک محفل میں چائے پیتے ہوئے ایک دانشور (بزعمِ خود) نے مجھ سے کہا،"برطانیہ میں اردو کی شاعرات ہی کتنی ہیں، میرا مطلب ہے جینوائن (genuine کھری) شاعرات دو ایک ہی ہیں"۔
"آپ برطانیہ کے لئے دکھی ہیں، میں تو کہتی ہوں کہ پوری دنیا میں دیکھا جائے تو مردوں کے مقابلے میں شاعرات کی گنتی دو ایک نہیں بلکہ ڈیڑھ کے برابر ہے۔ مگر کیا کیا جائے، گنتی کرنے والے بھی مرد ہیں...... بے چارے مرد، دانشور مرد" میں سوکھے منہ سے بولی۔ وہ شاید لہجے کا سوکھا پن محسوس کر گئے اور آگے بڑھ گئے، کسی اور سے شاید مشورہ کرنا ہوگا۔

بہت سے دانشور مردوں نے یہ ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ اور کوئی تخلیقی کام اپنے بس کا نہ پائیں تو تبصرے ہی کریں۔ کچھ ایسا ہی وطیرہ آج کل دانشور خواتین نے بھی اپنایا ہوا ہے۔ بلکہ یہ دستور تو ہر زمانے کا رہا ہوگا۔ ہمیں ضرورت نہ تھی کہ لوگوں کے قصے سنتے۔ اب جو فرصت ملی تو سنا اور پڑھا۔ ہندو پاک سے لے کر یہ وبا امریکہ اور برطانیہ (یورپ سمیت) تک آ پہنچی ہے۔

پھر مجھے نسیم اختر نسیم نے اپنی کتابیں پڑھنے کو دیں تو مجھے خوشی ہوئی کہ نسیم اختر کا شعری سفر جو اُن کے پہلے نعتیہ مجموعے "ابرِ رحمت" مطبوعہ جولائی ۱۹۹۷ء سے شروع ہوا تھا وہ ان کے اب دسویں

شعری مجموعے "مہتاب کا چھپنا یاد آیا" مطبوعہ ۲۰۰۳ء تک مسلسل جاری و ساری ہے۔ چھ سال میں دس کتابیں یعنی دس شعری مجموعوں کی فہرست کو دیکھ کر لوگوں کو حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ اپنے حوصلے کی بات ہے۔ ہماری ریحانہ قمر بھی زود گو شاعرہ ہیں۔ جب ان کے پے در پے چھ مجموعے شائع ہوئے تو لوگوں نے خصوصاً مردوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بے چاری عورتیں کئی کئی محاذوں پر کام کر رہی ہیں۔ گھر سنبھالتی ہیں، بچوں کی پرورش کرتی ہیں، روزگار کے حصول کے لئے محنت کرتی ہیں اور پیسے جمع کر کے اپنے کلام کا مجموعہ چھپواتی ہیں۔ اس پر بھی لوگ معترض ہوتے ہیں۔ وہ کیوں خود میں یہ ہنر پیدا نہیں کرتے۔ بد سلیقہ لوگ ہیں، عورتوں کا یہ سلیقہ انہیں کھٹکتا ہے۔

نسیم اختر نسیم کے کلام کے مجموعے "درد کا شہر" مطبوعہ ۲۰۰۰ء میں محترم احمد ندیم قاسمی نے اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے۔ "محترمہ نسیم اختر عرصہ دراز سے برمنگھم میں مقیم ہیں مگر غزل اس انداز سے کہتی ہیں جیسے وہ لاہور یا کراچی میں رہتی ہیں"۔ نسیم اختر مجھ سے کہا "سلطانہ بہن، میں ہر سال لاہور جاتی ہوں"۔ یوں وہ اپنی مٹی اور تہذیب سے جڑی ہوئی ہیں۔

کتاب میں ڈاکٹر حسن رضوی مرحوم کی یہ رائے بھی شامل ہے، "نسیم اختر وطن سے دور بہت دور اجنبی فضاؤں میں رہتے ہوئے شاعری کے نئے موسم تخلیق کیئے ہوئے ہیں۔ ان موسموں میں مٹی کی خوش بو کے علاوہ ہجر و وصال کی مہکاریں دلوں کی سرزمین کو متاثر کیئے بغیر نہیں رہتیں۔ نسیم اختر کی شاعری کا سب سے معتبر استعارہ محبت ہے"۔

نسیم کی مختلف کتابیں محترم حفیظ تائب، جناب سعد اللہ شاہ، ڈاکٹر سعادت سعید، جیلانی کامران، اظہر غوری، زاہد حسن، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور مرحوم عطا جالندھری جیسے نابغۂ روزگار دانشوروں کی حوصلہ افزا آرا سے آراستہ ہیں۔

اب ہم نسیم اختر نسیم سے ان کی کہانی ان کی زبانی سنتے ہیں۔ یہ ایک عورت کی جدوجہد کی کہانی ہے، گھریلو محاذ پر بھی اور ادبی محاذ پر بھی۔

نسیم اختر ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے دن پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے شہر وزیر آباد میں پیدا ہوئیں۔ جہلم میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی اور بعد میں نجی طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ زمانۂ طالب علمی میں مضامین لکھے۔ ایک مضمون "داعیٔ اسلام کا آخری دور" پر انہیں انعام بھی ملا۔ اسی زمانے میں شعر گوئی کی ابتدا ہوئی لیکن شادی کے بعد یہ سلسلہ مسدود ہو گیا۔ نسیم کو لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر سوچ پر تو پہرے بٹھائے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ سوچتی تھیں

سوچوں تو اس جہاں میں کوئی اپنا گھر نہیں پل بھر ٹھہر سکوں میں جہاں، کوئی در نہیں
اک گوشہ عافیت کا میسر نہیں مجھے تدبیر و جستجو بھی کوئی کارگر نہیں

پھر ۱۹۸۱ء میں انہیں پہلے پہل حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ نسیم کی زندگی پر دکھ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ دل برداشتہ رسول پاکؐ کے در پر فریاد کر رہی تھیں۔

آ گئی ہوں میں در پر ترے یا نبی — خالی ہاتھوں سے اب تو نہیں جاؤں گی
آج در پہ ترے میں ہوں سائل تری — تیرے آگے ہی دامن کو پھیلاؤں گی

اور پھر اللہ تعالیٰ نے نسیم کو اپنی رحمتوں سے نوازا۔ وہ بتدریج لکھتی رہیں۔ ان کے کلام میں برکت ہوئی۔ یوں "ابرِ رحمت"، "ادھورے سفر" اور "سنہرے خواب" کے بعد جو سلسلہ رُک گیا تھا پھر جاری ہوا۔ اور نسیم کے دیگر شعری مجموعے "چراغ دم"، "طاہرِ مدینہ" "وفاؤں کا مجرم"، "تجدید آرزو"، "یاداں دی خوش بو"، "درد کا اک شہر" اور "مہتاب کا چھپنا یاد آیا" کتابی شکل میں قارئین کے سامنے آئے۔

نسیم نے زیادہ تر نعتیں اور غزلیں کہی ہیں۔ نظم کی طرف رجحان نہیں ہے۔ نثری نظم کی وہ بالکل حامی نہیں۔ اردو رسم الخط کی تبدیلی کی بھی حامی نہیں۔ اردو ادب اور زبان کے مستقبل سے پُرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو اتنی سادہ اور میٹھی زبان ہے کہ ہم جیسے پنجابی بھی اس کے گرویدہ ہیں۔ پھر اردو کا مستقبل کیسے تاریک ہو سکتا ہے۔ اگر ہوگا بھی تو ان لوگوں کے ہاتھوں جو بچوں کو اردو پڑھانے لکھانے کے حق میں نہیں۔

نسیم کہ رہی تھیں کی ان کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہیں جو ان کے دل و دماغ پر نقش ہیں۔ اور ہر واقعہ کے ساتھ اللہ کے کرم نے ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔

انہوں نے بتایا جن دنوں وہ وکرج روڈ، کنگز ہیتھ، (Vicarge Road, King's Heath) میں رہتی تھیں، جنوبی برمنگھم میں ان کے دس فیشن بوتیک تھے جو "نیاز فیشن" کے نام سے مشہور تھے۔ یہ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۸۳ء کا واقعہ ہے۔ وہ گھر میں اکیلی تھیں۔ صبح کا وقت تھا کہ ساڑھے دس بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک جوان لڑکا چندہ مانگ رہا تھا۔ نسیم نے اس سے کہا کہ وہ وہیں ٹھہرے وہ اسے کچھ لا کر دیتی ہیں۔ انہوں نے دروازہ پوری طرح بھیڑا ابھی نہیں کہ وہ لڑکا انہیں دھکا دے کر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور لڑکا بھی اندر گھس آیا۔ دونوں نے نسیم کے ہاتھ مروڑے اور ان پر تشدد شروع کر دیا۔ یہ بہادر خاتون ان کا مقابلہ کرتی رہیں اور اللہ سے مدد مانگتی رہیں۔ ان لڑکوں کا مطالبہ تھا کہ وہ انہیں دس ہزار پونڈ دیں۔ ان میں سے ایک نے گھر کی چیزیں الٹنا پلٹنا شروع کر دیں۔ اس عرصے میں ان کی بڑی بیٹی اپنی چیک بک جو بھولے سے گھر میں رہ گئی تھی لینے واپس آ گئی اور اپنے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔ جواب نہ پا کر اس نے لیٹر بکس سے اندر جھانکا اور شک ہوا تو برابر والی پڑوسن کے گھر سے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ آواز سن کر لڑکوں نے نسیم کی شہ رگ دبا کر اُسے بے ہوش کر دیا اور پچھلا دروازہ توڑ کر بھاگ نکلے۔ اس ہاتھا پائی میں نسیم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ انہیں طبی امداد دی گئی اور پولیس کی تفتیش سے پتا چلا یہ سب نسیم کی دولت حاصل کرنے کے واسطے ان کے رشتہ داروں کی طویل منصوبہ بندی بسلسلہ نسیم کے قتل کا ایک حصہ تھا۔

نسیم کہتی ہیں، "آپ کو میری شاعری میں میرے دکھ، درد، کرب و عذاب جو میں نے ایک عورت ہونے کے ناطے جھیلے ہیں، ان کی چیخیں سنائی دیں گی۔ یہ میرے اشعار نہیں میری زندگی میں

ہونے والی وارداتوں کا اظہار ہے۔ یہ وہ دکھ ہیں جو میں کسی سے کہہ نہیں سکتی مگر شعر کے ذریعے کاغذ پر منتقل کرتی ہوں۔ میں نے بعد میں اپنی دولت ان لوگوں میں بانٹ دی اور خود قلندری کی زندگی گزارنی شروع کر دی جس سے مجھے سکون ملا۔ مگر وہ لوگ جو دولت کے لئے بے قرار تھے وہ پھر نادار ہو گئے۔ میرا ہی ایک شعر ہے۔

وہ اپنی موت مرا ہے وگرنہ میں نے نسیم ہزار حیلے کئے تھے اُسے بچانے کے

میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس جہاں میں عزت بخشی۔ میرے چمن کی پھلواری کو نکھارا سنوارا۔ اب میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہوں اور اپنے رب کی شکر گزار کہ وہ ہی عزت دینے والا ہے اور ذلت سے ہم کنار کرنا بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

Mrs. Nasim Akhtar Nasim,
70 Yardley Wood Road, Mosley, Birmingham, B13 9 JD, UK

انتخابِ کلام

افراتفری کا ہے عالم اس جہاں میں ان دنوں
چار سُو بیٹھے ہوئے ہیں ہم فغاں میں ان دنوں
ساری دنیا میں پریشانی ہے پھیلی اس طرح
خوف کا سا ہے سماں ہر ایک مکاں میں ان دنوں
کون جانے کس گھڑی کس پل میں کیا ہو جائے گا
جانتے ہیں سب نہیں کوئی اماں میں ان دنوں
ملتی رہتی ہے ہمیں اب ہر گھڑی ہر سمت سے
سب بتاتے ہیں خبر اپنی زباں میں ان دنوں
ماند ایسی پڑگئی ہے رونق بازار بھی
وحشتیں ہی بک رہی ہیں ہر دکاں میں ان دنوں
گیت گائے گی وہاں فاختہ کیسے نسیم
امن باقی رہ گیا ہے بس اماں میں ان دنوں

یہ اور بات ہے واں تک خبر نہیں پہنچی
وطن کی بات تو ہم بے دیار کرتے رہے

نسیم جلالوی
لکھنوی

نسیم جلالوی

ہیوسٹن، ٹیکساس، امریکہ

شہر ہیوسٹن میں خواتین کا مشاعرہ تھا۔ ہمیں نسرین جاوید زیدی نے بشیر آپا کی جانب سے مدعو کیا تھا۔ کئی خواتین نے معاونت کی تھی ان میں نسیم جلالوی ہمیں ایئر پورٹ پر لینے آئی تھیں۔ نسرین گاڑی میں منتظر تھیں۔ راستے میں نسیم سے بھی باتیں ہوئیں، برا شستہ لہجہ، بے حد ٹھہراؤ اور نرم گفتگو۔ مجھے نسیم کی شخصیت نے متاثر کیا۔ پھر میں نے نسیم کا کلام پڑھا۔ ان کے چند اشعار دیکھیے۔

زندگی کی راہ میں پیچ و خم تو آئے ہیں ‌ ‌ ‌ جن کے حوصلے کم ہیں وہی لڑکھڑائے ہیں

اور

چمن امید کا یوں نالہ زار کرتے رہے ‌ ‌ ‌ رہ خزاں میں تلاش بہار کرتے رہے

مشاعرے میں کئی خواتین نے اپنا کلام سنایا۔ نسرین زیدی نے بھی پڑھا مگر نسرین اپنا کلام اشاعت کے لئے نہیں دیتیں۔ وہ کہتی ہیں ابھی ان کے کلام کو اور پختگی کی ضرورت ہے۔

شہر ہیوسٹن کی خواتین کے حوصلے بلند ہیں۔ ان نامساعد حالات میں خواتین کا مشاعرہ کرنا معمولی کام نہ تھا۔ پھر انہوں نے ہمارے علاوہ نیو یارک سے حمیرا رحمن اور اوہایو سے شاہدہ حسن کو بھی بلایا تھا۔ ایک قیامت کی شاعرہ عشرت آفرین تو خود ہیوسٹن میں موجود تھیں۔ ہم دو دن ہیوسٹن میں

رہے اور تشنگی رہی کہ ہیوسٹن کی تمام شاعرات کا کلام نہ سن سکے۔

پھر میں نے نسیم کو سوال نامہ دیا اور کہا اب ذرا اپنے بارے میں بتاؤ۔ نسیم کہنے لگیں ... "ویسے تو میرا نام نسیم فاطمہ نقوی ہے لیکن نسیم تخلص کرتی ہوں اور ادبی دنیا میں میرا نام نسیم جلالوی ہے۔ جائے پیدائش یوپی، ضلع علی گڑھ اور قصبہ جلالی ہے۔ پیدائش جلالی کی ہے اس لئے اپنے نام کے ساتھ جلالوی لکھتی ہوں۔ والد مرحوم سید مصطفیٰ حسین وہاں جاگیردار تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال وہاں گزارنے کے بعد ہم لوگ مدھیہ پردیش میں آگئے۔ اور وہیں بھوپال یونیورسٹی سے میں نے زولوجی (zoology) میں ایم ایس سی (MSc) کیا۔ والدین کے انتقال کے بعد ہم لوگ (میں اور میری بہنیں) بھائی کے پاس، جوالہ آباد میں قیام پذیر تھے، آگئے۔ وہاں میں نے ایل ٹی (LT) کیا اور حمیدیہ گرلز کالج میں ڈیڑھ سال تک کیمسٹری اور بیالوجی کی لیکچرار رہی۔ ۱۹۷۷ء میں شادی کے بعد امریکہ آگئی۔ یہاں آکر ڈاٹا پروسیسنگ (Data processing) میں ایسوشیئیٹ ڈگری (Asso-ciate Degree) لی۔ بچوں کی تربیت میں کہیں فرق نہ آئے اس لئے ابھی تک کوئی نوکری نہیں کی۔ دو بچے، ایک بیٹی اور ایک بیٹا، یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور چھوٹی بیٹی ابھی اسکول میں ہے۔

والد مرحوم اردو، عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے اور شوقیہ طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ ان کا کچھ کلام رسالوں میں بھی چھپا۔ اس کے علاوہ بڑے بھائی بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے وہ لوگ چھٹیوں میں جب بھی گھر آتے تو ہم لوگوں میں بیت بازی کا مقابلہ ہوتا۔ اس طرح گھر میں ایک ادبی ماحول رہتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں میں نے کبھی سنجیدگی سے یہ نہیں سوچا کہ مجھے بھی ادب میں کوئی حصہ لینا ہے۔

۱۹۷۷ء میں جب ہیوسٹن (ٹیکساس) آئی تو دیکھا کہ میرے شوہر ڈاکٹر ظفر نقوی ادبی سرگرمیوں میں کافی مصروف ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر ریڈیو پروگرام 'جھنکار' اور 'سنگیت بہار' ڈیڑھ سال تک کیا۔ اسی دوران میں کچھ ڈرامے اور مانولاگ (monologue) ریڈیو کے لئے لکھے اور ان میں صداکاری بھی کی۔ اس کے علاوہ میرے شوہر شہر میں اور گھر پر ادبی نشستیں منعقد کرتے تھے۔ ظفر نے مجھ سے کہا کہ اگر میں خود طرح پر شعر نہ کہوں گی تو اوروں کو وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ یوں ان کے اصرار پر میں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ ۹/ جون ۱۹۷۷ء سے اب تک یہ طرحی مشاعرے تقریباً ہر دوسرے مہینے منعقد ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں نے کئی بین الاقوامی مشاعروں کا بھی انعقاد کیا جس میں بیرونی ملکوں سے متعدد شعرا نے حصہ لیا۔ ہمارے مشاعروں میں غزل، نظم، نعت اور قصیدوں پر طبع آزمائی کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ فرمائشی غزلیں اور سہرے وغیرہ لکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ابھی تک کلام شائع کرانے کا موقعہ نہیں ملا حالانکہ دوستوں کا بہت اصرار ہے۔ لیکن انشااللہ بہت جلد یہ کام بھی پایۂ تکمیل تک پہنچے گا۔ دل سے بات نکلتی ہے تو اثر رکھتی ہے، چنانچہ ایک مشاعرے میں میں نے ایک قطعہ پڑھا۔

وطن سے دور ہیں لیکن وطن ہمارا ہے　　　　اسی کی یاد سے دل کو بہت سہارا ہے
بلا رہا ہے وہ کچے مکان کا آنگن　　　　جہاں پہ ہم نے کبھی بچپنا گزارا ہے

اس مشاعرے میں وقفے کے دوران ایک خاتون آئیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگیں 'آپ کے کلام نے ہماری کتنی یادیں تازہ کردیں'۔ انہی باتوں سے ہمت افزائی ہوتی ہے اور خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ سب اُس کا کرم ہے"۔

نسیم کا کہنا ہے... "آج کل نثری نظم اور نثری غزل کے تجربات ہو رہے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ لیکن میری رائے میں جو لطف اور چیلنج غزل اور پابند نظم میں ہے وہ نثری نظم میں نہیں ہے۔ طبع آزمائی میں ردیف اور قافیے کی بندش سے جو خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے اس کا مقابلہ نثری نظم کبھی بھی نہیں کرسکتی"۔

اردو زبان کے مستقبل سے نسیم قطعی مایوس نہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں... "اس زبان میں جو شائستگی، مٹھاس اور جادو ہے وہ صرف اپنوں کو (ہم زبان) ہی نہیں غیروں کو بھی اپنی طرف راغب کرلیتی ہے اور یہ ہی وجہ ہے اس کی بقا کی۔ یہ زبان کسی ایک مذہب یا کسی ایک ملک کی زبان نہیں، بلکہ یہ ہر ایک ادب نواز کی زبان ہے۔ اسی لئے یہ ابھی تک زندہ ہے اور انشا اللہ آگے آنے والی نسلوں میں بھی زندہ رہے گی۔ لیکن اس کی بقا کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ بڑے افسوس کے ساتھ میں یہ ضرور کہوں گی کہ امریکہ اور انگلینڈ کو چھوڑیئے ہمارے پاکستان اور ہندوستان میں پلے بڑھے لوگ بھی اردو پڑھنے سے قاصر ہیں۔ وہ اردو زبان کو ہندی یا انگلش میں لکھ کر پڑھتے ہیں۔ لہٰذا اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی بالکل روادار نہیں ہوں"۔ نسیم کا مشورہ ہے... "ہمارے بچے اگر سائنس، حساب اور ٹیکنالوجی جیسی مشکل چیزوں پر عبور حاصل کرسکتے ہیں تو کیا اردو زبان نہیں سیکھ سکتے۔ اگر ہم لوگ ذرا سی محنت کریں تو اردو کا مستقبل ضرور روشن ہوگا۔ اس کے لئے صرف مشاعروں کا انعقاد ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں اپنی نئی نسل کو اردو سکھانے کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ آج کل کے بچے کمپیوٹر کے رسیا ہیں۔ کمپیوٹر پر اردو سیکھنے کے چھوٹے موٹے پروگرم بنائے جائیں جو آسان بھی ہوں اور دلچسپ بھی۔ اس طرح ہمارے بچے دھیرے دھیرے اردو سے روشناس بھی ہوں گے اور اسے سیکھنے میں دلچسپی بھی لیں گے۔ ہمارے زیادہ تر بچے قرآن شریف پڑھنا جانتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لئے جو عربی جانتے ہوں اردو سیکھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ میں اور میرے شوہر گزشتہ بیس (۲۰) سال سے محلے کے بچوں کو قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ ہم جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ اردو کی ترویج و بقا کا انحصار ہماری نئی نسل پر ہے اور ہماری کوششوں پر ہے۔ اس زبان میں وہ کشش ہے کہ غیروں نے اسے اپنایا ہے۔ اور یہی انوکھا پن لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے"۔

نسیم کہہ رہی تھیں اور میں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے... "اردو ادب کا دائرہ بڑا

وسیع ہے۔ نظم اور غزل دونوں ہی اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔ لیکن میں غزل کو زیادہ ترجیح دیتی ہوں کیونکہ غزل کا ہر ایک شعر ایک الگ موضوع پر ہوتا ہے اور ایک شعر میں پوری بات کہہ دینا یا پورا پیغام دے دینا ایک چیلنج ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی غزل صرف گل و بلبل یا حسن و عشق تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ آج کی غزل میں انسانی جذبات، فلسفہ، موجودہ دور کے حالات اور دیگر حالات کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ ہر شعر شاعر کے تخیلات کی پرواز کی ترجمانی کرتا ہے۔ غزل کے مقابلے میں نظم کا دائرہ اس معاملہ میں محدود ہے"۔

شاعری کے کسی خاص مکتبۂ فکر سے نسیم کا تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ مرزا غالبؔ اور قمر جلالوی کے کلام سے متاثر ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنا جداگانہ اسلوب برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا۔" یہ ۱۹۹۵ء کی بات ہے جب میں نے اور ظفر نے حج اور زیارات کا اردہ کیا۔ ہم نے اپنے ایک ملنے والے ٹریول ایجنٹ سے تقریباً دو ماہ پہلے ٹکٹ کا انتظام کرنے کے لئے کہا۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ دو ماہ ہونے کو آئے اور انہوں نے ٹکٹ بنا کر نہیں دیا۔ سارے قافلے حج کے لئے روانہ ہوگئے اور ہم دونوں ٹکٹ کا انتظار ہی کرتے رہے۔ ہم لوگوں کو بہت افسوس تھا کیونکہ حج پر جانے کا پورا ارادہ اور تیاری تھی۔ ان دنوں دل کی عجیب کیفیت تھی۔ بڑا صدمہ تھا۔ انہیں دنوں میں نے خواب میں خانۂ کعبہ دیکھا۔ آنکھ کھلی تو سوچا کہ یا اللہ کیا خواب میں ہی زیارت کرتی رہوں گی۔ اپنے شوہر سے اس خواب کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا زیارت کا تو اب سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ہاں اگر صرف حج پر جانا چاہیں تو کسی ٹریول ایجنٹ کے پاس دو ٹکٹ تو مل ہی جائیں گے کیونکہ آخری موقعہ پر کئی لوگ اپنا سفر کسی وجہ سے منسوخ کردیتے ہیں۔ زیارات انشااللہ پھر کرلیں گے۔ غرض انہوں نے دوسرے ٹریول ایجنٹ سے بات کی۔ فوراً ٹکٹ کا انتظام ہوگیا۔ رات کے گیارہ بجے وُہ گھر پر آکر ٹکٹ دے گئے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ اور دوسرے دن صبح ساڑھے دس بجے ہم لوگ حج کے لئے روانہ ہوگئے۔ نہ کسی قافلے کا ساتھ تھا نہ کسی کو وہاں جانتے تھے۔ نہ کوئی حج کا تجربہ تھا۔ یہاں سے ایک دو لوگوں کے ٹیلی فون نمبر لے کر گئے لیکن وہاں ان لوگوں سے بات نہ ہوسکی۔ بس اللہ کے بھروسے پر حج کر رہے تھے۔ جدہ ایئرپورٹ پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہمارا سامان جہاز میں نہیں ہے۔ اُدھر مدینہ جانے کے راستے بھی بند ہوگئے تھے۔ ہم لوگ اس امید میں کہ شاید مدینہ جانے کی اجازت مل جائے، جدہ ایرپورٹ پر چوبیس (۲۴) گھنٹے پڑے رہے۔ لیکن ناامیدی رہی۔ غرضیکہ ہم لوگ کافی پریشان تھے۔ لیکن یہ سب امتحانات اور چھوٹی چھوٹی آزمائشیں تھیں۔ ابھی ہم ایئرپورٹ پر ہی تھے کہ دوسرے جہاز سے ہمارا سامان آگیا۔ ایئرپورٹ پر تھوڑی تلاش کے بعد انگلینڈ سے آیا ہوا ایک قافلہ، جو سترہ (۱۷) سال سے برابر حج کے لئے آتا ہے، مل گیا۔ انہوں نے اپنے قافلے میں ہمیں جگہ دے دی اور اس کے بعد ہم نے اتنے آرام سے حج کیا کہ جو ہمارے شہر کے قافلے والوں کو (جنہوں نے مہینوں پہلے سے سارا انتظام کیا ہوا تھا) بھی نصیب نہ ہوا۔ حرم کے ساتھ ہوٹل

میں ٹھہرے۔ کھانے کا، رہنے کا، مکہ و مدینہ میں ٹھہرنے کا، غرضیکہ سارا انتظام قافلے والوں نے کیا اور ہمارے لئے یہ مبارک حج ایک عظیم یادگار بن کر رہ گیا۔ اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا"۔

ان کی ایک غزل جو طرحی مصرعے پر کہی گئی ہے انتخابِ کلام میں پیش ہے۔

Mrs. Naseem Jalalvi,
9874 Sageaspen, Houston, Texas, 77089, USA

انتخابِ کلام

چمن امید کا یوں لالہ زار کرتے رہے
"رہ خزاں میں تلاش بہار کرتے رہے"

نہ بدلی گردش دوراں، نہ ہم بدل پائے
نصیب میں جو ملا اس سے پیار کرتے رہے

یہ بے خودی ہے مری، یا ہے بے بسی میری
تجھے ہی کھو کے ترا انتظار کرتے رہے

پہنچ نہیں تھی ہماری جو آسمانوں پر
زمیں پہ رہ کے ستارے شمار کرتے رہے

یہ اور بات ہے واں تک خبر نہیں پہنچی
وطن کی بات تو ہم بے دیار کرتے رہے

جو ہم کو لوٹ کے بس تیرے پاس آنا تھا
بلا وجہ تری دنیا سے پیار کرتے رہے

اجالا ہونے پہ یہ راز کھل گیا ہم پر
وہ تھے ہمارے ہی سائے جو وار کرتے رہے

مثال بن گئے دنیا میں کربلا والے
جو اپنے فرض پہ جانیں نثار کرتے رہے

نسیم وقت نے مرہم لگا دیا لیکن
کچھ ایسے زخم تھے جو بے قرار کرتے رہے

میرا خلوص شک کی ترازو میں تول کر
نشترِ رگِ حیات میں جیسے چبھو دیا

نسیمہ کلثوم شیخ
۲۶ فروری ۲۰۰۳ء

نسیمہ کلثوم

شکاگو، امریکہ

نسیمہ کلثوم نے مجھے ۱۹۹۵ء میں بتایا تھا کہ وہ میر اور مومن کے کلام سے متاثر ہیں۔ ان کے مجموعے "نشاطِ غم" میں مرحوم شاعر جناب خواجہ ریاض الدین عطش نے سیموئل ٹیلر (Samule Taylor 1772-1834) کے مقولے "مصوری کی تخلیق میں موضوع زیادہ خود اس مصور کی تصویر ہوتی ہے جس نے تصویر کو تخلیق کیا ہے" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ شاعری میں بھی یہی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ نسیمہ کلثوم نے اپنی ذاتی زندگی کی دھڑکتی ہوئی نبض پر انگلیاں رکھ کر اپنی شاعری میں اپنی وارداتِ قلبی کے ہاتھوں اس کے داخلی جذبوں کا احساس و ادراک کیا ہے اور اسے ایسے شعری سانچے میں ڈھال کر اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

معروف افسانہ نگار محترم مظفر الدین فاروقی کا کہنا ہے... "نسیمہ غزل کی مخصوص زبان میں ایسے تخلیقی شہ پارے نکال لائی ہیں جو ادب میں زندہ و تابندہ رہنے والے ہیں"۔ جب کہ شکاگو کے مانے ہوئے شاعر نیاز گلبرگوی کا فرمانا ہے... "میر تقی میر کے بہتر (۷۲) نشتروں میں سے ایک نشترِ میر کے زمانے سے اب تک زبان زدِ خاص و عام کی حیثیت سے مشہور ہے۔

مصائب یوں تو تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

میر کے اور بھی مصائب تھے، جیسے ترکِ وطن یا معاشی مشکلات کے پہاڑ کاٹنا، مگر ان کے دل کا روگ ان کے سارے مصائب پر بھاری رہا۔ چنانچہ نسیمہ کی دونوں تصنیفات میر کی طرح نسیمہ کے دل کے روگ کی مظہر ہیں۔ جس طرح میر انیس نے ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا دعویٰ کیا تھا، نسیمہ نے واقعتا اس پر عمل کر کے اپنے کلام میں اس کا ثبوت فراہم کیا ہے''۔

اب ہم نے سوچا کہ براہِ راست نسیمہ سے پوچھیں کہ ان کے کلام میں اتنی یاسیت اور نا امیدی کیوں ہے؟ اس کے جواب میں نسیمہ نے ایک بزرگ اور معتبر شاعر جناب کلیم عاجز کی لکھی ہوئی رائے ہمارے سامنے رکھ دی۔ کلیم عاجز صاحب رقم طراز ہیں... ''نسیمہ صاحبہ سے میری ملاقات تین چار بار کی ہے اور وہ بھی مشاعروں میں۔ ہاں ایک بار میں اپنے ایک تبلیغی دوست پروفیسر معبود الحق صاحب کے ساتھ ان کے شکاگو کے نہایت مختصر فلیٹ میں گیا جو ایک عظیم اپارٹمنٹ بلڈنگ کی تیسری منزل پر ایک کمرے کا ہے، جس کے ایک کونے میں کچن ہے، ایک طرف باتھ روم ہے، ایک طرف دو تین کرسیوں کا صوفے والا ڈرائنگ روم ہے اور ایک طرف ان کا مختصر بیڈ ہے۔ اُسے میں چھپر کھٹ کہہ دوں۔ یہ کمرہ بارہ فٹ اور دس فٹ سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر اس مختصر کمرے کو انہوں نے ایسا سجا رکھا ہے، ایسا آراستہ کمرہ جس میں زندگی کی تمام ضروریات کا وافر سامان ہو۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور اس کمرے میں سب سے زیادہ قیمتی اور جاذبِ نظر خود کلثوم کی مسکراتی ہنستی، بے تکلف، متواضع، دردمند اور محبت دار ذات ہے جو خود ایک بہترین شاعری ہے۔ اور اس شاعری سے ایسی ایسی شاعری پیدا ہوسکتی ہے جو نسیمہ کلثوم کی ہے۔ اگر اس مختصر کمرے سے ایسے قرینے اور سلیقے سے سجے ہوئے سامان کو (جیسے کسی انگوٹھی کو بہترین رنگا رنگ جواہرات سے مرصع کر دیا جائے) ہٹا دیا جائے تو وہ مختصر کمرہ واقعی قبر جیسا خوفناک ہو جائے۔ اسی طرح نسیمہ کلثوم کی ذات سے ان کے جگمگاتے ہوئے کردار اور ان کی شاعری کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک قابلِ رحم، مسکین اور کمزور انسان نظر آنے لگیں گی۔ ان کا کردار ان کا حُسن ہے اور ان کی شاعری اس حسن کو سنوارنے کا نام ہے۔ دونوں جیتی جاگتی گاتی رقص کرتی زندگیاں ہیں۔ ان ہی دونوں زندگیوں کا نام نسیمہ کلثوم ہے۔ نسیمہ کی شاعری کی کونپل کہہ رہی ہے کہ بیج بہت اصلی، بہت خالص، بہت محفوظ اور بہت جاندار ہیں۔ یہ کم آبیاری کے باوجود اپنی اصلی نشو و نما کی قوت و توانائی سے ابھر رہی ہے۔ اس میں صناعی کا شائبہ بھی نہیں، کوشش اور آورد کا ہلکا پرتو بھی نہیں۔ یہ بہت معصوم شاعری ہے۔ بہت سچی بات، بہت بے تکلف بات، بہت بے بناوٹ بات، ایسی بات جو آنے والی باتوں کا پتا دے رہی ہو، ایسی بات جس کی تہہ میں بہت سی باتیں نظر آئیں اور جو لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیں، تلاش و جستجو کی دعوت دیں۔ میں نے کسی شاعر کے ابتدائی کلام میں ایسی خالص اور معصوم آواز نہیں سُنی۔

وہ ملائم پھوار باتوں کی وہ تسلی بھرے پیام کہاں
زندگی پھر ہو آشنائے بہار میں کہاں یہ خیالِ خام کہاں

اور

مانوس ہو چکا ہے غمِ زندگی سے دل   مجھ کو بلائے جان تھیں تنہائیاں کبھی"

محترم کلیم عاجز کا کہا آپ نے پڑھ لیا۔ اس سے زیادہ آراستہ تبصرہ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اب ذرا نسیمہ کی کہی باتیں بھی سنیں۔ نسیمہ بتا رہی تھیں..."میں ۷/دسمبر ۱۹۳۶ء کے دن قصبہ خورجہ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئی۔ بلند شہر کا پرانا نام "برن پور" تھا اور آج بھی وہاں سے تعلق رکھنے والے اپنے نام کے ساتھ "برنی" کا استعمال کرتے ہیں۔ خورجہ اپنی چند دوسری خصوصیات کے ساتھ پٹھانوں کی بستی ہونے کے لئے بھی مشہور ہے۔ میرا تعلق بھی خورجہ کے پٹھان خاندان سے ہے۔ میرے والد صاحب قبلہ مرحوم کا اسم گرامی علی احمد خان تھا۔ شاعری کا چسکا شاید خاندانی ہے۔ یوں تو میرے والد صاحب مرحوم بقول ان کے کچھ تک بندی کر لیتے تھے گو میرے خاندان میں کچھ اچھے شعرا بھی ہوئے لیکن انہوں نے اپنے کلام کو اپنے تک ہی محدود رکھا۔ اس لئے انہیں کوئی جان نہیں سکا۔ میرے نانا مرحوم قبلہ و کعبہ جناب نصر اللہ خان خویشگی اپنے دور کے معروف صوفی بزرگ عالم ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے اور قمر تخلص فرماتے تھے لیکن شاعری سے زیادہ دیگر علوم سے شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے علم طب، فلسفہ، تصوف، صرف و نحو و تاریخ و کن پر عربی، فارسی اور اردو میں ضخیم کتابیں تصنیف فرمائیں۔ غالباً ۱۸۵۳ء میں تذکرۂ شعرا "گلشن ہمیشہ بہار" کے نام سے تحریر فرمایا جس کی اشاعت ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔ مگر پھر وہ ایسا کم یاب و معدوم ہوا کہ اردو کی ادبی تاریخوں میں اس کے حوالے تک نہیں دیئے گئے۔ ۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی کاوشوں سے انجمن ترقی اردو، پاکستان نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ نانا صاحب قبلہ مرحوم کے ماموں قبلہ فتح خان صاحب مرحوم بھی اردو فارسی میں اسد تخلص کے ساتھ شاعری فرماتے تھے۔ ان کا اردو کا ایک شعر ہے۔

کیا ہوا اگر چشم نم سے خوں ٹپک کر رہ گیا   بادۂ گلگلوں کا ساغر تھا چھلک کر رہ گیا

قبلہ نانا صاحب مرحوم کے پوتے محمد اسمٰعیل خان صاحب مرحوم بھی شاعر تھے اور عالی تخلص فرماتے تھے۔ ویسے تو ہمارے خاندان میں بہت سے شاعر ہوئے، کہاں تک ذکر کروں مگر میرے رشتے کے ایک بھائی محمد یعقوب خان صاحب مرحوم کی صاحبزادی کے، جو میری بھابی بھی ہوتی ہیں، دو اشعار جو تقریباً ایک ہی مضمون کے ہیں مجھے بہت پسند ہیں ضرور تحریر کرنا چاہوں گی۔

ماجرا برہنہ پائی کا ہماری مجنوں   خار سے پوچھ کہ سب نوک زباں ہے اس کو

اور

مل کے خاروں سے وشتِ غربت میں   آبلے پھوٹ پھوٹ کر روئے

میرے بڑے بھائی ظفر احمد خان صاحب مرحوم بہ سلسلۂ ملازمت لکھنؤ میں قیام پزیر تھے۔ میری عمر شاید آٹھ (۸) سال کی تھی کہ میرے والدین بھی معہ اپنے باقی بچوں کے مستقل لکھنؤ جا بسے۔ لکھنؤ میں قبلہ علامہ نیاز فتح پوری ہمارے ہم محلہ تھے۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی شوکت جہاں مرحومہ جو میری ہم عمر تھیں عزیز سہیلی بن گئیں اور میرے والد قبلہ کے، جنہیں میں بابا کہتی تھے، قبلہ علامہ نیاز فتح پوری سے

دوستانہ مراسم ہوگئے۔ پھر یوں ہوا کہ قبلہ نیاز فتح پوری مرحوم کی خواہش پر شوکت مرحومہ کے ساتھ ان ہی کے گھر پر اوران ہی کی نگرانی میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میرا تقریباً سارا وقت وہیں گزرتا۔ پھر یہ یگانگت اس قدر بڑھی کہ میں ان کے خاندان کا ایک فرد بن گئی اور شوکت کی طرح میں ان کے ابا کو ابا اوراماں کو اماں کہنے لگی۔ ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی کی ہوئی۔ اردو ابا مرحوم خود پڑھاتے تھے، فارسی و عربی کے لئے استاد پڑھانے آتے تھے۔ اس طرح میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی کے امتحان میں ''دبیر ماہر'' کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا اردو ''اعلیٰ قابلیت'' پاس کیا۔ اور ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ سے پرائیوٹ میٹرک کیا۔

پیدائش کے وقت تو میرا نام نسیم بیگم رکھا گیا تھا۔ لکھنؤ آنے کے بعد ابا مرحوم (نیاز فتح پوری) نے نسیم کا نسیمہ کردیا۔ میری والدہ مرحومہ جن کا اسم گرامی ام کلثوم تھا، جب ان کی وفات ہوگئی تو بابا مرحوم نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے بیگم کو تبدیل کر کے کلثوم کردیا اوراس طرح میں نسیمہ کلثوم ہوگئی۔ خاندان والے اب بھی مجھے نسیم کے نام سے ہی پکارتے اور پہچانتے ہیں اور لکھنؤ والے نسیمہ کے نام سے۔ شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تو تخلص اختیار کرنا بھی ضروری تھا جو میں نے نسیم اختیار کیا۔ یہ میرا پہلا نام ہے یا یہ کہیئے کہ اصلی نام بھی تھا۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی۔ ابتدائی دو سال لاہور میں قیام رہا اور پھر مستقلاً کراچی آگئی۔ کچھ عرصے بعد پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ٹیچر زٹریننگ کے بعد بیس (۲۰) سال ''کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری اسکول کراچی'' میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

قبلہ نیاز فتح پوری صاحب کی معیت میں ادبی ماحول ملنے اوران کی تعلیم وتربیت کے سبب ادبی ذوق تو پیدا ہو ہی گیا تھا، جب کسی قابل ہوئی تو افسانہ نگاری وشاعری سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ابتدا میں کئی افسانے اور انشایئے تحریر کیئے جو کبھی شائع نہیں کرائے۔ دو چار جو لوگ خود ہی لے گئے اور شائع کردیئے وہ دوسری بات ہے۔ شاعری تسکینِ جذبات کا ذریعہ نظر آئی تو اس طرف طبیعت زیادہ راغب ہوئی۔ ۱۹۵۶ء سے کبھی کبھی شعر کہنا شروع کیئے۔ پھر میری خوش نصیبی کہ ایک بہت اچھی شاعرہ ثریا زیبا میرے ہمسائے میں آبسیں جن سے میری شناسائی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ثریا کے گھر اکثر مشاہیر شعراوادبا کا جانا آنا رہتا تھا مثلاً تابش دہلوی، شبنم رومانی، نظر امروہوی، کلیم عثمانی، اطہر نفیس، منظر ایوبی، نشاط لکھنوی، صائمہ خیری وغیرہ۔ اور جناب اعجاز الحق قدوسی، جنہیں ثریا ماموں کہتی تھیں، تقریباً روز ہی آتے تھے۔ اس ادبی وشاعرانہ ماحول میں میرے ذوق شعری کو مہمیز لگی۔ اس زمانے میں کراچی کے ہر مشاعرے میں ثریا کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ ثریا کا نہ صرف کلام بلکہ ترنم بھی بڑا پیارا تھا۔ ثریا ہر مشاعرے میں مجھے اپنے ساتھ لیجاتیں اور کئی مشاعروں میں مجھے بھی پڑھوایا۔ جب ان بڑے بڑے مشاعروں میں مجھے بعض اشعار پر داد بھی ملی تو میرا اعتماد اور حوصلے بلند ہوگئے۔ افسوس ثریا زیبا اب ایسے پردۂ گم نامی میں جا چھپی ہیں کہ کہیں ان کا نام بھی سنائی نہیں دیتا۔

میرا اکلوتا بیٹا، پرویز محمد خان بہ سلسلۂ تعلیم شکاگو امریکہ آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر ستائیس (۲۷) سال پاکستان میں گزارنے کے بعد میں بھی یہاں آبسی۔ میری عمر کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تینوں ملکوں میں اب تک تقریباً ایک سا عرصہ گزارا ہے۔ پاکستان میں جو عرصہ بیٹے کی جدائی میں گزارا تو تنہائی کے عذاب کو کم کرنے کے لئے ''گل رعنا کلب'' اور بیگم نورالصباح مرحومہ کی ''بزم عمل'' کی ممبری اختیار کر لی تھی۔ گل رعنا کلب میں سالانہ خواتین کے مشاعرے ہوتے تھے لیکن بزم عمل میں تقریباً ہر ماہ ہوتے تھے، جن میں جہاں تک مجھے یاد ہے محترمہ وحیدہ نسیم، محترمہ سعیدہ عروج مظہر، محترمہ میمونہ غزل، جنابہ اختر بیگانہ، جنابہ عطیہ اویس، جنابہ عزیز بدایونی، جنابہ سعیدہ ناز، جنابہ رحمت النساناز، صائمہ خیری وغیرہ شریک ہوتی تھیں اور گل رعنا کلب کے مشاعروں میں محترمہ بیگم صدیق علی خان بھی۔ گل رعنا کلب کی جانب سے تو ایک بار حیدرآباد سندھ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کا موقعہ بھی ملا۔ بزمِ عمل کی کچھ عرصہ نائب سکریٹری رہی ہوں۔

شکاگو میں قیام پزیر ہونے کے بعد بڑی پیاری پیاری ہستیوں سے تعلقات استوار ہوئے، جیسے جناب نیاز گلبرگوی، محترمی خواجہ ریاض الدین عطشؔ، جناب حسن چشتی، ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی۔ چند سال قبل پاکستان کی مایۂ ناز اور قابلِ فخر افسانہ نگار سے، جو اب ایک بہترین شاعرہ بھی ہیں یعنی رضیہ فصیح احمد، ملاقات ہوئی اور میری برسوں کی آرزو بر آئی۔ وہ ایک اچھی ادیبہ اور شاعرہ ہی نہیں اچھی انسان بھی ہیں۔

یہاں اکثر مشاعروں میں شرکت رہتی ہے اور اپنے مہربان دوستوں کی بدولت ڈیٹرائٹ، مشی گن، کولمبس (اوہائی او)، اسپرنگ فیلڈ (اوہائی او) اور سنسناٹی کے مشاعروں میں بھی شرکت رہی۔ میں شعر جب ہی کہتی ہوں جب موڈ بنتا ہے اس لئے کم ہی کہتی ہوں۔ میرا پہلا مجموعۂ کلام ''افکارِ نسیم'' میرے ایک عزیز و مہربان جناب احمد علی قدوائی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کرادیا۔ دوسرا مجموعہ ''نشاطِ غم'' کے نام سے میں نے خود شائع کرایا۔ یہ لاہور سے میرے بھانجے سلطان محمد خان کی کوششوں اور جناب سعود عثمانی کی نگرانی میں ان کی محبت اور مہربانی سے ''کتب نما پبلشرز'' نے شائع کیا۔ ''افکارِ نسیم'' کی رسم اجرا تو جنابہ غوثیہ سلطانہ نے منعقد کی تھی اور ''نشاطِ غم'' کی رسم اجرا بلقیس فاروقی بیگم ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی نے منعقد کی۔ ان پرخلوص ہستیوں کا میں شکریہ ادا کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ کیسے کیسے پیارے لوگ خداوند کریم نے مجھے عطا کیئے ہیں۔

یوں تو میں غزل کی شاعرہ ہوں مگر کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، ایک دو حمد اور کچھ نعتیں بھی۔ گو نعتیں کہتے ہوئے بڑا ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے یا حبِ رسول میں غرق ہو کر شرک کا کوئی پہلو نکل آئے۔ جدید اردو شاعری جسے آزاد شاعری کہا جاتا ہے وہ مجھے کچھ پسند نہیں بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی شعر نہیں کہہ سکتا تو آزاد شاعری کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن بعض شعرا کی آزاد نظمیں جن میں ربط اور نغمگی پائی جاتی ہے مجھے پسند ہیں۔ نثر کے انداز کی شاعری مجھے بالکل پسند

نہیں۔ وہ اگر انشائیے کے طور پر لکھ دی جائے تو شاید زیادہ بھلی معلوم ہو۔ آزاد شاعری میں یہ خوبی ہے کہ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں اسے بے تکلف اور بہ آسانی کہہ سکتے ہیں۔ تین چار نظمیں آزاد شاعری میں بھی کہہ گزری ہوں مگر میں اس کو پسند نہیں کرتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اپنی سہولت کے لئے ایسا کر بیٹھی۔

سلطانہ میں نے آپ سے بہت باتیں کر لیں اور آپ کے تقریباً تمام سوالوں کے جواب بھی دے دیئے۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔

بہت بہت شکریہ نسیمہ کلثوم صاحبہ۔ یقیناً آپ سے گفتگو بہت معلوماتی رہی۔

Mrs. Naseema Kulsoom,
6400 N Sheridon, # 318, Chicago, Illinois, 60626, USA

انتخابِ کلام

میں بچا کے پہلو نکل گئی ملے سنگِ راہ جہاں جہاں
مرے درد دل کے یہ قافلے رہ زیست پر ہیں رواں رواں

مجھے چاہتوں کی تلاش تھی یہی پیاس جیسے ازل سے تھی
وہ جو چاہتوں کے سراب تھے چلی اس طرف ہی کشاں کشاں

مرے دوستو مرے ساتھیو کہیں اس جہاں میں وفا بھی ہے
کہ کہیں بھی اس کو نہ پا سکی رہی ڈھونڈھتی میں کہاں کہاں

کروں بے نقاب دکھوں کو میں یہ گوارہ مجھ سے نہ ہو سکا
غمِ جاں ہو یا غمِ دوستاں رہا دل ہی دل میں تپاں تپاں

جو گزر رہی تھی نسیم پر اسے کوئی بھی نہ سمجھ سکا
کہ بس اک بہار نشاط تھی جو وجود سے تھی عیاں عیاں

ایک کشتی گشت کرتی کب رہے گی ارتضیٰ
سر اگر پانی سے نکلے گا جدا ہو جائے گا

ارتضیٰ نشاط
۸-۷-۹۹

ارتضیٰ نشاط

ممبئی، ہندوستان

روزنامہ "انقلاب، ممبئی" کے شعبۂ ادارت سے منسلک رہنے والے ارتضیٰ نشاط نے اب تک بارہ سو (۱۲۰۰) غزلیں، تین ہزار (۳۰۰۰) قطعات اور چھ سو (۶۰۰) ہزلیں کہی ہیں۔ ہزلیں اور قطعات باقاعدگی سے "انقلاب، ممبئی" میں شائع ہوتے رہے ہیں اور "الف نون" کے نام سے قطعات اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے اہم جرائد سطور اور ذہن جدید (دہلی)، جواز (مالیگاؤں)، نیا ورق، ترسیل، تشکیل اور ہم قلم (ممبئی) میں نہ صرف کلام شائع ہوتا رہا ہے بلکہ سطور، تشکیل اور نیا ورق نے ان پر "گوشے" بھی شائع کیے ہیں۔ انہوں نے عمر خیام کی ڈیڑھ سو (۱۵۰) رباعیات کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ سو کے قریب نثری نظمیں کہی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ان کا شعری مجموعہ "ریت کی رسّی" شائع ہوا ہے۔ مگر بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بارے میں کچھ پوچھا جائے تو فرماتے ہیں۔

تعارف کے لئے کوئی حوالہ میں نہیں رکھتا
خدا جانے مری بنیاد کس پتھر پہ رکھی ہے

سید ارتضیٰ نشاط ۲۸/جنوری ۱۹۳۷ء کو بدایوں میں سید رضا حسین شاہد بدایونی کے خانوادے میں پیدا ہوئے۔ سید ارتضیٰ حسین نام تجویز ہوا۔ نشاط تخلص اور قلمی نام ارتضیٰ نشاط اور اس کا مخفف الف نون اپنایا۔ مجھ میں اور ارتضیٰ بھائی میں ایک قدرِ مشترک ہے۔ میں نے اپنی نوعمری کے

زمانے میں روز نامہ ''انقلاب'' سے لکھنے کی ابتدا کی۔ میرا پہلا مضمون ''بچوں کے مستقبل کی تباہی کا ذمہ دار کون؟'' انقلاب میں شائع ہوا تھا، جس پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ''غنچہ، دہلی'' کے ایڈیٹر، جناب کامل دہلوی صاحب نے بڑا مثبت تبصرہ کیا تھا۔ اور ارتضیٰ نشاط بھی اسی اخبار ''انقلاب'' سے وابستہ ہیں۔

ارتضیٰ نشاط کو ایڈیٹر جناب ہارون رشید علیگ نے میری کتاب ''سخنور دوم'' دی تھی جس پر انہوں نے ''انقلاب'' میں تبصرہ شائع کیا تھا۔ میرا سوال نامہ عبدالاحد ساز کے توسط سے ملنے کے بعد انہوں نے میری سعی ناتمام کو سراہتے ہوئے مجھے لکھا... ''آپ کی ذات میں ایک بڑی عورت کے آثار موجود ہیں۔ اتنے بڑے کام کے ساتھ آپ شعرا اور اُدبا کو یاددہانی کے خطوط کے ذریعے کلام کرتی رہتی ہیں یہ اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں۔ خدا آپ کو مزید حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین! آپ ممبئی آئیں تو مجھے ضرور یاد فرمائیں۔ آپ سے ملنا ملاقات خضر و مسیحا سے کہیں بہتر ثابت ہوگا''۔

پھر اپنے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے ایک شعر بھی لکھا۔

جان پر کھیل کر بچالوں گا   جتنے غم ہیں حساب میں میرے

اس شعر میں جو رمز ہے، کنایہ ہے اسی میں ارتضیٰ نشاط کی شخصیت کا بھرپور عکس بھی موجود ہے۔ بے نیازی اور خود اپنی ذات سے بیگانگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور پھر یہ شعر ارتضیٰ نشاط کا نہ ہوتا تو ان کے لئے میرا ہوتا۔

شاعر بہت بڑا تھا مگر ارتضیٰ نشاط   کم بخت کس زبان میں آکر چلا گیا

شاعری میں نشاط کی فکر ایک جداگانہ روش کی حامل ہے۔ تعلقات عامہ کے بازار میں رہ کر بھی تعلقات عامہ کے ہنر سے ناواقف اس شخص سے جب میں نے خود اس کے بارے میں تفصیل جاننی چاہی تو انہوں نے یہ شعر گنگنا دیا۔

ختم ہونے کو ہے روداد نشاط   بس لفافے پر پتا باقی ہے

لیکن میں بھی کہاں چوکنے والی تھی۔ چناں چہ گفتگو شروع ہوگئی اور پھر تھوڑی دیر میں ارتضیٰ بتا رہے تھے کہ وہ تقریباً آٹھ نو سال کی عمر میں ہی ممبئی آگئے تھے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کیئے۔ شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد مرحوم شاہد بدایونی ایک معروف شاعر اور آل انڈیا ریڈیو ممبئی میں پروگرام پروڈیوسر کے عہدے پر فائز تھے۔ دادا مسکین حسین مسکین بدایونی ایک بلند پایہ شاعر، پردادا خادم حسین خادم بدایونی خواجہ مذاق بدایونی کے شاگرد تھے جو ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد اور ذوق بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ پھر بھلا ارتضیٰ حسین اس نعمت شعری سے کیسے محروم رہتے!

ارتضیٰ بتا رہے تھے... ''والد صاحب کے زمانے میں مشاعروں اور ریڈیو پروگراموں کی دھوم رہتی تھی۔ لہٰذا کم عمری میں ہی اُس زمانے کے مشاہیر شعرا کو نہ صرف دیکھنے بلکہ سننے اور سمجھنے کا موقعہ بھی

مجھے ملا۔ میری شاعری کی ابتدا بھی روایتی غزلوں سے ہوئی۔ بی اے تک آتے آتے تقریباً سات آٹھ سو غزلیں کہہ چکا تھا۔ پھر جدید شاعری نے متوجہ کیا۔ ظفر اقبال، شکیب جلالی اور باقی کی آوازوں نے چونکا دیا۔ اتفاق سے کالج کے ماحول میں ادبی چاشنی اس قدر گھل ہوئی تھی کہ چند دوستوں کے ساتھ ''اردو اسٹوڈنٹس فورم'' نامی ایک تنظیم قائم کی اور رفتہ رفتہ ایک بہت بڑا حلقہ اس تنظیم کے زیرِ اثر آ گیا۔ جس میں آج کے بیشتر شعرا اور نامور افسانہ نگار شامل تھے۔

اس تنظیم کے تحت باقاعدہ شعری، افسانوی اور تنقیدی نشستوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ پتا نہیں کس طرح ایک مرکزی حیثیت مجھے دے دی گئی۔ اور میں دن رات صرف اور صرف فکرِ شعر میں گم رہنے لگا۔ رات رات بھر جاگ کر شعر کہنا روزانہ کا معمول ہو گیا۔ گھریلو ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ عجیب پیغمبرانہ دور تھا۔ ممبئی کے ایک نیم سرکاری ادارے بی ای ایس ٹی میں کیشیئر (cashier) کی نوکری کر رہا تھا اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب فرصت ہی فرصت تھی۔ ذریعہ معاش کے لئے ایک چھوٹا سا تندور کرائے پر لے لیا جس سے گزر بسر ہو جاتی۔

پھر جب روایت سے جدیدیت کی طرف مڑا تو پچھلی تقریباً سات آٹھ سو غزلوں کو بیک قلم مسترد کر دیا۔ اس بیچ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب ایک عرصہ تک شعر نہیں کہے اور اساتذہ کے کلام کا مطالعہ، غور و فکر، اسلامی لٹریچر، فلسفہ، تصوف، قرآن و حدیث، انگریزی ادب، فارسی ادب اور پتا نہیں کیا کیا کچھ پڑھتا رہا۔ وقت اور حالات نے جھنجھلاہٹ، غصہ، محرومی، نفرت، بغاوت اور خود احتسابی جیسے احساسات سے دوچار کیا۔ جو ایک طرح اچھا ہوا کہ میری شاعری میں ایک کاٹ پیدا ہوتی چلی گئی۔ تلاش و جستجو نے جدید تر اردو غزل کے دل فریب اسلوب سے قریب کیا جس کی آبیاری میں میں نے عمر گزار دی۔ اب کوئی اسے میری کمزوری کہے یا کوتاہی، لیکن میں نے ہمیشہ چاہا کہ خاموشی اور راہبانہ ریاضت کے ساتھ اپنا کام کرتا رہوں اور بس۔ اسی لئے اپنے کلام کی اشاعت اور تعریف کے حصول کے لئے بھاگ دوڑ کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور اس طرح جو نقصان ہوا اس کا آج ایک شدید احساس بھی ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی احباب کا کرم تھا کہ انہوں نے زبردستی کر کے شعری مجموعہ 'ریت کی رتی' چھپوا دیا، سو چھپ گیا۔ آج اس کی ایک بھی جلد خود میرے اپنے ریکارڈ کے لئے میرے پاس نہیں ہے۔ کچھ مخلص دوستوں کے پاس البتہ وہ کتاب آج بھی محفوظ ہے۔ اب پھر ایک بار بچے اور دوست بضد ہیں۔ لہٰذا دوسری کتاب 'کہرام' کی اشاعت زیرِ غور ہے''۔

ارتضیٰ اور میں چائے پی رہے تھے۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر میں نے متوجہ کیا تو کہنے لگے... ''میں نے ہمیشہ جامد اصولوں سے ہٹ کر شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اپنے تئیں میں اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں۔ میں نے پیچیدگی اور ابہام سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ پیش پا افتادہ تراکیب سے اجتناب کیا ہے۔ ضرب الامثال اور کہاوتوں کو ان کے صحیح پس منظر میں اشعار میں برتنے کا تجربہ کیا ہے۔ خود پر ہنسنے سے کبھی پیچھے نہیں رہا۔ کہیں لطیف طنز کی

چٹکیاں بھری ہیں تو کبھی استہزا کے تازیانے بھی چلائے ہیں اور غلط العام فصیح کو بھی شعر میں جگہ دی ہے۔ عروضیوں کی طرح بنئی نہیں ہوں مگر عروض کی پابندی غزل کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ شعری اظہار کا بہترین وسیلہ غزل اور مختلف اصناف سخن بالخصوص نثری نظم میں اپنے خیالات کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں۔ اسی لئے میں نے خود بھی پابند، آزاد اور نثری نظمیں کہی ہیں۔ تاہم زبان کی غیر ضروری توڑ پھوڑ اور لایعنی تجربات سے گریز کیا ہے''۔

اب ارتضیٰ نشاط بڑی روانی سے گفتگو کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے...'' خدا میری شاعری کا ایک منفرد موضوع ہی نہیں بنیادی استعارہ بھی ہے جس کو وسیع تر کینوس میں مختلف ڈائی مینشن (dimentions ابعاد) میں برتنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے 'خدا' کو ایک قادر المطلق اور قادر الکلام فن کار اور خالق کے روپ میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ اسے اپنے قریب پایا ہے۔ مذہب میرے ہاں ایک وسیع تر ضابطۂ حیات اور اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں کٹر پن اور کٹھ ملائیت کو عام انسان کے حق میں مضر سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں شاعری میں تنوع کا قائل ہوں قدم قدم بدلتے رجحانات کو سوچ کی اکائی میں شامل کرتا رہتا ہوں۔ میں صرف مرض کی نشان دہی کرنے پر یقین نہیں رکھتا بلکہ اس کا علاج تجویز کرنے میں بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔ شاعری میں نعرہ بازی کا قائل نہیں۔ کسی 'ازم (ism عقیدہ یا مت)' یا نام نہاد جماعتی پروپگنڈے کو شاعری میں شامل کرنے کی مذمت کرتا ہوں۔ میرا عمل شاعری میں فرد اور اس کے فرضِ منصبی کی بازیافت کا عمل ہے۔ میں انسانی قدروں کی پامالی پر کڑھتا ہوں۔ فرد کو ایک صاف ستھرے سماج میں ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔

پچھلے بیس (۲۰) برسوں سے ممبئی کے مشہور و معروف اخبار روز نامہ 'انقلاب' سے وابستہ ہوں۔ اس وابستگی نے مجھے مزید وسیع طرز فکر عطا کیا ہے۔ 'انقلاب' کے وسیلے سے میں نے انتہائی بارک بینی سے اشیا کا مطالعہ کیا ہے۔ 'انقلاب' نے مجھے ہزلیات اور قطعات میں طبع آزمائی کے سنہرے مواقع بھی عطا کیئے ہیں۔ کئی برسوں تک 'میاں بھائی' کے فرضی نام سے روزانہ ایک ہزل اور ادھر کئی برسوں سے 'الف نون' کے نام سے مختلف موضوعات پر روزانہ ایک قطعہ میرے تجربات اور ریاضت میں مزید اضافے کا سبب بنے ہیں اور صحافت کے تجربے نے مزید وسیع النظری عطا کی ہے''۔

ارتضیٰ کی باتیں ایک شاندار تاریخ کی جھلکیاں پیش کر رہی تھیں اور میں پورے خلوص سے متوجہ تھی۔ وہ بتا رہے تھے...'' چند برسوں قبل ہندوستان کے مشہور غزل گلوکار محترم پنکج اُدھاس کے کیسٹ '' رباعیات'' کے لئے عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس بہانے بہت سنجیدگی سے خیام کے کلام کو سمجھنے کا نادر موقعہ ہاتھ آیا اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یورپ نے خیام کو صرف اور صرف خمریات کا شاعر اور شراب و عیش کوشی کا نمائندہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ نتیجتاً آج تک عمر خیام کو صرف اسی عینک سے دیکھنے کا رواج عام ہے۔ حیرت ہے کہ یاروں نے خیام کو صرف شباب اور شراب کا شاعر قرار دے دیا ہے اور کسی نے خیام کی حکمت، اس کے پاکیزہ اور فلسفیانہ

افکار و نظریات تک رسائی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ مغرب کے اس مفروضے کو لوگوں کے ذہنوں سے مٹایا جائے اور اسی خیال کے تحت میں نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ اب تک خیام کی ڈیڑھ سو (۱۵۰) رباعیات کا ترجمہ مندرجہ بالا اصولوں کی بنیاد پر کر چکا ہوں۔ میں نے عمر خیام کی رباعیوں کا صرف لفظی ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ ان رباعیوں کی روح کو اجاگر کیا ہے۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو خیام کے پورے کام کو مکمل کرنے کے ساتھ ہی منظر عام پر لانے کی آرزو ہے''۔

میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ارتضٰی اپنی آرزو کو ضرور پوری کریں۔ آمین! ارتضٰی کا یہ کام اردو ادب کے خزانے میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

مجھے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سناتے ہوئے ارتضٰی بولے... ''ممبئی حج کمیٹی کے آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کا میرا پہلا موقع تھا۔ ناظم مشاعرہ، جناب وسیم بریلوی نے نومشق جان کر توجہ نہیں دی۔ گراؤنڈ میں بیٹھے دوستوں نے غل مچانا اور پرچے بھیجنا شروع کیئے۔ اُس ستم ظریف اناؤنسر نے بھی ایک خوب صورت اور شوخ آواز شاعرہ برکھارانی کے بعد، جو واقعی اسم با مسمٰی تھیں اور مشاعرہ لوٹ چکی تھیں، مجھے پکارا۔ اتفاقاً بیٹھے بیٹھے ایک فی البدیہہ شعر اُسی غزل میں ہوگیا جو میں نے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے منتخب کی تھی۔ اب جو مائک پر آیا تو سامعین نے بھی سننے سے پہلے ہی میری ہنسی اُڑائی۔ تاہم ذرا غبار تھا تو میں نے مطلع اور ایک شعر سنایا۔

دیکھئے اور ابھی سامنے آتا کیا ہے آئینہ دیکھنے والوں کو دکھاتا کیا ہے
ہم کو معلوم ہے پانی پہ کھڑی ہے دنیا ڈوبنا سب کا مقدر ہے ڈرتا کیا ہے

کچھ ماحول بنا۔ اب میں نے وہ شعر، جو وہاں بیٹھے بیٹھے کہا تھا، سنایا۔

شاعری ہے کوئی نوشاد کا میوزک تو نہیں شعر اچھا ہے تو پھر گا کے سناتا کیا ہے

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ گویا ایک قیامت آگئی۔ سامعین نے داد و تحسین کے وہ نعرے بلند کیئے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ تقریباً پانچ (۵) منٹ تک تالیوں کا شور نہیں تھما۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مندرجہ بالا شعر ترنم باز شاعروں کے لئے اچھا خاصا درد سر بن چکا ہے''۔

یہ واقعہ سن کر میں بھی خوب محظوظ ہوئی۔ چائے کا دوسرا دور چلا اور میں نے ان سے اردو زبان کے حوالے سے بات کی۔ ارتضٰی کہنے لگے... ''اعداد و شمار کے لحاظ سے اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہوسکتی ہے لیکن مشاعروں کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے کیونکہ اس میں غزل جیسی صنفِ سخن موجود ہے۔ اور سب ہی جانتے ہیں کہ شاعری کو میر نے سخن کا پردہ کہا ہے اور یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ پردہ فن کار اذہان کے یہاں مکمل فن بن جاتا ہے۔ یہ فن دو طرح کی کیفیات اور موڈ پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک موڈ غور و خوص، ٹھہراؤ اور سنجیدگی کا متقاضی ہوتا ہے اور دوسری کیفیت وارداتِ قلبی کو من و عن جس طرح وہ اُترتی ہیں، پیش کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس کیفیت کو میں نظم یا نثری نظم (یا اور جو کچھ ہے) کہتا ہوں اور اول الذکر کیفیت کو غزل کیونکہ میں اکثر سوچتا ہوا پایا جاتا ہوں اس لئے غزلیں زیادہ

کہتا ہوں اور جب اچانک ہونٹ ہلنے لگتے ہیں اور قلم کاغذ پر چلنے لگتا ہے تو نظم بھی ہو جاتی ہے، کہیں کہیں مقفیٰ، کہیں آزاد اور کوئی کوئی جملہ خالص نثر میں وجود میں آ ہی جاتا ہے، اندرونی آہنگ سے منسلک۔ اگر اسی لئے اسے نثری نظم کہا گیا ہے تو قدرے درست ہے"۔

میں نے پوچھا... "آج کے دور میں مشاعرے افادیت کا باعث ہیں یا نقصان کا"؟

ارتضیٰ نے جواب میں کہا... "مشاعرے اپنی روایتی تہذیب کھوتے جا رہے ہیں۔ آج منتظمینِ مشاعرہ نے مشاعروں کو ضرورت سے زیادہ کمرشیل (commercial کاروباری) اور تفریح کا گلیمرائزڈ (glamourised سحر آفریں) ذریعہ بنا دیا ہے۔ آج منہ مانگی شرطوں پر شعرا مشاعروں کے لئے ہامی بھرتے ہیں اور پھر مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بھی وہی چند نام نہاد گلے باز شعرا رہ گئے ہیں۔ نئے شاعروں کو اول تو بلایا نہیں جاتا اور اگر کوئی موقع دے بھی دیتا ہے تو وہ اپنی ناپختہ اور غیر موثر غزلوں کے باعث اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادب کی تخلیق میں مشاعروں کا کوئی رَول (role حصہ) نہیں رہا۔ تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ لیکن اب ایسی نشستیں بھی کم کم ہی ہوتی ہیں"۔

اردو کے حوالے سے کیا الیکٹرونک میڈیا (electronic media) کی وجہ سے پرنٹ میڈیا (print media) کو نقصان پہنچا ہے؟ کے جواب میں نشاط نے کہا... "چونکہ میں خود پرنٹ میڈیا سے جڑا ہوا ہوں اس لئے بظاہر تو ایسا نہیں لگتا کہ الیکٹرونک میڈیا کتابوں کی اشاعت اور مطالعہ پر حاوی ہوا ہے۔ اخبار کے دفتر میں آئے دن لوگ اپنی کتابیں لے کر تبصرے کے لئے آتے رہتے ہیں اور ان میں ہر طرح کی کتابیں ہوتی ہیں۔ ادھر ہندوستان کی ہر ریاست میں ریاستی اردو اکادمیاں قائم ہو چکی ہیں جو بڑی حد تک کتابوں کی اشاعت میں مدد کرتی ہیں۔ معاملہ صرف کتابوں کی نکاسی اور ان کی قیمتِ خرید پر آ کر رک جاتا ہے۔ اس ضمن میں لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ادھر پچھلے ایک برس سے ہندوستان میں اردو میلوں کا انعقاد ہو رہا ہے۔ یہ ایک خوش آئند اقدام ہے۔ اس کی تقلید ہونی چاہئے"۔

تنقید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ارتضیٰ کہہ رہے تھے... "اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانے تک تنقید نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں نمایاں رَول ادا کیا ہے۔ پچھلے پچاس (۵۰) برسوں میں ترقی پسند ادب کی مقبولیت کا انحصار بیشتر تنقیدی تحریروں پر ہی رہا ہے۔ لیکن فی زمانہ تنقید کا رَول جانبدارانہ (biased) ہو گیا ہے۔ یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ ترقی پسند نقادوں نے جدید شاعری کو منہ نہیں لگایا۔ ایک منصوبہ بند پلان کے تحت نئے شاعروں کو نظر انداز کیا گیا۔ بہت بڑا کام شمس الرحمن فاروقی نے اپنے رسالے 'شب خون' کے ذریعہ کیا۔ وارث علوی نے بھی نئے شاعروں کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا لیکن فاروقی چند ناموں پر انحصار کر کے رہ گئے اور وارث اپنی طول طویل تحریروں میں کھو گئے۔ آج ایک نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔ ایک سروے (survey)، ایک جائزہ، ایک بھرپور تنقیدی ماحول اور ایک ہول سم رائٹ اپ (whole-some write up) ایک

خوشگوار تنقیبی منشور) کی ضرورت ہے۔ نئے لکھنے والوں کے متعلق انہوں نے مایوسی ظاہر کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ نئے لکھنے والوں میں راہبانہ ریاضت اور خاموش لگن مفقود ہے۔ لیکن میں پھر بھی مایوس نہیں کیونکہ میرے نزدیک وقت سے بڑا کوئی مکتبِ فکر نہیں۔ خود میری شاعری نے وقت سے اشارے اخذ کیئے ہیں۔

Mr. Irteza Nishat,
Siddiqi Baugh, A/2, Flat No. 301, 3rd Floor, Nr. Qismat Bakery,
Qismat Colony, Kausa Mumbra, Thane, 4000612, India

انتخابِ کلام

زندگی ڈوبتی نبضوں کی صدا لگتی ہے
کوئی رد کی ہوئی مخصوص دعا لگتی ہے
پیٹ کی آگ بھی لگتی ہے تو کیا لگتی ہے
نیند بھی سو کے جو اُٹھتا ہوں غذا لگتی ہے
جیسے ہر شخص کوئی جرم کیئے بیٹھا ہو
گھر میں گھستے ہی عجب گھر کی فضا لگتی ہے
آیئے، آج اسی سوچ کو پختہ کرلیں
بے حسی حد سے گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے
سب سے دلچسپ یہی غم ہے مری بستی کا
موت پس ماندہ علاقے میں دوا لگتی ہے
نور سا راستہ چلتا ہے جلو میں اس کے
کیا خبر جب وہ گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے
خوب قرآن کا انداز چرایا ہے نشاط
بات اس ڈھب سے کہی ہے کہ خدا لگتی ہے

سفید ہوتا ہے شیشہ بھی اور پانی بھی
بھرو نہ اتنا کہ خالی گلاس لگنے لگے

نظیر باقری

نظیر باقری

مراد آباد، ہندوستان

نظیر باقری کے کلام کا مجموعہ ''اعتماد'' جب میرے ہاتھوں میں آیا اور جس وقت میں نے پڑھنا شروع کیا تو ان کے کلام کے سحر نے گھڑی کی سوئیوں کو جیسے تھام لیا ہو۔ دو گھنٹے کب گزر گئے محسوس نہ ہوا۔ ہر غزل میں جیسے الفاظ کے خوب صورت موتی پروئے گئے ہوں اور مالا تھی کہ زنجیر بنتی چلی جارہی تھی۔ یہ ایک شعر تو مدتوں نہیں بھلایا گیا۔

چڑھتے سورج سے کبھی آنکھ ملایا نہ کرو
دیر تک پھر تمہیں کچھ بھی نہ دکھائی دے گا

اس کے ساتھ عکسِ تحریر کے لئے لکھا ہوا نظیر کا شعر ملاحظہ کریں اور انتخاب کلام میں نظیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل بھی۔

یہ تو خدا کا عطیہ بے بہا ہے جو نظیر کو عطا ہوا ہے۔ کتاب میں کسی کا دیباچہ نہیں۔ اس قلندر شاعر نے خود ہی اپنے قارئین کو مخاطب کر کے لکھا ہے... ''میں نظیر باقری اپنے اس 'اعتماد' کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، سوچا ہے اس کو اپنے بساط بھر علم، زبان و بیان کے اعتبار سے نظم کرنے کی سعی کی ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ داد و تحسین سے نوازیں یا بے داد رکھیں''۔

نظیر باقری سے جب وہ شکاگو آئے تو فون پر گفتگو ہوئی۔ میں نے انہیں ''سخنور پنجم'' میں

شرکت کی دعوت دی۔ نظیر نے میرے کہے کی لاج رکھی اور بڑے خلوص، پیار اور عقیدت سے ان سوالوں کے جواب دیئے جو میں نے کیئے۔ ان جوابات کو پڑھ کر میری طبیعت شگفتہ ہوئی۔ یقیناً یہ آپ کی معلومات میں بھی اضافے کا باعث ہوں گے۔ نظیر کی سوچ میں گہرائی ہے۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ نظیر میرٹھ کے علم بردار اور تصور حسین زیدی کے حلقۂ خوشہ چیں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا یہ شعر فکر کی کئی تہیں کھولتا ہے اور روشنی پھوٹتی چلی آتی ہے۔

تجھے یہ وہم مجھے پیاس مار ڈالے گی مجھے یہ فکر کہ دریا نہ سوکھ جائیں ترے

تو آیئے نظیر باقری کا خط پڑھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

سلطانہ آپا۔ آداب و نیاز

مزاج پرسی کے بعد پہلے اُس قرض کی ادائیگی کرتے چلیں جو آپ نے اردو کی خدمت کے طور پر ایک خزانہ ہمیں بخشا ہے وہ بھی ایسے ماحول میں جس میں اردو پڑھنے والوں کا فقدان ہے اور جو پڑھنے والے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہیں جو خرید کر پڑھنے کے قائل نہیں۔ اس ناقدری اور احسان فراموشی کے دور میں آپ نے جو کتابیں چھاپی ہیں، ممکن ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُن پر خرچ کیا ہوا پیسہ واپس مل جائے، مگر جو محنت اور مشقت اُس کے لئے آپ نے کی ہے اُس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ ہم بھی صرف چند جملے لکھ کر یا بول کر آپ کی ستائش کر کے لفظی یا صوتی اعتبار سے اس کی بصارتی یا سماعتی اُجرت ادا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آپ کی شان میں ایک مضمون یا ایک قصیدہ آپ کے نام لکھ سکتے ہیں، وہ بھی اگر خدا نے توفیق دی۔ ورنہ؟ کم ظرف ہیں تو اس کی بھی ضرورت نہیں، باظرف ہیں تو اس اخلاقی فریضے کے علاوہ کچھ ادا نہیں کر سکتے۔ اگر اس سے زیادہ کچھ اہم اور باعث تسلی کوئی چیز ہے تو وہ ہے بارگاہ الٰہی میں آپ کی سلامتی کی دعا، تاکہ وہ شجر ہمیشہ پھولتا پھلتا رہے جس پر آپ دنیائے ادب کے تمام پھولوں کو سجانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آمین!

آپ کا ارسال کردہ ملفوف موصول ہوا جس میں ایک عدد سوال نامہ تھا جو میری ادبی زندگی کا حساب نامہ ہے۔ پوری زندگی خرچ ہو چکی یہ پتا ہی نہیں کہ کہاں ہوئی، کیسے ہوئی؟ آپ کی سوالیہ عدالت میں کھڑا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں، جو جس طرح یاد آئے گا بیان کرتا ہوں۔ قلم بند کرتی جائیں۔

بات اپنے خمیر سے شروع کرتے ہیں۔ ہندوستان کا مشہور صوبہ اُتر پردیش، اُس کا مشہور ضلع مرادآباد، جو ادبی دنیا میں ''شہرِ جگر'' کے نام سے اور تجارتی دنیا میں ''پیتل نگری'' کے نام سے مشہور ہے، اُس کی ایک معروف تحصیل سنبھل جو کبھی پرتھوی راج چوہان کی راجدھانی ہوا کرتی تھی، اُس کے مغرب میں بارہ (۱۲) کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی سادات کی ہے جس کا نام ''نعمت پورہ'' ہے۔ مگر چونکہ نعمتوں میں سب سے اہم نعمت ہے روٹی اور وہ بھی واحد، جو اعلانِ وحدت الٰہی کرتی ہے اُسی کی نسبت سے وہ گاؤں ''اکرونہ سادات'' کے نام سے مشہور ہے جہاں میں ۲۷/ اکتوبر کو ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ میر سید مہدی حسن، میرے دادا، ضلع مرادآباد کے صف اول کے

زمینداروں میں شمار کیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جیورسٹ (jurist) بھی تھے۔ علم بہر حال سادات کا ورثہ ہے۔ نسلی تعلیم کی تاریخ تو معلوم نہیں البتہ گھر میں جو اجداد کا تحریر کردہ اثاثہ ہے اس کی تاریخ کم و بیش چار سو (۴۰۰) سال پرانی ہے۔ خدا کا شکر ہے اُس کے بعد والد محترم سید زمرد حسن، جن کا میں ممنون ہوں، جنھوں نے دولت علم کو ہم تک اپنی میراث کی طرح بہتر سے بہتر طریقے سے منتقل کیا۔ اُسی علمی اور مذہبی ماحول میں میری بھی پرورش ہوئی۔ والد صاحب کا تعلیمی وطن حیدر آباد، دکن اور میرا تعلیمی وطن لکھنؤ رہا۔ میری ڈگری کے مضامین اردو، انگریزی اور عمرانیات رہے ہیں۔ محافظ زبان و ادب حضرت میر انیس اور بابائے غزل حضرت میر تقی میر میرے ادبی مراجع تقلید ہیں۔ میر تقی میر پر میں بھی ایک تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ اس کا موضوع ہے "مقام میر"۔ خُدا کرے اس کو مکمل کر سکوں۔ کچھ نثری کام بھی کیا ہے یعنی کچھ مضامین لکھنے کا شوق تھا جن پر میرا قلمی نام تھا میر نظیر باقری۔ شاعری میں نظیر باقری رہ گیا جب کہ میرا پورا نام سید نظر عباس باقری ہے۔

میں شاعر کب سے ہوں یہ تو معلوم نہیں کیونکہ شاعر پیدائشی اور فطری ہوتا ہے۔ مگر شعوری طور پر مجھے خود جب یہ احساس ہوا کہ باقاعدہ میرے اندر بھی ایک شاعر ہے اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا وہ بھی سائنس کا جو ڈگری تک ساتھ رہی۔ پھر ادبی مضامین اختیار کر لیئے۔ بہر حال اُس وقت ایک مصرعہ سُن کر ایک شعر کہا تھا جس کا سبب ایک تخلیقی واقعہ ہے جو اس طرح ہے...ہماری بستی کی ایک بڑی صاحب نظر اور علمی شخصیت تھی، بابو اکبر حسین صاحب کی، جو میرے پھوپا تھے۔ وہ دہلی کے کسی طرحی مشاعرے کا ایک واقعہ بیان فرما رہے تھے۔ طرح تھی...

؎ جب کبھی تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا

اس پر کسی صاحب نے یہ مصرعہ لگایا...

؎ ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

اس کے بعد وہاں کوئی پڑھنے کو تیار نہیں ہوا۔ سب نے اپنی اپنی غزلیں چاک کر دیں اور وہ مشاعرہ اسی پر تمام ہوا۔ لیکن میرے لئے زندگی کا وہی پہلا مشاعرہ تھا۔ میں نے اُس وقت جو شعر کہا تھا وہ آج تک یاد ہے۔ حاضر کرتا ہوں ؎

بعد مدت کے میں سویا ہوں غموں سے کہہ دو
اب کبھی آن کے مجھ کو نہ پریشاں کرنا

یہی ہماری زندگی کا پہلا شعر تھا جس کو کہنے والے بھی ہم تھے اور سننے والے بھی ہم تھے۔ پھر کیا تھا

؎ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یہ سلسلہ شروع ہوا تو آج تک جاری ہے۔ غزل، نعت، منقبت، قصیدہ، سلام، مرثیہ، نوحہ، رباعی، قطعات، نظم وغیرہ، ان جملہ اصناف میں سات (۷) مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی شکل میں سب سے پہلے ایک مرثیہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "بنسی" اور جس کے بہتر (۷۲) بند تھے، سن اشاعت تھا ۱۹۸۲ء۔ ہندوستان میں ماہنامہ آج کل، نیا دور، ایوانِ اردو، شاعر، بیسویں صدی اور شمع کے علاوہ

بیشتر روزناموں اور جریدوں میں شریک اشاعت رہا ہوں۔ پاکستان میں ۱۹۸۰ء میں "آداب عرض" نے سب سے پہلے ایک نظم شائع کی تھی "دھواں اور سیندور"۔ اس کے علاوہ افکار اور سخن ور میں بھی حادثے کے طرح نام چھپ جاتا ہے۔

آپ اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھ رہی ہیں تو عرض ہے کہ اردو کے مستقبل کی اتنی ہی امید ہے جتنی صبح کے سورج کی۔ ناامیدی ویسے بھی کفر ہے۔ مگر اردو زبان کے مستقبل سے ناامیدی کو اس لئے بھی نہیں جوڑا جاسکتا کیونکہ اردو نے جتنا سفر بھی کیا ہے وہ اپنے پرکشش صوتی نظام کی بنا پر جو اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ اردو کی لاکھوں، سینکڑوں اور کروڑوں لکھی جانی والی کتابیں اردو ادب اور اس کی تاریخ کو تو زندہ رکھ سکتی ہیں لیکن زبان کو نہیں۔ کیونکہ زبان کا تعلق لسانیات سے، بول چال سے ہے۔ اسی کی دلیل ہندی رسم الخط ہے۔ اور نہ صرف ہندی (دیوناگری) رسم الخط میں بلکہ لوگ اس کو انگریزی (رومن) رسم الخط میں بھی لکھتے ہیں۔ اگر رسم الخط بدلنے کے معنی آپ کے یہاں اردو رسم الخط کو ختم کرنے کے ہیں تو میں اس سے متفق نہیں ہوں کہ پھر اردو کی پہچان کیا ہوگی؟ کیونکہ وہی اُس کی شناخت ہے۔ نہ صرف اُس کی بلکہ ہر زبان کی ادبی پہچان رسم الخط ہی ہوتی ہے۔

اردو ادب کی جڑیں زمین میں پیوست ہوں یا نہ ہوں مگر اردو زبان کی جڑیں نہ صرف زمین میں بلکہ ارض سماعت لے کر ارض دماغ تک اور ارض دماغ سے ارض دل تک ضرور پیوست ہیں۔

میں کہوں گا کہ نہ صرف آج کا ادب بلکہ ہر زمانے کا ادب اپنی تمام حرکات وسکنات کا ترجمان ہوتا ہے، کیونکہ ہر عہد کا منظر الگ ہوتا ہے اس لحاظ سے اس کے مشاہدات واحساسات بھی الگ ہوتے ہیں اور ان کو سمجھنے کے لئے وہی ماحول اور وہی اندازِ بیاں چاہیئے جو وہ چاہتا ہے۔ اسی سے اُس زمانے کے حالات اور واقعات کا بھی پتا چلتا ہے۔

نثری نظم... نثر اور نظم دونوں کا مرکب ہے، مگر تجربے کے لئے کوئی چیز بھی بری نہیں ہوتی۔ جب نثر میں بھی تاثر ہوسکتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نظم بھی جوڑ دی جائے تو کیا کہنا۔ یہ فیصلہ غالب کے خطوط کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ دراصل وہ ہے تو نثر مگر اُس میں شاعری کا احساس ہوتا ہے۔ اب رہا نثری نظم کی بارآوری کا مسئلہ تو پھر وہ ایک منزل پر یا نثر رہ جائے گی یا نظم۔ کیونکہ جو صنف بغیر کسی تغیر کے زندہ رہی ہے وہ صرف غزل ہے۔

زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات بہت سے ہیں مگر وہ واقعہ جس کو اردو ادب کے حوالے سے رقم کیا جاسکتا ہے وہ واقعہ ممبئی روزنامہ "انقلاب" کے دفتر کا ہے جب ظ۔ انصاری مرحوم اُس کے مدیر ہوا کرتے تھے۔ وہیں اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے حکم دیا... "میاں کوئی غزل سنائیے"۔ میں نے ایک غزل سنائی۔ اس کے بعد انہوں نے کہا... "جیتے رہیئے۔ آج بہت عرصے بعد غزل سنی ہے"۔ میں سوال کرنے کی جسارت نہ کرسکا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے... "آپ کا کوئی مجموعہ آیا ہے یا نہیں"۔ میں نے عرض کیا... "غزل کا کوئی مجموعہ ابھی نہیں آیا۔ مگر تیار

ہے''۔ کہنے لگے ... ''اس پر تقریظ میں لکھوں گا''۔ میں نے جواباً عرض کیا...''میرے لئے بڑا شرف ہوگا''۔ پھر کہنے لگے...''میاں ایسا کرنا خود جو چاہو لکھ لینا اور مجھ سے دستخط کرالینا''۔ سب لوگ ہنس پڑے اور بات تمام ہوگئی۔

یہ وہی زمانہ تھا سلطانہ آپا جب میں آپ کی ممبئی میں رہا کرتا تھا اور وہاں ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں بہت سے گلوکاروں نے میری غزلیں گائیں اور مختلف کمپنیوں میں ریکارڈ (record) بھی کیں۔ گانے والوں میں لتا منگیشکر، جگجیت سنگھ، عزیز نازاں اور راجکمار رضوی کے علاوہ بہت سے غیر معروف لوگ بھی شامل ہیں۔ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن ممبئی (Film Writers Associasion, Mumbai) کا بھی ممبر ہوں۔ بہت سی فلمیں بھی مجھے آفر (offer) ہوئیں مگر میں جن ڈائرکٹرز (Directors) کو پسند کرتا ہوں، ان کے علاوہ کسی میں کوئی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی قبول نہیں کی۔ جن کو پسند کرتا ہوں اُن کی طرف سے کوئی آفر نہیں ملا۔ اور نہ ہی میرے دماغ نے خوشامد کرنے کی کبھی اجازت دی۔ بابری مسجد کے حادثے کے بعد ممبئی چھوڑ کر اپنے وطن چلا آیا۔ وہاں سے یہاں امریکہ میں ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ یہیں پر میرے شعری مجموعے''اعتماد'' کی رسم رونمائی ہوئی جس کو میں نے بغیر کسی مقدمے اور تقریظ کے شائع کیا تھا کیونکہ نہ مجھے کوئی ادیب جانتا تھا اور نہ ہی کوئی مقتدر شخص۔ اتفاق سے ظ۔ انصاری سے ملاقات ہوگئی تھی پر مجموعے کی اشاعت کے وقت وہ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ اگر میں خود بھی لکھتا تو دستخط کون کرتا۔ اس کے بعد تیسری بار امریکہ حاضر ہوا تو ٹیلی فون پر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اسی میں آپ نے پوری زندگی کا حساب طلب فرمالیا۔ بہر حال اس وقت تک کا مختصر جو احوال تھا آپ کے حوالے کردیا، اب آپ جانیں۔ خدا حافظ۔

سلام ان پر جو لائق سلام ہیں
آپ کا بھائی
نظیر باقری

Mr. Nazeer Baqari,
Ikrotia Sadat, P.O. Asmoli, Dist. Moradabad, U P, India

انتخابِ کلام

مرتبے اُن سے کسی اور کے عالی نہ ہوئے
جنکی تخلیق کمالی تھی زوالی نہ ہوئے

سرخرو ہونا تھا اپنے ہی لہو سے جنکو
وہ کسی کے لب و رخسار کی لالی نہ ہوئے

آب غیرت سے سدا خود کو بھرا ہی رکھا
لاکھ دنیا نے اچھالا بھی تو خالی نہ ہوئے

دیکھ سکتے ہو تم آنکھوں سے ہمارے سب زخم
ظلم جتنے بھی ہوئے ہم پہ خیالی نہ ہوئے

وہ تو سائل تھا اسے کر دیا بخشش نے امیر
ہم بہرحال جوابی تھے سوالی نہ ہوئے

بقلم
نظیر باقری

زمانے سے یہ سنتے آرہے ہیں
زمانہ آجکل اچھا نہیں ہے
نیاز گلبرگوی
9/22/01

نیاز گلبرگوی

شکاگو، امریکہ

ریاستِ حیدر آباد، دکن کا شہر گلبرگہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اردو کی پہلی نعت لکھ کر اور اردو کی پہلی نثری کتاب "معراج العاشقین" لکھ کر دکن کی ادبی تاریخ کا آغاز کیا (۱)۔ اسی مقدس خاک سے اس نیاز نے جنم لیا جو اسم بامسمیٰ یعنی سراپا نیاز ہے اور اردو کا عاشق دل دار۔ ملاحظہ ہو ان کی یہ نظم بعنوان ترانۂ اردو۔

اچھی ہے ہر زبان سے اردو زباں ہماری
اونچی ہے آسماں سے اردو زباں ہماری

دشمن نہیں کسی کی رکھتی ہے آشنائی
دنیا کی ہر زباں سے اردو زباں ہماری

دیکھو تو ہو گے حیراں، امداد اپنے گھر میں
لائی کہاں کہاں سے اردو زباں ہماری

ترکی ہو یا کہ ہندی، عربی ہو فارسی ہو
واقف ہے ہر زباں سے اردو زباں ہماری

سارے علوم اپنے دامن میں لے چکی ہے
دنیا کی ہر زباں سے اردو زباں ہماری

مذہب کا بھی خزانہ رکھتی ہے اپنے اندر
زائد ہر اک زباں سے اردو زباں ہماری

سر تال سے بھی واقف، وابستہ بھی رہی ہے
خسرو کے آستاں سے اردو زباں ہماری

بھولو نہ مجھ کو ہرگز فریاد کر رہی ہے
ہر پیر ہر جواں سے اردو زباں ہماری

(۱) جدید تحقیق غالباً اس سے متفق نہیں۔ سلطانہ مہر

دامن کش دل و جاں سے یہ نیاز کتنی　　　　دیکھو اسے جہاں سے اردو زبان ہماری

ان سے میری ملاقات اس صدی کی چھٹی دہائی میں ہوئی۔ چھوٹا سا ایک گروپ تھا ہمارا جس میں محترمہ سعیدہ عروج، عروج بھائی، میمونہ غزل، ڈاکٹر اختر، فضل گلبر گوی، تحسین سروری، عشرت انجم، بدر جعفری اور فضا جلالوی (استاد قمر جلالوی مرحوم کے شاگرد) شامل تھے۔ اکثر اس طرح کی نشستیں ہمارے گھر سعید رضا سعید کی ایما پر منعقد ہوتیں۔ ہر فرد با قاعدگی سے شریک ہوتا۔ مصرع طرح دیا جاتا اور یوں نئی غزلوں کی تخلیق ہوتی۔ مسعود جاوید اور نیاز گلبر گوی ان نشستوں میں گاہے گاہے شریک ہوتے۔ ان احباب میں میری ذہنی قربت سب سے زیادہ فضل بھائی سے تھی اور وہ بھی مجھے چھوٹی بہن کی طرح چاہتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے ...."ہمارے گروپ میں مہر سب سے کم عمر ہے"۔ وہ چھوٹی بہن کی طرح میرا لاڈ بھی کیا کرتے تھے۔ پھر طویل عرصے تک ہم نہیں ملے۔ ۱۹۹۳ء میں جب میں کراچی گئی تب ان سے ملاقات ہوئی۔ مسعود جاوید کے گھر پر نشست میں ان کی وہی محبت، پیار اور خلوص میں نے دیکھا۔ اور بس یہ ہی ان سے آخری ملاقات تھی۔ یہاں (امریکہ) آنے کے بعد ان کے انتقال کی خبر ملی اور انہی دنوں برسوں کے بچھڑے نیاز گلبر گوی صاحب سے ان کی لاس اینجلس آمد پر ملاقات ہوئی تو یوں لگا میرا بچھڑا ہوا بڑا بھائی اور رہنما پھر سے آ گیا ہو، نیاز کا روپ دھار کر۔ گو وہ شکاگو میں ہیں اور میں لاس اینجلس میں اور کبھی برمنگھم (برطانیہ) میں۔ لیکن خطوط اور فون کے ذریعے تجدید ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ نیاز گلبر گوی سے میں نے جب پوچھا..."گو یہاں بھی آپ کے شعر کہنے کی رفتار ست تو نہیں لیکن کیا اب بھی آپ نظریاتی شاعری کے حق میں ہیں"؟ تو بولے..."شاعری بغیر نظریئے کے اب تک ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گی۔ گل و بلبل سے لے کر مزدور تک سب نظریاتی شاعری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعری چاہے کسی نظریئے کی ہو اپنے فن اور اپنی خوبی میں ایسی ہو کہ 'دل بر خیز' کے دائرے میں آتی ہو تو بس وہ شاعری ہے اور بڑی شاعری ہے۔ اس ضمن میں میرا یہ شعر حاضر ہے۔

وہ نخل سخن بے ثمر ہے نیاز　　　　جس کے پیچھے کوئی عقیدہ نہیں

اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شاعر کسی نہ کسی مکتبۂ فکر سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ وابستہ ہونا یا اس مکتبۂ فکر سے خود کو باندھے رکھنا، یہ علیحدہ بات ہے۔ جس پر بحث ہو سکتی ہے اور اس کی مختلف آرا بھی ہو سکتی ہیں۔ میں نئے رجحان کی شاعری سے، جسے آپ ترقی پسند شاعری کہہ سکتی ہیں، زیادہ متاثر ہوں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری سے دکن کا ہر باشعور نوجوان متاثر ہوا ہے۔ حیدر آباد، دکن کی ادبی زندگی کا انقلابی دور مخدوم کے نام سے عبارت ہے۔ مخدوم کی انقلابی فکر نے نہ صرف ان کے ہمعصروں کو متاثر کیا بلکہ نوجوانوں میں بھی ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کی تحریک پیدا کر دی۔ اور دیکھیے صدیوں کا جمود آن واحد میں ٹوٹ کر رہ گیا"۔

نیاز گلبر گوی کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام ہے "حرف نیاز"۔ اس میں حمایت علی شاعر لکھتے ہیں..."۔ شاعری جزو است از پیغمبری۔ حضرت موسیٰ کی زبان میں جب لکنت پیدا ہوئی تو انہوں نے خدا سے دعا کی 'اے خدا! میرے بھائی ہارون کو پیغمبر بنا دے'۔ حضرت ہارون بہت بڑے

خطیب تھے۔ خدا نے حضرت موسیٰ کی دعا قبول کرلی اور پھر یوں ہوا کہ 'لوح کلیم' ہارونؑ کی زبان بن گئی۔ حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات حضرت ہارونؑ کی آواز میں ان کی امت تک پہنچنے لگیں۔ شاعری بھی پیغمبری کا حصہ ہوتی ہے۔ ملکی حالات یا کسی 'جبرِ وقت' کے تحت شاعر چپ ہوجاتا ہے تو شاعری بولنے لگتی ہے استعاروں میں، کنایوں میں، علامتوں میں، بین السطور میں۔ بقول فیض۔

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور فیض کے الفاظ میں۔ 'بھائی سے جدا ہوگئے بھائی'۔ بظاہر ایک عام سانحہ ہے لیکن اس کے اثرات نسلوں میں پھیل گئے ہیں اور 'بے زمینی' کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ زندگی خلا میں معلق ہوکر رہ گئی۔ نیاز کی شاعری میں یہ غم بار بار جھلکتا ہے۔

توڑ کر تیرے شہر سے ناطہ پھر رہے ہیں نگر نگر تنہا
کیسے شام و سحر ہوگئے ہم ادھر، تم اُدھر ہوگئے
کیا بتائیں کیسے کٹی شب کس طرح دن بسر ہوگئے
شہر اپنا نہ شہریار اپنا ڈھونڈیئے پھر کوئی دیار اپنا

سہل ممتنع میں کہے ہوئے یہ اشعار نیاز کا رشتہ میر تقی میر سے جوڑ دیتے ہیں۔ میر کے دکھ درد میں عشق کے علاوہ ہجرتوں کے غم بھی شامل تھے۔ میر کے لہجے میں دل شکستگی کی جو فضا ہے، پاکستانی شعرا میں اس کی بازگشت ان کی اپنی ہجرت کے واسطے سے در آئی ہے اور ناصر کاظمی سے لے کر نیاز گلبر گوی تک تاریخ کے ایک دور کی پہچان بن گئی ہے''۔

آیئے اب نیاز بھائی سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولے...''میں یکم جون ۱۹۲۴ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوا۔ والد نے نیاز علی خان نام رکھا اور میں نے اسے تخلص کے طور پر اپنایا۔ میٹرک تک گلبرگہ کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۹ء میں والد وظیفہ پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو مجھے اپنی تعلیم ترک کرکے پندرہ سال کی عمر میں ایک دیہی مدرسہ میں تحتانی (ابتدائی) جماعتوں کا مدرس بننا پڑا کیونکہ ہمارے خاندان کی خود بسری کا واحد ذریعہ میرے والد کی ملازمت سے منسلک تھا۔ دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے گرانی زوروں پر تھی۔ پھر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک میں سرکاری مدرسہ تحتانیہ کا صدر مدرس رہا۔ ملازمت کے دوران میں نے منشی (فارسی)، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات پاس کیئے۔ ادب و شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات میرے گھر کے ماحول سے ہیں۔ والد صاحب اردو اور فارسی ادب سے شغف رکھتے تھے۔ نانا حضرت شیخ علی اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں چوتھی جماعت میں تھا تو نانا جان مشکل مشکل مسودے (خطوط کی شکل میں جوان کے دوستوں اور عزیزوں کے نام ہوتے تھے) مجھ سے املا کرواتے تھے۔ جن الفاظ کے معنی اور ہجے سمجھ میں نہ آتے وہ نانا بتادیتے۔ اس طرح تحریر کا شغف اور الفاظ کی نشست و برخواست سے واقفیت ہوتی گئی۔

تختی بھی لکھوائی گئی تھی جس سے خوش خط بنے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ پانچویں جماعت میں آئے تو والد صاحب نے گھر پر گلستان، بوستان پڑھا کر فارسی زبان سے روشناس کرایا۔ آٹھویں میں پہنچے تو فارسی زائد زبان کے طور میٹرک تک پڑھی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی بنیاد رکھی تو میں نے اردو فاضل وہیں سے کیا۔ اردو فاضل کا کورس ایم اے اردو کے کورس سے زیادہ وسیع تھا۔ اردو اساتذہ کے سارے دیوان، فنِ تنقید پر متداول (مروج) کتب، علمِ عروض، صنائع و بدائع، دکنی قدیم شعرا سے لے کر دبستانِ لکھنؤ اور دلی کے شعرا، ۱۹۳۶ء کا ترقی پسند ادب، اقبالؔ، سرسید اور ان کے رفقا کے کارنامے و تحریرات پر محیط یہ امتحان تھا جو میرے ادبی سفر میں بڑا مددگار ثابت ہوا۔

۱۲/ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہندوستان نے حیدر آباد، دکن پر فوجی کاروائی کی اور ۱۷/ستمبر کو ان کی فوجیں ریاست دکن پر قابض ہوگئیں۔ گلبرگہ ہندوستان کی سرحد کے قریب تھا۔ یہاں فوجی در آئے۔ ہم لوگ اپنی جانیں بچا کر ریاست کے دارالخلافہ حیدر آباد پہنچے۔ گھر لٹ گیا۔ گھر کا اثاثہ جلا دیا گیا۔ برسوں کی جمع پونجی آتش و آہنگ کی نذر ہوگئی۔ جس کے جہاں سینگ سمائے نکل پڑا۔ میں دکن سے ہجرت کر کے ۲۴/جنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچا۔ دکن میں جب تک رہے کبھی باہر جھانکا تک نہیں اور جب نکلے تو دکن کی صورت کو ترس گئے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز بہ یک وقت افسانہ نگاری اور شاعری سے ہوا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ابتدا میں نظم کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ میرے افسانے حیدر آباد، دکن کے روزنامہ 'میزان' اور ماہنامہ 'ہندوستانی ادب' میں چھپتے تھے۔ ابراہیم جلیس، جو اس وقت تک اپنی پہلی کتاب 'زرد چہرے' کے مصنف بن چکے تھے، میری تحریر کی بہت تعریف کرتے اور ہمت افزائی کرتے۔ اپنی ابتدائی عمر میں ہی مجھے بڑی پزیرائی ملی۔ مگر وہ زمانہ پَر لگا کر اڑ گیا۔ خواب تھا سہانا جو ٹوٹ گیا اور معلوم ہوا کہ سندھ کے ریگستانوں کی دھول میں اٹے ہوئے ہیں۔ مگر نئے وطن کی مٹی نے، جس کے لئے سب کچھ تج دیا تھا، گلے لگایا۔ وہ سب کچھ دیا جو اس کے بس میں تھا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام ہر چند افراتفری کے تھے مگر بڑے سہانے تھے۔ ادبا، شعرا اور دانشورانِ دکن جو وہاں چیدہ چیدہ بکھرے ہوئے تھے سب حیدر آباد کالونی میں اکٹھے بود و باش کرتے نظر آئے۔ ان میں ابراہیم جلیس، تحسین سروری، خواجہ معین الدین، نظر حیدر آبادی، فضل گلبرگوی، مظفر الدین مظفر، رضی اختر شوق، عبدالرؤف عروج، محمد عمر مہاجر، جلال الدین اشک، مرزا ظفر الحسن، بدر شکیب، حمایت علی شاعر، مہدی علی صدیقی، ماہر القادری اور حضرت علی اختر وغیرہ دکن کے درخشندہ ستارے تھے جو پاکستان کے آسمانِ ادب پر پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ پچاس کی دہائی کی ابتدا میں 'محفل علم و ادب' کا قیام عمل میں آیا۔ ہر ہفتے سارے اس محفل میں، جو بہادر یار جنگ ہائی اسکول کے لکچر ہال میں منعقد ہوتی تھی، جمع ہوتے اور اپنی نگارشات پیش کرتے۔ نقد و نظر کے سلسلے چل نکلتے۔ ادبی مباحثہ کا جو معیار اس محفل میں پیش کیا گیا وہ مدتوں دوسری انجمنوں کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا۔

پھر یہ سہانے خواب بھی ٹوٹے۔ استبداد کا زمانہ آیا اور سارا ادب اور تمام ادیب جانے کہاں کھو گئے۔ اس ٹوٹ پھوٹ نے بہت سوں کو ادب بیزار بنا دیا۔ ہم نے بھی چپ سادھ لی اور ایک طویل عرصے تک یعنی چونتیس (۳۴) سال تک اس راہ سے دور رہے اور ادب میں نامرادانہ زیست کرتے رہے۔

اگست ۱۹۸۱ء میں جب والدہ صاحبہ کی وفات کی خبر ملی تو گلبرگہ جانا ہوا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ والدہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کی شفقت کے سائے میں ہمارے سارے بچے پاکستان میں پرورش پاتے رہے۔ وہ چونتیس (۳۴) سال بعد اچانک چند دنوں کے لئے گلبرگہ اپنے بھائی سے ملنے گئیں اور وہیں انتقال کر گئیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارا وہ کلام جو وطن میں ۱۹۴۸ء تک کہا گیا تھا، اور ناسازگار زمانہ حالات کے ہاتھوں ادھر ادھر بچا ہوا تھا، ہمارے چند عزیزوں اور دوستوں نے جمع کیا اور اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ہم جو وطن سے منہ پھیر گئے تو یاران وطن کو بھولے سے بھی یاد نہ کیا تھا بلکہ شاید بالکل ہی بھول بیٹھے تھے مگر وہ تھے کہ اپنے غریب الوطن 'بے وفا' کو ابھی تک اپنے دل میں بسائے بیٹھے تھے۔ آنکھیں اُمنڈ آئیں، دل بھر آیا اور یوں میری کتاب 'حرف وفا' گلبرگہ سے انجمن ترقی اردو اور انجمن حیات نوشاہ پور کی مشترکہ کوششوں کے باعث ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔

پاکستان میں محکمہ اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ (Accountant General Sindh) کے شعبہ سرمایہ کاری میں ملازمت ملی۔ چھتیس (۳۶) سال کی ملازمت کے بعد بحیثیت اکاؤنٹ آفیسر یکم جون ۱۹۹۴ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ اور مارچ ۱۹۹۵ء کو دوسری ہجرت کر کے شکاگو اپنے بچوں کے پاس پہنچا۔ تب سے اب تک یہیں مقیم ہوں''۔

اس طویل مگر دلچسپ آپ بیتی کے بعد ان سے شعر گوئی کی تحریک ملنے کے بارے میں پوچھا تو بولے ...'' اساتذہ کے کلام کے مطالعے کے دوران اکثر آمد ہوتی ہے۔ ایک اچھا شعر یا کوئی مترنم بحر بھی شعر گوئی پر اُکسا دیتی ہے۔ لیکن یہ کوئی لگا بندھا اصول نہیں۔ بعض دفعہ یوں بھی شعر نازل ہوتے ہیں''۔

نیاز صاحب بھی اس بات سے متفق ہیں کہ زمانے کی تیز رفتاری نے کتب اور رسائل کو غیر مقبول بنا دیا ہے۔ آڈیو، ویڈیو اور کمپیوٹر کا دور ہے۔ انسان مشین میں ڈھل گیا ہے۔ وقت کہاں ہے مطالعہ کے لئے۔

پردیس میں پروان چڑھنے والی نسل کو اردو کا ورثہ منتقل کرنے کے سلسلے میں ان کا مشورہ ہے ...'' والدین اپنی شناخت اور اپنی زبان کے تحفظ کے خاطر ایک متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔ وقت نکال کر بچوں کو اپنی زبان کی ابجد سے واقف کرائیں۔ ان سے اردو میں بات کریں اور کمیونٹی میں سنڈے (Sunday اتواری) اسکولوں کا قیام عمل میں لائیں''۔

نیاز کا یقین ہے کہ اردو ادب آج یہ دعویٰ کر سکتا ہے اور ایسا کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا ہم پلہ ہے۔ اقبالؔ، حالیؔ، میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، مودودی، شبلی،

سلیمان ندوی، شرر، ڈپٹی نذیر احمد اور نہ جانے کتنے قد آور مصنف، فلسفی، شاعر اور دانشور اردو زبان میں پیدا ہوئے۔ یہ سب ادب عالیہ کے خالق ہیں اور موجودہ عہد میں بڑی شاعری کی طرف پیش قدمی ہوئی ہے۔ قاسمی، فیض، ماہر، فرزند، مخدوم، جذبی، رضی اختر شوق، حمایت، سرور جعفری، کیفی اعظمی اور بہت سوں نے ادب کا رشتہ زندگی سے جوڑ رکھا تھا اور جوڑ رکھا ہے۔ ویسے اچھی بری شاعری ہر دور میں ہوتی ہے لہٰذا ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی اردو کا رسم الخط بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ رسم الخط کی تبدیلی زبان کے قتل کی مترادف ہے۔

Mr. Niaz Gulburgavi,
5445 North Artesion, Chicago, IL., 60625, USA

انتخابِ کلام

ذرہ ذرہ انفس و آفاق کا گردش میں ہے
مہر و ماہ کا قافلہ صبح و مسا گردش میں ہے

رات ہے تاریک طوفانِ بلا ہے ہر طرف
ناؤ ہے اپنی بھنور میں ناخدا گردش میں ہے

فکرِ مال و زر نے غارت کردیا امن و سکوں
میں مصیبت میں الگ ہوں تُو جدا گردش میں ہے

شعلۂ جوالہ کی گردش کا حاصل دائرہ
گردشِ شعلہ بہ شکلِ دائرہ گردش میں ہے

قافلہ درماندگی کی دُھند میں محبوس ہے
منزلِ مقصود گم ہے رہنما گردش میں ہے

تیرے محبوبِ نظر کے در پہ مستوں کا ہجوم
تیرے گھر کے گرد مخلوقِ خدا گردش میں ہے

دیکھیئے ہاتھوں میں ہے راہ وارِ عالم کی لگام
سوچیئے پھر بھی ستارہ آپ کا گردش میں ہے

قوم ساری غرق ہے طوفانِ عصیاں میں نیاز
بند ہے بابِ اجابت اور دعا گردش میں ہے

حسرتہ چھین لیا اُس کو بدلنا کیوں نہیں آیا
مجھے اوروں کے نقشِ پا پہ چلنا کیوں نہیں آیا
اقبال نوید ۲۳ مارچ ۲۰۰۳

اقبال نوید

برمنگھم، برطانیہ

اقبال نوید کے لئے زندگی بذات خود ایک یادگار واقعہ ہے۔ پھر اس سے اہم بھلا اور کون سا واقعہ ہوگا، اور بقول مشہور فلسفی اور دانشور 'کیر کے گارڈ' سوچتا ہوں اس لئے کہ میں ہوں، چناں چہ اقبال نوید لکھتے بھی اسی لئے ہیں کہ ''ہیں''۔ اگر چہ لکھنا ایک شعوری عمل ہے مگر لکھنے کی خواہش اور پھر اس خواہش کے تحت تحریک ادیب کے لاشعور کی گہرائیوں میں پرورش پاتی رہتی ہے جو مناسب وقت پر تحریری شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح بسا اوقات شاعر اور ادیب کو خود پتا نہیں ہوتا اس نے کب اور کیوں لکھنا شروع کیا۔

گو اقبال نوید کے لکھنے پڑھنے کی ابتدا تو کالج کے زمانے سے ہوگئی تھی مگر اُن دنوں کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا اس لئے ابتدائی غزلیں، نظمیں سب ''مہاجر'' ہوگئیں۔ اب انہوں نے اپنا کلام محفوظ کرنا سیکھ لیا ہے۔ چناں چہ مجموعۂ کلام اشاعت پزیر ہونے کی توقع ہے۔

اقبال نوید فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر ناگزیر حالات انہیں فرانس اور پھر برطانیہ لے آئے۔ صحافت سے بھی انہیں دلچسپی ہے اور لندن کے ''پاکستان پوسٹ'' کے لئے برمنگھم میں نمائندہ ہیں اور ''اپنا ریڈیو، برمنگھم'' سے بھی وابستگی ہے۔

اقبال نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی رائے میں نظم کا دامن غزل سے زیادہ وسیع ہے۔ اس میں کسی بھی موضوع پر مفصل اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ گو آج کی غزل نے اپنے اندر ان تمام مضامین کا احاطہ کیا ہے جو کسی زمانے میں غزل کے لئے ممنوع تھے۔ پھر بھی نظم سے شاعر کی مکمل سوچ اور نظریے کا اظہار ہوتا ہے۔

اقبال نوید کی رائے میں نثری نظم اور نثری غزل کو تجربہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن شاعری نہیں۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔ ''اردو زبان میں لکھا جانے والا ادب کسی بھی دوسری زبان میں تخلیق کیئے گئے ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بے شمار لکھنے والے ایسے ہیں جن کی تخلیقات اپنے عہد کی عکاس ہیں۔ اردو دنیا کی چند بہترین زبانوں میں سے ہے۔ اس لئے احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ میں اردو زبان کو اپنا کر گھاٹے میں رہا ہوں اس کے باوجود کہ میں مغرب میں ہوں لیکن اردو کا ہی سودائی ہوں''۔

اقبال نوید کو سب ہی اساتذہ کا کلام اچھا لگتا ہے۔ نئی غزل اور نئی نظم کے حوالے سے احمد فراز، شکیب جلالی، شہزاد احمد،، عدیم ہاشمی، افتخار نسیم، اقبال ساجد، ریاض مجید، امجد اسلام امجد، اختر حسین جعفری اور سرمد صہبائی سے متاثر ہیں۔ کہتے ہیں۔۔۔ ''پچھلی صدی میں اقبالؒ اور فیض کے حوالے یاد رکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح انیسوی صدی کے شعرا میں غالب اور میر کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ میر کے شعر آج بھی ہمیں اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے دور میں کرتے تھے کیوں کہ وہ اپنے عہد سے منسلک ہیں صرف واقعات کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اپنے عہد کی تاریخ بن جاتے ہیں۔ صرف روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو شعری جامہ پہنا دینا ایسا ہی ہے کہ واقعہ ختم ہوا اور اس سے متاثر ہو کر کی گئی شاعری بھی واقعہ کی طرح طاقِ نسیاں کی زینت ہو کر رہ گئی''۔

یہاں اردو زبان کے مستقبل سے اقبال نوید زیادہ پُر امید نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔۔۔ ''کسی بھی زبان کو اس کے جغرافیائی حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کا مستقبل پاکستان میں تابناک ہے لیکن پاکستان سے باہر برطانیہ یا دوسرے ممالک میں ایک دو نسلوں تک محدود ہے۔ حتیٰ کہ بھارت میں، جہاں اردو کی پیدائش ہوئی، وہاں بھی یہ مخدوش حالات سے گزر رہی ہے۔ رسم الخط تبدیل کرنے سے اردو کسی اور زبان میں ضم ہو جائے گی، اردو نہیں رہے گی''۔

تنقید کے حوالے سے اقبال نوید کا کہنا ہے۔۔۔ ''گنتی کے چند ناقدین ایسے ہیں جو ادب اور شاعری کے معاملے میں دیانت داری سے اظہارِ خیال کرتے ہیں، ورنہ بیشتر ناقدین دوستی اور تعلقات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان ہی ناقدین نے ادب اور شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ آپ آج کی کتابوں کو دیکھیئے۔ فلیپ اور دیباچوں پر بے سوچے سمجھے بہت کچھ وہ لکھ دیا جاتا ہے جو کتاب کے اندر موجود نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ادب اور شاعری کی قدر گھٹ گئی ہے۔ لوگوں کا اعتماد تنقید پر سے اُٹھ گیا ہے''۔

اسی ضمن میں انہوں نے کہا۔۔۔ ''تنقیدی نشستیں بلاشبہ ایک اچھا کردار ادا کر سکتی ہیں بشرطیکہ

ان نشستوں میں تنقید برداشت کرنے والوں کی شمولیت ہو اور جس طرح پاک و ہند میں ایسی نشستوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس ضمن میں پنجاب میں خاصا ادبی کام ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ماضی میں پنجاب ادبی اور علمی مرکز رہا ہے''۔

اقبال نوید دوستوں کے دوست ہیں۔ کسی کو گزند پہنچانا ان کی سرشت میں نہیں۔ کہتے ہیں۔

یہ ہم تھے زندگی ساری مروت میں بسر کر دی وگرنہ خشک پھولوں سے محبت کون کرتا ہے

وہ جدوجہد کے قائل ہیں۔ اس حوالے سے نوید کا یہ شعر تنبیہہ ہے۔

جہاں سے زندگی کے استعارے کوچ کر جائیں نوید اس بانجھ دھرتی پر سکونت کون کرتا ہے

آگہی کا شعور رکھنے والے لوگ صدیوں پر پھیل جاتے ہیں۔ اقبال نوید بھی راتوں رات شہرت حاصل کرنے والوں میں سے نہیں۔ ان کا کلام اس دلیل کا ترجمان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خواہشوں کے پیڑ سے گرتے ہوئے پتے نہ چُن زندگی کے صحن میں امید کا پودا لگا
تیرے اندر کی خزاں مایوس کر دے گی تجھے کھڑکیوں میں پھول رکھ دیوار پر سبزہ لگا
وقت ہر دکھ کا مسیحا ہو نہیں سکتا نوید زخم اپنے دل پہ مت احساس کا گہرا لگا

اقبال نوید نے بڑی دل آویز نظمیں بھی کہی ہیں۔ ایک نظم ''شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں'' انتخاب کلام میں ملاحظہ ہو۔

Mr. Iqbal Naved,
7 Clement Road, Halesowen, West Midlands, B62 9LR, UK

انتخابِ کلام (شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں)

کبھی کچھ تھا
جسے ہم چھوڑ کر گھر سے نکلنے کے لئے بیتاب رہتے تھے
کبھی کچھ تھا، مگر ہم یہ سمجھتے تھے
کہ اپنے واسطے اس سرزمیں پر کچھ نہیں رکھا
در و دیوار اندر سے قفس معلوم ہوتے تھے
محبت اور نفرت تھی، جو اپنی تھی
ہوائیں، بارشیں، موسم
کبھی وہ کچھ جو ہر اک شخص کو قدرت سے ملتا ہے
وہ ہنگامے جنہیں آنکھیں ترستی ہیں
وہ اپنے لوگ

جو اَب آنسوؤں کے گھر میں رہتے ہیں
مگر اس وقت جب ہم سانس بھی لیتے
گھٹن ایسی کی جیسے دم نکلتا ہو
یہی لگتا تھا
جیسے اجنبی لوگوں میں زندہ ہیں
ہمیشہ خواب کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے یہ سوچتے رہتے
کہ اپنی آنکھ جب کھولیں
تو منظر ہی بدل جائے
کسے معلوم تھا
منظر بدلنے سے وہی کردار رہتے ہیں
وہی دیوار رہتی ہے، وہی زنجیر پاؤں میں
وہی تصویر آنکھوں میں
نگاہوں میں وہ سب کچھ ہے
کہ جب سرسبز شاخوں پر ہمیشہ پھول کھلتے تھے
خزاں رُت میں بھی اک تازگی محسوس ہوتی تھی
مگر اب زندگی کاغذ کے پھولوں اور
خوش بو کانچ کی بوتل کے اندر قید ہم پر مسکراتی ہے
ہمارے ہاتھ خالی ہیں مگر
ذہنوں میں گزرے روز و شب کی ایک البم ہے

خبر کیا تھی
شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں
سوکھ جاتے ہیں

فرزانہ نیناں
نوٹنگھم

فرزانہ خان نیناںؔ

نوٹنگھم، برطانیہ

میں نے پہلی بار فرزانہ کو ریحانہ قمر کے لئے منعقد کی گئی انور مغل صاحب کی تقریب میں دیکھا اور ان کا کلام سُنا۔ فرزانہ کے کلام میں نئے سفر، نئے امکانات اور نئی دنیا کا رنگ محسوس کر کے طمانیت ہوئی۔ پھر جب فرزانہ سے گفتگو کو موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ ان کی روزمرہ کی گفتگو بھی شاعرانہ ہے۔ لیکن وہ شاعرہ بعد میں ہیں اور اپنے شریکِ حیات اختر خان کی سلیقہ شعار بیوی اور اپنے بچوں کی، شارمین خان اور حماد خان، محبت کرنے والی ماں پہلے ہیں۔ اسی جذبے کا اظہار انہوں نے اپنے ان اشعار میں بھی کیا ہے۔

جھیل میں لمس کی تحریر بنانی ہے مجھے   آنکھ میں چاند کی تصویر بنانی ہے مجھے
سوچنا صرف نہیں چاہنے والے کے لئے   اپنے بچوں کی بھی تقدیر بنانی ہے مجھے

چونکہ فرزانہ چار (۴) سال کی عمر میں خود ماں کی محبت سے محروم ہو گئی تھیں، دادی اور بڑے بھائی نے ان پر محبت کے پھول نچھاور کئے۔ بچپن سے ہی کتابوں کا ساتھ رہا اور پھر دو تہذیبوں کے سنگم نے ان کی شخصیت میں اپنا حسن رچایا بسایا جس کی وجہ سے ان کی شاعری ہیر اور سسی کے دیس کے قدرتی مناظر کے سحر آفریں جذبات اور موسموں کی قوسِ قزح سے آراستہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کی والدہ گلزار خانم کا تعلق پنجاب سے تھا اور ان کے والد محمد اقبال میمن سندھ کی سرزمین سے جُڑے تھے۔ ان کے چچا سارنگ لطیفی سندھی زبان کے مشہور شاعر تھے۔

سارنگ لطیفی کی سندھی رومانیت سے بھرپور شخصیت اور شاعرانہ ساحری نے بھی، باوجود اس کے کہ انہوں نے نیناں کے ذوق شعری کی تربیت نہیں کی، نیناں کی شخصیت پر اثر ڈالا۔

فرزانہ خان ۶ / دسمبر کو کراچی، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ نیناںؔ ان کا تخلص ہے۔ سرسید گرلز کالج، کراچی سے بی اے کیا۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ان کی شادی ہوئی اور بقول فرزانہ کے "جہاز مجھے عقاب کی طرح جھپٹ کر انگلینڈ کی جانب اُڑ گیا۔ وقتی طور پر سات سمندر پار کی کہانیاں، جگنوؤں کی طرح اپنی مٹھی میں پا کر بہت خوش تھی۔ مگر چند ہفتوں میں ہی مسلسل بارشوں، چھوٹے چھوٹے اندھیرے دنوں اور طویل سرد راتوں نے احساس دلایا کہ میرے خوابوں کی تتلیوں کے دیس کے رنگ کسی اور دیس میں رہ گئے ہیں۔ ان دنوں خط و کتابت ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جو کبوتر کی طرح غٹرغوں کر کے مجھے اپنے پیاروں کی باتیں سناتا۔ اپنے دیس کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ کر نیر بہانے پر مجبور کرتیں۔ اداسی بھرے گیتوں سے دل بہلتا اور یہی وقت تھا کہ جب میرے اندر کی شاعرہ نے اپنا روپ اُجاگر کرنا شروع کیا، چھوٹی چھوٹی نظمیں ابھرنے لگیں۔ فن کی باریکیوں و رموز و اوقاف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جذبے خود ہی راہ بنا کر چلنے لگے تھے۔ میرے چچا سارنگ لطیفی اس انکشاف پر بہت حیران اور خوش ہوئے کہ خاندان میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا کوئی اور بھی ہے۔ لیکن وہ ازدواجی زندگی کا ایسا دور تھا جہاں بیشتر خواتین اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو پورا کرنے کی خاطر اس طرح کی صلاحیتوں اور مشاغل کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔

برطانیہ کا شہر نوٹنگھم دو حوالوں سے مشہور ہے، ایک تو رابن ہڈ (Robin Hood ca. 1225) اور دوسرے لارڈ بائرن (George Gordon Byron 1788-1824)۔ رابن ہڈ تاریخی حوالے سے سلطانہ ڈاکو والا کردار ہے اور لارڈ بائرن ادبی حوالے سے رومانی شاعری کا ایک ممتاز نام ہے جب کہ ان کے دور میں شیلے (Percy B Shelly) اور کیٹس (John Keats) بھی انسانی فطرت کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ کیٹس خاندانی حالات اور بچپن میں باپ کی وفات کی وجہ سے انتشار کا شکار رہا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں بھی انسانی قدروں اور رومانس کو بنیاد بنایا۔ یہاں لائبریریوں میں کتابیں میری ساتھی بنیں۔ بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں پر اردو کی کتابیں اور دوسری زبانوں کے اردو تراجم بھی دستیاب ہونے لگے۔ میں راتوں کو دیر تک مطالعہ کرتی اور اپنی پیاس بجھاتی۔ انگریزی شاعری بھی پڑھی۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کی۔ میرے شوہر کی رفاقت میرے حوصلے کو کافی تھی۔ ان کی کمپنی میں بطور ٹیلی کمیونی کیشن (tele-communication) 'انسپکٹر' دس سال ملازمت کی۔ وہاں بھی کافی دل لگا کر محنت سے کام کیا۔ اسی لئے نہ صرف کمپنی کی انتظامیہ ہمیشہ کسی نئے پروجیکٹ (project) کے لئے مجھے ٹریننگ کورسوں پر بھیجا کرتی بلکہ مجھے میرے کام پر انہوں نے 'ان نوویشن ایوارڈ (innovation award)' سے بھی نوازا۔ کبھی کبھار میں ذہنی دباؤ کم کرنے کے لئے ڈائری سے رجوع کر کے نظم و نثر میں باتیں کر لیا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ منجمد برف کچھ پگھلنا شروع ہوئی۔

اول اول جب وقت ملتا تو ذہن کے کونوں کھدروں میں جھانک لیا کرتی تھی۔ شاعری کو سنجیدگی

سے نہیں لیا۔ بالکل آغاز میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں جن میں بچپن کی کسی نہ کسی بات یا منظر کو رنگ دے کر سمو دیا۔ ان میں کئی 'ریڈیو ایشیا' سے 'گیتوں بھری کہانی' کے طور پر پیش کی جا چکی ہیں۔ پہلی نظم بھی ایک کہانی کے طور پر لکھی تھی۔ جنگ اخبار میں 'لوٹ آؤ' کے عنوان سے میری ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو شوق بھی فزوں ہوا۔ میرے شریکِ حیات طالب علمی کے دور میں خود بھی شاعری پر طبع آزمائی کر چکے تھے اور گو کہ بعد میں ان کا رجحان فوٹو گرافی کی طرف زیادہ ہو گیا تاہم انہوں نے میرے شعری ذوق کی پرداخت میں بہت حوصلہ افزائی کی۔ ویسے بھی تصویر کشی اور مصوری کو شاعری کی ہی رشتہ دار قرار دیتی ہوں۔ مشاعروں میں شرکت کے ذمہ دار بھی اختر خان ہیں۔ پہلے پہل ریڈیو پر مشاعروں کی محفلوں میں شرکت پر اُکسایا۔ پھر مشاعرے میں پڑھنے کے لئے بھی انہوں نے زبردستی تیار کیا۔ وہاں اچھے شعراء سے ملاقات کا موقع بھی ملا"۔

میں نے فرزانہ سے پوچھا... "یہاں کے مشاعروں میں شرکت کا تجربہ کیسا رہا؟ بغیر کسی لاگ لپیٹ فرزانہ نے کھل کر کہا... "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ جوں جوں ان محفلوں میں شرکت کی بہت سے نامی گرامی لوگوں کی قلعی کھلتی گئی۔ یہی اہل قلم جو ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے اسٹیج پر جاتے ہی جن خیالات کا اظہار کرنے لگتے ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔ ذاتیات کو اچھالا جاتا ہے، نام نہاد استادوں کی بھرمار ہے، استادوں کو صحیح بات کا علم ہوگا تو وہ سکھائیں گے ورنہ صرف گمراہ ہی کریں گے، اپنے لئے خود ہی تعریف کے پٹارے کھولے رہتے ہیں، اگر آپ بھولے سے کچھ پوچھ لیں تو ہمیشہ کے لئے آپ کے تمام کام پر ان کا ٹھپہ لگ جاتا ہے، ادبی دنیا میں چپقلش بڑھتی جارہی ہے۔ ادب کے نام پر جتنی بے ادبیاں یہاں نظر آتی ہیں وہ کسی بھی نئے لکھنے والے اور بالخصوص خواتین کی حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی اور طبیعت مکدر کرنے کو کافی ہے۔ اگر اہل علم اور بزرگ اپنی ذمہ داریاں نبھائیں، بے لوث طریقے سے اپنا علم بانٹیں تو سیکھنے والا خود اپنی زبان سے آپ کا معترف ہوگا۔ علم سکھانے کے لئے تو ہمارے دین نے بڑی تلقین کی ہے۔ اس موضوع پر فصاحت و بلاغت سے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو عملی طور پر منفی ہی پایا ہے۔ بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود میں کہوں گی کہ ناامیدی گناہ ہے اور اپنی ہمت و حوصلے کو بڑھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔ خواتین شاعرات میں جو حسد نظر آیا ہے اس کو بھڑکانے میں مرد حضرات کا خاصا ہاتھ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کریں۔ شاعری تو ایک ہنر ہے اور ہمیں ایک دوسرے کے ہنر سے لطف اندوز ہونا چاہیئے"۔

اردو زبان اور ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نیناں نے کہا... "اردو میری پسندیدہ زبان ہے کہ میں نے اس میں بولنا، لکھنا اور پڑھنا سیکھا اور اسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں اردو بولنے اور پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ ہندوستان جو کبھی اردو کا گڑھ تھا وہاں بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندی (دیوناگری) رسم الخط میں اردو ادب و شاعری چھپ رہی ہے جب کہ پاکستان، یورپ اور شاید امریکہ میں رومن رسم الخط کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ ممکن ہے ان وجوہ سے اردو پر سے عوام کا اعتبار اٹھتا جارہا ہے اور (جس وجہ سے) ساری دنیا میں اردو

پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے مستقبل میں اس کی ترقی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ کمپیوٹر کے استعمال کی وجہ سے انگریزی زبان نے دنیا کی بہت سی اور زبانوں پر بھی تلوار چلا دی ہے۔ ایک حد تک میں نئی نسل تک رسائی کے لئے رومن رسم الخط کی حامی ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو اردو خط سکھانے پر توجہ نہیں دی جائے، بلکہ یہ توجہ آج کے دور میں دوگنی ہو جانا چاہیئے کیوں کہ جس زبان کے خط سے آپ کی نسل واقف نہ ہوگی اس کے ادب سے بھلا کیا شناسائی پیدا ہوگی"!

فرزانہ نیناں نے اصناف سخن میں حمد، نعت، غزل، نظم، گیت اور ماہیئے بھی لکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان میں فارسی، عربی اور ہندی کے علاوہ بھی اور زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ یوں اردو کے پودے کی پرورش مختلف مٹی سے ہوئی ہے اور آج یہ ایک تناور درخت بن گیا ہے۔ ان کے خیال میں غزل ہمیشہ سے اردو کی سب سے مقبول صنف رہی ہے۔ چونکہ گائیکی میں بھی اس کا ایک منفرد مقام ہے اس لئے دوسری زبانیں بولنے والے بھی غزل سن کر اردو سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل کی وجہ سے ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، سندھی، بلوچی پشتو بولنے والے اردو سیکھ لیتے ہیں۔ بڑے بڑے استاد شعرا کی شاعری غزل گائیکی کی وجہ سے دوسری زبان بولنے والے لوگوں میں مشہور ہے۔ یہ درست ہے کہ نظم نگاری میں آپ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار زیادہ وضاحت سے کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم لوگوں کے حافظے میں زیادہ دیر محفوظ نہیں رہتی، ان گنت غزلیں شاہکار غزلوں کے طور پر لوگوں کو یاد ہیں جب کہ نظم کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ نت نئے تجربات بھی ہو رہے ہیں اور ہوتے رہنے چاہئیں۔ نثری غزل کے تجربات بھی ہو رہے ہیں لیکن معریٰ و مسجع غزل میں جو نفاست، ترنم اور حسن ہے وہ نظم یا شاعری کی کوئی اور صنف حاصل نہیں کر سکی۔ بہت سے لوگ (دوسری زبانوں کے ادب سے متاثر ہو کر) اردو اصناف سخن میں نئے نمونے پیش کر رہے ہیں جو کہ ایک بہت اچھی اور مثبت فکر ہے۔ اہل قلم کو چاہیئے کہ مخالفت کا شور مچانے کے بجائے وسیع النظری کا مظاہرہ کریں تو یقیناً اس سے ہمارے ادب پر خوش گوار اثر پڑے گا"۔

اپنے پسندیدہ اُدبا و شعرا کا ذکر کرتے ہوئے فرزانہ نے کہا..."مختلف حالات میں انسان کی کیفیات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ عمر اور تجربات کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک ہی شعر کو پڑھنے، سننے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک وقت میں جذبے چاند کی ٹھنڈی کرنوں کے مانند نرم اور ملائم بھی ہوتے ہیں تو کسی دوسرے وقت میں یہ سورج کی تیز شعاعوں کی طرح بھی طلوع ہوتے ہیں۔ کبھی رومانوی انداز اچھا لگتا ہے تو کبھی عشق کی حد کی کوئی چیز اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ لہٰذا ان کیفیات سے گزرتے ہوئے میں ایک دائرہ کھینچ کر کسی کو مقید نہیں کر سکتی۔ پھر بھی آپ نے پوچھا ہے تو یہ ضرور کہوں گی کہ غالب کی شاعری زندگی کی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس لئے صدیوں بعد بھی زندہ ہے۔ آج جو بھی اسے پڑھتا ہے اسے اپنے ہی دل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے وہ شروع سے پسند ہے۔ طالب علمی کے دور میں غالب اور علامہ اقبالؔ کو زیادہ پڑھا، انہی کے زیادہ تر اشعار بھی زبانی یاد ہیں۔ علامہ اقبالؔ کے تو ایک شعر کی تشریح میں صفحوں پر صفحے کالے کیئے جا سکتے ہیں۔

اقبالؔ کے ساتھ ساتھ مجھے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام بھی عجیب سرور بخشتا ہے۔ ان کی شاعری

میں سندھ کی تاریخ، ثقافت، لوک داستانیں اور مذہبی حوالے ملتے ہیں۔ شاہ صاحب کی شاعری کو معجزہ ثابت کرنے کے لئے یہ روایت مشہور کی گئی کہ وہ ان پڑھ تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ وہ نہ صرف پڑھے لکھے تھے بلکہ عربی اور فارسی کے عالم بھی تھے اور وہ اپنے ساتھ ہر وقت کلام پاک، مثنوی مولانا روم اور شاہ کریم بلڑی والے کا کلام رکھتے تھے۔ شاہ لطیف کو اس جانِ فانی سے کوچ کیئے تین سو (۳۰۰) سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ان کی شاعری اپنی مثالوں اور محاوروں سے آج بھی مجھے اس دور کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی کافیاں دل میں درد پیدا کر دیتی ہیں۔

میں ابن انشاً کے اسلوب سے بھی متاثر ہوں۔ نثر ہو یا شاعری، جس بے ساختگی اور شگفتگی سے وہ لکھتے تھے ویسے لکھنے والے بہت کم ہیں۔ کئی بار ان کی شاعری و نثر پڑھتے پڑھتے میں نے اپنے آپ کو بنجارن محسوس کیا اور اس ابن بطوطہ کے تعاقب میں نکل پڑی۔

خواتین شاعرات میں اس صدی کی بہت سی شاعرات ہیں لیکن بڑے نام کے طور پر صرف خوش بو کی طرح مہکتی پروین شاکر کا نام لوں گی۔ نسوانی جذبات کو جس حسن اور سچائی سے انہوں نے بیان کیا ہے وہ شاید کوئی اور خاتون صدیوں تک نہ کر سکے۔ ان کے الفاظ میں پھولوں اور کلیوں کی نزاکت ہے۔ مسکراتے ہوئے درد کی پھوار میں بھیگنا، اپنے آپ سے ترنم ریز سرگوشیاں کرنا اور زندگی سے محبت کرتے رہنا ایسا ہے کہ ہر لڑکی کبھی حقیقت اور کبھی دیو مالائی کہانیوں کی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ پچھلی صدی کی سب سے بڑی شاعرہ تھیں اور آنے والی صدیوں تک اس بلند مقام پر رہیں گی۔

باوجود ان تمام شعرا اور اُن تمام شعرا کو پڑھنے کے جن کا میں نے نام لیا ہے اور جن سے میں بہت متاثر ہوں، پتا نہیں کیوں میری اپنی شاعری میں کسی کا عکس نہیں پڑا۔ موسیقی سے رغبت میری شاعری کا ایک بڑا محرک ہے۔ ساز اور شاعری مل کر میری ذات پر عجب خوابناک سا اثر چھوڑتے ہیں۔ جب میں ایسی کیفیت میں ڈوبی ہوتی ہوں تو شعر تخلیق ہوتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ اچھوتی تشبیہیں دوں، انوکھے خیال اور ترشے ہوئے الفاظ استعمال کروں، سحر انگیز ماحول کو قید کرلوں۔ جذبات اور الفاظ تو پانی کے شفاف چشمے کی مانند ہوتے ہیں کہ بہتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کو مٹھی میں بند کر لینا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے بہت اچھے لوگ ملے۔ میں بھی اپنے کسی ایسے محسن کو کبھی نہیں بھولی جس نے مجھے کچھ سکھایا۔ ان لوگوں میں محترم عقیل دانش، محترم اعجاز رحمانی، محترم عبدالغفار عزم اور سب سے بڑھ کر محترم پروفیسر شوکت واسطی شامل ہیں۔ میرے کلام کا پہلا مجموعہ 'نیلی رگیں' جو اجرا کے لئے تیار ہے پروفیسر واسطی کے ادارے نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کے لئے پروفیسر صاحب کا ہی اصرار رہا، ورنہ مجھے تو اپنی شاعری ابھی تک اس قابل نہیں لگتی جو کتابی شکل اختیار کرے۔ ان کے علاوہ میں اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کا اعتراف نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ دونوں کو میری شاعری پر بہت فخر ہے۔ کتاب کے لئے سب سے پہلے میرے بیٹے نے مجھے آمادہ کیا اور کہا کہ بہترین سے بہترین کتاب شائع کرائے گا اور وہ تمام خرچ برداشت کرے گا۔ اس کتاب کی ڈیزائننگ، سرورق سب کچھ ان دونوں نے اپنی مرضی سے تیار کر کے دیا ہے"۔

نوٹنگھم آنے کے بعد فرزانہ نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع کیئے بغیر کئی کورس کیئے۔ جن میں ٹیلی کمیونی کیشن ڈپلوما (Tele-communication Diploma)، کمپیوٹر اسٹڈیز (Computer Studies)، ٹیچر ٹریننگ (Teacher's Training)، براڈ کاسٹنگ اینڈ جرنلزم (Broadcasting & Journalism)، آئی ٹی کنسلٹنٹ (ITConsultant) اور بیوٹی کنسلٹنسی (Beauty Consultancy) اور کئی دیگر کورس شامل ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے پروفیسر شوکت واسطی کے ساتھ مل کر نوٹنگھم میں "بزم علم وفن" کی بنیاد رکھی جس کے تحت شعروادب کے چراغ روشن کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ ادبی اور سماجی کارکردگی کے اعتراف میں انہیں بیسٹ اچیومنٹ ایوارڈ (Best Achievement Award)، حسن کارکردگی ایوارڈ، اپنا آرٹس اچیومنٹ ایوارڈ (Apna Arts Achievement Award) کے علاوہ کمیونی کیشن میں ان نوویشن ایوارڈ (Innovation Award) سے بھی نوازا گیا ہے۔

گفتگو کے اختتام سے پہلے فرزانہ نے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سنایا۔ کہنے لگیں... "ہماری شادی کی سال گرہ پر ہمارے بچوں نے کہا کہ ہمارے لئے انہوں نے لندن میں فلاں فلاں ہوٹل اور فلاں فلاں کنسرٹ (concert) کے ٹکٹ بک کروادیئے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے انگلش کپڑے لے کر وہاں پہنچیں۔ اور باپ سے کسی نہ کسی طرح کہہ کر ایک ہفتے کی چھٹی بھی بک کروالی۔ جب ہم لندن پہنچے تو ایئر پورٹ لے جانے کے لئے ٹیکسی کھڑی تھی۔ بیٹے بیٹی نے ہیپی اینورسری (Happy Anniversary) کہہ کر پاسپورٹ اور ٹکٹ ہمارے ہاتھ میں تھمادیا کہ ہم وینس جارہے ہیں جہاں ہمارا ہوٹل وغیرہ بک کیا ہوا ہے۔ چند گھنٹے میں ہم نوٹنگھم سے وینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت ہی حسین شہر ہے۔ اور اب تک تو یہی سب سے زیادہ خوش گوار واقعہ ہے۔"

Mrs Farzana Nainaan,
56 Glaindell Close, Carlton, Nottingham, NJ4 4FD, UK
e-mail: farzana@farzanaakhtar.com

انتخابِ کلام

آدھی رات کے شاید سپنے جھوٹے تھے — یا پھر پہلی بار ستارے ٹوٹے تھے
مندر میں زلفیں بکھرا کر داسی نے — رقص سے پہلے سارے شیشے کوٹے تھے
اپنے گھر سے بھاگ کے شہر آ پہنچی تھی — بھاگ بھری کے بھاگ کہاں آ پھوٹے تھے
مذہب کی بنیاد پہ کیا تقسیم ہوئی — لوگوں نے ہمسایوں کے گھر لوٹے تھے
ایک نظر کی چنگی نے نقصان کیا — ہاتھ سے چائے کے برتن چھوٹے تھے

اوڑھ کے نیناں پھرتی تھی ساری رات
دل کی شال پہ یادوں کے گل بوٹے تھے

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

وسیم بریلوی

بریلی، اتر پردیش، ہندوستان

مشاعرہ تھا لاس ویگاس میں اور اہتمام کیا تھا خالد خان صاحب نیر نے جو وسیم صاحب کے خاص الخاص دوست ہیں۔ لاس ویگاس امریکہ کا روشن ترین شہر ہے کیونکہ جوئے کے بڑے بڑے اڈوں کی آماج گاہ ہے۔ کسی ہوٹل میں چلے جایئے اس کے جوئے خانے میں ڈالروں کے سکے کھنکھناتے ہیں اور گزرنے والوں کو ایک نظر دیکھنے کی لالچ بھری دعوت دیتے ہیں۔ لوگ رک جاتے ہیں، کچھ بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ سکوں اور ریزگاری کی کھن کھن ٹھن ٹھن کو شعری سوغات کی ترنم ریزی میں گم کرنے نکل جاتے ہیں۔

ہم بھی ان ہی میں سے تھے اور ہمارے ساتھ محترم عبدالرحمٰن صدیقی اور خالد خواجہ تھے جو خالد خان صاحب کی دعوت پر مدعو تھے۔ عشائیے پر مجید اختر، فرحت شہزاد اور ریحانہ قمر سے بھی ملاقات ہوئی جو لاس اینجلس سے آئے تھے۔ پھر مشاعرے میں مقامی شعرا بھی تشریف لائے تھے۔ اس شب مہمانِ خصوصی جناب وسیم بریلوی نے خوب رنگ جمایا۔ خالد خان صاحب نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ لاس ویگاس میں ادبی سرگرمیوں کی ابتدا وسیم بریلوی نے کی ہے اور اردو کو جب بھی نئے خون کی ضرورت پڑی تو کوئی مجاہد اور کوئی کوہ کن آیا اور اس نے راستہ بنایا۔ انہی میں ایک کوہ کن وسیم بریلوی ہیں جنہوں نے علی گڑھ میں جگر مراد آبادی کے بعد شرفِ قبولیت حاصل کی کیونکہ وسیم بریلوی ایک

جادوگر کی طرح سامعین کو مسحور کر لیتے ہیں۔

وسیم بریلوی نے بھی حاضرین سے خطاب کیا اور کہا کہ ہر عہد اور ہر دور کا ادب اپنے لوگوں کی فکر اور سوچ سے پہچانا جاتا ہے اور یہ ہی فکر شاعری کو محفوظ کرتی ہے۔ شہنشاہ اکبر پڑھا لکھا نہ تھا مگر اس نے ایسے نورتنوں کو جمع کر لیا تھا جن کے علم و فکر سے اکبر کے عہد کی شناخت ہوتی ہے۔

وسیم بریلوی نے ریحانہ قمر کے لئے کہا... ''پروین شاکر کے بعد ریحانہ کی شاعری کی آواز مستقبل میں اپنا اعتراف کرائے گی''۔ پھر جب وسیم بریلوی نے اپنے خوب صورت لب و لہجے کی شاعری اپنے دل فریب ترنم میں سنائی تو یہ شعر شاعر اور سامعین کے حسب حال لگا۔

دنوں کا قد گھٹانے کے لئے راتیں بڑی کرنا

بڑے شہروں میں رہنا ہو تو پھر باتیں بڑی کرنا

میری وسیم بریلوی سے دوسری ملاقات ریحانہ قمر کے گھر منعقد کی گئی نشست میں ہوئی۔ وسیم صاحب نے مجھے سہ ماہی مجلّہ ''لمحے لمحے'' عنایت کیا جو بدایوں، اتر پردیش، ہندوستان سے شائع ہوتا ہے۔ یہ شمارہ وسیم بریلوی کے اعزاز میں شائع کیا گیا تھا۔ حبیب سوز اور خان فہیم اس کے مرتبین میں سے ہیں۔ حبیب سوز سمیت بائیس (۲۲) ادیبوں اور شعرا نے وسیم اور ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اکیاون (۵۱) صفحات پر مشتمل اپنا تعارف خود وسیم بریلوی نے حبیب سوز کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ اپنی آرا میں ڈاکٹر مظفر حنفی نے بھی اپنی رائے بڑے سلیقے سے ظاہر کی ہے۔ انہوں نے ''وسیم بریلوی... ایک تاثر'' کے عنوان سے لکھا ہے... ''اب سے کوئی پچیس برس اُدھر ڈاکٹر محمد حسن نے رسالے 'عصری ادب' میں ساتویں دہائی کی اردو غزل کا عمومی جائزہ پیش کرتے ہوئے جن تین چار غزل گو شعرا سے نیک توقعات وابستہ کی تھیں اور جن کی غزلوں کو متعلقہ دہائی کا حاصل قرار دیا تھا ان میں ایک نام ہمارے وسیم بریلوی کا بھی تھا۔ کیسے کہوں کہ میں بھی اپنے اس بھائی سے کچھ اس طرح کی امید رکھتا تھا۔ سچ کہنے کی اجازت ہو تو یہ عرض کروں کہ یہ امیدیں پوری طرح بار آور نہیں ہو سکیں۔ لیکن تا حال مایوس ہونے کی مدت نہیں آئی۔ کاش وسیم صاحب مشاعرے کی ضروریات کو فراموش کرتے ہوئے کبھی کبھار اپنے دل کی بات اپنے خاص انداز میں کہہ لیا کریں۔ یقین کیجئے ایسا قادر الکلام، شریف النفس اور دردمند دل رکھنے والا شاعر شہرت اور دولت کے ان پاٹوں میں پس رہا ہے جنہیں مشاعروں کے کنویز ز (conveners) گھماتے ہیں۔ زبان پر جو دسترس وسیم بریلوی کو حاصل ہے، طبیعت میں جمالیاتی رچاؤ کی جو فراوانی ان کے ہاں ہے (جس کا میں خود شاہد ہوں) اور یہی کچھ وہ چند عناصر ہیں جن کے بطن سے سچی غزل برآمد ہوتی ہے۔ کاش وسیم بریلوی مشاعرے اور ادبی منظر نامے کی دوئی کو وحدت میں تبدیل کر سکیں۔ میں اس دن کا شدت سے منتظر ہوں''۔

وسیم بریلوی کے کلام کے مطالعے کے بعد آپ بھی یہ ہی کہیں گے کہ بلاشبہ وسیم اپنے عہد کی چند معتبر آوازوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو جو ہم نے لاس ویگاس کے مشاعرے میں سنی۔

اپنے چہرے سے جو ظاہر ہے چھپائیں کیسے — تیری مرضی کے مطابق نظر آئیں کیسے
گھر سجانے کا تصور تو بہت بعد کا ہے — پہلے یہ طے ہو کہ اس گھر کو بچائیں کیسے
لاکھ تلوار بڑھی آتی ہو گردن کی طرف — سر جھکانا نہیں آتا تو جھکائیں کیسے
کوئی اپنی ہی نظر سے تو ہمیں دیکھے گا — ایک قطرے کو سمندر نظر آئیں کیسے
قہقہہ آنکھ کا برتاؤ بدل دیتا ہے — ہنسنے والے تجھے آنسو نظر آئیں کیسے
پھول سے رنگ جدا ہونا کوئی کھیل نہیں — اپنی مٹی کو کبھی چھوڑ کے جائیں کیسے

آیئے اب وسیم بریلوی سے ملتے ہیں۔

ان کا نام زاہد حسن ہے۔ ۸/فروری ۱۹۴۰ء کے دن بریلی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ادبی دنیا میں وسیم بریلوی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں کیا۔ والد شاہد حسن نسیم مرادآبادی مرحوم مرادآباد کے ایک بڑے جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ عنفوان شباب میں ایک بنئے شیام سندر کے ہاتھوں ٹھگے گئے اور وسیم کی پیدائش سے پہلے ہی ساری جائیداد گنوا بیٹھے۔ لہٰذا وسیم سمیت پانچ بھائی بہنوں کی پیدائش اور پرورش ننھیال میں ہوئی۔ نانا ضلع بریلی کے پانچ گاؤں کے زمیندار تھے۔ مگر ننھیال میں پرورش پانے والے بچوں کی جو ثانوی حیثیت ہوتی ہے ان کا بھی مقدر ہوئی۔ بچپن سے ذہن کو کئی سوالات پریشان کرتے، جیسے شہروں میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے زمیندار کو کسانوں کی محنت کا پھل کھانے کا حق کس نے دیا؟ دیہاتوں کے چھپتر زمیندار کی حویلیوں کی رونق کا سبب کیوں ہیں؟ یہ باغیانہ خیالات ننھیال میں کسی کو اچھے نہ لگتے۔ پھر بھی ابتدائی درجات سے ایم اے تک انہوں نے تعلیم امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ تعلیم کے بعد ملازمت کا سلسلہ ان کو دہلی یونیورسٹی لے گیا۔ وہاں سے بریلی کالج، بریلی آ۔ بے اور شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے اور وہیں صدر شعبہ بھی رہے۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف آرٹس (Dean Faculty of Arts) کا اعزاز بھی انہیں حاصل رہا۔ جون ۲۰۰۰ء میں کالج کی ملازمت کو خیر باد کہا۔ بارہ (۱۲) تحقیقی مقالے ان کی نگرانی میں لکھے گئے

وسیم کہہ رہے تھے کہ گزشتہ چالیس (۴۰) سال سے انہوں نے ہندوستان کے مشاعروں میں ادب اور مشاعرے میں رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا مجموعہ 'تبسم غم' ۱۹۶۵ء میں، دوسرا مجموعہ 'آنسو میرے دامن میں' دیوناگری رسم الخط میں ۱۹۷۲ء میں، تیسرا مجموعہ 'مزاج' ۱۹۹۰ء میں، چوتھا مجموعہ 'آنکھ آنسو ہوئی' ۲۰۰۰ء میں اور پانچواں مجموعہ 'پھر کیا' دیوناگری رسم الخط میں ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئے۔ 'مزاج' پر اردو اکیڈمی، لکھنؤ کا 'اعلیٰ تخلیقی ایوارڈ' ملا۔ میر اکاڈمی کا 'امتیاز میر'، کلا سنگم، لدھیانہ کا 'غزل ایوارڈ'، آل انڈیا ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ، آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن، الہ آباد کا 'سرسوتی سمان' اور دی عثمانیئنس، شکاگو (Usmaniyaites,Chicago) کا 'نسیم اردو ادب' ایوارڈ کے علاوہ بہت سے اعزاز سے انہیں نوازا گیا ہے۔

تعارف کے ابتدا میں میں نے لکھا ہے کہ وسیم بریلوی کی شخصیت اور شاعری پر اردو کا ادبی رسالہ ''لمحے لمحے'' اپنا خصوصی نمبر ۱۹۹۵ء میں شائع کر چکا ہے۔ اس میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، عبد المغنی، ڈاکٹر تنویر علوی، شمیم کرہانی، نشور واحدی اور رفعت سروش جیسے اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وسیم بریلوی کے فن اور شخصیت پر ڈاکٹر جاوید نسیمی نے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ہندوستان، پاکستان، دوبئی، مسقط، قطر، سعودی عرب سے لے کر امریکہ، کنیڈا تک وسیم بریلوی کا نام مشاعروں کے ادبی اعتبار کی علامت بن چکا ہے۔

وسیم نے بتایا... ''شعر تو آٹھ برس کی عمر سے کہہ رہا ہوں مگر باقاعدگی کے ساتھ اس طرف ۱۹۵۹ء سے متوجہ ہوا۔ پہلا شعر تو نہیں یاد، پہلا مصرعہ یاد ہے۔ عجب کشمکش میں پڑ گئی ہے زندگی اپنی''۔

وسیم بریلوی نے غزل، نظم، گیت، نعت، نوحہ، سلام، قصیدہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی رائے میں نثری نظم نثری غزل بجز ہیان سے زیادہ کچھ نہیں۔ رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں ان کا کہنا ہے... ''رسم الخط بدلنے کی بات اردو ہی کے لئے کیوں اُٹھائی جاتی ہے، کسی اور زبان کے لئے کیوں نہیں اُٹھتی؟ رسم الخط اردو کے وجود کا حصہ ہے۔ اسے باقی رہنا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو کے اعلیٰ تخلیقی ادب کو ہندی اور رومن کے ذریعے بھی پھیلایا جائے''۔

اردو زبان کے حوالے سے انہوں نے کہا... ''اردو زبان ہی نہیں ایک تہذیبی عمل بھی ہے اور تہذیبی عمل کا تسلسل عبارت ہے اہل تہذیب کے زندہ و متحرک ہونے سے۔ اگر اردو والے اپنی ذمہ داریاں سمجھیں تو اردو کے مستقبل سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اردو کو آج کے تقاضوں کے تحت زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل فرض کے بجائے شوق سے اس کی طرف متوجہ ہو۔ ہندوپاک سے باہر اردو کے تخلیقی ادب کے ترجمے کے ذریعے اسے نئی نسل تک پہنچانے کی کوشش ہونی چاہئے تاکہ اپنی میراث کی طرف لوٹنے کا ان میں تجسس پیدا ہو''۔

سوال نمبر ۶ کے جواب میں انہوں نے کہا... ''ترجمان احساس ہونا تخلیق کار کی صلاحیت پر منحصر ہے نہ کہ کسی صنف پر۔ اردو سے وابستگی اپنے وجود کی پہچان ہے اور وجود کی پہچان کو نفع نقصان کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا''۔

وسیم کا کہنا ہے کہ انہیں ہر وہ شاعر متاثر کرتا ہے جو انسان کے وجود اور اس کے مسائل کے حوالے سے شعر کہتا ہے اور تہذیب فکر و نظر کے تسلسل کو رفتار دیتا ہے اور اس حوالے سے ہر قابلِ ذکر شاعر اپنا قد رکھتا ہے۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا... ''میری زندگی کا سب سے یادگار واقعہ یہ ہے کہ اپنی کم مائیگی کے باوجود میں کہیں نہ کہیں ہوں''۔

بلاشبہ وسیم کہیں نہ کہیں ہیں۔ فراق گورکھپوری انہیں اپنا ''محبوب شاعر'' کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں... ''میں وسیم بریلوی اور اس کے کلام دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ مگر کیا کروں یہ ظالم صرف نام کا

مسلمان نہیں بلکہ نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہے اور میں اس کے برعکس ہوں''۔

لاس ویگاس میں ہم نے بھی وسیم بریلوی کو پابندی سے نماز پڑھتے دیکھا اور جب گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ وہ باقاعدہ وظائف بھی پڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر تنویر علوی نے انہیں مترنم شعریت اور غنائی لہجے کا شاعر کہا ہے۔ محشر بدایونی مرحوم نے ان کے بارے میں لکھا تھا... ''وسیم کی محبتیں میرا حصہ جاں ہیں۔ میری محبت و دوستی کا رشتہ ان کی سادگی و شائستگی اور زندہ و توانا شاعری کے توسط سے استوار ہوا ہے''۔

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے میں... ''وسیم بریلوی کے مزاج کی پہچان ہے وارفتگی، اور وارفتگی پیدا ہوتی ہے عرفانِ غم سے۔ وسیم شعر کہتے ہیں تو ڈوب کر اور لفظوں کو برتتے ہیں تو ترنم اور روانی کو پیشِ نظر رکھ کر۔ اس لئے ان کی شاعری تغزل کا لہجہ اختیار کرتی ہے جو ان کی ذات اور زمانے، دونوں سے پیوست ہے''۔ اور اسی ذات اور زمانے سے پیوست شاعری کو میں نے لاس ویگاس میں سُنا۔

Professor Naseem Barailvi,

5, Garhayya, Bareilly, W, U. P. 243003, India

انتخابِ کلام

ملی ہواؤں میں اُڑنے کی وہ سزا یارو
کہ میں زمین کے رشتوں سے کٹ گیا یارو

وہ بے خیال مسافر، میں راستہ یارو
کہاں تھا بس میں مرے اُس کو روکنا یارو

مرے قلم پہ زمانے کی گرد ایسی تھی
کہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہ لکھ سکا یارو

تمام شہر ہی جس کی تلاش میں گم تھا
میں اس کے گھر کا پتہ کس سے پوچھتا یارو

جو بے شمار دلوں کی نظر میں رہتا تھا
وہ اپنے بچوں کو اک گھر نہ دے سکا یارو

جنابِ میر کی خودغرضیوں کے صدقے میں
میاں وسیم کے کہنے کو کیا بچا یارو

☆☆☆☆

تو بھی بکھرنا سیکھ لے اپنے جسم کی پاگل خوش بو سے
میں بھی ہوا جاتا ہوں باہر اندیشوں کے قابو سے

سنگ اُٹھاؤ سنگ کہ دیکھو پتھر ہے پتھر کا جواب
قلعے ڈھانے نکلے ہو اور وہ بھی لرزتے آنسو سے

میرا کہلانے کا مطلب یہ تو نہیں تو میرا ہو
میرا تیرا رشتہ جیسے پھول کا رشتہ خوش بو سے

شاہوں نے بھی شاہی چھوڑ کے پیار کیا تو پیار ملا
دل کی زمینیں جیت نہ پایا کوئی بھی زورِ بازو سے

فطرت ہی آزاد تھی جس کی اس کا درد نہیں جانا
میں نے تو بس یہ چاہا، اپنی مٹھی بھر لوں خوش بو سے

آنکھیں زخمی ہیں تو وسیم اب شکوہ اور شکایت کیا
تم نے بھی تو دیکھنا چاہا دنیا کو ہر پہلو سے

باسمِ ربّی
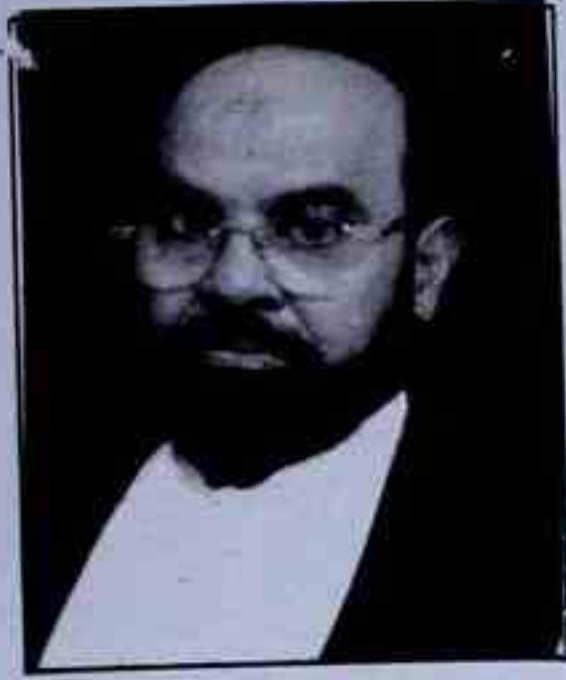
شام کے ہوتے ہر دروازہ اُس کے نام سے کھلتا ہے
ہم کس در پر دستک دیتے ہم تو ٹھہرے بے گھر لوگ

حسن اللہ ہما

حسن اللہ ہما

ابوظہبی، متحدہ عرب امارت

میں اُسے بھول گئی تھی اور آپ میں سے بھی بہت سے لوگ نہیں جانتے ہوں گے کہ حسن اللہ ہما کون ہے۔ میں آج آپ کو اس سے ملوا رہی ہوں اور یہ کہ اس کے بارے میں صرف یہ جملہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ وہ ایک منفرد لہجے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں لفظ بولتے ہیں یا یہ کہ وہ مستقبل کا میر ہے، غالب ہے یا ناصر کاظمی ہے۔ وہ جو بھی ہے، پہلے حسن اللہ ہما ہے۔ وہ جدوجہد کی بھٹی میں تپا ہے۔ تب اس کا فن نکھرا ہے اور اب وہ بڑے اعتماد سے اپنے بارے میں یہ کہنے کے لئے حق بجانب ہے۔

ہم نہ ہوں گے مگر ہمارا نام — لوگ لکھیں گے کل حوالوں میں

اور یہ شعر بھی حسن اللہ ہما کا ہے۔

تھا کون مرے قتل کی دیتا جو گواہی — لوگوں نے تو کھولے نہیں دروازے بھی گھر کے

حسن اللہ ہما کی روداد طویل ہے مگر دلچسپ بھی اور بعض باتیں دل کے نہاں خانوں کو چھو جاتی ہیں۔ حسن اللہ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا اہم واقعہ لکھا ہے۔ جن کا یقین پختہ نہیں وہ اس سچ کو تسلیم نہ کریں مگر ۱۹۸۹ء میں اس راہ سے میں خود گزر چکی ہوں جب خانہ کعبہ میں پہلے طواف سے قبل میں نے میرے خدا سے حجر اسود تک پہنچنے کی تمنا کی تھی۔ ایک ہجوم تھا مگر نہ جانے کس طرح پہلے چکر میں ہی جیسے آپ ہی آپ بھیڑ چھٹ گئی اور

میں حجر اسود کے سامنے تھی۔ ایک شخص کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی "بھائی"۔ اس نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا، راستہ دیا اور میرا سر جھک گیا۔ میری آنکھیں، میرے لب اس مقدس پتھر سے جڑے ہوئے تھے۔ خدائے ذوالجلال کا یہ عطیہ یقین رکھنے والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

حسن اللہ نے جو لکھا ہے اس کی چند سطریں مجھے ان دانشوروں کے سامنے بلاشبہ سرخ رو کردیں گی جن کا اعتراض ہے کہ میں نے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کردیا۔ یا گلاب اور ایک خودرو پھول کو ایک ہی گلدان میں سجادیا۔ چلئے پھر ملتے ہیں ہمارے جو ایک شان سے اس محفل میں شریک ہیں۔ ان کا خط ملاحظہ ہو:

"میں سوچتا ہوں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔ لیکن لکھنے سے قبل ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میری تحریر پڑھتے ہوئے ماتھے پر بل، آنکھوں میں حیرت اور غصے کی کیفیت اور ہونٹوں پر احمق، جاہل اور ست الوجود جیسے الفاظ مچلنے لگیں تو میری تحریر کو پھاڑیئے مت بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ پڑھ لیجیے۔

دو سال قبل کویت سے کمال اظہر نے اپنے خط کے ساتھ ایک 'سوال نامہ سخنور حصہ چہارم' بھیجا تھا، جسے دیکھنے کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تین ہٹی (۱) کے چوراہے سے پی آئی بی کالونی جاتے ہوئے دائیں ہاتھ مڑ گیا اور پھر ایک دروازے پر "سعید بھائی" نے میرا استقبال کیا ہو کہ 'کیا ادھر کا راستہ یاد رہا تھا' یا دفتر جنگ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے آپ نے مسکراتے ہوئے 'کیسے ہو' کہا تھا۔ مگر یہ سب باتیں تیس (۳۰) سال قبل ستر (۷۰) کی دہائی کی ہیں جب آپ روزنامہ جنگ میں صفحۂ خواتین سے وابستہ تھیں۔ جب آپ نے ہر ہفتہ 'آج کی شاعر/شاعرہ' کا سلسلہ شروع کرکے شعرا میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی اور وہ اس صفحے میں اپنے آپ کو شامل کروانے کے لئے رسہ کشی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور اس سلسلے میں آپ پر کس قدر دباؤ تھا اس کا اندازہ ایک آدھ انٹرویو (interview ملاقات/مصاحبہ) سے بھی ہوا تھا۔ خیر یہ سب تو خواب تھا۔ بات سوال نامے کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے جوابات ضرور بھیجوں مگر اس سال ۱۹۹۹ء میں بیٹیوں کی شادی اور دیگر حالات کی وجہ سے اتنا گھر ارہا کہ حسن اتفاق دو روز قبل کالج کے کتب خانے کی کتاب واپس کرتے ہوئے آپ کا سوال نامہ کتب خانے کی نگراں محترمہ ناہید شوکت نے یہ کہتے ہوئے مجھے دیا... "شاید یہ آپ کا ہے" تو یہ سوال نامہ دوبارہ سامنے آیا۔ وہیں تسنیم عابدی بھی تھیں۔ میں نے انہیں یہ دکھایا۔ وہ حیرت سے کہنے لگیں... 'حصہ چہارم تو چھپ گیا، سلطانہ مہر نے اس میں مجھے بھی شامل کیا ہے۔ کیا آپ نے جواب نہیں دیا'۔ ہم چپ رہے۔ ہم ہنس دیئے۔ انہیں کیا بتاتے کہ بہت سے رسائل کے مدیران بیرونِ ملک مقیم شعرا کو صرف اس شرط پر چھاپتے ہیں کہ وہ ان کے رسالے کے سالانہ خریدار بنیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو اس سے اختلاف ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے جو مدیران کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گی۔ یہاں ہر سال کسی نہ کسی رسالے کا مدیر اس امید پر آتا ہے کہ شاید کچھ سالانہ خریدار بنا جائے۔ کئی ایک تو سرورق اور پشت پر پورے پورے صفحے کی تصویر بلکہ چار چار صفحات ایک شاعر کی تصاویر سے بھر دیتے ہیں۔ یہ سب تجارتی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ ایک نے میرا انٹرویو بھی لیا تھا۔ مگر وہ

۱۔ کراچی کا ایک مشہور چوراہا جہاں کسی زمانے میں تین ہٹیاں (دکانیں) تھیں۔

دو سال سے اس انتظار میں ہے کہ میں اس کی توقع پوری کرسکوں۔ مگر میں ایسے انٹرویو یا تصویر کو ادبی
نہیں اشتہاری تصور کرتا ہوں۔ میری اس انا پسندی یا خود شناسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں منعقد ہونے والی ادبی
تقاریب کی رپورٹ سے میرا نام سہواً حذف ہو جاتا ہے یا گروپ تصویر میں پرنٹر میری شکل نہیں دیکھ پاتا۔
یہ اُن کا حق ہے جو جائز بھی ہے اور جس پر وہ قادر بھی ہیں۔ لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں ایک گم نام شہید
ہوں جس کی قبر پر لوگ نام لئے بغیر فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ لیکن دکھ یہ ہے کہ میری تصویر کٹنے سے وہ معصوم
بھی قتل ہو جاتے ہیں جو میرے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بیرونِ ملک مقیم ایسے شعرا جو رموز شاعری،
عروض، مطلع، مطلع المقطع، حسنِ مطلع، ایطا، ایطائے خفی، جلی، گریز اور شترگربہ تک سے ناواقف ہیں، جو ساتویں
اور آٹھویں نمبر کے شعرا میں بھی شامل نہیں کئے جاتے وہ پاکستان میں معروف اور ممتاز شعرا کہلاتے ہیں، جو
یہاں بین الاقوامی مشاعروں میں اشتہارات فراہم کر کے مشاعروں میں اپنا نام شریک کرواتے ہیں وہاں
پاکستان میں اعزازی مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اور اب تو یہ سلسلہ پاکستان میں بھی شروع ہو گیا ہے۔
بقول اوج کمال، مدیر دنیائے ادب... 'پانچ سو (۵۰۰) روپے دے کر مشاعرے میں شرکت کی جاتی ہے کبھی
مہمان شاعر، کبھی میزبان شاعر... یا کبھی دوستی کے ناطے'۔

سلطانہ صاحب! آخر یہ بیساکھیاں کب تک استعمال ہوں گی۔ کیا یہ ادب کی ترقی ہے یا ذاتی تشہیر
کا ذریعہ؟... جشن پیرزادہ کے بین الاقوامی مشاعرے میں ظہور الاسلام جاوید نے مجھ سے کہا "تم اس سال
مقامی شاعر کی حیثیت سے پڑھو گے"۔ پہلی بات تو یہ کہ مقامی شاعر کو معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ دوسرا گلف نیوز اور
خلیج ٹائمز میں چھپنے والے اشتہار میں میرا نام نہیں تھا۔ تیسرا یہ کہ اُس مشاعرے کے مہمان خصوصی سفیر
پاکستان ابوظبی جناب عبدالرزاق سومرو کی تقریر میں نے لکھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ لوگ پرچی کا شاعر تصور نہ
کریں میں نے تسنیم عابدی کے ذریعے مشاعرے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد سلیم جعفری مرحوم
کا ٹیلی فون آیا کہ مشاعرے میں شرکت کرنی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس حیثیت سے، نہ تو اشتہار میں میرا
نام ہے اور نہ ہی تمہارے سووینیر (souvenir یادگاری مجلّہ) میں۔ اور پھر میرے لئے نہ تمہیں ویزا لینا
ہے نہ طعام و قیام کا مسئلہ ہے تو کم از کم اُس معاوضہ کا حق دار تو ہوں جو دوسرے شعرا کو دیا جاتا ہے۔ اگر میری
شرکت مشاعرے کی ضرورت ہے تو اُس احترام کا بھی میں حق دار ہوں جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ وہ
خاموش ہو گئے۔ پھر آج کل مشاعروں میں شعرا کا مقام اُس کی مالی حیثیت، جسمانی شخصیت اور کتاب کی
اشاعت (چاہے اس میں نری بکواس ہو) کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ میرے پاس نہ مرسڈیز ہے، نہ بنگلہ نہ
مرعوب کرنے والی جسامت، تو پھر اس بھیڑ میں گم ہونے کے بجائے ایک گوشے میں بیٹھ کر اُس مورخ کی
تحریر کا انتظار کرنا بہتر نہیں جو ادب کی تاریخ مرتب کر رہا ہے کہ دیکھیں وہ کس کو کس مقام پر رکھتا ہے۔ ممکن
ہے کہ اس کے قلم کی زد پر ہمارا نام بھی آجائے۔ یا ممکن ہے کہ ہم لفظ جوڑنے والی اُس کی فہرست کے معیار
پر پورے ہی نہ اُتریں۔ مشاعروں کی داد یا واہ واہ مقام متعین کرنے کا پیمانہ نہیں۔ یہ تو وقتی جذباتی کیفیت اور
سامع کی سرور کا اظہار ہے۔ میر اور غالب مشاعروں کے محتاج نہیں تھے۔ انہیں جو مقام ملا وہ ان کے دل کی

دھڑکنوں کو شعر میں ڈھالنے کا ثمر تھا۔ "مجھ سے پہلے میر تھا اور اُس کے بعد میں ہوں" کہنے سے کوئی میر کے بعد غالب سے بڑا شاعر نہیں بن جاتا۔ دس دس دواوین کے شعرا گم نامی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں اور زندہ رہنے والا صرف ایک شعر پر زندہ رہتا ہے۔ بہر حال آپ مبارک باد کی مستحق ہیں کہ ادب کی اس بھیڑ میں گم، چیدہ چیدہ اور چنیدہ شخصیتوں کا انتخاب کر کے سخنور میں شامل کر رہی ہیں۔ معلوم نہیں کہ کتاب کی اشاعت تک ہم رہیں یا نہ رہیں گے۔

کہیں کیا عمر کتنی اب ہماری رہ گئی ہے ہوئی سب ختم پونجی ریزگاری رہ گئی ہے

مزہ اُس کا بھی لے لیں گے کسی دن کہ باقی صرف اک کندھا سواری رہ گئی ہے

اُٹھے جاتے ہیں سب احباب سارے ہما صاحب چلو باری تمہاری رہ گئی ہے

امریکہ میں ایک فقیر منش دوست اور بھی ہیں خالد عرفان۔ کہیں مل جائیں تو دوسرے فقیر کا سلام کہیئے۔ دیگر احباب کو سلام مخلص سید حسن اللہ ہما

پسِ تحریر ایک دلی خواہش: میری پوری داستانِ حیات یا زندگی کا رونا پڑھ لیا۔ ممکن ہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنی کتاب شائع نہ کر سکوں۔ بچوں کو خواہش کے طور پر وصیت کر دی ہے کہ وہ صرف میرا نعتیہ کلام اور غزلوں کا مجموعہ ضرور شائع کریں۔

اگر آپ میرے مجموعے "بے خواب آنکھیں اور بے رنگ چہرہ" کے لئے اپنی قیمتی رائے، مشورے، تعارف یا اظہار خیال کے طور پر مضمون تحریر کر دیں تو میں کمپوزنگ کروا کر فائل میں رکھ لوں۔ کیا آپ میری اس خواہش کا احترام کریں گی۔ شکریہ حسن اللہ ہما

مزید اضافی پس تحریر: خط بھیجنے کی تاریخ نہیں لکھوں گا کہ اس سے میری شہرت سے دور رہنے کا بھرم کھل جائے گا"۔

سوال نمبر ایک اور دو کے جواب میں عرض ہے:

"سرزمین دکن نے اردو دانی کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن اردو کی خدمت میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مجھے ۴/ مئی ۱۹۴۴ء کو اسی سرزمین پر عدم سے وجود میں آنے کا اعزاز ملا۔ تقسیم برصغیر ہند کے بعد والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور پشاور میں سکونت اختیار کی۔ میٹرک پشاور سے کیا۔ والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹری کروں۔ مگر تخلیقی ذہن چیر پھاڑ اور وہ بھی انسانوں کی... نتیجہ ظاہر تھا کہ سال اول میں اردو، اسلامیات اور انگریزی کے سوا سائنس کے تمام مضامین میں ممتحن کو ہمارے پرچے جانچنے میں قطعی محنت نہیں کرنا پڑی اور سال دوم میں ہم شان دار طریقے سے فیل ہو گئے۔ پھر کراچی آ کر آرٹس میں بی اے، تعلیمات (ایجوکیشن) میں بی ایڈ، سیاسات میں ایم اے اور اردو کالج سے وکالت (قانون) کے امتحانات پاس کیئے۔ والدین نے نام سید حسن اللہ پاشا رکھا مگر ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ سید کے بعد پاشا کی ضرورت کیا ہے۔ ہم نے ۱۹۶۳ء ہی سے بچوں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اول اول تو رسائل کے مدیران نے ہماری تخلیقات سے ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھرا۔ پھر جوابی لفافہ بھیجنے پر ہمارے یہ ادب پارے واپس بھیجنے

لگے۔ پھر وہ مقام بھی آیا کہ ہمیں ہماری کہانیوں کا معاوضہ ملنے لگا۔ پھلواری، بچوں کی دنیا، غنچہ، ہدایت، کھلونا اور تعلیم و تربیت کے لئے مستقل بلکہ بیک وقت تین تین رسالوں کے لئے قسط وار کہانیاں لکھیں۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے بچوں کے پروگرام میں ۱۹۶۳ء میں پہلی بچوں کی نظم پڑھنے کے ساتھ مائیک کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ کالج مردان کی نمائندگی کرتے ہوئے زرعی یونیورسٹی لائل پور (فیصل آباد) کے پہلے سالانہ کل پاکستان بین الکلیاتی مشاعرے میں شرکت کی اور پہلا انعام حاصل کیا جسے روزنامہ جنگ راولپنڈی اور روزنامہ انجام پشاور نے نمایاں طور پر شائع کیا۔ اُس وقت تک ہم اپنا تخلص ساقی کرتے تھے۔ لیکن ہماری والدہ کی ممانی، ممتاز افسانہ نگار و نقاد، ممتاز شیریں نے ہمارا تخلص ساقی سے ہما کر دیا۔ کراچی آنے کے بعد اردو کالج اور گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کی طرف سے مختلف بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کی اور بے شمار انعامات اور نشانِ ظفر حاصل کیئے۔ تفریحِ طبع کے لئے یہاں یہ بتاتا چلوں کہ جس کالج کے مشاعرے میں غزل میں پروین شاکر، شوکت عابد اور میں ہوتے مشاعرے میں شریک طلبا کہتے اب تو مقابلہ صرف چوتھے انعام کے لئے ہوگا، تین انعامات کے ٹھیکیدار تو آ گئے۔ اسی طرح جامعہ کراچی کے سالانہ مقابلے میں اردو کالج سے ذاکر نسیم غزل میں اور اقبال فریدی نظم میں، ایس ایم کالج سے ہم غزل میں اور خالد قریشی نظم میں شریک تھے۔ غزل اور نظم کا پہلا انعام ہم نے اور خالد قریشی نے اور دوسرا انعام ذاکر نسیم اور اقبال فریدی نے حاصل کیا اور انعامات بھی صرف چار تھے۔ اس نمایاں کامیابی پر دوسرے دن روزنامہ حریت کراچی نے خبر شائع کی کہ آج بابائے اردو کی روح خوش ہوگئی ہوگی۔ طالب علمی کے دوران ریڈیو پاکستان کے بزمِ طلبا کے انعقاد، طلبا کی تربیت اور حوصلہ افزائی میں اُن کا خلوص ہی تھا کہ آج بڑے ناموں کی ایک طویل فہرست میں اکثریت یاور بھائی کے حوالے سے متعارف اور معتبر ہوتی ہے۔

حصولِ تعلیم کے دوران میں نے چار ماہ تک سندھ انڈسٹریل کارپوریشن چاند مارکہ لالٹین میں کام کیا۔ پھر محکمہ پوسٹ میں ملازمت مل گئی۔ اس محکمے میں رہتے ہوئے میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ مگر بعد میں جب میں نے اسے چھوڑنا چاہا تو کمبل مجھے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً میڈیکل گراؤنڈ پر مجھے نجات ملی۔ پھر میں نے پانچ سال کیتانہ میمن بوائز سیکنڈری اسکول کھارادر میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ پھر بانٹوا میمن مدرسے اور پھر اوکھائی میمن اسکول میں وائس پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۷۵ء میں بقول غالب میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ پھر خاندان میں اضافے نے روزگار کے حصول کی طرف سنجیدہ کردیا۔ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لئے رئیس پبلی کیشنز کے عوامی ڈائجسٹ میں بطور معاون مدیر جز وقتی کام کرنے لگا۔ بچوں کے لئے پندرہ کتابی کہانیاں ہدایت پبلی کیشنز کے لئے لکھیں جس کی تصاویر ابن حسن نگار نے بنائیں۔ ابن صفی کے فرضی نام سے عمران سیریز لکھی اور ابن صفی کی اجازت سے امیر بک ڈپو کے لئے ہما کی عمران سیریز بھی لکھی۔ کرنل شجاع الدین کے ماہنامے اسپورٹس ایونٹ اور سندھ گورنمنٹ کے ادارے ساسی (SASI) سے بھی چند دن منسلک رہا۔ شاہ احمد شاہ ایڈورٹائزنگ میں کاپی رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سال بعد وہاں سے ایجوکیشن نیوز میں چلا آیا۔ تین سال تک اس کی ادارت کی۔

۱۹۹۲ء میں رزق نے مجھے متحدہ عرب امارت کی طرف کھینچا اور اس وقت تادمِ تحریر شیخ خلیفہ بن زید عرب پاکستان کالج میں اردو کی تدریس میں مصروف ہوں۔ چھپنے کے لئے ماہناموں کی طرف توجہ نہیں دی۔ بس جنگ کراچی، نوائے وقت، حریت اور جسارت میں کلام چھپتا رہا ہے۔ البتہ نئی کراچی کے شعرا کے تعارف پر مشتمل ایک پرچہ "غزل" مرتب کیا اور ایک پرچہ "عکسِ رسول" شائع کیا جس پر مولویوں (علماً نے نہیں) اعتراض داخل کیا کہ رسول کا سایہ نہیں تھا۔ پرچہ پریس ہی میں ضبط کرلیا گیا۔ اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر کنور ادریس کی عدالت میں پیشی ہوئی۔ میں نے صفائی پیش کی کہ سایہ اور عکس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ام المومنین حضرت عائشہؓ نے قرآن کو رسول اکرمؐ کا عکس قرار دیا ہے۔ مولانا کوثر نیازی، جو اس وقت وزیرِ مذہبی امور تھے، کے تائیدی خط نے اس مقدمے کو خارج کردیا۔ وہیں اپنی پیشی پر حاضری دینے کے لئے کمشنر کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے شہناز گل کو دیکھا جو مصطفیٰ زیدی کے قتل کے کیس میں کنور ادریس کی عدالت میں حاضر ہوئی تھی۔ وہ اپنی حاضری دے کر سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ اسے مکرر قریب سے دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ واقعی مصطفیٰ زیدی شہناز کے عشق میں تھا تو اس کی وجہ بھی تھی اور اُسے حق تھا کہ وہ اس پر چار نظمیں نہیں پورا دیوان لکھتا۔ یہ الگ بات کہ اُس کے حسن سے متاثر ہو کر ایک ڈپٹی کمشنر نے دوسرے ڈپٹی کمشنر کے قتل کو خودکشی گردان کر قاتلہ کو معصوم قرار دے دیا۔

کراچی اور خصوصاً مہاجروں کے مسائل کے حوالے سے ہندوستان کے فلم اسٹار مقری کے بڑے بھائی عزیز مقری کے ہفت روزہ "عزم" کے لئے مہاجر تنظیموں اور مہاجروں سے ہمدردی رکھنے والے سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔ ان ملاقاتوں میں نمایاں نام الطاف حسین، عظیم طارق، ڈاکٹر سلیم حیدر، سید سعید حسن، مولانا احترام الحق تھانوی، عبدالستار ایدھی، بلقیس ایدھی، ڈاکٹر سلطانہ ابراہیم، بیگم شمیم، این ڈی خان، بیگم نور الصباح کے علاوہ اُن ہی دنوں ساداتِ امروہہ کے مشاعرے میں تشریف لانے والے ہندستانی مہمان جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور محترمہ تسنیم صدیقی بھی شامل تھے۔ مجموعہ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں عرض ہے کہ میری نعتوں کا مجموعہ "مطلع انوار" اور غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "بے خواب آنکھیں بے رنگ چہرہ" اشاعت کے لئے میری جیب کی طرف دیکھ رہے ہیں، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ آج کل ادبیات پاکستان کے قیصر حمید صاحب کے حکم اور اپنے ساتھی پروفیسر ظہیر بدر کی خواہش پر "پاکستانی ادب کے معمار" سیریز کے تحت معروف شاعر حضرت راغب مرادآبادی کے فن اور شخصیت پر کتاب مرتب کر رہا ہوں"۔

سوال نمبر تین کے جواب میں عرض ہے... "ہر اچھے ادب کا چاہے وہ شعری ہو یا نثری مطالعہ کرتا ہوں جس سے فکر کو تازگی، روح کو طمانیت اور قلب کو مسرت حاصل ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ میر، غالب، درد، اقبال کے کلام کا شوق سے مطالعہ کرتا ہوں کہ یہ اردو ادب کے مینار ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنے مستقبل کی راہیں متعین کرسکتے ہیں۔ جوش، فیض اور ساحر میرے پسندیدہ شاعر ہیں جن سے میں متاثر ہوں۔ میں نے پہلی غزل ساحر کے مصرعے پر کہی تھی اور شاید صرف ایک شعر پر، جس نے بے پناہ داد حاصل کی تھی، پہلا انعام ملا تھا۔

وطن پرست شہیدوں کا خوں مخاطب ہے   کوئی بجھا سا دیا بھی سرِ مزار نہیں

اب میری زندگی کے دو ایک اہم واقعات ملاحظہ ہوں۔

◆ گزشتہ سال جون میں میں اپنی بیوی، اپنے دوست عامر رحمانی اور اُن کی والدہ کے ساتھ اپنے استاد عبد الرزاق خان زادہ کی کار میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے جا رہے تھے۔ ریاض سے قبل میں نے محسوس کیا کہ مسلسل کار چلانے کی وجہ سے عبدالرزاق خان زادہ پر نیند غالب آ رہی ہے اور گاڑی چلاتے ہوئے وہ توازن برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں۔ اسی دوران ایک بڑا پل نظر آیا۔ میں نے کہا کہ عبدالرزاق گاڑی اس پل کے نیچے کنارے پر روک کر کچھ دیر آرام کر لو۔ انہوں نے ویسا ہی کیا۔ عامر، ان کی والدہ اور میری بیوی بیٹھے باتیں کرنے لگے اور میں اور عبدالرزاق کمبل بچھا کر سو گئے۔ نیم غنودگی کے عالم میں میں نے دیکھا کہ والد مرحوم میرے سامنے کھڑے مجھ سے مخاطب ہیں کہ دوسری مرتبہ حرم شریف اور درِ رسول پر حاضری دے رہے ہو تو تم نے اپنے اندر کیا تبدیلی کی ہے اور وہاں کیوں کر حاضر ہو گے۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرے چہرے پر داڑھی ہے۔ یہ چہرہ مجھے بہت اچھا لگا۔ بیدار ہو کر میں نے بیوی اور دوستوں کو یہ خواب سنایا اور کہا کہ میں داڑھی رکھ یا چھوڑ رہا ہوں۔ اور ریاض پہنچ کر عورتوں کو ہوٹل میں ٹھہرانے کے بعد سید حا حجام کی دکان پر گیا اور خط بنوا لیا۔ جب اس حالت میں ہر دو محترم مقامات پر حاضری دی تو مجھے جو روحانی مسرت حاصل ہوئی اُس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔ صورت بدل گئی، دعا کریں کہ سیرت بھی بدل جائے۔

◆ پہلی مرتبہ ۱۹۹۴ء میں میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے گیا تو جمعہ کا دن تھا۔ حرم میں بہت ہجوم تھا۔ حجر اسود کو بوسہ دینا ممکن نہ تھا۔ نمازِ ظہر کے بعد میں حرم میں بیٹھا خانہ کعبہ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک لبوں پر شکوہ آ گیا کہ اے اس گھر کے مالک، یہاں تو میزبان ہے اور میں مہمان ہوں۔ کیا یہ ہی تیری میزبانی ہے کہ میں حجرِ اسود کو بوسہ تک نہیں دے سکتا۔ یقین جانیئے نہیں معلوم کسی غیبی قوت نے مجھے اپنی جگہ سے اُٹھایا۔ بوسہ دینے کے لئے دو قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ میں ایک قطار میں کھڑا تھا۔ پھر لمحے نہیں گزرے کہ میرے ہونٹ حجر اسود پر تھے۔ آنکھوں میں اشک اور لبوں پر شکر کے کلمات تھے، یہ سب چند منٹوں میں ہوا جب کہ وہاں لوگ آدھے گھنٹے سے قطار میں کھڑے مقام حجر تک پہنچنے کے لئے سرک رہے تھے۔

اقبالؔ نے فلسفہ خودی اور جوشؔ نے فلسفہ حُبِ انسانی کو پیش کیا ہے۔ یہاں حُبِ انسانی کے حوالے سے ایک واقع پیش کرتا چلوں۔

◆ یاور بھائی (یاور عباس) بزم طلبا ریڈیو پاکستان کے نگراں اور عصمت الزہرہ اُن کی معاون تھیں۔ ایک دن یاور بھائی، عصمت الزہرہ، ذاکر نسیم (جو آج کل اردو کالج میں پروفیسر ہیں) اور میں بزم طلبا کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عید قریب تھی۔ ذاکر نسیم نے (ممکن ہے مذاقاً کہا ہو) کہا "یاور بھائی عید پر میں کپڑے کیسے بناؤں گا۔ جیب میں کچھ نہیں..."۔ یاور بھائی نے ذاکر نسیم کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں محبت اور چاہت کی چمک تھی۔ پھر انہوں نے جیب سے بٹوا نکالا اور ذاکر نسیم کو بیس (۲۰) روپے دیتے ہوئے عصمت الزہرہ سے کہا کہ ذاکر کو دو پروگرام دے دو۔ اُس زمانے میں ریڈیو پر ایک پروگرام کے دس روپے

ملتے تھے اور قمیص پتلون بیس روپے میں آ جاتا تھا (کاش وہ وقت پھر لوٹ آئے)۔

یاور بھائی نے ہمیں نکھارا اور سنوارا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ستر (۷۰) کی دہائی میں مشاعروں کی نظامت کے لئے ہمارا نام سرِ فہرست ہوا کرتا تھا۔ بلکہ حیدر آباد سندھ کے شاعر، عزیز جبران نے اپنے کالم (ادبی رپورٹ) میں لکھا تھا کہ ہما کی نظامت ایسے لگتی ہے جیسے منظر ایوبی جوان ہو گیا ہو۔ اور اسی تربیت کا ثمر تھا کہ کراچی کی ایک فیکٹری کے افتتاحی تقریب میں میری نظامت کے دوران مہمان خصوصی صدر پاکستان جنرل محمد ضیا الحق مرحوم نے بار بار مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔ میرے قریب ریڈیو ریکارڈنگ کے لئے یاور بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ جنرل ضیا کی وجہ سے لوگ بھی مجھے دیکھتے۔ میں نے یاور بھائی سے کہا کہ یہ سب آپ کی تربیت کا صلہ ہے۔ آپ نے ہمیں نکھارا ہے اور سنوارا ہے۔ اس میں میری نہیں آپ کی بڑائی ہے۔ یہ واقعات سند کے لئے تحریر کر دیے ہیں"۔

سوال نمبر پانچ کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اردو یقیناً دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اور یہ اہل علم و ادب ہی سے نہیں بلکہ اہل دنیا سے بھی اپنی اہمیت کو منوا رہی ہے۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ خود ہمارے ملک میں، جس کی تشکیل میں اس زبان نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، اردو کو وہ مقام نہیں دیا جا رہا ہے۔ پی ٹی وی کے پروگراموں میں کمپیئر خواتین اردو اور انگریزی کا ایک عجیب مرکباتی انداز اختیار کیئے ہوئے ہیں کہ اسے سن کر حیرت ہوتی ہے۔ پھر اردو میڈیم اور انگریزی میڈیم کے طور پر نظام تعلیم کی تقسیم اور سب سے بڑا ظلم اردو کو خود اہل زبان کا اس کو ٹکسالی زبان کہہ کر مقامی زبانوں کے اثرات سے اس کو الگ تھلگ رکھنا اور مقامی دانشوروں کا اسے طوائفوں کی زبان قرار دینا، یہ سب اردو کے مستقبل میں سدِ راہ ہیں (۱)۔ پھر بھی میرا ایمان ہے اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اس کا ثبوت مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں اردو سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ یہاں اظہار کا سب سے مضبوط ذریعہ اردو ہے۔ ہوٹلوں سے دفاتر تک اردو ہی پہلے نمبر پر ہے۔

اب آخر میں یہ عرض کر دوں کہ انسان اپنے خیالات کو خوب صورت انداز اور آسانی کے ساتھ پیش کر سکے وہی صنف اختیار کرے۔ آج کل نثری نظم میں خوب صورت تجربے ہو رہے ہیں جو لوگوں کو متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کو متاثر بھی کر رہے ہیں۔ لیکن نثری غزل کے بارے میں عقل حیران ہے۔ غزل کا نام ہی، بحر ردیف اور قافیے کی پابندی ہے اور یہ ہی غزل کا حُسن ہیں۔ دو مصرعوں میں ایک مکمل بات ردیف اور قافیے کے ساتھ سجا کر کہنا ہی کمالِ فن ہے۔

مشاعروں میں شخصیت، دولت اور شخصی تعلقات کے ذریعے اپنے آپ کو بڑا بنانے اور شہرت حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہے۔ ان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ اردو زبان، خواہ منجمد ہی سہی، زندہ رہ سکتی ہے کیوں کہ مشاعروں میں وہی دس پندرہ سال پرانی غزلیں اور نظمیں نشۂ مکرر کے طور پر پیش کر کے شاعر کی انا کی جہاں تسکین ہوتی ہے وہیں سامعین کے کانوں میں اردو کے دو بول پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ تخلیقی نشستوں

۱۔ اردو کے اہل زبان یعنی لکھنؤ اور دلی والے اپنی زبان کو ٹکسالی زبان کہہ کر اس میں مقامی بولیوں (سندھی، بلوچی، پنجابی وغیرہ) کے الفاظ داخل کرنے کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح اردو کے خلاف ایک تعصب کا رویہ پیدا کرنے میں معاون ہیں شاید اسی وجہ سے ایک سندھی دانشور نے ایک بار اس زبان کو طوائفوں کی زبان کہنے میں عار محسوس نہیں کیا۔ (سلطانہ مہر)

کے ذریعے ہر نشست میں نئی تخلیق سے اردو کی پرورش ہو سکتی ہے جس سے اسے نئی طاقت اور توانائی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ لکھنے کے لئے پڑھنا پڑتا ہے اور پڑھنے سے ذہن کھلتا اور وسیع ہوتا ہے جس سے نئے استعارے، نئی تشبیہات اور نئے الفاظ تخلیق کرنے کا موقع ملتا ہے اور یہ ہی کسی زبان کی غذا ہوتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا نے ذہنوں کو مسخر کرلیا ہے جس سے قاری کا رشتہ کتاب سے ختم یا ٹوٹ گیا ہے۔ حالانکہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت زیادہ ہے کہ یہ ایک بار چھپ کر تا حیات محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ عوام کی قوتِ خرید کے اندر ہو۔ اخبارات اور رسائل کی قیمتیں، اشتہار کی موجودگی کے باوجود، ایک عام قاری کی سکتِ خرید سے باہر ہیں۔ مجموعوں کی اشاعت کا مقصد بھی قاری تک ان کی رسائی ہونا چاہیئے نہ کہ ان سے ہزاروں کے منافع کی امید۔

تنقید کا مقصد کسی ادب پارے کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر کرنا ہے۔ مگر آج کل نام نہاد نقاد تنقید کی کند چھری سے دوسروں کی عزت نفس کا قتل کرتے ہیں۔ وہ یا تو دوسروں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں یا پھر اپنی شہرت کے لئے ایسی بے جا تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں جو نہ تو اس ادب پارے میں ہوتی ہے اور نہ اس کے جنم دینے والے کی۔ ادب کی ترقی و ترویج کے لئے تنقید اور تنقیدی نشستیں بہت ضروری ہیں مگر اس کے لئے پہلے ہمیں صحیح اور انصاف پسندی کے ساتھ ایسے تنقید نگار پیدا کرنے ہوں گے جو واقعی اُس فن پر دسترس رکھتے ہوں، جو سچ کو سچ اور غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ یہ کام بہت مشکل ہے کیوں کہ اس میں لگتی ہے محنت زیادہ...، ورنہ من ترا حاجی بگویم تو مرا مُلّا بگو... تو بہت ہیں اور مل جائیں گے۔ وَمَا عَلَینا اَلّاالبلاغ ۔ شکریہ"۔

Mr. Hasan-ul-lah Huma,
Department of Urdu, Sheikh Khalifa bin Zayed Arab Pakistan College,
PO Box 46255, Abu Dhabi, United Arab Emirates

انتخابِ کلام

زندہ ضمیر لوگ تھے جبر رقم تو ہونا تھا — ہاتھ قلم ہوئے تو کیا سر بھی قلم ہونا تھا
کب تک اٹھائے پھرتے یوں عمر کا بوجھ گو بگو — شاخِ بدن کو آخرش بوجھ سے خم تو ہونا تھا
سر پر تھی چادرِ انا سو وہ بھی چھین لی گئی — ہم سے غریبِ شہر پر یہ بھی ستم تو ہونا تھا
تیرا خیال چاندنی، تیرا خیال کہکشاں — ساتھ رہا سفر میں جب، فاصلہ کم تو ہونا تھا

وہ جو رہے ہیں رازداں، وہ جو رہے ہیں نزدِ جاں
ان پر کرم ہوا تو کیا؟ اُن پر کرم تو ہونا تھا
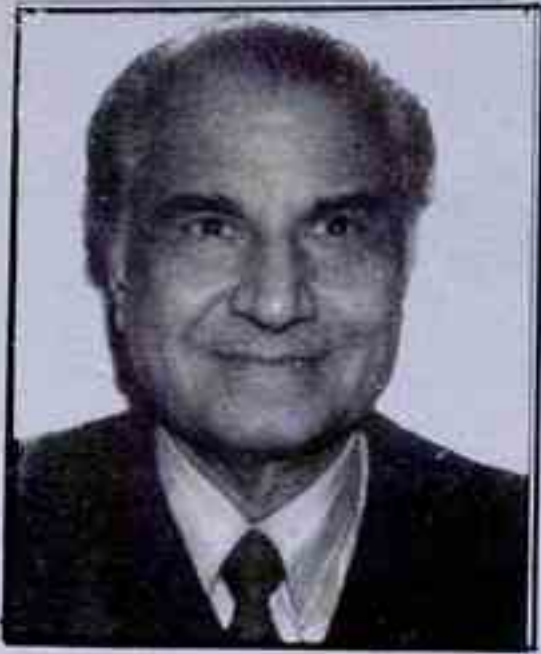
مجھ نغمے تری یاد ہے اور تیرا تصور
ہر دیس کے زخموں کے لیے خاکِ شفا ہے
جانا نہ مجھے چھوڑ کے اے قافلے والو
ہمدم بھی تو منجملہ اربابِ وفا ہے
سید حسن جہانگیر ہمدانی ہمدم

سید حسن جہانگیر ہمدانی ہمدمؔ

سان فرانسسکو، امریکہ

کم عمری میں یتیم بن جانے کے ساتھ ساتھ حصول علم کی محرومی نے جب مجھے مایوسی کے اندھیرے کنوئیں میں قید کردیا تب علم کی پیاس کانٹے بن کر سارے کے سارے وجود کو زخمی کرگئی تھی۔ بس پھر جب جب راتوں کے پچھلے پہر آنکھ کھلتی میں اپنی ہم سفر کتاب سے باتیں کرتی ہوئی اپنے رب سے دعا مانگنے لگتی۔

اے مرے ربِ جلیل
اک عنایت چاہتی ہوں
تو نے موسیٰ کو بنایا تھا کلیم
اک نظر اپنے کرم کی کر ادھر
میں کہ ہوں اک ناتراشیدہ صنم
مجھ کو ایک پارس عطا کر
لمس جس کے علم کا
کندن بنادے گا مجھے

یقیناً قبولیت کی کوئی گھڑی تھی کہ ربِ جلیل نے مجھے علم کے آب دار زر و جواہر سے استفادے کا موقع دیا۔ میں ان کے علم کے لمس کی روشنی میں آج اپنی بکھری سوچ کے موتی پروتی ہوں۔

ان ہی آب دار زر و جواہر میں ایک ہیرے جیسی شخصیت کا نام ہے سید حسن جہانگیر ہمدانی۔ جن کا شعر ہے۔

رونق محفل کا دعویٰ ہے فضول جب کہ ہمدم اس میں ہمدانی نہیں

ڈاکٹر حسن جہانگیر کو خود رونق محفل ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن بلا کے خطیب ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں تو علم کے دریا بہاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ آسمانِ علم کے مہتاب ہیں۔ میری نظم کے یہ چند مصرعے ان کی نذر ہیں:

اے ہمہ دان ہمدانی
جب جب تو حرفوں کی مالا گوندھے
تب تب چاند سے کرنیں پھوٹیں
اور گھور اماوس راتوں کا
ہر پل اُجلا اُجلا ہو جائے

جو میں نے ان کے بارے میں کہا ہے اس سے یقیناً وہ احباب اتفاق کریں گے جنہوں نے ان کی خطیبانہ گفتگو سنی ہے۔ یہی نہیں، امریکہ میں جن اساتذہ نے اردو شاعری و ادب کو نکھارا سنوارا ہے ان میں ایک نام سید حسن جہانگیر ہمدانی کا بھی ہے۔ فن کی لگن انہیں ہر دم بے چین رکھتی ہے۔ وہ اپنا آرام، اپنی نیند، اپنا چین سب کچھ علم کی ترسیل کی نذر کیئے ہوئے ہیں۔

جہانگیر ہمدانی بڑے دل نواز لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ترنم سے پڑھتے ہیں تو اربابِ محفل ایک سحر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں عالم اسلام کے دکھوں کی فریاد ہے۔ ارضِ فلسطین پر انہوں نے بعنوان "انتفادہ" ایک نظم کہی ہے جس میں ایک روشن مستقبل کی نوید ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

اے فلسطیں سر زمینِ قبلہ گاہِ اولیں — مرکزِ رشد و ہدایت منبعِ حق الیقیں
سر زمینِ رحمت و انوار ہیں تیرے فلک — آسمانِ عظمت و تقدیس ہے تیری زمیں
تُو دمِ عیسیٰؑ کا مظہر، تُو یدِ بیضا کا نُور — تُو فروغِ خاکِ پائے رحمۃ اللعالمیں
تیرا سینہ مخزنِ معراج و شانِ انبیا — تو امین و رازدارِ عظمتِ روح الامیں
شوکتِ عزمِ صلاح الدینؒ کا شاہد ہے تو — قلبِ مغرب میں ابھی تک جس کی ہیبت جاگزیں
انتفادہ آرزوئے حریت کی آبرو — خاتمِ حق و عدالت کا درخشندہ نگیں
آبروریزی زمینِ پاک کی جس نے بھی کی — سنگ ساری کی سزا ہے اُس پہ از شرعِ متیں
ہٹلر و نمرود کے مانند مارے جائیں گے — یہ شیروں[1]، شمیر[2] و بیگن[3] و ازحک رے بن[4]
عظمتِ فاروقؓ اعظم کی مجھے ہمدم قسم — پھر سے چومے گی قدومِ حریت یہ سرزمیں

۱۔ Ariel Sharon ۲۔ Shamir ۳۔ Menaham Began ۴۔ Ytzak Rabin

"بھائی حسن جہانگیر!" میں نے ان سے پوچھا... "آپ کی آواز میں بڑی مدھرتا ہے۔ آپ ترنم سے پڑھتے بھی ہیں تو پھر آپ بجائے ایک گلوکار بننے کے استاد کیسے بن گئے"؟ ہنس کر بولے "... گلوکار تو نہیں ہاں موسیقار بننا چاہتا تھا۔ خواجہ خورشید انور آئیڈیل تھے۔ مرحوم بابا چشتی اور عبدالحق قریشی (میوزک ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان، لاہور) کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن سادات آڑے آ گئی۔ ان حضرات نے یا تو ہمیں موسیقی کے قابل نہیں سمجھا یا موسیقی کو ہمارے قابل نہ جانا۔ بات ایک ہی ہے اور نتیجہ بھی ایک ہی برآمد ہوا کہ ہم بے سُرے کے بے سُرے ہی رہ گئے۔ لیکن ان عظیم فن کاروں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے تادم تحریر دل کے خرابے میں خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعروشاعری کی نسبت سے کالج کے زمانے میں ناصر کاظمی، شہزاد احمد، صوفی تبسم، حبیب جالب، منیر نیازی کی محبت سے لطف اندوز ہوا اور جناب احسان دانش سے اصلاح لی"۔

"آپ نے نظمیں بھی خوب کہی ہیں۔ آپ کی نظم کے بارے میں کیا رائے ہے"؟ حسن جہانگیر صاحب نے جواب میں فرمایا۔ "عاجزانہ توفیق وبساط کے مطابق قریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن تغزل کے غلام ہیں۔ غزل اگرچہ حدود وقیود رکھتی ہے لیکن تنوع کا بھی یہ عالم ہے کہ پہلا شعر اگر شراب کے بارے میں ہے تو دوسرے رب العزت کی ربوبیت کے بارے میں۔ یہ وسعت نظم کو نصیب نہیں۔ نظم اگرچہ محتاج قید وبسط نہیں لیکن اس کو شتر بے مہار گردانا جذبات کا بیان کرنا بھی بلکہ جذبات سے کھیلنا ہے۔ ایسے ہی اپنی روایتی شاعری کو گل وبلبل کا فسانہ بتانا، تنقید وتجزیہ کا منہ چڑانا ہے۔ گل وبلبل، صیاد وگل چین کل کے سیمبل (symbol استعارے) تھے اور تیشہ وسنگ، کسان ومزدور، سرمایہ داری اور حقوق انسانی آج کے۔ داغؔ زبان کے، انیسؔ منظرکشی کے، غالبؔ فکر کے اور میر درد کسک کے اعلیٰ ترین عکاس ہیں۔ جگرؔ، حسرتؔ، اقبالؔ اور فیضؔ ستارگانِ سپہ زبان ہیں"۔

"اب اپنے بارے میں بتایئے۔ آپ کا تعلق کس سرزمین سے ہے۔ تعلیم کہاں حاصل کی وغیرہ وغیرہ"۔ بڑے مزے سے ہنس کر بولے... "سید حسن جہانگیر ہمدانی نام، ہمدم تخلص، اردو انٹرنیشنل گلڈ (Urdu International Guild) کا دیا ہوا لقب "سحاب سخن" ہے۔ یہ خادم سخن ۱۴/ اگست ۱۹۴۰ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے جد امجد سید محمد عظیم ہمدانیؒ، جو حضرت امام صادقؑ کی اولاد سے تھے، ۱۶۸۰ء میں ہمدان (ایران) سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھے۔ موصوف صاحب سیف وقلم تھے۔ تاریخ ہمدان اور رقعات فیضی آپ کی تصانیف ہیں۔ والد مرحوم سید نذر حسین سلیم دہلی کے 'تھانہ فیض بازار' کے ایس ایچ او تھے۔ پولیس سروس سے پہلے شہرہ آفاق جریدے 'صلائے عام' کے نائب مدیر تھے۔ 'صلائے عام' کے مدیر اعلیٰ آفتاب صحافت میر ناصر علی مرحوم تھے جو رئیس دہلی کے علاوہ ریاست پٹودی کے دیوان بھی تھے۔

خاندان کے معروف بزرگوں میں سید امید علی کوتوال دہلی، حافظ سید معصوم علیؒ دیوان بیگم

ریاست دوجانہ، مولوی سید احمدؒ صاحب مرتب فرہنگِ آصفیہ اور سید دیدار علی شاہ الوریؒ قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ ان کی قبور کو نور سے بھرے، آمین۔ خاندان کے اکثر افراد شعر و شاعری سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ حقیر کا سارا خاندان نواب سراج الدین خان سائل دہلوی، شاگرد و داماد حضرت داغ دہلوی کے تلمذ تھے۔ ان اعزہ میں تایا سید اصغر علی، سید فدا حسین اور قبلہ والد مرحوم شامل ہیں۔ والد مرحوم کے مضامین اور شاعری 'الامان' اور 'صلائے عام' جیسے جریدوں کی زینت بنتی تھی۔ آپ جیسا نیک اور جامع صفات انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔

دل کی دھڑکن سے فقط تیری صدا آتی ہے	یوں فنا ہونے سے پہلے یہ بقا پاتی ہے
ایسی دنیا میں تو پہنچا ہے کہ جب بھی تیری	یاد آتی ہے تو جنت کی ہوا آتی ہے

آپ نے تعلیم کے بارے میں پوچھا ہے تو ناچیز کی رائے میں دنیا کی تین عظیم درسگاہیں ہیں۔ ایک گورنمنٹ کالج لاہور، دوسری میک گل یونیورسٹی مانٹریال (McGill University Montreal) اور تیسری یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے (University of California Berkeley)۔ آپ کا یہ حقیر بھائی ان تینوں سے بحیثیت طالب علم اور استاد وابستہ رہا ہے۔ میں نے بی اے آنرز اور ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور پی ایچ ڈی برکلے سے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ لسانیات میں بائیس (۲۲) سال کی عمر میں لیکچرار بنا۔ اور ۱۹۶۳ء میں میک گل یونیورسٹی نے فیلو کی حیثیت سے مدعو کیا۔ جہاں دیگر رفقاءٗ کے ساتھ اردو درس و تدریس کی چھ ہزار (۶۰۰۰) صفحات پر مبنی چار ضخیم کتابیں تصنیف کیں جو الحمد اللہ شمالی امریکہ کی تمام یونیورسٹیوں میں نصاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں لیکچرار کی حیثیت سے برکلے میں آیا اور تب سے برکلے کا ہو لیا ہوں اور اسی علاقے میں تا حال آباد ہوں۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے اردو زبان بحیثیت مضمون کسی کلاس میں نہیں پڑھی۔ انگریزی ادب، لسانیات، فارسی اور تاریخ میرے مضامین تھے۔ لیکن اردو زبان گھٹی میں پڑی ہے اور اس کا احساسِ عظمت پنگھوڑے سے۔ تب ہی تو افتخاریہ طور پر یہ کہہ دیا۔

سب زبانوں سے ہے شیریں یہ زبانِ اردو	کانِ الماسِ معانی ہے دہانِ اردو
اُس پہ دنیائے دَنی کا نہ ہو سودا غالب	جس کی حیرت میں سمایا ہو جہانِ اردو
وہ تو سرکارِ دو عالمؐ کی خوشی تھی مقصود	ورنہ قرآں بھی اُترتا بہ زبانِ اردو
پاکے شہ پارۂ تفسیر و حدیث و تاریخ	شاید اللہ ہو مخاطب بہ زبانِ اردو

(ماخوذ از منظور دہلوی...زبانِ دہلی)"۔

اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں ہمدانی صاحب کا کہنا ہے..."رسم الخط، لسانیات کے نقطۂ نظر سے کوئی مثالی، اور حتمی خطی فیصلہ نہیں ہے۔ ہمارا رسم الخط اس لئے ناقص ہے کہ اس کے اعراب نہ صوتی طور پر سمجھے جاتے ہیں اور نہ ہی بولے جاتے ہیں۔ اگر زبان کو صوتی (phonetic)

طور پر پڑھایا جائے تو موجودہ اعراب جیسے زیر، زبر اور پیش کے علاوہ مزید اعراب متعارف کرائے جاسکتے ہیں اور اُن کو سختی سے نافذ کیا جانا چاہیئے۔

'خواجہ' اور 'خواب' لکھا جاتا ہے لیکن 'خاجہ' اور 'خاب' بولا جاتا ہے۔ 'معلوم' لکھا جاتا ہے لیکن 'مالوم' بولا جاتا ہے۔ اسی طرح 'س، ث اور ص' کی ایک ہی صوتیاتی حیثیت ہے اگرچہ عربی زبان میں الگ اور منفرد ہے۔ دوسرے مغربی زبانوں اور موجودہ ٹیکنالوجی اور ایجادات کی الفاظ کا لکھنا، صحیح اعراب کی غیر موجودگی میں خاصا ادق کام ہے۔

اردو رسم الخط کو بدلنا اور رومن رسم الخط کو اختیار کرنا نہ صرف لسانی غلطی بلکہ اپنے ورثہ سے خیانت ہوگی۔ اتاترک نے ترکی زبان میں یہ جسارت کر کے ترکوں کو آن کی آن میں تمام عثمانی اور اسلامی ورثے سے منقطع کرڈالا۔ اور اُس کا یہ ارمان بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا کہ ترکوں کو یورپی منوالیا جائے۔ ذرا فرانسیسیوں اور المانوی عوام سے پوچھیئے کہ ترک ایشیائی ہیں یا یورپی۔ کوا چلا ہنس کی چال والی بات ہے۔ مجھے دکھ اور افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں وہ کتابیں جو عثمانی رسم الخط میں تھیں، ترک قوم ان کے فیض سے یکسر محروم ہوگئی۔

علاوہ ازیں آج کل کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا ایک ادنیٰ لیکن باوقار معجزہ ہے۔ اس کے افادی اعجاز سے فائدہ اُٹھا کر ہمارا مروج رسم الخط نہ صرف ایک انتہائی باعمل خط بن سکتا ہے بلکہ اپنی رعنائی و زینت سے محروم بھی نہ ہوگا۔ زبان ایک قوم کی ذہنیت کا اظہار ہے تو رسم الخط اس کی زیبائش ہے۔ تاریخی پس منظر میں ہمارا رسم الخط، مغرب کے حُسن سنگ تراشی کا فصیح و بلیغ جواب ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اسی نسبت سے دنیا بھر میں مقبول ہوئی ہے۔ اگر خدانخواستہ رسم الخط تبدیل کردیا گیا تو ہم اپنے عظیم ورثے اور اس کے شہ پاروں سے محروم ہوجائیں گے، موتی کی آب، ہیرے کی تاب اور دوشیزہ کا بکر و حجاب ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائے گا۔

ہم اگر اردو کی بقا چاہتے ہیں اور اپنے تہذیبی ورثے سے جڑا رہنا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ، اور خصوصاً ان لوگوں پر جو مغرب یا شمالی امریکہ میں آبسے ہیں، اپنی لسانی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی روایات کو برقرار رکھیں۔ اور اس کی شرط اول یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی اپنی آبائی زبانیں بولیں اور اپنی مذہبی روایات پر ایمانداری سے عمل کریں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم خود تو حکمِ خدا کے باوجود نماز نہ پڑھیں اور بچوں کو غیض و غضب کی آنکھوں سے نماز پڑھوائیں۔ خود قرآن پاک سے بے نیاز ہوں اور بچوں کو نیاز دینے والے مولانا صاحب کے حوالے کردیں۔ یا روزے رکھ کر اپنے امریکی دوستوں کو بتائیں کہ آج ہم ڈائٹ (diet) پر ہیں۔ ایسا رویہ نہ صرف منافقت ہے بلکہ احساسِ کم تری کے جذبے کو جنم دیتا ہے جس کا ہمارے ممالک اور خاص کر وہاں کے حکمراں طبقہ شکار ہے"۔

ان کی زندگی کا اہم واقعہ بھی بڑا پُر لطف ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہے تھے۔ "۱۹۷۸ء میں ایک مرتبہ لاس اینجلس ایک بین الاقوامی مشاعرے کی صدارت کی غرض سے گیا۔ وہاں ایک

نوجوان خاتون اسٹیج پر آئیں۔ وہ شاعرہ تو نہ تھیں لیکن انہوں نے نہایت شاندار طریقے سے ساحر لدھیانوی مرحوم کی ایک انقلابی نظم پیش کی۔ ساحر مرحوم کی نظم میں سحر یا انقلاب تھا یا نہیں تھا یہ تو خدا جانے لیکن موصوفہ کی ساحرانہ پیش کش ہماری زندگی میں انقلاب لے آئی۔ ان کی سحر آفرینی کے صدقے ہماری شامِ الم ڈھلی، تنہائی کے بادل چھٹ گئے اور دردِ فراق کی سرد مہر ہوا نسیم سحر بن گئی۔ لوگ جادو اور اُس کے اثر سے بچتے پھرتے ہیں اور ایک ہم ہیں اُسی جادو کے زیرِ اثر ماشاءاللہ تین جوان و شکیل بچوں سید احسن عباس، سیدہ اسماء جہانگیر اور سید زماں مصطفیٰ کے والدِ محترم ہیں۔ اور ان تینوں کی جنت جس کے قدموں میں ہے وہ پاکستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سابق مشہور فن کارہ میری رفیقۂ حیات سحاب مقبول ہمدانی ہے"۔

چشمے پھوٹیں ہیں حسن جاناں سے	جن میں نہرِ شبابِ بہتی ہے
جس سے شرما کے چاند چھپ جائے	اُس کو دنیا سحاب کہتی ہے

اب ان کی ایک دعائیہ حمد بعنوان "انوارِ تجسس"، ملاحظہ ہو:

الحمد کے لائق ہے تری ذات خداوند	ہے قبضۂ قدرت میں فقط تیرے در و بند
تو واحد و قدوس ہے خالق ہے جہاں کا	ہر ذرہ یہاں کا ہے ترے حکم کا پابند
خورشیدِ سحر ماہ فلک عقدِ ثریا	گردش میں سبھی پر سبھی لولاک کے پابند
گل زارِ جہاں کی سبھی رعنائی ہے تجھ سے	گل بانی و گل بازی و گل باری و گل قند
ہیں ذرۂ ناچیز تری شان کے آگے	البرز و ارارات و ہمالہ ہو یا الوند
دانائی یونان و یمن اُن پہ تصدق	شادابیِ گیلان و بخارا و سمرقند
اُمّی ہے لقب اُن کا مگر خالقِ کُل نے	حکمت کے سمندر کو رسالت میں کیا بند
کُھل جاتے ہیں اسرار و رموزِ جہاں اُن پر	جو عالمِ جبروت میں رہتے ہیں قلعہ بند
دریائے فصاحت کی اُنڈ اِس کو سمجھیے	جو کلکِ گہر بار سے ہو جائے قلم بند

گر جاں کی اماں پاؤں تو پوچھوں میرے مالک
گستاخی اگر ہووے تو کر ڈالیو منہ بند

کب چاند ستارے میری نقد میں ہوں گے	تسخیر بر و بحر ہو توقیرِ خرد مند
کیوں عدل و تقدیر کا در وا نہیں ہوتا	کیوں ہم پہ مسلط ہیں یہ چنگیز کے فرزند
کب بازنیا، پیچ نیا، القدس بنیں گے	رحمت سے تری خیبر و یرموک و نہاوند
یاں مالک و مزدور کے رشتے کی حقیقت	کب طوقِ ملامت سے بنے حرزِ نکومند
کیوں ظلم کے ہاتھوں میں مسلسل ہے خدایا	قرطاس بھی قاموس بھی قانونِ خردمند
کیوں عظمتِ آدم ہے ملی خاک میں اس جا	کیوں پنجۂ اغل میں ہے تقدیرِ ہنرمند
تو قادرِ مطلق ہے میں مطلق ترا بندہ	نسبت بڑی گہری ہے مگر فاصلہ ہر چند

اتنی سی گزارش ہے اگر نظرِ کرم ہو ناچیز پہ دروازۂ رحمت کو نہ کر بند
ممکن ہے کہ اورنگِ تقدس پہ ہو فائز ناقدری و ارزانی اربابِ ہنر مند
ظلماتِ جہالت کو دے انوارِ تجسس کر شوخیٔ تنویر کو مٹھی میں مری بند
بس تھام لیں "حبل اللہ جمعینا" (ا) کو خدایا
ندوہ و بریلی و نجف ازہر و دیوبند

Dr. Hasan Jahangir Hamdani Hamdam,
2331 Collins Avenue, Pinole, CA 94564, USA
e-mail. ronaq2000@yahoo.com

انتخابِ کلام

غلغلہ ایسا یہاں برپا کریں جام بن کر لختِ دل چھلکا کریں
خونِ دل اب کے نچوڑیں اس طرح جوشِ مستی سے یہ دل مینا کریں
میں وہ خاکی ہوں فرشتے دیکھ لیں اُن پہ واجب ہے مجھے سجدہ کریں
عقل و دانش کے اندھیروں سے نکل بس جنوں کے نُور میں چمکا کریں
اب کے روٹھیں وہ۔ منائیں نہ کبھی بارِ خاطر کو یونہی ہلکا کریں
ہوں بلند اتنے بلندی سے ڈریں جو بھی نیچے ہوں انہیں دیکھا کریں
جستجو محرومِ منزل ہی رہے کوئے جاناں میں فقط بھٹکا کریں
شانِ رندی یہ نہیں ہمدم مرے
گر جہاں گیر آئے سر نیچا کریں

(ا) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو... (القرآن)

تمنّی سے ہویدا ؔ پیار کی باتیں ہزار کیں
علم و ہنر سے، پیار سے تم معتبر ہوا

28/1/02

محمد یونس خان ہویداؔ

کراچی، پاکستان

یکم مارچ ۱۹۳۰ء کے دن غازی پور، یوپی، ہندوستان میں پیدا ہونے والے محمد یونس خان ہویداؔ تخلص کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا ''میں علم دوست ماحول میں پلا بڑھا نہیں کیونکہ میرے دادا جان محکمہ پولیس سے ریٹائر ہوئے تھے اور والد بزرگ وار کی ملازمت بھی پولیس کی تھی۔ میری رہائش بچپن میں زیادہ تر والد صاحب کے ساتھ رہی جن کی پوسٹنگ (posting) کبھی شہر، کبھی قصبے اور کبھی دور دراز علاقوں میں ہوتی تھی۔ ہاں مجھے کھیل کود کے مواقع میسر رہے۔ تیراکی اور شکار سے زیادہ شغف رہا۔ کبھی کبھی اسکول کے پروگراموں میں شعر و نغمہ سننے کو مل جاتا۔ ساتویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس زمانے کے مشہور ناول پڑھ لیئے تھے۔ دو ناولوں کے نام تو اب بھی یاد ہیں۔ ''انور'' اور ''شمیم''۔

میں نے شعر و ادب کا آغاز پندرہ (۱۵) سال کی عمر سے تک بندیوں کے سہارے کیا اور قلیل مدت میں قابلِ قبول اشعار کہنے لگا۔ ادبی زندگی کے آغاز کا پہلا شعر جو میں نے کہا وہ یہ ہے۔

آتشِ عشق بھڑک اٹھتی ہے میخانے میں
شکلِ محبوبہ نظر آتی ہے پیمانے میں

اصلاح لینے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس وجہ سے اشعار یوں ہی سے تھے۔ جولانیِ طبع سے مجبور ہو کر ''ماں کی لوری'' لکھی ۔

آنکھوں میں کاجل ڈالے، بالوں میں پھولوں کو سجائے

گیسو سنوارے آئے، اماں جی کے لاڈلے

بہت بعد میں مطالعے کے ذریعے علم ہوا کہ شاعری نام ہے وارداتِ قلبی کا، لیکن صرف احساسات و جذبات کی ترجمانی ہی شاعری کا کمال نہیں بلکہ فنِ شعر و شاعری سے واقفیت رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ مطالعے کے ذریعہ اساتذہ کے کلام سے مستفید ہوا، پر اپنے لئے ایک الگ راستہ منتخب کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آیا۔ پھر مشرقی پاکستان کے المیہ نے مجھ سے ''سقوطِ ڈھاکہ'' جیسی ہمہ گیر نظم لکھوائی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیں کھلے صحنِ چمن میں ہر طرف زخموں کے پھول — محو حیرت اک جہاں ہے دیکھ کر زخموں کے پھول

اب کہاں مشرق کی راتیں اب کہاں پدما کا راگ — وہ سقوطِ شہرِ ڈھاکہ دے گئے زخموں کے پھول

حضور محمدؐ سے گہری محبت نے مجھ سے نعتیں بھی کہلوائیں

فرقتِ شاہ بطحا گوارا نہیں — بزمِ عالم میں کوئی ہمارا نہیں

دامنِ مصطفےٰؐ سے لپٹ جائیے — پھر نہ کہئے گا کوئی سہارا نہیں

سوال نمبر ۳ کے جواب میں عرض ہے کہ میں نے میدان سخن میں ہر صنف اور ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور بڑی دل جمعی سے شعر کہے ہیں۔ میرا پہلا مجموعۂ کلام ''مجموعۂ کلام ہویدا'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ممکن ہے اس کے مطالعے سے کہنہ مشقی ظاہر نہ ہو مگر یہ میرے خلوص اور لگن کا نتیجہ ضرور ہے۔ میں نے چونکہ اپنے شعری سفر کا آغاز پندرہ (۱۵) سال کی عمر میں کر دیا تھا اور آغازِ شاعری میں کہا تھا۔

زندگی کی ابتدائے غم کا قصہ یاد ہے — یاد ہے مجھ کو محبت کا زمانہ یاد ہے

پھر یہ سفر جاری رکھا۔ میرا دوسرا مجموعہ ''سوز و ساز'' ہے۔ اس میں حمد و نعت، منقبت، سلام اور نظم سب موجود ہیں۔ میری کوشش رہی کہ غزلوں اور نظموں کا معیار پہلے مجموعے کی نسبت بلند رہے۔ جناب ظفر اقبال کی رائے ہے کہ میں نے الفاظ کے انتخاب میں اجتہاد کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی میں بھی جدت پیدا کی ہے۔ میری تیسری کاوش ''نوائے بے نوا'' میں میرا کلام اخوت، محبت، خدمتِ خلق اور عقیدت کا مظہر ہے۔ یہ نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

آتی ہے اس زمین پہ طیبہ سے روشنی — طیبہ کا مہتاب مرا شہر یار ہے

جب بھی ڈھونڈا ہے نگاہوں نے کفِ پائے نبیؐ — دیکھتا ہوں آسماں پہ نقش پا سرکارؐ کا

نعتیہ سلسلے کی میری تیسری کاوش ''مدحتِ رسول انامؐ'' کے نام سے آئی۔ اب میری شاعری کا محور اور مرکز صنف غزل گوئی اور نظم گوئی سے ہٹ کر صرف مدح سرائی رسولؐ ہے۔ میرے نزدیک نعت کہنا نہ صرف مقدس و پاکیزہ جذبات اور احساسات کا مظہر ہے بلکہ عین سعادت ہے۔ کون جانے نعت گو کا دربارِ رسالت میں کیا مقام ہے۔ وہاں تک ہمارا شعور اور ادراک پہنچنے سے قاصر ہے''۔

یونس ہویدا نے سوال نمبر ۴ کے جواب میں کہا... ''میں اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید

ہوں۔ اردو زبان میں لسانی نقطہ نظر اور ساخت و مزاج کے اعتبار سے مختلف تہذیبی اور تمدنی عوامل و عناصر کی ایسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں جن کی وجہ سے تحقیق کے میدان میں اختلاف آرا کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہی کلام اور اس کی ادائیگی حافظے میں محفوظ رہتی ہے جس میں کسی نہ کسی طرح سے کوئی آہنگ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو رسم الخط کی تبدیلی کا بھی حامی نہیں ہوں۔ اردو کی بنیادی شناخت رسم الخط ہے۔ اس کا تحفظ لازمی ہے۔ کسی زبان پر عبور حاصل کرنا مقصود ہو تو اس زبان کا رسم الخط جاننا ضروری ہے۔ اردو اور ہندی دو زبانیں ہیں، مگر رشتہ ایسا ہے کہ بول چال کی سطح پر دونوں زبانیں قریب ہیں۔ دونوں زبانوں میں فرق تحریری زبان سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو ہندی زبان کو قوت بہم پہنچاتی ہے اور ہندی سے بہت کچھ لیتی بھی ہے۔ اردو زبان دانوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ آج اردو بولنے والے دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ رسم الخط بدلنے کی تجویز جس طرف سے بھی آئے مکروہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اردو ادب میں اتنی کشش ہے کہ دوسرے ملک والے بھی اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔

اور جہاں تک سوال نمبر ۵ کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اردو ادب کی جڑیں اپنی زمین کی گہرائی تک پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو برصغیر سے باہر پھیل رہی ہے۔ اردو تنقید کا میدان بڑھ رہا ہے جس سے اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے۔ عالی تنقید بھی لکھی جا رہی ہے۔ آج تنقید کے حصار میں اہل ادب کام کر رہے ہیں۔ ادیب اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا جب تک کے وہ فلسفہ، ادب اور ادبی نظریات سے پوری طرح آگاہ نہ ہو۔ ادب اور تنقید کے میدان میں کام کرنے والے کو سنجیدگی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تنقید میں کسی کو اعتبار ہو گیا تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اعتبار اور اعتماد اُسے ہر صنف میں حاصل ہو جائے۔ اردو کی ادبی روایت میں علمی کام کرنا یا تنقید نگاری کرنا دوسرے درجے کا کام نہیں۔ ویسے بھی ادبی دنیا میں کوئی کام دوسرے درجے کا سمجھ کر کرنا نہیں چاہیئے۔

ادب میں کوئی منزل آخری منزل نہیں ہوتی اور نہ ہی ہونی چاہیئے۔ تجربوں کو بروئے کار لاکر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں اصطلاحات سازی کے حوالے سے کئی ادارے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے بھی اس حوالے سے لسانی کام کیئے ہیں۔ ہر مہذب اور ترقی یافتہ زبان میں اُس زبان کے اصلی اور طبعی الفاظ کی تعداد زیادہ ہونا چاہیئے۔ غیر زبانوں کے الفاظ جو اردو زبان میں در آئے ہیں ان کو اس طرح اپنا لیا جائے وہ الفاظ جو غیر مانوس یا ثقیل لگتے ہیں ان کو اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ زبان کو جاری و ساری رکھنے کے لئے یہ عمل بہت ضروری ہے۔ اگر اردو کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست نہ ہوتیں تو اس کا برصغیر پاک و ہند سے باہر پھیلنا اور پھولنا ناممکن ہوتا۔ آج اردو کی رسائی ساری دنیا تک ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا میں اردو دان طبقے اس کی آبیاری کر رہے ہیں"۔

میں نے پوچھا کہ آپ کن شعرا سے متاثر رہے؟ کہنے لگے ..."اردو ادب سے وابستہ بہت

سے نامور شعرا گزرے ہیں۔ آج بھی ان کے چھوڑے ہوئے نقوش اور یادیں ہمارے ساتھ ہیں۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے، میری نظر شاعر مشرق اقبالؒ اور ان ہی کے ہمعصر حسرت موہانی پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ دیکھیئے کہ خوب صورت شعر اقبالؒ کی بیاض سے پیش کرتا ہوں جو غالباً انہوں نے اپنے اول دور کی شاعری میں کہے تھے ۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چُن لیئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبالؒ بیسویں صدی کے اردو شعرا میں سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ دوسرے حسرت موہانی ہیں اور غزل کے مسیحا خیال کیئے جاتے ہیں۔ انہوں نے شاعری اور سیاست، دونوں میدانوں میں نام کمایا"۔

حرمین شریفین کی حاضری کا شرف حاصل ہونے کا واقعہ ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ وہ کہہ رہے تھے... "شانِ کریمی دیکھیئے ۱۹۹۴ء میں مجھے حج اور زیارت روضہ رسول نصیب ہوئی۔ میرے جذبات و احساسات وہی تھے جو ایک مسلمان کے ہوتے ہیں۔ گناہوں کا سوچ کر شرمندگی ہوتی رہی لیکن رحمت حق سے ناامید نہیں تھا۔ طواف کعبہ، آب زمزم، صحن مسجد الحرام کے روح پرور نظارے، خوش کن مناظر سب کا دل و دماغ نے اثر لیا۔ میری روح کو بالیدگی نصیب ہوئی۔ کئی روز اسی طرح جنتِ میں گزر گئے۔ ایک شب ہم سب زائرین بذریعہ بس مدینۃ الرسول کے لئے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل طواف کعبہ کیا اور صحن حرم میں نماز ادا کی۔ دل میں ایک طوفان اور ولولہ تھا لیکن ایک گونہ سکون بھی تھا۔ میں نے صحن حرم میں بیٹھے بیٹھے بیت اللہ کی طرف نظر ڈالی اور خیال آیا کہ میں کسی قیصر و کسریٰ سے کم دولت نہیں رکھتا کہ سامنے اللہ کا گھر ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا دولت ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ اور فکر شعر میں ڈھلنے لگی اور نعت کی بنیاد پڑ گئی جو روضہ رسولؐ پر حاضری کے بعد مکمل ہوئی۔ میں نے پھر روضہ طیبہ پر حاضری دی۔ مسجد نبوی میں چالیس (۴۰) نمازیں ادا کیں۔ ریاض الجنۃ میں نفلیں پڑھیں۔ حضورؐ کے روضے کے سامنے دعائیہ کلمات ادا کیئے۔ خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ روانگی سے قبل مدینہ منورہ کے اطراف و اکناف میں بھی جانا ہوا اور وہ مقام بھی دیکھا جہاں غزوۂ بدر واقع ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لئے میں ماضی میں کھو گیا اور جب کسی نے شانہ پکڑ کر ہلایا تو واپس حال میں آیا۔ مدینہ منورہ کے اطراف میں کھجور کے باغات بکثرت ہیں۔ قسم قسم کی کھجوریں کھانے کو ملیں اور ٹھنڈا ٹھار میٹھا پانی پینے کو ملا۔ نو (۹) روز بعد قافلہ واپس حرم شریف یعنی مکہ معظمہ واپس آ گیا تا آنکہ حج اکبر نصیب ہو گیا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ جو کچھ دیکھا اللہ کی مہربانی سے دیکھا اور اب بھی ۔ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں"۔

Mr Mohammad Yunus Khan, Advocate High Court,
224- 225 H M H Squre, CM-2/1, Block 12, Opp. Suleman Terrace, Sir Shah Mohammad Suleman Road, Gulshan-e-Iqbal, Karachi, Pakistan

انتخابِ کلام

مفلس نہیں غنی ہوں میں کعبہ نظر کے سامنے
باب صفا نظر میں ہے، مروہ نظر کے سامنے!!

شب میں حرم نشیں رہے پڑھتے رہے نمازِ شوق
سجدوں کی انتہا نہ تھی سجدہ نظر کے سامنے

وسعت میری نگاہ کو ملتی ہے اس طرح یہاں
عرش بریں نگاہ میں، سدرئ نظر کے سامنے

تر دامنی پہ شرم سے جھکتا ہے یہ سرِ غرور
روزِ جزا نگاہ میں، آقاؐ نظر کے سامنے

حالت میری بدل گئی بے کس نہیں، نہیں، نہیں
کیا کچھ مجھے ملا نہیں کعبہ نظر کے سامنے!!

خوش قسمتی سے آج ہی طیبہ نگر کا ہے سفر
ضحرئ میری نگاہ میں، خضرا نظر کے سامنے

دل میں جو تھا زبان سے وقتِ سحر رواں ہوا
دل میں حریمِ ناز ہے، جلوہ نظر کے سامنے

دیکھو ہویدؔا پیار سے نامِ نبیؐ لیا کرو!!
دنیا تو اک سرائے ہے، عقبیٰ نظر کے سامنے

وقت ٹھہرا ہے کسی شہر [illegible] کی طرح
تم چلے آؤ تو رستہ مرا بدل سکتا ہے
یاسمین حبیب
برمنگھم 2003

یاسمین حبیب

برمنگھم، برطانیہ

یاسمین حبیب جدید نسائی شاعری کا ایک دبستان ہیں اور منصور آفاق اس دبستان کا شارح۔ منصور کا نام میں نے اس دبستان کے شارح کی حیثیت سے اس لئے استعمال کیا کہ برمنگھم، برطانیہ آنے کے بعد میں نے لندن کے روزنامہ "جنگ" میں ان کا ایک کالم پڑھا۔ عنوان تھا "نیناں برسے نیناں"۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ آنسو بہانے والے نیناں کے بارے میں منصور آفاق کا کوئی شاعرانہ تجربہ ہوگا مگر کالم پڑھنے سے پتا چلا کہ منصور نے برطانیہ کی چند شاعرات کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان میں نوٹنگھم کی ایک شاعرہ فرزانہ خان کا بھی ذکر ہے جو نیناں تخلص کرتی ہیں۔ تجزیہ خوب تھا۔ تحریر برجستہ تھی اور باتیں کھری کھری۔ مگر دبستان کی دیگر شاعرات منصور سے بہت ناراض ہوئی ہوں گی کیونکہ اتنے اکھڑ تبصرے کسی کو بھی پسند نہیں آتے اور بقول فرزانہ خان نیناں انہیں تو پتا بھی نہ تھا کہ کسی نے ان کی شاعری پر اتنا اچھا تبصرہ کیا ہے جس نے دیگر شاعرات کو ان سے برہم کر دیا اور اب وہ برملا کہتی ہیں کہ یہ تبصرہ فرزانہ خان نیناں نے خود لکھوایا ہے جب کہ فرزانہ کو اس وقت پتا چلا جب صبح صبح کسی نے ٹیلی فون کر کے اطلاع دی کہ ان کی شاعری کے بارے میں کوئی مضمون شائع ہوا ہے۔ خیر یہ ذکر ضمناً آ گیا۔ بات ہو رہی تھی یاسمین حبیب کی۔ یہاں برمنگھم آنے کے بعد چند شاعرات کا ذکر میں نے

دوسروں کی زبانی سنا۔ ان میں یاسمین حبیب کا ذکر بڑے معتبر انداز میں ہوا تھا۔ میں نے یاسمین حبیب کو ٹیلی فون کیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ یاسمین نے پزیرائی کی اور اپنے کلام کا مجموعہ "آسیب سے پرچھائیں تک" لے کر مجھ سے ملنے آئیں۔

یاسمین حبیب کا کلام پڑھ کر بلاشبہ تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یاسمین کا شمار "گوشہ نشین" شاعرات میں ہوتا ہے، مشاعروں میں بھی کم کم جاتی ہیں لیکن ان کے کلام میں تپتے احساسات کے چراغ جلتے نظر آتے ہیں۔

میری طرح سے جاگ کے گزری تھی اس کی شب | چہرہ پہ اس کے رات کا نقشہ بنا لگا
گزرا تھا یوں فراق کے عالم کی دھوپ سے | سائے میں وہ وصال کے کتنا تھکا لگا

ہجر اور وصال اردو شاعری کا مزاج ہے مگر پروین شاکر مرحوم نے ان گل بوٹوں میں خوش نمائی، سچائی اور ان میں ایک نرالی مہک پیدا کی۔ بعد کی شاعرات میں شاہدہ حسن، عشرت آفرین، زرین یاسمین، عابدہ کرامت، فاطمہ حسن، ڈاکٹر پنہاں، طلعت اشارت اور حمیرا رحمٰن نے دل آویز تجربے کیے۔ ان کے ساتھ یاسمین حبیب کا نام بھی جوڑا جا سکتا ہے۔

خدا کرے کہ کہیں تجھ کو تیری فطرت سا | کوئی ملے کبھی پھر میری یاد آنے لگے

۲۰/فروری ۲۰۰۳ء کے روزنامہ جنگ، لندن کے ادبی صفحے پر منصور آفاق نے اپنے کالم "دیوار پہ دستک" میں بعنوان "اردو قواعد وضوابط میں ترمیم" میں یاسمین حبیب کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نئی اردو زبان تشکیل پا رہی ہے۔ یاسمین حبیب کے اس شعر میں زبان کی تازگی کے حوالے سے ایک مختلف احساس اُبھر رہا ہے۔

چلا بھی آ کہ تجھے اوڑھ کر لباس کروں | برہنہ جسم پہ ترا نام پہنے لگتی ہوں

منصور آفاق نے "پہنے لگتی ہوں" پر بحث کی ہے کہ زبان کے اعتبار سے یہ شعر درست نہ ہو مگر اس میں زبان کی تازہ کاری موجود ہے۔ اس پر ۱۹۷۲۔ ۷۳ کی فہمیدہ ریاض کی نظم "مقابلہ حسن" مجھے یاد آ گئی جو میری کتاب "آج کی شاعرات" میں ان کے انٹرویو کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں بھی تازہ کاری ہے۔

کولھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے؟
سر میں بھی جستجو کا جوہر/ تھا پارۂ دل بھی زیر پستاں
لیکن مرا مول ہے جو ان پر/ پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو

نظم کا مضمون اپنے زمانے میں ایک نیا خیال تھا۔ خاصی چہ میگوئیاں بھی ہوئی تھیں کہ ہر کلام مجمع میں پڑھنے یا شائع ہونے کے لیے نہیں ہوتا اور طرف داروں کا کہنا تھا کہ اس طرح کی تنقید بالغ نظری کو زنجیر کرتی ہے۔

پھر ایک دن میں، یاسمین حبیب، منصور آفاق اور جاوید اختر چودھری چائے پر گفتگو کر رہے تھے۔ موقع مناسب تھا۔ میں نے یاسمین سے سلسلۂ سوالات شروع کیا۔ یاسمین اکثر "نام بوئے" کی

طرح گفتگو کرتی ہیں، مثلاً میں گیا تھا، میں سوچ رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس دن یاسمین کی گفتگو میں سنجیدہ نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آیئے! آپ بھی اس گفتگو میں شریک ہو جائیے کہ ایسے مواقع کم ملتے ہیں۔

میرا پہلا سوال تھا... ''آپ کی تاریخ اور جائے پیدائش کیا ہے''؟ یاسمین نے لب کھولے ''میں کہاں پیدا ہوئی، میں کب پیدا ہوئی، ممکن ہے یہ سوالات اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہوں، مگر میرے نزدیک یہ بہت مبہم سوال ہیں۔ کیونکہ میں تو اس دن بھی موجود تھی جب پہلا حرف لکھا جارہا تھا اور اس وقت بھی تھی جب زمین کا وجود ہی نہیں تھا۔ بہر حال شعوری یادداشت میں مجھے دیبل پور کی بندرگاہ پر بھاگتی ہوئی بچی کے نقش پا یاد آتے ہیں اور لاشعوری یادداشت میں میرے ساتھ ایبٹ آباد میں پہلے مارشل لاء کی پرچھائیں نے جنم لیا تھا یعنی تیغوں (سنگینوں) کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ میں پاکستان کی کراچی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن اور برطانیہ کی ولور ہیمپٹن یونیورسٹی سے ایم بی اے کر چکی ہوں۔ اگر وقت اور حالات نے ساتھ دیا تو انشااللہ پی ایچ ڈی کا ارادہ بھی رکھتی ہوں۔

آپ نے اپنے سوال نامے میں سوانح کے بارے میں پوچھا ہے سو عرض ہے کہ سوانح کا لفظ سانحہ کی جمع ہے۔ زندگی کے واقعات کے بارے میں اس لفظ کا استعمال مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر شخص کی روداد کی آنکھ سے سانحوں کا جھرنا ہی بہتا ہو۔ میری زندگی کی کہانی بس اتنی ہے کہ میں ازل سے ہوں اور ابد تک اپنی موجودگی کو محسوس کرتی ہوں۔ ہاں اس دوران یہی دو چار واقعات ہیں کہ میں پیدا ہوئی، جوان ہوئی، پاکستان سے انگلستان آگئی، شادی ہوئی، بوڑھی ہوگئی اور مرگئی؛ میری مٹی سے پھول اُگے اور میری روح سے آسمانوں کو سیرابی حاصل ہوئی''۔

میرا اگلا سوال تھا... شعر کہنے کی ابتدا کب سے ہوئی؟ یاسمین مسکرائیں... ''مجھے آغوش مادری ہی سے شعر وسخن کا فیض حاصل ہوا ہے کیونکہ میری والدہ نہ صرف شعر وسخن سے بہت گہرا شغف رکھتی ہیں بلکہ خود بھی شعر کہتی ہیں۔ میں نے بہت کم عمری میں شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ ابتدا تو انگریزی زبان میں شاعری سے ہوئی مگر اپنی والدہ کا اصرار مجھے اردو زبان میں کچھ کہنے تک لے آیا۔ میں نے جب پہلی مرتبہ اپنی کاوش اشاعت کے لئے بھیجی تھی تو اس رسالے کے ایڈیٹر جون ایلیا مرحوم تھے۔ وہ ایک روز غیر متوقع طور پر مجھ سے ملنے میرے گھر آگئے۔ میں اُس وقت حسب معمول دیوار پر بیٹھی پتنگ اُڑا رہی تھی۔ جون ایلیا نے مجھ سے کہا... 'میں یاسمین بخاری (میرا پیدائشی خاندانی نام) سے ملنا چاہتا ہوں وہ شاید آپ کی امی ہیں، انہیں خبر کر دیں'۔ میں نے کہا 'اچھا جی!' اور انہیں گھر کے اندر لے جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا۔ اور پھر جب جون ایلیا مرحوم کو اس بات کی خبر ہوئی کہ یاسمین بخاری میری امی نہیں بلکہ خود میں ہوں تو اُن کی آنکھیں ایک بے یقینی کے عالم میں میری طرف دیکھتی رہیں۔

مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ مجھ جیسی بے نیاز شاعرہ نے اپنا کلام سنبھال کر رکھا۔ ہوا یہ کہ میرا مجموعۂ کلام 'آسیب سے پرچھائیں تک' دراصل میرے ایک دوست اور انگریزی زبان کے خوب صورت شاعر، ایلون ولیمز (Alvin Williams) کی خواہش کے پیش نظر بہت عجلت میں شائع ہوا۔

کتاب کا انتساب بھی ان کے نام ہے۔ ایلون ولیمز کو میری انگلش شاعری پسند تھی اور جب کبھی میں انہیں انگریزی زبان میں اپنی اردو شاعری کا ترجمہ کر کے سنایا کرتی تھی تو وہ مجھ سے کہتے تھے:

"تین عقل مند لوگوں کو کسی نے تین سکے دیئے۔ ان میں سے ایک نے وہ سکہ انوسٹ (invest سرمایہ کاری) کر دیا۔ دوسرے نے اسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دیا اور ضائع کر دیا اور تیسرے نے اسے زمین میں دبا دیا۔ پہلے نے اُس سکہ کی وساطت سے کئی گنا زیادہ سکے بنا لیے، دوسرے شخص کو کچھ حاصل نہیں ہوا، اور تیسرے شخص نے اگرچہ اس حقیقت کا کسی اور سے تذکرہ نہیں کیا مگر خود اسے اس بات کا علم ضرور رہا کہ اس کے پاس سکہ موجود ہے۔ تم وہی تیسرا شخص ہو۔ تمہارے پاس سکہ موجود ہے مگر تم نے اسے زمین میں دبا رکھا ہے"۔

سو میرا پہلا مجموعہ اُس سکے کو زمین سے نکالنے کی کوشش تھی۔ یہ واقعہ شاید ۱۹۶۶ء کا ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ سکہ ابھی تک زمین میں دبا ہوا ہے۔ اور میں اپنے اندر کہیں صدیوں کی مسافت پر دفن پڑی ہوں۔ ہاں کبھی کبھار صدیاں لمحوں میں بدل جاتی ہیں"۔

اب میرا سوال تھا... نثری نظم اور نثری غزل کے جو تجربات ہو رہے ہیں ان کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ یاسمین نے سوچ کر جواب دیا... "شاعری صرف خیال کا نام ہی نہیں ہے، آہنگ کے کرشمے بھی اس کا اہم حصہ ہیں۔ سو میری نظر میں ایسی کسی چیز کو شاعری تسلیم نہیں کیا جا سکتا جو آہنگ اور توازن سے نا آشنا ہو۔ اگر ایسی تحریر کو شاعری کہنا شروع کر دیا جائے جو اوزان سے باہر ہو تو قرآن حکیم کو بھی شاعری کی ایک کتاب کہنا پڑے گا۔ یہ تجربات ادب میں ایک اہم اضافہ ہیں مگر انہیں نظم یا غزل کہنا درست نہیں"۔

یاسمین اردو زبان کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے..."زبانیں بنتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں مگر ان میں تخلیق ہونے والا ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اردو زبان کا مستقبل کچھ بھی ہو اس میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ زبان کی زندگی کا سلسلہ اس کے بولنے والوں کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ اگر بولنے والوں نے ترقی کی تو اردو زبان بھی ترقی کرے گی۔ جس کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اسی طرح اردو زبان کے رسم الخط بدلنے کی تجویز بچگانہ ہے"۔

میرا اگلا سوال کہ اردو زبان کو اپنا کر آپ گھاٹے میں رہیں اُس ایک گفتگو پر مبنی ہے جو ایک اردو کے استاد نے جو، واشنگٹن یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، کہا تھا کہ اگر وہ انگریزی میں لکھتے تو وہ گھاٹے میں نہ رہتے۔ یاسمین کا جواب تھا... "یہ ایک بہت بیہودہ سوچ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو زبان ہماری زبان نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے اپنا لیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں ایک پاکستانی نژاد خاتون ہوں اور پاکستانیوں کی زبان اردو ہے۔ جب اسے اپنانے کی بات ہی غلط ہے تو فائدہ اور نقصان پر تو بات ہو ہی نہیں سکتی"۔

یاسمین کی رائے میں آج کا ادب اپنے عہد کی ترجمانی نہیں کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں ..."دراصل انیسویں صدی میں انسانی ذہن نے ایک بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے اور انسان نے ان سو

سالوں میں زندگی کے ہر میدان میں اتنی ترقی کی ہے کہ جتنی پچھلے دس ہزار سال میں ہوئی ہوگی۔ افسوس اردو ادب اس انسانی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکا۔ آج یہ صورت احوال ہے کہ ہماری شاعری میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو ہمارے گھروں میں ہو، ہم گھر سے باہر نکلیں تو ہمیں نظر آئے یا ہم دفتر میں کام کرنے کے لئے جائیں تو وہاں دکھائی دے۔ ہمیں اپنی شاعری میں ہزاروں سال پرانی چیزیں نظر آتی ہیں۔ کہیں صحراؤں میں قافلے چل رہے ہیں؛ کہیں ایسی جنگیں ہو رہی ہوتی ہیں جن میں تیر کمان تلواریں اور ڈھالیں دکھائی دیتی ہیں؛ کہیں کسی بام پر کوئی دیا پڑا ہوتا ہے...وغیرہ وغیرہ۔ سو اردو ادب اپنے وقت سے بہت پیچھے ہے"۔

یاسمین جن شعرا سے متاثر رہیں ان کے بارے میں کہہ رہی تھیں..."ماضی قریب میں وفات پانے والا انگریزی زبان کا شاعر ٹیڈ ہیوز (Ted Huges) مجھے بہت اچھا لگتا ہے، ٹیگور اپنی جانب کھینچتا ہے۔ غالب اکثر ہم کلام رہتا ہے۔ پروین شاکر مجھے اردو زبان کی سب سے بڑی شاعرہ محسوس ہوتی ہے۔ قدیم کشمیری شاعرہ للہ عارفہ سے میری دوستی ہے۔ یونانی شاعرہ سیفو (Sappho) بھی میرے گھر آتی رہتی ہے۔ ساقی فاروقی کو میں اپنے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ تقریباً ہر زبان میں کوئی نہ کوئی ایسا شاعر موجود ہے جس نے کبھی نہ کبھی مجھے ضرور متاثر کیا ہے۔ اچھی شاعری جہاں بھی دکھائی دے میرے مزاج پر خوش گوار اثر مرتب کرتی ہے۔ اور گزری ہوئی صدی کے قد آور شعرا میں اقبالؒ کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ اقبالؒ کے مقابل کسی شاعر کو رکھا جائے تو کوئی بھی قد آور نظر نہیں آتا بلکہ بڑے بڑے نام کوتاہ قامت نظر آتے ہیں"۔

ادب میں گروہ بندیوں کے متعلق یاسمین کا کہنا ہے..."اگر نظریاتی اعتبار سے ہوں تو بہت خوب صورت بات ہے، اگر صرف دوستی کی وجہ سے بنی ہوئی ہوں تو پھر بھی اچھی بات ہے لیکن اگر اپنی بے بنیاد ادبی قامت بڑھانے کے لئے کی جا رہی ہوں تو بہت بری بات ہے۔ تاہم ان گروہ بندیوں کی وجہ سے اردو ادب کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ مقابلے کی فضا میں انسانی دماغ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اسی گروہ بندی کی وجہ سے وزیر آغا نے تنقید میں بہت اہم تحریریں لکھی ہیں"۔

یاسمین نے بتایا کہ وہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ ان کے شاعری کے دوسرے مجموعے کے علاوہ ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔ اس کے علاوہ یاسمین انگریزی زبان میں ایک ناولٹ بھی لکھ رہی ہیں۔ اس کا بنیادی خیال ایک زخم زخم ایشیائی عورت کی یورپ میں اپنے ایک انگریز مرہم مثال کونسلر کے ساتھ دوستی کا رشتہ ہے۔ یہاں کونسلر کا مفہوم ایک ایسا ماہر نفسیات لیا گیا ہے، جو اپنے کلائنٹ (client موکل) کے ساتھ اُس کے کتھارسس (catharsis تہذیب نفس) میں اُس کی مدد کے مدِ نظر اُس کے ساتھ اعتماد کے رشتے کے پس منظر میں گفتگو پر مبنی ملاقاتوں کا ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔

یادگار واقعہ بتاتے ہوئے وہ اُداس ہو گئیں۔ وہ کہنے لگیں..."میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جس دن میرا راٹ وائلر (rottweiler) کتا 'چیف' مجھ سے بچھڑ گیا۔ وہ میرے ساتھ دو تین ہفتے کی

عمر سے لے کر چھ برس تک ساتھ رہا۔ مگر مجھے کسی مجبوری کے تحت اُسے کسی اور کے حوالے کرنا پڑ گیا تھا۔ اُسے میں نے کسی کے ساتھ سیر کے بہانے روانہ کیا تھا۔ اُسے اگر یہ معلوم ہوتا کہ اس کے ساتھ بے وفائی کی جا رہی ہے تو شاید اس کی وفاداری اُسے میری دہلیز سے کبھی دور نہ ہونے دیتی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک عجیب سا رشتہ تھا، بہت گہرا تعلق تھا ہمارا۔ وہ مجھے اپنا مالک نہیں بلکہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور میں اسے اپنا محافظ اور دوست۔ یوں تو اسے چار زبانیں آتی تھیں، انگریزی، اردو، ہندی اور پنجابی مگر ہمارے درمیان ایک ایسی گفتگو کا سلسلہ تھا جو کسی زبان کا مرہونِ منت نہ تھا۔ اُس کی خوب صورت بھوری آنکھیں بولتی تھیں اور مجھے اُس کی ہر بات سنائی دیتی تھی۔ اُس کا غصہ، اُس کی شراتیں، اُس کا حسد، اُس کا خوف، اُس کی ناراضگی، اُس کی شکایتیں، اُس کا غم، اُس کی مجھ سے لڑائیاں، مجھ سے جرح، مجھ سے محبت، مجھے اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے اُکسانا، چاکلیٹ مانگنا، نیا ڈاگ کالر (dog collar) پہن کر اترانا اور مجھ سے باہر جانے کے لئے ضد کرنا، چاکلیٹ میں چھپائی ہوئی دوا کی گولی نکال کر باہر پھینک کر چاکلیٹ کھا جانا اور شرارت بھری آنکھ سے میری جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے ڈانٹ کھاتے رہنا۔

ایک روز کسی انگریز نے پوچھا، 'کیا اُس کے کھانے وغیرہ کے سلسلے میں بہت زیادہ اخراجات ہیں'؟ میں نے ہنس کر کہہ دیا کہ میرا کتا وجیٹیرین (vegetarian سبزی خور) ہے۔ وہ شخص مجھے ایسے حیرت سے دیکھنے لگا جیسے میں اِس کرہ ارض پر کسی اور سیارہ سے اُتر آئی ہوں۔

میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ایک روز میں خود اُسے کسی اور کے حوالے کردوں گی۔ وہ اُس روز بہت خوش خوش چلا گیا اور میں تمام دن اور تمام رات روتی رہی۔ مجھ پر پہلی مرتبہ تنہائی کی حقیقت واہوئی تھی۔ اگلے روز صبح صبح اُسے دیکھنے چلی گئی۔ وہ کسی کے گھر کے بیک گارڈن (back gaurden یا ئین باغ) میں کمروں کی جانب رُخ کیئے ہلکی ہلکی آواز میں مجھے بلا رہا تھا۔ میں اُسے اُس گھر کی فینس (fence باڑھ) کے جھرکوں اور دراڑوں میں سے جھانک رہی تھی۔ اس کی پیٹھ تھی میری جانب۔ چند لمحوں کے بعد شاید اس کو میری خوش بو محسوس ہوئی اور وہ سونگھتا سونگھتا بیک گارڈن میں فینس کے چاروں جانب چلتے ہوئے عین اس حصے پر پہنچ کر رُک گیا جہاں میں باہر بیٹھ کر اندر جھانک رہی تھی۔ چیف وہاں بیٹھ کر میرے لئے رونے لگ گیا اور میں اُسے زیادہ تکلیف نہ دینے کے خیال سے زارو قطار روتی ہوئی واپس لوٹ کر آ گئی۔ یہ خیال ضرور رہا کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہوگا۔

اب تو شاید وہ مر چکا ہوگا مگر میرے خیال میں وہ اب بھی زندہ ہے۔ وہ میری زندگی کا ایک خوب صورت حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ ابھی کچھ روز ہی کی بات ہے کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ اُس کے چہرے پر نچھاور تھی۔ اس کی خوب صورت بھوری آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ان آنکھوں سے شناسا ہوں۔ ان آنکھوں سے میرا کوئی رشتہ رہا ہے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے بے اختیار اُس سے کہہ دیا... 'تمہاری آنکھوں کا رنگ کتنا خوب صورت ہے بالکل

میرے چیف کی طرح'۔ بہرحال چیف سے جدا ہوئے دو برس ہوئے ہوں گے کہ ایک روز وہ اچانک میرے راستے میں آ گیا۔ وہ ایک انگریز بوڑھی عورت کے ساتھ اُس کے گارڈ ڈاگ کی حیثیت سے چل رہا تھا۔ بہت دھیما مزاج ہو گیا تھا اُس کا، نہ وہ شوخی نہ وہ شرارت۔ اور وہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس نے لمحہ بھر کو میرا لباس اور میرے پاؤں سونگھے، سر اُٹھا کر میرے ہاتھ سونگھے اور آگے روانہ ہو گیا۔ عرصہ گزر جانے کے سبب وہ مجھے بھول چکا تھا۔ مگر مجھے اس خیال سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی کہ مجھ سے اور کچھ نہ سہی مگر شاید میرا دوست بھی اپنے جذبات پر گرفت رکھنے اور چہرے پر مسکان سجا کر اپنا درد چھپانے کا ہنر سیکھ چکا تھا''۔

Ms. Yasmin Habib,
65, Bourne Brook Crescent, Halesowen, B62 08Z, UK

انتخابِ کلام (وہ بھی...)

وہ بھی جانے کیسی عورت ہوگی جس کا
وقت چرا کے
مجھ پر صرف کیا جاتا ہے
اور
نہ جانے میں کیسی ہوں
جو لمحوں کے وصل کو
ہفتوں اور مہینوں پر پھیلائے پھرتی ہوں
لیکن.. تنہائی میں گاہے سوچا کرتی ہوں
جو باتیں وہ مجھ سے کہتا ہے، اپنی بیوی سے بھی کہتا ہوگا
شاید اُس کو
باتیں دُہرانے کی عادت ہے!

سوال نامہ برائے سخنور حصہ پنجم

۱۔ آپ کا نام، تاریخ و جائے پیدائش اور تعلیمی حالات نیز مختصر سوانح لکھیے
۲۔ ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟ اگر اپنا پہلا شعر یاد ہو تو لکھیے۔ پہلا مجموعۂ کلام اگر شائع ہوا تو کب ہوا؟
۳۔ آپ نے کن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟ نثری نظم نیز نثری غزل کے تجربات ہو رہے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟
۴۔ کیا آپ اردو زبان و ادب کے مستقبل سے پُر امید ہیں۔ کیا آپ اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کے حامی ہیں؟ اثبات و نفی کی صورت میں مختصر دلائل ضرور لکھیں۔
۵۔ کیا یہ درست ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات کی بہتر ترجمان ہے؟ کیا آج کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے؟ کیا اردو زبان کو اپنا کر آپ گھاٹے میں رہے؟
۶۔ آپ کن شعرا سے متاثر رہے ہیں؟ آپ کی نظر میں گزری صدی کے قد آور شعرا کون رہے ہیں؟
۷۔ اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ ضرور تحریر کریں۔

نوٹ: اپنے دو عدد پاسپورٹ سائز رنگین تصویر، عکسِ تحریر کے لئے سیاہ بال پوائنٹ سے لکھ کر اس پر دستخط فرما کر تاریخ رقم کر دیں اور علیحدہ کاغذ پر اپنا پتا، فون نمبر، ای میل ایڈریس دینا چاہئیں تو واضح اور صاف لکھیں۔ اپنی چند جدید غزلیں اور نظمیں بھی منسلک کر دیں۔ شکریہ

سلطانہ مہر

Sultana Meher,
2 Birchtrees Croft, Birmingham, B26 1EF, UK
Tel. No. 0121 707 6272
e-mail: sultanameher38@hotmail.com

پاکستان کا پہلا ترانہ

جگن ناتھ آزاد

محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان میں مقیم تھے۔ پاکستان کے چند ذمہ دار ارباب اقتدار نے ان سے ''ترانہ پاکستان'' لکھنے کے لئے کہا اور انہوں نے یہ ترانہ لکھا اور بقول ان کے ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو قیام پاکستان کے اعلان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے یہ ترانہ نشر ہوا۔

تلاش بسیار کے بعد یہ ترانہ ہم تک ڈاکٹر نگار عظیم کے توسط سے پہنچا۔ ہم ڈاکٹر نگار عظیم کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

اے سرزمین پاک
ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تری خاک

تندی حاسداں پہ ہے غالب ترا سو اک
دامن وہ سل گیا ہے جو تھا مدتوں سے چاک
اے سرزمین پاک

اب اپنے عزم کو ہے نیا راستہ پسند
اپنا وطن ہے آج زمانے میں سر بلند
پہنچا سکے گا اس کو نہ کوئی بھی اب گزند
اپنا علم ہے چاند ستاروں سے بھی بلند
اب ہم کو دیکھتے ہیں عطارد ہو یا سماک
اے سرزمینِ پاک

اُترا ہے امتحاں میں وطن آج کامیاب
اب حُریت کی زُلف نہیں محوِ پیچ و تاب
دولت ہے اپنے ملک کی بے حد و بے حساب
ہوں گے ہم آپ مُلک کی دولت سے فیض یاب
مغرب سے ہم کو خوف نہ مشرق سے باک
اے سرزمینِ پاک

اپنے وطن کا آج بدلنے لگا نظام
اپنے وطن میں آج نہیں ہے کوئی غلام
اپنا وطن ہے راہ ترقی پہ تیز گام
آزاد، بامراد، جواں بخت شاد کام
اب عطر بیز ہیں، جو ہوائیں تھیں زہر ناک
اے سرزمینِ پاک

ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تری خاک
اے سرزمینِ پاک

آج کی شاعرات

اس عنوان سے ۱۹۷۳ء میں، میں نے کتاب شائع کی تھی، جس میں ایک سو تین شاعرات کا تعارف تھا۔ یہ تعارف بھی میں نے شاعرات سے اس وقت لیا تھا، جب میں روزنامہ ''جنگ'' میں ہر ہفتے ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف شائع کرتی تھی۔ ان شاعرات کے نام کی فہرست درج ذیل ہے۔

(سلطانہ مہر)

فہرست بوئے گل

۱۔ راحیل اختر
۲۔ اختر یگانہ
۳۔ خلیق تبسم
۴۔ ثریا حیا
۵۔ رئیس بانو نقوی
۶۔ زیب النساء زیبی
۷۔ حسینہ شفق
۸۔ خورشید بانو شمع
۹۔ عسکری شہناز
۱۰۔ صنوبر مصور
۱۱۔ عظمی ناہید
۱۲۔ شوکت فرخ
۱۳۔ سعیدہ ناز
۱۴۔ فہمیدہ نسرین
۱۵۔ نعیم حسین نگار
۱۶۔ محمودہ جبیں
۱۷۔ عشرت جہاں آفرین
۱۸۔ خورشید اعظم پروانہ
۱۹۔ ریحانہ رضوی
۲۰۔ سکندر حیا بریلوی
۲۱۔ زہرہ اشتیاق
۲۲۔ سحر میمن
۲۳۔ شفیق بانو بریلوی
۲۴۔ نور شمع
۲۵۔ شہناز وصی
۲۶۔ ضمیر فاطمہ جعفری
۲۷۔ عشرت جہاں پشاوری
۲۸۔ مہہ جبیں فاطمہ ماہ
۲۹۔ شاہدہ سلطانہ ناز
۳۰۔ نسیم قمر
۳۱۔ نگار حفیظ نگار
۳۲۔ گلنار آفریں
۳۳۔ پروین شاکر
۳۴۔ خاتون حجاب
۳۵۔ خورشید فاطمہ
۳۶۔ آل زہرہ نقوی
۳۷۔ سردار بانو
۳۸۔ بشریٰ شمس
۳۹۔ شمیم اختر شمیم
۴۰۔ صائمہ خیری
۴۱۔ عظمت عزمی
۴۲۔ محترم عشرت جہاں
۴۳۔ مہر نگار تیموری
۴۴۔ عابدہ ناز
۴۵۔ نسیم ہدیٰ نسیم
۴۶۔ عذرا ہما
۴۷۔ انو پا
۴۸۔ آنسہ پنہاں

۴۹۔ حسنہ زیدی
۵۰۔ رضیہ ابو جعفر
۵۱۔ زیب گلشن مولوی
۵۲۔ سعدیہ روشن
۵۳۔ شمسہ صدیقی
۵۴۔ شمیم رحمان شمیم
۵۵۔ عابدہ بانو صبا
۵۶۔ عزیز بدایونی
۵۷۔ نائرہ صدیقی
۵۸۔ رحمت النساء ناز
۵۹۔ نسیرہ ملک
۶۰۔ فریدہ ہما

نالۂ دل

۶۱۔ ادا جعفری
۶۲۔ شباب قزلباش
۶۳۔ شائستہ زیدی
۶۴۔ پروین سید فنا
۶۵۔ معینہ انور معین
۶۶۔ وحیدہ نسیم
۶۷۔ سیدہ حنا
۶۸۔ ڈاکٹر سرور سلطانہ
۶۹۔ طلعت اشارت
۷۰۔ فہمیدہ ریاض
۷۱۔ منور سلطانہ لکھنوی
۷۲۔ زہرہ نگاہ
۷۳۔ ربیعہ فخری رزمی
۷۴۔ محمودہ جبیں سوز
۷۵۔ عرفانہ عزیز
۷۶۔ نور بانو محجوب
۷۷۔ کشور ناہید
۷۸۔ رابعہ نہاں
۷۹۔ ثریا زیبا
۸۰۔ رشیدہ سلیم سیمیں
۸۱۔ میمونہ غزل
۸۲۔ سعیدہ عروج مظہر
۸۳۔ ثریا محمود ندرت

دودِ چراغِ محفل

۸۴۔ زاہدا انجمن
۸۵۔ بلقیس جمال بریلوی
۸۶۔ تراب النساء علوی
۸۷۔ رشیدہ بیگم عیاں
۸۸۔ سیدہ نسیم فاطمہ بریلوی
۸۹۔ رضیہ انور امروہوی
۹۰۔ کنیزہ فاطمہ حیا
۹۱۔ سروری عرفان اللہ روحی
۹۲۔ میمونہ غزالہ بریلوی
۹۳۔ نور الصباح بیگم
۹۴۔ بغدادی بیگم
۹۵۔ بیگم خورشید آرا صدیق علی خاں
۹۶۔ حنیفہ شمیم ملیح آبادی
۹۷۔ بیگم قمر القادری
۹۸۔ نور جہاں
۹۹۔ رابعہ پنہاں
۱۰۰۔ خیاب علوی
۱۰۱۔ عذرا عزمی
۱۰۲۔ قمر جہاں چندوسوی
۱۰۳۔ نور بدایونی

سخن ور حصہ اوّل

سخن ور حصہ اول میں صرف پاکستانی شعراء کا تذکرہ تھا۔ سن ۲۰۰۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ جس میں مزید شعراء کا تعارف شامل کیا گیا ہے۔ اس کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ احسان دانش
۲۔ اطہر نفیس
۳۔ اقبال عظیم
۴۔ انجم اعظمی
۵۔ ابن انشاء
۶۔ ذوالفقار علی بخاری
۷۔ بہار کوٹی
۸۔ بہزاد لکھنوی
۹۔ تابش دہلوی
۱۰۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
۱۱۔ تحسین سروری
۱۲۔ حبیب جالب
۱۳۔ سید محمد جعفری
۱۴۔ جوش ملیح آبادی ۳۸
۱۵۔ جون ایلیا
۱۶۔ حفیظ جالندھری
۱۷۔ حفیظ ہوشیار پوری
۱۸۔ شان الحق حقی
۱۹۔ عبدالعزیز خالد
۲۰۔ خالد علیگ
۲۱۔ راغب مراد آبادی
۲۲۔ سید آل رضا
۲۳۔ رئیس امروہوی
۲۴۔ سحر انصاری
۲۵۔ سرور بارہ بنکوی
۲۶۔ سعید رضا سعید
۲۷۔ سلیم احمد
۲۸۔ حمایت علی شاعر
۲۹۔ شاعر لکھنوی
۳۰۔ شبنم رومانی
۳۱۔ شیب جلالی
۳۲۔ منظور حسین شور
۳۳۔ شورش کاشمیری
۳۴۔ صہبا اختر
۳۵۔ سید ضمیر جعفری
۳۶۔ سراج الدین ظفر
۳۷۔ ظہیر کاشمیری
۳۸۔ سید عابد علی عابد
۳۹۔ عارف عبدالمتین
۴۰۔ جمیل الدین عالی
۴۱۔ عظیم عباسی
۴۲۔ عبیداللہ علیم
۴۳۔ عندلیب شادانی
۴۴۔ احمد فراز
۴۵۔ فضل احمد کریم فضلی
۴۶۔ فیض احمد فیض
۴۷۔ قابل اجمیری
۴۸۔ قتیل شفائی
۴۹۔ قمر جلالوی
۵۰۔ ماہر القادری
۵۱۔ محسن احسان
۵۲۔ محسن بھوپالی
۵۳۔ محشر بدایونی
۵۴۔ عزیز حامد مدنی
۵۵۔ مصطفیٰ زیدی
۵۶۔ منظر ایوبی
۵۷۔ منظر صدیقی
۵۸۔ ناصر کاظمی
۵۹۔ احمد ندیم قاسمی
۶۰۔ وزیر آغا

تیسرے ایڈیشن میں ان شعراء کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۶۱۔ مخمور اکبر آبادی
۶۲۔ رعنا اکبر آبادی
۶۳۔ صبا اکبر آبادی
۶۴۔ نعیم آلتقوی
۶۵۔ نسیم امروہوی
۶۶۔ دلاور فگار
۶۷۔ کرار نوری
۶۸۔ اقبال صفی پوری
۶۹۔ ساقی جاوید
۷۰۔ احسن احمد اشک
۷۱۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری
۷۲۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین

تذکرہ شعراء وشاعرات، سخنور حصہ دوم ۱۹۹۶ء

نام	مقام	نام	مقام
۱۔ اظہار اثر	دہلی	۲۳۔ عقیل دانش	لندن
۲۔ اختر سعید خان	بھوپال	۲۴۔ اطہر راز	لندن
۳۔ سید حنیف اخگر	نیویارک	۲۵۔ علی طباطبائی راز لکھنوی	لاس اینجلس
۴۔ ارشد عثمانی	کینیڈا	۲۶۔ محمد ممتاز راشد	دوحہ قطر
۵۔ ارم انصاری	مشی گن	۲۷۔ راہی شہابی	جے پور
۶۔ سید اسد اللہ حسینی	لاس اینجلس	۲۸۔ سید شمیم رجز	لاس اینجلس
۷۔ افضال فردوس	ہیوسٹن	۲۹۔ رحمت قرنی	لندن
۸۔ اکبر حیدرآبادی	لندن	۳۰۔ رحمٰن صدیقی	لاس اینجلس
۹۔ عتیق انظر	دوحہ۔قطر	۳۱۔ رشی خان	جرمنی
۱۰۔ باقر زیدی	میری لینڈ	۳۲۔ رئیس الدین رئیس	علی گڑھ
۱۱۔ تجمل فاروقی بانی	کینیڈا	۳۳۔ تسلیم الٰہی زلفی	کینیڈا
۱۲۔ بشر صہبائی	بھوپال	۳۴۔ ساحل صدیقی	ساؤتھ افریقہ
۱۳۔ سکینہ ساجد پنہاں	ٹیکساس	۳۵۔ رحمٰن واگلے ساز	لاس اینجلس
۱۴۔ یعقوب تصور	ابوظہبی	۳۶۔ سحر مہدی	لندن
۱۵۔ جاوید اختر	ممبئی	۳۷۔ امجد علی سرور	دوحہ۔قطر
۱۶۔ حسن چشتی	شکاگو	۳۸۔ رفعت سروش	دہلی
۱۷۔ حمیدہ معین رضوی	لندن	۳۹۔ سلطان الحسن فاروقی	انگلینڈ
۱۸۔ حمیرا رحمٰن	نیویارک	۴۰۔ اشرف شاہ	آسٹریا
۱۹۔ ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی	سعودی عرب	۴۱۔ شاہد علی خان شاہد	بحرین
۲۰۔ حیدر اعظمی	دوحہ قطر	۴۲۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر	دہلی
۲۱۔ حیدر قریشی	جرمنی	۴۳۔ مرتضیٰ شبلی	سری نگر
۲۲۔ ڈاکٹر خالد سہیل	کینیڈا	۴۴۔ ڈاکٹر شبیر احمد	فلوریڈا

۴۵۔ رخسانہ شمیم — جرمنی
۴۶۔ فرحت شہزاد — لاس اینجلس
۴۷۔ شمشیر سنگھ شیر — ڈنمارک
۴۸۔ ضیا خان — سعودی عرب
۴۹۔ سید مظفر احمد ضیاء — شکاگو
۵۰۔ طہٰ آفندی — بحرین
۵۱۔ ظفر عظیمی — دوحہ۔ قطر
۵۲۔ عبدالحمید سولکر ظہور — مسقط۔ عمان
۵۳۔ عابد جعفری — کینیڈا
۵۴۔ عابدہ کرامت — کویت
۵۵۔ عبدالرحمٰن عبد — نیویارک
۵۶۔ خواجہ ریاض الدین عطش — اسکوکل، الے نائے
۵۷۔ عطیہ نیازی — لاس اینجلس
۵۸۔ استاد ابراہیم العریض عنایت — بحرین
۵۹۔ غوثیہ سلطانہ — الے نائے۔
۶۰۔ سعید قیس — بحرین
۶۱۔ کرامت غوری — کویت
۶۲۔ سیدہ کنیز فاطمہ کرن — آسٹریلیا
۶۳۔ بلراج کومل — دہلی
۶۴۔ گلزار — ممبئی
۶۵۔ گلشن کھنہ — برطانیہ
۶۶۔ مرزا محبوب بیگ — لاس اینجلس
۶۷۔ عبداللطیف خان محفوظ — سوئیڈن
۶۸۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد — برطانیہ
۶۹۔ مخمور سعیدی — دہلی
۷۰۔ جمشید مسرور — اوسلو۔ ناروے
۷۱۔ خضر مسیحا — لاس اینجلس
۷۲۔ مونا شہاب — میری لینڈ
۷۳۔ افشاں مہرین — سعودی عرب
۷۴۔ ناصر نظامی — ہالینڈ
۷۵۔ واجد ندیم — شکاگو
۷۶۔ افتخار نسیم — شکاگو
۷۷۔ نسیم سید — کینیڈا
۷۸۔ نسیمہ کلثوم — الے نائے
۷۹۔ آصفہ نشاط — لاس اینجلس
۸۰۔ نعیمہ ضیاء الدین — جرمنی
۸۱۔ سرفراز نواز اعظمی — مدینہ منورہ
۸۲۔ نور جہاں نوری — لندن
۸۳۔ نوشاد — ممبئی
۸۴۔ نیئر جہاں — لاس اینجلس
۸۵۔ نیاز جیراج پوری — ممبئی
۸۶۔ رشید نیاز — دوحہ، قطر
۸۷۔ نیاز گلبرگوی — شکاگو
۸۸۔ سیدہ حسن جہانگیر ہمدم — سان فرانسسکو

سخن ور سوم۔ تذکرہ شعراء وشاعرات

۱۔ اعزاز احمد آذر — لاہور
۲۔ مجید اختر — لاس اینجلس
۳۔ ہمایوں اختر — کراچی
۳۔ سلطانہ ذاکر ادا نقوی — سان فرانسسکو
۵۔ محمد آفاق صدیقی — کراچی
۶۔ اسد محمد خان — کراچی
۷۔ اسلم کولسری — لاہور
۸۔ محمد اشرف شاہین — کراچی
۹۔ محمد کمال اظہر — کویت
۱۰۔ اقبال مجیدی — کراچی
۱۱۔ امجد اسلام امجد — لاہور
۱۲۔ امداد نظامی — کوئٹہ
۱۳۔ ثاقب انجان — کراچی
۱۴۔ انور مسعود — اسلام آباد
۵۱۔ سید صابر علی جعفری بدر — کراچی
۶۱۔ ثروت سلطانہ ثروت — کراچی
۷۱۔ ثمر بانو ہاشمی — ملتان

نام	شہر	نام	شہر
۱۸۔ جاوید آفتاب	لاہور	۴۹۔ عظمیٰ جون	سبی۔ بلوچستان
۱۹۔ مسعود جاوید	کراچی	۵۰۔ عمر شریف	کراچی
۲۰۔ جمال نقوی	کراچی	۵۱۔ عقیل عباس جعفری	اسلام آباد
۲۱۔ جوہی غوری	لاس اینجلس	۵۲۔ رشیدہ عیاں	نیوجرسی
۲۲۔ اقبال حیدر	کراچی	۵۳۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی	ملتان
۲۳۔ امین خیال	گجرنوالہ	۵۴۔ ذکیہ غزل	کراچی
۲۴۔ رفیع الدین راز	کراچی	۵۵۔ غوث متھراوی	کراچی
۲۵۔ زین صدیقی	دہران	۵۶۔ فاطمہ حسن	کراچی
۲۶۔ امتیاز ساغر	کراچی	۵۷۔ کاوش عباسی	ریاض
۲۷۔ سکندر سالم	بریڈفورڈ	۵۸۔ پیرزادہ قاسم	کراچی
۲۸۔ سرشار صدیقی	کراچی	۵۹۔ ڈاکٹر قمر آرا قمر	لاہور
۲۹۔ سعدیہ روشن	ابوظہبی	۶۰۔ قمر جمیل	کراچی
۳۰۔ محمود شام	کراچی	۶۱۔ ریحانہ قمر چودھری	لاس اینجلس
۳۱۔ محمد ہارون صدیقی شاہد	کراچی	۶۲۔ لیث قریشی	کراچی
۳۲۔ شاہدہ حسن	کراچی	۶۳۔ مقصود الہ آبادی	مشی گن
۳۳۔ شجاع درانی	حیدرآباد۔ سندھ	۶۴۔ منصور ملتانی	کراچی
۳۴۔ انور شعور	کراچی	۶۵۔ جاوید منظر	کراچی
۳۵۔ شمس وارثی	کراچی	۶۶۔ ڈاکٹر فہیم باٹلا نادان	لاس اینجلس
۳۶۔ عبدالعلی شوکت	کراچی	۶۷۔ رحمت النساء ناز	کراچی
۳۷۔ شہاب کاظمی	نیوجرسی	۶۸۔ ناہید ورک	مشی گن
۳۸۔ محمد سبکتگین صبا	کراچی	۶۹۔ اصغر ندیم سید	لاہور
۳۹۔ عبدالقوی ضیاء	کینیڈا	۷۰۔ روشن آراء نزہت	لاہور
۴۰۔ ضیاء الحق قاسمی	کراچی	۷۱۔ نقاش کاظمی	کراچی
۴۱۔ سعید الظفر	اوکلاہاما	۷۲۔ نگار سجاد	کراچی
۴۲۔ افتخار عارف	اسلام آباد	۷۳۔ نگار صہبائی	کراچی
۴۳۔ عارف شفیق	کراچی	۷۴۔ رخسانہ نور	لاہور
۴۴۔ لیاقت علی عاصم	کراچی	۷۵۔ شہناز نور	کراچی
۴۵۔ عاصی کرنالی	ملتان	۷۶۔ احمد نوید	کراچی
۴۶۔ عذرا عباس	کراچی	۷۸۔ وکیل انصاری	نیویارک
۴۷۔ الیاس عشقی	حیدرآباد۔ سندھ	۷۹۔ ڈاکٹر بلال نقوی	کراچی
۴۸۔ مرزا عظیم بیگ	مشی گن	۸۰۔ احمد ہمیش	کراچی
		۸۱۔ یاسمین	لاہور
		۸۲۔ یونس جاوید	لاہور

سخنور حصہ چہارم تذکرہ شعرأ اور شاعرہ

۱۔ آباد جعفری — نینی تال ہندوستان
۲۔ ابراہیم اشک — ممبئی ہندوستان
۳۔ ڈاکٹر محمد علی اثر — حیدر آباد ہندوستان
۴۔ احسان سہگل — ہالینڈ
۵۔ ملک ارشد اقبال آرش — اٹلی
۶۔ اشفاق حسین — کینیڈا
۷۔ ف۔ س۔ اعجاز — کلکتہ ہندوستان
۸۔ افتخار امام صدیقی — ممبئی ہندوستان
۹۔ سہیل اقبال — کینیڈا
۱۰۔ اکبر حمیدی — اسلام آباد پاکستان
۱۱۔ سید جعفر امیر — امریلو ہیوسٹن امریکا
۱۲۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند — واشنگٹن امریکا
۱۳۔ سید انور کمال رضوی — کینیڈا
۱۴۔ مامون ایمن — نیویارک امریکا
۱۵۔ باقر نقوی — برطانیہ
۱۶۔ بخش لائل پوری — برطانیہ
۱۷۔ جاوید اختر بیدی — برطانیہ
۱۸۔ تاجدار عادل — کراچی پاکستان
۱۹۔ صاحبزادہ تجمل علی خان — کراچی پاکستان
۲۰۔ تسنیم عابدی — ابوظہبی یو۔ اے۔ ای
۲۱۔ توفیق احمد انصاری — اے ٹاے امریکا
۲۲۔ توفیق محمد خان — جارجیا امریکا
۲۳۔ تمثیل جاوید — کراچی پاکستان
۲۴۔ جاوید زیدی — ہیوسٹن امریکا
۲۵۔ حامد امروہوی — شکاگو امریکا
۲۶۔ افتخار حیدر — کینیڈا
۲۷۔ سید ولی حیدر — کراچی پاکستان
۲۸۔ خالد خواجہ — کیلی فورنیا امریکا
۲۹۔ خالد یوسف — برطانیہ
۳۰۔ ڈاکٹر سید خورشید خاور امروہوی — کراچی پاکستان
۳۱۔ ڈاکٹر دلنواز صدیقی — پنسلوانیا امریکا
۳۲۔ اوم کرشن راحت — سڈنی آسٹریلیا
۳۳۔ محمد نقیب اللہ رازی — چترال پاکستان
۳۴۔ رخسار ناظم آبادی — بحرین عربین گلف
۳۵۔ رسا چغتائی — کراچی پاکستان
۳۶۔ رشمی بادشاہ — کانپور ہندوستان
۳۷۔ کالی داس گپتا رضا — ممبئی ہندوستان
۳۸۔ رفیق احمد رفیق — کیلی فورنیا امریکا
۳۹۔ رؤف خیر — حیدر آباد ہندوستان
۴۰۔ رئیس وارثی — نیویارک امریکا
۴۱۔ ریحانہ روحی — کراچی پاکستان
۴۲۔ ساحر شیوی — برطانیہ
۴۳۔ عبدالاحد ساز — ممبئی ہندوستان
۴۴۔ ساقی فاروقی — برطانیہ
۴۵۔ پروفیسر خادم حسین سحر — ریاض سعودی عرب
۴۶۔ پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی — کیلیفورنیا امریکا
۴۷۔ ابوالفیض سحر — دہلی ہندوستان
۴۸۔ سعید شرعی — دوحہ قطر
۴۹۔ ڈاکٹر شاہد الوری — کراچی پاکستان
۵۰۔ شاہد ماہلی — دہلی ہندوستان
۵۱۔ شاہین صدیقی — برطانیہ
۵۲۔ ڈاکٹر شباب للت — شملہ ہندوستان
۵۳۔ شہلا فیضی — کیلیفورنیا امریکا
۵۴۔ ڈاکٹر شہلا نقوی — نیویارک امریکا

۵۵۔ڈاکٹر سائرہ آفاقی — مظفرآباد، کشمیر پاکستان
۵۶۔صفوت علی صفوت — کنیٹی کٹ امریکا
۵۷۔ضیا جلال پوری — برطانیہ
۵۸۔طاہر سلطانی — کراچی پاکستان
۵۹۔مظفر گورکھپوری — ممبئی ہندوستان
۶۰۔ابرار عابد — کراچی پاکستان
۶۱۔عرفان علوی عابد — انڈیانا پولیس امریکا
۶۲۔فیاض عادل فاروقی — برطانیہ
۶۳۔عبیدالرحمٰن عارف — وسکانسن امریکا
۶۴۔عاشور کاظمی — برطانیہ
۶۵۔انتخاب عالم — چین
۶۶۔عرفان مرتضیٰ — لاس اینجلس امریکا
۶۷۔عروج ملک — سان فرانسسکو امریکا
۶۸۔عزیز الحسن — نیویارک امریکا
۶۹۔عطاء الحق قاسمی — لاہور پاکستان
۷۰۔غزالہ عالم — برطانیہ
۷۱۔ملک فضل حسین — برطانیہ
۷۲۔عارف فرہاد — راولپنڈی پاکستان
۷۳۔قمر نقوی — ٹلسا، امریکا
۷۴۔علی میلی قزلباش — کوئٹہ پاکستان
۷۵۔مغنی امروہوی — شکاگو امریکا
۷۶۔سلیمہ سلامت علی عرف فیہ عاشی مغنی — سان فرانسسکو امریکا
۷۷۔مظفر حنفی — کلکتہ ہندوستان
۷۸۔مظہر امام — دہلی ہندوستان
۷۹۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی — بھاگلپور، ہندوستان
۸۰۔رشید منظر — برطانیہ
۸۱۔حکیم منظور — سری نگر کشمیر ہندوستان
۸۲۔منیر حیدر — کویت
۸۳۔ڈاکٹر منیر الزماں منیر — اٹلانٹا امریکا
۸۴۔شوکت علی ناز — دوحہ قطر
۸۵۔صلاح الدین ناصر — نیویارک امریکا
۸۶۔شاہد نسیم سالک — اوہائیو امریکا
۸۷۔فرحت ہمایوں ندیم — کراچی پاکستان
۸۸۔نزہت صدیقی — کینیڈا
۸۹۔سیدہ نسرین نقاش — سری نگر ہندوستان
۹۰۔نوشاد نوری — ڈھاکہ بنگلہ دیش

گفتنی اوّل، نثر نگاروں کا تذکرہ ۲۰۰۰ء

۱۔	گفتنی اوّل	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔	بزبان شاعر بقلم حمایت	حمایت علی شاعر
۳۔	نیابت	ابراہیم جلیس
۴۔	میں سرخرو رہی	سلطانہ مہر

۱۔ احمد خان	شکاگو	۲۲۔ ثریا شہاب	جرمنی
۲۔ احمد سہیل خان	ٹیکساس	۲۳۔ جاوید اختر چودھری	برطانیہ
۳۔ اختر جمال	کینیڈا	۲۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی	کراچی
۴۔ ارشاد احمد صدیقی	کیلیفورنیا	۲۵۔ جمیل زبیری	کراچی
۵۔ ارمان شمسی	ڈھاکہ	۲۶۔ جوگندر پال	دہلی
۶۔ آصف الرحمٰن طارق	نیوجرسی	۲۷۔ جیتندر بلو	برطانیہ
۷۔ امراؤ طارق	کراچی	۲۸۔ جیلانی بانو	حیدر آباد، دکن
۸۔ پروفیسر آفاق احمد	بھوپال	۲۹۔ چاند کرن شرما	برطانیہ
۹۔ اکرام بریلوی	کینیڈا	۳۰۔ حسن ہاشمی	کراچی
۱۰۔ انور خواجہ	کیلیفورنیا	۳۱۔ ڈاکٹر شان الحق حقی	کینیڈا
۱۱۔ انور سلیمی	کیلیفورنیا	۳۲۔ سیدہ حنا	پشاور
۱۲۔ انور شیخ	برطانیہ	۳۳۔ حیدر طباطبائی	برطانیہ
۱۳۔ انور نزہت	دہلی	۳۴۔ حیدر قریشی	جرمنی
۱۴۔ ایوب جوہر	ڈھاکا	۳۵۔ ڈاکٹر خاور جمیل	کراچی
۱۵۔ بانو ارشد	برطانیہ	۳۶۔ ڈاکٹر خلیق انجم	دہلی
۱۶۔ بشریٰ رحمان	لاہور	۳۷۔ خورشید عالم	کینیڈا
۱۷۔ بشیر مالیر کوٹلوی	مالیر کوٹلہ	۳۸۔ خورشید علی خان	کراچی
۱۸۔ پروین کمال	جرمنی	۳۹۔ ڈاکٹر خیر النساء مہدی	ممبئی
۱۹۔ تسنیم ثنا خان	کیلیفورنیا	۴۰۔ ذکیہ مشہدی	پٹنہ
۲۰۔ تصدق سہیل	برطانیہ	۴۱۔ رالف رسل	برطانیہ
۲۱۔ تقی عابدی	کینیڈا	۴۲۔ رحیم انجان	کینیڈا

نام	مقام
۴۳۔ ڈاکٹر رشید امجد	راولپنڈی
۴۴۔ رشیدہ منظر حسین	کینیڈا
۴۵۔ رضا الجبار	کینیڈا
۴۶۔ رضیہ فصیح احمد	شکاگو
۴۷۔ رفیعہ منظور الامین	حیدرآباد دکن
۴۸۔ ریحان اظہر	ریاض
۴۹۔ سائیں سچا	سویڈن
۵۰۔ سجاد حیدر	انڈیانا
۵۱۔ سعید انجم	ناروے
۵۲۔ سعیدہ افضل	ڈیرہ غازی خان
۵۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر	لاہور
۵۴۔ سلیم شہزاد	مالیگاؤں
۵۵۔ سید جعفر	بھوپال
۵۶۔ ش۔ صغیر ادیب	برطانیہ
۵۷۔ شفیقہ فرحت	بھوپال
۵۸۔ شکیل عادل زادہ	کراچی
۵۹۔ شکیلہ رفیق	کینیڈا
۶۰۔ صباحت مشتاق	ملتان
۶۱۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی	دہلی
۶۲۔ صفیہ صدیقی	برطانیہ
۶۳۔ صہبا لکھنوی	کراچی
۶۴۔ طلعت سلیم	برطانیہ
۶۵۔ طہٰ آفندی	بحرین
۶۶۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	پشاور
۶۷۔ عبدالغنی شیخ	لداخ
۶۸۔ عذرا اصغر	راولپنڈی
۶۹۔ سید عرفان علی عابدی	کراچی
۷۰۔ عطیہ خان	برطانیہ
۷۱۔ فردوس حیدر	کراچی
۷۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری	کراچی
۷۳۔ ڈاکٹر فیروز عالم	کیلیفورنیا
۷۴۔ فیروز مکرجی	برطانیہ
۷۵۔ قرۃ العین حیدر	نوئیڈا، ہندوستان
۷۶۔ قمر علی عباسی	نیویارک
۷۷۔ قیصر تمکین	برطانیہ
۷۸۔ کنول نین پرواز	برطانیہ
۷۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	دہلی
۸۰۔ ڈاکٹر گیان چند جین	کیلیفورنیا
۸۱۔ لطف اللہ خان	کراچی
۸۲۔ مجتبیٰ حسین	دہلی
۸۳۔ محسن جیلانی	برطانیہ
۸۴۔ ڈاکٹر محمد حسن	دہلی
۸۵۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی	کراچی
۸۶۔ محمود ہاشمی	برطانیہ
۸۷۔ مختار زمن	کراچی
۸۸۔ قاضی مشتاق	پونے
۸۹۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم	برطانیہ
۹۰۔ ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی	شکاگو
۹۱۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی	کراچی
۹۲۔ مقصود الٰہی شیخ	برطانیہ
۹۳۔ منظور الامین	حیدرآباد دکن
۹۵۔ ڈاکٹر نعیم چودھری	شکاگو
۹۵۔ نعیمہ ضیاء الدین	جرمنی
۹۶۔ ڈاکٹر ابو سعید نورالدین	ڈھاکہ
۹۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا	سرگودھا
۹۸۔ ہرچرن چاؤلہ	ناروے
۹۹۔ سید محمد یعقوب نظامی	برطانیہ

گفتنی دوم نثر نگاروں کا تذکرہ 2004ء

نمبر	نام	مقام
۱۔	ڈاکٹر ابن کنول۔	دہلی ہندوستان
۲۔	احمد بشیر۔	لاہور پاکستان
۳۔	احمد زین الدین۔	کراچی پاکستان
۴۔	ادیب سہیل۔	کراچی پاکستان
۵۔	اشفاق احمد۔	لاہور پاکستان
۶۔	اطہر رضوی۔	ٹورنٹو کینیڈا
۷۔	اظہار اثر۔	دہلی ہندوستان
۸۔	ڈاکٹر افتخار نسیم	شکاگو، امریکہ
۹۔	اقبال متین۔	نظام آباد ہندوستان
۱۰۔	محمد الیاس۔	میرپور آزاد کشمیر پاکستان
۱۱۔	ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان۔	لندن برطانیہ
۱۲۔	امجد علی مرزا۔	لندن برطانیہ
۱۳۔	انور خان مرحوم۔	ممبئی ہندوستان
۱۴۔	ڈاکٹر انور سدید۔	لاہور پاکستان
۱۵۔	سید انور سعید۔	علی گڑھ ہندوستان
۱۶۔	امیر النساء۔	ملویشرم، تامل ناڈو، ہندوستان
۱۷۔	باصر سلطان کاظمی	چیسٹر برطانیہ
۱۸۔	بانو قدسیہ۔	لاہور پاکستان
۱۹۔	سید شبیر حسین جعفری۔	اسلام آباد پاکستان
۲۰۔	بلقیس جہاں۔	بھوپال ہندوستان
۲۱۔	پروین عاطف۔	لاہور پاکستان
۲۲۔	پروین لاشاری۔	لندن برطانیہ
۲۳۔	تبسم محسن علوی۔	جدہ سعودی عرب
۲۴۔	ترنم ریاض۔	دہلی ہندوستان
۲۵۔	تسلیم الٰہی زلفی۔	ٹورانٹو کینیڈا
۲۶۔	محمد توفیق خان۔	سرونج ہندوستان
۲۷۔	ثریا انعام۔	سان فرانسسکو امریکہ
۲۸۔	جاوید اختر پاشا	نیویارک امریکہ
۲۹۔	سید جعفر امیر۔	ٹیکساس امریکہ
۳۰۔	ڈاکٹر جمال الدین جمال۔	کیلیفورنیا، امریکہ
۳۱۔	جمشید مرزا۔	لندن برطانیہ
۳۲۔	حمید قیصر۔	بریڈفورڈ برطانیہ
۳۳۔	خالد خواجہ۔	لاس اینجلس امریکہ
۳۴۔	ڈاکٹر خالد سہیل۔	ٹورانٹو کینیڈا
۳۵۔	دیپک بدکی۔	بڑودہ، ہندوستان
۳۶۔	ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز۔	لندن برطانیہ
۳۷۔	ڈاکٹر راحت سلطانہ۔	حیدرآباد دکن ہندوستان
۳۸۔	راشد آزر۔	حیدرآباد ہندوستان
۳۹۔	رضا علی عابدی۔	لندن برطانیہ
۴۰۔	ڈاکٹر رضیہ حامد۔	بھوپال ہندوستان
۴۱۔	محمد سالم۔	نیوجرسی امریکہ
۴۲۔	سعدیہ سیٹھی۔	ناٹنگھم برطانیہ
۴۳۔	سلطان جمیل نسیم۔	کراچی پاکستان
۴۴۔	سلطان محمود۔	برمنگھم برطانیہ
۴۵۔	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	حیدرآباد ہندوستان
۴۶۔	سنجے گوڑبولے۔	پونے ہندوستان
۴۷۔	شاہدہ احمد۔	لندن برطانیہ
۴۸۔	شاہدہ بیگم۔	ناروے
۴۹۔	شایستہ ایمن۔	ہنٹنگٹن، لانگ آئی لینڈ، امریکہ

۵۰۔ ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرحمن۔ فلوریڈا امریکہ
۵۱۔ شرف الدین شرف کمالی۔ کولہاپور ہندوستان
۵۲۔ ڈاکٹر شعائراللہ خان۔ رام پور ہندوستان
۵۳۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ دہلی ہندوستان
۵۴۔ شمیم طارق۔ ممبئی ہندوستان
۵۵۔ شوکت مرزا۔ لندن برطانیہ
۵۶۔ ڈاکٹر شہناز مزمل۔ لاہور پاکستان
۵۷۔ صابر ارشاد عثمانی۔ لندن برطانیہ
۵۸۔ صبیحہ علوی۔ برمنگھم برطانیہ
۵۹۔ ڈاکٹر صفات علوی۔ بریڈفورڈ برطانیہ
۶۰۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ ملتان پاکستان
۶۱۔ ڈاکٹر عابد معز۔ ریاض سعودی عرب
۶۲۔ عرفانہ تزئین شبنم۔ فورٹ وانم باڑی، تامل ناڈو، ہندوستان
۶۳۔ سید عاشور کاظمی۔ برمنگھم برطانیہ
۶۴۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی۔ الہ آباد ہندوستان
۶۵۔ سید علی امام نقوی۔ ممبئی ہندوستان
۶۶۔ علی ایم شمسی۔ ممبئی ہندوستان
۶۷۔ ف۔ س۔ اعجاز۔ کولکتہ ہندوستان
۶۸۔ فیروزالدین احمد فریدی۔ کراچی پاکستان
۶۹۔ فیصل نواز چوہدری۔ ناروے
۷۰۔ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس۔ دہلی ہندوستان
۷۱۔ کرامت غوری۔ ٹورانٹو کینیڈا
۷۲۔ گلزار۔ ممبئی ہندوستان
۷۳۔ مبارک کاپڑی۔ ممبئی ہندوستان
۷۴۔ مجید سلیم۔ دمام سعودی عرب
۷۵۔ محافظ حیدر مرحوم۔ ممبئی ہندوستان
۷۶۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد۔ شیفیلڈ برطانیہ
۷۷۔ پروفیسر مشکور حسین یاد۔ لاہور پاکستان
۷۸۔ پروفیسر منیر احمد یزدانی۔ میرپور آزاد کشمیر پاکستان
۷۹۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔ دہلی ہندوستان
۸۰۔ نجمہ عثمان۔ لندن برطانیہ
۸۱۔ نذیر فتح پوری۔ پونے ہندوستان
۸۲۔ ڈاکٹر نگار عظیم۔ دہلی ہندوستان
۸۳۔ نور شہزادی عالم۔ پیٹر برو، انگلینڈ
۸۴۔ نیلم احمد بشیر۔ لاہور پاکستان
۸۵۔ واجد ندیم۔ شکاگو امریکہ
۸۶۔ یوسف ناظم۔ ممبئی ہندوستان

رو میں ہے رخش عمر............

خاندانی نام: فاطمہ

قلمی نام: سلطانہ مہر

مقام پیدائش: ممبئی ہندوستان

تعلیم: ایم۔اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی 1971ء

پہلا افسانہ: 6 ستمبر 1953ء میں روزنامہ ''انقلاب'' ممبئی میں شائع ہوا۔

صحافت: روزنامہ ''انجام'' کراچی 1965ء تا 1967ء

روزنامہ ''جنگ'' کراچی 1967ء تا 1979ء

مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ ''روپ'' کراچی 1980ء تا 1990ء

تصانیف:

1۔ ''داغ دل'' (ناول 1962ء)

2۔ ''تاجور'' (ناول 1966ء)

3۔ ''ایک کرن اجالے کی'' (ناول 1969ء)

4۔ ''جب بسنت رت آئی'' (ناول 1972ء)

5۔ ''آج کی شاعرات'' (تذکرہ 1973ء)

6۔ ''بند سیپیاں'' (افسانے 1976ء)

7۔ ''اقبال دور جدید کی آواز'' (تالیف۔ 1977ء)

8۔ ''سخن ور'' حصہ اول (تذکرہ شعراء 1978ء)، دوسرا ایڈیشن 1979ء

تیسرا ایڈیشن 2000ء

9۔ ''دھوپ اور سائبان'' (افسانے 1980ء)

10۔ ''دل کی آبرو ریزی'' (افسانے 1988ء)

11۔ ''ساحر کا فن اور شخصیت'' (تالیف 1989ء)

12۔ ''سخن ور'' حصہ دوم (بیرون پاکستان بسنے والے شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1996ء)

13۔ حرف معتبر۔ کلام کا مجموعہ (1996ء)

14۔ ''سخن ور'' حصہ سوم (پاکستانی شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1998ء)

15۔ سخن ور چہارم (شعراء و شاعرات کا تذکرہ) 2000ء

16۔ ''گفتنی اول'' (نثر نگاروں کا تذکرہ) 2000ء

زیر تصنیف:

17۔ سخن ور پنجم 2004ء

18۔ گفتنی دوم 2004ء

Published by

MEHER BOOK FOUNDATION

U.S.A.